ہزاروں مسائل شرعیہ کا
بیش بہا خزانہ

فتاویٰ اجملیہ

بدر الفقہاء حضرت علامہ مفتی شاہ
مولانا محمد اجمل قادری رضوی علیہ الرحمۃ



مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُّفَقِّہْہُ فِی الدِّیْنِ (الحدیث)

اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اُسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔

ہزاروں فتاویٰ پر مشتمل مسائل شرعیہ کا بیش بہا خزانہ

اجمل الفتاویٰ

المعروف بہ

فتاویٰ اجملیہ

جلد دوم

عمدۃ المحققین سلطان المناظرین اجمل العلماء بدر الفضلاء

حضرت علامہ مفتی الشاہ محمد اجمل صاحب قادری رضوی اشرفی نعیمی علیہ الرحمۃ والرضوان

شبیر برادرز

۴۰۔ اردو بازار۔ زبیدہ سنٹر ○ لاہور

نام کتاب	•=•=••	اجمل الفتاوی المعروف بہ فتاوی اجملیہ (جلد دوم)
مصنف	•=•=••	اجمل العلماء حضرت علامہ مفتی الشاہ محمد اجمل صاحب سنبھلی
تبییض وترتیب	•=•=••	محمد حنیف خاں رضوی بریلوی صدر المدرسین جامعہ نوریہ بریلی شریف
محرک	•=•=••	حضرت علامہ مولانا محمد منشاء تابش قصوری (صدر ادارہ ریاض المصنفین پاکستان)
مؤید	•=•=••	مولانا صاحبزادہ سید وجاہت رسول قادری (چیئرمین ادارہ تحقیقات رضا انٹرنیشنل کراچی)
پروف ریڈنگ	•=•=••	محمد عبدالسلام رضوی - محمد حنیف خاں رضوی
کمپوزنگ	•=•=••	محمد غلام مجتبیٰ بہاری - محمد زاہد علی بریلوی - محمد منیف رضا خاں بریلوی
	•=•=••	زین العابدین بہاری - محمد عفیف رضا خاں بریلوی
سن اشاعت	•=•=••	فروری ۲۰۰۵ء
تعداد	•=•=••	۵۰۰
ناشر	•=•=••	شبیر برادرز اُردو بازار لاہور
مطبع	•=•=••	اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز لاہور
قیمت	•=•=••	فی جلد 250 روپے (مکمل سیٹ 1000 روپے 4 جلد)

ملنے کے پتے

ادارہ تحقیقات رضا انٹرنیشنل رضا چوک ریگل (صدر) کراچی

ادارہ پیغام القرآن زبیدہ سنٹر 40 اُردو بازار لاہور

مکتبہ اشرفیہ مرید کے (ضلع شیخوپورہ)

احمد بک کارپوریشن کمیٹی چوک راولپنڈی

مکتبہ ضیائیہ بوہڑ بازار راولپنڈی

مکتبہ قادریہ عطاریہ موتی بازار راولپنڈی

مکتبہ غوثیہ ہول سیل پرانی سبزی منڈی کراچی

ضیاء القرآن پبلی کیشنز اُردو بازار کراچی

مکتبہ رضویہ آرام باغ روڈ کراچی

مکتبہ رحیمیہ گوالی لین اُردو بازار کراچی

فہرست مسائل جلد دوم

باب الامامت

باب الجمعہ

باب العیدین

باب النوافل

باب التہجد ۳۶۲

باب قضاء الفوائت

باب المساجد

باب الدعا

باب القرآن والتفسیر

کتاب الجنائز

باب الوصیت

باب صلوۃ جنائز

باب تلقین میت

باب حرمۃ قبور

باب صدقات میت

کتاب الزکوۃ

باب مصارف زکوۃ

کتاب الصوم

رسالہ اجمل المقال ۔۔۔۔ ۶۸۲

باب مسائل الصوم

کتاب الحج

رسالہ فوٹو کا جواز درحق عازمان حجاز ۔۔۔۔ ۷۳۹

کتاب الطهارة



باب المیاہ

مسئلہ (۲۱۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک کنواں ناپاک ہوگیا ہے۔ اگر اس کنویں سے پانی پاک کرنیکی نیت سے نہ نکالا جائے مگر پانی برابر بھرتے رہیں۔ مثلاً پانی نکالنے کی تین سو ڈول مقدار ہے اگر اس ناپاک کنویں سے اسقدر پانی نکل گیا ہو تو کنواں پاک ہو جائے گا یا نہیں؟۔ یا چوہا گل سڑ گیا اور پانی بھرنے والے برابر بھرتے رہیں اگر کل پانی کی مقدار پر پانی بھر لیا گیا ہو۔ یا اس سے زیادہ تو پانی پاک ہوگا یا نہیں؟۔

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

کنویں کے جس وقت ناپاک ہونے کا حکم کیا گیا اس میں جس قدر اس وقت پانی تھا ناپاک قرار پایا، پھر اس نجاست کو نکال کر اس کل مقدار پانی کا کنوں سے بیک وقت نکالنا ضروری نہیں، بلکہ اگر مختلف وقتوں یا چند مدتوں میں وہ پانی کنویں سے نکالا گیا یہاں تک کہ وہ کل مقدار متفرق اوقات کو جمع کر کے نکالی گئی تو وہ کنواں بلاشبہ پاک ہوگیا۔

قاضی خاں میں ہے: بیر وجب فيها نزح اربعين دلوا فنزح يوما عشرين ويوما عشرين جاز ولا يشترط النزح متواليا۔ (قاضی خان ص ۷) واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۱۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

وضو کے استعمال کی پانی کی چھینٹیں اگر کنوئیں میں واقع ہو جائیں تو کنواں مذکور پاک ہے یا نہیں؟۔ اگر ناپاک ہے تو کتنے ڈول نکالے جائیں، اسکا جواب بحوالہ کتب فقہی عطا کیا جائے،

بینوا توجروا۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

کنوئیں میں جب ماء مستعمل کی چھینٹیں واقع ہوجائیں تو وہ کنواں پاک ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: الماء المستعمل اذا وقع فی البیر لا یفسدہ الا اذا غلب وھو الصحیح۔ (عالمگیری)

یہ ظاہر ہے کہ چند چھینٹیں کنوئیں کے پانی پر غالب نہیں آسکتیں۔ لہذا کنوئیں میں ماء مستعمل کی چند چھینٹوں کے گرجانے سے کنواں ناپاک نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مسئلہ (۲۱۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

کنوئیں میں استعمالی جوتا گرجائے اور اس پر نجاست کا لگنا یقینی نہیں تو کنواں مذکور پاک ہے یا نہیں؟۔ اس کا جواب بحوالہ کتب فقہ عطا فرمایا جائے، بینوا توجروا۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

جب استعمالی جوتا کنوئیں میں گرجائے اور اس پر نجاست کا یقین نہ ہو تو محض تسکین قلب کیلئے احتیاطا بیس ڈول نکالے جائیں۔

شامی میں ہے۔ فینزح ادنی ما ورد بہ الشرع وذلک عشرون دلوا احتیاطا کذاقال فی الفتاوی العالمگیریہ: لووقعت الشاۃ وخرجت منہ ینزح عشرون دلوا لتسکین القلب لا للتطھیر حتی لو لم ینزح وتوضاجاز کذافی فتاوی قاضی خان۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۱۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

اگر ایک مٹکا یا گھڑا پانی ناپاک ہوجائے تو شریعت نے اس کے پاک کرنے کے کیا طریقے لکھے

ہیں؟۔ المستفتی جمال الدین وعبدالرحمن چتوڑگڑھی

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

جب ایک مٹکا یا ایک لوٹا یا پیالا بھر پانی ناپاک ہوجائے اور اس کے رنگ یا بو یا ذائقہ کسی ایک میں کچھ تغیر نہ ہو تو اس کے پاک کرنے کا ایک نہایت سہل اور آسان طریقہ یہ ہے۔ کہ اس میں پاک پانی اس قدر پہنچائیں کہ وہ کناروں سے ابل کر خوب بہہ جائے۔

فتاوی عالم گیری میں ہے: حوض صغیر تنجس ماؤہ فدخل الماء الطاھر فیہ من جانب وسال ماء الحوض من جانب آخر کان الفقیہ ابو جعفریقول لما سال ماء الحوض من الجانب الآخر یحکم بطھارۃ الحوض وھو اختیار الصدر الشھید وفی النوازل وبہ ناخذ کذافی التاتارخانیہ" (عالمگیری قیومی ص۹)

منیہ اور اس کی شرح کبیری غنیتہ میں ہے: فان دخل الماء من جانب حوض صغیر کان قد تنجس ماؤہ وخرج من جانب قال ابو بکربن سعید الاعمش لا یطھر مالم یخرج مثل ماکان فیہ ثلث مرات فیکون ذلک غسلالہ کالقصعۃ۔ وقال غیرہ لا یطھر مالم یخرج مثل ما کان فیہ مرۃ واحدۃ۔ وقال ابو جعفر الھندوانی یطھر بمجرد الدخول من جانب والخروج من جانب وان لم یخرج مثل ماکان فی الحوض وھوای قول ابو جعفر اختیار الصدر الشھید حسام الدین لانہ حینئذ یصیر جاریا والجاری لا یتنجس مالم یتغیر بالنجاسۃ والکلام فی غیر المتغیر" (کبیری ص۹۹) واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

مسئلہ (۲۱۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان شرع عظام دامت برکاتہم النوری اس مسئلہ میں

بہار شریعت جلد چار صفحہ ۵۷ میں ہے کہ پانی کے رہنے والے جانور کا جوٹھا ناپاک ہے خواہ ان کی پیدائش پانی میں ہو یا نہیں۔

یہ مسئلہ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر جانور پانی کے رہنے والے ہیں تو انکا جوٹھا ناپاک کیوں ہے؟۔ اس کی وجہ کیا ہے؟۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

سائل کو یا اس مسئلہ کو دیکھنے میں دھوکہ ہو گیا ہے۔ یا کتاب ہی میں غلط چھپ گیا ہے۔ باوجودیکہ بہار شریعت جلد دوم صفحہ ۵۷ میں ہے: مسئلہ پانی کے رہنے والے جانور کا جوٹھا پاک ہے خواہ اسکی پیدائش پانی میں ہو یا نہیں۔ اور یہی حکم تصریحات کتب فقہ کے موافق ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل



باب الوضو

مسئلہ (۲۲۰)

جناب مفتی جی صاحب ہادی دین و جامع علوم ظاہری و منبع فیوض باطنی بعد مسنون السلام علیکم کے واضح ہو کہ آپ برائے مہربانی مسائل ذیل کے جواب با قاعدہ مہر کے تحریر فرما دی جائے گا عین مہربانی ہوگی۔ بندہ کو ممنون ومشکور فرمائیگا (نوٹ) خط صاف ہوتا کہ پڑھنے میں مشکوک نہ ہو۔

جمعہ کی نماز کو خطبہ سے پہلے جس طرح آدمی جمع ہوتے ہیں اس وقت ایک شخص کو نیند آئی اور وہ نیند میں بیٹھا ہوا جھٹکا کھا گیا، گرا نہیں، اور نہ کسی چیز کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، جیسے دیوار وغیرہ، تو اس کا وضو ساقط ہوا یا نہیں؟ ۔اور اگر وہ شخص گر گیا تو وضو ساقط ہوا یا نہیں؟ ۔حل کر دیجئے گا۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

باوضو شخص کو جب بیٹھے ہوئے نیند آجائے اور بغیر کسی چیز کے سہارے کے بیٹھا تھا تو اگر وہ نیند میں زمین پر گر گیا تو اس کا وضو ساقط ہو گیا اور اگر اس کو فقط نیند کا جھٹکا ہی لگا اور گرنے نہ پایا تو وضو ساقط نہ ہوگا۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

کتاب الصلوۃ

﴿۱۶﴾

اوقات الصلوۃ

مسئلہ (۲۲۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین وشرع متین اس مسئلہ میں کہ

مخالفین نماز عصر کا وقت ہونے کا ایک مثل سایہ ہونا بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ حدیث سے ثابت ہے۔اس کے بارے میں جو حدیث شریف وفقہ حنفی کا معتبر فیصلہ ہو مطلع فرمائیں۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

مخالفین جب نماز عصر کا اول وقت سایہ کے ایک مثل کے بعد بتاتے ہیں تو انہیں ماننا پڑے گا کہ وقت عصر ظہر کے وقت ختم ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے کہ مسلم شریف کی حدیث میں بھی یہ ہے کہ

اول وقت الظھر اذا زالت الشمس و کان ظل الرجل کطولہ ما لم یحضر العصر۔ یعنی ظہر کا اول وقت جب سے سورج کا زوال ہو یہاں تک کہ آدمی کا سایہ اس کے طول کی مثل ہو جائے جب تک کہ عصر کا وقت نہ آئے۔

اور اوقات نماز کی اصل بنیادی حدیث امامت جبرئیل والی حدیث میں ہے۔دوسرے دن کی نماز ظہر ایک مثل کے بعد پڑھنا مذکور ہے۔چنانچہ اس میں یہ ہے: و صلی لی الظھر حین کان الظل مثلہ۔

یعنی حضور نے فرمایا کہ جبرئیل نے ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جب سایہ ایک مثل ہو گیا تھا۔

تو اب مخالفین یہ بتائیں کہ جب ایک مثل کے بعد عصر شروع ہو جاتا ہے تو حضرت جبرئیل نے یہ ظہر وقت عصر میں پڑھائی۔تو ادا ہوئی یا قضا ہوئی؟۔تو ظہر کا آخر وقت کس چیز سے معلوم ہوا۔اور معلوم ہوا کہ ادا ہوئی تو ثابت ہو گیا کہ ایک مثل کے بعد ظہر کا وقت ہے۔عصر کا وقت دو مثل پر شروع ہوتا ہے اور دو مثل کی مثبت چند احادیث ہیں۔صرف ایک حدیث پیش کرتا ہوں۔

حضرت امام احمد امام مالک سے بسند خود راوی کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت رافع سے فرمایا:

انا اخبرك و صل الظهر اذا كا ن ظلك مثلك و العصر اذ ا كا ن ظلك مثليك والحديث ۔

یعنی میں تجھ کو خبر دیتا ہوں کہ ظہر جب کہ تیرا سایہ ایک مثل ہو جائے پڑھ اور عصر جب تیرا سایہ دو مثل ہو جائے۔ مذہب حنفی کی یہ ایک دلیل ہے۔ مختصر جواب روانہ ہے۔ واللہ تعالٰی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۲۲)

حدیث شریف میں سید عالم صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورج اللہ تعالٰی کے دربار میں حاضر ہوتا ہے، یا عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے، اللہ تعالٰی اس کو طلوع کا حکم فرماتا ہے۔ تو مشرق سے طلوع کرتا ہے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے، بلکہ حقیقت ہے، کہ بلغار اور لندن میں عشا کا وقت ہی نہیں ہوتا ہے۔ شفق ڈوبتے ہی فجر طلوع کرتی ہے، اس کے متعلق قرآن وحدیث میں کہیں ہو تو بتایا جائے۔ جب ایسا ہے کہ سورج غروب ہوتے ہی طلوع کرنے لگتا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورج ڈوبتا ہی نہیں ہے۔ اور بعض لوگ یوں بھی کہتے ہیں کہ کسی مقام پر چھ مہینے دن رہتا ہے اور چھ مہینے رات رہتی ہے۔ جب ایسا ہوگا تب ہی تو کہا جاتا ہے، ان مقامات پر طلوع وغروب کے متعلق شرع کا کیا حکم ہے؟۔ مقام کے لحاظ سے نماز کا حکم کیا جاتا تو مناسب تھا کہ جہاں جتنے وقت ہوں اتنے وقت کی نماز فرض ہوتی۔ اللہ تعالٰی کے علم میں ہے کہ بعض مقام ایسے ہیں کہ عشا کا وقت ہی نہیں ہوتا۔ بعض مقام ایسے ہیں کہ چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات رہتی ہے۔ جب چھ چھ مہینے کا رات دن ہو تو وہاں کتنی نمازیں فرض ہونی چاہیں۔ اس کا ذکر قرآن وحدیث میں کہیں نہ کہیں اشارۃ کنایۃ ہوگا تو ضرور۔ واضح ثبوت سے جواب دیا جائے۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

قرآن وحدیث سے ہر چیز کا تفصیلی ثبوت ضروری ہو تو بہت سے احکام شرع کا محض اسی نظریہ کی بنا پر انکار کر دیا جائے گا۔ اور یہی گمراہی اور لامذہبی کا اصل دروازہ ہے۔ یہاں قابل غور امر یہ ہے کہ قرآن کریم اور حدیث میں اکثر اجمالی احکام اور اصول بیان کئے گئے ہیں۔ جن کی تفصیل کے لئے ہم

ائمہ ومجتہدین کے محتاج ہیں۔ چنانچہ جیسے واقعات وحوادث ظہور میں آتے ہیں مجتہدین اسکا تفصیلی حکم قرآن وحدیث ہی سے مستنبط کر کے بیان فرما دیتے ہیں کہ اس تفصیل تک ہم عوام کے ذہن کی رسائی نہیں ہوتی۔ جیسے کون نہیں جانتا ہے کہ قرآن وحدیث سے وضو کے چار فرائض ثابت ہیں۔ لیکن جس شخص کے ہاتھ کہنیوں تک کاٹ دیے جائیں اس کے حق میں وضو میں صرف تین فرائض ہی ہوئے کہ ایک فرض ہاتھ کا دھونا اس کے لئے ساقط ہو گیا۔ یا قرآن وحدیث سے دن رات میں پانچ نمازیں ہر مسلمان پر فرض ہیں لیکن حیض والی عورت جب حیض سے وقت عصر میں پاک ہو تو بس پر اس دن رات میں صرف تین نمازیں عصر، مغرب، عشا فرض ہوئیں۔

اور دو نمازیں فجر، ظہر فرض ہی نہیں ہوئیں۔ تو ایسے حوادثات کا قرآن وحدیث سے واضح طور پر تفصیلی ثبوت کا مطالبہ وہی کیا کرتا جو گمراہ و بیدین ہے۔ یا بالکل جاہل و ناواقف ہے۔ لہذا ایسے حوادثات کے سوالات یوں کئے جاتے ہیں کہ ایسے مقطوع الید کے لئے وضو میں ہاتھ دھونے کے فریضے کے ساقط ہو جانے کی شرع نے کیا وجہ بیان فرمائی ہے۔ تو اس کا صاف جواب یہ ہے کہ ایسے مقطوع الید کے جب چوتھے فرض کا محل یعنی ہاتھ ہی نہیں ہے تو چوتھا فرض یعنی ہاتھوں کا دھونا اس سے ساقط ہو گیا اور اس کے حق میں قرآن وحدیث کے بیان کئے ہوئے تین فرائض ہی وضو میں ثابت ہوئے۔ اسی طرح اس حیض والی عورت پر اس دن رات میں دو نمازوں فجر وظہر کے فریضوں کے ساقط ہو جانے کی شرع نے کیا وجہ بیان فرمائی ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان دو اوقات میں وہ عورت حیض سے پاک نہیں تھی، تو شرط نماز ہی اس کے حق میں نہیں پائی گئی، تو اس عورت پر سے ان دو وقتوں فجر وظہر کا فریضہ ساقط ہو گیا۔ تو اس کے حق میں قرآن وحدیث ہی کے بیان سے اس دن رات میں صرف تین نمازیں عصر، مغرب، عشاء ہی فرض ثابت ہوئے۔

یہی حال بلغار اور لندن کے مسلمانوں کا ہے کہ وجوب نماز کے لئے وقت شرط اور سبب ہے تو جب وقت عشا ہی انکو نہ مل سکا تو ان پر فرض وقت یعنی نماز عشا واجب ہی نہیں ہوئی۔ لہذا قرآن وحدیث ہی کے طرف سے ان کے سروں سے فرض عشا کا فریضہ ساقط ہو گیا۔ تو چالیس راتوں میں بلغار اور لندن والوں پر قرآن وحدیث ہی سے صرف چار نمازیں فجر، ظہر، عصر اور مغرب فرض ہوئیں اگر چہ انہیں عشا و وتر کی قضا بھی پڑھ لینی چاہیے۔

اب باقی رہا یہ امر کہ ان مقامات پر طلوع وغروب کا کیا حکم ہے۔ تو یہ ظاہر ہے کہ طلوع وغروب تو

ان مقامات کے طلوع وغروب کے بعد فرض وقت نماز مغرب ان پر فرض ہے، اور طلوع سے قبل فرض وقت نماز فجر ان پر واجب ہے۔ تو اس سے صاف طور پر معلوم ہو گیا کہ شریعت نے ان مقامات کے طلوع وغروب پر حکم مرتب کیا۔ تو اب یہ نتیجہ نکالنا غلط ہو گیا کہ ان مقامات میں سورج ڈوبتا ہی نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بھی غلط معلوم ہوتا ہے کہ بعض مقامات جن میں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات رہتی ہے۔ اگر ایسے مقامات ہوتے تو فقہا کرام بلغار اور لندن کی طرح انکا ذکر کرتے اور وہاں کے احکام بیان کرتے۔ لیکن میری نظر سے کتب فقہ میں انکا ذکر نہیں گزرا۔ حدیث شریف کا مضمون حق ہے ان مقامات کا حال مضمون حدیث کے خلاف نہیں کہ آفتاب کا طلوع وغروب سب حکم الہی سے ہوتا ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل



باب الاذان

مسئلہ (۲۲۳۔۲۲۴۔۲۲۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

اس زمانہ میں جو یہ نئی بات رائج ہوگئی ہے کہ علاوہ مغرب کے باقی چار نمازوں کیلئے اور جمعہ کے وقت میں بھی اذان اور تکبیر کے درمیان آواز بلند صلوۃ پکاری جاتی ہے۔ دریافت طلب یہ امور ہیں۔

(۱) آیا اس اعلان کا ثبوت فقہ حنفی کی کسی معتبر کتاب میں ہے یا نہیں؟۔

(۲) اس اعلان کیلئے صلاۃ کے الفاظ کس زمانہ میں رائج ہوئے، اس کا بھی کسی فقہ کی معتبر کتاب میں ذکر ہے یا نہیں؟۔

(۳) الصلاۃ والسلام علیک یا رسول اللہ۔ اور اس کے مثل الفاظ ہیں۔ ان کلمات میں ایک تو لفظ۔ یا۔ ہے جو ندائے قریب کے لئے ہے اور جس سے قریب کے شخص کو پکارا جاتا ہے۔ دوسرا لفظ ۔ک۔ ہے جو خطاب کے لئے ہے اور اس سے شخص حاضر کے لئے خطاب کیا جاتا ہے۔ تیسری چیز یہ ہے کہ لفظ۔ یا۔ اور۔ک۔ سے زندہ شخص کے ساتھ خطاب کیا جاتا ہے نہ کہ مردہ سے۔ تو کیا باوجود ان امور کے یہ الفاظ صلاۃ جائز ہیں یا نہیں؟۔ اگر جائز ہیں تو اسکا پورا ثبوت پیش کیا جائے۔ بینوا توجروا۔

المستفتی مولوی محمد اشفاق صاحب
بمقام محلہ مراثی ٹولہ متصل مسجد اونٹ والان بریلی شریف۔
۱۱ محرم الحرام ۱۳۶۲ھ۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

(۱) اذان وتکبیر کے درمیان جس اعلان کے متعلق سوال ہے وہ بلا شک جائز ہے، اس کا جواز بکثرت کتب وفقہ میں موجود ہے، بلکہ فقہائے متاخرین نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے اور اسکا نام تثویب رکھا ہے۔

چنانچہ نورالایضاح اوراس کی شرح مراقی الفلاح میں ہے:

(ویثوب) بعد الاذان فی جمیع الاوقات لظهور التوانی فی الامور الدینیة فی الاصح وتثویب کل بلدة بحسب ما تعارفه اهله۔ (طحطاوی مصری ص۱۱۴)

اور صحیح مذہب میں تمام وقتوں میں اذان کے بعد تثویب کہے، کیونکہ دینی باتوں میں سستی ظاہر ہے، اور ہر شہر کی تثویب وہ ہے جو اس کے رہنے والے سمجھیں۔

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

(قوله یثوب) هو لغة مطلق العود الی الاعلام بعد الاعلام وشرعا هو العود الی الاعلام المخصوص (وقوله بعدالاذان) الاذان علی الاصح لا بعد الاقامة کما هو اختیار علماء الکوفة۔ (قوله فی جمیع الاوقات) استحسنه المتاخرون وقد روی احمد فی السنن والبزار وغیرهما باسناد حسن موقوفا علی ابن مسعود ما راه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن۔ (طحطاوی مصری ص۱۱۴)

تثویب لغت میں پہلے اعلان کے بعد دوسرے اعلان کی طرف مطلق لوٹنے کو کہتے ہیں اور شریعت میں وہ مخصوص اعلان کی طرف لوٹنا مراد ہوتا ہے۔ صحیح تر مذہب میں تثویب اذان کے بعد ہے نہ کہ تکبیر کے بعد جیسا کہ یہ علماء کوفہ کا مختار قول ہے۔

تثویب کو اذان کے بعد تمام اوقات میں متاخرین نے مستحسن جانا، اور استحسان کا ثبوت اس حدیث سے ثابت ہے جسے امام احمد نے مسند میں اور بزار وغیرہ نے بسند حسن حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالٰی عنہ سے موقوفا روایت کیا کہ جسے مسلمان اچھا جانیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔

کنزالدقائق اوراس کی شرح عینی میں ہے:

(ویثوب) من التثویب وهو العود الی الاعلام بعد الاعلام وانما اطلقه تنبیها علی ما استحسنه المتاخرون من التثویب فی کل الصلوات لظهور التوانی فی الامور الدینیة۔ (عینی مصری ص۲۷ ج۱)

تثویب پہلے اعلان کے بعد دوسرے اعلان کی طرف لوٹنے کا نام ہے۔ صاحب کنز نے اسے مطلق بیان کرنے میں اس بات پر تنبیہ کی کہ متاخرین نے اس تثویب کو تمام نمازوں میں مستحسن جانا۔ اس لئے کہ دینی امور میں سستی ظاہر ہو چکی ہے۔

جوہرہ نیرہ شرح مختصر قدوری میں ہے:

المتاخرون استحسنوه فی الصلوات کلها لظهور التونی فی الامور الدینیة وصفته فی کل بلد علی ما یتعارفونه۔ (ص۴۵ جوہرہ)

متاخرین نے سب نمازوں میں تثویب کو مستحسن جانا کہ امور دینیہ میں سستی ظاہر ہے اور تثویب کے الفاظ ہر شہر کیلئے وہ ہیں جنہیں وہاں کے رہنے والے سمجھیں۔

تنویرالابصار ودرمختار میں ہے:

(ویثوب) بین الاذان والاقامة فی الکل للکل بما تعارفوه۔ (ردالمحتار مصری ص۲۶۲ ج۱)

اذان اور تکبیر کے درمیان تمام اوقات نماز میں سب لوگوں کے لئے اس لفظ سے تثویب کہیں جسے لوگ جانتے ہوں۔

علامہ شامی ردالمحتار میں عنایہ سے ناقل ہیں:

احدث المتاخرون التثویب بین الاذان والاقامة علی حسب ما تعارفوه فی جمیع الصلوات سوی المغرب۔ (ردالمحتار ص۲۷۲ ج۱)

متاخرین نے سوائے مغرب کے تمام نمازوں میں اذان وتکبیر کے مابین ہر اس لفظ کے ساتھ جسے لوگ سمجھتے ہوں تثویب کہنا ایجاد کیا ہے۔

خود مانعین کے پیشوا مولوی خرم علی صاحب نے غایۃ الاوطار ترجمہ درمختار میں صاف طور پر اقرار کیا:

تثویب یعنی اعلام بعد الاذان کا طریقہ یہ ہے کہ بعد اذان بقدر بیس آیت پڑھنے کے ٹھہر جائے پھر بلاوے اس طرح کہ "الصلوۃ الصلوۃ" یا کہے: چلو نماز تیار ہے، یا جس طرح کا رواج ہو۔ پھر اس کے بعد بیس آیت کا توقف کرے پھر اقامت کہے۔ کذا فی البحر۔ (غایۃ الاوطار (ص۱۸۱ کشوری)

بخیال اقتصار یہ چند عبارات پیش کی گئیں ہیں۔ ورنہ تثویب کے جواز کی تصریح قنیہ، ملتقط، ہدایہ، بحرالرائق، فتاوی قاضی خاں، نہر، مجتبی، درر، غرر، نہایہ، خزائن، حسن المحاضرہ، القول البدیع وغیرہ کتب فقہ میں ہے۔

بالجملہ ان عبارات سے ظاہر ہو گیا کہ تثویب یعنی اعلان بعد الاذن نہ فقط جائز بلکہ مستحسن ہے اور نیز یہ بھی روشن ہو گیا کہ فقہائے کرام نے اس تثویب کے لئے کوئی خاص الفاظ مقرر نہیں فرمائے ہیں بلکہ اسے عرف ورواج پر چھوڑ دیا ہے اور یہ اجازت دی ہے کہ ہر جگہ جن الفاظ سے لوگ تثویب کو سمجھتے ہوں وہی الفاظ مقرر کر لئے جائیں۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۲) جب یہ ثابت ہو گیا کہ تثویب کیلئے کوئی الفاظ خاص مقرر نہیں بلکہ اختیار ہے کہ اسے جن الفاظ میں چاہیں ادا کر سکتے ہیں تو لفظ ''صلاۃ وسلام'' کہنے کا جواز خود ان ہی عبارت سے ثابت ہو گیا ۔لیکن سائل کے اطمینان خاطر کیلئے فقہ کی معتمد ومستند اور مشہور کتاب درمختار کا حوالہ پیش کیا جاتا ہے۔

التسليم بعد الاذان حدث في ربيع الآخر سنة سبعمائة واحدى وثمانين في عشاء ليلة الاثنين ثم يوم الجمعة ثم بعد عشر سنين حدث في الكل الاالمغرب ثم فيها مرتين ۔ وهو بدعة حسنة۔ (ردالمحتار مصری ص۲۷۳ ج۱)

اس عبارت کا ترجمہ خود مانعین صلاۃ کے پیشوا مولوی خرم علی صاحب نے غایۃ الاوطار میں یہ کیا ہے:

رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم پر سلام کہنا پیدا ہوا ربیع الآخر (۷۸۱ھ) میں عشا کی نماز میں دوشنبہ کی رات۔ پھر جمعہ کے دن۔ پھر دس برس کے بعد پیدا ہوا سب نمازوں میں سوائے مغرب کے پھر مغرب میں بھی دو بار سلام کہنا ہو گیا اور یہ امر بدعت حسنہ ہے۔ (غایۃ الاوطار ص۱۸۱ ج۱)

علامہ شامی ردالمحتار میں فرماتے ہیں:

قوله سنة ۷۸۱ ۔ كذا في النهر عن المحاضرة للسيوطي ثم نقل عن القول البديع للسخاوي انه في سنه ۷۹۱ وان ابتداء ه كا ن في ايام السلطان الناصر صلاح الدين بامره (ردالمحتار مصری ص۲۷۳ ج۱)

یہی مولوی صاحب اس کا ترجمہ غایۃ الاوطار میں کرتے ہیں:

یہ فائدہ شارح نے جلال الدین سیوطی شافعی رحمۃ اللہ تعالی کے حسن المحاضرہ سے نقل کیا۔ اور سخاوی کی قول بدیع میں ہے کہ اس کی ابتدائے حدوث سلطان صلاح الدین بن المظفر بن ایوب کے حکم سے ہوئی ۷۹۱ھ میں۔

طحطاوی نے کہا کہ مغرب کا سلام ہمارے وقت میں رائج نہیں اور نہ سیوطی کی اس عبارت

میں ہے جو بحر الرائق میں منقول ہے انتہی۔ بدعت حسنہ وہ ہے جو قواعد شریعت کے مخالف نہ ہو۔
(غایۃ الاوطار ص۱۸۱ ج۱)

ان عبارات اور ترجمہ سے ظاہر ہو گیا کہ حضور اکرم ﷺ پر باواز بلند اذان اور تکبیر کے درمیان میں صلاۃ وسلام باواز بلند کہنا چودہویں صدی کے کسی عالم کا ایجاد کردہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کی ابتدا ۷۸۱ھ میں ہوئی اور سلطان صلاح الدین بن مظفر کے حکم سے اس کو شروع کیا گیا اور اس کے بعد ہر زمانہ اور ہر صدی میں اسکا رواج فقہائے کرام وعلمائے عظام نے باقی رکھا اور اس پر انکار نہیں فرمایا۔ بلکہ ان حضرات نے اپنی اپنی تصنیف میں ذکر فرما کر اس صلاۃ کو بدعت حسنہ قرار دیا اور مستحسن ومستحب ہونیکا حکم دیا جو ان عبارات میں مذکور ہے۔ لہذا اب اس سے زیادہ روشن ثبوت اور صاف تصریح اور کیا ہو سکتی ہے۔ انصاف پسند طبیعتوں کے لئے یہ بات بہت کافی ہے کہ جو فعل تخمیناً چھ سو سال سے رائج ہے اور فقہاء وعلمائے امت کا معمول بہا ہے، آج کسی نام نہاد مولوی صورت کا بلا کسی دلیل وثبوت کے اسے ناجائز وبدعت قرار دیدینا کتنی بڑی دلیری وجرات ہے اور چھ صدی کے فقہا وعلما ومشائخ بلکہ تمام مسلمین کو بدعتی وگمراہ ٹھہرانا ہے۔ العیاذ باللہ تعالی۔ اور چھ صدی کے مسلمین تو بدعتی وگمراہ ہو نہیں سکتے کہ اسی مسئلہ کے ثبوت میں طحطاوی کی عبارت گزری: ما راه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن۔ یعنی جس چیز کو مسلمان اچھا جانیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔ تو جب چھ صدی کے مسلمانوں نے اس صلوۃ کو اچھا جانا تو بلاشبہ یہ فعل اچھا ہے۔ اب آج جس شخص نے اس صلاۃ کو چھ صدی کے فقہا وعلما کی تصریحات کے خلاف محض اپنی رائے سے بدعت وناجائز قرار دیا اور جائز کہنے والے تمام علما وفقہا کو بدعتی وگمراہ ٹھہرایا تو وہ خود بدعتی وگمراہ بیدین وضال ہے۔ مولی تعالی ایسے منکروں کو قبول حق کی توفیق دے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۳) بحمد اللہ صلوۃ کا ثبوت تو جواب نمبر (۲) میں گزر چکا، تو اب صلاۃ تو قابل بحث نہیں رہی، اب باقی رہا سائل کا یہ قول کہ ''یا رسول اللہ'' میں لفظ ''یا'' ندائے قریب کیلئے ہے۔ جس سے قریب کے شخص کو پکارا جاتا ہے۔ تو اول سائل کی یہ بات ہی بالکل غلط ہے کہ لفظ ''یا'' صرف ندائے قریب کے لئے آتا ہے۔ سائل اگر ذی علم ہوتا تو کبھی ایسی بات نہ کہتا۔ نحو کی کتابوں میں یہ تصریح موجود ہے کہ لفظ ''یا'' ندائے قریب وبعید دونوں کیلئے مستعمل ہوتا ہے۔

(اولا) شرح جامی میں ہے۔ "يا اعمها استعمالا لانها تستعمل لنداء القريب والبعيد۔

'یا' باعتبار استعمال کے عام ہے کہ وہ ندائے قریب وبعید دونوں کے لئے مستعمل ہے۔ تو اب لفظ 'یا' کو ندائے قریب کے لئے خاص کر دینا کیسی سخت غلطی ہے۔

(ثانیا) حضور نبی کریم صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم ہم سے بعید کب ہیں بلکہ وہ ہم سے اتنے زیادہ قریب ہیں کہ ہماری جانوں کو ہم سے وہ قرب حاصل نہیں۔ اس مضمون پر بکثرت ثبوت پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن بخوف طوالت صرف ایک ہی حوالہ پر اکتفا کیا جاتا ہے جس کے بعد مانعین کو جائے سخن ومجال دمزدن باقی نہ رہے۔

مانعین کے پیشوا مولوی قاسم نانوتوی بانی مدرسہ دیوبند اپنی کتاب تحذیر الناس میں لکھتے ہیں:

النبی اولی بالمومنین من انفسھم، کو بعد لحاظ صلہ من انفسھم کے دیکھتے ہوئے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کو اپنی امت کے ساتھ وہ قرب حاصل ہے کہ ان کی جانوں کو بھی ان کے ساتھ حاصل نہیں۔ کیونکہ اولی بمعنی اقرب ہے۔

(تحذیر الناس مطبوعہ خیرخواہ سرکار پریس سہارن پور)

لہذا جب حضور اکرم صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم اتنے قریب تر ہیں تو اب سائل کو لفظ ''یا'' کے استعمال کرنے میں کیا عذر باقی رہ گیا۔

سائل کی دوسری بات یہ ہے کہ ''ک'' حاضر مخاطب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تو اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ خود نماز میں . السلام علیك ایھا النبی . پڑھا جاتا ہے۔ اس میں صلوۃ وسلام بھیجنا بھی ہے اور ک خطاب بھی ہے اور۔ ایھا النبی۔ سے قبل لفظ ''یا'' بھی ہے جو لفظا محذوف اور معنی مراد ہے۔

لہذا اگر یہ چیزیں ناجائز ہوتیں تو ان الفاظ کو تشہد سے علیحدہ کر دیا جاتا، مگر ساڑھے تیرہ سو برس سے آج تک کسی نے اس کاف خطاب اور یا ندا پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ فقہا وعلما نے خطاب وندا کے صحت معنی کی تائید فرمائی اور حضور صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کو حاضر جان کر مصلی کو خطاب وندا کرنے کا حکم دیا۔

حضرت عارف صمدانی قطب ربانی سیدی عبدالوہاب شعرانی نے میزان الشریعۃ میں فرمایا:

انما امر الشارع المصلی بالصلوۃ والسلام علی رسول اللہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم فی التشھد لینبه الغافلین فی جلوسھم بین یدی اللہ عز وجل علی شھود نبیھم فی تلك الحضرۃ فانه لا یفارق حضرۃ اللہ تعالی ابدا فیخاطبو نه بالسلام مشافھة۔

(میزان الشریعۃ مصری ج ۱ ص ۱۵۴)

شارع نے نمازی کو تشھد میں نبی ﷺ پر درود وسلام عرض کرنے کا حکم اس لئے دیا کہ جو لوگ اللہ عزوجل کے دربار میں غفلت کے ساتھ بیٹھتے ہیں انھیں آگاہ فرمادیں کہ اس حاضری میں اپنے نبی صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کو دیکھیں، اسلئے کہ حضور کبھی اللہ تعالی کے دربار سے جدا نہیں ہوتے تو بالمشافہ حضور صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم پر سلام عرض کرے اور آپ سے خطاب کرے؛

خاتم المحدثین حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات ترجمہ مشکوۃ شریف میں فرماتے ہیں:

نیز آنحضرت ہمیشہ نصب العین مومناں وقرۃ العین عابدان است در جمیع احوال واوقات خصوصا درحالت عبادت وآخر آں کہ وجود نورانیت وانکشاف دریں محل بیشتر وقوی تر است وبعضے عرفا گفتہ اند کہ ایں خطاب بجہت سریان حقیقت محمدیہ است درذرات موجودات وافراد ممکنات پس آں حضرت درذوات مصلیاں موجود وحاضر است، پس مصلی باید کہ ازیں معنی آگاہ باشد تا بانوار قرب واسرار معرفت متنور وفائض گردد۔ (اشعۃ اللمعات ص ۴۰۱ نولکشوری)

حضور صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم ہمیشہ ایمانداروں کے پیش نظر اور عبادت کرنے والوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں تمام احوال واوقات میں خاص کر عبادت کی حالت میں اور اس کے اخیر میں کہ نورانیت وانکشاف زیادہ قوی تر ہوتا ہے۔ بعض عرفاء نے فرمایا ہے ایھا النبی کا خطاب اس جہت سے ہے کہ حقیقت محمدیہ موجودات کے ذروں اور ممکنات کے افراد میں سرایت کئے ہوئے ہے، تو حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نمازیوں کی ذاتوں میں موجود اور حاضر ہیں، نمازی کو چاہئے کہ اس سے باخبر رہے اور اس شہود سے غافل نہ ہوتا کہ انوار قرب واسرار معرفت کے ساتھ متنور وفائض ہو؛

حاصل کلام یہ ہے کہ جب نماز جیسی عبادت مخصوصہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم پر صلوۃ وسلام بھیجنا ندا وخطاب کرنا جائز وداخل عبادت ہے تو یہ صلوۃ جو اذان وتکبیر کے درمیان کہی جاتی ہے اس میں خطاب وندا کس طرح ناجائز وبدعت ہوسکتا ہے۔ اب جو کوئی اس کو ناجائز کہے تو وہ ان کلمات کو تشھد سے نکال دے اور ساری امت کو گمراہ قرار دیکر خود گمراہ وبیدین بنے۔

سائل کی تیسری بات یہ ہے کہ لفظ۔ یا اور ک۔ خطاب سے زندہ کو خطاب کیا جاتا ہے نہ مردہ سے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم زندہ ہیں بحیات دنیوی جسمانی جو خود حدیث شریف

سے ثابت ہے۔

علامہ قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں بیہقی سے بروایت حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ یہ حدیث نقل فرمائی:

ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قال: الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون۔

(مواہب لدنیہ مصری ج ۲ ص ۳۸۹)

رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا کہ انبیائے کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔

تو حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کو زندہ نہ جاننا اور مردہ سمجھنا حدیث شریف کے مخالف ہے۔ العیاذ باللہ تعالی۔ نیز حرف خطاب اور یا ندا سے مردہ کو بھی خطاب کیا جاتا ہے۔ زیارت قبور کی دعاؤں میں بکثرت حرف خطاب و یا ندا وارد ہے۔

ترمذی شریف میں حضرت عباس رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے کہ

مر النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بقبور بالمدینة فاقبل علیهم بوجهه فقال السلام علیکم یا اهل القبور فغفر اللہ لنا ولکم ۔ (الحدیث)

حضور نبی کریم ﷺ مدینہ شریف کے قبرستان میں گذرے تو حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے ان کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ السلام علیکم یا اهل القبور یعنی تم پر سلامتی ہو اے قبر والو، اللہ ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائے۔

تو اگر حرف خطاب اور یا ندا مردہ کے لئے ناجائز ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کبھی خود استعمال نہ فرماتے۔ لہذا ظاہر ہو گیا کہ سائل کی یہ تمام باتیں قرآن وحدیث اور تصریحات مذہب کے خلاف ہیں۔ مولی تعالی منکر کو قبول حق کی توفیق دے؛

حاصل جواب یہ ہے کہ اذان وتکبیر کے درمیان میں صلوۃ کہنا جائز بلکہ مستحسن ہے اور الصلوۃ والسلام علیك یا رسول اللہ ۔ یا اس کے مثل ایسے کلمات جن میں حرف خطاب وحرف ندا ہوں بالکل صحیح ودرست ہیں اور شریعت کے موافق ہیں واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۲۶۔۲۲۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ

(۱) جمعہ میں خطبہ سے پہلے اذان ثانی مسجد سے باہر ہونا سنت ہے یا مسجد کے اندر؟۔

(۲) اذان کہنے کے بعد جماعت کھڑے ہونے کے وقت صلوۃ کہنا کیا ہے؟۔

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

(۱) جمعہ میں اذان کا مسجد کے باہر ہونا سنت ہے۔ ابوداؤد شریف میں ہے جس کے سائب بن یزید رضی اللہ عنہ راوی ہیں:

قال کان یؤذن بین یدی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اذا جلس علی المنبر یوم الجمعة علی باب المسجد و ابی بکر و عمر فلما کان فی خلافة عثمان و کثر الناس امر عثمان یوم الجمعة بالاذان الثالث فاذن به علی الزوراء فثبت الامر علی ذالك ۔ (ابوداؤد مجتبائی ج ۱ ص ۱۶۳)

اس حدیث کا خلاصۂ مضمون یہ ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم بروز جمعہ منبر پر تشریف فرما ہوتے تو دروازۂ مسجد پر حضور کے سامنے اذان دی جاتی تھی اور اسی طرح خلافت اول اور دوم میں ہوتا رہا۔ پھر جب خلافت سوم ہوئی اور لوگ زیادہ ہو گئے تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ نے پہلی اذان کا اور اضافہ کیا تو یہ اذان مقام زوراء (جو بازار میں ایک گھر تھا اس کی چھت) پر کہی جاتی پھر عمل اسی طرح ہوتا رہا)

اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہوئیں۔ ایک بات یہ ہے کہ جمعہ کی اذان اول کا تو حضور اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے زمانہ پاک اور خلافت اول ودوم میں وجود ہی نہ تھا۔ اس کا حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ نے اضافہ فرمایا ہے اور یہ اذان بازار کے ایک گھر زوراء کی چھت پر ہوتی تھی۔ تو یہ اذان مسجد سے کچھ فاصلہ پر ہوتی تھی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ خطبہ والی اذان دوم زمانہ اقدس سے برابر خطبہ سے پہلے دروازۂ مسجد پر منبر کے مقابل ہوتی رہی۔ کسی خلافت میں اس کے اندر کسی طرح کا کوئی تغیر نہیں ہوا اور ظاہر ہے کہ دروازۂ مسجد خارج مسجد ہوتا ہے تو اس اذان کا بھی مسجد سے باہر ہونا سنت قرار پایا۔ اسی

بناپر فقہاء نے مسجد کے اندر اذان کہنا ممنوع ٹھہرایا۔

فتاویٰ قاضی خاں اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

و ینبغی ان یؤذن علی المنارۃ او خارج المسجد و لا یوذن فی المسجد کذا فی فتاوی قاضی خان ۔ (عالمگیری مجیدی ص۲۹)

یعنی منارہ یا خارج مسجد میں اذان کہنا مستحب ہے اور مسجد میں اذان نہ کہی جائے۔

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ اذان مسجد میں کہنا ممنوع ہے اور حکم تمام اذانوں کو عام ہے تو جمعہ کی یہ اذان دوم بھی اسی حکم میں داخل ہے۔ پھر جو اس کو اس میں داخل نہ مانے اور اس کو مسجد میں بلا کراہت جائز جانے وہ دلیل خصوص اپنے دعوی پر قائم کرے۔ اب رہا رواج کو دلیل ٹھہرانا تو ایسا رواج حجت شرعی نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) اذان کے کچھ دیر بعد دوسرے اعلان کو تثویب کہتے ہیں۔ فقہاء کرام نے اس تثویب کو جائز قرار دیا جس کی تصریح اکثر کتب فقہ میں موجود ہے۔ لیکن اس کے لئے کوئی خاص الفاظ مقرر نہیں۔ بلکہ اس کو ہر مقام کے عرف پر موقوف کیا گیا ہے۔ اور تثویب میں صلاۃ وسلام کے الفاظ ۷۸۱ھ میں جاری ہوئے۔ فقہاء نے انہیں بہتر و مستحسن قرار دیا ہے۔

فقہ کی مشہور کتاب درمختار میں ہے:

التسلیم بعد الاذان حدث فی ربیع الاخر سنة سبعمائة و احدی و ثمانین فی عشاء لیلة الاثنین ثم یوم الجمعة ثم بعد عشر سنین حدث فی الکل الا المغرب ثم فیها مرتین و هو بدعة حسنة ۔ (ردالمحتار مصری ج۱ ص۲۷۳)

یعنی اذان کے بعد صلوٰۃ وسلام کی بنا ربیع الاخر ۷۸۱ھ کی شب دوشنبہ کی نماز میں شروع ہوئی۔ پھر جمعہ کے دن میں۔ پھر دس سال بعد سوائے مغرب کے سب نمازوں میں شروع ہوا۔ پھر مغرب میں بھی دو بار۔ تو یہ صلوٰۃ وسلام بدعت حسنہ یعنی امر مستحسن ہے۔ لہٰذا اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ اذان کے بعد جماعت کے کھڑے ہونے سے کچھ دیر پہلے صلوٰۃ وسلام کہنا نہ فقط جائز بلکہ مستحسن ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۲۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ اذان کے کلمات کا جواب دینا کیسا ہے؟۔ موذن کے حی علی الصلوۃ، حی علی الفلاح۔ الصلاۃ خیر من النوم کے عوض کیا کہنا چاہئے؟۔ اور تکبیر کے کلمات کا جواب دینا بھی چاہئے؟۔ اگر جواب دیا جائے تب قد قامت الصلوۃ کے جواب میں کیا کہنا چاہئے؟۔ ہاں اذان کے بعد دعا پڑھنے سے پہلے درود شریف پڑھنا بھی آیا ضروری ہے یا اختیاری یا کیسا ہے؟۔

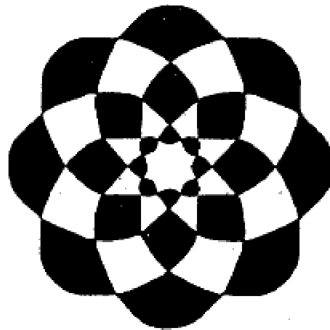
ح۔م۔ اشرفی ۲۵ ر اکتوبر

الجواب

اللهم هداية الحق و الصواب

اذان کے کلمات کا جواب مستحب بلکہ سنت ہے اور حی علی الصلوۃ وحی علی الفلاح کے جواب میں لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہنا چاہئے۔ تکبیر کے کلمات کا جواب دینا مسنون نہیں۔ دے سکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل





باب ارکان الصلوۃ

مسئلہ (۲۲۹)

جناب مفتی جی صاحب ہادی دین وجامع علوم ظاہری ومنبع فیوض باطنی بعد مسنون السلام علیکم کے واضح ہو کہ آپ برائے مہربانی مسائل ذیل کے جواب باقاعدہ مہر کے تحریر فرمادیئے جائیں عین مہربانی ہوگی۔ بندہ کو ممنون ومشکور فرمائیگا (نوٹ) خط صاف ہوتا کہ پڑھنے میں مشکوکی نہ ہو۔

اگر نمازی کے نماز پڑھنے میں کوئی دوسرا شخص آگے ہو کے گذر جائے تو وہ گنہگار ہوا یانہیں اور نماز نماز پڑھنے والے کی باطل ہوئی یانہیں؟۔ اگر قصداً گذر جائے تو اور سہواً گذر جائے ہر طرح کی تفصیل کر دیجئے گا۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

نمازی کے سامنے سے سہواً گذرنے والے تو گنہگار ہی نہیں۔ ہاں قصداً گذرنے والا سخت گنہگار ہے، بہرصورت اس سے نمازی کی نماز باطل نہیں ہوئی۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۳۰)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

امام نے نماز پڑھائی مقتدی نے اپنے غلط خیال سے یا بھول سے لقمہ دیا لیکن امام نے اپنے صحیح خیال کے مطابق مقتدی کا لقمہ رد کرتے ہوئے نماز ختم کی۔ تو اس لقمہ دینے سے مقتدی کی نماز میں نقص ہوا یانہیں؟۔ اگر نقص ہو تو نماز کے اعادہ کی ضرورت ہے یانہیں؟۔ بینوا توجروا۔

مستفتی، مولوی محمد عبداللہ خان نگینہ مسجد تالاب محلہ اون ضلع ایوب محل

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

اپنے امام کو بوقت حاجت لقمہ دینے سے مقتدی کی نماز میں کوئی نقص نہیں آتا اگرچہ لقمہ دینے میں اس سے سہواً غلطی ہوگئی ہو اس کو نماز کے اعادے کی بھی حاجت نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

۱۵ شوال ۱۳۷۷ھ

مسئلہ (۲۳۱-۲۳۲-۲۳۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ان تین مسئلوں میں

(۱) رمضان المبارک میں قرآن کریم کی اجرت دیکر سننا کیسا ہے؟۔

(۲) زید کہتا ہے کہ نماز پڑھانے کی اجرت نہیں لینی چاہئے اگرچہ امام کا ذریعہ معاش یہی ہو تو امام کو کیا کرنا چاہئے؟۔

(۳) اگر حافظ درکار ہو تو جانے آنے کا خرچ ودیگر خرچ طے کرسکتا ہے یانہیں؟۔

حسن پور دوئم

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

(۱) رمضان المبارک میں قرآن کریم کا اجرت دیکر سننا ممنوع ہے۔ اس کے جواز کے لئے وقت کی اجرت مقرر کی جائے اور اس وقت میں قرآن شریف پڑھوایا جاسکتا ہے تو یہ اجرت قرآن کریم کی نہیں بلکہ وقت کی ہوئی فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) نماز پڑھانے کی اجرت دینا اور لینا بلاشبہ جائز ہے۔ ہدایہ وغیرہ کتب فقہ میں یہ مسئلہ موجود ہے اور متاخرین فقہاء نے امامت کی اجرت کے جواز کا فتوی دیا ہے فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) جو حافظ دور کا رہنے والا ہو وہ اپنے جانے اور آنے کے اخراجات یقیناً طے کرسکتا ہے۔
واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۳۴)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی ارشدنا الی الملۃ الحنفیۃ والصلوۃ والسلام علی خیر الانبیاء سیدنا محمد النبی الامی وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

لو فرغ الامام من الصلوۃ وتذکر ان ما صلاہ خمسۃ رکعات فی ذوات الاربع وتشھد فی القعدۃ الاولی وسھا عن القعدہ الاخیرۃ فھل یفسد صلاتہ ویجب علیہ اعادۃ الصلوۃ ام لا ؟۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

الحمد للہ الذی اوضح علینا الملۃ البیضاء وسھل لنا طریقنا بالارشاد والاھتداء وجعل لنشرھا رجالا بالافتاء واوجب علی طالبیھا الاستفتاء ۔ والصلوۃ والسلام علی صاحب الجود والعطاء ، ماحی الذنوب والخطاء ، سید الاولیاء ، نبی الانبیاء ، سیدنا محمد الذی ھو باعث تخلیق الکون بلاامتراء ، وعلی آلہ الذین ھم کالسفینۃ علی وجہ الماء ، وعلی اصحابہ الذین ھم کالنجوم علی افق السماء ، وعلی جمیع الاصفیاء والاتقیاء ، وعلی سائر الفقھاء ، وعلینا معھم الی یوم الجزاء ۔

امابعد فاجیب عن السوال ان سھا عن القعدۃ الاخیرۃ فی ذوات الاربع وزاد الرکعۃ الخامسۃ بطل فرضہ وتحول فرضہ نفلا وعلیہ اعادۃ الفرض کذا فی الدر المختار والغنیۃ والطحطاوی ورد المحتار وغیرھا ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۳۵)

ھل للمصلی ان یفرج بین قدمیہ اکثر من اربع اصابع وکم من مقدار یکون بین القدمین ؟ ۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

یسن فی القیام تفریج القدمین قدر اربع اصابع الید لانہ اقرب الی الخشوع ھکذا فی الطحطاوی وروی عن ابی نصر الدبوسی انہ کان فعلہ کذا فی الکبری صرح بہ العلامۃ الشامی فی رد المحتار واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۳۶)

لو رفع المصلی رجلیہ فی السجود بعد الطمانیۃ فھل تفسد بہ الصلوہ ام لا ؟ ۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

رفع الرجلین فی السجود بعد الطمانیۃ غیر مفسد الصلوۃ لانہ وضع اصابعھما علی الارض قدر تسبیحۃ واستقر کل عضو فی محلہ بقدر الفرض والمفروض من الرکن ادنی ما یطلق علیہ اسم الفرض فیحصل بھذا القدر فرضیۃ السجود ووجوبہ لکنہ مکروہ لان التسبیح فیہ سنۃ لقولہ علیہ السلام اذا سجد احدکم فلیقل سبحان ربی الاعلی ثلاث مرات وذالک ادناہ فترکہ او نقصہ مکروہ کماھو مصرح فی کتب الفقہ : واللہ اعلم بالصواب ۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

(۱)لا يجب عليه التشهد بعد فراغ امامه لان المسبوق متفرد بعد سلام الامام فلا يبقى عليه متابعة الامام فيقضى ما فات من صلوته والله تعالى اعلم بالصوب ۔

(۲)يستانف الصلوة لترك الواجب ولا يجبر النقصان بسجدة السهو والله تعالى اعلم ۔

(۳)نعم يجب عليه استينا ف الصلوة لترك الواجب وهو تعقيب التشهد للقيام بلا فاصل حتى لو سكت يلزمه السهو صرح به فى رد المحتار والله تعالى اعلم بالصوب ۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۴۳)

کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع ان مسائل میں کہ
بیٹھ کر نماز پڑھنے میں ایڑی کو رکوع میں سرین سے علیحدہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ ۔

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

رکوع میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کی حالت میں جھکنے کی انتہا تصریحات کتب فقہ سے اس قدر ثابت ہے:

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

فان ركع جالسا ينبغى ان تحاذى جبهته ركبتيه ليحصل الركوع ولعل مراده انحناء الظهر عملا بالحقيقة لا انه يبالغ فيه حتى يكون قريبا من السجود له ۔
(طحطاوی مصری ص ۱۳۳ ج ۱)

اگر بیٹھ کر رکوع کیا تو لائق یہ ہے کہ اپنی پیشانی کو اپنے دونوں گھٹنوں کے مقابل کرے تاکہ رکوع حاصل ہو۔ اس سے مراد پشت کا جھکانا ہے حقیقت پر عمل کرتے ہوئے نہ یہ بات کہ رکوع میں اتنا مبالغہ کر

ے کہ سجدہ کے قریب ہوجائے۔

علامہ ابن عابدین برجندی سے ردالمحتار میں ناقل ہیں:

لو كان يصلى قاعدا ينبغى ان يحاذى جبهته قدام ركبتيه فيحصل الركوع اه۔
قلت ولعله محمول على تمام الركوع والا فقد علمت حصوله باصل طأطأة الرأس اى مع انحناء الظهر ۔ (ردالمحتار مصری ص ۳۱۳ ۔ ج ۱)

اگر بیٹھ کر رکوع کیا تو لائق یہ ہے کہ اپنی پیشانی کو اپنے دونوں گھٹنوں کے مقابل کرے تاکہ رکوع حاصل ہو۔ میں کہتا ہوں شاید کہ اسے تمام رکوع پر حمل کیا جائے ورنہ تو نے جان لیا کہ رکوع کا حصول پشت کے جھکانے اور سر کے نیچے کرنے سے ہوجاتا ہے۔

میری نظر میں ایڑی کو سرین سے جدا کرنیکی کوئی تصریح نہیں ہے۔ لیکن ان عبارات پر غور کرنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بیٹھنے کی حالت میں رکوع کی فرضیت تو صرف پشت کے جھکا دینے سے ادا ہوجائیگی اور اس جھکنے کی انتہا یہ ہے کہ پیشانی کو گھٹنوں کے مقابل کردیا جائے اور یہ تقابل سرین کو ایڑی سے جدا کئے ہوئے بھی حاصل ہوجاتا ہے۔ تو پھر سرین کو ایڑی سے علیحدہ کرنیکی کونسی ضرورت داعی ہے۔ نیز اگر سرین کو ایڑی سے جدا کر کے پیشانی کو گھٹنے کے مقابل کیا جاتا ہے تو اقرب من السجود ہوجاتا ہے اور اس کی ممانعت عبارت طحطاوی سے گزری۔ اور سرین کو ایڑی سے بغیر جدا کئے ہوئے جب پیشانی کو گھٹنوں کے مقابل کیا جاتا ہے تو ہیت سجدہ سے بالکل امتیاز ہوجاتا ہے اور رکوع سجود کا امتیاز شرعا مطلوب ہے۔

طحطاوی میں ہے: وجعل ايمائه للسجود اخفض من ايمائه للركوع تميزا بينهما۔

تو مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرین کو ایڑی سے جدا نہ کیا جائے۔ معہذا اس میں کسی حکم شرعی کی مخالفت بھی لازم نہیں آتی ہے تو بلا کسی تصریح کے کس طرح سرین کو ایڑی سے جدا کرنے کا حکم دیا جائے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

الجواب

اللھم ھدایة الحق والصواب

(۱) لا یجب علیه التشهد بعد فراغ امامه لان المسبوق متفرد بعد سلام الامام فلا یبقی علیه متابعة الامام فیقضی ما فات من صلوته والله تعالی اعلم بالصوب۔

(۲) یستانف الصلوة لترك الواجب ولا یجبر النقصان بسجدة السهو والله تعالی اعلم۔

(۳) نعم یجب علیه استینا ف الصلوة لترك الواجب وهو تعقیب التشهد للقیام بلا فاصل حتی لو سکت یلزمه السهو صرح به فی رد المحتار والله تعالی اعلم بالصوب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سیدکل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۴۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع ان مسائل میں کہ
بیٹھ کرنماز پڑھنے میں ایڑی کو رکوع میں سرین سے علیحدہ کرنا چاہیے یا نہیں؟۔

الجواب

اللھم ھدایة الحق والصواب

رکوع میں بیٹھ کرنماز پڑھنے کی حالت میں جھکنے کی انتہا تصریحات کتب فقہ سے اس قدر ثابت ہے:

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

فان رکع جالسا ینبغی ان تحاذی جبهته رکبتیه لیحصل الرکوع ولعل مراده انحناء الظهر عملا بالحقیقة لا انه یبالغ فیه حتی یکون قریبا من السجود له۔
(طحطاوی مصری ص ۱۳۳ ج ۱)

اگر بیٹھ کر رکوع کیا تو لائق یہ ہے کہ اپنی پیشانی کو اپنے دونوں گھٹنوں کے مقابل کرے تاکہ رکوع حاصل ہو۔ اس سے مراد پشت کا جھکانا ہے حقیقت پر عمل کرتے ہوئے نہ یہ بات کہ رکوع میں اتنا مبالغہ کر

ے کہ سجدہ کے قریب ہوجائے۔

علامہ ابن عابدین برجندی سے ردالمحتار میں ناقل ہیں:

لو کان یصلی قاعد اینبغی ان یحاذی جبهته قدام رکبتیه فیحصل الرکوع اه۔
قلت ولعله محمول علی تمام الرکوع والا فقدعلمت حصوله باصل طأطأة الراس ای مع انحناء الظهر۔
(ردالمحتار مصری ص ۳۱۴ ج ۱)

اگر بیٹھ کر رکوع کیا تو لائق یہ ہے کہ اپنی پیشانی کو اپنے دونوں گھٹنوں کے مقابل کرے تاکہ رکوع حاصل ہو۔ میں کہتا ہوں شاید کہ اسے تمام رکوع پر حمل کیا جائے ورنہ تو نے جان لیا کہ رکوع کا حصول پشت کے جھکانے اور سر کے نیچے کرنے سے ہوجاتا ہے۔

میری نظر میں ایڑی کو سرین سے جدا کرنیکی کوئی تصریح نہیں ہے۔ لیکن ان عبارات پر غور کرنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بیٹھنے کی حالت میں رکوع کی فرضیت تو صرف پشت کے جھکا دینے سے ادا ہو جائیگی اور اس جھکنے کی انتہا یہ ہے کہ پیشانی کو گھٹنوں کے مقابل کردیا جائے اور یہ تقابل سرین کو ایڑی سے جدا کئے ہوئے بھی حاصل ہوجاتا ہے۔ تو پھر سرین کو ایڑی سے علیحدہ کرنیکی کونسی ضرورت داعی ہے۔ نیز اگر سرین کو ایڑی سے جدا کرکے پیشانی کو گھٹنے کے مقابل کیا جاتا ہے تو اقرب من السجود ہوجاتا ہے اور اس کی ممانعت عبارت طحطاوی سے گزری۔ اور سرین کو ایڑی سے بغیر جدا کئے ہوئے جب پیشانی کو گھٹنوں کے مقابل کیا جاتا ہے تو ہیئت سجدہ سے بالکل امتیاز ہوجاتا ہے اور رکوع سجود کا امتیاز شرعا مطلوب ہے۔

طحطاوی میں ہے: وجعل ایمائه للسجود اخفض من ایمائه للرکوع تمیزا بینهما۔
تو مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرین کو ایڑی سے جدا نہ کیا جائے۔ معہذا اس میں کسی حکم شرعی کی مخالفت بھی لازم نہیں آتی ہے تو بلا کسی تصریح کے کس طرح سرین کو ایڑی سے جدا کرنے کا حکم دیا جائے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سیدکل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۴۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
امام مغرب کی پہلی دو رکعات میں سے ایک میں بعد سورۃ فاتحہ کے سورۃ فیل "طیرا ابابیل" تک پڑھا اور اس کے بعد رکوع کرلیا تو یہ نماز صحیح ادا ہوگئی یا اس میں کوئی نقصان باقی رہ گیا؟ بینوا توجروا

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

سورۃ فاتحہ کے بعد تین چھوٹی آیتوں یا ایک ایسی آیت جو تین چھوٹی آیات کے برابر ہو اس قدر قراۃ کا پڑھنا صحت نماز کے لئے کافی ہے۔ فقہ کی مشور کتاب درمختار میں ہے:
وضم سورۃ الکوثر اوما قام مقامھا وھو ثلث آیات قصار نحو ثم نظر، ثم عبس وبسر، ثم ادبر واستکبر۔ وکذا لو کانت آیات او الآیتان تعدل ثلث قصار۔
شامی میں ہے: وان قرأ ثلث آیات قصار او کانت الآیات او الا یتان تعدل ثلث آیات قصار خرج عن حد الکراھۃ المذکورۃ یعنی کراھۃ التحریم "
اور صورت مسئولہ میں جب امام نے سورۃ فیل کو "طیرا ابابیل" تک پڑھ لیا ہے تو تین آیتیں پوری ہوگئیں۔ تو نماز کے صحیح ادا ہونے میں کوئی شک ہی باقی نہیں۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل
۲۶ رشوال المکرم ۱۳۷۰ھ

مسئلہ (۲۴۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
نماز پڑھتے وقت خیال کس طرف ہونا چاہئے اور نگاہ کس مقام پر ہونا چاہئے اور آنکھیں بند کر کے نماز پڑھنا چاہئے یا نہیں؟ اور اگر چاہئے تو بھی کس طریقے سے اور آنکھیں کھول کر پڑھنے سے کیا تصور کریں؟ صاف صاف تحریر کیجئے۔ بینوا توجروا۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

نماز میں آنکھیں کھلی ہوئی رکھی جائیں۔ اور نگاہ قیام میں سجدہ کی جگہ کی طرف۔ اور رکوع میں قدم کی پشت کی طرف۔ اور سجدہ میں ناک کی طرف اور قاعدہ میں گود کی طرف۔ اور پہلے سلام میں داہنے کندھے کی طرف اور دوسرے سلام میں بائیں کندھے کی طرف رکھے۔ اور آنکھوں کو بند رکھنا مکروہ ہے۔ مگر جب آنکھیں کھلی ہوئی رکھنے میں خیالات منتشر ہوتے ہوں اور خشوع نہ ہوتا ہو تو انہیں بند رکھ سکتا ہے بلکہ ایسے شخص کے لئے اولی یہ ہے کہ انہیں بند ہی رکھے۔ ھذا کلہ فی رد المحتار"
اب باقی رہا خیال تو اس کی پوری توجہ اللہ تعالی ہی کی طرف رہے۔ اور ارکان نماز ادا کرنے میں حضور ﷺ کے افعال کی مطابقت کا پورا خیال رکھے اور قرأت وتشہد اور درود شریف میں حضور ﷺ کی جانب توجہ کرے کہ وہ درگاہ میں واسطہ ہیں۔ اور حضور کی طرف خیال کا لے جانا اللہ تعالی کی طرف خیال لے جانے کے منافی نہیں ہے۔ جیسے حضور کی اطاعت اور اللہ تعالی کی اطاعت کا ذکر قرآن کریم میں ہے: " ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ "
حدیث قدسی میں ہے:
" جعلت ذکرا من ذکری فمن ذکرک ذکرنی " نقلہ القاضی فی شفائہ۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۴۶)

یہاں اصل میں استفتاء اور جواب نہیں بلکہ صرف جواب الجواب ہی لکھا ہے۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے دیوبندیوں سے چلتی ریل میں نماز پڑھنے کے بارے میں سوال کیا تو جواب میں مولوی مظفر حسین مظاہری نے صرف اتنا لکھ دیا کہ اس میں اختلاف ہے، اور اسی طرح کی لایعنی چیزیں تھیں جن کی جانب اس فتوی میں اشارہ ہے اور ساتھ ہی ان کا رد بھی۔

جواب الجواب:

الحمد لله و كفى ـ والصلوة على من اصطفى ـ ان مفتیان سہارنپور کے جواب کو دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ ان کو نہ فقہ سے کوئی علاقہ ۔نہ احکام رسم المفتی سے کچھ واسطہ۔اور ان میں نہ مسئلہ سمجھنے کی لیاقت ۔نہ سوال کے جواب دینے کی صلاحیت ۔ہر اردوخواں جانتا ہے کہ سائل یہ دریافت کررہا ہے کہ چلتی ریل گاڑی میں فرض نماز ادا ہوگی یا نہیں۔مجیب اس کے جواب میں لکھتا کہ فرض نماز ادا ہوجائے گی یا ادا نہ ہوگی ۔یعنی کسی ایک صورت پر حکم قطعی دیتا۔اور اس پر کوئی حوالہ کتاب نقل کردیتا۔لیکن وہ اپنی قابلیت کا اس طرح اظہار کرتا ہے۔

اس مسئلہ پر جب ریل جاری ہوئی تھی علماء میں اختلاف تھا کہ اس میں نماز جائز ہے یا نہیں ۔

اولا:اس عبارت میں ریل میں نماز پڑھنے کا اگر یہ مطلب ہے کہ ٹھہری ہوئی ریل میں تو اس کے لئے یہ کہنا جھوٹ اور غلط ہے ۔کہ اس مسئلہ پر علماء میں اختلاف تھا۔اس کے آگے مجیب خود یہ اقرار کرتا ہے۔

اگر ریل گاڑی ٹھہری ہوئی ہے تب تو بالاتفاق سب کے نزدیک نماز درست ہے۔

تو مجیب کی کون سی بات صحیح ہے اور کونسی باطل۔

ثانیا:اگر ریل میں نماز پڑھنے کا یہ مطلب ہے کہ چلتی ریل میں نماز پڑھنے پر علما کا اختلاف تھا تو اس میں دریافت طلب امر یہ ہے کہ علماء سے علمائے اہل سنت وعلمائے وہابیہ کے مابین کا اختلاف مراد ہے؟۔یا صرف علمائے اہلسنت کے مابین کا اختلاف ہے؟۔یا فقط علمائے وہابیہ کے مابین کا اختلاف؟۔

ثالثا:اگر صرف علمائے اہلسنت کے مابین کا اختلاف مراد ہے تو مجیب اس کا ثبوت پیش کرے اور یہ بتائے کہ علمائے اہلسنت کا اس میں کیا اختلاف ہے اور اس اختلاف کو کس نے لکھا اور کس کتاب میں کہاں لکھا ہے؟۔اور اگر صرف علمائے وہابیہ کے مابین کا اختلاف مراد ہے تو ان میں کیا اختلاف ہے؟۔اور موافقین کے کیا کیا اسماء ہیں؟۔اور مخالفین کے کیا نام ہیں؟

رابعا:اگر علمائے اہلسنت وعلمائے وہابیہ کے مابین کا اختلاف مراد ہے تو چلتی ریل میں جواز فرائض وواجبات کے مخالف علمائے اہلسنت ہی قرار پاتے ہیں کہ مجیب کا یہ قول

ہمارے مشائخ کی تحقیق یہ ہے الخ۔اس کی کافی دلیل ہے یا نہیں۔

پھر مجیب صاحب تحریر فرماتے ہیں:

اگر ریل گاڑی ٹھہری ہوئی ہے تب تو بالاتفاق سب کے نزدیک نماز درست ہے۔

اولا:سائل اس صورت کا سوال ہی نہیں کررہا ہے تو مجیب کا جواب میں یہ لکھنا سوال از آسمان و جواب از ریسمان جیسا جواب ہے۔

ثانیا:اگر اس عبارت میں الفاظ (بالاتفاق سب کے نزدیک) سے صرف علمائے وہابیہ ہی مراد لیے جاتے ہیں تو پھر آگے کے یہ الفاظ۔ہمارے مشائخ۔آخر کس لئے ہیں۔

ثالثا:اور اگر اس میں صرف علمائے اہل سنت کا اتفاق مراد لیا جاتا ہے تو علمائے وہابیہ کا مسلک اس کے خلاف ثابت ہوا جاتا ہے۔

رابعا:جب ٹھری ہوئی ریل میں نماز جائز ہے تو وہ اسی بنا پر تو ہے کہ وہ مثل سریر موضوع علی الارض ہے۔لہذا ٹھہری ہوئی گاڑی میں نماز پڑھنا گویا زمین پر ہی نماز پڑھنے کے حکم میں ہوا۔تو یہ تعلیل صرف ٹھہری ہوئی گاڑی کی ہوئی یا نہیں؟۔پھر مجیب اس کے بعد لکھتا ہے۔

البتہ چلتی ریل میں نماز پڑھنے میں اختلاف ہے بعض علماء ایسی صورت میں نماز جائز نہیں کہتے۔

اولا:۔ان بعض علماء سے اگر صرف علمائے اہلسنت مراد ہیں تو وہ بعض علمائے اہلسنت کون کون ہیں جو ایسی صورت میں فرائض وواجبات کو جائز نہیں کہتے ہوں؟۔ورنہ اس کو یوں لکھنا تھا کہ کل علمائے اہلسنت ایسی صورت میں نماز جائز نہیں کہتے۔تو کل کو بعض کہنا مغالطہ نہیں تو اور کیا ہے۔

ثانیا:اور اگر بعض علماء سے بعض علمائے وہابیہ مراد ہیں تو وہ بعض آیا مشائخ وہابیہ میں داخل ہیں یا نہیں۔

ثالثا:اگر وہ بعض مشائخ وہابیہ سے نہیں تو ان کا یہ قول باقرار مجیب غیر محقق اور مرجوح قرار پایا یا نہیں؟۔

رابعا:قول مرجوح کا فتوی میں پیش کرنا بحکم رسم المفتی جہالت ہے یا نہیں؟۔

خامسا:اور اگر وہ بعض مشائخ وہابیہ میں داخل ہیں تو پھر مجیب کا یہ لکھنا

ہمارے مشائخ کی تحقیق یہی ہے کہ نماز دونوں صورتوں میں درست ہے۔جھوٹ اور غلط ہوا یا نہیں۔پھر مجیب اس کے بعد لکھتا ہے:

ہمارے مشائخ کی تحقیق یہی ہے کہ نماز دونوں صورتوں میں جائز ہے۔

اولا:اس عبارت میں ہمارے مشائخ سے نہ فقہائے کرام ومصنفین کتب مشہورہ مراد ہوسکتے ہیں

۔اس لئے کہ ان کے زمانہ سابقہ میں ریل جاری نہ ہوئی تھی تو وہ اس کی تحقیق ہی کیوں فرماتے۔ اور نہ ان مشائخ سے علمائے اہلسنت مراد ہوسکتے ہیں کہ علمائے اہلسنت جب دیوبندیوں کو گمراہ و بے دین کہتے ہیں اور دیوبندی انہیں اہل بدعت و شرک لکھتے ہیں۔ تو دیوبندی ان علمائے اہلسنت کو اپنا مشائخ کس طرح قرار دے سکتے ہیں۔ لہذا اب ان مشائخ سے اکابر دیوبند ہی مراد ہوتے ہیں۔ تو یہ ثابت ہو گیا کہ تمام دیوبندیوں کا یہی مسلک ہے کہ اگر فرائض و واجبات چلتی ہوئی اور ٹھہری ہوئی گاڑی کی دونوں صورتوں میں نماز درست ہے۔ مجیب نے اس کو پردۂ اجمال میں کیوں ذکر کیا۔

ثانیا: جب سوال میں یہ اشارہ تھا کہ یہ مسئلہ بریلوی حضرات نے طلب کیا ہے تو مجیب پر لازم تھا کہ اپنے ان مشائخ کی تحقیق کو نقل کرتا۔ اور مخالفین کے سامنے اپنے مشائخ کے دلائل کو پیش کرتا۔ پھر یہ مجیب اپنے اس دعوی پر یہ دلیل قائم کرتا ہے۔

کیوں کہ اگر ریل مثل سریر موضوع علی الارض ہے تو ظاہر ہے کہ نماز درست ہی ہے۔

اولا: مجیب کا دعوی تو یہ ہے کہ چلتی ہوئی ریل میں نماز درست ہے اور دلیل یہ ہے کہ جو تخت زمین پر ایک جگہ رکھا ہوا ہے اس پر نماز درست ہے۔ تو اس دلیل سے دعوی کس طرح ثابت ہوا؟۔

ثانیا: اگر مجیب یہ کہتا کہ ہے کہ چلتی ہوئی ریل اس چلتے ہوئے تخت کی مثل ہے جس کو رسی سے باندھ کر کھینچا جا رہا ہے تو مماثلت بھی پائی جاتی۔ اور دلیل دعوی کو ثابت کر دیتی۔ لیکن مجیب کو یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ جس تخت کو رسی سے باندھ کر کھینچا جائے اور برابر جگہ بدلتی رہے جب بھی اس چلتے ہوئے تخت پر نماز فرض و واجب درست ہے۔

ثالثا: مجیب کا یہ استدلال ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کہے زمین پر چلتے ہوئے نماز پڑھنا درست ہے۔ کیونکہ زمین پر بھی پڑھنا درست ہے۔ تو بتایئے کہ یہ استدلال صحیح ہے یا نہیں؟۔

رابعا: ردالمحتار میں ہے۔" اختلاف المکان مبطل العذر" تو نمازی کے لئے اتحاد مکان شرط ہوا یا نہیں۔ اور چلتی ریل میں اختلاف مکان ہوتا ہے یا نہیں۔

خامسا: ردالمحتار میں ہے:" اتحاد المکان واستقبال القبلة شرط فی صلاۃ غیر النافلة عند الامکان لا یسقط الابعذر۔ اسی میں ہے:" فالتحویل مفسد اذا کان قدر اداء رکن ولو کان فی مکانہ" اور چلتی ہوئی ریل میں کبھی فرض نماز میں قبلہ سے انحراف ہو جاتا ہے تو یہ انحراف مفسد نماز ہے یا نہیں؟۔ اور مجیب اپنی اس دلیل کی تائید میں درمختار کی یہ عبارت پیش کرتا ہے۔ وان لم

یکن طرف العجلة علی الدابة جاز لو واقفة لتعلیلهم انها کالسریر۔

اولا: مجیب نے نقل عبارت میں اتنی غلطی کی کہ" بانها کالسریر" کے بجائے" انها کالسریر" لکھا۔ یعنی با جارہ کو چھوڑ کر عبارت کو بے ربط کر دیا۔

ثانیا: مجیب نے عبارت نقل کر دی لیکن کاش اگر اس عبارت کو سمجھ بھی لیا ہوتا تو ایسی شرمناک غلطی نہ ہوتی۔ مگر بہت ممکن ہے کہ غیر زبان کی عربی عبارت ہے۔ مجیب کی سمجھ میں نہ آئی ہو تو اسکی تفہیم کے لئے پہلے میں اردو میں ترجمہ لکھ دوں اور وہ بھی مجیب ہی کے پیشوا مولوی احسن نانوتوی کا ترجمہ۔

چنانچہ غایۃ الاوطار ترجمہ درمختار میں اس کا ترجمہ یہ ہے۔

اور اگر گاڑی کا سر بیل وغیرہ پر نہ ہو تو نماز اس میں جائز ہے اگر وہ کھڑی ہو چلتی نہ ہو بہ سبب علت بیان کرنے فقہا کے کہ زمین پر کھڑی ہوئی گاڑی مثل تخت کے ہے۔

(غایۃ الاوطار کشوری ص ۳۲۳ ج ۱)

کہیے مجیب صاحب اب یہ اردو ترجمہ دیکھ کر تو آپ کی سمجھ میں بھی آ گیا ہوگا کہ یہ عبارت در مختار کھڑی گاڑی کے لئے ہے نہ کہ چلتی گاڑی کے لئے۔ اب آپ خود ہی بتائیں کہ اس عبارت کو اپنے دعوے کے ثبوت میں نقل کرنا جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔

ثالثا: اس عبارت سے ثابت ہوا کہ فقہاء کرام نے تو زمین پر کھڑی ہوئی گاڑی کو مثل تخت قرار دیا ہے اور مجیب نے اس کے مقابلہ میں چلتی ریل گاڑی کو مثل تخت ٹھیرا کر اپنے مجتہد ہونے کا اعلان کیا ہے۔

رابعا: اس عبارت میں" جاز لو واقفة" کی جب تصریح موجود ہے تو چلتی ریل گاڑی میں جواز صلوۃ کا حکم اس عبارت کے کونسے لفظ سے ثابت ہو رہا ہے۔

خامسا: فقہائے کرام نے جس گاڑی کو مثل تخت کے قرار دیا ہے تو وہ اسی بنا پر تو ہے کہ تخت چار پایوں پر زمین پر قائم ہے اسی طرح گاڑی بھی چار پہیوں پر زمین پر قائم ہے۔ اب باقی رہا گاڑی کا چلنا اس کی تخت سے مماثلت کس بنا پر ہے۔ پھر اس عبارت کے بعد مجیب نے شامی کی یہ عبارت پیش کی۔

قولہ لو واقفة کذا قیدہ فی شرح المنیة ولم اره لغیره یعنی اذا کانت العجلة علی الارض ولم یکن شئ منها علی الدابة وانما بها حبل مثلا تجرها الدابة تصح الصلوۃ علیها لانه حینئذ کالسریر الموضوع علی الارض ومقتضی هذا التعلیل انها لو کانت سائرة فی هذه الحالة لا تصح الصلوۃ علیها بلا عذر وفیه تامل لان جرها بالحبل وهی علی الارض

لا یخرج بہ عن کونہا علی الارض ویفیدہ عبارۃ التتار خانیۃ ۔شامی ۔

اقول: اولا: مجیب سے نقل عبارت میں دوغلطیاں ہوئیں ۔ایک تو " تجرھا الدابۃ " کے بعد لفظ " بہ " کو چھوڑ گیا ۔دوسرے اسی سطر میں "لانہا" کے بجائے " لانہ" لکھ دیا ہے ۔تو مجیب نے یہ غلطیاں قصداً کیں ہیں یا سہوا؟۔

ثانیا: چار پہیے والی گاڑی کو اگر کھینچا جائے تو اس میں شک نہیں کہ وہ زمین ہی پر رہی لیکن جب وہ چل رہی ہے تو اس سے اختلاف مکان برابر ہوتا چلا جارہا ہے اور اتحاد مکان شرائط نماز سے ہے ۔شامی میں مجیب کی پیش کردہ عبارت کے بعد ہی اسی بحث میں ہے ۔

اتحاد المکان واستقبال القبلۃ شرط فی صلاۃ غیر النافلۃ عندالامکان لایسقط الا بعذر فلو امکنہ ایقافہا مستقبلا فعل۔

تو چلتی ہوئی ریل میں شرط صلاۃ یعنی اتحاد مکان کا فوت ہونا فرائض وواجبات کو مجیب کی پیش کردہ عبارت سے کس طرح جائز ودرست کردیگا۔

ثالثا: اسی طرح چلتی ریل میں دوسری شرط صلاۃ استقبال قبلہ کا بدل جانا انہیں کس بنا پر درست وصحیح کردیگا۔

رابعا: علامہ شامی نے عدم قید کی بنا پر ایک احتمال کا استفادہ کیا لیکن اس کو فتامل کہہ کر اس پر جزم نہ فرمایا تو جواز کے لئے حکم قطعی کس طرح حاصل ہوا۔

خامسا: علامہ شامی نے عبارت مذکورہ جواب کے چند سطر بعد فرمایا: "قلت بقی لو امکنہ الایقاف دون الاستقبال فلا کلام فی لزومہ" تو یہ عبارت چلتی ریل میں واجب وفرض نماز کی صحت ثابت کرتی ہے یا عدم صحت ۔

سادسا: علامہ شامی کا آخر بحث میں یہ فرمانا ۔ والظاہر ان الاول اولی لان الضرورۃ تتقدر بقدرھا فتامل اسکا کیا مطلب ہے ۔اور یہ چلتی ریل میں نماز کے مجوزین کے لئے مفید ہے یا مانعین کے لئے ۔پھر مجیب اپنا فتوی اس عبارت پر ختم کرتے ہیں ۔

اور اگر مثل عجلہ محمولہ علی الدابہ مانی جائے تو تب بھی بوجہ عذر کے چلتی ریل میں اتر نہیں سکتا اسی میں نماز پڑھنا درست ہے ۔اما الصلاۃ علی العجلۃ ان کانت طرف العجلۃ علی الدابۃ وھی تسیر او لا تسیر فتجوز فی حالۃ العذر الخ شامی واللہ اعلم بالصواب ۔

کتبہ مظفر حسین مظاہری دارالافتا مدرسہ مظاہر علوم ۔سہارن پور

الجواب صحیح سعید احمد غفرلہ مفتی مظاہر العلوم ۱۱۔۲۲۔۶۳ھ

اولا: شامی میں یہ عبارت بلفظہ کہاں ہے ہاں درمختار کی یہ عبارت ہوسکتی ہے ۔

ثانیا: اور اگر یہ درمختار ہی کی عبارت ہے تو اس میں ایک غلطی یہ ہے کہ 'ان کانت' کے بجائے 'ان کان' ہے اور دوسری غلطی یہ ہے کہ 'لا تسیر' کے بعد 'فتجوز فی حالۃ العذر' کو لکھ دیا اور درمیان میں 'فھی صلاۃ علی الدابۃ' کو مجیب نے کیوں چھوڑ دیا ۔تو یہ نقل عبارت میں تحریف ہے یا نہیں ۔

ثالثا: ریل گاڑی کی بعض بوگی چار پہیوں پر اور بعض آٹھ پہیوں پر زمیں پر قائم ہے اسی بنا پر وہ مثل سریر موضوع علی الارض کے حکم میں ہے تو وہ مثل عجلہ محمولہ علی الدابہ کس طرح ہوسکتی ہے ۔

رابعا: عجلہ محمولہ علی الدابہ وہ گاڑی ہے جو خود زمین پر قائم ہو ۔اگر اس میں دو پہیے ہوں تو اس کا جوا وغیرہ جانور پر ہو ۔تو ریل کی بوگی کو اس کی مثل کس نے مانا ہے ۔غالباً مجیب کے مشائخ ہی اس کے ماننے والے ہوں گے ۔

خامسا: جب ریل عقلاً ونقلاً کسی طرح عجلہ محمولہ علی الدابہ کے مثل نہیں ہوسکتی تو اس شق کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے اور مجیب کے مسلک کو اس سے کیا قوت پہنچتی ہے ۔

سادسا: جس جانور کا ٹھیرنا ممکن ہو اور وہ چل رہا ہے تو بوجہ اس کے چلنے کے عذر کے کیا اس پر نماز واجب وفرض درست ہے ۔تو اس عبارت کا کیا جواب ہے ۔واذا کانت تسیر لا تجوز الصلوۃ علیہا اذا قدر علی ایقافہا ۔(شامی)

سابعا: جو حکم جانور پر نماز کا ہے وہی عجلہ محملہ علی الارض کا ہے اور جب بقول مجیب ریل گاڑی عجلہ محمولہ علی الدابہ کے مثل ہے تو ٹھہری ہوئی ریل گاڑی پر بھی بلا اترے ہوئے بغیر عذر کے واجب وفرض نماز درست نہ ہوگی تو مجیب نے خود اپنے آپ کو جھٹلا دیا ۔

ثامنا: جب ریل گاڑی ہر نماز کے وقت میں کسی اسٹیشن پر ضرور ٹھہرتی ہے اور معین وقت پر پہنچ جاتی ہے اور کم از کم اتنی دیر ٹھہرتی ہے کہ مسافر چھوٹی سورتوں سے ٹھہری گاڑی میں فرض کی دو رکعتیں پڑھ سکتا ہے اور گاڑی سے اترنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی ۔لہذا مجیب یہ بتائے کہ عذر شرعی کون کون ہے ۔

تاسعاً: جب ریل گاڑی کو مثل عجلہ محمولہ علی الدابہ کے مانا جائے تو چلتی ہوئی اور ٹھہری ہوئی دونوں کا الگ حکم ہوگا کہ نماز حالت عذر میں درست ہوگی اور بلا عذر درست نہ ہوگی تو ٹھہری ہوئی ریل

میں بھی نماز بلا عذر درست نہ ہوئی اور مجیب نے ابتدائے فتوی میں لکھا: اگر ریل گاڑی ٹھہری ہوئی ہے تب تو باتفاق سب کے نزدیک نماز درست ہے۔ تو مجیب کا کونسا حکم حق وصحیح اور کونسا غلط و باطل۔

عاشراً: مولوی احسن نانوتوی لکھتے ہیں۔ اگر وقت باقی رہنے تک توقف کرے اور ریل کے ٹھہرنے پر نماز پڑھے تو یہ صورت احتیاط کی ہے۔ اب مجیب بتائے کہ یہ اس کے مشائخ سے ہیں یا نہیں اور انکا یہ حکم کیسا ہے؟۔

بالجملہ اس فتوی سہارنپور پر اس وقت اپنی عدیم الفرصتی اور لڑکے کی شدید علالت کے باوجود ایک سرسری نظر کر کے تقریباً وتخمیناً پچاس مطالبات پیش کر دئے ہیں۔ اگر مفتی سہارنپور کو اپنے علم وقابلیت کا کچھ زعم بھی ہو اور اپنے فتوے کی صحت کا ادنی خیال بھی ہو اور اپنی غلطیوں کا ذرہ بھر احساس بھی ہو تو ان میرے مطالبات کے معقول اور مدلل جواب دیں تو پھر انشاء اللہ تعالی اس مسئلہ پر کافی ابحاث پیش کر دی جائیں گی اور اگر ان مفتی صاحب نے میرے مطالبات کے جوابات ہی نہ دئے۔ یا دئے تو بغیر مدلل اور نامعقول جوابات دئے تو ان کی غلطی اور عجز کا اعتراف خود انکے فعل سے ظاہر ہو جائے گا۔ مولی تعالی انہیں قبول حق کی توفیق عطا فرمائے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔ ۲۲ر محرم الحرام ۱۳۷۳ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۴۷-۲۴۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

(۱) مکبر تکبیر کس جگہ کھڑے ہو کر پڑھے امام کے بالکل پیچھے یا داہنے بائیں کھڑے ہو کر تکبیر کہے کیا حکم شرع ہے؟۔

(۲) تکبیر ہوتے وقت امام کا مصلے پر ہونا ضروری ہے یا نہیں؟۔ اگر امام مصلے پر نہ ہو اور مکبر تکبیر پڑھے تو کیا حکم شرعی ہے؟۔ بینوا توجروا۔

المستفتی اعجاز احمد پیلی بھیتی عفی عنہ ۱۹ر ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

(۱) مکبر کو بہتر یہ ہے کہ امام کے پیچھے کھڑے ہو کر تکبیر کہے اور اگر وہاں موقع نہ ہو تو امام کے داہنی طرف تکبیر کہنی چاہئے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

(۲) بوقت تکبیر امام کا مصلے پر ہونا ضروری نہیں ہے یہاں تک کہ اگر امام بعد تکبیر کے آیا تو اس تکبیر کو دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں۔

طحطاوی میں ہے: لو حضر الامام بعدها بساعة لا يعيدها ۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

۵ر ربیع الآخر ۵۳ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۴۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

ایک شخص پنج وقتہ فرض نماز کے بعد آواز بلند کلمہ طیبہ کہتا ہے تین بار آواز بلند کلمہ طیبہ ادا کرتا ہے۔ چند اشخاص اس کے اس عمل سے اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کلمہ طیبہ بلند آواز سے کہنا کسی جگہ نہیں آیا۔ صرف دل میں کہنا چاہئے اور اگر کسی جگہ آیا ہے تو ہمیں بتلا دیا جائے تاکہ ہم بھی پڑھیں۔ اس پر کافی اختلاف ہے از روئے شریعت مطہرہ کیا حکم ہے واضح طور پر سیر د جواب سے روشناس کرائیں نیز معتبر کتب، احادیث سے حوالہ جات بھی نقل فرما کر مہر تصدیق ثبت فرمائیں ممنون ومشکور ہوں گا عین نوازش ہوگی۔

(نوٹ) جواب جلد از جلد ارسال فرما کر مشکور فرمائیں کیونکہ یہ وجہ اختلاف شدت سے زور پکڑ رہا ہے زیادہ حد ادب۔ اگر میرے پتہ پر جواب ارسال فرماسکیں تو قبلہ جناب منشی خلیل احمد صاحب بلاری ارسال فرما دیا جائے وہاں سے حاصل کر لیا جائے گا۔

نیاز مند عاقل حسین نائب مدرس مدرسہ کھوٹھی قصبہ بلاری ضلع مراد آباد یوپی

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

پنج وقتہ فرض نمازوں کے بعد باآواز بلند نمازیوں کا ذکر کرنا حدیث شریف سے ثابت ہے۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت ابومعبد رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے:

ان ابن عباس اخبرہ ان رفع الصوت بالذکر حین ینصرف الناس من المکتوبۃ کان علی عهد النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و قال کنت اعلم اذا انصرفوا بتلک اذا سمعتہ ۔ (مسلم شریف ج۱ ص۲۱۷)

کہ انہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ لوگوں کا فرض سے فراغت کے وقت ذکر بآواز بلند کرنا نبی علیہ السلام کے زمانہ میں بھی تھا۔ اور فرمایا میں ذکر سے ان کے نماز ختم کر لینے کو جان لیتا جب ذکر کی آواز سن لیتا۔

اور طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

و یستفاد من الحدیث الاخیر جواز رفع الصوت بالذکر و التکبیر عقیب المکتوبۃ بل من السلف من قال باستحبابہ و جزم بہ ابن حزم من المتاخرین ۔

اور اخیر حدیث سے فرض نمازوں کے بعد ذکر اور تکبیر بآواز بلند کہنے کا جائز ہونا ثابت ہوا۔ بلکہ بعض سلف سے اسکا مستحب ہونا مروی ہے اور متاخرین میں سے حضرت علامہ ابن حزم نے اسی پر جزم کیا ہے۔

اس حدیث شریف اور عبارت فقہ سے ثابت ہو گیا کہ فرض نمازوں کے بعد بآواز بلند ذکر کرنا نہ فقط جائز بلکہ سلف کے نزدیک مستحب ہے بلکہ عمل صحابہ کرام کی بنا پر سنت ہے۔ اور کون نہیں جانتا کہ کلمہ طیبہ افضل الذکر ہے۔ لہذا کلمہ طیبہ کا بھی فرض نمازوں کے بعد بآواز بلند کہنا اسی حدیث شریف اور عبارت فقہ سے ثابت ہو گیا۔ تو جو اب اس کو منع کرے وہ حدیث کا منکر حکم فقہ کا مخالف۔ سنت صحابہ کا دشمن ہے۔ مولیٰ تعالیٰ ایسے شخص کو ہدایت دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۳۰ر جمادی الاول ۱۳۷۳ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

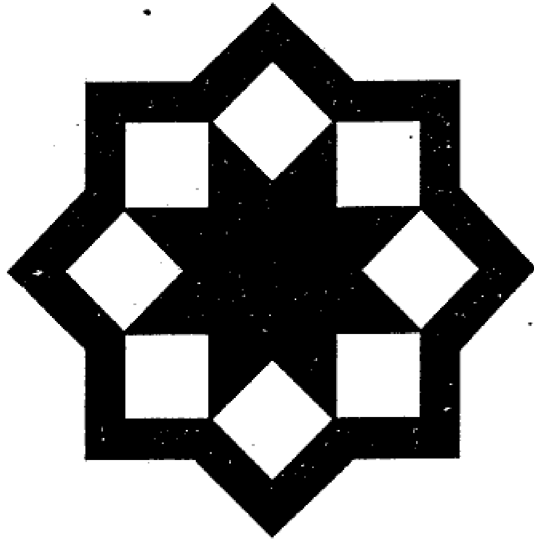
مسئلہ (۲۵۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان شرع عظام دامت برکاتہم مسئلہ ذیل کی بابت
نماز میں سیدھے پاؤں کا انگوٹھا اپنی جگہ قائم رہے، رکوع سجدہ وغیرہ میں بالکل نہ ہٹے۔ کیا یہ شرعا حکم ہے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ سمجھ لیا جائے کہ سیدھے پاؤں کے انگوٹھے میں کیل ٹھونک دی گئی ہے اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتا۔ کیا یہ صحیح ہے؟۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

نماز میں ہر دو پاؤں کے انگوٹھوں اور انگلیوں کو زمین پر نوک سے لے کر جڑ تک لگا رہنا ضروری ہے۔ قعدہ میں بایاں پاؤں جسے بچھا لیا جاتا ہے تو یہ حالت تو مستثنیٰ ہے لیکن صرف سیدھے پاؤں کے انگوٹھے کے زمین پر قائم رہنے کی خصوصیت یہ عوام میں مشہور ہے۔ جس کی کوئی سند نظر سے نہیں گزری۔
واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ **کتبہ** : الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول





باب القرأت

مسئلہ (۲۵۱)

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ
جس طرح الحمد پڑھنے والے لوگ امام کے پیچھے اپنے دلائل صریح صاف صاف حضور ﷺ کی احادیث کے الفاظ سناتے ہیں اور معتبر معتبر احادیث کی کتابوں کے حوالے مستند علماء کے یہاں سے دیتے ہیں جن سے یقین کامل ہوجاتا ہے کہ الحمد پڑھنا مقتدی کو ضرور چاہئے۔ مثلا یہ حدیث پیش کرتے ہیں:
قال رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم: لا صلوة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب خلف الامام ۔ رواه البيهقي في كتاب القرأت صفحه ٤٧ وقال هذا اسناد صحيح ۔
ترجمہ: یعنی فرمایا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے: کہ نہیں نماز ہوئی اس شخص کی جس نے امام کے پیچھے سورہ الحمد نہیں پڑھی۔ روایت کیا اس حدیث کو امام بیہقی نے کتاب القرأۃ میں اور کہا اسناد اس کی صحیح ہے۔ لہٰذا مذہب حنفیہ میں جو مقتدی کو الحمد پڑھنے کی ممانعت ہے یہ کس قاعدہ اور دلیل کی رو سے ہے؟ امید کہ جواب کافی وافی ہونا چاہئے ورنہ لوگوں کے کہنے سے اور بتانے سے چند آدمی اس طرف متوجہ ہوئے جاتے ہیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب

الحمد لله رب العلمين ۔ والصلاة والسلام على افضل المرسلين وعلى اله واصحابه اجمعين

ہندوستان میں امام کے پیچھے بھی الحمد پڑھنے والے بالعموم غیر مقلد ہیں، انھیں احادیث شریفہ سے استدلال کرنے کی کیا لیاقت۔ ائمہ دین جن کے سینے علوم کے بحر مواج تھے انہوں نے کیسی کیسی عرق ریزیاں کیں اور محنتیں اٹھائیں تب اس مرتبہ کو پہنچے کہ آیات کریمہ اور احادیث سے استنباط احکام کرسکیں۔ ان بے خردان زمانہ کو تو ہنوز غالب اور داغ کے اردو کلام سمجھنے کا سلیقہ نہیں، وہ معدن علوم تک کیونکر رسائی

کرسکتے ہیں۔ قرأت خلف الامام ہی کا مسئلہ لیجئے اس میں جس قدر احادیث وارد ہیں اور جو حکم قرآنی ہے سب پر نظر رکھ کر فیصلہ کرنا آج تک نہ کسی غیر مقلد کو میسر آسکا، نہ آسکے الی یوم القیامۃ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ مجبوراً وہی کرتے ہیں کہ جو حدیث ان کے سامنے پیش کردی جائے تو اس کے ماننے ہی میں طرح طرح کے حیلہ حوالے نکالیں خواہ وہ مسلم و بخاری کی حدیث کیوں نہ ہو۔ اور اپنے آپ بیہقی کی روایت لے آئیں اور اس کو معتبر جانیں۔ مجھے یہاں بیہقی پر جرح مدنظر نہیں ہے بلکہ ان کی خود مطلبی ونفسانیت کا ایک نمونہ پیش کرنا ہے کہ جو شخص اپنے مطلب کے موافق سمجھ کر کسی حدیث کو بیہقی سے اخذ کرتا ہے اور بیہقی کی کتاب کو حدیث کی معتبر کتاب مانتا ہے اس کے مخالف مدعی کوئی حدیث کسی دوسری کتاب کی پیش کردی جائے تو اس میں کلام کرنے لگتا ہے، کس قدر نفسانیت ہے۔ العياذ بالله من شرور انفسنا۔

بیہقی کی یہی روایت جس سے استفتاء میں استناد کیا ہے غیر مقلدین جو روایت میں مفہوم مخالف کے قائل ہیں، کیا سمجھ کر پیش کرسکتے ہیں۔ فصحاء کے کلام میں زیادت افادت سے خالی نہیں ہوتی۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے تمام عالم کے فصحاء کو کیا نسبت۔ اب بتائے کہ جس حدیث کو یہ اپنے اپنے مدعیٰ کے لئے دلیل صریح صاف بنا کر پیش کررہے ہیں۔ اس میں کیا اتنے ہی الفاظ اس مطلب کے لئے کافی نہ تھے کہ "لا صلوة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب" کیا اس سے متدل کے نزدیک فرضیت قرأت فاتحہ مستفاد نہیں ہوتی تھی۔ اگر نہیں ہوتی تھی تو کیا لفظ خلف الامام افادہ فرضیت کرتا ہے؟ یہ شاید کوئی مسلوب الحواس کہے تو کہے کوئی عقل وہوش رکھنے والا نہ کہہ سکے گا۔ اگر کہیں کہ "لا صلوة لمن لم تقرء بفاتحة الكتاب" سے فرضیت قرأت فاتحہ ہوتی تھی تو پھر خلف الامام کس فائدہ کے لئے آیا۔ آیا یہ مطلب ہے کہ امام کے پیچھے پڑھنے والے کی نماز تو بغیر فاتحہ پڑھے نہ ہوگی مگر خود امام کی اور منفردوں کی نمازیں بغیر فاتحہ کے ہی ہوجاتی ہیں۔ حدیث نقل کردینا تو آسان تھا مگر ذرا اسے سمجھ کر بھی دکھایئے۔ یا یہ بات ہے کہ حدیث سمجھے یا نہ سمجھے مسائل دین میں دخل دینا اور ائمہ کی مخالفت کرنا روا ہوگیا۔ پھر یہ بتائیں کہ "لا صلوة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب" کا مطلب کیا ہے۔ آیا یہ کہ جس نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھی صرف وہی نماز ناجائز ہے، جب تو یہ بتائیں کہ "لا" کیسا ہے، اور کس چیز کی نفی کرتا ہے۔ اور دلیل خصوص کیا ہے؟ یا مطلب یہ ہے کہ جس نے کبھی امام کے پیچھے فاتحہ ترک کی اس کی عمر بھر کی کوئی نماز ہی صحیح نہ رہی، سب باطل ہوگئیں، عمل ہی حبط ہوئے۔ اگر ایسا کہیں تو کیا ان سے پہلے دنیا میں اور کوئی اس کا قائل ہوا ہے اور جن صحابہ نے امام کے پیچھے قرأت نہ کی ان کی عمر بھر کی نمازیں کیا ہوئیں؟ اور کیا

پچھلی نمازیں جو تمام شرائط وآداب کے ساتھ ادا کی گئی تھیں، ان کی صحت موقوف تھی؟ یا ترک فاتحہ خلف الامام کفر موجب حبط عمل ہے؟ ہر بات دلیل معتبر سے کہیں۔ یہ اور بتاتے چلئے کہ "لاصلوۃ" میں نفی حقیقت کی ہے یا صفت کی یا فضیلت کی۔

برتقدیر اول ثبوت فرضیت خبر واحد محتمل المراد سے لازم " فاللازم باطل فالملزوم مثله " اور یہی مذہب ہے غیر مقلدین کا جیسا کہ الفاظ مندرجہ استفتاء سے ظاہر ہے۔ اور الحمد پڑھنا مقتدی کو ضرور چاہئے بلا پڑھے نماز نہیں ہوتی۔

برتقدیر ثانی فرضیت خلف الامام کس کے گھر سے آئیگی؟ پھر یہ بھی بتائیں کہ فرضیت قرأت خلف الامام میں یہ حدیث مطلق ہے یا مقید، عام ہے یا خاص، اگر خاص یا مقید ہے تو دلیل تقید وتخصیص کیا ہے؟ نیز یہ کہ اس حدیث کی صحت محض بیہقی کی تصحیح سے بطور تقلید شخصی کافی ہے یا اس کی تحقیق کا اور کوئی ذریعہ ہے؟ ہے تو کیا؟

دریافت کرنے کی باتیں تو اور بھی بہت تھیں مگر ائمہ کی تقلید سے بھاگنے والوں کی قلعی انھیں دوچار باتوں میں کھل جائے گی اور پتہ چل جائے گا۔ کہ کلام رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سمجھنے کے لئے ائمہ دین کی تقلید ضروری ہے۔ ورنہ وہ حدیث جس کو غیر مقلد صاف صریح کہتا ہے عمر بھر کی عرق ریزی میں بھی نہ سمجھا سکے گا جب تک کہ ائمہ دین کی تقلید نہ کرے، یا مقلدین سے دریوزہ گری نہ کرے۔ ان سب سے گذر کر میں یہ کہتا ہوں کہ جب قرآن پاک میں رب العزہ عزوجل تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

ایت۔ فاذا قری القرآن فاستمعوا له وانصتوا ۔

یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو سنو اور ساکت رہو۔ خاص مسئلہ قرأت خلف الامام میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اور نہ بھی ہوتی تو اس کا عموم حجت ہے۔ یا کسی صاف صریح آیت کو آپ حدیث سے منسوخ کرنا چاہتے ہیں؟ کیا تمہارے نزدیک آیت حدیث سے منسوخ ہوسکتی ہے اور حدیث بھی خبر واحد، وہ بھی ایسی جس کا مطلب غیر مقلدین کو سمجھنا دشوار۔ اب سنئے اس آیت سے قرأۃ کے وقت سکوت کا وجوب صاف ثابت ہے۔ پہلے تو میں آپ کو اسی بیہقی سے سنواؤں کہ یہ آیت کس معاملہ میں نازل ہوئی ہے۔

امام بیہقی امام احمد سے نقل کرتے ہیں " قال اجمع الناس علی ان هذه الآیة فی الصلوة "
یعنی امام احمد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ آیت نماز کے باب

میں ہے۔

پھر انھیں بیہقی کی روایت سنئے:

حدیث۔ عن مجاهد قال: کان علیه الصلاة والسلام یقرأفی الصلوة فسمع قرأة فتی فنزل واذا قری القرآن فاستمعواله وانصتوا ۔ (جلد۲صفحہ۱۵۵)

مجاہد سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نماز میں قرأت فرماتے تھے تو ایک جوان انصاری کا پڑھنا سنا تو نازل ہوئی یہ آیت۔

واذا قری القرآن فاستمعوا له وانصتوا۔

ملاحظہ ہو کہ قرآن پاک کی آیت قرأت خلف الامام کے روکنے کے لئے نازل ہورہی ہے۔

ابن مردویہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں" عن معاویة بن قرة قال: سألت بعض اشیاخنا من اصحاب رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم قال المسروق: احسبه قال عبدالله بن مغفل قلت له کل من سمع القرآن وجب علیه الاستماع والانصات قال: انما نزلت هذه الآیه واذا قری القرآن فاستمعوا له وانصتوا فی القرآن خلف الامام"

یعنی معاویہ ابن قرہ نے کہا: میں نے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں سے اپنے بعض بزرگوں سے دریافت کیا راوی کہتا ہے: مجھے خیال ہے کہ معاویہ نے عبداللہ ابن مغفل کا نام لیا۔ ان سے دریافت کیا کہ ہر کوئی جو قرآن سنے اس پر سننا اور خاموش رہنا واجب ہے۔ فرمایا: یہ آیت نازل ہی ہوئی ہے قرأت خلف الامام میں۔

امام ابوالبرکات عبداللہ بن محمود نسفی اپنی تفسیر مدارک التنزیل میں فرماتے ہیں:

" جمهور الصحابة رضی الله عنهم علی انه فی استماع الموتم " یعنی جمہور صحابہ اس پر ہیں کہ یہ آیت مقتدی کے قرأت سننے اور خاموش رہنے کے لئے نازل ہوئی۔

ابن مردویہ اور بیہقی نے روایت کیا "عن ابن عباس صلی النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم فقرأ خلفه قوم فخلطوا علیه فنزلت هذه الآیه"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی، قوم نے آپ کے پیچھے قرأت کی۔ اس سے آپ پر قرأت میں خلط واقع ہوا، تو یہ آیت نازل ہوئی۔

عبداللہ بن حمید اور ابوراسخ اور بیہقی ابوالعالیہ سے روایت کرتے ہیں " ان النبی صلی الله

تعالیٰ علیه وسلم كان اذا صلی باصحابه فقرأ من اصحابه فنزلت " یعنی حضور نے جب اپنے اصحاب کو نماز پڑھائی اور قرأت کی تو آپ کے اصحاب نے بھی قرأت کی۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

الحمدللہ عاقل منصف کے لئے مسئلہ تو فیصل ہو گیا کہ جب قرأت خلف الامام کی ممانعت میں ایت نازل ہوئی اور آیت نے مقتدی پر خاموش رہنا واجب کیا اور اس پر جمہور صحابہ نے اجماع فرمایا تو اب مقتدی کے لئے قرأت ثابت کرنے کی ہر کوشش بے کار ہے۔کہ حدیث خبر واحد حکم قرآنی کو ہرگز نہ منسوخ کر سکے گی۔مقتدی کا امام کے پیچھے خاموش رہنا آیت سے ثابت ہو گیا تو اس سے بڑھ کر اور کونسی دلیل ہو گی جس سے غیر مقلدوں کی تسکین ہو سکے۔ضرورت تو نہیں ہے کہ مسئلہ میں تطویل کی جائے مگر چند تائیدات صاف صریح احادیث سے پیش کرتا ہوں۔اللہ تعالیٰ ہدایت فرمائے۔

مؤطا امام محمد رحمۃ اللہ علیہ میں ہے" اخبرنا مالك وحدثنا وهب بن كيسان انه سمع جابر بن عبدالله يقول :من صلی ركعة لم يقرأ فيها بام القرآن لم يصل الاوراء الام

(صفحہ ۷۵)

وہب بن کیسان حدیث بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے جابر بن عبداللہ سے سنا فرماتے تھے: کہ جس شخص نے ایک رکعت پڑھی اس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی تو اس نے نماز ہی نہ پڑھی مگر امام کے پیچھے۔

مشکوٰۃ شریف میں بروایت مسلم لائے ہیں:

عن ابی هريره وقتادة قالا: قال رسول الله صلی الله تعالیٰ عليه وسلم : واذا قرأ فانصتوا " یعنی ابو ہریرہ وقتادہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

حضرت شیخ محقق اس کی شرح میں فرماتے ہیں " هذا دليل علی مذهب ابی حنيفة فی منع قرأة الفاتحة عليه سواء كانت الصلوة جهرية او سرية " یعنی یہ حدیث دلیل ہے مذہب ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مقتدی کو امام کے پیچھے قرأ ت سے منع کرنے اور اس پر فاتحہ کی قرأت کے واجب نہ ہونے میں۔

ابوداؤد،نسائی،ابن ماجہ،احمد،بزار،ابن عدی وغیرہ محدثین روایت کرتے ہیں " عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلی الله تعالیٰ عليه وسلم انما جعل الامام ليوتم به فاذا كبر فكبروا واذا قرأفانصتوا " (نسائی جلد اول صفحہ ۱۴۶)

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے تو وہ جب تکبیر کہے تو تم تکبیر کہو اور جب قرأت کرے تم خاموش رہو۔

مرقات المفاتیح میں اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں " يعنی الائتمام فی القرأة " یعنی اقتدا اور امام کی پیروی قرأت میں خاموش رہنے سے ہوسکتی ہے، نہ کہ پڑھنے میں۔

مؤطا امام محمد رحمۃ اللہ علیہ میں ہے:

عن جابر بن عبدالله قال قال رسول الله صلی الله تعالیٰ عليه وسلم من صلیٰ خلف امام فان قراء الامام له قرأة۔

جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ فرمایا حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے: جس شخص نے امام کے پیچھے نماز پڑھی تو بیشک امام کا قرأت کرنا اس کا قرأت کرنا ہے۔

وفيه ايضاعن وائل قال: سئل عبدالله ابن مسعود عن القرأة خلف الامام قال: انصت فان فی الصلوة شغلا سيكفيك ذالك الامام۔

ابووائل سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود سے قرأۃ خلف الامام کا مسئلہ پوچھا گیا فرمایا : خاموش رہو (یعنی امام کے پیچھے قرأۃ نہ کر) بیشک نماز میں ایک شغل ہے امام کا قرأۃ کرنا تیرے لئے کافی وافی ہے۔

ایضاً: حدیث: ان عبدالله ابن مسعود كان لا يقرأخلف الامام فی ما يجهر فيه وفيما يخافت فيه فی الاولين ولا فی الاخرين۔

یعنی عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے جہری نماز میں نہ سری نماز میں،نہ پہلی دو رکعتوں میں نہ پچھلی دو رکعتوں میں۔

طحاوی نے بروایت علقمہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا:

قال ليت الذی يقرأ خلف الامام ملئی فوه ترابا ۔یعنی جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرے کاش کے اس کا منہ خاک سے بھر دیا جاتا۔

حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال ليت فی فم الذی يقرأخلف الامام حجر۔ یعنی کاش کے امام کے پیچھے پڑھنے والے

زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

انہ قال من قرأ خلف الامام فلا صلوۃ لہ۔

اس قدر احادیث وآثار اور قرآن پاک کی آیت دیکھنے کے بعد کسی منصف کو ذرا بھی تردد نہیں ہوسکتا اور کیونکر ہوسکتا ہے کہ اس سے صاف اور زیادہ صریح اور انتہائی واضح باوجود اجمال کے اور مسئلہ کا کیا انکشاف ہوگا، شریعت میں جو دلائل اصول تسلیم کر لئے گئے ہیں ان سے بالصراحت ثابت ہوگیا۔ اگر میں اس مطلب میں بسط کروں تو اس کے علاوہ بہت سی احادیث پیش کرسکتا ہوں مگر اس وقت اسی قدر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالی معاندین کو ہدایت فرمائے "واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم ۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۵۲) از مراد آباد محلّہ گنج

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
حرف "ض" معجمہ مشابہ دال ہے یا "ظ" کے۔ اور جس وقت اس کے مخرج اور جمیع صفات کے ساتھ ادا کیا جائے تو اس کی آواز کسی حرف کے مشابہ ہوگی یا نہیں؟ اگر کسی سے مشابہ ہو تو کس حرف کے مشابہ ہوگی؟ اور جو شخص اس کو صحیح صحیح ادا کرسکتا ہے تو اس کو عوام جہال کے کہنے سے غلط کسی حرف سے بدل کر پڑھنا درست ہے یا نہیں؟۔ دریں صورت عمداً غلط پڑھنے والا خاطی فی الدین اور محرف فی القرآن کہلائے گا یا نہیں؟ نیز ایسے شخص کی اقتدا کرنا درست ہے یا نہیں؟ سوال کی ہر صورت کو مفصل کتب فقہیہ وتجوید کے تحت فرمایا جاوے۔ بینوا وتوجروا۔

الجواب

نحمدہ ونستعینہ ونتوکل علیہ ونصلی ونسلم علی حبیبہ وافضل رسولہ سید الانبیاء وعلی الہ واصحابہ اجمعین۔

اس زمانہ میں ایک شرذمہ قلیلہ اور فرقہ متفرقہ ہے کہ فساد کی راہیں چلتا اور مسلمانوں میں تفرقہ اندازی کی بنیادیں ڈالتا رہتا ہے۔ دن رات ایسے ہی تراش خراش اس کا پیشہ وشیوہ ہے۔ یہ فرقہ وہابیہ کے

نام سے پکارا جاتا ہے اور اس کو نئی بات نکالنے میں مزہ آتا ہے۔ یہ فرقہ "ض" کو "ظ" پڑھتا اور اسی پر اصرار کرتا ہے۔ باوجودیکہ ایسے شخص کی امامت ناجائز اور قصداً "ض" کو "ظ" پڑھنا کفر ہے۔ محیط برہانی میں ہے" سئل الامام الفضلی عمن یقرأ الظاء المعجمۃ مکان الضاد المعجمۃ او علی العکس فقال لا تجوز امامتہ ولو تعمد یکفر"۔ (شرح فقہ اکبر مصری ص ۱۵۳)

یعنی امام فضلی رحمۃ اللہ علیہ سے اس شخص کا حکم دریافت کیا گیا جو "ض" کی جگہ "ظ" یا "ظ" کی جگہ "ض" پڑھتا ہے۔ فرمایا: اس کی امامت جائز نہیں۔ اور اگر قصداً کیا تو کافر ہوجائے گا۔

منح الروض الازہر میں ہے "کون تعمدہ کفرا لا کلام فیہ" اس کے اس قصد کا کفر ہونا محل کلام نہیں۔

عالمگیری میں "ض" کے عمداً "ز" پڑھنے کو کفر لکھا ہے" سئل عمن یقرأ الزاء مقام الضاد وقرأ اصحاب الجنۃ مقام اصحاب النار قال لا تجوز امامتہ ولو تعمد یکفر"
(فتاوی عالمگیری۔ ج ۲ ص ۲۸۵)

یعنی اس شخص کا حکم پوچھا گیا جو "ض" کی جگہ "ز" پڑھے اور "اصحاب الجنۃ" کی جگہ "اصحاب النار" فرمایا اس کی امامت جائز نہیں اور قصداً کیا تو کافر ہوجائے گا۔

لہذا وہ فرقہ جو "ض" کو قصداً "ظ" پڑھتا ہے ان عبارات میں اپنا حکم تلاش کرلے اور خدا سے ڈرے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ "ض" کا مخرج "احد الحافتین" کا اتصال ایک جانب کے اضراس سے ہے۔ اور "ظا" کا ثنایا علیا۔

چنانچہ جزریہ میں ہے

والضاد من حافتہ اذ ولیا   الاضراس من الیسر او یمنا ھا
(منح فکریہ شرح جزریہ ص ۱۲)

وفیہ ایضا والظاء والذال ولیا للعلیا " (منح فکریہ شرح جزریہ مصری صفحہ ۱۴)

تو معلوم ہوا کہ "ظا" کا مخرج جدا ہے اور "ض" کا جدا۔ پھر "ض" مستطیلہ ہے اور "ظ" مستطیلہ نہیں۔ باوجود اس کے فرق نہ کرنا جہل ہے۔

جزریہ میں ہے

والضاد باستطالۃ ومخرج ☆ میز من الظاء وکلھا تجی"

(شرح جزری ہندی مطبع مجیدی صفحہ ۳۹)

اس شعر کی شرح یوں کرتے ہیں۔ اور ضاد معجمہ کو ساتھ صفت استطالت کے مخرج یعنی ضاد واستطالت کی صفت میں اور مخرج میں اکیلا ہے۔ اس صفت اور اس مخرج کا کوئی حرف نہیں تو اس ضاد کو ہمیشہ تمیز یعنی فرق کر اور جدا کر ظاء معجمہ سے تاکہ مشابہ ظا کے نہ ہو جائے۔

بالجملہ اشتباہ صوت کی بحث اس کو مفید نہیں کہ اس کا ایک حیلہ ہے جس سے عوام جہال کو دھوکہ دینا چاہتا ہے۔ سامعہ کا ادراک اور چیز اور حرف کا کسی انداز پر ادا ہونا اور بات۔ حائے حطی ہائے ہوز سے مشتبہ الصوت ہے مگر عوام کا سامعہ اس میں فرق ظاہر پاتا ہے تو اشتباہ صوت کا حیلہ کر کے الحمد للّٰہ کی جگہ الھمد اللّٰہ پڑھنا تحریف قرآن ہے۔ ایسے ہی غیر المغضوب کو غیر المغظوب پڑھنا اللہ تعالی ہدایت نصیب فرمائے۔ واللّٰہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل۔

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۵۳-۲۵۴-۲۵۵-۲۵۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں کہ

(۱) سورہ ہود میں ''مجریھا'' امالہ کے ساتھ پڑھنا یعنی یائے مجہول پڑھنا صحیح اور موافق سنت ہے اور اس کلمہ کو بیائے معروف پڑھنا صحیح اور سنت ہے یا نہیں؟ حنفیہ کی قرأت کے موافق جواب طلب ہے۔

(۲) تجوید کا سیکھنا واجب ہے یا نہیں؟۔

(۳) کلمہ مذکورہ ''مجریھا'' کو امالہ کیساتھ پڑھنے والے پر اعتراض کرنا اور اس کلمہ کی ہنسی اڑانا شریعت مقدسہ میں کیسا ہے؟۔

(۴) یائے مجہول عربی میں کسی موقع پر آتی ہے یا نہیں؟۔ فقط السائل عبدالغفار

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

(۱) واقعی کلمہ ''مجریھا'' کو امالہ کے ساتھ پڑھنا ہماری قرأت ہے۔

(۲) تجوید کا سیکھنا ضروری اور لازمی ہے۔ چنانچہ علامہ محمد جزری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

والاخذ بالتجوید حتم لازم　　من لم یجود القرآن آثم

یعنی تجوید کا سیکھنا ایسی حتمی ولازمی چیز ہے کہ جس نے تجوید نہیں سیکھی وہ گنہگار ہے۔

(۳) کلمہ مذکورہ کو امالہ کے ساتھ پڑھنے والے کی ہنسی اڑانا قرآن کریم کے ساتھ ایک نوع کی گستاخی ہے۔

(۴) یائے مجہول کی اصطلاح عجمی ہے اور اہل عرب کے محاورہ میں یائے مجہول بحیثیت اس اصطلاح کے مستعمل نہیں۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۵۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ

کیا حکم ہے شریعت مطہرہ کا اس مسئلہ میں کہ بجائے تسبیح رکوع مشہور ''سبحان ربی العظیم'' کے ''سبحان ربی الکریم'' پڑھا جائے۔ کہ عوام الناس مخرج ''ظا'' کا صحیح تلفظ نہیں کر سکتے اور بجائے ''ظاء'' کے ''زا'' ادا ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ''زا'' کی ادائیگی سے معنی ''عزیم'' کے دشمن کے بن جاتے ہیں اور اس کے ثبوت کے لئے شامی پیش کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایسی صورت میں ''ربی الکریم'' پڑھنا اولی ہے؟ یا ''ربی العظیم''۔ دوسری بات یہ کہ وہ اشخاص قرآن مجید کی تلاوت میں جہاں لفظ ''عظیم'' آتا ہے کیا کریں۔ آیا وہاں بھی ''کریم'' ہی پڑھ لیا کریں۔ یا ''عظیم'' ہی پڑھیں۔ بیان فرما کر عنداللہ ثواب کے حقدار ہوں۔

المستفتی ذکاوت حسین محلہ دیپا سرائے سنبھل

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

سنت یہی ہے کہ رکوع میں ''سبحان ربی العظیم'' کہا جائے اور ''عظیم'' میں ''ظا'' کو مخرج سے ادا کیا جائے۔ لیکن چونکہ عوام الناس ''ظا'' کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر ہیں اور وہ اپنی اسی لاعلمی میں بجائے ''ظا'' کے ''زائے معجمہ'' ادا کرتے ہیں۔ تو وہ کلمہ بجائے ''عظیم'' کے ''عزیم'' ہو جاتا ہے اور یہ حضرت حق سبحانہ تعالی کی شان میں سخت گستاخی کا کلمہ بن جاتا ہے اگرچہ بلا قصد ہی سہی۔ لہذا ایسے عوام

کے لئے ''ظا'' کا صحیح طور مخرج سے ادا کرنا ضروری ہے ورنہ ان کے لئے رکوع میں بجائے 'سبحان ربی العظیم'' کے "سبحان ربی الکریم" کہنا یقیناً اولیٰ ہے۔

چنانچہ شامی جلد اول میں ہے:

السنة فی تسبیح الرکوع سبحان ربی العظیم الا ان کان لایحسن الظاء فیبدل به الکریم لئلایجری علی لسانه العزیم فتفسد به الصلوة کذا فی شرح دررالبحار فلیحفظ فان العامة عنه غافلون حیث یاتون بدل الظاء بزاء المعجمة۔

یعنی رکوع کی تسبیح میں "سبحان ربی العظیم" کہنا سنت ہے مگر جب ''ظا'' اچھی طریقہ سے ادا نہ کر سکے تو اس کی جگہ لفظ ''کریم'' بدلے تاکہ اس کی زبان پر ''عزیم'' جاری نہ ہو کہ اسکے ساتھ نماز فاسد ہو جائے گی ایسے ہی شرح دررالبحار میں ہے۔

لہذا اس کو یاد کرو کہ آدمی اس سے غافل ہیں کہ وہ ''ظا'' کی جگہ ''زا'' ادا کرتے ہیں۔ لہذا اس عبارت سے موکد طور پر ''عزیم'' یا ''زاء'' پڑھنے کی ممانعت ثابت ہوئی۔ اور وجہ ممانعت یہ ہے کہ ''عزیم'' کے معنی قاموس میں "العزیم العدو الشدید" کے ہیں۔ یعنی سخت دشمن۔ اور ''سبحان ربی العظیم'' کے یہ معنی ہیں کہ۔ پاک ہے میرا رب جو عظمت والا ہے۔ اور ''سبحان ربی العزیم'' کے یہ معنی ہو گئے کہ۔ پاک ہے میرا رب جو سخت دشمن ہے۔ (العیاذ باللہ منہ)

لہذا اس تغیر معنی کی وجہ سے علمائے کرام نے اس کی ممانعت فرما کر فساد نماز کا حکم دیا۔ اسی لئے کبیری نے تغیر معنی کی یوں تصریح کی ہے:

والقاعدة عند المتقدمین ان ماغیر تغیرا یکون اعتقاده کفر یفسد۔

چند سطر بعد فرماتے ہیں:

والمعتبر فی عدم الفسادتغیرالمعنی کثیراً۔

یعنی فساد اور عدم فساد نماز کا حکم معنی کے متغیر ہونے اور نہ ہونے پر ہے۔ اب رہا باقی قرآن پاک کے مقامات میں تبدیل کرنا اس کے لئے شریعت سے کوئی سند ثابت نہیں ہوئی۔ مگر ایسے مقامات ودیگر تغیر معنی کے کلمات کے لئے علم تجوید سیکھنے کو علماء کرام نے فرض قرار دیا ہے۔ لہذا اگر کہیں ایسی ہی تغیر معنی کی قرآن پاک میں غلطی ہو جائے تو وہ اس کی خطا ہے کہ اس نے اس قدر تجوید نہیں سیکھی۔ ہاں قرآن پاک کے علاوہ دیگر ادعیہ مین بجائے ''عظیم'' کے اگر ''کریم'' کہے تو اس میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۵۸_۲۵۹_۲۶۰_۲۶۱_۲۶۲_۲۶۳_۲۶۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں کہ

(۱) لحن کس کو کہتے ہیں اور اس کی کتنی قسمیں ہیں۔

(۲) ضاد، ظا، ز، ذال، تا، سین، صاد، دال۔ ان حرفوں کا کیا مخرج ہے۔

(۳) لفظ ''ضاد'' مثل ''ظاء'' کے پڑھا جائے گا۔ یا۔ ''دال'' کے مثل۔

(۴) اگر کوئی شخص اندر نماز کے ''سبحان ربی العظیم" کی ''ظاء'' کی جگہ ''زا'' پڑھتے ہیں۔ یا ''سبحان ربی الاعلیٰ'' کے جگہ ''سبحان ربی الالیٰ" پڑھے۔ یا سورہ فاتحہ میں'' وایاك" کی جگہ "ویاك" پڑھے۔ یا اسی سورہ میں'' المغضوب" کی ''ضاذ'' کی جگہ ''ظاء'' یا ''دال'' مفخم پڑھے۔ یا۔ "الضالین" کے ''ضاذ'' کی جگہ ''ظاء'' یا ''دال'' مفخم پڑھے۔ یا "والصیف" کی جگہ ''سین'' پڑھے یا "فائزون" کی جگہ ''ذال'' پڑھے۔ یا "نصراللہ" کے ''صاد'' کی جگہ ''سین'' پڑھے۔ یا "حطب" کی جگہ ''ت'' پڑھے۔ یا "یکذب" کی ''ذال'' کی جگہ ''زا'' پڑھے۔ تو ایسے شخص کے پیچھے کسی صورت میں بھی نماز ہو جاتی ہے یا کہ نہیں؟ یا ایسی صورت میں اس اکیلے شخص کی بھی نماز ہو جاتی ہے یا کہ نہیں؟۔

(۵) "لاالی اللہ تحشرون" سورہ آل عمران میں۔" ولا اوضعوا" سورہ توبہ میں۔ اور'' لا اذبحنه" سورہ نحل میں۔ ''لاالی الجحیم'' سورہ والصّٰفّٰت میں۔'' لاانتم" سورہ حشر میں۔ اگر کوئی شخص اندر نماز کے ''لا'' کو ساتھ الف کے ملائے تو نماز ہو جائے گی یا نہیں؟۔

(۶) اگر کوئی شخص درمیان سورہ سے پڑھنا شروع کرے اور ''اعوذ'' کو اللہ کے کسی صفتی نام سے وصل کر دے تو اس حالت میں پڑھنے والا گنہگار ہوگا یا نہیں؟۔

(۷) مجود کی نماز غیر مجود کے پیچھے ہو جاتی ہے یا کہ نہیں؟۔ فقط

السائل عبدالحق

نوٹ۔ تمام سوالات کے جوابات کتب تجوید وکتب فقہ مع حوالہ کتاب مع عبارت کے حنفیہ کی قرأت کے موافق مطلوب ہیں۔

الجواب

الحمد لله الذی نزل علینا القرآن فهو یهدی الی سبیل الرشاد ۔فافضل العبادة قراته ترتیلا بغیر تغیرالمراد۔ ومیزالحروف بمخارجها وصفاتها واصواتها مع السداد فادعاء وحدة الصوت باطل فی الظاء والضاد ۔ ومن تعمد بالتبدیل حرفا من حروفه فله بئس المهاد والصلوة والسلام علی فردا لافراد مصلح البلاد دافع الفساد واهب المراد سیدنا ومولنا محمد افضل العباد وعلی آله واصحابه الاوتاد وعلی من تبعهم الی یوم التناد ۔

امابعد

اس زمانہ پرآشوب میں احکام مذہبی سے مسلمانوں کی بے توجہی نہایت ہی قابل افسوس ہے۔ عوام تو عوام بلکہ اہل علم کی بھی یہ حالت زار ہے کہ ان کو تجوید کا سیکھنا، حروف کا مخارج سے ادا کرنا، صفات کا اس وقت لحاظ رکھنا، مشتبہ الاصوات میں بین تمیز کر دینا، ایسا غیر ضروری کام ہو گیا ہے جس کی طرف بعد تنبیہ بھی ان کی توجہ منعطف نہیں ہوتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاید ان کے نزدیک تبدیل حرف سے معنی میں فساد ہی نہیں آتا۔ تعجب ہے کہ باوجود اس زبوں حالت کے امام بننے کا بھی شوق۔ اپنی نماز تو فاسد ہوتی ہی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مقتدیوں کے حال پر بھی یہ کرم کریم ہے کہ ان کی نماز بھی برباد کی جاتی ہے۔ اب ان سے زیادہ قابل افسوس وہ لوگ ہیں جو چند قواعد تجوید دیکھ کر قاری بن گئے ہیں اور دیدہ ودانستہ ’’ضاد‘‘ کو ’’ظا‘‘ پڑھتے ہیں اور مشتبہ الصوت کی آڑ لے کر قرآن عظیم میں تحریف کرتے ہیں۔ لہذا ان چند سطور میں ان سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں، اگرچہ مسائل زلۃ القاری کے مختلف فیہ ہیں، متقدمین اور متاخرین دونوں میں بہت اختلافات ہیں اور باوجود ان اختلافات کے مجھ جیسے کم علم کا قلم اٹھانا نہایت دشوار ہے لیکن محض توکلا علی اللہ تعالٰی ثم علی رسولہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم یہ چند جملے لکھتا ہوں، اگرچہ مسائل فقہیہ کے سمجھنے کے لئے لیاقت علمی درکار ہے مگر حتی الامکان عام فہم کرنے کی کوشش بلیغ کروں گا۔

اقول وباللہ التوفیق۔ جوابات سے قبل ان چند مقدمات کا سمجھنا بہت ضروری ہے کہ انشاء اللہ تعالٰی یہ مقدمات نہ فقط ان مسائل بلکہ بہت سے مسائل زلۃ القاری کو کافی ہوں گے۔

مقدمہ اول: ان جوابات میں جو احکام بیان کئے جائیں گے وہ تمام متقدمین کے قواعد پر مبنی ہوں گے۔ اقوال متاخرین میں اول تو اختلافات بہت زیادہ ہیں معہذا وہ باعتبار قواعد کے غیر منضبط ہیں،

علاوہ بریں اقوال متقدمین میں احتیاط زیادہ ہے۔

چنانچہ ابراہیم حلبی غنیہ میں قواعد متقدمین کو کہہ کر فرماتے ہیں:

هذا ملخص قاعدة المتقدمين وهو الذی صححه المحققون من اهل الفتاوی كقاضی خان وغیره وفرعوا علیه الفروع فافهم ترشد ۔

پھر یہی علامہ اسی میں دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

فالاولیٰ الاخذ فیه بقول المتقدمین لانضباط قواعدهم وكون قولهم احوط واكثر الفروع المذكورة فی كتب الفتاوی منزلة علیه۔

مقدمہ دوم: قرات کی تمام غلطیوں کے احکام کی بنا بلکہ سارے مسائل زلۃ القاری کی جان اور اصل الاصول معنی کا تغیر ہے کہ اسی تغیر معنی کی وجہ سے نماز کے فساد کا حکم دیا جاتا ہے۔

چنانچہ غنیہ میں ہے: والقاعدة عند المتقدمین ان ماغیر تغییرا یكون اعتقاده كفرا یفسد ۔چند سطر بعد فرماتے ہیں: فالمعتبر فی عدم الفساد عند عدم تغیر المعنی كثیرا۔

اسی طرح عامہ کتب فقہ میں ہے۔ اے عزیز قرآن کریم اللہ تبارک وتعالٰی نے جیسا نازل فرمایا ہے ویسا ہی ہم کو ادا کرنا چاہئے اور اگر اس کے حرف بدل گئے تو کہیں بے معنی مہمل الفاظ بن جائیں گے، کہیں معنی زیادہ متغیر ہو جائیں گے، کہیں معنی ایسے بگڑ جائیں گے جس کا اعتقاد کفر ہو۔ لہذا اس تغیر کے بعد وہ خدا کا کلام کس طرح باقی رہ سکتا ہے بلکہ حرف کی آواز بدلنے کی وجہ سے بھی بعض جگہ بجائے حمد کے حضرت حق سبحانہ کی شان میں گستاخی کا کلمہ بن جائے گا۔ العیاذ باللہ تعالٰی

اب باقی رہا یہ عذر کہ ہمارا قصد تو تعریف وحمد ہی کا ہے۔ لہذا یہ نہایت خام خیال ہے، اگر کوئی شخص کسی کی تعریف کا قصد کرے لیکن الفاظ ایسے کہے جن میں اس کی کھلی ہوئی برائی اور مذمت ہو تو کیا کوئی ایسا عاقل ہے کہ اس کے ان گستاخانہ الفاظ کو چھوڑ کر اس کا قصد دریافت کرتا پھریگا۔ لہذا پھر شان رب تبارک وتعالٰی میں ایسے گستاخانہ الفاظ اگرچہ بلا قصد ہی سہی کس طرح گوارا کئے جاسکتے ہیں۔ دیکھئے میں قرآن کریم ہی سے اس کا حکم سنادوں۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالٰی علیہم اجمعین کی یہ عادت تھی کہ وہ سرکار رسالت میں لفظ ’’راعنا‘‘ کہا کرتے تھے یعنی حضور ہماری جانب نظر فرمایئے۔ یا ہماری رعایت کیجئے۔ یہود نے جب اس کلمہ کو سنا انہوں نے اسی کلمہ میں گستاخی کے معنی قصد کر کے سرکار رسالت علی صاحبہا الصلوۃ والسلام میں اس کو بولنا

شروع کیا۔ لہذا یہ آیت نازل ہوئی۔

یاایھاالذین آمنوا لاتقولوا راعنا وقولواانظرنا۔

یعنی اے ایمان والو! تم لفظ ’’راعنا‘‘ مت کہا کرو بلکہ اس کے بجائے لفظ ’’انظرنا‘‘ کہا کرو۔

اب غور کیجئے کہ صحابہ کرام کا گستاخی کے معنی کا قصد تو کس طرح متصور بلکہ ان کے وہم وگمان میں بھی یہ گستاخی کے معنی آجانے ممکن نہیں تھے مگر باوجود اس بات کے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان میں ایسے موہم الفاظ بولنے سے ممانعت فرمادی۔ لہذا شان حق جل جلالہ تو بہت ہی ارفع واعلیٰ ہے۔ نیز حدیث قدسی میں ہے:

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قال تعالیٰ: یوذینی ابن آدم یسب الدھروانا الدھر بیدی الامر اقلب اللیل والنھار متفق علیہ (مشکوۃ شریف)

یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی، حضور شافع یوم النشور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بنی آدم مجھکو ایذا دیتا ہے کہ وہ زمانہ کو گالی دیتا ہے باوجود یکہ زمانے کا پیدا کرنے والا میں ہوں، امر میرے قبضہ قدرت میں ہے میں ہی رات اوردن کو پلٹتا ہوں۔

غنیہ میں ہے: ولو ادخل المد فی الف لفظة اللہ کمایدخل فی قولہ تعالیٰ اذن لکم وشبھہ تفسد صلوتہ ان حصل فی اثنائھا عند اکثر المشائخ ولایصیر شارعابہ فی ابتدائھا ویکفر لوتعمد لانہ استفھام ومقتضاہ الشك فی کبریائہ تعالیٰ وقال محمد بن مقاتل ان کان لایمیز بینھما ای بین المد وعدمہ لاتفسد صلاتہ و الاستفھام یحتمل ان یکون للتقریر لکن الاول اصح لان مثل ھذا الجھل لایصلح عذرا۔

منیہ میں ہے: وان قال اللہ اکبار لایصیر شارعا وان قال فی خلال الصلاۃ تفسد صلوتہ لانہ اسم الشیطان۔

خلاصہ ان دونوں عبارتوں کا یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے اللہ اکبر تکبیر میں لفظ اللہ کے الف کو مد کے ساتھ بڑھاکے آللہ اکبار کہا۔ اگر نماز کی درمیانی تکبیروں میں کہا تو اکثر مشائخ کے نزدیک اس کی نماز فاسد ہوجائے گی اور یہی اصح قول ہے۔ اور اگر ابتدائے نماز میں آللہ اکبر کہا تو اس سے نماز کا شروع کرنا صحیح نہیں ہے۔ اور اگر معنی پر مطلع ہونے کے بعد بالقصد کہا تو کافر ہوجائے گا۔ اس لئے کہ آللہ اکبر کے یہ

معنی ہوئے (کیا اللہ بہت بڑا ہے) تو اس سے اللہ عزوجل کی کبریائی میں شک واقع ہوگیا اور اس جیسا جہل عذر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اسی طرح آللہ اکبار کا حکم ہے کہ اول میں کہنے سے نماز کا شروع صحیح نہیں اور درمیان میں کہنے سے نماز فاسد کہ اکبار شیطان کے ناموں سے ایک نام ہے۔

الحاصل اس آیت اور حدیث اور قول فقہ سے نہایت روشن طور پر ثابت ہوگیا کہ گستاخی کے الفاظ میں عدم قصد کا حیلہ اور اپنی نادانی کا اقرار کمزور عذر ہے پھر یہ غلطی بھی ہو تو حالت نماز میں جس میں بندہ کو اپنے مولا تبارک وتعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہو اور سارے حجابات اٹھکر اس کو حضوری کی عزت سے نوازا جائے اور یہ بندہ اس وقت ایسی گستاخی کے کلمات اپنی زبان سے نکالے، اگر یہ ان کا قصد نہ رکھتا ہو اور پھر ایک دومرتبہ نہیں بلکہ بیسوں مرتبہ مثلاً رکوع میں اس نے پانچ بار تسبیح کہی اور عظیم کی ’’ظا‘‘ اس سے ادا نہیں ہوئی اور اسکی بجائے ’’عزیم‘‘ زا۔ سے کہا جس کے معنی سخت دشمن کے ہیں تو اس نے چار رکعت میں بیس مرتبہ اللہ تعالیٰ کو اپنا دشمن کہہ کر پکارا۔

خلاصۃ یہ ہے کہ کیا ایسی نماز تمہارے کچھ کام آسکتی ہے اور کیا باوجود اتنی تجوید سیکھنے کی قدرت کے تمہاری یہ غلط خوانی کچھ عذر بن سکتی ہے۔ نماز وہ چیز ہے جس کے بارے میں سرکار مدینہ سید الانبیاء محبوب کبریا حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اذا نعس احدکم وھو یصلی فلیرقد حتی یذھب عنہ النوم فان احدکم اذا صلی وھو ناعس لایدری لعلہ یذھب یستغفر فیسب نفسہ۔ بخاری وغیرہ

یعنی جب تم میں سے کسی کو غنودگی آئے تو سورہے یہاں تک کہ نیند چلی جائے کہ غنودگی میں پڑھے گا تو کیا معلوم شاید اپنے لئے دعائے مغفرت کرنے چلے اور بجائے دعا کے بددعا نکلے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غنودگی کی حالت میں نماز سے اس لئے منع کیا گیا کہ شاید وہ بجائے دعا کے بددعا کرنے لگے باوجودیکہ اس کا قصد بددعا کا ہرگز نہ ہوگا۔ اب کہاں ہیں وہ لوگ جو یہ کہدیا کرتے ہیں کہ ہمارا تو اس کا قصد نہیں تھا۔ وہ اپنے عذر کو اس ترازو میں لاکر تولیں اور غور کریں کہ جب غنودگی میں اتنی احتیاط کی تعلیم دیجارہی ہے اور ہم تو جاگتے ہوئے ہوش میں ایسے قبیح الفاظ کہہ رہے ہیں اور پھر ایک دومرتبہ نہیں بلکہ مکرر بار بار کہتے ہی رہتے ہیں۔ لہذا قصد نہ ہونے کا عذر کہاں تک بچاسکے گا۔

الحاصل نماز مسلمانوں کے لئے ایک بڑی دولت ہے اس میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے۔

غنیہ میں مسائل زلۃ القاری کے اختتام پر لکھتے ہیں:

والاحتیاط اولیٰ سیمافی امرالصلوۃ التی ھی اول مایحاسب العبد علیھا۔

یعنی احتیاط ہر حال میں اولیٰ ہے خاص کر حالت نماز میں کہ یہ نماز وہ چیز ہے کہ سب سے پہلے بندہ کا حساب اسی سے شروع ہوگا۔

مقدمہ سوم: قرآن کریم کے حروف کا مخارج سے صحیح طور پر نکالنا، ہر حرف کو دوسرے سے ممتاز کرنا، ہرایک کی آواز کو دوسرے کی آواز سے بچانا، ہر مسلمان کے لئے فرض عین ہے، بلکہ بعض اقوال کی بنا پر وقفوں اور حرکتوں کا لحاظ بھی ضروری ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ورتل القرآن ترتیلا۔ یعنی قرآن خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔

تفسیر خازن میں ہے:

الترتیل ھو التوقف والترسل والتمھل والافھام وتبیین القرأۃ حرفا اثرہ فی اثر بعض بالمد والاشباع والتحقیق و (ترتیلا) تاکید فی الامر بہ لانہ لابد للقاری منہ ۔

تفسیر مدارک میں اسی آیت کے تحت میں فرماتے ہیں:

اقرأ علی قواعدہ بتبیین الحروف وحفظ الوقوف واشباع الحرکات (ترتیلا) ھو تاکید لایجاب الامر بہ وانہ لابد منہ للقاری ۔

تفسیر احمدی میں اسی آیت کے تحت میں فرماتے ہیں:

امرھم بترتیل القرآن واوجبہ علیھم وھو علی مانقل عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ رعایۃ الوقوف واداء المخارج۔

خلاصہ مضمون ان تفسیروں کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ترتیل واجب کی اور ترتیل سے مراد قرآن کریم کا ٹھہر ٹھہر کر اور آہستہ دیر کر کے اور سمجھا کر پڑھنا اور ہر ہر حرف کو دوسرے سے ممتاز کرنا، مد اور اشباع حرکات کا ظاہر کرنا، وقفوں کی حفاظت کرنا کہ قاری کو ان سے چارہ کار نہیں۔ اسی طرح تفسیر بیضاوی اور حسینی وغیرہ میں ہے۔ اس آیت اور تفسیروں سے تجوید کا سیکھنا ضروری اور لازمی ثابت ہوا۔

علامہ جزری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی مختصر نظم جزریہ میں فرماتے ہیں۔

یعنی تجوید سیکھنا واجب ہے اور جو تجوید کے ساتھ قرآن نہ پڑھے وہ گنہگار ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو تجوید کے ساتھ اتارا اور اسی طرح اس سے ہمارے پاس پہنچا۔ اور نیز وہ تجوید تلاوت کا زیور اور قرأت کی زینت ہے۔ اور وہ تجوید حروف کو ان کی صفت لازمہ کے حق دینے کا نام ہے۔ اور ہر

حرف کو اس کی اصل کی طرف پھیرنے اور اسکی نظیر میں اس کے مثل تلفظ کرنے کا نام ہے۔ قاری بلا تکلف اور بغیر دشواری کے پڑھنے میں کمال درجہ کی پاکیزگی پیدا کرے۔

اعلیٰ حضرت امام اہلسنت مجدد دین وملت فاضل بریلوی قدس سرہ اپنی کتاب ''الجام الصاد'' میں اتقان سے ناقل ہیں:

من المھمات تجوید القرآن وھو اعطاء الحروف حقوقھا ورد الحروف الیٰ مخرجہ واصلہ ولاشك ان الامۃ کماھم متعبدون بفھم معانی القرآن واقامۃ حدودہ ھم متعبدون بتصحیح الفاظہ واقامۃ حروفہ علی الصفۃ الملتقاۃ من ائمۃ القرأۃ المتصلۃ بالحضرۃ النبویۃ۔

یعنی قرآن کا تجوید سے پڑھنا ضروریات سے ہے اور تجوید حروف کو ان کے حقوق دینے اور ہر حرف کو اس کے مخرج اور اصل کی طرف پھیرنے کا نام ہے اور بلاشک جس طرح امت کے لئے قرآن کے معنی سمجھنے اور اسکے حدود قائم کرنے داخل عبادت ہیں اسی طرح قرآن کے الفاظ کی تصحیح اور حروف کے صفات کا قائم کرنا بھی ہے، جس طرح ان کو ان ائمہ قرأت نے ظاہر کیا جن کی سند سرکار رسالت تک پہنچتی ہے۔

نیز اسی میں فرماتے ہیں:

لہذا ائمہ دین تصریح فرماتے ہیں کہ آدمی سے کوئی حرف غلط ادا ہوتا ہو تو اس کی تصحیح وتعلم میں اس پرانتہائی کوشش واجب۔ اگر کوشش میں قصور کرے گا معذور نہ ہوگا، نماز کھوئے گا۔ بلکہ جمہور علماء نے اس سعی کی کوئی حد مقدر نہیں کی اور حکم دیا کہ عمر بھر شبانہ روز ہمیشہ جہد کئے جائے، کہیں اس کے ترک میں معذور نہ رکھیں گے۔ یہی قول امام ابراہیم بن یوسف، امام حسین بن مطیع کا ہے۔ محیط میں اسی کو مختار للفتوی فرمایا۔ خانیہ وخلاصہ وفتح القدیر ومراقی الفلاح وفتاوی الحجہ وجامع الرموز ودرمختار وغیرہا میں اس پر جزم فرمایا۔ علامہ ابن شحنہ نے اسی کو محرر بتایا۔ علامہ ابراہیم حلبی نے غنیہ میں اسی کو معتمد فرمایا اگرچہ امام برہان محمود نے ذخیرہ میں بصورت عجز خلقی اسے مشکل بتایا۔ امام ابن امیر الحاج نے اسی پر تعویل کی اور عذر عارض ناقابل زوال بڑھایا۔ علامہ طحطاوی نے حاشیہ مراقی الفلاح میں اسی طرف میل کیا اور اسے مقتضائے کلام اکثر ائمہ اعلام قرار دیا۔ اور یہی فتاوی امام فقیہ ابو اللیث وخزانۃ الاکمل وغیرہا کا مفاد۔

کمابینا کل ذلك فی فتاوٰنا حققناہ انہ کأنہ ھو المراد۔انتھیٰ

اب اتنی تصریحات کے ہوتے ہوئے مزید تفصیل کی ضرورت تو نہیں معلوم ہوتی مگر ممکن ہے کہ بعض شریر طبیعتیں ابھی اس میں کچھ کلام کریں۔ لہذا میں انہیں کے پیشواؤں کے کلام پیش کردوں۔

مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی فتاوی رشیدیہ حصہ دوم کے ص ٦٨ میں کہتے ہیں:

مسئلہ ٩۔ علم تجوید فرض عین ہے یا کفایہ اور کہاں تک مستحب ہے؟۔

الجواب:۔ علم تجوید جس سے کہ تصحیح حروف کی ہو جائے کہ جس سے معانی قرآن شریف کے نہ بگڑیں یہ فرض عین ہے مگر عاجز معذور ہے اور اس سے زیادہ علم قرأۃ وتجوید فرض کفایہ ہے۔

اور مولوی اشرفعلی تھانوی فتاوی امدادیہ جلد اول کے ص ١١١ میں لکھتے ہیں:

اور تجوید کی مقدار واجب صرف تصحیح حروف اور رعایت وقوف ہے اس طرح کہ تغیر مراد نہ ہوجاوے باقی مستحسن۔

اس وقت مجھے ان دونوں فتووں پر تنقیدی نظر کر کے ان کی کمزوریاں دکھانی منظور نہیں ہیں بلکہ صرف اپنے مدعا کا اثبات مقصود ہے لہذا اب کسی منصف ہی کو نہیں بلکہ کسی ہٹ دھرم کو بھی مجال سخن باقی نہیں رہی۔

مقدمہ چہارم: قرآن کریم میں غلطی ہونے کی چار صورتیں ہیں۔ عمد۔ خطا۔ عجز۔ عذر۔

قسم اول: قصدا ایک حرف کو دوسرے حرف سے یا ایک کلمہ کو دوسرے کلمہ سے بدلنا۔ یا حروف میں تقدیم وتاخیر یا زیادتی وکمی کرنا۔ یا کلمات اور جملوں میں تغیر کرنا۔ یا اعراب وغیرہ میں کچھ تغیر کرنا جس سے معنی میں تغیر ہوجائے۔ اس کو عمد کہتے ہیں۔ لہذا قرآن کریم میں عمداً ایسا کرنا حرام ہے اور اس سے یقیناً نماز فاسد ہوجائے گی۔

چنانچہ شامی میں ہے: ان تعمد ذلك تفسد۔

طحطاوی میں ہے: اما فی العمد فتفسد به مطلقا بالاتفاق۔

اور اگر نعوذ باللہ کوئی ہٹ دھرم از راہ عناد قرآنی حرف کی جگہ کوئی دوسرا حرف قصدا بدلے اور پھر اس پر اس قدر اڑے کہ اپنے اس بدلے ہوئے حرف کو ہی اللہ تعالی کی طرف سے اتری ہوئی وحی ٹھہرائے تو اس پر حکم کفر ہے۔

چنانچہ غنیہ میں قاضی خاں سے ناقل ہیں:

قال قاضی خان وماقاله المتاخرون اوسع وما قاله المتقدمون احوط لانه لوتعمده

یکون کفرا لایکون من القرآن قال ابن الهمام فیکون متکلما بکلام الناس الکفار وهو مفسد کما لو تکلم بکلام الناس ساهیا مالیس بکفر فکیف وهو کفر۔

شرح فقہ اکبر میں محیط سے ناقل ہیں:

سئل الامام الفضلی ممن یقرأ الظاء المعجمة مکان الضاد المعجمة اویقرأ اصحاب الجنة مکان اصحاب النار او بالعکس فقال لاتجوز امامته ولو تعمد یکفر قلت اما کون تعمده کفرا فلا کلام فیه۔

شرح فقہ اکبر والی عبارت کا ترجمہ یہ ہے کہ امام فضلی رحمۃ اللہ تعالی علیہ سے اس شخص کے متعلق دریافت کیا گیا جو "ضاد معجمہ" کی جگہ "ظاء معجمہ" پڑھتا ہے۔ یا "اصحاب النار" کی جگہ "اصحاب الجنة" یا اس کا خلاف پڑھتا ہے تو جواب دیا کہ اس کی امامت جائز نہیں اور اگر قصدا کہے تو کافر ہوجائے گا۔

علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالی علیہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: کہ اس کے قصدا پڑھنے کے کفر ہونے میں کوئی کلام ہی نہیں۔ لہذا جو لوگ "ضاد" کو قصدا "ظا" پڑھتے ہیں وہ اپنا حکم ان عبارتوں میں تلاش کر کے تائب ہوں۔

قسم دوم: باوجود صحیح ادا کرنے کی قدرت کے زبان کی لغزش سے بلاقصد ان میں سے کوئی غلطی خطا ہوگئی اور معنی صحیح رہے تو نماز فاسد نہیں ہوگی اور اگر اس کے معنی متغیر ہوگئے اور بنا بر اصل امام یوسف رحمۃ اللہ تعالی علیہ کے یہ بدلا ہوا کلمہ قرآن کریم میں بھی کہیں نہیں ہے تو باجماع متقدمین اس کی نماز باطل اور جب یہ امام ہو تو سارے مقتدیوں کی نمازیں فاسد۔

چنانچہ غنیۃ میں ہے:

وان لم یکن التغیر کذلك (ای مایکون اعتقاده کفرا) فان الاصل فیه ای فی الذلل والخطاء انه ان لم یکن مثله ای مثل ذلك اللفظ فی القرآن والمعنی ای والحال فی ان معنی ذلك اللفظ بعید من معنی لفظ القرآن متغیر معنی لفظ القرآن به تغیرا فاحشا قویا بحیث لامناسبة بین المعنیین اصلا تفسد صلاته ایضا کما اذا قرأ هذا الغبار مکان قوله هذا الغراب وکذا ان لم یکن مثله فی القرآن ولامعنی له حتی یحکم علیه بالبعد من المعنی القرآنی اوبعدمه کما اذا قرأ یوم تبلی السرایل باللام فی آخره مکان الراء فی السرایر وان

کان مثلہ فی القرآن والمعنی ای معنی اللفظ الذی قرأہ بعید من معنی اللفظ المراد ولم یکن معنی اللفظ المراد متغیرا باللفظ المقر وتغیرا فاحشا تفسد ایضا عند ابی حنیفة ومحمد رحمة اللّٰه تعالیٰ علیهما وهو الاحوط ۔

اسی کے دوسرے مقام پر ہے:

واذا تاملت فیما ذکرنا من اول الفصل الی آخره علمت انه اذا خطأ بما یتغیر تغیرا یلزم من اعتقاده کفر تفسد صلوته مطلقا وان لم یکن التغیر کذلك فان فی هیئات الحروف من الاعراب والتشدید والتخفیف والمد والقصر لاتفسد الا ان یکون التغیر فاحشا وکذا اذا کان فی نفس الحروف فان بقیت الکلمة سببه لامعنی لها اولها معنی بعید جدا عن المراد تفسد والا فلا،سواء کان فی حرف او اکثر وسواء کان فی القرآن او لا عندهما وعند ابی یوسف رحمة اللّٰه تعالیٰ علیه لاتفسد اذا کانت الکلمة المغیرة فی القرآن ۔

طحطاوی میں ہے:

فالاصل فیها عند الامام ومحمد رحمهما اللّٰه تعالیٰ تغیر المعنی تغیراً فاحشا وعدمه للفساد عدمه مطلقاسواء کان اللفظ موجودا فی القرآن ولم یکن وعند ابی یوسف رحمه اللّٰه تعالیٰ علیه ان کان اللفظ نظیره موجودا فی القرآن لاتفسد مطلقا تغیر المعنی تغیرا فاحشا اولا وان لم یکن موجودا فی القرآن تفسد مطلقا ولا یعتبر الاعراب اصلا ومحل الاختلاف فی الخطا والنسیان۔

لہذا اگر بحالت خطا معنی متغیر ہوگئے تو بنا بر مذہب مفتی بہ کے نماز فاسد ہو جائے گی۔

قسم سوم: باوجود صلاحیت تصحیح حروف ورعایت وقوف کے زبان پر غلطی کا بلاقصد جاری ہو جانا اور مشاغل دنیوی کے انہماک میں صحیح تلفظ کے سیکھنے سے قاصر رہ جانے کی وجہ سے اس غلط تلفظ کو ہی اپنے خیال میں صحیح سمجھنا مفہوم عجز کا ہے۔

لہذا ایسے عاجز پر جتنی تجوید مقدمہ سوم میں گذری سیکھنا واجب ہے کہ جس سے تغیر مراد نہ ہونے پائے مگر اس کی اپنی نماز درست ہے اور یہ عاجز امامت صحیح خوانوں کی نہیں کرسکتا۔ ہاں اپنے جیسے کی امامت کرسکتا ہے۔ اور اگر اس نے تجوید ہی نہیں سیکھی یا کچھ سیکھی اور پھر چھوڑ دی یہاں تک کہ وجوب کا

مطالبہ اس کے ذمہ پر باقی رہا تو خود اس کی نماز کی صحت بھی محل کلام ہے۔

غنیہ میں ہے:

کان القاضی الامام الشهید المحسن یقول الاحسن فیه ای فی الجواب فی هذه الابدال المذکور ان یقول المفتی ان جری ذٰلك علی لسانه ولم یکن ممیزا بین بعض هذه الحروف وبعض وکان فی زعمه انه ادی الکلمة علی وجهها لاتفسد صلوته وکذا ای مثل ماذکر فی فتاوی الحجة انه یفتی فی حق الفقهاء باعادة الصلوة بالجواز کقول محمد بن سلمة اختیارألاحتیاط فی موضعه والرخصة فی موضعها۔

اسی میں محیط سے ناقل ہیں:

ومایجری علی السنة النساء والارقاء من الخطاء الکثیر من اول الصلوة الی آخرها کالشیتان والالمین وایاك نابد وایاك نستئین السرات انامت فعلی جواب الفتاوی والحسامية مادامو فی التصحیح والتعلیم والاصلاح باللیل والنهار ولا یطاوعهم لسانهم جازت صلوتهم کسائر الشروط اذا عجز عنها من الوضو وتطهیر الثوب والقیام والقرأة والرکوع والسجود والقعود والتوجه اذا حصل العجز عنها جازت صلوته فکذا هنا اما اذا ترکوا التصحیح والجهدفسدت صلوتهم کما اذا ترکوا سائر الشروط وانما جوزت صلوتهم لعجزهم عن الاصلاح فصار تلك الالفاظ لغتهم ولسانهم فکانهم قرأوا القرآن بلغتهم۔

اسی میں قاضی خاں سے ناقل ہیں:

وان کان الرجل ممن لایحسن بعض الحروف ینبغی ان یجتهد ولا یعذرفی ذلك فان کان لاینطق لسانه ان لم یجد آیة لیس فیها تلك الحروف تجوز صلوته ولایؤم غیره ۔

شامی میں خزانۃ الاکمل سے ناقل ہیں:

ان جری علی لسانه (ای حرفا مکان حرف) اولا یعرف التمیز لاتفسد وهو المختار حلیه وفی البزازية وهو اعدل الا قاویل وهو المختار ۔

اسی میں تاتارخانیہ سے ناقل ہیں:

اذا لم یکن بین الحرفین اتحاد المخرج ولاقربة الا ان فیه بلوی العامة کالذال

مکان الضاد او الزائ المحض مکان الذال والظاء مکان الضاد لاتفسد عند بعض المشائخ ۔

علامہ شامی فرماتے ہیں:

فینبغی علی ہذا عدم الفساد فی ابدال الثاء سینا والقاف ہمزۃ کماہو عوام زماننا فانہم لایمیزون بینہما ویصعب علیہم جدا کالذال مع الزاء ولاسیما علی قول القاضی ابی عاصم وقول الصفار۔

اسی طرح عالمگیری وحلیہ وفتح القدیر وغیرہا کتب میں ہے۔لہذا بنابر مذہب مفتی بہ کے عاجز کی خود اپنی نماز درست اور مقدار وجوب تجوید سیکھنا واجب اور بحالت عدم سعی خود اس کے ذمہ سے فریضہ کا سقوط موہوی بلکہ بنابر قول بعض فقہائے کرام کے اس پر باقی۔

قسم چہارم: تصحیح حروف کی خلقۃ زبان میں بالکلیہ صلاحیت ہی نہ ہونا عذر سے تعبیر ہے۔لہذا ایسے معذور کی خود اپنی نماز صحیح ہے لیکن وہ امامت نہیں کرسکتا ہے اور بقول بعض فقہاء کے اس پر بھی تصحیح حروف کی کوشش ضروری ہے حتی الامکان کسی صحیح خواں کی اقتدا کرے بمجبوری تنہا نماز پڑھے۔

منیہ میں ہے:لو قرأ الالثغ لب (العالمین باللام)مکان رب لاتفسد۔

غنیۃ میں ہے:

الحاصل ان الثغ یجب علیہ الجہد دائما وصلوتہم جائزۃ ماداموا علی الجہد لکنہم بمنزلۃ الامیین فی حق من یصحح الحروف الذی عجزوا عنہ لایجوز اقتداؤہ بہم ولایجوز صلوتہم اذا ترکوا الاقتداء بہ مع قدرتہم وانما یجوز صلوتہم مع قرأۃ تلك الحروف اذا لم یقدروا علی قرأۃ مایجوز بہ الصلوۃ ممالیس فیہ تلك الحروف واما لوقدروا مع ہذا قراؤ اتلك الحروف فصلوتہم فاسدۃ ایضا لان جواز صلوتہم مع التلفظ بتلك الحروف ضروری فینعدم بانعدام الضرورۃ ہذا ہوالذی علیہ الاعتماد ۔

اسی میں ملتقط سے ناقل ہیں:

لو قرأ فی الصلوۃ الحمد للہ بالہاء مکان الحاء اوقرأ کل ہو اللہ احد بالکاف مکان القاف والحال انہ لایقدر علی غیرہ کما فی الاتراك ونحوہم تجوز صلوتہ ولاتفسد وکذا لو قال الخمد للہ بالخاء المعجمۃ ۔

اسی میں محیط سے ناقل ہیں:

والمختار للفتوی فی جنس ہذہ المسائل انہ ان کان یجتہد آناء اللیل واطراف النہار فی التصحیح ولایقدر علیہ فصلوتہ جائزۃ۔

درمختار وتنویر الابصار میں ہے:

ولا(یصح اقتداء) غیر الالثغ بہ ای بالالثغ علی الاصح کما فی البحر عن المجتبی وحرر الحلبی وابن الشحنۃ انہ بعد بذل جہدہ دائما حتما کالامی فلایؤم الامثلہ ولاتصح صلوتہ لذا امکنہ الاقتداء بمن یحسنہ او ترك جہدہ او وجد قدر الفرض ممالا لثغ فیہ ہذا ہو الصحیح المختار فی حکم الالثغ۔

الحاصل چونکہ ان مقدمات سے جوابات کو زیادہ تعلق تھا اس لئے وہ قدرے تفصیل سے تحریر کئے گئے۔ جوابات کا ہر پہلو انہیں مقدمات پر مبنی ہوگا۔لہذا اب ہر ہر سوال کا جواب باختصار دیا جاتا ہے۔ واللہ الموفق للا تمام۔

جواب سوال اول: لحن اور اس کی دونوں قسمیں جلی وخفی اپنے مقام پر نہایت مشرح ہیں یہاں تک کہ علمائے قرأت بے تجوید کو بھی لحن کہہ دیتے ہیں۔

چنانچہ اتقان شریف میں ہے:وقد عدالعلماء القرأۃ بغیر تجوید لحنا۔

لیکن اس کے احکام شرعیہ کا اظہار بہت ضروری ہے۔لہذا تصریحات فقہا میں مجھے لحن کی تین قسمیں ثابت ہوئیں۔

قسم اول: لحن بمعنی تغنی یعنی جس میں حروف وکلمات متغیر ہوجائیں۔

چنانچہ شامی درمختار کے قول۔تغنی بغیر کلماتہ کے تحت میں فرماتے ہیں:

ای بزیادۃ حرکۃ اوحرف اومد او غیرہا فی الاوائل والاواخر۔

یعنی تغنی جو کلمات کو متغیر کردیتی ہے وہ کلمات کے اول یا آخر میں حرکت یا حرف یا مد وغیرہ کی زیادتی سے حاصل ہوتی ہے۔

لہذا یہ لحن حرام ہے اور اگر معنی میں تغیر کردے تو اس سے نماز فاسد ہوجائے گی۔

چنانچہ غنیۃ میں ہے:

اما اللحن المغیر فحرام بلاخلاف۔

درمختار میں اذان کے لحن کے متعلق فرماتے ہیں:

ولالحن فیه ای تغنی یغیر کلماته فانه لایحل فعله وسماعه کالتغنی بالقرآن۔

احسن الفتاوی وفتاوی بزازیہ میں ہے:ان اللحن حرام بلاخلاف ۔

لہذا ایسا لحن باتفاق حرام ہے۔

قسم دوم:وہ لحن جس میں حروف تو متغیر نہ ہوں لیکن اعراب میں خطا واقع ہوجائے جیسا کہ۔

طحطاوی میں ہے: والخطاء فی الاعراب یقال له لحن۔

یعنی خطائی الاعراب کوبھی لحن کہا جاتا ہے۔

لہذا یہ لحن مکروہ ہے اوراگر معنی بگڑ جائیں تو نماز فاسد ہوجائے گی۔

چنانچہ غنیہ میں ہے:ویکرہ الترجیع والتلحین بقراءۃ القرآن عند عامۃ المشائخ لانه تشبه بفعل الفسقة هذا اذا کان لایغیر الحروف ۔

نورالایضاح ومراقی الفلاح میں ہے:

ویکرہ التلحین و التطریب والخطاء فی الاعراب۔

درمختار میں مفسدات صلوۃ کے بیان میں ہے:

منها القرأة بالالحان ان غیر المعنی والا لا۔

قسم سوم:لحن بمعنی تحسین صوت جس میں قسم اول ودوم کی کوئی خرابی نہ ہو۔لہذا یہ لحن نماز وغیر نماز دونوں میں مستحب ومطلوب ہے۔

مراقی الفلاح میں ہے :اما تحسین الصوت بدونه فهو مطلوب۔

شامی میں ہے:

ان القرأة بالالحان اذا لم تغیرا الکلمة عن وضعها ولم یحصل بها تطویل الحروف حتی لایغیر الحرف حرفین بل مجرد تحسین الصوت وتزیین القراة لایضر بل یستحب عند نا فی الصلوۃ و خارجها کذا فی التتار خانیة۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

جواب سوال دوم: زبان کی داہنی یا بائیں کروٹ جب بالائی داڑھوں سے متصل ہو وہ مخرج ضاد ہے،اب چاہے داہنی جانب سے اس کو نکالا جائے یا بائیں طرف سے۔

چنانچہ جزری میں ہے:

والضاد من حافته اذ ولیا لاضراس من ایسر او یمناها

لہذا زبان کا اگلے دانتوں سے لگنا۔یا فقط زبان کی نوک سے کام لینا۔یا زبان کا تالو کی جانب نہ اٹھنا۔یا اعتماد ضعیف ہوجانا۔یا مخرج لام کے قریب تک استطالت کا نہ ہونا۔یہ ہر ایک ضاد کو مخرج سے ادا ہونے کے موانع ہیں۔"ظا معجمہ" کا مخرج ثنایا علیا اس طرح ہیں کہ جب زبان کی نوک ثنایا علیا کے کنارے سے متصل ہوجائے۔ذ معجمہ اور س مہملہ اور ص مہملہ یہ تینوں زبان کے کنارے اور ثنایا سفلی کی جڑ کے مابین سے نکلتے ہیں یہی ان کا مخرج ہے۔ت فوقانیہ اور ط مہملہ اور د مہملہ یہ تینوں زبان کے کنارے اور ثنایا علیا کی جڑ کے مابین سے نکلتے ہیں یہی ان کا مخرج ہے۔

جزری میں ہے:

والطاء والدال وتاء منه ومن علیا الثنایا والصفیر مستکن منه ومن فوق الثنایا السفلی ۔ والظاء والذال وثا للعلیا۔ من طرفیها ۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

جواب سوال سوم: "ضاد معجمہ" اور "ذ معجمہ" اور "دال مہملہ" کے مخارج تو جواب دوم میں گذر چکے کہ ان میں سے ہر ایک کا مخرج جداگانہ ہے۔لہذا پہلا فرق تو ان میں من حیث المخارج ہوا۔پھر "ضاد معجمہ" مجہورہ۔رخوہ۔مستعلیہ۔مطبقہ۔مصمتہ۔مستطیلہ۔اور "ظا معجمہ" مجہورہ۔رخوہ۔مستعلیہ۔مطبقہ۔مصمتہ۔اور "دال مہملہ" مجہورہ۔شدیدہ۔مستفلہ۔منفتحہ۔مصمتہ۔قلقلہ ہے۔لہذا "ضاد معجمہ" کو "ظا معجمہ" سے صرف ایک صفت استطالت کا فرق ہے کہ "ضاد معجمہ" مستطیلہ ہے۔اور "ظا معجمہ" مستطیلہ نہیں۔اور "ضاد معجمہ" کو "دال مہملہ" سے چند صفات کا فرق ہے کہ "ضاد معجمہ" رخوہ ہے اور "دال مہملہ" اس کی ضد شدیدہ۔اور "ضاد معجمہ" مستعلیہ ہے۔اور "دال مہملہ" اس کی ضد مستفلہ۔اور "ضاد معجمہ" مطبقہ ہے اور "دال مہملہ" اس کی ضد منفتحہ۔اور "ضاد معجمہ" مستطیلہ ہے اور "دال مہملہ" اس کی ضد قصیرہ۔اور "دال مہملہ" قلقلہ ہے اور "ضاد معجمہ" غیر قلقلہ۔

بالجملہ یہ تینوں حروف متباینہ متغایرۃ من حیث المخارج والصفات ہوئے۔اب تلاوت قرآن کریم میں ایک کو دوسرے سے قصدا بدلنا حرام اور گناہ عظیم وتحریف قرآن کریم ہے۔اب باقی رہی مشتبہ الصوت کی بحث۔لہذا اشتباہ صوت کے اسباب یا تو ایک کا دوسرے حرف کے ساتھ مخرج میں اتحاد یا قرب ہوگا۔یا مشارکت فی الصفات۔یا قصور زبان۔

قسم اول:یعنی اتحاد مخرج یا قرب کی وجہ سے مشتبہ ہونا۔لہذا اس اشتباہ کو زائل کرنے والی چند

چیزیں ہیں۔ ہر حرف کا تغایر وتباین وضعی بلکہ ہر ایک کی صحت طبعی امتیاز شبہات کے لئے بہت کافی ہے۔ معہذا صفات عامہ یا خاصہ کا فرق بلکہ ایک کی ادائیگی کی مخصوص کیفیات مشتبہ الاصوات میں ایسا بین فرق پیدا کردے گی کہ ہر سامع عام ازیں کہ وہ فن تجوید سے مس رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو مگر تغایر مشتبہات کو بآسانی معلوم کرلیتا ہے اور مغایر المخارج حروف میں ان تمام امور کے باوجود خود تغایر بین المخارج ایک بڑی امتیاز پیدا کرنے والی چیز ہے۔

الحاصل اس قسم اول کے مشتبہ الصوت حروف کا فرق سیکھنا نہایت ضروری کہ اکثر اس میں امتیاز نہ ہونے کی وجہ سے کلمہ بدل کر معنی متغیر ہوجاتے ہیں۔

قسم دوم: یعنی حروف کا مشارکت فی الصفات کیوجہ سے مشتبہ الصوت ہونا۔ لہذا اس اشتباہ کو زائل کرنے والی بھی چند چیزیں ہیں۔

(۱) ہر حرف کا تغایر وتباین وضعی۔

(۲) ہر ایک کی صوت طبعی۔

(۳) ہر ایک حرف کے ادا کی مخصوص رعایات۔

(۴) بعض میں اس کی خاص صفات۔ کہ ان میں سے ہر ایک ایسے مشتبہ الاصوات حروف میں بین فرق پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ پھر سب کا اجماع تو کمال کا امتیاز پیدا کردے گا۔ اور اگر ان متشارک فی الصفات حروف میں تغایر بین المخارج بھی ہے تو یہ ایک خود زبردست فرق کرنے والی چیز ہے۔ لہذا اس قسم دوم کے مشتبہ الاصوات کا فرق سیکھنا بھی حتمی اور لازمی ہے کہ اس فرق کے نہ ہونے کی وجہ سے بھی کلمہ متغیر ہوکر معنی اکثر بگڑ جاتے ہیں مگر اس وقت چند متجو داور نئے مدعیان علم تجوید نے مشارکت فی بعض الصفات کا نام اتحاد ذات سمجھ رکھا ہے۔ کہ ''ضاد معجمہ'' کو بالقصد ''ظا معجمہ'' پڑھنا شروع کردیا ہے اور جب کوئی شخص اعتراض کردیتا ہے تو نہایت جرأت ودلیری سے کہہ دیتے ہیں کہ ''ضاد معجمہ'' کو چونکہ ''ظا معجمہ'' سے اکثر صفات میں مشارکت ہے اس لئے اس کو ''ظا معجمہ'' کی آواز میں ادا کیا جاتا ہے لہذا میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس جیسے مغالطوں کی حقیقت سے آگاہ کروں۔

چنانچہ اگر بقول ان کے مشارکت فی بعض الصفات ایک حرف کی آواز کو دوسرے کی آواز میں فنا کردیتی ہے تو ملاحظہ ہو کہ ''حا مہملہ'' اور ''شین معجمہ'' میں پانچ صفات میں مشارکت ہے۔ صرف ''شین

معجمہ'' میں ایک صفت تفشی زائد ہے۔ ''دال مہملہ'' اور ''با موحدہ'' میں پانچ صفات میں مشارکت ہے۔ صرف ایک صفت میں فرق ہے کہ ''دال مہملہ'' مصمتہ ہے اور ''با موحدہ'' مذلقہ ہے۔ یہ دو مثالیں تھیں کہ جن میں ایک ایک صفت کا فرق تھا۔ اب دو مثالیں وہ لیجئے جن میں ایک صفت کا بھی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ ''ہا'' اور ''ثا مثلثہ'' کہ ان دونوں میں ایک صفت کا بھی فرق نہیں ہے۔ کہ یہ دونوں مہموسہ۔ رخوہ۔ مستفلہ۔ منفتحہ۔ مصمتہ۔ ہونے میں برابر ہیں۔ اسی طرح ''کاف وتا فوقانیہ'' کہ یہ دونوں بھی پانچوں صفت مہموسہ۔ شدیدہ۔ مستفلہ۔ منفتحہ۔ مصمتہ میں برابر ہیں۔ لہذا اب ان نئے قاریوں کو چاہئے کہ پہلی دونوں مثالوں میں چونکہ اکثر صفات میں مشارکت ہے صرف ایک ایک صفت کا فرق ہے۔ جیسے ''ضاد معجمہ'' اور ''ظا معجمہ'' میں ایک صفت کا فرق ہے۔ تو جب باوجود ایک صفت کا فرق ہوتے ہوئے ''ضاد معجمہ'' ہم آواز ''ظا معجمہ'' کا ہی نہیں ہوگیا بلکہ ذات ''ظا معجمہ'' بن گیا۔ لہذا اس قاعدہ کی بنا پر ''ش معجمہ'' ہم آواز ''جیم'' اور ''زا'' اور ''دال مہملہ'' ہم آواز ''با موحدہ'' کا ہی نہیں ہوجائے بلکہ ''ش معجمہ'' ذات ''حا مہملہ'' اور ''دال مہملہ'' اور ذات ''با موحدہ'' بن جائے۔

اب باقی رہیں آخر کی دو مثالیں تو ان میں مشارکت فی بعض الصفات ہی نہیں بلکہ مشارکت فی کل الصفات ہے۔ اور ''ضاد معجمہ'' اور ''ظا معجمہ'' میں تو ایک صفت کا فرق بھی تھا اور یہاں تو فرق کا نام ہی نہیں۔ لہذا ایک کو دوسرے کی ہم آواز ہونے کا تو کیا ذکر بلکہ ''ہا'' کو ''ث مثلثہ'' اور ''ک'' کو ''ت فوقانیہ'' پڑھنا چاہئے باوجودیکہ ہر ناخواندہ بھی ''ح مہملہ'' اور ''شین معجمہ'' میں اور ''دال مہملہ'' اور ''ب موحدہ'' میں اور ''ہا'' اور ''ثا مثلثہ'' میں اور ''ک'' اور ''ت فوقانیہ'' میں بین فرق سمجھتا ہے۔

بالجملہ مشتبہ الصوت ہونے کا مدار یہ متجودین کیا اب بھی مشارکت فی الصفات ہی قرار دینگے۔ اور سنئے کہ ''ط مہملہ'' اور ''ت فوقانیہ'' مشتبہ الصوت ہیں باوجودیکہ چار صفات میں متغایر ہیں کہ ''ط مہملہ'' مجہورہ۔ مستعلیہ۔ مطبقہ۔ قلقلہ ہے اور ''ت فوقانیہ'' میں اس کی اضداد صفات ہیں یعنی مہموسہ۔ مستفلہ۔ منفتحہ۔ غیر قلقلہ۔ لہذا اگر مشتبہ الصوت ہونے کا مدار صرف مشارکت فی الصفات ہوتا تو باوجود چار صفات کے فرق ہوتے ہوئے یہ دونوں مشتبہ الصوت نہ ہوتے حالانکہ ان کو مشتبہ الصوت تسلیم کیا گیا ہے۔ علاوہ بریں ان متجودین نے مشتبہ الصوت ہونے کا یہ مطلب کہاں سے تراشا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ایسے ہم آواز ہوجائیں کہ جس میں سامع کو کوئی امتیاز ہی نہ ہوسکے۔ ملاحظہ ہو کہ یہی ''ت فوقانیہ'' اور ''ط مہملہ'' مشتبہ الصوت ہیں باوجودیکہ ہر سامع ان کی ادئیگی کے وقت ان میں بین فرق بآسانی معلوم

کرلیتا ہے۔لہذا ''ض معجمہ'' کو ''ظ معجمہ'' پڑھنا اور گلوخلاصی کے لئے مشتبہ الصوت کو آڑ بنالینا ان متجودین کا قرآن کریم میں تحریف کرنا ہے ورنہ ان متجودین کے ان قاعدہ کی بنا پر کیا ہر مشتبہ الصوت کا یہ طریقہ تلاوت ہے۔ پھر لطف کی ایک یہ بات ہے کہ مشابہت جانبین سے مساوات چاہتی ہے۔لہذا اس کی کیا وجہ ہے کہ ''ض معجمہ'' کو ہم آواز'' ظ معجمہ'' کیا جاتا ہے اور'' ظ معجمہ'' کو ہم آواز'' ض معجمہ'' کے نہیں کیا جاتا کیونکہ ''ض معجمہ'' میں ایک صفت استطالت ''ظ معجمہ'' سے زائد ہے۔لہذا باوجود اس کے اس کے خلاف پر کونسی دلیل ترجیح قائم ہوگئی ہے۔اب باقی رہا یہ عذر کہ ''ض معجمہ'' کی ادائیگی میں نہایت دشواری اور اشکال ہے تو کیا یہ عذر تبدیل حرف کو جائز کردے گا۔علاوہ بریں جس شخص کو جس حرف کے ادا کرنے میں دشواری ہو تو کیا اس کے لئے یہی قاعدہ ہے کہ وہ اس طرح تبدیل حرف کرلیا کرے۔لہذا پھر تو ہر شخص کا نیا ہی قرآن ہوجائے گا۔ نعوذباللہ من ھذہ الخرافات۔

قسم سوم: یعنی زبان کے قصور کی وجہ سے مشتبہ الصوت ہونا۔لہذا اس کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) عجز۔ (۲) عذر۔ان دونوں کی تعریف اور حکم مقدمہ چہارم کی قسم سوم و چہارم میں مفصل گزر چکا۔

بالجملہ خلاصہ جواب یہ ہے کہ ''ض معجمہ'' ان دونوں حرف ''ظ معجمہ'' اور ''د مہملہ'' سے ایک بالکل علیحدہ اور ممتاز حرف ہے۔لہذا ''ض معجمہ'' نہ ''ظ معجمہ'' پڑھا جائے گا نہ ''د مہملہ''۔اور ''د مہملہ'' مفخم نہیں ہوتی۔اس کو مفخم لکھنا غلطی ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

جواب سوال چہارم: سنت یہی ہے کہ رکوع میں ''سبحان ربی العظیم'' ہی کہا جائے اور عظیم میں ''ظا'' کو مخرج سے ادا کیا جائے اور بصورت عجز یا عذر اگر ''زا'' سے کہا اور وہ بجائے عظیم کے عزیم بن گیا تو یہ حضرت حق سبحانہ تعالیٰ کی شان اعلیٰ میں سخت گستاخی کا حکم ہوگیا کہ عزیم کے معنی قاموس میں۔ العدو الشدید کے ہیں۔لہذا شامی نے ایسے عوام کے لئے جو ''ظ'' ادا نہ کرسکتے ہوں یہ حکم نقل کیا کہ وہ بجائے ''سبحان ربی العظیم'' کے ''سبحان ربی الکریم'' کہا کریں۔

عبارت یہ ہے:

السنۃ فی تسبیح الرکوع سبحان ربی العظیم الا ان کان لایحسن الظاء فیبدل بہ الکریم لئلا یجری علی لسانہ العزیم فتفسد بہ الصلوۃ کذا فی شرح درر البحار فلیحفظ فان العامۃ عنہ غافلون حیث یاتون بدل الظاء بزای مفخمۃ۔

اور صورت خطا میں بسبب تغیر معنی کے نماز فاسد ہوجائے گی۔

اقول قولہ تفسد اشارۃ الی ھذہ واما فی العجز فالمختار عدم الفساد کما بینا فی المقدمۃ الرابعۃ۔

(۲) ''سبحان ربی الاعلیٰ'' کی عین کو بھی صحیح طور پر ادا کیا جائے کہ عین کا مخرج سے ادا کرنا عوام کو زیادہ دشوار نہیں ہے بخلاف ''ظا'' کے کہ اس کی ادا مشکل ہے۔اب چونکہ ''آلیٰ'' میں دوسرے غیر مناسب شان حق جل جلالہ معانی بھی ممکن ہیں۔لہذا ''اعلیٰ'' کو ''آلیٰ'' ادا ہونے سے بچانا ضروری ہے اور صورت خطا میں احتیاط اسی میں ہے کہ نماز کے فساد کا حکم دیا جائے۔کہ ''آلیٰ'' کے معنی صراح میں بزرگ سرین کے بھی ہیں اور صورت عجز اور عذر میں نماز فاسد نہ ہوگی۔کما فصلنا فی المقدمۃ الرابعۃ۔

(۳) ''و یاك'' میں ایک حرف یعنی ہمزہ حذف کیا۔لہذا صورت خطا میں بقاعدہ متقدمین بوجہ تغیر معنی کے فساد نماز کا حکم ہے۔اب باقی رہی۔

طحطاوی کی یہ عبارت:

وکثیرا مایقع فی قراۃ بعض القرویین والاتراك والسودان ویاك نعبد بواو مکان الھمزۃ والصراط الذین بزیادۃ الالف واللام وصرحوا فی الصورتین بعدم الفساد وان غیر المعنی۔

لہذا اس میں یا عجز کی بنا پر عدم فساد کا حکم ہے۔یا باعتبار اقوال متاخرین کے وسعت ملحوظ ہے۔

فالاولیٰ الاخذ فیہ بقول المتقدمین لانضباط قواعدھم وکون قولھم احوط وھوالذی صححہ المحققون من اھل الفتاوی۔

(۴-۵) ''ض معجمہ'' کی جگہ اگر عمداً ''ظ معجمہ'' یا ''د مہملہ'' پڑھی تو اس کی نماز یقیناً فاسد۔اور اگر وہ اس کی عادت بھی مقرر کرے تو اس کی امامت ہرگز درست نہیں۔اس وقت جو نئے قاری ''ض معجمہ'' کو بالقصد ''ظ معجمہ'' پڑھتے ہیں وہ اپنا حکم مقدمہ چہارم کی بحث میں تلاش کرلیں۔اب رہے ''د مہملہ'' پڑھنے والے چونکہ مدعی تجوید نہیں اس لئے ان کا حکم ظائیوں کا سا نہیں ہے اگر چہ ''ض'' کو ''د'' پڑھنا بھی غلط ہے۔اور اگر خطا ''ض'' کی جگہ ''ظ'' یا ''د'' پڑھی تو اس کا حکم ہر جگہ ایک نہیں جہاں معنی متغیر ہوجائیں نماز فاسد ہوجائے گی اور جہاں معنی متغیر نہ ہوں وہاں نماز فاسد نہیں ہوگی۔''غیر المغضوب'' میں ''ض'' کو ''ظ'' پڑھنے میں چونکہ معنی متغیر ہوگئے۔لہذا نماز فاسد اور ''ولا الضالین'' میں ''ض'' کی جگہ ''ظ'' یا ''د'' پڑھنے

میں چونکہ معنی متغیر نہیں ہوئے۔ لہذا نماز فاسد نہیں ہوگی۔

چنانچہ غنیہ میں قاضی خان سے ناقل ہیں:

ولیس فی القرآن غیر المغضوب بالظاء والذال المعجمتین تفسد اذ لیس لهما معنی ولا الضالین بالظاء المعجمه اوالدال المهملة لاتفسد لوجود لفظهما فی القرآن وقرب المعنی۔

لہذا نماز تو "غیر المغضوب" پر ہی فاسد ہوجائے گی "ولا الضالین" تو نماز کے باہر کرے گا۔

اور بحالت عجز وعذر "ض" کی "ظ" یا "ذ" ہی نہیں بلکہ اگر کوئی اور حرف بھی بدلا تو خود اس کی نماز درست ہے۔ کمامر فی مبحث العجز والعذر۔

(۶) رحلة الشتاء والصیف کے "ص" کی جگہ اگر "س" ادا کیا تو نماز فاسد ہوجائے گی۔

غنیۃ میں ہے۔

رحلة الشتاء والسیف بالسین مکان الصاد تفسد للبعد الفاحش۔

اور عجز کی حالت میں بنا بر اتحاد مخرج یا فرق بمشقۃ یا عموم بلوی وغیرہ کے خود اس کی نماز درست۔ کماهو مشرح فی کتب الفقه۔

(۷) فائزون "ذ" سے پڑھنے میں بحالت خطا غالبا نماز فاسد ہوجائے گی کہ صراح اور قاموس ومنتخب وتاج المصادر وغیاث میں اس کے کوئی معنی نہیں لکھے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بے معنی اور مہمل لفظ ہے۔ اسی بنا پر فساد کا حکم ہے اور حالت عجز میں نماز درست۔

(۸) اذا جاء نصر اللّٰہ میں "صاد" کی جگہ "س" پڑھنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

چنانچہ غنیۃ میں ہے۔

قرأ اذا جاء نسر اللّٰه بالسین لاتفسد لان مَن جملة معانية القطعة من الجیش وبتقدیره یصح المعنی فان جیش اللّٰه هم الملائكة مستلزم للنصر۔

(۹) حمالة الحطب کی "ط" کی جگہ اگر "ت" بصورت خطا ادا کی تو نماز فاسد ہوجائے گی۔

غنیۃ میں ہے۔

ولو قرا حمالة الحتب بالتاء مکان الطاء تفسد ۔

اور بحالت عجز درست۔

(۱۰) یکرب "زا" سے پڑھنے کی صورت میں اغلب یہی ہے کہ بحالت خطا نماز فاسد ہوجائے کیونکہ یہ معنی بہت بعید ہوئے جاتے ہیں اور بصورت عجز درست۔ لہذا اگر ایک حرف کا دوسرے حرف سے بدلنا بالعمد ہے تو اس کی نماز فاسد اور امامت درست نہیں اور اگر بالخطا ہے تو بصورت تغیر معنی نماز فاسد اور بصورت صحت درست اور بصورت فساد اس کے مقتدیوں کی بھی نماز فاسد اور عجز کی حالت میں خود اس کی نماز درست لیکن وہ صحیح خوانوں کی امامت نہیں کرسکتا۔ وهکذا حکم المعذور یہ خلاصہ جواب چہارم ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

جواب سوال پنجم: ان مقامات میں الف کی زیادتی سے "لا" نفی بن جائے گا اور اس میں بجائے اثبات کے نفی کے معنی پیدا ہوجائیں گے تو اس میں معنی بہت زیادہ بگڑ جائینگے۔ لہذا بنا بر قول احوط حضرت امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے فساد نماز کا حکم ہے۔

چنانچہ شامی سے ناقل ہیں:

ولو زاد حرفا لایغیر المعنی لاتفسد عندهما وعن الثانی روایتان کمالو قرأوانهی عن المنکر بزیادة الیاء ویتعد حدوده یدخلهم نارا وان غیر یفسد ۔

اور بحالت عجز بھی اس میں حکم فساد ہی زیادہ احوط ہے۔ کہ اس کے امتیاز میں زیادہ دشواری نہیں ہے۔ فلیتأمل۔

جواب سوال ششم: تعوذ کے آخر میں چونکہ شیطان کا نام ہے اور اس کے بعد اس کی صفت رجیم ہے۔ لہذا اس کا کسی اسم الٰہی سے وصل مناسب نہیں ہے اگرچہ وصل ووقف سے علمائے کرام نے معنی کا تغیر تسلیم نہیں کیا ہے۔ ہاں اگر معنی پر نظر رکھتے ہوئے اور اس اتصال کو اچھا سمجھتے ہوئے اس نے عمدا وصل کو اختیار کیا تو یہ گنہگار رہوگا، جیسا کہ شامی کی عبارت سے مصرح ہے:

والاولیٰ الاخذ بهذا فی العمد۔

ہاں بسم اللہ شریف کو اسمائے الٰہی سے وصل کرسکتے ہیں۔ کماهو مصرح فی کتب التجوید۔

جواب سوال ہفتم: مقدمہ چہارم سے معلوم ہو چکا کہ عاجز اور معذور پر یہ واجب ہے کہ تصحیح حروف میں رات دن پوری کوشش کریں اور اگر صحیح خواں کی اقتدا کرسکتے ہوں تو جہاں تک ممکن ہو اس کی

اقتدا کریں۔ یا وہ آیتیں پڑھیں جس کے حروف صحیح ادا کر سکتے ہوں اور اگر یہ صورتیں ممکن نہ ہوں تو اس زمانۂ کوشش میں خود انکی نماز ہو جائے گی۔ باقی رہی امامت تو یہ دونوں اپنے اپنے مثل کی امامت بھی کر سکتے ہیں۔ لہذا ایسا مجود کہ جو حروف کو صحیح طور پر ادا کر لیتا ہے یہ دونوں اس کے امام نہیں بن سکتے ہیں۔

چنانچہ غنیہ میں ہے:

والذی ینبغی ان یکون الحکم فیه کالحکم فی الثغ انه یجتهد فی اصلاح لفظه ولاتفسد صلوته مادام علی الاجتهاد ولکن لایجوز لغیره الاقتداء به فاعلموا هذا الحکم فی کل من لایمکنه النطق بحرف وفصلنا فی المقدمة الرابعة۔ والله تعالیٰ اعلم بالصواب وصلی الله علیٰ خیر خلقه سیدنا محمد وآله واصحابه اجمعین۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۶۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ رمضان المبارک میں تراویح کے اندر ختم کلام اللہ کے وقت تین مرتبہ سورۂ اخلاص جو پڑھی جاتی ہے تو آیا یہ تین مرتبہ پڑھنا شرع شریف سے ثابت ہے یا محض حفاظ کا طریقہ؟ اگر یہ ثابت ہے تو برائے کرم بالدلائل اظہار فرما دیجئے۔

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

قل ھو اللہ شریف کا ختم تراویح میں تین مرتبہ پڑھنا محض حفاظ کا طریقہ نہیں بلکہ متاخرین نے اسے مستحب قرار دیا ہے۔

چنانچہ فقہ کی مشہور کتاب غنیہ میں ہے:

وقراءة قل هو الله احد ثلث مرات لم يستحسنها بعض المشائخ وقال الفقيه ابو الليث هذا شئ استحسنه اهل القرآن وائمة الامصار فلاباس به۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۲۶۶۔۲۶۷۔۲۶۸۔۲۶۹)

حضرت ضیغم سنیت حامی سنیت ماحی بدعت عالم اہل سنت والجماعۃ مولانا المکرم ذو المجد والکرم مولانا مولوی مفتی شاہ محمد اجمل صاحب زید مجدھم مفتی سنبھل ضلع مراد آباد۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ۔

حضور والا فقیر یہ چند سوالات بغرض حضور جوابات خدمت بابرکت بالا درجت میں روانہ کرتا ہے جوابات سے سرفرازی بخشی جائے۔

سوال اول: حفاظ وقراء حضرات قرآن پاک کی کوئی سورۃ یا رکوع لہجے کے ساتھ قرأت سے پڑھتے ہیں تو بڑی آیت ایک سانس میں نہ پڑھنے کی بنا پر درمیان آیۃ پر وقف کر دیتے ہیں۔ اور پھر جہاں سے وقف کرتے ہیں وہاں سے یا اس کے اوپر سے دوسری سانس سے پڑھتے ہیں۔ اس طرح بعض بعض لفظ تکرار سے پڑھے جاتے ہیں جیسے "وقال الذین کفروا ربنا ارنا الذین اضلنا من الجن والانس" پر وقف کر کے پھر سے دوسری سانس میں "تتنزل علیهم الملئکة" سے پڑھا۔ یا "لو انزلنا هذا القرآن علی جبل لرأیته" پر وقف کیا اور "المهیمن العزیز الجبار المتکبر" پڑھا۔ یا سورۂ بقرہ کا پہلا ہی رکوع شروع کیا اور بالغیب پر وقف کر کے پھر بالغیب سے پڑھنا شروع کیا۔ یا "وقال الذین کفروا لا تسمعوا لهذا القرآن والغوا فیه" پر وقف کر دیا کچھ ٹھہرا پھر "والغوا فیه لعلکم تغلبون" پڑھا۔ علی ھذا القیاس۔ اس طرح تکرار سے قرآن شریف پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کس بنا پر مفصل مدلل ارشاد فرمائیں۔ زید یہ کہتا ہے کہ تکرار الفاظ کے ساتھ قرآن شریف پڑھنا صحیح نہیں ہے جیسا کہ قراء اور حفاظ پڑھتے ہیں کہ "تتنزل" پر وقف کر کے یا "من الجن والانس" پر وقف کر کے یا "علی جبل لرأیته" پر وقف کر کے۔ یا "بالغیب" پر وقف کر کے دوبارہ پھر تنزل پر سے۔ یا من الجن والانس۔ یا علی جبل لرأیته۔ یا بالغیب سے پڑھنا صحیح نہیں۔ یا ایسا ہی ہے جیسا کہ "اذا بطشتم بطشتم جبارین" یا۔ یعلمون یعلمون یا قواریر قواریر یہ جو لفظ بتکرار آئے ہیں۔ لہذا ان کے علاوہ جہاں تکرار سے الفاظ نہ ہوں وہاں تکرار سے پڑھنا غلط ہے زید کا قول صحیح ہے یا نہیں کیا حکم شرعی ہے؟۔

سوال دوم: کوئی آیۃ پر لا بنا ہو تو وہاں ٹھہرنا وقف کرنا جیسے سورہ فاتحہ میں رب العالمین پر وقف کر دیا۔ پھر الرحمٰن الرحیم پڑھا۔ یا مستقیم پر وقف کر کے صراط الذین انعمت علیهم پڑھا۔ یا سورۂ ناس میں الخناس پر وقف کر کے الذی یوسوس پڑھا۔ یا سورۂ فلق میں اذا وقب پر وقف کر دیا پھر ومن شر النفثت پڑھا۔ یا سورۂ بقرہ شریف میں لعلکم تتقون پر وقف کر کے الذین

جعل لکم الارض فراشا والسماء بناء پڑھا۔ یا سورہ ماعون میں ساھون پروقف کیا پھر الذین ھم یراؤن ویمنعون الماعون پڑھا۔ اس طرح جہاں گول آیۃ پرلا ہوتو وہاں پروقف کرنا جائز ہے یا نہیں؟۔

زید کہتا ہے کہ گول آیت پر لا ہوتو وہاں پر وقف کرنا جائز نہیں۔ سابقہ قراء کے خلاف اپنی طرف سے جدت ہے جوقواعد حجاج ابن یوسف کے زمانہ میں قراء نے مقرر کیے ہیں ان کے خلاف ہے۔ لہٰذا رب العلمین پر وقف کرکے الرحمٰن الرحیم پڑھنا۔ یا مستقیم پروقف کرنا۔ یا لعکم تتقون پر وقف کرنا علی ھذا القیاس۔ جہاں پر گول آیۃ لا ہو وہاں پر وقف کرنا صحیح نہیں ہے۔ وقف کرکے الرحمٰن الرحیم۔ یا۔ صراط الذین۔ یا۔ الذی جعل لکم الارض پڑھنا صحیح نہیں ہے۔ نیز یہ بھی کہتا ہے کہ الخناس پروقف کرکے الذی یوسوس پڑھنا غلط کہ الخناس موصوف ہے، الذین اسم موصول یوسوس صلہ، صلہ موصول سے مل کر صفت ہوگی۔ لہٰذا اسم موصول کی ضمیر کس طرف پھیری جائیگی جب الخناس پر وقف کر دیا۔ زید کا قول صحیح ہے یا غلط شرعاً کیا حکم ہے؟۔

سوال سوم: سورۂ اخلاص اس طرح پڑھنا کہ قل ھو اللہ احدن اللہ الصمد یعنی احد پر نہ ٹھہرنا وقف نہ کرنا بلکہ احد کی دال پر پیش پڑھ کر نون قطنی اللہ الصمد میں اللہ سے پہلے بڑھا کر احدن اللہ الصمد پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟۔ زید کا قول ہے نون قطنی بڑھا کر احدن اللہ الصمد پڑھنا صحیح نہیں ہے کہ احــد پر وقف مطلق پر ہے، وقف مطلق پر وقف نہ کرنا اپنی جدت ہے، قرائے سابقہ کے خلاف۔

سوال چہارم: سورۂ لہب میں تب کی ب مشدد ہے، وتب کو اس طرح پڑھنا کہ ب دوبارادا ہو ضروری ہے یا نہیں؟ بعض حفاظ اس طرح پڑھتے ہیں کہ وتب پر وقف نہیں کرتے بلکہ وتب کی ب دو مرتبہ پڑھتے ہیں، ایک بار وتب کے ساتھ، دوسری بما اغنیٰ عنہ کے ساتھ، یعنی وتبَّ ما اغنیٰ عنہ اس طرح پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟۔ بینوا وتوجروا

المستفتی، فقیر محمد عمران قادری رضوی مصطفوی غفرلہ ربہ محلّہ منیر خاں پیلی بھیت شریف

١٩ محرم الحرام ٦ ٧ ١٣ھ

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

(ا) جب کلام تام نہ ہو اور کلمات کے درمیان معنوی تعلق بھی ہو اور لفظ کے اعتبار سے بھی ایسا تعلق ہو کہ ایک کلمہ مبتدا ہو اور دوسرا خبر ہو۔ یا ایک معطوف علیہ ہو دوسرا معطوف ہو۔ یا ایک موصوف ہو دوسرا صفت ہو۔ یا ایک مضاف ہو دوسرا مضاف الیہ ہو۔ یا ایک رافع ہو دوسرا مرفوع ہو۔ یا ایک ناصب ہو اور دوسرا منصوب ہو۔ یا ایک ذوالحال ہو دوسرا حال ہو۔ یا ایک مستثنیٰ ہو دوسرا مستثنیٰ منہ ہو۔ یا ایک مفسر ہو دوسرا مفسِر ہو۔ یا ایک ممیز ہو دوسرا تمیز ہو۔ یا ایک موصول ہو دوسرا صلہ ہو۔ یا ایک شرط ہو دوسرا جزا ہو۔ یا ایک عامل ہو دوسرا معمول ہو۔ یا اور لفظی تعلقات ہوں تو ایسے کلمات کے درمیان باختیار وقف نہ کیا جائے۔ اور اگر بحالت اضطرار ان کے درمیان سانس ہی ٹوٹ گیا یا کھانسی آ گئی۔ یا سہو ہو گیا اور ان مجبوریوں کی بنا پر وقف کرنا پڑ گیا۔ تو جس کلمہ پر وقف کیا ہے اس کو دوہرایا جائیگا۔ یعنی پھر اسی سے سانس کی ابتدا کرنی ضروری ہے۔

چنانچہ علامہ علی قاری منح فکریہ شرح جزریہ میں فرماتے ہیں:

وکذا لووقف علی المضاف دون المضاف الیہ والصفۃ دون الموصوف والرافع دون المرفوع والناصب دون المنصوب والمنصوب دون الناصب وکذا الوقف علی المعطوف دون المعطوف علیہ وعلی ان واخواتھا دون اسمھا واسمھا دون خبرھا وعلی کان واخواتھا دون اسمھا واسمھا دون خبرھا وعلی ظننت واخواتھا دون منصوباتھا وعلی صاحب الحال دونھا وعلی المستثنیٰ منہ دون الاستثناء وعلی المفسر دون المفسر وعلی الذی وما ومن دون صلاتھن وعلی صلاتھن دون معمولا تھن وعلی الفعل دون مصدرہ والتہ وعلی حرف الاستفھام دون ما استفھم بھا عنہ وعلی حروف الشرط دون المشروط وعلی المشروط دون الجزاء وعلی الامر دون جوابہ الا ان یکون القاری مضطرا فانہ یجوز الوقف حال اضطرارہ کا نقطاع ونحوہ لکن اذا وقف یبتدئی من الکلمۃ التی وقف علیھا۔ (منح فکریہ مصری صفحہ ٦٠)

تو سائل نے جن آیات کے متعلق سوال کیا ہے تو ان میں وقف نہ کلام تام پر ہوا نہ آیت پر۔ بلکہ وہ ایسے کلمات کے درمیان ہوا جن میں تعلق معنوی بھی ہے اور تعلق لفظی بھی ہے۔ تو جس کلمہ پر وقف ہو اسی کو دوہرایا جائیگا اور اسی سے ابتدا کی جائیگی۔ لیکن اگر قال الذین کفروا ربنا ارنا الذین اضلنا من الجن والانس سے نہ کی جائے کہ اس میں فعل و معمول فعل میں فصل ہو جائیگا۔ بلکہ الذین اضلنا سے

ابتدا کی جائے۔ اسی طرح " لو انزلنا هذا القرآن على جبل لرأيته " پر سانس ٹوٹی تو علی جبل سے ابتدا نہ کی جائے کہ اس کے فعل اور معمول میں فصل ہو جائیگا، بلکہ لرأيته سے ابتدا کی جائے۔ اسی طرح سورۂ بقرہ میں جب بالغيب پر سانس ٹوٹی تو ابتدا بالغيب سے نہ کریں بلکہ یومنون سے ابتدا کریں تا کہ فعل اور اس کے معمول میں فصل نہ ہو۔ بالجملہ ایسی تکرار کرنا اور دوہرانا متعلقات اتصال معنوی اور لفظی کے اظہار کے لئے ہے تو قرآن کریم میں ایسی تکرار نہ فقط جائز بلکہ حسن ہے بلکہ بعض مقامات میں تو واجب ہے۔ اسی منح فکریہ شرح جزریہ میں ہے:

ومن انقطع نفسه على ذلك وجب عليه ان يرجع الى ما قبله ويصل الكلام بعضه ببعض فان لم يفعل اثم انما يستقيم في الامثلة الاولىٰ واما فى الامثلة الثانية فينبغي ان يعود فالعو داحمد ۔

زید چونکہ مسائل قرأت سے ناواقف ہے تو اس کا قول نہ فقط غلط ہے بلکہ نہایت جہالت پر مبنی ہے۔ اس کو اتنی جرأت نہ کرنی چاہئے کہ اس کے قول سے امت کا غلطی پر مجتمع ہونا لازم ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) جب گول آیت پر لا ہو تو وہاں پر وقف کرنا جائز ہے اگر چہ اس پر وقف کا نہ کرنا ہی اولیٰ ہے جامع العلوم میں ہے (لا) " فالوجهان الوصل والوقف لكن الاول افضل " ہاں جب آیت لا پر سانس ٹوٹ جائے تو اس کو دہرائے نہیں بلکہ ابتداء اس کلمہ سے کرے جو بعد آیت کے ہے کہ حقیقۃ آیت ہی تو وقف کا محل ہے۔

منح فکریہ میں ہے:

ان رؤس الآى وغيرها فى حكم واحد من جهة تعلق ما بعده بما قبله وعدم تعلقه ولذا جعلوا رمزلا ونحوه فوق الفواصل كما كتبوها فوق غيرها مع اتفاقهم على جواز الابتداء بعد رؤس الآى۔

لہٰذا زید کا قول غلط ہے۔ خود حدیث شریف میں ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے آیت لا پر وقف کیا اور ابتدا مابعد آیت کے کلمہ سے کی۔

كان النبى ﷺ اذا قرأ اية فيقول بسم الله الرحمٰن الرحيم ثم يقف الحمد لله رب

العلمين ۔ ثم يقف الرحمٰن الرحيم ثم يقف مالك يوم الدين ثم يقف الح (رواه ام سلمه رضى الله عنهما) (منح فکریہ صفحہ ۵۹)

تو اس حدیث شریف سے ثابت ہو گیا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے العلمين پر وقف کیا پھر الرحمٰن سے ابتدا کی اور الرحیم پر وقف کیا تو یہ دونوں آیات لا کی ہیں تو اس حدیث شریف سے ثابت ہو گیا کہ حضور نے آیت لا پر وقف کیا اور مابعد آیت کے کلمہ سے ابتدا فرمائی۔ تو زید کا قول حدیث شریف کے خلاف ہوا۔ اور فعل شارع علیہ السلام کے مخالف ثابت ہوا تو زید کو ایسی دلیری پر توبہ واستغفار کرنی چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۳) جس کلمہ پر تنوین ہو اور اس کے بعد معرف باللام کلمہ ہو تو ان میں وصل کا یہ طریقہ ہے کہ ہمزہ کی حرکت نقل کر کے ماقبل کو دی جائیگی۔ اور جب پہلے کلمہ کے آخر میں تنوین تھی اور تنوین نون ساکن ہوتا ہے اور ساکن کو حرکت صرف کسرہ ہی دیا جاتا ہے تو خفی قلم سے نون کو لکھ کر اس کے نیچے کسرہ دیدیا جاتا ہے جیسے سورہ شعراء میں ہے كذبت عادٌن المرسلين اور سورہ النجم میں ہے اهلك عادًا نِ الاولىٰ ۔ ان آیات معرف باللام المرسلین اور الاولیٰ کی ہمزہ کی حرکت نقل کر کے عاد کی تنوین یعنی نون ساکن کو کسرہ دیا گیا۔

چنانچہ سراج القاری شرح قصیدہ شاطبی میں ہے " ان ابن كثير وابن عامر والكوفيين يقرؤن فى الوصل عاد نِ الاولىٰ " بكسرالتنوين وسكون اللام وبعدها همزة مضمومة ۔

لہٰذا یہی قاعدہ قل هو الله احد نِ الله الصمد میں ہے کہ احد پر تنوین ہے اور اس کے بعد لفظ اللہ معرف باللام ہے تو ہمزہ کی حرکت نون ساکن کو بصورت کسرہ دی۔ یہ جب ہے کہ احد اور اللہ کے درمیان وصل مقصود ہو اگر چہ احد پر آیت ہے اور اس پر (ج) ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اس پر وقف و وصل دونوں جائز ہیں۔

حضرت مفتی عنایت صاحب البیان الجزیل میں فرماتے ہیں۔ ج علامت جائز کی ہے وہاں ٹھہرنا نہ ٹھہرنا برابر ہے۔ تو جب اس میں وصل بھی جائز ہے تو قل هو الله احد نِ الله الصمد پڑھنا بھی بلاشبہ جائز ثابت ہوا۔ تو زید کا اس کو صحیح نہ کہنا بھی غلط ہے۔ اور احد پر آیت مطلق کہنا بھی غلط ہے اس کو چاہئے کہ وہ اپنی غلط بات سے رجوع کرے اور قول حق کو قبول کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۴) رسالہ وقف میں یہ قاعدہ موجود ہے۔ " اگر حرف موقوف علیہ مشدد ہو خواہ حرف علت

ہو یا حرف صحیح تشدید پر وقف کیا جائیگا تشدید میں کسی قسم کا نقصان نہ ہوگا۔ پس اگر مفتوح ہے تو سکون محض ہوگا جیسے تب۔ فاتھن۔ التی۔ صواف"۔ تو اس سے ثابت ہوگیا کہ تب کی ب کو مشدد پڑھا جائیگا اور اس پر وقف ہی کیا جائگا۔ کہ اس کے بعد آیت مطلق ہے تو اس کے مابعد سے وصل نہیں کر سکتے اور جب اس پر وقف ہے تو اس پر زبر نہیں پڑھ سکتے بلکہ اس پر وہی وقف کا سکون ہوگا۔ تو بعض حفاظ کا اس کے خلاف پڑھنا خلاف قاعدۂ قرات ہے جس کے غلط ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۶ صفر المظفر ۶/ ۱۳۷۷ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۷۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین حسب ذیل مسئلہ میں اللہ تعالیٰ اجر عظیم عطا فرمائے کچھ لوگ ولا الضالین کو و لا لظالین بالقصد پڑھتے ہیں اور منع کرنے پر نہیں مانتے، کہتے ہیں یہی صحیح ہے۔ استدعا ہے کہ اس میں چند باتوں کا اظہار فرمایا جاوے۔

اول: ض و ظ کا بطریق تجوید صحیح پڑھنے کا طریقہ کیا ہے اور ولا الظالین کے معنی کیا ہیں مفسد نماز ہے یا نہیں؟ اور تبدیل حرف کر کے قصدا پڑھنے والا کیسا ہے اور جوابات مدلل تحریر فرمائے جائیں دوسرے کتب عربیہ شریف کا اردو ترجمہ فرمایا جائے۔

شرح فقہ اکبر ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (ص ۱۵۳) میں فرماتے ہیں:

" وفی المحیط سئل الامام الفضلی عمن یقرأ الظاء المعجمة مکان الضاد المعجمة او یقرأ اصحاب الجنة مکان اصحاب النارا وعلی انعکس فقال لا تجوز امامته ولو تعمد یکفر قلت اما کون تعمده کفراً فلا کلام فیه اذالم یکن فیه لغتان ففی ضنین الخلاف سامی اما تبدیل الظاء مکان الضاد ففیه تفصیل و کذا تبدیل اصحاب الجنة فی موضع اصحاب النار وعکسه ففیه خلاف و بحث طویل "

محیط میں ہے: امام فضلی سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو ضاد کی جگہ ظاء معجمہ پڑھتا

ہے اور اصحاب النار کی جگہ اصحاب الجنۃ یا اس کے خلاف الٹا پڑھتا ہے تو فرمایا اس کی امامت جائز نہیں اور اگر قصدا پڑھا تو کافر ہوگیا۔ میں کہتا ہوں قصدا پڑھنے والے کے کفر میں تو خلاف ہی نہیں جب اس میں دولغت نہ ہوں تو ضنین میں اختلاف ہے لیکن ضاد کی جگہ ظا کا بدل دینا تو اس میں بھی تفصیل ہے اسی طرح اصحاب النار کی جگہ اصحاب الجنۃ یا اس کے خلاف بدل دینے میں اختلاف ہے اور لمبی بحث ہے

" خزینة الاسرار الکبری صفحه ۲۵ لو قرء الظاء مکان الضاد باعتماد راس اللسان الی الاطراف الثنایا العلیا او الضاد مکان الظاء باعتماد حافة اللسان الی الاضراس

"اگر ضاد کی جگہ ظا نوک زبان ثنایا علیا کے کنارے پر رکھ کر پڑھی یا ظا کی جگہ ضاد زبان کی کروٹیں داڑھوں پر لگا کر پڑھا۔ یہی صفحہ دوسری جگہ " لا تجوز الصلاة بدون التجوید "تو نماز جائز نہیں بہ سبب خلاف تجوید کے۔

تفسیر حقانی جلد آٹھ صفحہ ۴۵ کے حاشیہ میں فرماتے ہیں: صاحب کشاف کہتے ہیں:" واتقان الفصل بین الظاء والضاد واجب الخ " کہ ان دونوں حرفوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔

''ض'' اور ''ظ'' میں اکثر عجم فرق نہیں کرتے حالانکہ ان کے مخرج جدا جدا ہیں۔ 'ظ' کنارے زبان اور اگلے دانتوں کی جڑ سے نکلتی ہے اور 'ضاد' دائیں یا بائیں ڈاڑھ سے اور زبان کی جڑ سے۔ ایک کی جگہ دوسرا پڑھنا ایسا ہے کہ جیسا دال کی جگہ جیم اور ث کی جگہ شین۔ اس میں مولینا عبدالحق صاحب نے صاف تبدیل حروف لکھا ہے۔

المستفتی، محمد عبداللہ نعیمی رضوی کھیری محلّہ یدہ پور یوم دوشنبہ عید الفطر ۱۳۷۷ھ

الجواب

اللھم ھدایة الحق والصواب

زبان کی داہنی یا بائیں کروٹ جب بالائی داڑھوں سے متصل ہو یہ تو مخرج ضاد ہے اور ض کے ادا کرتے وقت زبان کی کروٹ کا تالو کی طرف اٹھنا۔ اور مخرج پر قوی اعتماد کرنا۔ اور مخرج لام تک استطالت کرنا ضروری ہے۔ نیز اس کے ادا کے وقت یہ بھی ضروری ہے کہ زبان اگلے دانتوں پر ہرگز نہ لگے اور نوک زبان سے کام نہ لیا جائے۔ اور شان شدت پیدا نہ ہو جائے۔ اور اس کے اطباق میں کوئی کمی اور قصور نہ ہونے پائے۔ اور زبان کی نوک جب ثنایا علیا کے کنارے سے متصل ہو جائے تو مخرج ظ ہے۔ اس کے ادا کرتے وقت صرف نوک زبان سے کام لینا اور نوک زبان کا ثنایا علیا کے کنارے پر لگنا۔ اور

اس کا زبان کی کروٹ اور تالو سے بے تعلق ہونا اور استطالت سے دور رکھنا ضروری ہے تو یہ بطرق تجوید ظ کے صحیح پڑھنے کا طریقہ ہے۔ پھر قرآن میں بالعمد تبدیل حرف کر دینے۔ اور بالقصد ضاد کو ظا پڑھنے سے نماز فاسد ہو جائیگی۔

ردالمحتار میں ہے " وان تعمد ذلك تفسد " یعنی اگر بالقصد تبدیل حرف کی تو نماز فاسد ہو جائیگی۔ کبیری میں ہے " قرء الظاء المعجمة مكان الضاد المعجمة او على القلب مثال المغظوب مكان المغضوب وظعف الحياة مكان ضعف الحيوٰة تفسد صلاته وعلى القول بالفساد اكثر الائمة " یعنی اگر ضاد کی جگہ ظا پڑھی یا ظا کی جگہ ضاد پڑھا جیسے مغضوب کی جگہ مغظوب پڑھا اور ضعف الحیٰوۃ کی جگہ ظعف الحیاۃ پڑھا تو نماز تو اس کی فاسد ہو جائیگی اور اکثر ائمہ اسی حکم فساد کے قائل ہیں۔

اسی کبیری میں ہے " وليسا في القرآن غير المغضوب بالظاء والذال المعجمتين تفسد اذ ليسا لهما معنىٰ "

یعنی قرآن میں غیر المغضوب ظا اور ذآل سے نہیں، اس سے نماز فاسد ہو جائیگی کہ ان کے کوئی معنیٰ ہی نہیں ہیں۔

فتاوی قاضی خاں میں ہے " ولو قرأ والعاديات ظبحا بالظاء تفسد صلاته وكذا ولسوف يعطيك ربك فترضى قرأ فترظى بالظاء تفسد صلاته وكذا لو قرأ غير المغضوب بالظاء او بالذال تفسد صلاته "

یعنی اگر والعادیات ظبحا ظاء سے پڑھا تو اس کی نماز فاسد ہوگئی۔ اور ولسوف یعطیك ربك فترضى میں فترظی ظا سے پڑھا تو اس کی نماز فاسد ہوگئی۔ اور اسی طرح اگر غیر المغضوب کو ظا یا ذآل سے پڑھا تو اس کی نماز فاسد ہو جائیگی۔ پھر جس نے بالقصد تبدیل حرف کی اور عمدا ضاد کو ظا سے بدلا تو وہ کافر ہو جائیگا۔ چنانچہ محیط کی عبارت سوال میں فقہ اکبر سے منقول ہے۔

نیز فتاوی عالمگیری میں ہے " سئل الامام الفضلی عمن يقرأ الزاء مقام الضاد او قرأ اصحاب الجنة مقام اصحاب النار قال لا تجوز امامته ولو تعمد يكفر "

یعنی امام فضلی سے سوال کیا گیا کہ جس نے زاء کو ضاد کی جگہ پڑھا یا اصحاب النار کی جگہ اصحاب الجنۃ پڑھا تو فرمایا اس کی امامت جائز نہیں اور اگر عمدا ایسا کیا تو وہ کافر ہو گیا۔ تو ان کثیر عبارات سے یہ

ثابت ہو گیا کہ حرف کا قصداً بدلنا نماز کو فاسد کر دیتا ہے اور عمدا بدلنے والا کافر ہو جاتا ہے۔ تو جس نے عمدا بالقصد ضاد کو ظاء سے بدلا۔ اور اس پر یہ ڈھٹائی کہ منع کرنے پر بھی اس نے نہیں مانا۔ یہاں تک کہ اس بدلے ہوئے کو ہی صحیح جانا تو بلا شک اس کی نماز فاسد ہو جائیگی بلکہ اس کی نماز تو غیر المغضوب ہی پر فاسد ہو جائیگی۔ اب وہ ولا الظالین تو نماز سے باہر ہو کر پڑھیگا پھر جب وہ اس قدر دلیر ہے کہ منع کرنے پر بھی باز نہیں آتا۔ اور غلط کو صحیح جانتا ہے تو وہ کافر بھی ہو گیا اس پر توبہ واستغفار واجب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ۱۴ ذیقعدہ ۱۳۷۷ھ

استفتاء

(۲۷۱)

احمدہ و اصلی علی حبیبہ الکریم علیہ الصلوۃ والتسلیم۔

کیا ارشاد فرماتے ہیں حضرات حاکمان شریعت مطہرہ مندرجہ مسئلہ میں کہ

ان آیات میں الف تثنیہ ظاہر کر کے پڑھنا چاہیے یا حذف کر کے؟ بر تقدیر اول خلاف قواعد کا لزوم عارض" بینوا بالدلیل مع حوالۃ الکتب المعتبرۃ التی کانت الحجۃ للموافق وللمخالف خصوصا۔

آیات یہ ہیں:

آیت	سورہ
(۱) فلما ذاقا الشجرہ۔	سورہ اعراف ح۸ ع۸ ۔
(۲) دعوا اللہ ۔	سورہ اعراف ح۹ ع۲۴ ۔
(۳) واستبقا الباب۔	سورۃ یوسف ح۱۴ ع۳ ۔
(۴) وقالا الحمد للہ۔	سورہ نمل ح۱۹ ع۲۔

ہندوستان میں اکثر جگہ حذف کر کے پڑھتے ہیں بیرون ہند کا حال معلوم نہیں ہاں بعض حافظ الف ظاہر کر کے پڑھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اعلحضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وقت میں بھی ہم لوگ الف ظاہر کر کے پڑھتے تھے اور حضرت نے منع وانکار نہ فرمایا کہ کس طرح پڑھنا چاہیے۔ مفصل ومدلل فتوے ارقام فرما کر تسلی خاطر فاتر فرمائیں۔ ایک عالم کا فتوی بھی نقل کر کے ملاحظہ کیلئے نقل کر رہا ہوں، اگر اس میں کچھ خامی ہو تو اس کو واضح فرمادیں۔

مسئلہ (۲۷۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارے میں کہ

آیت کریمہ۔"فلما ذا قاالشجرۃ" کے پڑھنے کا کیا طریقہ ہے، یعنی جب "ذاقا کو الشجرۃ" کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو ذا قا کا الف پڑھا جائیگا یا نہیں؟۔زید یہ کہتا ہے کہ اس میں الف پڑھنا ضروری ہے۔اور ترک کرنا غلط۔اسلئے کہ تثنیہ کا صیغہ ہے۔اگر الف ترک کیا جائے گا تو واحد کا صیغہ ہو جائیگا اور معنی بدل جائے گا، تو کیا زید کا قول اور استدلال صحیح ہے۔اسی طرح واستبقا الباب۔قالا الحمد لله اور دعو االله میں تثنیہ کا الف پڑھا جائیگا یا نہیں؟۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

قاعدہ ہے کہ جب دو ساکن دو کلموں میں جمع ہوں اور دوسرا حرف مشدد ہو اور پہلا حرف مدہ ہو تو اول کو حذف کر دیتے ہیں جیسے "یخشی الله، دعوالله، دعی الله" البتہ اگر ایک کلمہ میں ایسی صورت ہو تو حذف نہیں کرتے ہیں۔جیسے ضالین، حاج، وغیرہ۔نیز جب دوسرا ساکن و حرف مشدد نہ ہو اور پہلا حرف مدہ ہو تو اس صورت میں بھی ساکن اول حذف کیا جاتا ہے، جیسے "فی الاخرۃ، علی الھدی۔الی الله" وغیرہ میں حروف علت حذف کر دیئے گئے ہیں۔

علم الصیغہ میں ہے: اجتماع ساکنین کہ دراں ساکن اول مدہ باشد و ساکن دوم حرف مشدد اگر در یک کلمہ باشد جائز است و مدہ را حذف نہ کنند چوں ضالین واتحاجونی واین را اجتماع ساکنین علی حدہ می گویند و اگر در دو کلمہ باشند اول را کہ مدہ ست حذف کنند چوں "یخشی الله، دعولله، ادعی الله۔

نیز اسی میں ہے: جیں اجتماع ساکنین اگر اول مدہ باشد آں را حذف کنند۔

زبدہ میں ہے: ہر جا کہ اجتماع ساکنین شود اگر اول حرف مدہ زائدہ یا غیر مدہ باشد و دوم مدغم باشد در یک کلمہ حذف نہ کنند و ایں اجتماع ساکنین روا باشد "دابۃ، خواصہ" ہمچنیں در حال وقف چوں زید و عمر، و اگر نہ مدہ حذف کردہ شود۔اغزو الجید وقولی الحق۔لہذا قواعد مذکورہ بالا کے مطابق الف تثنیہ گرا دیا جائے گا اور الف کے ساتھ پڑھنا خلاف قاعدہ ہوگا اور زید کا استدلال قواعد فن سے ناواقفی پر مبنی ہے، مقام تعلیل میں التباس کا لحاظ نہیں ہوتا۔

صاحب علم الصیغہ فرماتے ہیں: وحدیث التباس سخنے است کہ طفلان را بآں فریب تواں داد ورنہ

از التباس تا کجا خواہند گریخت، ہزار جا التباس بسبب اعلال گردیدہ است مثلا تدعین واحد مونث حاضر بسبب اعلال با جمع مونث حاضر ملتبس شدہ و در جمیع ابواب ناقص مکسور العین و مفتوح العین چہ مجرد و چہ مزید این التباس موجود ست۔

اور اگر اسی طرح التباس کا لحاظ ہے تو ان چار مقامات کی کیا تخصیص ہے، قرآن کریم میں ایسے التباس بہت سی جگہ لازم آتے ہیں۔مثلا جمع متکلم کا التباس جمع مونث غائب کیساتھ حسب ذیل آیات میں:

(۱) ولقد خلقنا الانسان فی اجسن تقویم۔

(۲) وقد فصلنا الآیا ت لقوم یعلمون۔

(۳) ووصینا الانسان بوالدیہ۔

(۴) ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا ہ۔

اور جمع مذکر حاضر کا التباس واحد مذکر حاضر کیساتھ حسب ذیل آیات میں:

قل ادعو الذین زعمتم من دون الله فا دعوا الله مخلصین۔

اور جمع مذکر حاضر کا التباس واحد مذکر غائب کے ساتھ یا واحد مونث غائب کے ساتھ اس آیت میں:

ولا تسبوا الذین ید عون من دون الله ۔

اور جمع مذکر غائب کیساتھ اس آیت میں:

فیسبوا الله عدوا بغیر علم۔

تو کیا ان آیات میں الف جمع اور واو جمع اور واحد مذکر ظاہر کر کے پڑھے جائنگے؟ ہرگز نہیں، بلکہ الف جمع متکلم اور واو جمع مذکر حذف کر کے پڑھتے ہیں اور التباس کا لحاظ نہیں رکھتے۔

بالجملہ صورت مسئولہ میں الف تثنیہ حذف کر کے پڑھنا ہی مقتضائے قواعد ہے اور الف کا ظاہر کرنا قواعد کے خلاف۔نیز زید الف ظاہر کرنے کی جو وجہ ذکر کی وہ دعو االله میں پائی نہیں جاتی کہ اس میں الف تثنیہ حذف کرنے سے واحد کیساتھ التباس نہیں ہوتا کہ واحد دعا ہے تو اسکا استدلال یوں بھی ناقص ہے واللہ تعالی اعلم انتھی بالفاظہ۔

المستفتی محمد احمد المدعو بہ جہانگیر غفرلہ القدیر متعلم مدرسہ مظہر اسلام بریلی اعظمی مولدا رضوی مسلکا

جواب صحیح ہے:

اور تفصیل مقام یہ ہے کہ ان کلمات آیات میں۔ ذاقا ۔دعوا۔ استبقا ۔قالا۔ میں حرف اخیر الف تثنیہ ہے اور الف حرف مدہ ہے جو ہمیشہ ساکن رہتا ہے۔

منح فکریہ شرح جزریہ میں ہے: حروف المدثلا ثة الا لف ولا تکو ن الا ساکنة "

اور یہ الف معرف باللام کلمات سے ملا اور لام تعریف بھی ساکن ہے تو یہ اجتماع ساکنین ہو گیا۔

اور جواز اجتماع ساکنین کی ایک صورت تو وقف ہے۔

منح فکریہ میں ہے: الوقف یجو زفیه التقاء الساکنین مطلقا۔

سراج القاری شرح اشعار شاطبی میں ہے: ان التقاء الساکنین یغتفرفی الوقف۔

اور یہ ظاہر ہے کہ آیات کے یہ کلمات مقام وصل میں ہیں نہ کہ مقام وقف میں۔ دوسری صورت مدلازم ہے، اور یہ مدان کلمات پر ہوتا ہے جن میں حروف مد کے بعد کوئی حرف ساکن ہو، اب وہ مدغم ہو، جیسے ضالین ،دابۃ میں، یا مظہر ہو جیسے، جیسے ص، ق، حروف مقطعات میں، اور الآن و آللہ میں۔

جزری میں ہے:

فلازم ان جاء بعد حرف مد   ساکن حالین وبالطول یمد

علامہ علی قاری منح فکریہ میں فرماتے ہیں:

ذهب الجمهو ر الی التسویة بین مد المد غم والمظهر فی ذلك كله اذا الموجب للمد هو التقاء الساكنين والتقاؤ هما مو جود فی كل لا حاجة للتفصيل فی ذلك كله هذا هو التحقيق ۔

ان آیات میں الف تثنیہ حرف مد بھی ہے اور اسکے بعد حرف ساکن لام تعریف بھی ہے، لیکن یہ ساکن نہ حرف مشدد ہے نہ حروف مقطعات میں سے کوئی حرف، تو ظاہر ہے کہ ان کلمات آیات میں نہ مدغم ہوا نہ مدمظہر۔ لہذا جواز اجتماع ساکنین کی دونوں صورتیں وقف اور مدلازم ہیں اور یہ ہر دو صورت کلمات آیات میں متصور نہیں۔ تو اب ان میں الف تثنیہ کو ظاہر کر کے پڑھنے میں اجتماع ساکنین لازم آتا ہے۔ اور علاوہ ان دو صور کے اجتماع ساکنین ناجائز ہے۔

چنانچہ نوادر الوصول میں ہے۔ در غیر صور مذکورہ اجتماع ساکنین جائز نیست (نوادر ص۱۹۱)

لہذا اب مقام وصل میں اجتماع ساکنین سے بچنے کے لئے ان تین باتوں میں سے ایک بات ضروری ہے۔ یا تو ہر دو ساکنوں کو باقی رکھ کر مد کے ساتھ ادا کیا جائے۔ یا احد الساکنین کو حرکت دیجائے۔ یا ایک ساکن کو حذف کر دیا جائے۔

علامہ علی قاری منح فکریہ میں فرماتے ہیں: تقرر فی علم التصریف انه لا یجمع فی الوصل بین الساکنین فا ذا ادی الکلام الیه حرك او حذف او زید فی المد لیقد ر فحر کا ۔

تو مد کا بیان تو ابھی گزرا کہ ان کلمات آیات پر مد نہیں کر سکتے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مد میں گویا اجتماع ساکنین ہی باقی نہیں رہتا۔

نوادر الوصول میں ہے: ہر دو جا گویا اجتماع ساکنین حقیقۃ نیست۔

منح فکریہ میں ہے:

مدد ب لا ن الساکنین تلا فیا   فصارا کحریك كذا قال ذوالخبر

حرکت ایسے اجتماع ساکنین میں دی جاتی ہے جہاں پہلا ساکن مدہ نہ ہو، تو کہیں ساکن اول کو حرکت دیتے ہیں جیسے: انتم الفقراء، میں۔ کہیں ساکن دوم کو حرکت دیتے ہیں جیسے: رد وذب، میں۔

شافیہ میں ہے: فا ن لم یکن (ای اول الساکن) مدۃ حرك نحو اذهب الا فی نحورد فحرك الثانی ملخصا۔ (ص ۱۵۸)

جامع العلوم میں ہے: وان لم یکن مدة حرك نحو اخشوالله ۔

اور یہ ظاہر ہے کہ ان کلمات آیات میں حرکت بھی نہیں دی جا سکتی کہ ان میں ساکن اول حرف مدہ ہے۔ نیز ان میں ساکن اول الف ہے اور ساکن دوم لام تعریف ہے، اور یہ دونوں حرکت کو قبول نہیں کرتے۔

اب باقی رہا حذف تو یہ اس اجتماع ساکنین میں ہوتا ہے جن میں ساکن اول حرف مد ہو، تو اس میں ساکن اول ہی کو حذف کر دیا جاتا ہے۔

شافیہ میں ہے: فان کا ن غیر ذلك واولهما مدة حذفت نحو خف وقل۔

جامع العلوم میں ہے: فان کا ن (ای اول الساکن مدة حذفت سواء کان الساکنا ن فی کلمة او فی کلمتین مستقلتین مثل یخشو ن اغزوا الجیش ۔

فصول اکبری اور اس کی شرح میں ہے: پس ساکن اول اگر مدہ است در یک کلمہ یا دو کلمہ

آں ساں را بیفگنند نحو قل وبع ۔

حاشیہ شافیہ میں ہے: و یلتقی الساکنان المدۃ و لا التعریف فیجب حذف المدۃ ۔
ان کلمات آیات میں بھی ساکن اول مدہ یعنی الف ہے اور ساکن دوم لام تعریف ہے۔ لہذا الف کا حذف واجب اور ضروری ہے۔

بعض نے حلقتا البطان میں الف تثنیہ کو ثابت رکھا تو یہ دلیل نہیں بن سکتا کہ یہ استعمال شاذ ہے۔

شافیہ میں ہے: و حلقتا البطان شاذ۔

فصول اکبری اور اس کی شرح نوادر الوصول میں ہے:

و حلقتا البطان با ثبات الف تثنیۃ و سکون لام در قولہم التقت حلقتا البطان شاذ، چہ کدام وجہ قیاسی در جواز آن یافتہ نمی شود۔ (نوادر ص ۱۹۰)

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ ان کلمات آیات میں الف تثنیہ کو حذف نہ کرنا اجتماع ساکنین علی حدہ کرتا ہے جو ناجائز ہے، بلکہ یہ ظن جلی ہے جو عند القراء ممنوع ہے۔ تو اب الف تثنیہ کو ثابت رکھنا نہ قواعد صرف کے موافق، نہ اصول تجوید کے مطابق۔ مخالف کو الف تثنیہ کی قرآن کریم میں صرف یہ چار مثالیں ملیں۔ ہم دس مثالیں اور پیش کرتے ہیں۔

(۱) فازلہما الشیطن۔ (سورہ بقرہ ع۴)
(۲) فوسوس لہما الشیطان ۔
(۳) عن تلکما الشجرۃ ۔ (اعراف ع۴)
(۴) منہما اذکر نی۔ (یوسف ع۵)
(۵) کلتا الجنتین۔ (کہف ع۵)
(۶) من اتبعکما الغلبون۔ (قصص ع۴)
(۷) واتینہما الکتب۔
(۸) وھدینٰھما الصراط المستقیم۔ (والصّٰفّٰت ع۴)
(۹) یخرج منہما اللؤلؤ۔ (الرحمٰن ع۱)
(۱۰) قیل ادخلا النار (تحریم ع۱)

ان سب آیات میں الف تثنیہ کو حذف کیا جاتا ہے، اور قرآن کریم میں اس کی کثیر مثالیں اور بھی ہیں۔ اور الف تثنیہ کی طرح جب معرف باللام کے ساتھ واو جمع ہو تو واو کو بھی حذف کیا جائیگا۔ قرآن کریم میں واو جمع کی مثالیں الف تثنیہ سے بہت زائد ہیں۔ صرف سورہ اعراف میں ہے:

اتخذوا الشیطین　ع۳۔
عملوا الصّٰلحٰت۔　ع۵۔
قالوا الحمد۔　ع۵۔
ادخلوا الجنۃ۔　ع۶۔
فعقروا الناقۃ۔　ع۱۰۔
فاوفوا الکیل ۔　ع۱۱۔
فاوفوا لکیل ۔　ع۱۱۔
ذروا الذین۔　ع۲۲۔

ان سب آیات میں واو جمع کو حذف کر کے پڑھا جائے گا۔ حاصل جواب یہ ہے کہ الف تثنیہ اور واو جمع جب معرف باللام سے متصل ہو تو ہر دو کا حذف ضروری ہے اور ان کا ثابت رکھ کر پڑھنا ناجائز وممنوع ہے۔ مولیٰ تعالیٰ قبول حق کی توفیق دے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۷۳)

حضرات علمائے کرام وقرائے عظام کیا فرماتے ہیں کہ
''ولا الضالین'' کو مخرج بالدال سے ''دالین'' یا ''دوالین'' پر کے ساتھ یا ''ظالین'' یا ''زالین'' یا ''ذالین'' پڑھنا چاہئے؟ اس کا صحیح مخرج کیا ہے؟ ''ض'' کس کے مشابہ ہے؟ کیا اختلاف ہے؟ ترجیح کس کو ہے؟ کن صورتوں میں نماز فاسد ہوتی ہے کن صورتوں میں نہیں؟ مفصل تحریر فرمائیں۔
بینوا توجروا۔

سید اطہر حسن موضع مرزا پور چوہاری ضلع پرتاپ گڑھ

xxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxx

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

ضاد۔ کا مخرج زبان کی بائیں جانب جب بالائی داڑھوں سے متصل ہو کر دراز ہو یہ آسان ہے۔ یا داہنی جانب سے اس طرح یہ دشوار ہے۔ شرح جزری میں ہے:

تخرج الضاد من طرف اللسان مستطیلة الی مایلی الاضراس من الجانب الایسر وھو الایسر والاکثر ومن الایمن وھو الیسیر العسیر۔

اور دال، ذال، ظا، زا، کے مخارج جدا جدا ہیں۔ تو ضاد کو ان میں سے کسی مخرج سے نکالنا سخت غلطی اور تحریف القرآن ہے۔ ضاد۔ بقول بعض مشابہ بہ ظا ہے۔ لیکن مشابہت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ضاد کو عین ظا پڑھا جائے اور ان کے تغائر وضعی تباین صوت طبعی اور امتیاز صفت خاص اور مخصوص کیفیات ادا سب کو میٹ دیا جائے اور ''ضاد'' کو بالکل ہم آواز ''ظا'' پڑھا جائے جیسا کہ اب چند منحوس زمانہ کی عادت ہے بلکہ جب ضاد کو اس کے مخرج اور تمام صفات کی رعایت کے ساتھ ادا کیا جائے گا تو اس کی۔ دال، ذال، ظا، زا، کی آوازوں سے ممتاز آواز ہے۔ ''کما حققناہ فی فتاوانا الاجملیہ'' اب باقی رہا اس کا حکم تو اگر یہ بدلنا جان بوجھ کر بقصد اختیار ہے تو کفر ہے۔

چنانچہ علی قاری شرح فقہ اکبر میں محیط سے ناقل ہیں:'' سئل الامام الفضلی عمن یقرء الظاء المعجمة مکان الضاد المعجمة او علی العکس فقال لاتجوز امامته ولو تعمد یکفر۔

(شرح فقہ اکبر مصری ص ۴۵۳)

امام فضلی سے اس شخص کا حکم دریافت کیا گیا جو ضاد کی جگہ، ظا، یا، ظ، کی جگہ، ضاد، پڑھتا ہے فرمایا اس کی امامت جائز نہیں اور اگر قصداً پڑھا تو کافر ہو جائے گا۔

اور اگر ناواقفی سے ہو یا بالقصد نہ ہو یا بر بنائے لغزش ہو تو جہاں معنی متغیر ہو جائیں گے نماز فاسد ہو جائے گی ورنہ نہیں۔

چنانچہ یہی علامہ علی قاری فتاوی قاضی خاں سے ناقل ہیں:

ان قرء غیر المغضوب بظاء المعجمة او بالدال تفسد صلاته ولا الضالین بالظاء المعجمة والدال المھملة لا تفسد ولو بالذال المعجمة تفسد۔

(منح فکریہ شرح جزریہ مصری ص ۴۳)

غیر المغضوب کو ظ یا دال سے پڑھا تو نماز فاسد ہو گئی اور ولا الضالین کو ظ یا دال سے پڑھا تو نماز فاسد نہ ہو گی اور اگر ذال سے پڑھا تو نماز فاسد ہو گئی۔ لھذا نماز تو غیر المغضوب ہی پر اگر اس کو ظ یا دال سے پڑھا فاسد ہو جائے گی ولا الضالین تو نماز کے باہر پڑھے گا۔

هذا ملخص رسالتنا الذی صنفت فی تحقیق الضاد فمن اراد التحقیق فلیرجع الیها فیجد فیها ابحاثاً نفیسة'' واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

۱۵ / جمادی الآخرہ ۱۳۷۹ھ

مسئلہ (۲۷۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ

صاحب فوائد مکیہ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت امام عاصم کوفی علیہ الرحمۃ بین السورتین تسمیہ پڑھتے ہیں تو اس لحاظ سے جس سورۃ کو قاری بلاتسمیہ پڑھیگا وہ سورت امام کے نزدیک ناقص ہو گی۔

وعن ابی خزیمة ان رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم قرأ بسم الله الرحمن الرحیم فی اول الفاتحة فی الصلوة وعدها آیة ایضا، الخ۔

پھر علامہ جزری فرماتے ہیں: کہ بسم اللہ اس کو پڑھنا چاہیئے۔ چنانچہ باسناد اسحاق نقل کرتے ہیں، ہم سورہ فاتحہ اور ہر سورۃ کے شروع پر ہر حالت وخارج از صلوۃ قرآن سناتے ہوں خواہ نماز میں بسم اللہ پڑھا ہی کرتے تھے، اور قراء مدینہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

ان روایات سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ بین السورتین بسم اللہ نہ پڑھنے کا اختلاف ایسا ہے کہ جیسے اور اختلافات قرأت سبعہ کہ جس طرح انکا پڑھنا جائز ہے اسی طرح اس کا نہ پڑھنا بھی درست ہے، پس مبسملین کی روایت میں بسم اللہ بین السورتین جہراً پڑھنا چاہیئے۔ کیونکہ فقہا کو اگر چہ اپنی ذاتی تحقیق اس مسئلہ میں کچھ ہی ہوتی تھی مگر روایت کے موقعہ پر آکر اس مسئلہ کو مسئلہ فن قرأت ہو جانے کی وجہ سے وہ قراء ہی کا اتباع کرتے تھے۔ حضرت امام مالک علیہ الرحمۃ باوجود اس کے کہ انکے مذہب میں بسم اللہ ہر ہر سورۃ کا جز نہیں۔ مگر امام نافع سے مسئلہ پوچھ کر یوں ہی فرمایا کہ ہر علم کا مسئلہ اس کے اہل سے پوچھنا چاہیے، مدار علم قراءت نقل اور صحت روایت پر ہے، قیاس و عقل کو اس میں دخل ہی نہیں، اور علم فقہ

منصوصات و مجتہدات دونوں سے مرکب ہے۔مسائل منصوصہ میں شارع علیہ السلام کے مجتہدات کسی اور کا اتباع نہیں اور ائمہ کی تقلید مسائل اجتہاد پر ہے۔

لہٰذا ہر مسئلہ قرائت میں نقل وصحت روایت کے علاوہ اور سند کی ضرورت مسئلہ قراءت کی سند فقہاء کے اقوال سے تلاش کرنا غلطی ہے بلکہ اس کی سند ائمہ قراءت سے دریافت کرنی چاہیے۔پس تصحیح روایات کے بعد اس پر عمل کرنا چاہیے۔دوسری بات یہ ہے کہ جو کچھ بین الدفتین ہو، رسم عثمانی اس کی متحمل ہو اور قواعد نحویہ کے موافق ہو، نقل متواترہ کے ساتھ ہم تک پہونچا ہو وہ قرآن ہے اور تسمیہ پر یہ باتیں صادق آتی ہیں، نیز باجماع مذاہب اربعہ ہر حال میں قرأت سبعہ کے ساتھ قرآن پڑھنا جائز ہے۔اختلاف قراءت خواہ بحرکت ہوں یا بکلمہ یا تبدیل وزیادتی کلمہ خواہ ان میں سے کسی طرح کا اختلاف ہو سب جائز پھر تسمیہ کو خاص نماز میں ناجائز کہنا کس طرح قبول کیا جا سکتا ہے۔جب تک کہ دلیل نقلی قرآن یا حدیث سے نہ ہو۔کیوں کہ مبسملین وغیر مبسملین سب دلایل نقلیہ متواترہ رکھتے ہیں، باوجود ان تمامی امور کے کہیں امام اعظم قدس سرہ سے اسکی تصریح بھی نہیں آئی، کہ تمامی قراء کے اختلاف تمام قرآن میں پڑھنے جائز ہوں ۔اور مبسملین کے قول کے موافق تسمیہ بین السورتین جائز نہ ہو۔پھر یہ مسئلہ اجتہادی ہی نہیں، کیوں کہ منصوصات میں اجتہاد جائز ہی نہیں ۔اور ہم مسائل اجتہادیہ میں امام صاحب کے مقلد ہیں نہ کہ مسائل منصوصہ میں۔لہذا فقہ میں تو مقلد ہیں کہ وہ مجتہد مطلق ہیں۔

اور مسائل قراءت میں ائمہ و راویان قرآن حکیم کے ہیں اور علم قراءت میں امام صاحب بھی راویان قرآن کے مقلد تھے ونیز علم قراءت میں شاگرد امام عاصم کے ہیں اور یہ بات کہیں ثابت نہیں ہوئی کہ امام صاحب نے قرآن کریم میں اجتہاد فرمایا ہے۔کیونکہ سمعیات میں تو اجتھاد کی گنجائش ہی نہیں۔اگر اجتہاد کی کہیں بھی گنجائش ہے تو جہاں سے ہے مبسملین کیلئے تسمیہ کی ممانعت مستنبط ہو بتائیں ورنہ احتمال اجتہاد اس مسئلہ میں محض بے سود ہے جو پزیرائی نہیں ہوسکتا ہے۔

پس جو لوگ بسم اللہ بالجہر تراویح میں پڑھنے کی بابت مبسملین کیلئے نزع کرتے ہیں وہ قرأت سبعہ کی حقیقت سے واقفیت نہیں رکھتے۔لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ تراویح میں ہر سورۃ پر بسم اللہ پڑھنی چاہئے یا ایک سورۃ پر۔نیز بالجہر یا بالسر اور سورۃ فاتحہ و دیگر سور پر بھی بالجہر یا بالسر پڑھے یا نہیں؟۔اور کیا احکام و دلائل ہیں معہ حوالہ کتب جواب مرحمت فرمائیں۔

(۲) حرف ضاد معجمہ مشابہ بالدال ہے یا بالظاء اور جس وقت اس کو اس کے مخرج سے مع جمیع

صفات ادا کیا جائے تو اس کی صورت کسی حرف سے مشابہ ہوگی یا نہیں۔اگر ہوگی تو کس حرف کے ساتھ نیز جو شخص اس کو صحیح ادا کرتا ہے تو اس کو عوام کے کہنے پر کسی اور حرف کیساتھ بدل کر پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ (دواد۔ذواد۔زواد۔ظاوغیرہ) دریں صورت عمداً غلط پڑھنے والا خاطی و محرف کہلائے گا یا نہیں؟۔نیز اس کی اقتدا درست ہوگی یا نہیں؟۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ ''ضاد و ظا'' میں فرق کرنا دشوار ہے۔و هما متشا بها ن فی الصو ت و السمع ۔

امام غزالی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: فرق درمیان ضاء و ظا بجا آوردو اگر نتواند روا باشد۔

تفسیر عزیزی میں ہے: فرق درمیان ضا د و ظا بسیار مشکل است خوانندگان ایں دیار ہر دو را یکساں می رانند نہ در مقام ضاد ظا میشود در مقام ضاد ظا۔

قاضی خاں میں ہے:

و لو قرا ء الظا لین با لظا او با لذا ل لا تفسد صلو ته و لو قرء الدا لین تفسد ۔

سوال کی صورت کو مد نظر رکھتے ہوئے مع دلائل کتب فقیہ و تجوید سے جواب مفصل تحریر فرمایا جائے

المستفتی محمد حسن عثمانی قادری غفرلہ

الجواب

الحمد لله و كفى و الصلوة والسلا م على من اصطفى و على آ له و صحبه و على كل من اجتبى اما بعد ـ

فہم جواب کیلئے چونکہ چند مقدمات پر اطلاع بہت ضروری ہے۔لہٰذا پہلے ان مقدمات ہی کو پیش کیا جاتا ہے ۔

مقدمہ اولیٰ: تمام اہل اسلام کے نزدیک بلا شک بسم اللہ شریف قرآن کریم کی ایک آیت ہے۔سورتوں کے درمیان فصل اور علیحدگی کیلئے نازل ہوئی ہے یہی امام اعظم اور احناف کرام کا بھی مذہب ہے۔

درمختار میں ہے: و هى آ ية وا حدة من القر آ ن كله انز لت للفصل بين السو ر ـ

(درمختار ج ۱ ص ۳۴۴)

کبیری میں ہے: و انها من القر آ ن و به نقو ل انها آ ية منه نز لت للفصل بين السور و كتا بتها بقلم عليحد ة يو يد ذا الك ـ (کبیری مطبوعہ المطابع لکھنوص ۳۰۰)

حجۃ الاسلام امام ابوبکر رازی احکام القرآن میں فرماتے ہیں:

لا خلاف بین المسلمین ان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم من القرآن ۔

(احکام القرآن مصری ج ۱ ص ٦)

حاشیہ عبدالحکیم علی البیضاوی میں ہے: والصحیح ما ذھب الیہ المتاخرون انھا من القرآن انزلت للفصل بین السور ۔

(حاشیہ مطبوعہ لکھنؤ ص ۲۴)

اسی میں ہے: ان الاجماع انعقد علی ان ما ثبت بین الدفتین بالاتفاق من جمیع الصحابۃ فھو کلام اللہ قطعا والبسملۃ فی اوائل السور کذلک ۔

(حاشیہ مذکور ص ۲۵)

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ بالاجماع بسم اللہ کلام اللہ ہے اور قرآن کی ایک آیت ہے جو مابین سورتوں کے فصل کیلئے نازل ہوئی ۔ یہی اصحاب امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا صحیح مذہب ہے اور یہی مسلمانوں کا اتفاقی مسئلہ ہے ۔

مقدمہ ثانیہ: تسمیہ آیت قرآنی تو ہے لیکن سورۃ فاتحہ یا اور سورتوں کا جز نہیں یعنی ان کی پہلی آیت نہیں ہے ۔ بلکہ وہ تسمیہ فاتحہ میں تو ابتداء کتاب اللہ کیلئے ہے اور سورتوں میں فصل کیلئے ہے ۔

غیث النفع فی القرأت السبع میں ہے:

ان البسملۃ لیست بآیۃ ولا بعض آیۃ من اول الفاتحۃ ولا من اول غیرھا وانما کتبت فی المصاحف للتیمن والتبرک او انھا فی اول الفاتحۃ لابتداء الکتاب علی عادۃ اللہ عزوجل فی ابتداء کتبہ وفی غیر الفاتحۃ للفصل بین السور ۔

درمختار میں ہے: لیست من الفاتحۃ ولا من کل سورۃ فی الاصح ۔

(ردالمحتار ج ۱ ص ۳۲۴)

کبیری میں ہے: بان من ھھنا مذھب الجمھور علی انھا لیست آیۃ من الفاتحۃ ولا من کل سورۃ ۔

(کبیری ص ۹۹)

احکام القرآن میں ہے: مذھب اصحابنا انھا لیست بآیۃ من اوائل السور لترک الجھر بھا ۔

(احکام القرآن مصری ج ۱ ص ۷)

ان عبارات میں جو مذکور ہے وہ حضرت امام اعظم علیہ الرحمہ کا مذہب ہے ۔

امام شافعی کا مذہب ان کے خلاف ہے ۔ اس لئے کہ وہ تسمیہ کو سورہ فاتحہ اور ہر سورت کی پہلی آیت مانتے ہیں ۔ ان کی دلیلیں یہ ہیں ۔ حدیث شریف میں ہے جس کو دارقطنی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی:

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اذا قرأتم الحمد للہ فاقرؤا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم انھا ام القرآن وام الکتاب وسبع مثانی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم احدی آیاتھا ۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم الحمد شریف پڑھو تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی پڑھو، بیشک الحمد ام القرآن اور ام الکتاب اور سبع مثانی ہے، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اس کی آیات میں سے ایک آیت ہے ۔

اور ان کی دلیل اجماع امت سے یہ ہے جس کو علامہ حلبی نے نقل کیا ہے: لانھا اثبت فی المصحف باجماع الصحابۃ مع الامر بتجریدہ عما لیس القرآن ۔

(کبیری ص ۲۹۹)

حنفیہ کی طرف سے ان ہر دو استدلالوں کے بہترین جواب دیے گئے ۔ علامہ حلبی نے اس حدیث دارقطنی پر یہ جرح کی اور جواب دیا کہ:

انہ روی موقوفا ولو سلم صحتہ فغایتہ التعارض المورث للشبھۃ ولو سلم عدم التعارض فخبر الواحد غیر قاطع لشبھۃ والقرآن لا یثبت مع الشبھۃ لانہ طریق الیقین لانہ اصل الدین وبہ تثبت الرسالۃ واقامۃ الحجۃ علی الضلالۃ فلا یثبت کونھا آیۃ من السورۃ من السور بلا دلیل قطعی کما فی سائر الآیات ۔

(کبیری ص ۳۰۰)

وہ حدیث موقوف روایت کی گئی اور اگر اس کی صحت مان لی جائے تو اس کی غایت تعارض احادیث ہے جو شبہ کو پیدا کرنے والا ہے اور اگر عدم تعارض بھی مان لیا جائے تو خبر واحد شبہ کیلئے غیر قاطع ہے اور قرآن شبہ کیساتھ ثابت نہیں ہوسکتا ہے ۔ اس لئے کہ اسکا طریقہ یقین کا طریقہ ہے کیونکہ یہی دین اسلام ہے اور اسی سے رسالت ثابت ہوئی اور ضلالت پر حجۃ قائم کی تو تسمیہ کا سورت میں سے کسی سورۃ کی آیت ہونا بغیر دلیل قطعی ثابت نہیں ہوسکتا ہے جیسا کہ اور آیات کا حکم ہے ۔

اورعلامہ حلبی نے اس دلیل کے مقابل اپنے دعوی پر اس حدیث کو پیش کیا جس کو صحیح مسلم وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی:

قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یقول :قال اللہ قسمت الصلوۃ بینی و بین عبدی نصفین ولعبدی ما سأل فاذا قال العبد الحمد للہ رب العالمین قال اللہ تعالیٰ حمدنی عبدی و اذا قال الرحمٰن الرحیم قال اللہ اثنی علی عبدی و اذا قال ملک یوم الدین قال اللہ تعالیٰ مجدنی عبدی واذاقال ایاک نعبد وایاک نستعین قال اللہ تعالی ھذا بینی و بین عبدی و لعبدی ما سأل و اذا قال اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین قال اللہ تعالیٰ ھذا لعبدی ولعبدی ما سأل ۔

(مسلم شریف مع شرح نووی ج ۱ ص ۱۶۹)

انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے نماز کو اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کردیا اور میرے بندے کیلئے وہ ہے جو سوال کرے۔ تو جب بندہ کہتا ہے "الحمد للہ رب العالمین" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد کی۔ اور جب اس نے کہا "الرحمٰن الرحیم" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثنا کی۔ اور جب اس نے کہا "مالک یوم الدین" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری تمجید کی اور جب اس نے کہا "ایاک نعبد و ایاک نستعین" اللہ فرماتا ہے یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کیلئے وہ ہے جو سوال کرے۔ اور جب اس نے کہا "اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے بندے کیلئے اور میرے بندے کیلئے وہ ہے جو سوال کرے۔

علامہ حلبی نے کبیری میں اس حدیث شریف سے اپنے مسلک کی تائید میں اس طرح استدلال کیا: و لا شک ان المراد بالصلوۃ ھنا الفاتحۃ لان المقسوم بھا فسر فھو کقولہ تعالیٰ و لا تجھر بصلوتک ای بقراء تک فی الصلوۃ فالبداءۃ بالحمد للہ دلیل علی ان التسمیۃ لیست من الفاتحۃ و انھا سبع آیات بدونھا حیث جعل الوسطی و ھی ایاک نعبد و ایاک نستعین بینہ سبحنہ و بین عبدہ و الثلث قبلھا لہ تعالیٰ خاصہ و الثلث بعدھا لعبدہ فقط و اذا لم تکن آیۃ من الفاتحۃ لم تکن آیۃ من غیرھا لعدم القائل بہ و لا شک ان ھذا

الحدیث اصح من روایۃ الدارقطنی ۔ (کبیری ص ۳۰۰)

اوراس امر میں کوئی شک نہیں کہ حدیث میں صلوۃ سے مراد سورۂ فاتحہ ہے۔ اس لئے کہ جو چیز تقسیم ہوئی اسی نے یہ تفسیر کردی اور اس کا مثل "لا تجھر بصلوتک" میں لفظ صلوۃ ہے کہ جس میں قرأۃ فی الصلوۃ مراد ہے تو سورۂ فاتحہ کو الحمد للہ سے شروع کرنا اس کی دلیل ہے کہ تسمیہ فاتحہ کی آیت نہیں اور فاتحہ کی بغیر تسمیہ کے سات آیات ہیں۔ اس لئے کہ خدا نے "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آیت قرار دیا۔ اس سے پہلے کی تین آیات کو اپنے لئے خاص کیا اور اس کے بعد کی تین آیات کو اپنے بندے کیلئے مختص کیا۔ تو جب تسمیہ فاتحہ کی آیت نہیں تو وہ اور سورتوں کی بھی آیت نہیں کہ اس کا کوئی قائل نہیں۔ اور اس حدیث کی روایت دارقطنی سے زیادہ صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں۔

حضرت حجۃ الاسلام امام ابو بکر رازی تفسیر احکام القرآن میں اپنے مسلک کیلئے اس طرح استدلال کرتے ہیں:

و یدل ایضا علی انھا لیست من اوائل السور ما حدثنا محمد بن جعفر بن ابان قال حدثنا محمد بن ایوب قال حدثنا سعد و قال حدثنی یحیی بن سعید عن شعبۃ عن قتادۃ عن عباس الجشمی عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قال: سورۃ فی القرآن ثلاثون آیۃ شفعت لصاحبھا حتی غفر لہ تبارک الذی بیدہ الملک واتفق القراء و غیرھم انھا ثلاثون آیۃ سوی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم فلو کانت منھا کانت احدی و ثلاثون آیۃ و ذلک خلاف قول النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و یدل علیہ ایضا اتفاق جمیع قراء و فقھاء ھم علی ان سورۃ الکوثر ثلاث آیات و سورۃ الاخلاص اربع آیات فلو کانت منھا لکانت اکثر ماعدوا ۔

(احکام القرآن مصری ج ۱ ص ۹)

اور اس پر کہ تسمیہ اوائل سور سے ہے یا نہیں یہ حدیث دلالت کرتی ہے جس کی ہمیں روایت کی محمد بن جعفر بن ابان نے انھوں نے کہا کہ ہمیں حدیث بیان کی محمد بن ابو ایوب نے انہوں نے کہا کہ ہمیں حدیث بیان کی سعد نے انھوں نے کہا مجھے روایت بیان کی یحیی بن سعد نے وہ روایت کرتے ہیں شعبہ سے وہ قتادہ سے وہ عباس جشمی سے وہ ابو ہریرہ سے وہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہ حضور نے فرمایا: قرآن میں تیس آیات کی ایک سورۃ ہے جو اپنے پڑھنے والے کی شفاعت کرے گی یہاں تک کہ اس کی

مغفرت کردیجائے گی وہ سورۃ ملک ہے۔ اور قراء وغیر قراء سب نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اس کی تیس آیات سوائے بسم اللہ کے ہیں۔ تو اگر تسمیہ اس کا جز ہوتی تو اس میں اکیس آیات ہوتیں اور قول نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مخالف ہوجاتا۔

اور نیز اس پر تمام شہروں کے قراء اور فقہاء کا اتفاق کرنا کہ سورۃ کوثر میں تین آیات ہیں اور سورۃ اخلاص میں چار آیات ہیں یہ دلالت کرتے ہیں کہ اگر تسمیہ سورتوں کا جز ہوتی تو ان سورتوں کی آیات زیادہ ہوجاتیں۔

تو ان احادیث سے ثابت ہوگیا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم سورتوں کا جز نہیں اور ان کی پہلی آیت نہیں۔ اب رہا شافعیہ کے استدلال اجماع کا جواب تو علامہ حلبی کبیری میں اس استدلال کے جواب میں فرماتے ہیں:

وا جماع الصحابة على اثباتها في المصاحف لا يلزم منه انها آية من كل سورة بل اللازم منه مع الامر بالتجريد عن غير القران انها من القرآن و به نقول انها اية منه نزلت للفصل بين السور۔

اور صحابہ کے مصاحف میں تسمیہ کے ثابت رکھنے پر اجماع سے یہ لازم نہیں آتا کہ تسمیہ ہر سورۃ کی پہلی آیت ہو بلکہ مع اس حکم کے کہ مصحف کو غیر قرآن سے خالی کیا جائے یہ لازم آیا کہ تسمیہ قرآن کی آیت ہو اور ہم یہی کہتے ہین کہ تسمیہ قرآن کی آیت ہے سورتوں میں فصل کیلئے وہ نازل ہوئی۔

بالجملہ اس بحث سے ثابت ہوگیا کہ جولوگ تسمیہ کو سورہ فاتحہ کی پہلی آیت قرار دیتے ہیں ان کا مذہب روایۃ ودرایۃ ہر طرح ضعیف ہے اور ہمارے لئے ناقابل عمل ہے اور مذہب حنفی ہر لحاظ سے قوی اور مدلل ہے۔

مقدمہ ثالثہ: نماز کی ہر رکعت مین تسمیہ کا سورہ فاتحہ سے قبل پڑھنا سنت ہے۔ اور اس کا بعد فاتحہ کے سورہ سے پہلے پڑھنا مسنون نہیں اور قول مفتی بہ یہی ہے کہ فاتحہ اور سورۃ کے درمیان تسمیہ نہ پڑھی جائے۔

طحطاوی سے مراقی الفلاح میں ہے:

و تسن التسمية اول كل ركعة قبل الفاتحة لانه صلى الله تعالىٰ عليه وسلم كان يفتتح صلاته ببسم الله الرحمن الرحيم۔

اسی میں ہے: لا يسمى بين الفاتحة و السورة في قولها قال في المضمرات والفتوى على قولها۔

درمختار میں ہے: و لا تسن بين الفاتحة والسورة مطلقا و لو سرية و لا تكره اتفاقا۔

احکام القرآن میں ہے:

روى ابو يوسف عن ابی حنيفة انه يقرأها في كل ركعة مرة واحدة عند ابتداء قرأة فاتحة الكتاب و لا يعيدها مع السورة عند ابي يوسف۔

(احکام القرآن مصری ج ۱ ص ۱۲)

اسی میں ہے: و اما من قرأها في كل ركعة فوجه قوله ان كل ركعة لها قرأة مبتدأة لا ينوب عنها القرأة في التي قبلها كان كذالك حكم الثانية اذا كان فيها ابتداء قرأة و لا يحتاج الى اعادتها عند كل سورة لانها فرض واحد و كان حكم السورة في الركعة الواحدة حكم ما قبلها لانها دوام على فعل قد ابتدأه حكم الدوام و حكم الابتداء كالركوع۔

یہ مذہب حنفیہ ہوا اور اس مذہب کی تائید دارقطنی کی یہ حدیث کرتی ہے:

قال رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم اذا قمت في الصلوه فقل بسم الله الرحمن الرحيم الحمد لله رب العالمين حتى تجمعها و قل هو الله احد الى آخرها۔

(صحیح البخاری ج ۱ ص ۳۶۶)

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم نماز میں کھڑے ہوتو بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھو یہاں کہ ان کو ختم کردینا اور قل ھو اللہ احد آخر سورۃ تک پڑھو۔

علامہ حلبی کبیری میں نہایت صاف طور پر تصریح فرماتے ہیں:

اما تسمية عند ابتداء السورة بعد الفاتحة عند ابی حنيفة لا ياتی بها لا في حال الجهر ولا في حال المخافة و كذا عند ابی يوسف لما تقدم انها ليست بآية من اول السورة و الاتيان بها في اول كل ركعة لما تقدم من الاحاديث الدالة على انه عليه السلام كان ياتي بها سرا و كذا الخلفاء الراشدون و لم يرو شئی في الاتيان بها اول

السورۃ ۔ (کبیری ص ۳۰۱)

لیکن فاتحہ کے بعد سورۃ کے ابتداء میں بسم اللہ پڑھنا تو امام اعظم کے نزدیک اس کو نہ پڑھے نہ جہر کی حالت میں نہ آہستہ پڑھنے میں اور اسی طرح امام ابو یوسف کے نزدیک پہلے گذر چکا کہ تسمیہ سورۃ کی پہلی آیت نہیں اور تسمیہ کا ہر رکعت کے اول میں لانا تو اس پر دلالت کرنے والی حدیثیں منقول ہوئیں کہ حضور علیہ السلام تسمیہ کو آہستہ پڑھتے اور اسی طرح خلفائے راشدین کرتے اور تسمیہ کے اول سورۃ پڑھنے میں کوئی حدیث مروی نہیں۔

مخالف کے پاس کوئی ایسی روایت نہیں جس سے تسمیہ کا فاتحہ کے درمیان پڑھنا مسنون ثابت کر سکے تو مذہب مخالف روایت ودرایت کسی طرح ثابت نہ ہو سکا اور مذہب حنفیہ ہر طرح ثابت کر دیا گیا۔

مقدمہ رابعہ: نماز میں تسمیہ کے بالجہر پڑھنے میں سوائے ترمذی کے صحاح نے کوئی حدیث روایت نہیں کی اور ترمذی نے جو یہ حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی:

کان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم یفتح صلوته ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

تو اس کا ضعف خود ہی اس طرح بیان کیا: قال ابو عیسیٰ و لیس اسنادہ بذلك ۔

پھر اس کے حاشیہ میں ہے: قال بعض الحفاظ لیس حدیث صریح فی الجھر الا فی اسنادہ مقال عند اهل الحدیث و لذا اعرض ارباب المسانید المشهورة الاربعة واحمد لم یخرجوا منها شیئا مع اشتمال کتبهم علی آحادیث ضعیفة ۔

علامہ حلبی کبیری میں فرماتے ہیں:

قال ابن التیمیة و روینا عن الدارقطنی انه قال لم یصح عن النبی صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم فی الجهر حدیث و قال الحازمی احادیث الجهر و ان کانت ماثورة عن نفر من الصحابة غیر ان اکثرها لم یسلم من الشوائب ۔ (کبیری ص ۳۰۱)

علامہ عینی عمدۃ القاری میں فرماتے ہیں:

احادیث الجهر وان کثرت رواتها فکلها ضعیفة و لیست مخرجة فی الصحاح و لا فی المسانید المشهورة ۔ (حاشیہ بخاری مجتبائی ج ۱ ص ۱۰۳)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں:

وبہ تحقیق ثابت شدہ است از آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم واز خلفاء راشدین وصحابہ رضوان

اللہ علیہم اجمعین کہ جہر نمی کردند بسملہ اگر نماز جہری می بود۔ وشیخ ابن الہمام از بعض حفاظ نقل کردہ کہ ہیچ حدیث ثابت نشد کہ صریح باشد در جہر بہ تسمیہ مگر آنکہ در اسناد وی سخن است وہیچ یکے از ارباب مسانید اربعہ مشہورہ اخراج نہ کردہ حدیثے دراں باوجود آنکہ کتب ایشاں مشتمل ست بر احادیث ضعیف وچندیں از صحابہ وتابعین وتبع تابعین وغیرہم از ائمہ لاتعد ولاتحصی ذکر کردہ اند کہ جہر نمی کردند واحیانا اگر بعض جہر روایت کردہ اند برائے تعلیم بود یا بجہت کمال قرب بعضے از مقتدیاں آنرا۔

(اشعۃ اللمعات کشوری ج ۱ ص ۳۷۳)

ان عبارات سے ظاہر ہو گیا کہ مدعیان تسمیہ بالجہر کے پاس غیر مجروح صحیح مرفوع حدیث اپنے اثبات مدعی کیلئے نہیں ہے۔ جب مشہور صحابہ نے تسمیہ بالجہر میں کسی صحیح مرفوع حدیث کی تخریج نہیں کی تو خود ہی ثابت ہو گیا کہ تسمیہ بالجہر کا مذہب ضعیف ہے۔ اور تسمیہ بالسر کا مذہب اصح ہے۔ چنانچہ روایات بکثرت اسی کی تائید کرتی ہیں۔

حدیث: (۱) بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

ان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم و ابا بکر و عمر کانوا یفتحون الصلوة بالحمد للہ رب العلمین ۔ (ج ۱ ص ۱۰۳)

بیشک نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور عمر نماز کو الحمد للہ رب العلمین سے شروع کیا کرتے تھے۔

مسلم شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

حدیث: (۲)۔ قال صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم و ابی بکر و عمر و عثمان فلم اسمع احدا منهم یقرء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔

(مسلم مع شرح نووی ج ۱ ص ۱۷۲)

انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور خلیفہ اول حضرت ابوبکر اور خلیفہ ثانی عمر اور خلیفہ سوم حضرت عثمان کے ساتھ نماز پڑھی تو میں نے ان سے کسی کو بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتا ہوا نہیں سنا۔

اسی مسلم شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

حدیث: (۴) ان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم و ابا بکر و عمر و عثمان کانوا

یفتتحو ن با لقرأ ۃ با لحمد للہ رب العالمین ۔ (ابوداؤد مجتبائی)

بیشک نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور عمر و عثمان الحمد للہ رب العلمین سے قرأت شروع کرتے تھے۔

ابوداؤد شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی:

حدیث:(۵) قالت کان رسو ل اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یفتتح الصلوۃ بالتکبیر والقرأۃ با لحمد للہ رب الغلمین۔

انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نماز کو اللہ اکبر سے اور قرأۃ کو الحمد للہ رب العلمین سے شروع کرتے تھے۔

حدیث:(۶۔۷) عن عبد اللہ بن مغفل قال: سمعنی ابی و انا فی الصلوۃ اقول بسم اللہ الرحمٰن الرحیم فقال یابنی محدث ایاک و الحدث و قال لم ار ھذا من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کان ابغض الیہ الحدث فی الاسلام قال و قد صلیت مع النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و مع ابی بکر و عمر و عثمان فلم اسمع احدا منھم یقولھا فلم تقلھا اذا انت صلیت فقل الحمد للہ رب العالمین ۔
(ترمذی علیمی دہلی ج ۱ ص ۳۳)

ترمذی شریف میاں حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے مروی انہوں نے کہا مجھے میرے باپ نے نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتا ہوا سنا تو انہوں نے مجھ سے کہا اے بیٹے یہ نئی بات ہے اور تو نئی بات سے بچ اور کہا میں نے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں سے کسی کو نہ دیکھا کہ وہ انہیں سخت ناپسند تھی اور فرمایا کہ میں نے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و عمر و عثمان کے ساتھ نماز پڑھی تو میں نے ان میں سے کسی کو تسمیہ کہتے ہوئے نہ سنا تو اس کو تو بھی اب مت کہہ تو نماز پڑھ تو الحمد للہ رب الغلمین کہنا۔

ترمذی شریف میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی:

حدیث:(۸) کان رسو ل اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و ابو بکر و عمر و عثمان یفتتحو ن القرأ ۃ با لحمد للہ رب الغلمین ۔ (ص ۳۴)

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اور حضرت عثمان قرأۃ کو الحمد للہ

رب العلمین سے شروع کرتے تھے۔

نسائی شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی:

حدیث:(۱۰) صلیت مع النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و مع ابو بکر و عمر وعثمان رضی اللہ عنہما فیفتتحون بالحمدللہ رب العالمین ۔ (نسائی انصاری ص ۹۱)

کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ اور حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ساتھ نماز پڑھی تو انہوں نے الحمد للہ رب العالمین سے نماز شروع کی۔

حدیث:(۱۱) قال صلی بنا رسو ل اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فلم یسمعنا قرأۃ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم و صلی بنا ابو بکر و عمر و عثمان فلم نسمعھا منھما ۔
(نسائی ج ۱ ص ۹۲)

انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی تو ہم نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا پڑھنا نہیں سنا اور ہمیں حضرت ابوبکر و عمر نے نماز پڑھائی تو ہم نے تسمیہ کو ان دونوں سے نہیں سنا۔

نسائی شریف میں انہیں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی:

حدیث:(۱۲) قال صلیت خلف رسو ل اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و ابی بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنھم فلم اسمع احدا منھم یجھر ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔
(نسائی ص ۹۲)

انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی تو ان میں سے کسی کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بالجہر کیساتھ پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔

نسائی شریف میں حضرت مغفل بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی:

حدیث:(۱۳) اذا سمع احد نا یقرأ بسم اللہ الرحمن الرحیم یقول صلیت خلف رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وابی بکر و عمر رضی اللہ عنہما فما سمعت احدا منھم قرأ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ (نسائی مطبوعہ انصاری ص ۹۲)

اور جب ہم میں سے کسی کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے ہوئے سنتے تو کہتے میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پیچھے نماز پڑھی تو میں نے ان میں سے کسی کو نہیں سنا کہ اس نے بسم الرحمٰن الرحیم پڑھی ہو۔

ابن ماجہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی:

حدیث:(۱۴) کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یفتتح القرأۃ بالحمد للہ رب العالمین۔ (ابن ماجہ نظامی دہلی ج۱رص۵۹)

انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قرأۃ کو الحمد للہ رب العالمین سے شروع فرماتے تھے۔

ابن ماجہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی:

حدیث:(۱۵) کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و ابو بکر و عمر یفتتحون القرأۃ بالحمد للہ رب العلمین۔ (ابن ماجہ ص۵۹)

بیشک نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قرأت کو الحمد للہ رب العلمین سے شروع فرماتے تھے۔

ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے مروی:

حدیث:(۱۷) قال صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و مع ابی بکر و عمر و عثمان فلم اسمع رجلا یقوله فاذا قرأت فقل الحمد للہ رب العلمین۔ (ابن ماجہ ص۵۹/)

انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ اور حضرت ابوبکر کے اور عمر کے ساتھ اور عثمان کیساتھ نماز پڑھی تو میں نے کسی شخص کو تسمیہ پڑھتا ہوا نہیں سنا۔ پس جب تو قرأت کرے تو الحمد للہ رب العلمین پڑھنا۔

موطا امام مالک میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی:

حدیث:(۱۸) قال: قمت وراء ابی بکر و عمر و عثمان فکلھم کان لا یقرأ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اذا افتتحوا الصلاۃ۔ (مؤطا ص۱۰)

انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت ابوبکر اور عمر اور عثمان کی اقتدا کی تو یہ سب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں پڑھتے تھے جب نماز شروع کرتے۔

بیہقی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی:

حدیث:(۱۹) کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و ابو بکر و عمر یقرأن یعنی لا یجھرون ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ (بیہقی ج۲رص۵۲۰)

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ابوبکر اور عمر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بالجہر نہیں پڑھتے تھے۔

امام طبرانی تہذیب الآثار میں حضرت ابووائل رضی اللہ عنہ سے راوی:

حدیث:(۲۰) قال لم یکن عمر و علی یجھران ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم و لا بآمین، (الجوہر النقی ج۲رص۴۸)

انہوں نے کہا کہ حضرت عمر اور حضرت علی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور آمین جہر سے نہیں کہتے تھے۔

امام طبرانی معجم کبیر میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے راوی:

حدیث:(۲۱) ان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وابا بکر و عمر کانوا یسرون ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ (صحیح البخاری ج۱رص۳۸۹)

بیشک نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور عمر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بالسر یعنی پوشیدہ طور پر پڑھتے تھے۔

حدیث:(۲۲) لم یجھر النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بالبسملۃ حتی مات۔ (کبیری ص۳۰۱)

کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تسمیہ کو بالجہر نہ پڑھا یہاں تک کہ وفات پائی۔

امام طبرانی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے راوی:

حدیث:(۲۳) ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کان یسر ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم و ابا بکر و عثمان و علیا۔ (کبیری ص۳۰۱)

بیشک رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و عثمان اور علی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بالسر آہستہ پڑھتے۔

حدیث:(۲۴) قال الجھر ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرأۃ الاعراب۔ (الجوہر النقی ج۲رص۴۷)

انہوں نے فرمایا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بالجہر پڑھنا اہل قریہ کی قرأت ہے۔

ابوبکر رازی احکام القرآن میں حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی:

قال جھر الامام ببسم اللہ الرحمن الرحیم فی الصلاۃ بدعۃ۔ (احکام القرآن، ج۱ـص۱۵)

انہوں نے کہا کہ امام کا بسم اللہ الرحمن الرحیم کو نماز میں بالجہر پڑھنا بدعت ہے۔

ان احادیث سے ثابت ہوگیا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم سورۃ فاتحہ سے پہلے پڑھی جاتی تھی۔ لیکن جہری نمازوں میں بالجہر نہیں پڑھی جاتی تھی، بلکہ بالسر آہستہ پڑھی جاتی تھی، خود نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین اور اجلہ صحابہ وتابعین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جہر کے ساتھ بسم اللہ نہیں پڑھتے اور الحمد للہ رب العالمین سے جہر سے شروع کرتے۔ انہیں احادیث سے استدلال کرتے ہوئے مذہب امام اعظم کا واضح وراجح ہونا ظاہر ہوگیا۔ لہذا نماز میں بسم اللہ کا آہستہ پڑھنا مسنون ہوا۔

ردالمحتار میں ہے: والسرلانها سنة۔ اور بالجہر پڑھنا مکروہ ہوا۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: ويكره الجهر بالستمية والتامين ۔

یہ حنفی مذہب کے دلائل کا ایک نمونہ پیش کردیا گیا ہے۔ ان مقدمات کے بعد سوال کا جواب خود ہی واضح ہوگیا مگر چونکہ سوال مذہب حنفیت کے خلاف بعض مغالطوں اور غلط استدلالوں پر مشتمل ہے اس لئے اس کے ہر ہر جملے کا جواب دے دیا جاتا ہے۔ پھر اختصار ملحوظ ہے۔

صاحب فوائد مکیہ تحریر فرماتے ہیں: کہ حضرت امام عاصم کوفی رحمۃ اللہ علیہ بین السورتین تسمیہ پڑھتے ہیں تو اس لحاظ سے جس سورۃ کو قاری بلاتسمیہ پڑھے گا وہ سورۃ امام کے نزدیک ناقص ہوگی۔

اقول: حضرت امام عاصم کا فعل غیر نماز میں قابل لحاظ لائق عمل ہوسکتا ہے، لہذا خارج نماز میں جب تلاوت کرے تو سورۃ کو بلاتسمیہ کے نہ پڑھے۔

ردالمحتار میں ہے: وفي خارج الصلوة اختلاف الروايات والمشائخ في التعوذ و التسمية قيل يخفى التعوذ دون التسميه والصحيح انه يتخير فيهما ولكن يتبع امامه من القراء وهم يجهرون بهما الاحمزة فانه يخفيهما۔ (ردالمحتار۔ ج۱۔ص۳۴۴)

باقی رہا نماز میں تو اس میں ائمہ اربعہ کا اتباع کیا جائے گا۔ کہ احکام صلوۃ کا تعلق ائمہ اربعہ سے ہے نہ کہ ائمہ قراۃ سے، جسکی تفصیل آگے آتی ہے اس کے بعد کہا۔

و عن ابی خزيمة ان رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه و سلم قرء بسم الله الرحمن الرحيم في اول الفاتحة في الصلوة و عدها آية ايضا الخ۔

اقول: اس حدیث پر علامہ علاء الدین بن علی نے الجوہر النقی میں یہ جرح لکھی ہے:

ليس في الحديث عدها آية الامن وجه ضعيف ۔

نیز اس حدیث میں ابن ملیکہ کی سماعت حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

وقال الطحاوي في كتاب الرد على الكرابيسي لم يسمع ابن ابي مليكة هذا الحديث من ام سلمة۔ (الجوہر النقی، ج۲۔ص۴۴)

ان کے درمیان میں ایک راوی یعلی بن مملک متروک ہے تو اس حدیث ضعیف و مجروح پر حدیث صحیح کے بالمقابل بناء مذہب قرار دینا ناقابل اعتماد واستدلال ہے۔ اسکے بعد لکھا۔

پھر علامہ جزری فرماتے ہیں کہ بسم اللہ منزل من اللہ ہے اسکو پڑھنا چاہیے۔

اقول: بسم اللہ کے منزل من اللہ ہونے کا کون انکار کرتا ہے، احناف کے نزدیک بھی وہ منزل من اللہ ہے جیسا کہ مقدمہ اولی سے ظاہر ہوچکا ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ اسکو پڑھنا چاہیے تو اس کے نماز وغیر نماز میں ابتدائے قراءۃ میں پڑھنے کو کون منع کرتا ہے احناف اس کو کہیں سنت کہیں مستحب کہتے ہیں جیسا کہ اوپر مفصل مذکور ہوا۔

پھر کہا: چنانچہ باسناد اسحاق نقل کرتے ہیں۔ ہم سورۃ فاتحہ اور ہر سورۃ کے شروع ہر حالت وخارج از صلوۃ قرآن سناتے ہوں خواہ نماز میں بسم اللہ پڑھا ہی کرتے تھے۔

اقول: اسحاق بن مسیبی کو علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں فرماتے ہیں: کہ وہ ضعیف ہیں۔ علاوہ بریں وہ کسی حدیث کی روایت نہیں کررہے بلکہ محض اپنے عمل کا ذکر کررہے ہیں، اور انکا عمل سب کے لئے حجت نہیں۔ اور اگر اس سے بھی قطع نظر کیجئے تو اسے سورۃ فاتحہ اور ہر سورۃ سے پہلے نماز میں کون ناجائز قرار دیتا ہے۔ مقدمہ ثالثہ سے ظاہر ہوچکا کہ تسمیہ کا قبل سورۃ فاتحہ کے پڑھنا مسنون ہے اور سورۃ سے پہلے پڑھنا بھی جائز ہے۔ تو انکا کلام ہمارے خلاف نہیں۔

پھر کہا: اور قراء مدینہ کا بھی یہی مذہب تھا۔

اقول: قراء مدینہ کا مذہب اس تسمیہ کے جزء سورۃ ہونے میں امام عاصم وغیرہ قراء کوفہ کے بالکل مخالف ہے۔

تفسیر بیضاوی میں ہے: بسم الله الرحمن الرحيم من الفاتحة وعليه قراء مكة والكوفة و فقهائها و ابن المبارك والشافعي وخالفهم قراء المدينة و البصرة و فقهائها و مالك۔

تو اس عبارت سے ظاہر ہوگیا کہ قراء مدینہ کا مذہب حضرت امام عاصم وغیرہ قراء کوفہ کے خلاف ہے تو ان کو انکا ہم مذہب کہنا کس قدر غلط بات ہے۔ اس کے بعد کہ ان روایات سے یہ امر ثابت ہوتا ہے

کہ بین السورتین بسم اللہ نہ پڑھنے کا اختلاف ایسا ہے کہ جیسے اور اختلافات قراءت سبعہ کہ جس طرح اس کا پڑھنا جائز ہے اسی طرح اس کا نہ پڑھنا بھی درست ہے۔

اقول: نتیجہ تو معلوم ہے لیکن ان رویات سے اس امر کا ثابت ہونا محل نظر ہے جیسا کہ اوپر کی تفسیر سے ظاہر ہے۔ پھر ان روایات کا بجنسہ حجت ہونا بھی محل کلام ہے۔

اسکے بعد کہا؛ پس مبسملین کی روایات میں بسم اللہ بین السورتین وجہرا پڑھنی چاہیے۔

اقول: خارج نماز میں تو تسمیہ کا بین السورتین جہر سے پڑھنا محل نزاع نہیں۔ رہا نماز میں تسمیہ کا جہرا پڑھنا تو وہ بین السورتین ہی کیا بلکہ قبل سورۃ کے بھی کسی غیر مجروح صحیح حدیث سے ثابت نہیں، بلکہ صحیح حدیثوں کے خلاف ہے جیسا کہ مقدمہ رابعہ سے ظاہر ہے۔ تو اب ان صحیح حدیثوں کے خلاف یہ استدلال کرنا کہ تسمیہ کو جہرا پڑھنا چاہیے جہالت نہیں ہے تو اور کیا ہے بلکہ دین میں اپنی رائے ناقص سے دخل دینا ہے۔

اس کے بعد کہا: کیوں کہ فقہا کو اگر چہ اپنی ذاتی تحقیق اس مسئلہ میں کچھ ہی ہوتی تھی مگر روایت کے موقع پر آ کر اس مسئلہ کو فن قراءت ہو جانے کی وجہ سے وہ قراء ہی کا اتباع کرتے تھے۔

اقول: اوپر مذکور ہوا کہ نماز میں تسمیہ کا پڑھنا، پھر ہر رکعت میں پڑھنا اور ایک رکعت میں بھی ایک بار پڑھنا یا چند بار پڑھنا بالجہر پڑھنا یا بالسر پڑھنا یہ سب فقہ کے احکام ہیں نہ کہ فن قرائت کے۔ تو جب یہ فقہ کے احکام ہوئے تو ان میں اتباع فقہا کا ہوگا یا قراء کا۔ قراء کا اتباع ہر اس بات میں ہوگا جو بات فن قراءت کی ہو، اور جو بات ان کے فن ہی کی نہ ہو تو اس میں قراء کا اتباع کس طرح کیا جا سکتا ہے۔

صاحب فوائد نے نہ تو تجوید کے امتیاز کو سمجھا، نہ فقہا و قراء کے مذہب کے فرقوں کی جانا، نہ انکے طریقہ استدلال سے واقفیت حاصل کی، نہ انکے دلائل پر مطلع ہونے کی سعی کی۔ پھر اس نے فقہا کی ذاتی تحقیق سے اگر یہ مراد لی ہے کہ انہوں نے نص صریح کے خلاف جو استدلال کیا ہے وہ انکی ذاتی تحقیق ہے تو ہمارے فقہا کرام کی ایسی تحقیق کوئی نہیں پیش کی جا سکتی ہے۔ اور اگر یہ مراد ہے کہ انہوں نے نص کے خلاف تو نہیں کیا لیکن نص سے علت کو اخذ کر کے کسی غیر منصوص کیلئے قیاس کیا تو یہ خلاف روایت ہی کب قرار پایا۔ اس کو خلاف روایت کہنا ہی سخت نادانی ہے۔ اس مسئلہ تسمیہ میں ہمارے فقہا احناف نے جو احکام بتائے وہ بالکل موافق روایات ہیں جیسا کہ اوپر کے مقدمات سے ظاہر ہو چکا۔ صاحب فوائد نے فقہا کا تسمیہ میں وہ کون سا حکم دیکھا جو صحیح روایت کے خلاف ہو اور قراء اسکے مقابل صحیح روایت پر عامل

ہوں۔ اور جو بات پیش کی گئی اس میں تو صحیح روایات فقہا کی موافقت کر رہی ہیں جیسا کہ مقدمات میں گذرا۔

اس کے بعد کہا: حضرت امام مالک علیہ الرحمۃ نے باوجود اسکے کہ انکے مذہب میں بسم اللہ ہر سورۃ کا جز نہیں مگر امام نافع سے مسئلہ پوچھ کر یوں ہی فرمایا کہ ہر علم کا مسئلہ اس کے اہل سے پوچھنا چاہیے

اقول: یہ قاعدہ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہر علم کا مسئلہ اس کے اہل سے پوچھنا چاہیے۔ لیکن صاحب فوائد اپنے اس دعوے کو تو کسی دلیل سے ثابت کر دے کہ نماز سے تسمیہ کا فاتحہ و سورۃ سے پہلے ہر رکعت میں پڑھنا اور اس کا بالجہر پڑھنا علم قراءۃ کا مسئلہ ہے پھر ہم سے مطالبہ کرے۔

رہا امام مالک کا یہ واقعہ۔ اول تو کسی معتبر کتاب کے حوالہ سے نہیں، علاوہ بریں حضرت امام مالک نے اپنے قول پر خود عمل نہیں کیا۔ اور اپنے مذہب سے کیوں رجوع نہیں فرمایا، مصنف کو اپنے استدلال میں کسی کا قول سوچ سمجھ کر پیش کرنا تھا۔ لہذا قول حضرت امام مالک نے اسکو کیا فائدہ پہنچایا۔

پھر اس کے بعد کہا: مدار علم قرائت نقل وصحت روایت پر ہے۔ قیاس وعقل کو اس میں دخل نہیں۔

اقول: نہ تو تمام قواعد علم تجوید نقل وصحت روایت پر موقوف ہیں جو قواعد عربیہ اس میں جاری ہیں ان میں صحت روایت کیسے متصور ہوگی۔ نہ اس کے سارے مسائل تجوید قیاس وعقل کے بالکل خلاف ہیں، کہ بعض مسائل تجوید موافق قیاس وعقل بھی ہیں جو فن تجوید کے واقف کار پر بھی مخفی نہیں۔

اسکے بعد کہا: علم فقہ منصوصات ومجتہدات دونوں سے مرکب ہیں۔

اقول: اگر مجتہد کو منصوص کا مقابل ٹھہرا کر مجتہدات سے خلاف منصوصات مراد لیا گیا ہے تو یہ غلط ہے اور حقیقۃ وہ مجتہد ہی نہیں ہے۔

توضیح میں ہے: فمعنى القياس ان النص الوارد فى المقيس عليه وارد فى المقيس معنى و ان لم يكن واردا صريحا۔

ردالمحتار میں ہے: المراد بالمجتهد فيه ما كان مبنيا على دليل معتبر شرعا بحيث يسوغ للمجتهد بسببه مخالفة غيره بخلاف ما اذا كان قولا مخالفا للكتاب كحل متروك التسمية عمدا فانه لا يسمى مجتهدا فيه ۔ (ردالمحتار۔ ص ۳۳۱)

تو مجتہدات بمعنی منصوصات ہی ہوتے ہیں ان کو خلاف منصوص نہیں کہا جا سکتا۔

پھر اس کے بعد کہا۔ مسائل منصوص میں شارع علیہ السلام کے سوا کسی کا اتباع نہیں اور ائمہ کی

تقلید مسائل اجتہادیہ میں ہے۔

اقول: نہ تو مطلقا یہ صحیح ہے کہ شارع علیہ السلام کے سوا کسی اور کا اتباع مسائل منصوصہ میں نہیں کہ مسائل منصوصہ میں ائمہ اور فقہا کا بھی اتباع کیا جاتا ہے۔

درمختار میں ہے: و اما نحن فعلینا اتباع ما رجحوہ و ما صححوہ۔

اور نہ حقیقۃ یہی صحیح ہے کہ مسائل اجتہادیہ میں صرف ائمہ ہی کی تقلید کی جاتی ہے۔ بلکہ اس تقلید ائمہ میں اتباع رسول علیہ السلام بھی حاصل ہے۔

علامہ شعرانی میزان الشریعۃ میں فرماتے ہیں: ما من قول من اقوال المجتہدین و مقلدیہم الا و ینتہی سندہ برسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ثم بجرئیل ثم بحضرۃ اللہ تعالیٰ۔ (میزان مصری ج۱ ص۴۴)

تو جب مسائل اجتہادیہ کی سند حضرت شارع علیہ السلام تک پہنچتی ہے تو تقلید ائمہ میں اتباع رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی حاصل ہو گیا اور مصنف کا دعویٰ ہر پہلو پر باطل ثابت ہوا۔

اس کے بعد کہا: لہٰذا ہر مسئلہ قرأۃ میں نقل وصحت روایت کے علاوہ اور سند کی ضرورت نہیں۔

اقول: جب ہر مسئلہ قرأۃ نقل وصحت روایت پر موقوف نہیں ہے تو سرے سے یہ دعویٰ ہی صحیح قرار نہیں پایا۔ پھر باوجود اس کے یہ کہنا بےجا ہے۔ کہ جس کا مدار روایت پر ہو اس میں سند کی ضرورت نہیں،

اسکے بعد کہا: مسئلہ قرأت کی سند فقہاء کے اقوال سے تلاش کرنا غلطی ہے بلکہ اس کی سند ائمہ قرأۃ سے دریافت کرنی چاہیے۔ پس تصحیح روایت کے بعد اس پر عمل کرنا چاہیے۔

اقول: جس طرح مسئلہ قرأۃ کی سند اقوال فقہاء سے تلاش کرنا غلطی ہے۔ اسی طرح فقہی مسئلہ کی اقوال قراء سے تلاش کرنا بھی سخت غلطی بلکہ انتہائی جہالت ہے کہ فقہی مسئلہ اقوال فقہاء سے ہی لیا جاتا ہے، تو نماز میں ہر سورۃ پر بسم اللہ پڑھنا یا نہ پڑھنا اور بالجہر پڑھنا یا بالسر پڑھنا یہ فقہی مسئلہ ہے اُس کو اقوال فقہاء سے ہی اخذ کر کے عمل کیا جائے گا۔

اس کے بعد کہا:

دوسری بات یہ ہے کہ جو کچھ بین الدفتین ہو رسم عثمانی اس کی متحمل ہو اور قواعد تجوید کے موافق ہو نقل متواتر کیساتھ ہم تک پہنچا ہو وہ قرآن ہے اور تسمیہ پر یہ سب باتیں صادق آتی ہیں۔

اقول: لاریب تسمیہ قرآن کی آیت ہے۔ فقہاء کا یہی مسلک ہے۔ مقدمہ اولیٰ میں اس کو بدلائل

ثابت کر دیا ہے۔

اس کے بعد کہا: نیز باجماع مذاہب اربعہ ہر حال میں قرأۃ سبعہ کیساتھ قرآن پڑھنا جائز ہے۔

اقول: نماز میں قرآن کا قرأت سبعہ کے ساتھ پڑھنا جائز ہے۔ لیکن عوام کے انکار کرنے یا فتنہ میں پڑ جانے کا خوف ہو تو اپنی اس قرأت کے سوا جس سے عوام واقف ہیں کسی دوسری قرأت میں نہ پڑھنا چاہیے۔

درمختار میں ہے: و یجوز بالروایات السبع لکن الاولیٰ ان لا یقرأ بالغریبۃ عند العوام صیانۃ لدینہم۔

اس کے بعد کہا: اختلاف قرأۃ بحرکت ہوں یا بکلمہ یا تبدیلی وزیادتی کلمہ خواہ ان میں سے کسی طرح کا اختلاف ہو سب جائز ہے۔

اقول: جو اختلاف قرأۃ سبعہ بلکہ عشرہ کے موافق ہو گا وہ تو بلاشک جائز ہے۔ اور جو اختلاف عشرہ سے بھی متجاوز ہو اس میں تغیر معنی بھی ہوتا ہو تو وہ کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ اور اس کو نماز میں کیسے روا رکھا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد کہا: پھر تسمیہ کو نماز میں ناجائز کہنا کس طرح قبول کیا جا سکتا ہے جب تک کہ وہ دلیل نقلی قرآن یا حدیث سے نہ ہو۔

اقول: تسمیہ کو نماز میں ناجائز کس نے کہا ہے۔ فقہاء حنفیہ تو نماز میں تسمیہ کو قبل سورۃ فاتحہ کے تو مسنون کہتے ہیں۔ اور بین السورتین کو جائز لکھتے ہیں جیسا کہ مقدمہ ثالثہ سے کہ وہ تو اس کو جائز لکھتے ہیں،

پھر اس کے بعد کہا: باوجود ان تمام امور کے کہیں امام اعظم قدس سرہ سے اس کی تصریح بھی نہیں آئی کہ تمامی قراء کے اختلاف تمام قرآن میں پڑھنے جائز ہوں اور مبسملین کے قول کے موافق تسمیہ بین السورتین جائز نہ ہو۔

اقول: مذہب امام اعظم کا اتفاقی مسئلہ یہی ہے کہ ائمہ سبعہ بلکہ عشرہ کی روایت سے جتنی قرأتین ہو چکیں اس کا نماز میں پڑھنا جائز ہے۔

ردالمحتار میں ہے: القرآن الذی تجوز بہ الصلوٰۃ بالاتفاق ہو المضبوط فی مصاحف الائمۃ التی بعث بہا عثمان رضی اللہ عنہ الی الامصار و ہو الذی اجمع علیہ الائمۃ العشرۃ و ہذا ہو المتواتر جملۃ و تفصیلا فما فوق السبعۃ الی العشرۃ غیر

شاذ وانما الشاذ ما وراء العشرة و هو الصحيح ۔ (ردالمحتار ج۱ ص۳۴۱)

رہا خود امام اعظم کا قول تو وہ اگر اس کے خلاف ہوتا تو مذہب حنفی کا یہ متفقہ مسئلہ نہ ہوتا اور حضرت امام کی تسمیہ بین السورتین کے متعلق یہ تصریح موجود ہے۔

احکام القرآن میں ہے: روى هشام عن ابى يوسف قال ابو حنيفة عن قراءة بسم الله الرحمن الرحيم قبل الفاتحة الكتاب و تحديدها قبل السورة التى بعد فاتحة الكتاب فقال ابو حنيفة يجزيه قرأتها قبل الحمد۔ (احکام القرآن مصری ص۱۲ ج۱)

نیز اسی میں ہے: روى ابو يوسف عن ابى حنيفة انه يقرأها فى كل ركعة مرة واحدة عند ابتداء قرأة فاتحة الكتاب و لا يعيدها مع السورة عند ابى حنيفة ۔

اور اختلاف قراء کا جواز اور تسمیہ بین السورتین کے جواز کا قول ان کے خلاف اولی ہونے کے منافی نہیں۔

ردالمحتار میں ہے: الجواز المشروعية بمعنى عدم الحرمة فلا ينافى كونه خلاف اولى ۔ (ج۱ ص۳۴۴)

لہذا یہ دونوں جائز ہیں۔ لیکن خلاف اولی ہیں۔

اس کے بعد کہا: پھر یہ مسئلہ اجتہادی بھی نہیں کیونکہ منصوصات میں اجتہاد جائز نہیں۔

اقول: مصنف نے نماز میں تسمیہ بین السورتین کے مسئلہ اجتہادی ہونے کا انکار کیا ہے اور اسکو منصوص مانا لیکن اس کے منصوص ہونے پر کوئی روایت پیش نہیں کی بلکہ وہ کوئی صریح حدیث پیش کر بھی نہیں سکتا کہ اس میں کوئی حدیث مروی ہی نہیں۔

چنانچہ علامہ حلبی کبیری میں تصریح کرتے ہیں: و الاتيان بها فى اول كل ركعة كما تقدم من الاحاديث الدالة على انه عليه السلام كان ياتى بها سرا و كذا الخلفاء الراشدون و لم يرو شئى فى الاتيان بها اول السورة ۔ (کبیری ص۳۰۱)

تو اس کے منصوص ہونے کا دعویٰ تو غلط ثابت ہوا اور جب یہ غلط ہوا تو وہ مسئلہ اجتہادی قرار پایا۔

اس کے بعد کہا: ہم مسائل اجتہادیہ میں امام صاحب کے مقلد ہیں نہ کہ مسائل منصوصہ میں۔ لہذا مسائل فقہیہ میں تو مقلد ہیں کہ وہ مجتہد ہیں۔

اقول: جب اسکا مسئلہ اجتہادی ہونا ثابت ہو چکا تو مصنف اس میں باقرار خود امام صاحب کی

تقلید پر مجبور ہوئے اور خود ہی اس نے اپنی سعی کو ملیامیٹ کر ڈالا۔ اور قول امام صاحب کی تصریح ابھی گزری کہ تسمیہ صرف سورۃ فاتحہ سے قبل پڑھا جائے اور پوشیدہ پڑھا جائے اور اسی رکعت میں بعد فاتحہ نہ پڑھا جائے۔

اس کے بعد کہا: اور مسائل قراۃ میں ائمہ اور روایان قرآن حکیم کے ہیں۔

اقول: یہ توضیح ہے کہ مسئلہ قراءۃ میں ائمہ قرأت میں سے اپنے اپنے امام کے قول پر عمل کیا جائے گا۔ تو یہ جملہ ہی لغو قرار پایا۔

اس کے بعد کہا: اور علم قرأت میں امام صاحب بھی راویان قرآن کے مقلد تھے۔ نیز علم قرآن میں شاگرد امام عاصم کے ہیں۔

اقول: امام اعظم صاحب سے ان مشہور راویان قرآن کے موافق قرآتیں اور دیگر راویوں کی ہر طرح قرائتیں ثابت و مروی ہیں اور حضرت امام عاصم کی قراءۃ کے متعلق حضرت امام اعظم کا یہ قول علامہ ابن حجر مکی نے مناقب امام اعظم میں نقل کیا ہے۔ قرأۃ عاصم قرأۃ مستقیمہ۔ لیکن آپ کی ان میں سے کسی امام خاص کی تقلید کرنا کسی معتبر کتاب میں نظر سے نہیں گزرا۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت امام اعظم صاحب حضرت امام عاصم کے شاگرد ہیں لیکن امام کردری صاحب فتاوی بزازیہ نے مناقب میں حضرت امام عاصم کو حضرت امام کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ (دیکھو مناقب امام ج۲ ص۲۲۱)

اس کے بعد کہا: اور یہ بات کہیں ثابت نہیں ہوئی کہ امام صاحب نے قرآن کریم میں اجتہاد فرمایا ہے کیونکہ سمعیات میں تو اجتہاد کی گنجائش ہی نہیں۔

اقول: جس واقعہ میں نص موجود ہو اس میں اجتہاد و قیاس کیا ہی نہیں جاتا کہ اجتہاد و قیاس کی حاجت وہاں ہوتی ہے جہاں نص وارد نہ ہو۔ باقی رہا آیات میں اجتہاد کرنا تو استدلال بہ عبارت النص۔ اشارۃ النص۔ واقتضاء النص کیا ہیں۔ فعل مجتہد ہی تو ہے۔ تو یہ کہنا کہ سمعیات میں اجتہاد کی گنجائش ہی نہیں جہالت نہیں ہے تو اور کیا ہے۔

اس کے بعد کہا: اگر اجتہاد کی کہیں گنجائش ہے تو جہاں سے مبسملین کیلئے تسمیہ کی ممانعت مستنبط ہو بتائیں ورنہ احتمال اجتہاد اس مسئلہ میں محض بے سود جو بڑ برائی نہیں ہوسکتا۔

اقول: یہ اوپر تفصیل سے گذر چکا کہ نماز میں تسمیہ کا ہر رکعت میں پڑھنا ایک بار پڑھنا یا چند بار پڑھنا اور بالجہر پڑھنا یا بالسر پڑھنا فقہی مسائل ہیں جو یقیناً اجتہاد سے مستنبط ہیں تو اس میں احتمال اجتہاد

کیسا۔اور جب مسائل اجتہادیہ سے ہیں تو اس میں مقلد کو دلیل دریافت کرنے کا کب استحقاق حاصل
ہوسکتا ہے۔تو قول امام کے معلوم ہو جانے کے بعد محل استدلال کے دریافت کرنے کا کیا حق ہے۔علاوہ
بریں ہم نے اوپر کافی دلائل جمع کر دیے ہیں۔

اس کے بعد کہا: پس جو کچھ لوگ بسم اللہ بالجہر تراویح میں پڑھنے کی بات مبسملین کیلئے نزاع کر
تے ہیں وہ قراۃ سبعہ کی حقیقت سے واقفیت نہیں رکھتے۔

اقول: احناف نماز میں تسمیہ بالجہر کو مکروہ کہتے ہیں۔اب چاہے کہ وہ نماز فرض ہو یا تراویح یا نفل
۔اور جب وہ مکروہ کہتے ہین تو مبسملین بالجہر سے نزاع ہی متحقق ہوگیا۔علاوہ بریں نماز میں تسمیہ بالجہر کو
قرأت سبعہ کی حقیقت سے کیا علاقہ کہ یہ فقہی مسئلہ ہے۔اس کا مسئلہ قرأۃ سے کب مقابلہ۔پھر جب
ان فقہاء حنفیہ کو قرأت سبعہ کی حقیقیت سے ناواقفیت نہ ہوگی۔تو اس صاحب فوائد مکیہ کو کہاں سے واقفیت
حاصل ہوسکتی ہے۔یہ نادار خود تو قرأت سبعہ کی حقیقت سے ناواقف واقف کاروں کو کس طرح دلیری
سے ناواقف کہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ خود ہی اس کے ناواقف و جاہل ہونے کی بین دلیل ہے۔

پھر حاصل سوال یہ ہے۔لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ تراویح میں ہر سورۃ پر بسم اللہ پڑھنی چا
ہئے یا ایک سورۃ پر۔نیز بالجہر یا بالسر اور سورہ فاتحہ و دیگر سور پر بھی بالجہر یا بالسر پڑھے یا نہیں؟ اور کیا احکا
م و دلائل ہیں؟۔بحوالہ کتب جواب مرحمت فرمائیں۔

اقول: یہ تو ظاہر ہے کہ تراویح بھی نماز ہی ہے اور اس کے شرائط اور احکام بھی وہی ہیں جو فرائض
کے ہیں۔تو اس تراویح میں بھی ہر سورۃ پر بسم اللہ نہ پڑھے بلکہ ہر رکعت میں وہی سورۃ فاتحہ سے پہلے بسم
اللہ پڑھ لے اور تسمیہ بالجہر نہ پڑھے بلکہ بالسر ہی پڑھے۔عبارت کتب فقہ اور دلائل شرعیہ مقدمات میں
ان کے بعد سلسلہ میں کافی منقول ہو چکے ہیں۔اس سلسلہ میں مسئلہ مجوثہ پر کافی روشنی ڈالی گئی۔طالب
تحقیق کیلئے مسئلہ کا ایسا حاصل موجود ہے کہ جس کے بعد مزید بحث کی حاجت باقی نہیں رہتی اور منکر
و معاندین کیلئے دفتر کے دفتر ناکافی ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

جواب سوال دوم: ۔ض۔ظ۔دال ان میں ہر ایک کا مخرج علٰیحدہ وجداگانہ ہے۔تو ان
میں پہلا فرق امتیاز من حیث المخرج ہوا جو ہر ایک کے امتیاز صوت طبعی کو مستلزم ہے۔دوسرا فرق من حیث
الصفات ہے۔تو ض اور دال میں تو پانچ صفات کا فرق ہے یعنی ض۔رخوہ۔مستعلیہ۔مطبقہ۔مستطیلہ

غیر قلقلہ ہے۔اور دال ان کی اضداد شدیدہ۔مستفلہ۔مفتحہ۔قصیرہ۔قلقلہ ہے۔اور ض و ظ مین چار صفا
ت میں شرکت ہے۔وہ رخوہ۔مستعلیہ۔مطبقہ۔مصمتہ ہیں۔اور ایک صفت استطالت کی بنا پر ض، ظ
سے ممتاز وجدا ہے۔تو ض کو ان ہر دو دال، اور ظا سے من حیث المخرج اور من حیث الصفات ہر طرح کا امتیا
ز اور فرق حاصل ہوا۔ لہٰذا ان حروف میں تباین ذاتی بھی ہوا اور تغایر صفاتی بھی ہوا۔اور جب ان میں تبا
ین ذاتی و صفاتی دونوں ہیں تو یہ ان کے درمیان افتراق فی الصوت کو یقیناً مستلزم ہے کہ مشابہت فی الصو
ت یا تو اتحاد مخرج کی بنا پر ہوتا ہے جیسے۔ط۔ت۔میں۔یا تقارب فی المخرج کی بنا پر۔جیسے ظ۔ز۔میں
۔یا مشارکت فی الصفات کی بنا پر جیسے۔س۔ث۔میں۔اور ض و ظ۔ میں نہ تو اتحاد مخرج ہی ہے نہ تقا
رب مخارج نہ مشارکت فی الصفات۔تو ان میں مشابہت تامہ فی الصوت کہاں سے آئیگی۔

لہٰذا ان کے درمیان مشابہت تامہ کے تو اسباب ہی نہیں پائے گئے۔اب رہی مشابہت ناقصہ تو
وہ اگر ض۔ظ۔سے مشارکت فی بعض الصفات ہونے کی بنا پر ہے تو ض کو دال سے باعتبار مخرج ظا سے
زیادہ قرب اور مشارکت فی بعض الصفات کی بنا پر بھی ہے کہ ج اور دال مجہورہ، مصمتہ ہونے میں شریک
ہیں تو جس طرح ض۔کو ظ۔سے مشابہت ناقصہ ہے اسی طرح ض۔کو د۔سے بھی مشابہت ناقصہ ہے۔
اسی بنا پر قاضی خاں کی یہ عبارت ہے:

لو قرأ یلبسو ن ثیا با خضرا با لذا ل او با لدا ل تفسد صلا ته ـ

اسی میں ہے:

لو قرأ غیر المغظوب ب ظا او با لذال المعجمة تفسد صلا ته ولا الضا لین با
لظاء المعجمة والدا ل المهملة لا تفسد صلا ته و لو با لذا ل المعجمة تفسد ـ ولو قرأو
نخل طلعها هضیم قرأ با لظا ء او با لدا ل تفسد صلا ته ـ

(فتاویٰ قاضی خاں مطبوعہ مصطفائی ص۶۹۔۷۰)

ان عبارات سے ظاہر ہے کہ ض۔کی ظ یا دال سے تبدیل کا باعث وہی ان کی ض سے مشا
بہت ناقصہ ہی تو ہے تو ض۔کیلئے جیسے مشابہۃ ناقصہ ظ سے ہے ایسی ہی اس کو مشابہت ناقصہ دال سے
بھی ہے۔

اور جب ض۔کو اس کے مخرج سے مع جمیع صفات و شرائط کے ادا کیا جائیگا تو اس کی صوت طبعی
ان ہر دو، ظا اور دال کی آوازوں سے ممتاز اور جدا ہوگی۔ظ۔یا دال کی مشابہت ناقصہ سے ض کی اصل آوا

زمت نہیں جائے گی۔اور ض،عین،ظ۔یا عین دال نہیں بن جائے گا۔اور ض کا ان دونوں سے تباین ذا
اور تغایر فی بعض الصفات فنا ہو کر اتحادِ ذات ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتا۔مشتبہ الصوت حروف کی ادائیگی میں
جس طرح ہر سامع ان کے درمیان بین فرق و امتیاز کر لیتا ہے۔اسی طرح ض۔اور ظ۔اور دال میں امتیاز
فرق کا ہونا ضروری ہے۔جو شخص ض کو صحیح ادا کرنے پر قادر ہو اس کو صحیح ادا کرنا ضروری ہے۔عوام کی طرح
کسی حرف کا بدلنا ہرگز جائز نہیں۔اور جو ایسا کرے گا یقیناً محرف اور مغیر کہلائے گا۔

شرح جزری میں ہے: فلو ابدل ضاد بظاء عامدا ابطلت صلاته علی الاصح۔

(شرح جزری ص ۴۳)

اور جب اس کی نماز ہی باطل ہے تو اس کی اقتدا کیسے صحیح ہو سکتی ہے۔اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے
کہ ض اور ظ میں فرق کرنا نہایت دشوار ہے تو کیا دشوار ہونیکی بنا پر ان کے ذاتی فرق کو میٹ دیا جائے گا
ہرگز نہیں۔بلکہ علامہ جزری اسے تمیز کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

جزریہ میں ہے:

و الضاد باستطالة و مخرج   میز من الظاء و کلها تجی

شرح جزری ہندی اس شعر کا ترجمہ و شرح اس طرح کرتے ہیں:

اور ضاد معجمہ کو ساتھ صفت استطالت کے اور ساتھ مخرج کے یعنی ضاد استطالت کی صفت میں اور
مخرج میں اکیلا ہے اس صفت اور اس مخرج کا کوئی حرف نہیں۔سو اس ضاد کو ہمیشہ تمیز یعنی فرق کرو اور جدا
کرو ظا معجمہ سے تاکہ مشابہ ظا کے نہ ہو جاوے۔   (شرح ہندی ص ۳۹)

اسی بنا پر علامہ علی قاری نے اس کی شرح میں فرمایا: ما کان تمیزہ عن الظاء مشکلا
بالنسبة الی غیرہ امر الناظم بتمیزہ عنه نطقا۔ (شرح جزری مصری ص ۳۸)

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ ان کے فرق کا دشوار ہونا ہی ان کے درمیان فرق اور تمیز کا سبب
بنا اور اس کے لئے خصوصیت سے حکم دیا گیا۔اور ض کو ظ کی مشابہت صوتی سے بچایا گیا۔

عبارت ''هما متشابهان فی الصوت و السمع'' ۔نہ اس کا کوئی حوالہ دیا نہ قائل کا نام بتا
۔تو اس پر کیا توجہ کی جائے۔مع ہذا اس مشابہت سے مراد مشابہت ناقصہ ہے نہ کہ مشابہت تامہ۔اور قول
امام غزالی کا یہ مطلب ہے کہ ان کے درمیان فرق کرنے میں اس کی سعی کی جائے۔اگر کسی مجبوری یا لغزش
لسانی سے فرق نہ ہو سکا تو اس کی صحت نماز کا حکم دیدیا جائے۔

عبارت تفسیر عزیزی کا جواب یہ ہے کہ شاہ صاحب لوگوں کی غلطی بیان فرما رہے ہیں کہ انہوں
نے ضاد اور ظا کو یکساں کر لیا ہے اور ان کے ذاتی فرق اور طبعی امتیاز صوت کو میٹ دیا ہے۔نہ یہ کہ شاہ صا
حب ان ہر دو کو یکساں پڑھنے کا حکم دے رہے ہیں اور ان کے شرعی و ذاتی فرق اور طبعی امتیاز صوت کو ملیا
میٹ کر رہے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب کی طرف سے ایسے خلاف شرع حکم کیسے نسبت کی جا سکتی ہے۔

عبارت قاضی خاں کا جواب یہ ہے کہ ضالین کو ظ یا ذال سے بدل کر پڑھنے میں تغیر نہیں ہوا اس
لئے نماز فاسد نہیں اور ضالین کو د سے پڑھنے میں تغیر معنی لازم آتا ہے اس بنا پر نماز فاسد ہو گئی۔یہ مطلب
ہرگز نہیں کہ ض کو ظ یا ذال تو پڑھ سکتے ہیں اور دال نہیں پڑھ سکتے۔ورنہ اس سے پہلا مسئلہ غلط ہو جائے گا
کہ اس میں غیر المغضوب میں ض کو ظ یا د ہر ایک سے بدلنے پر فساد نماز کا حکم دیا ہے۔بات وہی ہے کہ چو
نکہ اس میں ہر ایک کے بدلنے میں تغیر معنی ہوتا ہے تو فساد نماز کا حکم دیا گیا ہے اور ظا و دال کا ایک ہی حکم ہو
گیا۔بحمدہ تعالیٰ ہر دو سوالات کے مکمل جوابات دیدیے گئے۔مولیٰ تعالیٰ قبول حق کی توفیق دے۔واللہ تعا
لیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

۲۵ر ذی الحجہ ۱۳۷۴ھ

مسئلہ (۲۷۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین دامت برکاتہم النوری مسائل حسب ذیل
میں کہ

قرآن پاک میں ان آیتوں کو جو آیت پر ختم ہوئے یا وقف وغیرہ ہے کہ وہاں پر نہ ٹھہرنا ہے مگر
وہاں پر مد نہیں جیسے:ایاك نعبد وایاك نستعین۔من الجنة والناس۔لکم دینکم ولی دین۔
عذاب عظیم۔ان الله علی کل شئی قدیر۔للناس لعلهم یتفکرون۔وهو العزیز الحکیم۔
علی مثله کہ ان پر مد نہیں ہے۔مگر ان کو اس طرح پڑھنا کہ مد ہو جائے۔مثلا نستعین،حکیم،
عذاب عظیم۔علی کل شئ قدیر۔ وغیرہ وغیرہ کہ ان پر مد نہیں ہے اور یہاں پر آیت ختم ہے یا وقف
ہے کہ سانس توڑنا ہے،ٹھہرنا ہے،تو ختم آیت پر زیادہ کھینچنا کہ جہاں مد ہو جائے جس طریقہ سے اس
آیت میں جہاں پر مد ہوتا ہے تو اس کو زیادہ قریب پانچ الف کے برابر کھینچا جاتا ہے۔ایسے ہی یہ آیتیں

کہ مد نہیں ہے چونکہ ٹھہرنا ہے یا آیت ختم ہے یا وقف ہے ان کو تین چار الف کے برار کھینچنا کہ مد ہو جائے جائز ہے یا نہیں۔ اور اسی طرح پڑھنے میں کوئی حرج شرعی ہے یا نہیں۔ نیز اس کی کیا شناخت کیا پہچان ہے۔ کہ یہ تین یا پانچ الف کے برابر مقید پڑھنے پڑھانے کی کیا شناخت و پہچان ہے۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

ختم آیت جیسے ایاك نستعین ۔ عذاب عظیم۔ لعلھم یتفکرون۔ وغیرہ پر وقف میں مد کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ کہ یہ مد جائز ہے اس مد کو مد متصل و منفصل کی طرح لکھا نہیں جاتا۔ یہ مد دو الف یا تین الف کے برابر کھینچا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کو چار یا پانچ الف کی مقدار کھینچنا غلط ہے۔ الف دو زبر سے حاصل ہوتا ہے، جس کی مقدار انگلی کا اٹھانا یا لفظ الف کا کہنا ہے جس کو فن تجوید سے ذوق ہے دو یا تین یا چار الف کے کھینچنے کی مقدار کا صحیح اندازہ کر لیا کرتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۷۶)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسائل مندرجہ ذیل میں

زید کہتا ہے کہ نماز میں ولا الضالین وغیرہ موقعوں پر ضاد پڑھے اور ظا د نہ پڑھے، تو نماز باطل ہو جائے گی اور پڑھنے والا گمراہ ہے، لہذا از روئے شرع یہ بتایا جائے کہ زید کا یہ قول صحیح ہے، یا غلط اور زید کے بارے میں کیا حکم ہے؟۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

زید کا قول غلط و باطل ہے اور اپنی لاعلمی سے اس نے یہ مسئلہ بالکل الٹ دیا ہے۔ شرعی مسئلہ تو یہ ہے کہ جس نے عمداً ض کو ظ سے بدل دیا تو صحیح مذہب کی بنا پر اسکی نماز باطل ہو جائے گی۔

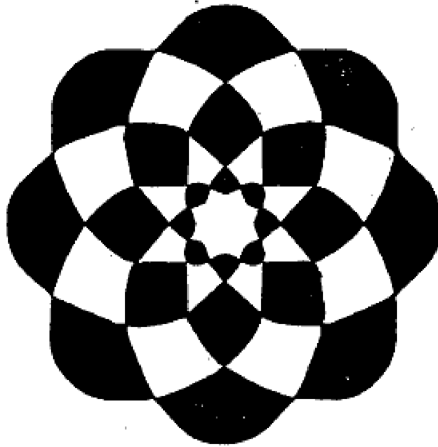
چنانچہ ملا علی قاری بحر سے ناقل ہے: لوابدل ضا دبظاء عمدابطلت صلوته علی الاصح لفساد المعنی۔ (منح فکریہ مصری ص ۴۳)

بلکہ اس کو عمدا بدلنے والا نہ فقط خاطی بلکہ کافر ہے۔ محیط میں ہے۔ سئل الامام الفضلی عمن

یقرأ الظاء المعجمة مکان الضاد المعجمة او علی العکس قال لا تجوز امامته ولو تعمد یکفر۔ (فقہ اکبر، ۱۵۳)

ان عبارات سے زید کے قول کا غلط و باطل ہونا ظاہر ہو گیا۔ نیز زید کا مخالف تصریحات فقہ و منکر حکم شرع ہونا بھی ثابت ہو گیا واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل



اجمل الکلام فی عدم القرأت خلف الامام

مسئلہ (۲۷۷)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

جس طرح الحمد پڑھنے والے لوگ امام کے پیچھے اپنے دلائل صریح وصاف حضرت علیہ کی احادیث کے الفاظ سناتے ہیں اور معتبر معتبر احادیث کی کتابوں کے حوالے مستند علماء یہاں سے دیتے ہیں جن سے یقین کامل ہوجاتا ہے کہ الحمد پڑھنا مقتدی کو ضرور چاہئے بلا پڑھے نماز درست نہ ہوگی مثلا یہ حدیث پیش کرتے ہیں قال رسو الله ﷺ لا صلوۃ لمن لم یقراء بفاته الکتاب خلف الامام رواہ البیہقی کتاب القرأۃ ص ۷۴ وقال هذا اسناد صیح (ترجمہ) یعنی فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ نہیں نماز ہوتی اس شخص کی جس نے امام کے پیچھے سورہ الحمد نہیں پڑھی روات یا اس حدیث کو امام بیہقی نے کتاب القرأت میں اور کہا سنا داس کی صحیح ہے لہذا مذہب حنفیہ میں جو متقدمین کو الحمد پڑھنے کی ممانعت ہے کس قاعدہ اور دلیل کی رو سے ہے امید ہے کہ جواب کافی ووافی ہونا چاہئے ورنہ ان لوگوں کے کہنے اور بتانے سے چند آدمی اس طرف متوجہ ہوئے جات ہیں۔ بینوا وتوجروا

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

ہندوستان میں امام کے الحمد پڑھنے والے بالعموم غیر مقلدین ہیں حضرات شافعیہ سے خطاب نہیں کہ وہ تو ایک امام کے مقلد ہیں بلکہ سارا خطاب غیر مقلدین ہی سے ہے ائمہ دین جن کے سینے میں علوم کے بحر مواج تھے انہوں نے کیسی کیسی عرق ریزیاں کیں اور محنتیں اٹھائیں تو اس مرتبہ کو پہنچے کہ آیت کریمہ اور احادیث شریفہ سے استنباط احکام کرسکیں غیر مقلدین کو آیات واحادیث سے استدلال کرنے کی کیا لیاقت ان بے خبردان زمانہ کو تو ہنوز غالب وداغ کی اردو سمجھنے کا سلیقہ بھی نہیں۔ یہ معدن علوم تک کیونکر رسائی کرسکتے ہیں قرأت خلف امام ہی کا مسئلہ لیجئے اس میں جس قدر احادیث وارد ہیں اور جو حکم قرآنی ہے سب پر نظر رکھ کر فیصلہ کرنا آج تک نہ کسی غیر مقلد کو میسر ہو نہ انشاء اللہ آئندہ اس کے مجبورا

وہ یہی کرتے ہیں کہ جو حدیث اس کے سامنے پیش کردی جائے اس کی ماننے ہی میں طرح طرح کے حیلے حوالے نکالیں خواہ وہ مسلم وبخاری ہی کی حدیث یوں نہ ہو اور اپنے آپ بیہقی کی روات لے آئیں اور اس کو معتبر مانیں مجھ یہاں بیہقی پر جرح مقصود نہیں ہے۔ بلکہ ان کی خود مطلبی اور نفسیانیت کا ایک نمونہ پیش کرتا ہے کہ جو شخص اپنے مطلب کے موافق سمجھ کر کسی حدیث کو بیہقی سے اخذ کرتا ہے اور بیہقی کی کتاب کو حدیث کی ایسی معتبر ومستند کتاب مانتا ہے کہ اگر اس کے مخالف کوئی حدیث کسی دوسری کتاب کی پیش کردی جائے تو اس میں کلام کرنے لگتا ہے یہ ہے غیر مقلدین کی نفسانیت العیاذ بالله من شرور الانفس۔ بیہقی ی یہی روایت جس سے سوال میں استنباط کیا غیر مقلدین جو روایت میں مفہوم مخالف کے قائل ہیں وہ اس کو کیا سمجھ کر پیش کرسکتے ہیں فصحاء کے کلام میں زیادت افادیت سے خالی نہیں ہوتی تو حضور اکرم ﷺ نے فصحاء کو کیا نسبت اب غیر مقلد بتائے کہ جس حدیث کو اپنے مدعی کے لے دلیل صاف وصریح بتا کر پیش کرتا ہے اس میں یا اتنے ہی الفاظ اس مطلب کے لئے کافی نہ تھے لا صلوۃ لمن یقراء بفاته الکتاب کیا اس سے مستدل کے نزدیک فرضیت قرأت فاتحہ مستفاد نہ ہوتی تھی اور نہیں ہوتی تھی تو کیا لفظ خلف امام افادہ فرضیت کرتا ہے شائد یہ کوئی مسلوب الحواس کہے تو کہے کوئی عقل وہوش رکھنے والا نہ کہہ سکے گا اور اگر کہیں کہ لا صلوۃ لمن یقراء بفاته الکتاب سے ہی فرضیت ثابت ہوگئی تو سوال یہ ہے کہ لفظ خلف الامام کس فائدہ کے لئے آیا آیا مطلب ہے کہ امام کے پیچھے پڑھنے والے کی نماز تو بغیر فاتحہ پڑھے نہ ہوگی مگر خود امام اور منفردوں کی نمازیں بغیر فاتحہ کے بھی ہوجاتی ہیں حدیث نقل کردینا تو اسان مگر ذرا اس سمجھ کو بھی دیکھا یا یہ بات ہے کہ حدیث سمجھے یا نہ سمجھے لکن مسائل دین میں داخل کردینا اور ائمہ کی مخالفت کرنا روا ہوگیا پھر یہ بھی بتاؤ کہ لاصلوۃ لمن لم یقراء عبقا بفاتحه الکتاب کا مطلب کیا ہے آیا یہ کہ جس نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھی صرف وہی نماز ناجاز ہے جب تو بتاؤ کہ ایسا ہے اور اس چیز کی نفی کرتا ہے اور دلیل خصوص ہی یہ مطلب ہے کہ جس نے کبھی امام کے پیچھے فاتحہ ترک اسی عمر کی کوئی نماز ہی صحیح نہ رہی سب باطل ہوگئیں عمل ہی حبط ہوگئے اگر یہ کہو تو یا تم سے پہلے دنیا میں اور کوئی بھی اس کا قائل ہوا ہے اور پھر جن صحابہ نے امام کے پیچھے قرأۃ نہیں کی ان کی عمر بھر کی نمازیں یا ہوئیں اور پچھلی نمازیں جو تمام شرائط وادب کے ساتھ ادا کی گئیں تھیں ان کی صحت پہلی پر موقوف تھی یا ترک فاتحہ خلف الامام کفر موجب حبط عمل ہے ہر بات دلیل معتبر سے کہو یہ اور بتادو کہ لاصلوۃ میں نفی حقیقت کی ہے یا صفت کی صحت کی ہے یا فضیلت کی بر تقدیر اول ثبوت فرضیت خبر واد محتمل المراد سے لازم فالازم باطل

فالمزلوم ثلثہ اور یہی غیر مقلدین کا مذہب ہے جیسا کہ الفاظ مندرجہ استفتاء سے ظاہر ہے اور الحمد پڑھنا مقتدی کو ضرور چاہے بلا پڑھے نماز درست نہ ہوگی۔

برتقدیر ثانی فرضیت خلف الامام کس کے گھر سے آئیگی۔ پھر یہ بھی بتاؤ کہ فرضیت قرأۃ خلف الامام میں یہ حدیث مطلق ہے یا مقید خاص ہے یا عام۔ اگر خاص یا مقید ہے تو دلیل تقیید و تخصیص کیا ہے؟۔ نیز یہ کہ اس حدیث کی صحت محض بیہقی کی تصحیح سے بطور تقلید شخصی کافی ہے یا اس کی تحقیق کا اور کوئی ذریعہ ہے اور اگر ہے تو یا دریافت کرنے کی باتیں تو اور بھی بہت ہیں مگر ائمہ دین کی تقلید سے بھاگنے والوں کی قلعی انھیں دو چار باتوں میں کھل جائیگی اور پتہ چل جائیگا کہ کلام رسوال اللہ ﷺ کے سمجھنے کے لئے ائمہ دین کی تقلید ضروری ہے۔ ورنہ حدیث جس کو غیر مقلد صریح کہتا ہے۔ عمر بھر کی غریبی میں بھی نہیں سمجھا جاسکے گا جب تک کہ ائمہ دین کی تقلید نہ کرے یا مقلدین سے دریوزہ گری نہ کرے۔ ان سب سے گذر کر میں یہ کہتا ہوں کہ جب کہ قرآن پاک میں رب العزت تبارک وتعالی نے فرمایا: فاذا قرء القرآن فا ستمعو اله وانصتوا یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو سنو اور ساکت رہو۔

یہ آیت خاص اسی مسئلہ قرأت خلف الامام میں نازل ہوئی، تو اس کا عموم ہی حجت ہے۔ ایسی صاف وصریح آیت کو غیر مقلدین کیا حدیث سے منسوخ کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تمہارے نزدیک آیت حدیث سے منسوخ ہوسکتی ہے۔ اور حدیث بھی خبر واحد اور وہ بھی ایسی جس کا مطلب غیر مقلدین کو سمجھنا دشوار۔ اب سنئے کہ اس آیت سے قرأت کہ وقت سکوت کا وجوب صاف طور پر ثابت ہو رہا ہے۔ پہلے تو میں آپ کو اسی بیہقی سے سنواؤں کہ یہ آیت کس معاملہ میں نازل ہوئی۔

امام بیہقی امام احمد سے نقل کرتے ہیں۔ قال اجمع الناس على ان هذه الآية فى الصلوة ۔ یعنی امام احمد نے فرمایا کہ لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ آیت نماز کے باب مین نازل ہوئی۔ پھر انہیں بیہقی کی روایت سنو:

عن مجاهد قال كان عليه الصلوة والسلام يقرأ في الصلوة فسمع قرأة فتى فنزل فاذا قرئ القرآن فا ستمعو اله وانصتوا ۔

یعنی مجاہد سے مروی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نماز میں قرأت فرماتے تھے تو ایک جوان انصاری کا پڑھا سنا تو یہ آیت نازل ہوئی، فاذاقری القرآن (الآیۃ)

ملاحظہ ہو کہ قرآن پاک کی آیت قرأت خلف الامام کے روکنے کیلئے نازل ہو رہی ہے۔

ابن مردویہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

عن معاوية بن قوت قالت سالت بعض اشيا خنامن اصحاب رسول ﷺ احسبه قال عبد الله بن مغفل اكل من سمع القرآن وجب عليه الاستماع والانصات قال انما نزلت هذه الآية و اذا قرى القرآن فاستمعوا وانصتوا فى القراة خلف الامام ۔

یعنی معاویہ ابن قرہ نے کہا میں نے اصحاب رسول اللہ ﷺ میں سے اپنے بعض بزرگوں سے دریافت کیا، راوی کہتا ہے مجھے خیال ہے کہ معاویہ نے عبداللہ بن مغفل کا نام لیا، ان سے دریافت کیا کہ ہر کوئی جو قرآن سنے اسپر سننا اور خاموش رہنا واجب ہے۔ فرمایا یہ آیت نازل ہی ہوئی ہے قرآت خلف الامام میں۔

امام ابوالبرکات عبداللہ بن محمود نسفی اپنی تفسیر مدارک التنزیل میں فرماتے ہیں:

جمهور الصحابه رضى الله عنه عنهم على انه فى استماع الموتم ۔

یعنی جمہور صحابہ کرام اس پر ہیں کہ یہ آیت مقتدی کے قرأت سننے اور خاموش رہنے کے باب میں نازل ہوئی۔

ابن مردویہ اور بیہقی نے روایت کیا ہے:

عن ابن عباس صلى النبى ﷺ فقراء خلفه قوم فخلطوا عليه فنزلت هذه الاية۔

یعنی ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضور انور ﷺ نے نماز پڑھائی قوم نے آپ کے پیچھے قرات کی اس سے آپ پر قرات میں خلط واقع ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

عبداللہ بن حمید اور ابوراسخ اور بیہقی ابوالعالیہ سے روایت کرتے ہیں۔ ان النبى ﷺ كان اذا صلى باصحابه قرأ فقرأمن اصحابه فنزلت۔

یعنی جب حضور انور ﷺ نے اپنے اصحاب کو نماز پڑھائی اور قرات کی تو آپ کے اصحاب نے بھی قرات کی اسپر یہ آیت نازل ہوئی۔

الحمدللہ عاقل منصف کیلئے مسئلہ تو فیصل ہوگیا کہ جب قرات خلف الامام کی ممانعت میں آیت نازل ہوئی اور آیت نے مقتدی پر خاموش رہنا واجب کیا اور اس پر جمہور صحابہ نے اجماع کیا تو اب مقتدی کیلئے قرأت ثابت کرنے کی ہر کوشش بیکار ہے کہ حدیث خبر واحد حکم قرآنی کو ہرگز ہرگز منسوخ نہیں کرسکتی، مقتدی کا امام کے پیچھے خاموش رہنا آیت کریمہ سے ثابت ہوگیا تو اس سے بڑھ کر اور کونسی دلیل

ہوگی جس سے غیر مقلدین کی تسکین ہو سکے۔ ضرورت تو نہیں ہے کہ مسئلہ میں طول کیا جائے مگر غیر مقلدین کے لئے احادیث سے بھی چند صاف وصریح تائیدات پیش کردیجائیں مولیٰ تعالیٰ انکو ہدایت فرمائے۔

چھ احادیث تو آیت کے ذیل میں مذکور ہوئیں اب مزید اور سنئے۔

حدیث (۷) مسلم شریف میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: صلی بنا رسول اللہ ﷺ صلوۃ الظہر او العصر فقال ایکم قرأخلفی بسبح اسم ربك الاعلیٰ فقال رجل: انا ولم اردبها الاالخیر، قال: قد علمت ان بعضکم خالجنیها۔

(مسلم شریف مع شرح مطبوعہ مجتبائی دہلی باب نہی الماموم عن جہرہ بالقراۃ خلف امامہ صفحہ ۱۷۲/۲ ۔ ج ۱/)

یعنی ہم کو نبی ﷺ نے ظہر یا عصر کی نماز پڑھائی، فرمایا تم میں سے کسی نے میرے پیچھے سبح اسم ربك الاعلی پڑھا، ایک شخص نے عرض کیا: میں نے، اور میں نے سوائے خیر کے اور کچھ ارادہ نہیں کیا۔ فرمایا بیشک میں نے جانا کہ تمہارے بعض لوگ مجھ سے اس میں جھگڑا کرتے ہیں یعنی تم امام کے پیچھے قرأت نہ کرو۔

حدیث (۸) اسی مسلم شریف میں ایک طویل حدیث میں یہ الفاظ ہیں: واذا قرأفانصتوا،

(مسلم شریف، باب التشہد فی الصلوۃ ص ۱۷۴ ج ۱)

یعنی حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

حدیث (۹) ترمذی شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ان رسول اللہ ﷺ انصرف من صلوۃ جہر فیہا بالقرأۃ فقال ہل قرأ معی احد منکم انفا ؟ فقال رجل: نعم یارسول اللہ! قال: انی اقول مالی انازع القرآن قال فانتہی الناس عن القرأۃ مع رسول اللہ ﷺ فیما یجہر فیہ رسول اللہ ﷺ من الصلوات بالقرأۃ حین سمعوا ذلك من رسول اللہ ﷺ۔ (ترمذی شریف مطبوعہ مجیدی کانپور باب ماجاء فی ترک القرأۃ خلف الامام ص ۵۰ ج ۱)

یعنی رسول اللہ ﷺ اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں قرأت بالجہر پڑھی، فرمایا: کیا میرے ساتھ تم میں سے کسی نے ابھی قرأت کی؟ ایک شخص نے عرض کی ہاں یارسول اللہ! فرمایا میں کہتا ہوں مجھے کیا ہوا کہ مجھ سے قرآن میں جھگڑا کیا جاتا ہے، راوی نے کہا کہ لوگ حضور کے ساتھ قرأت کرنے سے

ان نمازوں میں باز رہے جن میں حضور جہر کے ساتھ قرأت فرماتے تھے جب سے یہ بات انہوں نے حضور اقدس ﷺ سے سنی۔

حدیث (۱۰) اسی ترمذی شریف میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: من صلی رکعة لم یقرأ فیہا بام القرآن فلم یصل الا ان یکون وراء الامام۔

(ترمذی شریف ص ۵۰ ج ۱)

یعنی جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی تو اس نے نماز ہی نہیں پڑھی مگر جب امام کے پیچھے ہو۔ کہ اس میں سورۃ نہیں پڑھی جاتی۔

حدیث (۱۱) ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا واذا قرأفانصتوا۔

(ابوداؤد شریف ج ۱ مطبوعہ مجتبائی دہلی، باب الامام یصلی من قعود ص ۹۶)

یعنی امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، تو جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

حدیث (۱۲) اسی ابوداؤد شریف میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ان رسول اللہ ﷺ خطبنا فعلمنا وبین لنا سنتنا وعلمنا صلوتنا فقال اذا صلیتم فاقیموا صفوفکم ثم لیؤمکم احدکم فاذا کبر فکبروا واذا قرأفانصتوا۔

(ابوداؤد شریف ج ۱ ص ۱۴۶ باب التشہد مطبوعہ مذکور)

یعنی نبی کریم ﷺ نے خطبہ پڑھا تو ہمیں سکھایا اور سنت کا بیان کیا اور ہمیں نماز کا طریقہ تعلیم کیا اور فرمایا: جب تم نماز پڑھو تو اپنی صفوں کو سیدھا کرو، پھر تم میں سے ایک امامت کرے، پس جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

حدیث (۱۳) ابوداؤد شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ان رسول اللہ ﷺ انصرف من صلوۃ جہر فیہا بالقرأۃ فقال ہل قرأ معی احد منکم انفا فقال رجل: نعم یا رسول اللہ ﷺ، قال انی اقول مالی انازع القرآن، قال فانتہی الناس عن القرأۃ مع رسول اللہ ﷺ فیما فیہ یجہر النبی ﷺ بالقرأۃ من الصلوات حین سمعوا ذلك من رسول اللہ ﷺ۔ (ابوداؤد شریف ج ۱ باب من کرہ القرأۃ بفاتحۃ الکتاب اذا جہر الامام ص ۱۷۷)

یعنی حضور اقدس ﷺ اس نماز میں جس میں قرأت بالجہر پڑھی جاتی ہے، فراغت کی تو فرمایا: کیا ابھی تم میں سے کسی نے میرے ساتھ قرأت کی؟ ایک شخص نے عرض کیا: ہاں یارسول اللہ ﷺ، حضور نے فرمایا: میں کہتا ہوں مجھے کیا ہو کہ میں قرأت میں منازعت کیا جاؤں، راوی نے کہا کہ لوگ حضور ﷺ کے ساتھ قرأت کرنے سے ان نمازوں میں باز رہے جن میں حضور ﷺ بالجہر قرأت کرتے تھے جب سے انہوں نے حضور ﷺ سے یہ سنا۔

حدیث (۱۴) اسی ابوداؤد شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بطریق دیگر مروی: یقول صلی بنا رسول اللہ ﷺ صلوۃ نظن انها الصبح بمعناه الی قوله مالی انازع القرآن ۔

(ابوداؤد شریف ج ۱ ص مذکور)

یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی ہمیں خیال ہے کہ وہ صبح کی نماز تھی، اور پھر اوپر کی حدیث کا پورا مضمون یہاں تک بیان کیا کہ مجھے کیا ہو کہ میں قرآن میں منازعت کیا جاؤں۔

حدیث (۱۵) اسی ابوداؤد شریف میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ان النبی ﷺ صلی الظهر فجاء رجل یقرأ خلفه بسبح اسم ربك الاعلیٰ فلما فرغ قال ایكم قرأ؟ قالوا: رجل، قال: قد عرفت ان بعضكم خالجنيها۔

(ابوداؤد شریف ج ۱ باب من رأی القرأۃ اذا لم یجهر)

یعنی حضور نبی کریم ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی، ایک شخص آیا اور اس نے آپ کے پیچھے "سبح اسم ربک الاعلیٰ" پڑھا، حضور ﷺ جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: تم میں سے کس نے قرأت کی؟ لوگوں نے عرض کیا: ایک شخص نے، فرمایا میں نے جانا کہ تم میں سے بعض نے مجھ سے قرأت میں منازعت کی۔

حدیث (۱۶) اسی ابوداؤد شریف میں انہیں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بطریق دیگر بالفاظ آخر مروی ہے: ان النبی ﷺ صلی بهم الظهر فلما انفتل قال: ایكم قرأ بسبح اسم ربك الاعلیٰ فقال: رجل انا یا رسول اللہ! فقال علمت ان بعضكم خالجنيها۔

(ابوداؤد شریف باب مذکور)

یعنی حضور نبی کریم ﷺ نے لوگوں کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی، تو جب حضور نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: تم میں سے کس نے سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھا؟ ایک شخص نے عرض کی میں نے، فرمایا: میں

نے جانا تم میں سے بعض نے مجھ سے قرأت میں منازعت کی۔

حدیث (۱۷) ابن ماجہ شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: قال رسول اللہ ﷺ: انما جعل الامام لیؤتم به فاذا كبر فكبروا واذا قرأ فانصتوا، واذا قال غير المغضوب عليهم ولا الضالين فقولوا آمين الحديث۔

(ابن ماجہ ج ۱ مطبوعہ نظامی دہلی ص ۶۱ باب اذا قرأ الامام فانصتوا)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، تو جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب امام غير المغضوب عليهم ولا الضالين کہے تو تم آمین کہو۔

حدیث (۱۸) ابن ماجہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: قال رسول اللہ ﷺ اذا قرأ الامام فانصتوا فاذا عند القعدة فليكن اول ذكر احدكم التشهد۔

(ابن ماجہ ص مذکور)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب وہ قعدہ میں پہونچے تو تمہارا پہلا ذکر تشہد ہے۔

حدیث (۱۹) اسی ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: صلی النبی ﷺ باصحابه صلوة اظن انها الصبح فقال هل قرأ منكم من احد؟ قال رجل: انا، قال انی اقول مالی انازع القرآن ۔ (ابن ماجہ ص مذکور)

یعنی نبی ﷺ نے اپنے اصحاب کو نماز پڑھائی، میں گمان کرتا ہوں کہ وہ صبح کی نماز تھی، فرمایا: کیا تم میں سے کسی نے قرأت کی؟ ایک شخص نے عرض کی: میں نے، فرمایا: میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہو کہ میں قرآن میں منازعت کیا جاؤں۔

حدیث (۲۰) اسی ابن ماجہ میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: قال رسول اللہ ﷺ: من كان له امام فقرأة الامام له قرأة ۔ (ابن ماجہ ص مذکور)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کا امام ہو تو امام کا قرأت کرنا اس کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۲۱) نسائی شریف میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: صلی النبی ﷺ الظهر فقرأ رجل خلفه سبح اسم ربك الاعلیٰ، قال رجل: انا، قال قد علمت ان

بعضکم قد خالجنیھا ۔

(نسائی ج ا مطبوعہ انصاری دہلی ص ۹۳ باب ترک القرأۃ خلف الامام فیما لم یجھر فیہ)

یعنی نبی کریم ﷺ نے نماز ظہر پڑھائی تو حضور کے پیچھے ایک شخص نے سبح اسم ربک الاعلی پڑھا حضور نے بعد نماز فرمایا: کس نے سبح اسم ربک الاعلی پڑھا؟ ایک شخص نے عرض کیا: میں نے، فرمایا: میں نے جانا کہ تمہارے بعض نے مجھ سے قرأت میں منازعت کی ۔

حدیث (۲۲) اسی نسائی شریف میں انہیں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بطریق دیگر و بالفاظ آخر مروی ہے، ان النبی ﷺ صلی صلوۃ الظھر او العصر ورجل یقرأ خلفہ فلما انصرف قال ایکم قرأ سبح اسم ربک الاعلیٰ ؟ قال رجل من القوم انا، ولم ارد بھا الا الخیر فقال النبی ﷺ قد عرفت ان بعضکم قد خالجنیھا ۔

(نسائی شریف ص و باب مذکور)

یعنی حضور نبی کریم ﷺ نے نماز ظہر یا نماز عصر پڑھائی اور حضور ﷺ کے پیچھے ایک شخص نے قرأت کی، تو جب حضور ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: تم میں سے کس نے سبح اسم ربک الاعلی پڑھا؟ قوم میں سے ایک شخص نے کہا: میں نے، اور میں نے سوائے بھلائی کے اور کچھ ارادہ نہیں کیا، حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں نے جانا کہ تمہارے بعض نے مجھ سے قرأت میں منازعت کی ۔

حدیث (۲۳) اسی نسائی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ان رسول اللہ ﷺ انصرف من صلوۃ جھر فیھا بالقرأۃ فقال ھل قرأ معی احد منکم انفا فقال رجل نعم یا رسول اللہ! قال انی اقول مالی انازع القرآن ،

(نسائی ص مذکور)

یعنی رسول اللہ ﷺ اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں جہری قرأت پڑھی جاتی ہے، فرمایا: کیا تم میں سے کسی نے میرے ساتھ ابھی قرأت کی؟ ایک شخص نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ میں نے، فرمایا: میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہوا کہ میں قرآن میں منازعت کیا جاؤں ۔

حدیث (۲۴) اسی نسائی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: قال رسول اللہ ﷺ: انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا واذا قال سمع اللہ لمن حمدہ فقولوا اللھم ربنا لک الحمد ۔

(نسائی شریف ص مذکور باب تاویل قولہ عز وجل واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، پس جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللھم ربنا لک الحمد کہو۔

حدیث (۲۵) اسی نسائی شریف میں انہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بالفاظ دیگر مروی ہے: قال رسول ﷺ انما الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبر و او اذا قرا فانصتوا ۔

(نسائی صفحہ و باب مذکور)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ امام اس لئے ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے۔ پس جب امام تکبیر کہے۔ تو تم بھی تکبیر کہو۔ اور جب امام قرات کرے تو تم خاموش رہو۔

حدیث (۲۶) اسی نسائی میں حضرت ابو داؤد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ وہ کہتے ہیں ۔سئل رسول اللہ ﷺ فی کل صلوۃ قرأۃ قال: نعم، قال رجل من الانصار وجبت ھذہ فالتفت الی و کنت اقرب القوم منہ فقال ما اری الامام اذا ام القوم الا وقد کفا ھم ۔

(نسائی شریف صفحہ مذکور باب اکتفاء الماموم بقراۃ الامام)

یعنی رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا۔ کیا ہر نماز میں قرات ہے۔ فرمایا: ہاں۔ انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا۔ کہ یہ قراۃ واجب ہوئی۔ تو میری طرف توجہ فرمائی اور میں قوم میں حضور سے زیادہ نزدیک تھا۔ فرمایا میں یہی جانتا ہوں۔ کہ جب امام قوم کی امامت کرتا ہے۔ تو ان کے لئے وہی کافی ہے۔

حدیث (۲۷) موطا امام مالک میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ من صلی رکعۃ لم یقرا فیھا بام القران فلم یصل الا وراء الامام ۔

(موطا امام مالک مطبوعہ نظامی دہلی صفحہ ۲۱ باب ماجاء فی ام القرآن)

یعنی جس نے ایک رکعت نماز پڑھی۔ اور اس میں سورہ فاتحہ نہیں پڑھی۔ تو اس نے نماز ہی نہیں پڑھی مگر امام کے پیچھے۔

حدیث (۲۸) اسی موطا امام مالک میں ہے۔ ان عبداللہ بن عمر کان اذا سئل ھل یقرا

احد خلف الامام قال اذا صلی احدکم خلف الامام فحسبہ قراۃ الامام واذا صلی وحد فلیقرا قال کان عبداللہ بن عمر لا یقرا خلاف الامام۔

(موطا امام مالک باب ترک القراۃ خلف الامام فیما یجہر فیہ صفحہ ۲۲)

یعنی حضرت عبداللہ بن عمر سے جب سوال کیا جاتا کہ کیا کوئی شخص امام کے پیچھے قرات کرے فرماتے جب تمہارا کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے۔ تو اسے امام کا قرات کرنا کافی ہے اور جب تنہا نماز پڑھے تو قرات کرے۔ راوی نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن عمر امام کے پیچھے قرات نہیں کرتے تھے۔

حدیث (۲۹) اسی موطا امام مالک میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے ان رسول اللہ ﷺ انصرف من صلوۃ جھر فیھا بالقرأۃ فقال ھل قراء معی منکم احد آنفا فقال رجل نعم انا یا رسول اللہ فقال رسول اللہ ﷺ انی اقول مالی انازع القرآن فانتھی الناس عن القرأۃ حین سمعوا ذلک من رسول اللہ ﷺ۔

(موطا امام مالک باب وصفحہ مذکور)

یعنی رسول اللہ ﷺ اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں قرات بالجہر پڑھی جاتی تھی۔ فرمایا کیا تم میں کسی نے میرے ساتھ ابھی قرأت کی۔ ایک شخص نے عرض کیا: ہاں یارسول اللہ ﷺ! تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہو کہ میں قرآن میں منازعت کروں۔ راوی نے کہا کہ لوگ حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ قرأت کرنے سے ان نمازوں میں باز رہے جن میں حضور بالجہر قرأت کرتے جب سے انہوں نے یہ رسول اللہ ﷺ سے سنا۔

حدیث (۳۰) جامع مسانید امام اعظم میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے ان رسول اللہ ﷺ قال من کان لہ امام فقراۃ الامام لہ قراۃ۔

(جامع مسانید امام اعظم مطبوعہ مجلس دائرۃ المعارف حیدرآباد صفحہ ۳۳۱ جلد اول)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کا امام ہو تو امام کا قرات کرنا اس کا قرات کرنا ہے۔

یہ حدیث بکثرت طرق مروی ہے۔

حدیث (۳۱) اسی جامع مسانید اعظم میں انہیں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بالفاظ د مروی ہے۔ ان رجلا قرأ خلف النبی ﷺ فی الظھر او فی العصر و او می الیہ رجل منھا فلما انصرف قال: اتنھانی ان اقرا خلف رسول اللہ ﷺ فتذاکرا ذلک حتی سمع النبی ﷺ فقـ

رسول اللہ ﷺ: من صلی خلف الامام فقراۃ الامام لہ قراۃ۔

(جامع مسانید امام اعظم صفحہ نمبر ۳۳۴ ج اول)

یعنی ایک شخص نے نبی ﷺ کے پیچھے نماز ظہر یا عصر میں قرات کی اس کو ایک شخص نے اشارہ سے منع کیا۔ تو جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو کہنے لگا کیا تو مجھ کو رسول اللہ ﷺ کے پیچھے قرات کرنے سے منع کرتا ہے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نے ان دونوں کی یہ گفتگو سنی تو حضور نے فرمایا جس نے امام کے پیچھے نماز پڑھی تو امام کا قرأت کرنا اس کا قرأت کرنا ہے۔

یہ حدیث بھی بطرق کثیرہ مروی ہے۔

حدیث (۳۲) اسی جامع مسانید امام اعظم میں انہیں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بالفاظ دیگر مروی ہے: قال: صلی رسول اللہ ﷺ بالناس فقرأ رجل خلفہ فلما قضی الصلوۃ قال ایکم قرأ خلفی ثلاث مرات فقال رجل انا یا رسول اللہ! فقال من من صلی خلف الامام فان قرأۃ الامام لہ قرأۃ۔

(جامع مسانید امام اعظم ص ۳۳۷ ج ۱)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو نماز پڑھائی، ایک شخص نے آپ کے پیچھے قرأت کی، جب حضور ﷺ نے نماز پوری فرمائی تو فرمایا: تم میں میرے پیچھے کس نے قرأت کی؟ یہ تین مرتبہ فرمایا، تو ایک شخص نے عرض کی: یارسول اللہ میں نے قرأت کی، تو حضور ﷺ نے فرمایا: جو امام کے پیچھے نماز پڑھے تو بیشک امام کا قرأت کرنا اسی کا قرأت کرنا ہے۔

یہ بھی چند طرق سے مروی ہے۔

حدیث (۳۳) اسی جامع مسانید امام اعظم میں انہیں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بالفاظ دیگر مروی ہے: انصرف النبی ﷺ من صلاۃ الظھر والعصر فقال من قرأ منکم سبح اسم ربک الاعلی فسکت القوم حتی سأل عن ذلک مرارا فقال رجل من القوم انا یا رسول اللہ! فقال: رأیتک تنازعنی او تخالجنی القرآن۔

(جامع مسانید امام اعظم ص ۳۳۸ ج ۱)

یعنی حضور نبی کریم ﷺ نماز ظہر یا نماز عصر سے فارغ ہوئے تو فرمایا: تم میں سے کسی نے سبح اسم ربک الاعلی پڑھا، تو سب لوگ ساکت رہے یہانتک کہ حضور ﷺ نے یہ بار بار دریافت فرمایا، تو قوم میں سے ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے پڑھا، حضور سید عالم ﷺ نے فرمایا: میں نے تجھے جانا کہ تو مجھ سے قرآن میں منازعت کرتا ہے۔

اس حدیث کے بھی چند طریق بیان کئے گئے ہیں۔

حدیث (۳۴) اسی جامع مسانید امام اعظم میں ہے: ان عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہلم یقرأ خلف الامام لا فی الرکعتین الاولیین ولا فی غیرھما۔

(جامع مسانید امام اعظم ص۳۱۰ ج۱)

یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرتے، نہ پہلی دونوں رکعتوں میں اور نہ ان کے غیر میں۔

حدیث (۳۵) اسی جامع مسانید امام اعظم میں ہے: لا یقرأ علقمة خلف الامام حرفا لا فیما یجهر فیه ولا فیما لا یجهر فیه ولا یقرأ فی الاولیین بام الکتاب ولا غیرھا خلف الامام ولا اصحاب عبد اللہ جمیعا۔

(جامع مسانید امام اعظم ص۳۱۰ ج۱)

یعنی حضرت علقمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام کے پیچھے کوئی حرف نہیں پڑھتے تھے، نہ ان نمازوں میں جن میں قرأت بالجہر پڑھی جاتی ہے اور نہ ان نمازوں میں جن میں بالجہر نہیں پڑھی جاتی، اور انہوں نے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ آخری دو رکعتوں میں پڑھی اور نہ ان کے غیر میں اور نہ اصحاب عبداللہ نے۔

حدیث (۳۶) مسند امام احمد میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ان رسول اللہ ﷺ قال: من کان له امام فقرأة الامام له قرأة۔

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کا امام ہو تو امام کا قرأت کرنا اس کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۳۷) مسند امام احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: صلی رسول اللہ ﷺ باصحابه صلوة اظن انها الصبح فقال هل قرأ منکم من احد؟ قال رجل: انا، قال: انی اقول مالی انازع القرآن۔

یعنی رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کے ساتھ ایک نماز پڑھی، مجھے خیال ہے کہ وہ نماز صبح تھی، فرمایا: کیا تم میں سے کسی نے قرأت کی؟ ایک شخص نے عرض کیا: میں نے، فرمایا: میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہوا کہ میں قرآن میں منازعت کیا جاؤں۔

حدیث (۳۸) مسند امام احمد میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: لا صلوٰۃ الا بقرأة فاتحة الکتاب فی کل رکعة الا وراء الامام۔

یعنی نماز کی ہر بغیر سورۂ فاتحہ پڑھے کامل نہیں ہوتی مگر جب امام کے پیچھے ہو۔

حدیث (۳۹) دارقطنی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے: ان رسول اللہ ﷺ قال: من کان له امام فقرأة الامام له قرأة۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کا امام ہو تو امام کا قرأت کرنا اس کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۴۰) اسی دارقطنی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے: قال رسول اللہ ﷺ: یکفیك قرأة الامام خافتا او جهرا۔ یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تجھے امام کی قرأت کافی ہے، سری ہو یا جہری۔

حدیث (۴۱) اسی دارقطنی میں حضرت مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: من قرأ خلف الامام فقد اخطأ الفطرة۔

یعنی جس نے امام کے پیچھے قرأت کی تو اس نے فطرت سے خطا کی۔

حدیث (۴۲) اسی دارقطنی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: انما جعل الامام لیؤتم به فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا۔

یعنی امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، پس جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

حدیث (۴۳) اسی دارقطنی میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: کان النبی ﷺ یصلی بالناس ورجل یقرأ خلفه فلما فرغ قال من ذا الذی یخالجنی سورة کذا فنهاهم عن القرأة۔

یعنی حضور نبی کریم ﷺ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے، ایک شخص نے حضور کے پیچھے قرأت کی جب حضور ﷺ فارغ ہوئے تو فرمایا: کون ہے جس نے فلاں سورت کے ساتھ مجھ سے منازعت کی تو حضور ﷺ نے انہیں امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع فرما دیا۔

حدیث (۴۴) اسی دارقطنی میں حضرت مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: قال رجل أقرأ خلف الامام او انصت؟ قال بل انصت فانه یکفیك۔

یعنی ایک شخص نے حضور حضور نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: میں امام کے پیچھے قرأت کروں یا خاموش رہوں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: بلکہ خاموش رہو کہ تجھے یہی کافی ہے۔

حدیث (۴۵) اسی دارقطنی میں حضرت شعبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ان النبی ﷺ قال: لا قرأۃ خلف الامام ۔ یعنی حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: امام کے پیچھے قرأت نہیں۔

حدیث (۴۶) طبرانی نے اپنی معجم اوسط میں حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی: قال رسول اللہ ﷺ: من کان له امام فقرأۃ الامام له قرأۃ ۔ یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کا امام ہو تو امام کا قرأت کرنا اس کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۴۷) صحاح ستہ کے ائمہ سے امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ ان سب کے استاذ حضرت ابوبکر ابن ابی شیبہ اپنی مصنف میں حضرت علقمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ: ان عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنه کا ن لا یقرأ خلف الامام فیما یجھر ولا فیما یخافت فیه واذا صلیٰ وحدہ قرأ فی الاولیین بفاتحة الکتاب و سورۃ ولم یقرأ فی الاخریین سورۃ ۔

یعنی حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے، نہ ان نمازوں میں جن میں جہر کیا جاتا ہے اور ان نمازوں میں جن میں آہستہ پڑھا جاتا ہے، اور جب تنہا پڑھتے تو پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ پڑھتے اور ساتھ میں سورت بھی، اور پچھلی دونوں رکعتوں میں کوئی سورت نہیں ملاتے۔

حدیث (۴۸) اسی مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: من کان له امام فقرأته له قرأۃ ۔ یعنی جس شخص کے لئے امام ہو تو اس امام کا قرأت کرنا اسی کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۴۹) اسی مصنف ابن ابی شیبہ میں انہیں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ: قال لا یقرأ خلف الامام ۔ یعنی حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرے۔

حدیث (۵۰) اسی مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے مروی ہے: قال من قرأ خلف الامام فقد اخطأ الفطرۃ ۔ یعنی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جس نے امام کے پیچھے قرأت کی تو اس نے فطرت سے خطا کی۔

حدیث (۵۱) اسی میں ابووائل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: جاء رجل الی عبد اللہ

فقال اقرأ خلف الامام فقال: ان فی الصلوۃ شغلا و سیکفیك قرأۃ الامام ۔ یعنی ایک شخص حضرت عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: کہ امام کے پیچھے قرأت کروں؟ تو فرمایا: نماز میں یہ ایک شغل ہے اور تجھے امام کا قرأت کرنا کافی ہے۔

حدیث (۵۲) مؤطا امام محمد میں وہب بن کیسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ: انه سمع جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنه یقول: من صلی رکعة لم یقرأ فیها بام القرآن فلم یصل الا وراء الامام ۔ (مؤطا امام محمد مصطفائی باب القرأۃ فی الصلوۃ خلف الامام ص ۹۳)

یعنی وہب نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا، وہ فرماتے ہیں: کہ جس نے ایک رکعت پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس نے نماز ہی نہ پڑھی مگر جب امام کے پیچھے ہو۔

حدیث (۵۳) اسی مؤطا امام محمد میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ: قال رسول اللہ ﷺ: من صلی خلف الامام فان قرأۃ الامام له قرأۃ ۔

(مؤطا امام محمد باب مذکور ص ۹۶)

یعنی حضور انور ﷺ نے فرمایا: کہ جس نے امام کے پیچھے نماز پڑھی تو بیشک امام کا قرأت کرنا اس کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۵۴) اسی مؤطا امام محمد میں ہے: عن وائل قال سئل عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنه عن القرأۃ خلف الامام، قال انصت فان فی الصلوۃ شغلا و سیکفیك ذالك الامام ۔ (مؤطا امام محمد باب مذکور ص ۹۶)

یعنی حضرت وائل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قرأت خلف الامام کا مسئلہ دریافت کیا گیا تو فرمایا خاموش رہو یعنی امام کے پیچھے قرأت نہ کرو، بیشک نماز میں یہ ایک شغل ہے اور امام کا قرأت کرنا تیرے لئے کافی ہے۔

حدیث (۵۵) اسی موطا امام محمد میں ہے: ان عبد اللہ بن مسعود کا ن لا یقرأ خلف الامام فی ما یجھر فیه لا فی الا ولیین ولا فی الا خرین ۔

(موطا امام محمد باب مذکور ص ۹۶)

یعنی عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرتے تھے، نہ جہری نماز میں نہ سری نماز میں نہ پہلی دو رکعتیں میں نہ پچھلی دو رکعت میں۔

حدیث (۵۶) اسی موطاامام محمد میں ہے: عن نافع عن ابن عمر قال :اذا صلی احدکم خلف الا م فحسبه قرأة الا مام واذا صلی وحده فلیقرأ قال: وکان عبد الله بن عمر لا یقرأ خلف الا ما م۔ (موطاامام محمد باب مذکورص۹۳)

یعنی حضرت نافع سے مروی کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا کہ جب تمہارا کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اسے امام کا قرأت کا کرنا کافی ہے۔اور جب تنہا نماز پڑھے تو قرأت کرے۔راوی نے کہا کہ عبداللہ بن عمر امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے۔

حدیث (۵۷) اسی موطا امام محمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے :ان رسول الله ﷺ انصرف من صلوة جهر فيها بالقرأة فقال هل قرأ معي منكم من احد فقال رجل انا يا رسول الله اقال فقال اني اقول ما لي انازع القرآن فانتهى الناس عن القرأة مع رسول الله ﷺ فيما جهر به من الصلوة حين سمعوا ذلك۔

(مؤطاامام محمد مصطفائی باب القرأة فی الصلوة خلف الامام ص۹۳)

یعنی رسول اللہ ﷺ اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں قرأت بالجہر ہوتی ہے،فرمایا: کیا تم میں سے کسی نے میرے ساتھ قرأت کی؟ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ میں نے ،حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: کہ حضور نے فرمایا؛ میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہوا کہ میں قرآن میں منازعت کیا جاؤں،تو لوگ حضور ﷺ کے ساتھ جہری نمازوں میں قرأت سے باز رہے جب سے انہوں نے یہ سنا۔

حدیث (۵۸) اسی مؤطاامام محمد میں نافع سے مروی ہے :ان ابن عمر كان اذاسئل هل يقرأ احد مع الامام قال اذا صلى احدكم مع الامام فحسبه قرأة الامام وكان ابن عمر لا يقرأ مع الامام۔ (مؤطاامام محمد باب مذکورص۹۳)

یعنی جب حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے دریافت کیا گیا کہ کیا کوئی امام کے ساتھ قرأت کرے تو فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص امام کے ساتھ نماز پڑھے تو اس کو امام کا قرأت کرنا کافی ہے اور ابن عمر امام کے ساتھ قرأت نہیں کرتے تھے۔

حدیث (۵۹) اسی موطاامام محمد میں ہے :عن ابن عمر قال :من صلى خلف الامام كفته قرأته۔ (موطاامام محمد باب مذکورص۹۴)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں جس نے امام کے پیچھے نماز

پڑھی تو اسے امام کی قرأت کافی ہے۔

حدیث (۶۰) اسی موطاامام محمد میں ہے:عن ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنهما انه سئل عن القرأة خلف الامام قال تكفيك قرأة الامام۔ (مؤطاامام محمد باب مذکورص۹۴)

انہیں ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ ان سے قرأت خلف الامام کا مسئلہ پوچھا گیا تو فرمایا: تجھ کوامام کی قرأت کافی ہوگی۔

حدیث (۶۱) اسی مؤطاامام محمد میں ہے:عن ابن مسعود رضی الله تعالیٰ عنه قال انصت للقرأة فان في الصلوة شغلا وسيكفيك الامام۔ (مؤطاامام محمد باب مذکورص۹۸)

یعنی حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں: تو قرأت کے لئے خاموش ہو، بیشک نماز میں ایک شغل اور تجھے امام کافی ہے۔

حدیث (۶۲) اسی مؤطاامام محمد میں حضرت عبداللہ بن شداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا:ام رسول الله في العصر قال فقرأ رجل خلفه فغمزه الذي يليه فلما صلى قال لم غمزتني ؟قال :كان رسول الله ﷺ قدامك فكرهت ان تقرأ خلفه فسمع النبي ﷺ فقال :من كان له امام فان قرأته له قرأة۔ (مؤطاامام محمد باب مذکورص۹۸)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے نماز عصر میں امامت فرمائی ،راوی نے کہا کہ ایک شخص نے حضور ﷺ کے پیچھے قرأت کی تو اس کے پڑوسی نے اس کو اشارہ سے روکا تو جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو اس نے پڑوسی سے، کہا کہ تو نے مجھے اشارہ سے کیوں روکا تو اس نے جواب دیا کہ حضور ﷺ تیرے آگے تھے تو میں نے تیری حضور کے پیچھے قرأت کو مکروہ جانا، تو اس کو نبی ﷺ نے سنا اور فرمایا: جس کے لئے امام ہو تو بیشک اس امام کا قرأت کرنا اسی کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۶۳) اسی مؤطاامام محمد میں ہے:عن علقمة بن قيس قال:لان اعض على جمرة احب الي من ان اقرأ خلف الامام۔ (موطاامام محمد باب مذکورص۹۸)

یعنی حضرت علقمہ ابن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: مجھے آگ کی چنگاری کو منہ میں لینا امام کے پیچھے قرأت کرنے سے زیادہ پسند ہے۔

حدیث (۶۴) اسی مؤطاامام محمد میں ہے:عن ابراهيم رضي الله تعالیٰ عنه قال :ان اول من قرأ خلف الامام رجل اتهم ۔ (مؤطاامام محمد ص۹۸)

یعنی حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: امام کے پیچھے سب سے پہلے جس نے قرأت کی وہ متہم شخص تھا۔

حدیث (٦٥) اسی مؤطا امام محمد میں ہے: ان سعدا قال: وددت ان الذی یقرأ خلف الامام فی فیه جمرة۔ (موطا امام محمد ص ٩٨)

یعنی حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں پسند کرتا ہوں کہ جو امام کے پیچھے قرأت کرے اس کے منہ میں چنگاری ہو۔

حدیث (٦٦) اسی مؤطا امام محمد میں ہے: ان عمر بن الخطاب رضی الله تعالیٰ عنه قال: لیت فی فم الذی یقرأ خلف الامام حجرا۔ (مؤطا امام محمد ص ٩٨)

یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کاش کہ امام کے پیچھے پڑھنے والے کے منہ میں پتھر ہوتا۔

حدیث (٦٧) اسی مؤطا امام محمد میں ہے: ان زید بن ثابت رضی الله تعالیٰ عنه قال: من قرأ خلف الامام فلا صلوة له۔ (مؤطا امام محمد ص ١٠٠)

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جس نے امام کے پیچھے قرأت کی تو اس کی نماز نہیں۔

حدیث (٦٨) شرح معانی الآثار معروف طحاوی میں ہے: عن ابی هریرة رضی الله تعالیٰ عنه قال: ان رسول الله ﷺ انصرف من صلوة جهر فیها بالقرأة فقال هل قرأ منکم معی احد انفا؟ فقال رجل نعم یا رسول الله! فقال رسول الله ﷺ: انی اقول مالی انازع القرآن، قال فانتهی الناس عن القرأة مع رسول الله ﷺ فیما جهر فیه رسول الله ﷺ بالقرأة من الصلوات حین سمعوا ذلک منه۔ (طحاوی مطبوعہ لاہور ص ١٢٨ باب القرأۃ خلف الامام)

یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں قرأت بالجہر ہوتی ہے فرمایا: کیا تم میں سے ابھی میرے ساتھ کسی نے قرأت کی؟ ایک شخص نے عرض کیا: ہاں یا رسول اللہ! تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہوا کہ میں قرآن میں منازعت کیا جاؤں، راوی نے کہا کہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قرأت کرنے سے ان نمازوں میں باز رہے جن میں رسول اللہ ﷺ قرأت بالجہر فرماتے تھے جب سے لوگوں نے حضور ﷺ سے یہ سنا۔

حدیث (٦٩) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن ابی هریرة رضی الله تعالیٰ عنه قال: قال رسول الله ﷺ: انما جعل الامام لیؤتم به فاذا قرأ فانصتوا۔ (طحاوی مطبوعہ لاہور ص ١٢٨ باب القرأۃ خلف الامام)

یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے تو جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

حدیث (٧٠) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن عبد الله رضی الله تعالیٰ عنه قال: کانوا یقرؤن خلف النبی ﷺ فقال خلطتم علی القرأة۔ (طحاوی مطبوعہ لاہور ص ١٢٨ باب القرأۃ خلف الامام)

یعنی حضرت عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کہ لوگ حضور نبی کریم ﷺ کے پیچھے قرأت کرتے تھے تو حضور ﷺ نے فرمایا: تم نے مجھ پر قرأت خلط کردی۔

حدیث (٧١) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن جابر رضی الله تعالیٰ عنه قال: ان النبی ﷺ قال: من کان له امام فقرأة الامام له قرأة۔ (طحاوی مطبوعہ لاہور ص ١٢٨ باب القرأۃ خلف الامام)

یعنی حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس شخص کا امام ہو تو امام کا قرأت کرنا اسی کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (٧٢) اسی طحاوی شریف میں ہے: حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے انہیں الفاظ اور مضمون کے ساتھ مروی ہے۔ (طحاوی مطبوعہ لاہور ص ١٢٨ باب القرأۃ خلف الامام)

حدیث (٧٣) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن جابر رضی الله تعالیٰ عنه قال: ان النبی ﷺ قال: من صلی رکعة فلم یقرأ فیها بام القرآن فلم یصل الا وراء الامام۔ (طحاوی مطبوعہ لاہور ص ١٢٨ باب القرأۃ خلف الامام)

یعنی حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے ایک رکعت پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس نے نماز ہی نہ پڑھی مگر امام کے پیچھے۔

حدیث (٧٤) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن انس رضی الله تعالیٰ عنه قال: صلی رسول الله ﷺ ثم اقبل بوجهه فقال: اتقرؤن والامام یقرأ فسکتوا فسألهم ثلاثا فقالوا انا

لنفعل قال فلا تفعلوا ۔ (طحاوی مطبوعہ لاہور ص۱۲۸ باب القراۃ خلف الامام)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا: کیا تم لوگ قرأت کرتے ہو اور امام بھی قرأت کررہا ہے تو لوگ چپ رہے یہاں تک کہ حضور ﷺ نے ان سے تین مرتبہ سوال کیا تو بولے بیشک ہم نے قرأت کی، حضور ﷺ نے فرمایا: تم قرأت نہ کرو۔

حدیث (۷۵) اسی طحاوی شریف میں ہے: قال علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ: من قرأ خلف الامام فلیس علی الفطرۃ۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص۱۲۸ باب القراۃ خلف الامام)

یعنی حضرت مولی علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جس شخص نے امام کے پیچھے قرأت کی تو وہ فطرت پر نہیں۔

حدیث (۷۶) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: انصت للقرأۃ فان فی الصلوۃ شغلا وسیکفیک ذلک الامام۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص۱۲۸ باب القراۃ خلف الامام)

یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: خاموش رہو یعنی امام کے پیچھے قرأت نہ کرو بیشک نماز مین یہ ایک شغل ہے اور امام تجھے کافی ہے۔

حدیث (۷۷) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: لیت الذی یقرأ خلف الامام ملئ فوہ ترابا۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص۱۲۹ باب القراۃ خلف الامام)

یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کاش کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرے اس کا منہ خاک سے بھر دیا جائے۔

حدیث (۷۸) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہ سأل عبد اللہ بن عمر وزید بن ثابت وجابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم فقالوا: لا تقرأ خلف الامام فی شی من الصلوات۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص۱۲۹ باب القراۃ خلف الامام)

یعنی حضرت عبیداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عبد اللہ بن عمر وزید بن ثابت وجابر بن عبداللہ رضی اللہ

تعالیٰ عنہم سے قرأت خلف الامام کا مسئلہ دریافت کیا تو ان ہرسہ حضرات نے جواب دیا کہ نمازوں میں سے کسی نماز میں امام کے پیچھے قرأت نہ کرو۔

حدیث (۷۹) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن ابی حمزۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: قلت لابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اقرأ والامام بین یدی فقال: لا۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص۱۲۹ باب القراۃ خلف الامام)

یعنی حضرت ابوحمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے عرض کیا: کہ میں نماز میں قرأت کرسکتا ہوں اور امام آگے موجود ہو تو فرمایا: نہیں۔

حدیث (۸۰) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: ان عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کان اذا سئل ھل یقرأ احد خلف الامام یقول: اذا صلی احدکم خلف الامام فحسبہ قرأۃ الامام وکان عبد اللہ بن عمر لا یقرأ خلف الامام۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص۱۲۹ باب القراۃ خلف الامام)

یعنی جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے دریافت کیا جاتا کہ کیا امام کے پیچھے کوئی قرأت کرے تو فرماتے جب تمہارا کوئی شخص امام کے کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کا قرأت کرنا کافی ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے۔

حدیث (۸۱) سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن ابی موسی الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: ان رسول اللہ ﷺ کان یعلمنا اذا صلی بنا فقال: انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص۱۵۶ ج۲

باب من قال یترک الماموم القراۃ فیما جھر فیھا الامام بالقراۃ)

یعنی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کہ رسول اللہ ﷺ جب ہمیں نماز پڑھاتے تو ہمیں تعلیم کرتے اور فرماتے کہ امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، تو جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

حدیث (۸۲) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: ان النبی ﷺ قال: انما جعل الامام لیؤتم بہ فلا تختلفوا علیہ فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فا

نصتوا واذا قال غیر المغضوب علیھم ولا الضالین فقولوا آمین۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص۱۵۶
ج۲ باب من قال یترک الماموم القرأۃ فیما جھر فیھا الامام بالقرأۃ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے تو تم امام سے اختلاف نہ کرو، اور جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب امام غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔

حدیث (۸۳) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: ان النبی ﷺ انصرف من صلوۃ جھر فیھا بالقرأۃ فقال ھل قرأ معی احد منکم انفا فقال الرجل نعم یا رسول اللہ! قال انی اقول مالی انازع القرآن قال فانتھی الناس عن القرأۃ مع رسول اللہ ﷺ فیما جھر فیہ النبی ﷺ بالقرأۃ من الصلوات حین سمعوا ذلک من رسول اللہ ﷺ۔ (السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد
ص۱۵۶ ج۲ باب من قال یترک الماموم القرأۃ فیما جھر فیھا الامام بالقرأۃ)

یعنی حضور نبی کریم ﷺ اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں جہری قرأت پڑھی جاتی ہے۔ فرمایا کیا تم میں سے کسی نے میرے ساتھ ابھی قرأت کی ایک شخص نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ فرمایا میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہوا کہ میں قرآن میں منازعت کروں۔ راوی نے کہا کہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قرأت کرنے ان نمازوں میں باز رہے جن میں حضور قرأت نہ کرتے جب سے انہوں نے یہ رسول اللہ ﷺ سے سنا۔

حدیث (۸۴) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن عبد اللہ بن بحینۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: ھل قرأ احد منکم انفا فی الصلوۃ؟ قالوا نعم، قال: انی اقول مالی انزر القرآن فانتھی الناس عن القرأۃ حین قال ذلک۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص۱۵۸ ج۲)

یعنی حضرت عبد اللہ بن بحینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم میں سے کسی نے ابھی نماز میں قرأت کی؟ لوگوں نے عرض کیا: ہاں، فرمایا: میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہوا

کہ قرآن میں منازعت کیا جاؤں، تو لوگ جب سے حضور ﷺ نے فرمایا قرأت کرنے سے باز رہے۔

حدیث (۸۵) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: ان النبی ﷺ صلی وکان من خلفہ یقرأ فجعل رجل من اصحاب النبی ﷺ ینھاہ عن القرأۃ فی الصلوۃ فلما انصرف اقبل علیہ الرجل فقال: اتنھانی عن القرأۃ خلف رسول اللہ ﷺ فتنازعا حتی ذکر ذلک لرسول اللہ ﷺ فقال النبی ﷺ: من صلی خلف الامام فان قرأۃ الامام لہ قرأۃ۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص۱۵۹ ج۲
باب من قال لا یقرأ خلف الامام علی الاطلاق)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھائی اور آپ کے پیچھے ایک شخص قرأت کرتا تھا، تو حضور ﷺ کے اصحاب میں سے ایک صحب اس کو نماز میں قرأت کرنے سے منع کرنے لگے تو جب وہ شخص نماز سے فارغ ہوا تو ان صحابی کی طرف متوجہ ہو کر بولا کیا تم نے مجھے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کیا؟ تو انہوں نے جھگڑا کیا یہاں تک کہ حضور نبی کریم ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو امام کے پیچھے نماز پڑھے تو بیشک امام کا قرأت کرنا اسی کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۸۶) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن عبد اللہ بن شداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: من کان لہ امام فان قرأۃ الامام لہ قرأۃ۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص۱۵۹
ج۲ باب مذکور)

حضرت عبد اللہ بن شداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کے لئے امام ہو تو امام کا قرأت کرنا اس مقتدی کا قرأت کرنا ہے

حدیث (۸۷) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص۱۵۹
ج۲ باب مذکور)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس کے لئے امام ہو تو امام کا قرأت کرنا اسی کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۸۸) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن جابر بن عبد الله رضی الله تعالیٰ عنه قال : من صلیٰ رکعة لم یقرأ فیها بام القرآن فلم یصل الا وراء الامام ۔
(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدر آباد ص ۱۵۹ ج ۲ باب مذکور)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا: جس شخص نے ایک رکعت پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس نے نماز ہی نہ پڑھی مگر جب امام کے پیچھے ہو۔

حدیث (۸۹) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن ابی وائل رضی الله تعالیٰ عنه قال : ان رجلا سأل ابن مسعود رضی الله تعالیٰ عنه عن القرأة خلف الامام فقال : انصت للقرآن فان فی الصلوة شغلا و سیکفیك ذاك الامام۔
(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدر آباد ص ۱۵۹ ج ۲ باب مذکور)

ایک شخص نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قرأت خلف الامام کا مسئلہ دریافت کیا تو فرمایا: قرآن کے لئے خاموش رہو، بیشک یہ نماز میں ایک شغل ہے اور تجھے یہ امام کافی ہے۔

حدیث (۹۰) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن نافع عن ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنه انه کان یقول : من صلی وراء الامام کفاه قرأة الامام ۔
(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدر آباد ص ۱۵۹ ج ۲ باب مذکور)

حضرت نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے: جس نے امام کے پیچھے نماز پڑھی اس کے لئے امام کی قرأت کافی ہے۔

حدیث (۹۱) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے : عن ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنه قال : کان رسول الله ﷺ یصلی بالناس ورجل یقرأ خلفه فلما فرغ قال : من ذا الذی یخالجنی سورتی فنهی عن القرأة خلف الامام۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدر آباد ص ۱۵۹ ج ۲ باب مذکور)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک شخص نے آپ کے پیچھے قرأت کی، جب حضور ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھ سے کسی نے میری سورت میں منازعت کی تو امام کے پیچھے قرأت سے منع فرمایا۔

حدیث (۹۲) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن عمران بن حصین رضی الله تعالیٰ عنه قال : ان النبی ﷺ صلی یوما الظهر فجاء رجل فقرأ خلفه سبح اسم ربك الاعلیٰ فلما فرغ قال : ایکم القاری ؟ قال : انا، قال : قد ظننت ان بعضکم خالجنیها ۔
(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدر آباد ص ۱۵۹ ج ۲ باب مذکور)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ ایک دن ظہر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک شخص آئے اور انہوں نے آپ کے پیچھے سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھا، جب حضور فارغ ہوئے تو فرمایا: تم میں سے کون قرأت کر رہا تھا؟ ایک شخص نے کہا: میں، فرمایا: میں نے جانا کہ تم میں سے بعض نے میرے ساتھ قرأت میں منازعت کی۔

حدیث (۹۳) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن ابی الدرداء رضی الله تعالیٰ عنه قال : سئل رسول الله ﷺ افی کل صلوة قرأة قال : نعم، فقال رجل من الانصار : وجبت هذه، فقال لی رسول الله ﷺ و کنت اقرب القوم الیه، ما اری الامام اذا ام القوم الا قد کفاهم ۔ (السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدر آباد ص ۱۵۹ ج ۲ باب مذکور)

حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کیا ہر نماز میں قرأت ہے؟ فرمایا: ہاں، انصار میں سے ایک شخص نے کہا: قرأت واجب ہوگئی، تو رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا: کہ میں قوم میں حضور ﷺ سے زیادہ قریب تھا، میں امام کو جانتا ہوں جب وہ قوم کی امامت کرتا ہے تو وہی ان کے لئے کافی ہے۔

حدیث (۹۴) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن عطاء بن یسار رضی الله تعالیٰ عنه قال : سئل زید بن ثابت رضی الله تعالیٰ عنه عن القرأة مع الامام فقال : لا اقرأ مع الامام

فی شیئ۔ (السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص۱۵۹ ج۲ باب مذکور)

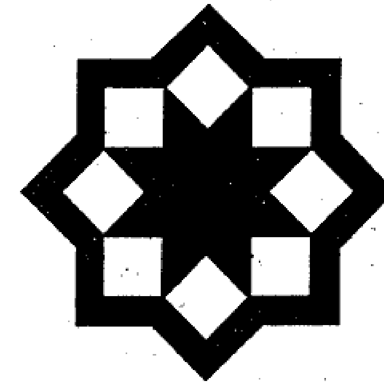
حضرت عطا بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے امام کے ساتھ قرأت کرنے کا مسئلہ دریافت کیا گیا تو فرمایا: میں امام کے ساتھ کچھ نہیں پڑھتا ہوں۔

حدیث (۹۵) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن زید بن ثابت رضی الله تعالیٰ عنه قال: من قرأ وراء الامام فلا صلوة ۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص۱۵۹ ج۲ باب مذکور)

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: جس شخص نے امام کے پیچھے قرأت کی تو اس کی نماز نہیں۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل





باب الجماعۃ

مسئلہ (۲۷۸)

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص جماعت ثانیہ کے حرام ہونے کا قائل ہے۔ دریافت یہ امر ہے کہ از روئے شرع جماعت ثانیہ حرام ہے یا نہیں؟

از رام نگر منڈی

الجواب

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم

سائل کا جماعت ثانیہ کو حرام کہنا کتب فقہ کے بالکل خلاف ہے۔ حرام ایک بہت بڑی چیز ہے۔ وہ کتنی ہی عرق ریزی کرے اس کا ناجائز ہونا بھی ثابت نہیں کرسکتا۔ جماعت ثانیہ فقہائے کرام کے نزدیک بالاتفاق جائز ہے۔

الحجة القاطعة میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ ناقل ہیں۔

ویجوز تکرار الجماعة بلا اذان واقامة ثانیة اتفاقا وفی بعضها اجماعا بلا کراهة قال فی شرح الدرر هو الصحیح۔

یعنی جماعت کی تکرار بغیر اذان وتکبیر کے اجماعاً بلا کراہت جائز ہے۔ اس قول میں جماعت ثانیہ کے بلا کراہت جائز ہونے بلکہ اجماع بلا کراہت پر کیسی صاف صراحت ہے۔ علاوہ بریں درر میں یہ تصریح کردی کہ صحیح بھی یہی قول ہے۔ اسی میں مجمع البحرین سے منقول ہے۔

وتکرارها فی مسجد محلة باذان ثان یعنی اذا کان للمسجد امام معلوم وجماعة معلومة فصلوا فیه بجماعة باذان واقامة لایباح تکرار الجماعة باذان واقامة عندنا وقید باذان ثان لا نهم ان صلوا بلا اذان ثان یباح اتفاقا۔

یعنی محلہ کی مسجد میں دوسری اذان کے ساتھ جماعت کا مکرر کرنا جب کہ اس مسجد میں امام اور مقتدی متعین ہوں اور اذان واقامت کے ساتھ جماعت پڑھ چکے ہوں اسی مسجد میں ہمارے نزدیک

جماعت کا اذان واقامت کے ساتھ مکرر کرنا غیر مباح ہے۔ اور اذان ثانی کی قید میں یہ فائدہ ہے کہ اگر جماعت کا بغیر اذان اعادہ کیا جائے تو باتفاق علماء مباح ہے۔ اسی میں ہے:

ثم قد علمت ان الصحیح انه لا یکره تکرار الجماعة اذالم تکن علی هیئة الاولیٰ۔

یعنی میں نے بہ تحقیق اس کا صحیح ہونا جانا کہ جماعت جب پہلی ہیئت پر نہ ہو تو مکروہ نہیں ہے۔

عالمگیری میں ہے: المسجد اذا کان له امام معلوم و جماعة معلومة فی محلة فصلی اهله فیه بالجماعه لا یباح تکرارها فیه باذان ثان اما اذا صلوا بغیر اذان یباح اجماعا۔

یعنی جب مسجد محلہ میں امام اور مقتدی متعین ہوں اور وہ جماعت پڑھ چکے ہوں اس میں دوسری اذان کے ساتھ جماعت کا مکرر کرنا غیر مباح ہے لیکن بلا اذان جماعت ثانیہ مباح ہے بالاجماع۔

ان عبارتوں سے ثابت ہوا کہ جماعت ثانیہ بلا کراہت جائز ہے۔ اور اسی پر اجماع بھی ہے۔

لیکن محلہ کی مسجد میں اذان جماعت ثانیہ کے لئے دوبارہ نہ کہی جائے اور امام کی جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ جماعت قائم کی جائے۔

الحجۃ القاطعۃ میں ردالمختار سے ناقل ہیں: عن ابی یوسف اذالم تکن علی الهیئة الاولیٰ لا تکره والاتکره وهو الصحیح۔ وبالعدول عن المحراب تختلف الهیئة کذا فی البزازیة۔

یعنی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ جب پہلی ہیئت پر نہ ہو تو مکروہ نہیں ہے۔ ورنہ مکروہ اور قول صحیح ہے۔ اور محراب سے علحدہ ہونا ہی ہیئت کو بدلتا ہے۔

بلکہ فقہاء اس کی بھی تصریح فرماتے ہیں۔ کہ بازار کی مسجد میں جماعت ثانیہ کے لئے اذان واقامت کا اعادہ افضل ہے۔

خزائن الاسرار شرح تنویر الابصار میں ہے: لو کان مسجد طریق جاز اجماعا کما فی مسجد لیس له امام ولا موذن ویصلی الناس فیه فوجا فوجا فان الافضل ان یصلی کل فریق باذان واقامة علی حدة کما فی امالی قاضی خان۔

یعنی اگر مسجد راستہ کی ہو اور اس میں گروہ گروہ آکر نماز پڑھتے ہیں تو افضل یہ ہے کہ ہر گروہ اذان واقامت کے ساتھ جماعت کریں اس کے جواز پر اجماع ہے اس مسجد کی مانند کہ جس میں امام موذن مقرر نہ ہوں۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۲۷۹)

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک مقتدی دوسری رکعت میں امام کے ساتھ جماعت میں آکر ملا۔ امام صاحب نے دو رکعت کے بعد تشہد پڑھی اور اس مقتدی کی ایک رکعت والے نے بھی تشہد پڑھی۔ امام صاحب نے دو رکعت پوری کر کے تشہد پڑھی اور اس مقتدی نے بھی تشہد پڑھی اور ایک باقی رکعت کو پورا کر کے پھر تشہد پڑھی اس مقتدی کی چار رکعت میں تین تشہد ہوئے۔ جو شخص جان کر ایسا کرے اس کی نماز میں شریعت کے لحاظ سے کچھ نقص تو واقع نہیں ہوتا؟۔ یا کسی سے سہوا ایسا ہو جائے تو اس کا کیا حکم ہے۔ بینوا توجروا

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

اس میں کوئی نقص نہیں۔ اس مقتدی کو ایسا ہی کرنا چاہئے۔ یہاں تو چار رکعتوں میں تین تشہد ہوئے اور کتب فقہ میں تو ایسی صورت بھی لکھی ہے جس میں تین رکعتوں میں دس تشہد ہوں۔

ادرك الامام فی تشهد المغرب الاول وتشهد معه فی الثانیة وكان علیه سهو فسجده وتشهد معه فی الثالثة وتذکر الامام سجدة تلاوة فسجدمعه و تشهد الرابعة وسجد للسهو وتشهد معه الخامسة۔ فاذ سلم قام الی قضاء مافاته فصلی رکعة تشهد السادسة ویصلی رکعة اخری ویتشهد السابعة ۔ وکان قد سها فیما یقضی فیسجد ویتشهد الثامنة ثم تذکر انه قرأ آیة سجدة فی قضائه فیسجد لهاو یتشهد التاسعة ثم یسجد للسهو ویتشهد العاشرة ۔ (طحطاوی علی مراقی الفلاح مصری ص ۲۷۰)

لہذا یہ صورت بلاشبہ جائز ہے۔ واللہ تعالیٰ علم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۸۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک امام صاحب نے صبح کی نماز پہلی رکعت میں سورۂ یٰسین کا آخری پورا رکوع پڑھ کر اس کے متصل دوسری سورۃ والصافات کا پہلا پورا رکوع پڑھا۔ ایسا کرنے سے لوگوں کی نماز ہو جاتی ہے یا کہ نہیں اور کیا کیا نماز میں نقص واقع ہوتے ہیں؟۔ آپ مع فقہ کی کتاب یا حدیث سے ساتھ صفحہ وباب کے حوالہ دیں۔ بینوا توجروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صورت مسئولہ میں بلاشک نماز ہو جائے گی لیکن یہ خلاف اولیٰ ہے۔

تاتارخانیہ میں ہے:

اذا جمع بین سورتین فی رکعة رأیت فی موضع انه لا باس به وذکر شیخ الامام لاینبغی له ان یفعل علی ما هو ظاهر الروایة ۔ (ردالمحتار مصری ج۱ ص۳۸۳)

غنیۃ المستملی شرح المنیہ میں ہے:

الاولیٰ ان لایفعل فی الفرض ولو فعل لایکره ۔ (غنیۃ مطبوعہ فخر المطابع لکھنو ص۴۶۲)

لہذا صورت مسئولہ میں صرف اولویت کا خلاف لازم آتا ہے اور کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۸۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع کہ

ایک مسجد کے امام کا کئی مرتبہ چوری کی عادت اس کے مقتدیوں کو پایہ ثبوت تک پہونچ گئی۔ اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ یہ امام صاحب اسی مسجد کی امامت پر برقرار رکھے جا سکتے ہیں؟۔ بینوا توجروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جب چوری کرنا گناہ کبیرہ ہے تو چور ارتکاب کبیرہ کی وجہ سے فاسق ہوا۔

ردالمحتار میں ہے: المراد به من یرتکب الکبائر کشارب الخمر والزانی واکل الربا ونحو ذلك ۔ (ردالمحتار ۳۹۳)

فاسق سے، مراد وہ شخص ہے جو کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرے جیسے شراب پینے والا، زنا کرنے والا، سود کھانے والا اور مثل اس کے۔

علامہ طحطاوی شرح مراقی الفلاح میں فاسق کی بحث میں فسق کی شرعی تعریف لکھتے ہیں:

وشرعا خروج عن طاعة الله تعالیٰ بارتکاب کبیرة ۔ (طحطاوی ص۱۷۶)

فسق شریعت میں ارتکاب کبیرہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طاعت سے خارج ہونے کا نام ہے۔

اور فاسق کی امامت مکروہ ہے۔

کنزالدقائق میں ہے: کره امامة العبد والاعرابی والفاسق ۔ (عینی ج۱ ص۳۷)

غلام۔ دہقانی۔ فاسق کی امامت مکروہ ہے۔

ملتقی الابحر میں ہے:

تکره امامة العبد والاعرابی والاعمی والفاسق ۔ (حاشیہ شرح وقایہ فارسی ص۳۴)

غلام۔ دہقانی۔ نابینا۔ فاسق کی امامت مکروہ ہے۔

نورالایضاح میں ہے: کره امامة العبد والاعمی والاعرابی وولدالزنا والجاهل والفاسق۔ (نورالایضاح ص۲۲)

غلام، نابینا، دہقانی، حرامی، جاہل، فاسق کی امامت مکروہ ہے۔

مراقی الفلاح میں ہے: کره امامة الفاسق لعدم اهتمامه بالدین فتجب اهانته شرعا ولایعظم بتقدیمه للامامة ۔ (ص۱۷۶)

فاسق عالم کی اہانت بوجہ دینی اہتمام ہونے کے مکروہ ہے اور شرعا اس کی اہانت واجب ہے تو اس کو امامت کے لئے پیش کرکے تعظیم نہ کی جائے۔

تنویرالابصار میں ہے: یکره امامة عبد واعرابی وفاسق ۔ (شامی ج۱ ص۳۹۳)

غلام۔دہقانی۔فاسق کی امامت مکروہ ہے۔

بالجملہ فاسق کی امامت مکروہ ہے اور اس کراہت سے مراد مکروہ تحریمی ہے۔

چنانچہ شرح منیہ میں ہے: ان کراھة تقدیمه کراھة تحریم ۔(غنیۃ ص ۴۷۹)

فاسق کے امامت کے لئے پیش کرنے کی کراہت تحریمی کراہت ہے۔

طحطاوی میں ہے: مفاده کون الکراھة فی الفاسق تحریمیة ۔(ص ۱۷۶)

امامت فاسق کے مکروہ ہونے کا مفاد تحریمی ہے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ چور کی اپنے فسق کی وجہ سے امامت مکروہ تحریمی ہے اور جب وہ چوری کا عادی ہے اور مقتدیوں کو اسکا فسق پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے تو اس کی امامت بدرجہ اولی مکروہ تحریمی ہے۔

واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۸۲)

علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں

کہ زید اپنے ساتھیوں کے ساتھ مسجد میں بیٹھا رہتا ہے۔پہلی جماعت جب ختم ہوئی امام نے سلام پھیرا تو فوراً وہ دوسری جماعت کرتا ہے۔مسلمانوں میں تفریق پیدا کرتا ہے اور کر رہا ہے۔جماعت توڑنے کی کوشش میں رہتا ہے جس سے مسلمانوں میں نفاق پیدا ہورہا ہے۔لہٰذا از روئے شرع شریف کے بتایا جائے کہ زید کا فعل جائز ہے یا ناجائز۔بینوا توجروا

المستفتی، حسین بخش حاجی محمد اسمٰعیل کی دکان نمبر ۱۱ لاگیٹ سوداگر پٹی کاشی پور کلکتہ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

اگر پہلی اور دوسری جماعت کے لوگوں میں اختلاف عقائد کا فرق ہے کہ ایک جماعت بدمذہبوں -وہابی، غیر مقلد، قادیانی وغیرہ کی جماعت ہے۔اور دوسری اہل سنت صحیح العقیدہ لوگوں کی جماعت ہے تو اہل سنت و جماعت کی ان بدمذہبوں کے ساتھ اور بدمذہب امام کی اقتداء میں پڑھنا ناجائز و ناروا ہے۔

دارقطنی کی حدیث شریف میں ہے " ولا تصلوا معهم " یعنی تم بدمذہب امام کی اقتداء میں نماز نہ پڑھنا۔

فقہ کی مشہور کتاب کبیری میں ہے " روی محمد عن ابی حنیفة وابی یوسف رحمهما الله ان الصلوة خلف اهل الاهواء لا یجوز "۔

یعنی حضرت امام اعظم ابوحنیفہ وامام ابو یوسف علیہما الرحمۃ سے امام محمد علیہ الرحمۃ نے روایت کی کہ بیشک بدمذہبوں کے ساتھ اور ان کے پیچھے نماز جائز نہیں۔

تو اگر پہلی جماعت بدمذہبوں کی ہے اور زید سنی صحیح العقیدہ ہے تو زید کا بدمذہبوں کی جماعت میں شریک نہ ہونا اور دوسری جماعت کرنا صحیح و جائز فعل ہے۔اور اس کو نفاق وتفریق بین المسلمین کہنا غلط اور اندھاپن ہے۔اور کہنے والوں کے دین سے ناواقف ہونے کی روشن دلیل ہے۔اور اگر ان دونوں جماعتوں میں اختلاف عقائد بالکل نہیں ہے۔لیکن جماعت اولی کے امام میں کچھ شرعی عملی خامی ہے۔یعنی کسی طرح کا فسق ہے تو زید کا اس بناء پر پہلی جماعت میں شرکت نہ کرنا اور دوسری جماعت منعقد کرنا قابل ملامت ولائق مواخذہ نہیں۔مگر اس کا بوقت جماعت اس شان سے وہاں موجود رہنا اور فوراً دوسری جماعت قائم کر دینا شرعاً یہ طریقہ مذموم وناپسندیدہ ہے۔اور اس صورت میں تفریق بین المسلمین کی مجرم وہ جماعت اولی ہے کہ اس نے ایسے فاسق امام کو کیوں مقرر کر رکھا ہے۔جس کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہو جو واجب الاعادہ ہو۔اور اگر ان دونوں جماعتوں اور اس کے امام میں اعتقاد اور عمل کسی طرح کا فرق نہیں بلکہ زید کو اس امام سے محض دنیوی امور کی بنا پر عداوت و دشمنی ہے تو پھر زید کے یہ افعال جماعت اولی میں شریک نہ ہونا اور اس کے بعد فوراً جماعت ثانیہ قائم کرنا شرعاً مذموم وناجائز ہے اور فی الواقع تفریق بین المسلمین ہے۔زید کو اپنی ایسی ناپاک حرکت سے باز آنا چاہئے مولی تعالی قبول حق کی توفیق دے۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل
۹ صفر المظفر ۱۳۷۰ھ۔

مسئلہ (۲۸۳)

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ

زید پڑھا لکھا اور صوم وصلوۃ کا پابند ہے مگر مسجد ونماز کے پابند نہیں، محلّہ کی مسجد زید صاحب کے

مکان سے صرف چار سو قدم کے فاصلے پر ہے، برسات میں بارش وغیرہ کیوجہ سے راستہ ضرور خراب وتکلیف دہ ہوجاتا ہے۔ پھر بعد ختم برسات راستہ بہت صاف ستھرا ہوجاتا ہے مگر زید صاحب موصوف کے لئے، جاڑا، گرمی، برسات سب برابر ہے۔ حالانکہ اپنی کاموں کے لئے مسجد سے بھی دوری فاصلے پر دن تو دن اندھیری شب میں جاتے آتے ہیں اور مسجد کے لئے ہمیشہ عذر درپیش رہا کرتا ہے۔ مسجد میں صرف جمعہ کی امامت کے لئے چلے جاتے ہیں، باقی پنج گانہ اپنے گھر پر پڑھا کرتے ہیں۔ اس پر بعض لوگ کہتے ہیں کہ بغیر عذر شرعی مکان پر نماز ہرگز نہ ہوگی، اور ایسے امام جو بغیر عذر شرعی تارک مسجد وجماعت ہو ان کے پیچھے نماز درست نہیں۔ لہذا شرعی حکم سے بالتشریح بحوالہ کتب فقہ مطلع فرمایا جائے؟

المستفتی، عبدالکمال مظفرپوری خریدار سنی

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جو شخص بغیر عذر شرعی کے تارک جماعت کا عادی ہو وہ فاسق ہے۔

ردالمحتار میں ہے " انہ یاثم اذا اعتاد الترك " اور جب وہ فاسق قرار پایا تو اس کو امامت کے لئے پیش کرنا مکروہ ہے اور سوائے جمعہ کے اس کے پیچھے جو نماز پڑھی جائیگی وہ واجب الاعادہ ہوگی۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل
۳ رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ

مسئلہ (۲۸۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
زید فجر کی سنت مسجد میں ایک طرف کو ادا کر رہا ہے اور جماعت ہو رہی ہے۔ کیا یہ سنت ادا ہوجائیں گی؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جماعت کے وقت فجر کی سنتیں مسجد میں پڑھ سکتا ہے لیکن اس کے اور جماعت کے درمیان ستون

دیوار وغیرہ کا آڑ ہو۔ یا اندر باہر کا فرق ہو۔ اور اگر خارج مسجد میں کوئی جگہ ہو تو وہاں پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔ واللہ تعالی اعلم

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۸۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
امام کے مصلی پر پہنچنے سے پہلے تکبیر کہنا جائز ہے یا نہیں: اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ کیا تھی اور آپ کس وقت مصلے پر تشریف لاتے تھے: بینوا توجروا؟

المستفتی محبوب حسین محلہ محمود خاں سرائے ۴ رجب المرجب سنہ ۶۲ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بلاشک امام کے مصلے پر جانے سے پہلے تکبیر کا شروع کردینا جائز ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے زمانہء اقدس میں ایسا عمل ہوتا تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالی عنہ جب حضور کو حجرہ شریفہ سے برآمد ہوتا ہوا دیکھتے اقامت (تکبیر) شروع کردیتے۔

چنانچہ حاکم نے مستدرک میں یہ حدیث حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کی:

كان بلال یوذن ثم یمهل فاذا رأی رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم قد خرج فاقام الصلوة هذا حدیث صحیح علی شرط مسلم (وفی روایة) فاذا رأی النبی صلی اللہ تعالی علیہ وسلم قد اقبل اخذ فی الاقامة (رواہ حاکم فی المستدرك) (و فی روایة) لا یقیم حتی یری النبی صلی اللہ تعالی علیہ وسلم فاذا رأہ اقام حین یراہ (رواہ مسلم والبیهقی)

حضرت بلال اذان کہتے پھر توقف کرتے پھر جب حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کو نکلتے ہوئے دیکھتے تو نماز کے لئے اقامت کہتے (یہ مسلم کی شرط پر حدیث صحیح ہے) (ایک روایت میں ہے) کہ نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کو برآمد ہوتا دیکھتے تو اقامت شروع کردیتے (اس حدیث کو حاکم نے مستدرک میں روایت کیا) (اور ایک روایت میں ہے) کہ حضرت بلال اقامت نہیں کہتے یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کو دیکھتے پس جب آپ کو دیکھتے تو دیکھنے کے ساتھ ہی اقامت کہتے؛

ان احادیث سے ظاہر ہو گیا کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کو جس وقت حجرہ شریفہ سے باہر تشریف لاتا ہوا دیکھتے موذن اقامت شروع کر دیتے۔ تو ظاہر ہے کہ اقامت امام کے مصلے پر جانے سے پہلے شروع کر دی گئی اور یہ طریقہ حضور ہی کی تعلیم سے جاری ہوا۔ ورنہ اس پر ضرور منع فرما دیتے اور خود حضور انور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کی عادت کریمہ مقرر معلوم نہیں ہوتی۔ کبھی حجرہ شریفہ سے برآمد ہوتے اور موذن آپکو دیکھتے ہی اقامت شروع کر دیتے جیسا کہ ان احادیث میں مذکور ہے اور کبھی تکبیر کی آواز سنکر حجرہ شریفہ سے باہر تشریف لاتے۔

چنانچہ بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ میں حضرت ابو قتادہ رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کی کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا اقیمت الصلوۃ فلا تقوموا حتی ترونی: جب نماز کے لئے اقامت کہی جائے تو کھڑے نہ ہو یہاں تک کہ مجھے دیکھ لو۔

علامہ علی قاری مرقات میں اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں:

ولعله صلى الله تعالى عليه وسلم كان يخرج من الحجرة بعد شروع المؤذن في الاقامة ويدخل في محراب المسجد عند قوله حي على الصلوٰة؛

شاید کہ حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم موذن کے اقامت شروع کر دینے کے بعد حجرہ سے نکلتے تھے اور محراب مسجد میں حی علی الصلوٰۃ کے کہنے کے وقت داخل ہوتے: اور کبھی اقامت کے ختم کے وقت حجرہ شریفہ سے برآمد ہوتے۔

چنانچہ مشکوٰۃ شریف کے حاشیہ میں بحوالہ مرقات یہ عبارت ہے:

قال ابن حجرو كان يخرج صلى الله تعالى عليه وسلم عند فراغ المقيم من اقامته فامرهم بالقيام حينئذلانه وقت الحاجة اليه : (مشکوٰۃ ص ۶۴)

ابن حجر نے کہا کہ حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم مقیم کے اقامت سے فارغ ہونے کے وقت برآمد ہوتے تھے اور صحابہ کو اس وقت کھڑے ہونے کا حکم فرماتے۔ کیونکہ اسی وقت قیام کی حاجت ہے؛ اور کبھی ان کے علاوہ اور صورتیں عمل میں آتیں (الحاصل) امام کے مصلے پر پہنچنے سے قبل تکبیر شروع کر دینا جائز ہے اور حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہے (واللہ تعالی اعلم بالصواب)

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۲۸۶)

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بیٹھ کر پڑھنے والے امام کی اقتدا کھڑے ہو کر کرنے کا جواز تنویر الابصار، درمختار، کنز الدقائق عینی، بحر الرائق، شرح وقایہ، نہایہ، غنیۃ، فتاوے خانیہ، فتاوے سراجیہ، قدوری، جوہرہ نیرہ، جامع الفتاوے، نور الایضاح، مراقی الفلاح، طحطاوی، ہدایہ وغیرہ متون وشروح میں موجود ہے۔ اور کیونکر نہ موجود ہو کہ بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف، نسائی شریف، بیہقی وغیرہ کتب حدیث میں مروی ہے کہ خود نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کا یہ آخری فعل ہے کہ حضور نے آخر مرض میں بیٹھ کر نماز پڑھائی اور صحابہ نے آپ کی اقتدا میں کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔

چنانچہ درمختار میں ہے:

(وصح اقتداء قائم بقاعد) یرکع ویسجد لانه ﷺ آخر صلاته قاعدا وهم قائمون وابو بكر يبلغهم تكبيره۔ (شامی ص ۴۱۳ ج ۱)

البتہ فرائض میں شیخین اور امام محمد میں اختلاف منقول ہے۔ شیخین جواز کے قائل ہیں اور حدیث ان کی مستدل ہے۔ اور امام محمد بر بنائے قیاس اس کو ناجائز فرماتے ہیں۔ لیکن فرائض میں بھی اکثر فقہا نے قول شیخین کو ترجیح دی اور اسی کو قول مفتی بہ قرار دیا۔

اب رہے نوافل وتراویح اس میں یہ اقتدا باتفاق جائز ہے۔

شامی میں ہے: (قوله وقائم بقائد) ای قائم ساجد او موم وهذا عندهما خلافا لمحمد واقتداء القاعد بكونه يركع ويسجد لانه لما كان موجبا لم يجز اتفاقا والخلاف ايضا فيما عدا النفل اما فيه فيجوز اتفاقا وفي التراويح في الاصح۔

(شامی ص ۴۱۳ ج ۱)

بالجملہ صورت مسئولہ میں یعنی تراویح امام کا بیٹھ کر پڑھنا اور مقتدیوں کا کھڑا ہو کر اس کی اقتدا کرنا باتفاق فقہا صحیح درست ہے۔ اب اس تحقیق کے بعد کسی عالم کا اس میں اختلاف کرنا اس کی ناواقفی کی دلیل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۸۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں کہ
ایک شخص صبح یا ظہر کی نماز کیلئے مسجد میں پہنچتا ہے جماعت ہو رہی ہے۔ ایک رکعت پہنچنے سے پہلے ختم ہو جاتی ہے، دوسری رکعت امام کے ساتھ ملتی ہے، امام اپنی نماز پوری کر کے سلام پھیرتا ہے، بعد کا آنے والا شخص جسکی ایک رکعت فوت ہوئی ہے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور ثنا اور اعوذ کے بعد الحمد اور سورۃ پڑھکر اپنی نماز ادا کر لیتا ہے۔ زید اس کے خلاف بتلاتا ہے کہ ثنا نہ پڑھی جائے۔ زید اپنے عمل کے ثبوت میں بہشتی زیور۔ مفتاح الجنۃ۔ شرح وقایہ پیش کرتا ہے۔ شخص مذکور اپنے عمل کے ثبوت میں بالا بد۔ بہار شریعت۔ فتاوی عالمگیری، درمختار لاتا ہے۔ لہذا ان دونوں شخصوں میں کون حق بجانب ہے۔ مدلل طریقہ سے جو کتب دینیات مذہب حنفی میں ہو رقم فرمایا جائے۔ کہ مسئلہ حقہ پر عمل ہو۔ و نیز نماز جہر و خفی کا عمل بھی تحریر فرمایا جائے کہ مسبوق کو کس طرح نماز پڑھنی چاہیے۔
ممتاز الٰہی اشرفی نقشہ نویس چنگی چندوسی۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسبوق جب امام کے سلام کے بعد اپنی باقی نماز پڑھنے کیلئے کھڑا ہو تو وہ ثنا پڑھے پھر تعوذ اور الحمد اور سورت ملائے۔ ثنا کا پڑھنا عامہ کتب فقہ میں موجود ہے۔

تنویر الابصار و درمختار میں ہے:

المسبوق من سبقه الامام بها او ببعضها وهو منفرد حتى يثني ويتعوذ ويقرء۔
(ردالمحتار مصری ص ۴۱۸ ج ۱)

مسبوق وہ مقتدی ہے کہ امام کی اس سے پہلے سب نماز کی رکعتیں یا بعض رکعات ہو چکیں تو وہ

منفرد کے حکم میں ہے یہاں تک کہ وہ ثنا اور تعوذ اور قرأت پڑھے۔

علامہ شامی رد المحتار میں قولہ یثنی کے تحت میں فرماتے ہیں:

تفريع على قوله منفرد فيما يقضيه بعد فراغ امامه فياتي بالثناء والتعوذ لانه للقراءة ويقرأ لانه يقضي اول صلاته في حق القراءة كما ياتي حتى لو ترك القراءة فسدت۔
(ردالمحتار۔ مصری ص ۴۱۸ ج ۱)

یہ مصنف کے قول منفرد کی تفریع ہے کہ مسبوق اپنی باقی نماز کی امام کے فارغ ہونے کے بعد قضا کرے تو وہ ثنا اور تعوذ پڑھے۔ تعوذ قرأت کیلئے ہے۔ اور قرات پڑھے اسلئے کہ حق قرأت میں وہ اپنی پہلی نماز کی قضا کر رہا ہے۔ جیسا کہ آئندہ آئے گا۔ یہاں تک کہ اگر اسنے قرات ترک کی تو نماز فاسد ہو جائیگی

نور الایضاح اور اس کی شرح مراقی الفلاح میں ہے:

فياتي به المسبوق في ابتداء ما يقضيه بعد الثناء۔ (طحطاوی ص ۱۶۴۔)

تو مسبوق تعوذ کو ثنا کے بعد اپنی فوت شدہ نماز کی ابتداء میں لائے۔

فتاوی قاضی خان میں ہے:

ولو ان المسبوق لم يات بالثناء في اول الصلاة فقام الى قضاء ما سبق ذكر في الكيسانيات انه ياتي بالثناء عند محمد رحمه الله تعالى ولم يذكر فيه خلافا وبعد الفراغ من الثناء يتعوذ۔ (قاضی خاں ص ۴۳)۔

اگر مسبوق ثنا اول نماز میں نہ لایا پھر اپنی فوت شدہ کو قضا کی طرف کھڑا ہوا کیسانیات میں ذکر کیا گیا کہ امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک وہ ثنا پڑھیگا اور کسی مخالف قول کا اس میں ذکر نہیں کیا اور ثنا سے فارغ ہو کر وہ تعوذ پڑھے۔

اسی فتاوے خانیہ میں ہے:

المسبوق اذا ادرك الامام في القراءة التي يجهر فيها لا ياتي بالثناء فاذا قام الى قضاء ما سبق ياتي بالثناء ويتعوذ للقراءة۔ (خانیہ ص ۵۱)۔

مسبوق نے جب امام کو جہری نماز کی قرأت میں پایا تو وہ اب ثنا نہ پڑھے۔ پھر جب اپنی فوت شدہ کی قضا کی طرف کھڑا ہو تو ثنا پڑھے، اور قرأت کے لئے تعوذ پڑھے۔

فتاوے سراجیہ میں ہے:

المسبوق اذا قام الی قضاء ما سبق فانه یستفتح لا ن هذا اول صلا ته فی حق القرأة وان کا ن اخرصلا ته فی حق القعدة ۔

(ش خانیہ ص۹۶)

مسبوق جب فوت شدہ نماز کو طرف کھڑا ہو تو وہ ثنا پڑھے۔ اسلئے کہ حق قرأت میں یہ اس کی پہلی نماز ہے۔ اگرچہ حق قعدہ میں یہ اس کی آخر نماز ہے۔

شرح وقایہ اور عمدۃ الرعایہ فی حل شرح الوقایہ میں ہے:

المسبوق وهو الذی ادرك آخر صلوة الامام فلم یلتزم اداء الکل خلف الامام فهو فی اداء ما لم یدرکه مع الامام منفرد حتی یجب علیه القرأة (قال المحشی) قوله منفرد ای حقیقة وحکما ایضا و لذا یقرأ المسبوق القرآن ویتعوذ ویثنی ۔ (شرح وقایہ ص۱۷۹ ج۱)

مسبوق وہ ہے جس نے امام کی آخر نماز کو پایا اور امام کے پیچھے کل نماز کو ادا نہ کر سکا تو وہ اس کی ادا میں جو امام کے ساتھ نہ ملی منفرد کے حکم میں ہے یہاں تک کہ اس پر قرأت واجب ہے۔ محشی نے کہا کہ وہ حقیقۃ اور حکما منفرد ہے۔ اسی لئے مسبوق قرآن پڑھے گا اور تعوذ پڑھے گا اور ثنا پڑھے گا ۔

الحاصل فقہ کی مشہور کتب تنویر الابصار۔ درمختار۔ ردالمحتار۔ نور الایضاح۔ مراقی الفلاح۔ فتاوے قاضی خاں۔ فتاوے سراجیہ۔ شرح وقایہ۔ عمدۃ الرعایہ سے نہایت واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ مسبوق جب اپنی فوت شدہ رکعات پوری کرے گا تو وہ ثنا پڑھیگا۔ اور عبارت قاضی خاں سے معلوم ہوا کہ یہ ایسا قول ہے جس کا کوئی مخالف قول منقول نہیں۔ لہذا اب زید اس کے خلاف قول کہاں سے لائیگا۔ زید کا شرح وقایہ کو اپنے استدلال میں پیش کرنا اس کی نا قابلیت کی دلیل ہے۔

اقول اولا: شرح وقایہ میں غالبا جو مسبوق کیلئے ثنا پڑھنے کی ممانعت کی ہے وہ اس صورت میں ہے کہ جب یہ مسبوق بوقت شروع ثنا پڑھ چکا ہے کہ ثنا کی مشروعیت نماز میں ایک ہی مرتبہ کیلئے ہے چنانچہ فقہائے کرام دوسری رکعت میں ثنا تعوذ نہ پڑھنے کی یہی علت لکھتے ہیں۔

درمختار میں ہے:

الرکعة الثانیة کالا ولی فیما مر غیر انه لا یا تی بثناء ولا تعوذ فیها اذلم یشرعا الامرة ۔

تو اس بنا پر شرح وقایہ کی عبارت۔ المسبوق یقرأ ولا یثنی فیتعوذ، کا یہ مطلب ہوا کہ وہ

مسبوق جو بوقت شروع ثنا پڑھ چکا ہے وہ قرأت اور تعوذ پڑھے اور ثنا نہ پڑھے کہ ثنا کی نماز میں تکرار نہیں ہوتی اور وہ شروع میں ثنا پڑھ چکا ہے تو یہ عبارت ہماری پیش کردہ عبارات کے مخالف نہیں ہوئی:

ثانیا: اور اگر زید عبارت شرح وقایہ کا یہ مطلب سمجھتا ہے کہ یہ اس مسبوق کے لئے ہے جس نے بوقت شروع ثنا نہیں پڑھی ہے تو اس میں فقہاء کے طبقہ ثالثہ کے مجتہد فی المسائل امام اجل فخر الدین قاضی خاں کی مخالفت لازم آتی ہے جیسا کہ عبارت منقولہ فتاوی خانیہ سے ظاہر ہے۔

ثالثا: اگر مخالفت قاضی خاں سے بھی قطع نظر کر لی جائے تو محرر مذہب اجل شاگرد امام اعظم حضرت امام محمد رحمۃ اللہ کی کتاب کی صریح مخالفت ہوتی ہے۔

رابعا: جب اصحاب مذہب سے کوئی مخالف قول منقول نہیں جیسا کہ بیانات سے ظاہر ہوا تو کیا زید قول شرح وقایہ کو مخالف قول ہونے کا صالح سمجھتا ہے۔

خامسا: اس عبارت شروح وقایہ میں قرأت کے ساتھ تعوذ پڑھنے کا حکم ہے اور تعوذ کے لئے متوارث یہ ہے کہ وہ بعد ثناء پڑھا جائے۔

چنانچہ کبیری میں ہے:

ولا یتعوذ الا بعد الثناء لانه المتوارث۔ (کبیری صفحہ ۱۹۸)

تو اس صورت میں تعوذ کا بلا ثنا کے اجازت دیدینا خلاف متوارث ٹھہرتا ہے۔ بالجملہ شرح وقایہ کی عبارت کی تاویل وہ ہے جو ہم نے اقول کے بعد لکھی ہے کہ اس میں دیگر کتب فقہ سے مخالفت لازم نہیں آتی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس عبارت میں ناسخین یا مطابع کی غلطی ہو اس کا قرینہ یہ ہے۔

کہ میرے پاس شرح وقایہ کا ایک فارسی ترجمہ ہے جو مولانا عبدالحق سرہندی نے ۱۰۸۶ھ میں زمانہ حضرت سلطان محمد اورنگ شاہ عالمگیر علیہ الرحمۃ میں کیا ہے اور مطبع مرتضوی دہلی میں سن۱۲۸۳ء میں طبع ہوا ہے۔ اس میں جب اس مقام کو دیکھا گیا تو مترجم ان الفاظ میں ترجمہ کرتے ہیں:

بعد از ثنا تعوذ گوید بداں کہ تعوذ تابع قرأت است نہ تابع ثناء۔ پس مسبوق پیش از قرأت خود تعوذ بخواند و موتم را چوں قرأت نیست تعوذ نہ خواند۔ (ص۳۰)

لہذا اس ترجمہ میں شرح وقایہ کے لفظ "لا یثنی" کا ترجمہ ہی نہیں کیا۔ بالجملہ زید کا شرح وقایہ سے استدلال کرنا غلط ثابت ہوا۔

اسی طرح مفتاح الجنۃ سے اسکا استناد ہے۔

اولا: زید کا مفتاح الجنۃ کا مذہب کی ان مشہور ومعتمد ومستند کتابوں کے مقابلہ میں پیش کرنا ہی سخت جہالت ہے۔

ثانیا: اگر بالفرض مفتاح الجنۃ میں یہ مسئلہ زید کے قول کے موافق بھی ہے تو کیا مفتاح الجنۃ ان مذہب کی کتابوں کی تمام تصریحات کو نا قابل عمل اور غیر معتبر اور غلط قرار دیدے گی۔

ثالثا: میں نے مفتاح الجنۃ جو مولوی شاہ کرامت علی صاحب جونپوری کی تصنیف ہے اور ۱۳۰۶ھ میں مطبع نامی لکھنو میں چھپی ہے، اس کے چار مقام دیکھے لیکن مجھے اس میں مسبوق کے ثنا پڑھنے کی ممانعت کسی میں نظر نہ آئی۔ بلکہ اس میں ایک مستقل باب احکام مسبوق میں ملا جس میں وہ صاف تحریر فرماتے ہیں۔

جو شخص کہ امام کے ساتھ آخر نماز میں ملے یعنی اس کے اوپر کی نماز جاوے تو اس کو مسبوق کہتے ہیں اور مسبوق کا مسئلہ اسطرح پر ہے کہ مثلا ایک شخص فجر کی نماز میں امام کو دوسری رکعت میں پاوے تو ثنا اور تعوذ اور تسمیہ کہے۔ (ص ۵۷)

اسی کتاب کے یہ آخری الفاظ۔ تو ثنا اور تعوذ اور تسمیہ کہے۔ اگر اس سے وقت شروع مراد کیا جائے تو یہ خلاف تصریحات کتب فقہ قرار پاتا ہے کہ مسبوق کا بوقت شروع تعوذ وتسمیہ پڑھنا اب تک کسی فقہ کی کتاب میں نظر سے نہیں گزرا۔ ثنا کے متعلق تو اتنا کتب فقہ میں ہے کہ مسبوق سری نماز میں ثنا پڑھ سکتا ہے لیکن اس میں بھی اگر امام کو دوسرے سجدے میں یا قعدہ میں پایا تو بہتر یہ ہے کہ بغیر ثنا پڑھے شامل ہو جائے۔ اور رکوع اور پہلے سجدے میں بھی اگر گمان غالب یہ ہے کہ ثنا پڑھنے میں اس امام کے ساتھ شرکت نہ ہو سکے گی جب ثنا نہ پڑھے۔

الحاصل شروع میں ثنا کے متعلق بھی مطلقا مسبوق کو اجازت نہیں ملی تو پھر تینوں ثنا اور تعوذ اور تسمیہ کا شروع میں مراد لینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟۔ تو لا محالہ اس عبارت مفتاح الجنۃ کی یہ مراد لینا ہے کہ جب مسبوق اپنی فوت شدہ رکعات پڑھنے کیلئے کھڑا ہوا تو ثنا اور تعوذ اور تسمیہ کہے لہذا اب زید آنکھیں کھول کر دیکھے کہ مفتاح الجنۃ سے بھی مسبوق کیلئے ثنا پڑھنے کا حکم ثابت ہوا۔ تو زید کا مفتاح الجنۃ کو سند میں لانا بھی غلط ہوا۔

اب باقی رہا زید کا بہشتی زیور کو اپنی سند میں پیش کرنا تو بہشتی زیور بھی کوئی ایسی کتاب ہے جسکو سند میں پیش کیا جا سکے۔ کہ کہیں اس میں کہانیاں، غیر معتبر قصے، کہیں صابن بنانے، کھانا پکانے کی ترکیبیں

۔ اور کہیں رنگنے اور پارسل وغیرہ ڈاک خانہ کے طریقے۔ کہیں امراض کے علاج ہیں تو کہیں مخصوص شکایات کے شرمناک وحیا سوز نسخے۔ کہیں مسلمان کو مشرک وبدعتی بتانے کے باطل عقائد ہیں تو کہیں مرجوح اور غیر مفتی بہ مسائل۔ تو ہر ذی عقل کے نزدیک تو ایسی کتاب قابل سند نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر زید اس بنا پر پیش کرتا ہے کہ وہ اس کے حکیم الامت تھانوی صاحب کی مصنفہ ہے، اس کے ایک ایک حرف ایک ایک لفظ پر ایمان ہے کہ اس کے خلاف آیات قرآنی۔ اور احادیث نبوی آ جائیں تو وہ سب قابل انکار ہیں۔ تو پھر ایسے شخص کی کتب فقہ اور تصریحات فقہا کیا تسکین کر سکتی ہیں۔

لہذا اب ایسی الٹی کھوپڑی کیلئے انہیں بہشتی زیور والے حکیم الامت تھانوی کے فتاوے اشرفیہ سے تین زبردست اور عظیم الشان پہاڑیاں لاتے ہیں۔ زید بگوش ہوش سنے۔ امداد الفتاوے معروف بہ فتاوے اشرفیہ مطبوعہ مجتبائی دہلی۔ ۱۳۲۹ھ۔

سوال، جو شخص فرض ظہر یا عصر کی چوتھی رکعت میں شریک ہوا وہ تین رکعت باقی کس طور سے ادا کرے، کس رکعت کے بعد جلسہ کرے اور کن رکعتوں میں ختم سورت کرے۔ کئے رکعت بدون سورت کے پڑھے؟۔ اور جو شخص تیسری رکعت میں شریک ہوا وہ دو رکعت باقی کس طور سے ادا کرے؟۔ جو مغرب کی تیسری رکعت میں امام کیساتھ شریک ہوا وہ اپنی دو رکعت باقی کس طور سے ادا کرے؟۔ جلسہ اور ختم سورت کن رکعت میں کرے فقط۔

الجواب۔ جسکی کوئی رکعت امام کے ساتھ فوت ہو گئی ہو اس کو مسبوق کہتے ہیں اس کی باقی نماز حق قرأت میں اول ہوتی ہے اور حق تشہد میں آخر۔

یقضي اول صلوة في حق قرأة وآخرها في حق تشهد۔ (درمختار)

پس جو شخص ظہر یا عصر میں چوتھی رکعت میں شریک ہوا۔ بعد فراغ امام کے کھڑا ہو کر ثنا اور تعوذ پڑھکر فاتحہ وسورت پڑھے۔ اور یہ رکعت پوری کر کے قعدہ کرے پھر کھڑا ہو کر وہ رکعت بھی فاتحہ وسورت سے پڑھکر پچھلی رکعت فقط فاتحہ سے پڑھکر نماز تمام کرے۔ اور جو تیسری میں شریک ہوا وہ دونوں رکعتیں فاتحہ وسورت سے پڑھے اور ان دونوں کے بیچ میں جلسہ نہ کرے۔ دونوں کے بعد قعدہ اخیرہ کر کے فارغ ہو۔ جو مغرب کی تیسری میں شریک ہوا وہ دونوں میں فاتحہ وسورت پڑھے اور ہر رکعت پر بیٹھے۔ فقط

واللہ اعلم۔ از فتاوے اشرفیہ حصہ اول ص ۲۲۔

سوال۔ جس میں پانچ سوالات اور ہیں اور چھٹا سوال بالکل یہی ہے۔ صرف اتنے الفاظ کا تغیر

ہے (کئے رکعت کے بعد جلسہ کرے) یعنی بجائے کس کے کئے ہے، کریں کے کرے ہے۔ ختم سورت کی جگہ ضم سورت ہے، اور بجائے اس کے کہ پہلے سوال کو فقط پر ختم کردیا۔ اس میں اتنی عبارت اور زائد کی جواب بسند کتب تحریر ہو۔ بینوا عنداللہ توجروا۔

معلوم ہوتا ہے کہ فتاوے کے صفحات زائد کرنے کیلئے ایک سوال کو بار بار لکھا گیا ہے اور فرق کیلئے اسپر پانچ سوالوں کا اور اضافہ کردیا گیا ہے تاکہ پہلے سے ممتاز ہوجائے۔ یا اسی سائل نے بعینہ اسی سوال کو کسی شبہ کے بنا پر پھر انہیں الفاظ مین دریافت کیا ہے۔ یا کس دوسرے سائل نے کسی شک کی بنا پر اسی سوال کو پھر نقل کردیا ہے ورنہ کسی ناواقف سائل نے بالکل سوال کی وہی شکل وہی الفاظ وہی ترتیب کسطرح لکھی۔ اب جو چند الفاظ کا فرق ہے وہ کتابت میں بھی ہوجاتا ہے۔ اب جواب کا حال دیکھئے۔

الجواب۔ اس جواب اور پہلے جواب میں بالکل فرق نہیں۔ ایک دو جگہ تو اتنا معمولی فرق ہے کہ اس جواب میں لفظ جو زائد ہے اس میں نہیں ہے۔ اور اس میں آخر میں لفظ فقط ہے۔ اس میں ہے البتہ شروع میں ایک یہ فرق ہے کہ جسکی کوئی رکعت امام کے ساتھ فوت ہوگئی ہو اس کو مسبوق کہتے ہیں یہ عبارت تو پہلے جواب کی ہے، اس جواب میں بجائے کوئی کے ایک دو ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ بالکل پہلے جواب ہی کو نقل کردیا ہے اور اسی طرح اسی فتاوے کا حجم مکررات سے بڑھایا گیا ہے۔ یہ ہے اس حکیم الامت کی قابلیت کا ایک نمونہ۔ پھر اس جواب میں ایک یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس میں مسبوق کی تعریف اب ان الفاظ میں ہوگئی جسکی ایک دو رکعت امام کے ساتھ فوت ہوگئی ہو اس کو مسبوق کہتے ہیں۔ تو اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ جسکی تین رکعتیں فوت ہوگئی ہوں یا چار رکعتیں فوت ہوگئی ہوں اور وہ قعدہ اخیرہ میں شریک ہوا ہے۔ وہ ان کے نزدیک مسبوق نہیں تو نہ معلوم اس کو یہ کیا کہتے ہیں۔ باوجودیکہ مسبوق کی تعریف اسی درمختار میں ہے جسکی انہوں نے عبارت اسی جواب میں نقل کی ہے۔

بالجملہ اس جواب میں بھی انہوں نے مسبوق کو ثنا اور تعوذ کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے کہ بعد فراغ امام کے کھڑا ہوکر ثنا و تعوذ پڑھکر فاتحہ و سورت پڑھے۔ یہ سوال و جواب اسی فتاوے امدادیہ معروف بہ فتاوے اشرفیہ کے ص ۱۰۷/ اور ص۔ ۱۰۸ پر ہے۔

سوال۔ مسبوق رکعات جہریہ و خفیہ میں ثنا و تعوذ و تسمیہ تینوں پڑھے یا نہیں؟۔ اور جب بعد فراغت کے اپنی بقیہ رکعتیں ادا کرنے کے لئے کھڑا ہو تو اسوقت ثنا و تعوذ و تسمیہ تینوں پڑھے یا صرف تعوذ و تسمیہ پر قناعت کرے؟۔ جو کچھ فرق اس مسئلہ کے متعلق رکعات جہریہ و سریہ میں ہو مطلع فرمائیگا۔

الجواب۔ فی الدر المختار قبل باب الاستحلاف المسبوق منفرد حتی یثنی ویتعوذ ویقرأ وان قرأ مع الامام بعدم الاعتداد بها لکراهتها مفتاح السعادة فیما یقضیه اه مختصرا۔

اس عبارت سے دو امر مستفاد ہوئے ایک یہ کہ مسبوق امام کے ساتھ ثنا و تعوذ و تسمیہ نہ پڑھے۔ دوسرے یہ کہ بعد فراغ امام کے جب اپنی بقیہ نماز پڑھنے کھڑا ہو سب چیزیں اور قرات پڑھے اور جہری وسری اس حکم میں دونوں برابر ہیں۔ لا طلاق الدلیل واللہ تعالی اعلم۔ ۷ ا ذیقعدہ ۱۳۲۳ھ۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ان تینوں جوابوں میں انہیں بہشتی زیور کے مصنف تھانوی نے مسبوق کے لئے صاف لکھدیا کہ وہ بعد فراغ امام کے کھڑا ہوکر ثنا و تعوذ پڑھکر فاتحہ و سورت پڑھے۔ اسی طرح تیسرے جواب میں صاف کہا کہ وہ بعد فراغ نماز امام کے جب اپنی بقیہ نماز پڑھنے کھڑا ہو سب چیزیں اور قرات پڑھے۔ سب چیزوں سے مراد ثنا و تعوذ و تسمیہ ہے کہ انھوں نے خود انکا ذکر کیا اور سوال ہی ان کے متعلق ہے، تو اب زید بتائے کہ وہ اس مسبوق کے مسئلہ میں بہشتی زیور کو مانیگا یا فتاوے اشرفیہ کو۔ پھر یہ بھی بتائے کہ ان دونوں کتابوں میں سے کون سچی ہے کون جھوٹی اور کون حق پر ہے اور کون باطل اور کس پر عمل کیا جائیگا اور کس کو نا قابل عمل ٹھرایا جائیگا؟۔

افسوس جس تھانوی کی محبت میں قرآن عظیم سے منہ موڑا۔ احادیث رسول کریم کو چھوڑا۔ سلف وخلف کی کتابوں سے تعلق توڑا۔ اسی تھانوی نے زید کی عزت خاک میں ملادی۔ تمام حجت و بحث کی عمارت گرادی۔ مخالف کی بات بنادی۔ موافق کے منہ پر مہر سکوت لگادی۔ بحمداللہ اس مسئلہ پر نہایت کافی بحث ہوگئی اور حقانیت آفتاب کی طرح روشن ہوگئی جس پر اب مخالف کو مجال سخن و جائے دمزدن باقی نہیں۔ مولی تعالی مخالف کو قبول حق کی توفیق دے واللہ تعالے اعلم بالصواب۔

اور مسبوق بعد فراغ امام جب اپنی باقی نماز پڑھنے کیلئے کھڑا ہو تو اگر وہ سری نماز ہے تو وہ قرات آہستہ پڑھے اور جہری نمازوں میں مختار ہے کہ چاہے قرأت آہستہ پڑھے یا جہر کے ساتھ۔

لان المسبوق منفرد فی حق ما بقی والمنفرد ان قضی السریة یخافت وان قضی الجهریة خیر فکذلك المسبوق هذا مستفاد من الطحطاوی ورد المختار وغیرهما۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۸۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ
مسجد کے متصل برآمدہ ہے اور درمیان کی دیوار کی موٹائی ایک گز یا اس سے کم وبیش ہو اور اس میں صرف دو کھڑکیاں ہوں دروازہ یا در کچھ نہ ہوں تو اس برآمدہ میں امام مسجد کی اقتدا کرے تو یہ اقتدا صحیح ہو سکتی ہے باوجود کہ یہ مقتدی مسجد کے اندر مقتدیوں سے جدا ہیں۔ مسجد کے اندر کی صف سے ان کا اتصال نہیں ہے۔ اور جب اتصال صفوف نہیں ہے تو کیا ان دونوں کھڑکیوں کا کھلا ہونا ان کی اقتدا کو درست کرے گا یا نہیں؟۔ امام مسجد کے اندر ہے اور اس کے ساتھ مسجد میں مقتدی ہیں اور کچھ مقتدی اس برآمدہ میں ہیں۔ بینوا توجروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اتصال صفوف اقتدا کے لئے ضروری ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ مقتدی کو امام کے انتقالات کا علم سن کر یا دیکھ کر ہو جائے۔ مراقی الفلاح میں ہے:

من صلی علی سطح بیتہ المتصل با لمسجد او فی منزلہ بجنب المسجد وبینہ وبین المسجد حائط مقتدیا باما م فی المسجد وھو یسمع التکبیر من الامام او من المکبر تجوز صلا تہ۔ (طحطاوی مصری ص ۱۷۰)

جس نے اپنے گھر کی چھت پہ نماز پڑھی جو مسجد سے متصل ہے یا اپنے گھر میں جو مسجد کے پہلو میں ہے اور اس کے اور مسجد کے درمیان دیوار ہے اور وہ مسجد کے امام کی اقتدا کر رہا ہے اور وہ امام یا مکبر کی تکبیر سنتا ہے تو اس کی نماز جائز ہے اور اقتدا صحیح ہے۔

فتاوے عالمگیری میں ہے:

یصح ان کان الحائط صغیرا لا یمنع او کبیر اولہ ثقب لا یمنع الوصول و کذا اذا کان الثقب صغیر ایمنع الوصول الیہ لکن لا یشتبہ علیہ حال الاما م سما عا او رویۃ ھو الصحیح۔ (ص۴۶ ج۱)

اور اقتدا صحیح ہے اگر دیوار چھوٹی ہو اور مانع نہ ہو۔ اور اگر بڑی ہو اور اس میں ایسا سوراخ ہو جو آواز پہنچنے کیلئے مانع نہو اور اسی طرح جب سوراخ چھوٹا ہو اور آواز پہنچنے کیلئے مانع ہو لیکن اس پر امام کا حال

سنکر یا دیکھ کر مشتبہ نہ ہو یہی صحیح قول ہے۔

ان عبارات سے واضح ہو گیا کہ صورت مسئولہ میں جب برآمدہ مسجد سے متصل ہے اور جو دیوار ہے اسکا ایسا عرض نہیں جو اتصال صفوف کو مانع ہو پھر اس دیوار میں بھی کھڑکیاں ہیں جن سے امام کے انتقالات کا علم بلا اشتباہ ہو جائیگا تو برآمدہ کے مقتدیوں کو امام مسجد کی اقتدا کرنا صحیح ہے اور اتصال صفوف حاصل ہے کہ ان کھڑکیوں سے کم از کم امام کی آواز ان برآمدہ کے مقتدیوں کو ضرور پہنچے گی۔ لہذا یہ مقتدی مسجد کے اندر کے مقتدیوں سے جدا نہیں ہوئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۸۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ ذیل میں کہ
زید مولوی اشرفعلی تھانوی کا مرید اور خلیفہ ہے اور دیوبندی عقائد بھی رکھتا ہے مگر کبھی کبھی میلاد شریف کی محفلوں میں شرکت کر کے سلام بھی پڑھ لیتا ہے لیکن ضروری نہیں سمجھتا۔ اور کھانا وغیرہ پر فاتحہ بھی کر لیتا ہے۔ لہذا زید کے پیچھے اہل سنت وجماعت کی نماز ہوگی یا نہیں؟ اور سنیوں کو اس کے پیچھے جان بوجھ کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟ صاف صاف بیان کیجئے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جب زید مولوی اشرفعلی تھانوی کا مرید وخلیفہ ہے تو وہ انکو کم از کم مسلمان اور عالم پیشوا تو اعتقاد کرتا ہی ہوگا اور انکے عقائد واحکام کو صحیح جانتا ہوگا اور انکی کتاب حفظ الایمان کے کفری قول کو کفر نہ سمجھتا ہوگا۔ تو زید کے بدمذہب وگمراہ ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے چہ جائے کہ وہ دیوبندی عقائد بھی رکھتا ہے۔ لہذا زید کے پیچھے اہل سنت وجماعت کی نماز ہرگز نہ ہوگی اور ہمارے برادران اہلسنت ان کے پیچھے نماز نہ پڑھیں۔

کبیری میں ہے:

وعن ابی حنیفۃ وابی یوسف رحمہما اللہ تعالی ان الصلوۃ خلف اہل الاھواء لاتجوز۔

اور ظاہر ہے کہ زید تفصیل بالا کی بنا پر اہل اہواء سے ہے تو اس کی نماز حقیقۃ نماز نہیں اور وہ جماعت دراصل جماعت نہیں۔ اب باقی رہا زید کا میلاد شریف کی محفل میں شریک ہونا اور سلام پڑھنا اور فاتحہ وغیرہ اعمال کرلینا تو ان پر سنیت کا دارومدار نہیں، دیوبندی اس کو کسی اعتقاد کی بنا پر نہیں کرتے ہیں بلکہ عوام اہل سنت کو اپنی دام تزویر میں پھانسنے کے لئے کرتے ہیں۔ تو ان کی ان باتوں پر انہیں سنی سمجھ لینا ہمارے عوام سنی بھائیوں کی سادہ لوحی ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

سوال (۲۹۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ اقامت سے پہلے یا اقامت شروع ہوتے ہی مقتدیوں کو کھڑا ہوجانا چاہئے یا حی علی الفلاح کے وقت؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اقامت سے پہلے یا بوقت شروع مقتدیوں کا کھڑا ہوجانا مکروہ ہے۔ بلکہ انہیں حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا چاہیے۔

عالمگیری میں ہے: اذا دخل الرجل عند الاقامة یکره له الانتظار قائما ولکن یقعد ثم یقوم اذا بلغ المؤذن قوله حی علی الفلاح کذا فی المضمرات ان کان المؤذن غیر الامام وکان القوم مع الامام فی المسجد فانه یقوم الامام والقوم اذا قال المؤذن حی علی الفلاح عند علمائنا الثلثة وهو صحیح والله تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۹۱_۲۹۲_۲۹۳_۲۹۴)

کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام ومفتیان شرع عظام دامت برکاتہم النوریہ مسائل ہذا میں کہ

(۱) لاؤڈ اسپیکر پر نماز درست بلاکراہت جائز ہوتی ہے یانہیں۔ اگر نہیں تو صحیح وجائز نہ ہونے کی

کیا سبب ہے۔ کیا کوئی صورت ہے کہ جس سے نماز لاؤڈ اسپیکر پر صحیح ودرست بلاکراہت جائز ہوجائے۔ نیز اذان واقامت لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنا کیا جائز ہے یانہیں؟۔

(۲) گراموفون سے جو آواز نکلتی ہے وہ عین آواز متکلم ہے یانہیں، لاؤڈ اسپیکر سے جو آواز نکلتی ہے وہ عین آواز متکلم ہے یانہیں؟۔

(۳) لاؤڈ اسپیکر پر نماز ہوتو مقتدیوں کی نماز ہوگی یانہیں۔ اگر نہیں ہوگی تو کس بنا پر مفصل ومدلل بیان کیجئے؟۔

(۴) لاؤڈ اسپیکر پر نماز ہوتو امام کی نماز ہوگی یانہیں اگر نہیں ہوگی تو کس بنا پر مفصل مدلل بالتفصیل تحریر فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) امام ومقتدی کے درمیان تکبیرات وغیرہ کی آواز پہنچانے کے لئے لاؤڈ اسپیکر ایک واسطہ ہے اور ظاہر ہے کہ وہ انکا غیر ہے، انکی نماز میں شریک نہیں۔ تو مقتدی کی نماز کی بنا ایسی چیز پر لازم ہے جو انکا غیر ہے اور خود نمازی نہیں۔ لہذا مقتدی نے قول غیر پر عمل کیا جو مفسد صلوۃ ہے۔

ردالمحتار میں ہے: اخذ المصلی غیر الامام بفتح من فتح علیه تفسد ایضا کذا فی البحر عن الخلاصة او اخذ الامام بفتح من لیس فی صلاة۔ تو لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر جو لوگ اقتدا میں ارکان نماز ادا کریں گے انکی نماز نہ ہوگی۔

اب باقی رہی یہ تحقیق کی لاؤڈ اسپیکر اور گراموفون میں جو آواز مسموع ہوتی ہے وہ عین آواز متکلم اور قرع اول ہی ہے۔ یانہیں۔ تو اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ ان سے عین آواز متکلم بھی سنی جاتی ہے تو اس سے تو کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آواز متکلم پر برقی طاقت کی آواز کا شمول اصل آواز متکلم سے کئی گنا زائد ہے۔ اسکا ثبوت ظاہر ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز اس قدر دور تک پہنچ جاتی ہے کہ اصل آواز متکلم اتنی دور تک ہرگز ہرگز نہیں پہنچ سکتی۔ اسی غلبہ کی بنا پر اس آواز کی نسبت لاؤڈ اسپیکر یا گراموفون کے طرف کردی جاتی ہے۔ اور ہر سننے والا یہ بے تکلف کہتا ہے کہ یہ لاؤڈ اسپیکر یا گراموفون کی آواز ہے اور یہ آلات اس آواز کو اپنی کیفیات کے ساتھ اس قدر مکیف کردیتے ہیں کہ کبھی اصل متکلم کی آواز کا امتیاز مٹ جاتا ہے اور پہچان میں نہیں آتا کہ کون بول رہا ہے۔ تو ان آلات کے تصرفات کا انکار نہیں کیا

جاسکتا۔لہذا یہ ماننا پڑے گا کہ ان آلات سے عین آواز متکلم میں زبردست اضافہ اور بین فرق پیدا ہو گیا تو اس آواز پر نہ سجدہ تلاوت واجب، نہ اقتدا صحیح۔اور اب استعمال کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان آلات میں عین آواز متکلم اپنی اصلیت پر باقی نہیں رہتی اور قرع اول باقی نہیں رہتا بلکہ آواز بازگشت ہو جاتی ہے تو اس بنا پر اقتدا ہی صحیح نہیں ہے۔

رہی امام کی نماز تو اس کے لئے یہ وجہ فساد تو نہیں ہے مگر وہ بھی کراہت سے خالی نہیں، اس لئے کہ آلہ سے نماز کے شغل خاص میں خلل پیدا ہوتا ہے، جو کراہت کو مستلزم ہے۔رہا اذان و اقامت کا حکم تو اس میں اگرچہ نماز کے سے احکام نہیں لیکن ان میں اس آلہ کا استعمال خلاف اولی ضرور قرار پائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۹۵-۲۹۶-۲۹۷)

کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام و مفتیان شرع عظام دامت برکاتہم النور یہ مسائل ہذا میں

(۱) آج ہی یہاں کی جامع مسجد میں پیش امام صاحب جو یہاں کے خطیب بھی ہیں تکرار ہوتے ہوئے جھگڑا ہو گیا۔وہ اس بحث پر کہ جماعت فرض سے پڑھا ہوا شخص ہی جماعت سے نماز وتر پڑھ سکتا ہے۔دوسرا شخص جماعت سے وتر نہیں پڑھ سکتا، اس کا جماعت سے وتر پڑھنا جائز نہیں۔یہ کہاں تک صحیح ہے۔اصل مسئلہ کا حل کیا ہے؟۔

(۲) ہمیشہ کی طرح رمضان میں حیدرآباد سے رائے پور جامع مسجد کو تراویح پڑھانے اختر نجمی صاحب آئے ہیں اور جامع مسجد کے پیش امام جو خطیب بھی ہیں، یہ اعتراض پیش کر رہے ہیں، کہ جو پیش امام داڑھی صاف کرائے اس کے پیچھے اس کی امامت جائز نہیں۔نماز پڑھنا نہیں چاہئے، یہ کیا صحیح ہے۔ اصل مسئلہ کیا ہے؟۔

(۳) یہ پیش امام جامع مسجد جو خطیب بھی ہیں، آجکل جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں، اور ابوالاعلی مودودی کا لٹریچر ہر وقت زیر مطالعہ رکھتے ہیں، چونکہ یہ رائے پور کے خطیب ہیں، کیا انہیں سنیوں کو بحثیت خطیب کے اس طرح دوسری جماعتوں سے رابطہ پیدا کر لینا جائز ہے۔اور کیا انکی خطابت و امامت جائز ہے؟۔کیا انہیں سنی اپنا امام بنا سکتے ہیں۔یہاں کے دیگر سنی بھائی امامت سے ہٹا دینا چاہتے

ہیں۔کیا ان کیساتھ ایسا سلوک کرنا جائز ہوگا۔اور پھر خطیب صاحب کی کئی ایکڑ زمین بھی انعام کی ہے اس کا کیا کریں۔آیا اس حکومت کے قبضہ میں دیدیں، نتیجہ میں کاروائی یہی صورت اختیار کرے گی۔خطیب کا بیان یہ ہے کہ درگاہوں پر نہ جاؤ۔نذر و نیاز نہ کرو۔اور پھر یہ صاف کہتے ہیں، کہ زندے مردوں کو فائدہ پہونچاؤ۔مردے زندہ کو کیا فائدہ پہونچائیں گے۔کیا ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے؟۔

یہ میں اکیلا معلوم کرنا نہیں چاہتا ہوں۔بلکہ میرے تمام اہل محلہ بھی اس کے خواہش مند ہیں ۔میرے محلہ کی مسجد میں اس پر بہت قیاس ہوا پھر میں نے انکو اطلاع لکھ کر جواب کا انتظار کرنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔حالات دن بدن بگڑتے جا رہے ہیں، اس لئے اپنے معلوماتی کوئیں سے کچھ فیض ہمیں بھی پہنچادیں۔بیک وقت میں نے کافی سوالات لکھ دیا۔مگر میں مجبور تھا، قبلہ محترم، کچھ واقعات ہی ایسے پیش آگئے۔تو آپ سے معلوم کر لینا ہی مناسب سمجھا، اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

(۱) جس نے فرض عشاء جماعت سے نہ پڑھی ہو وہ وتر بھی جماعت سے نہ پڑھے۔

ردالمحتار میں ہے۔اذا لم یصل الفرض معه لا یتبعه فی الوتر۔اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ جس نے جماعت سے فرض نہ پڑھے ہوں وہ جماعت سے وتر نہیں پڑھ سکتا۔جو اسکے خلاف کہتا ہے وہ اس عبارت شامی کا جواب دے۔اور اپنے دعوے پر بھی وہ ایسی عبارت پیش کرے ساری علمی قابلیت کی پول کھل جائے گی۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۲) جو شخص یکمشت سے کم داڑھی رکھتا ہو، یا بالکل صاف ہی کرا دیتا ہو، وہ بلاشبہ فاسق ہے۔ اس کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے۔اور اس کے پیچھے جو نماز پڑھی جائے گی، وہ واجب الاعادہ ہوگی، لہذا خطیب کا یہ اعتراض تو صحیح ہے، کہ اسکے پیچھے نماز نہ پڑھنی چاہیے۔واللہ تعالیٰ اعلم

(۳) جب یہ امام و خطیب جامع مسجد مودودی جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔اور مودودی کے لٹریچر کو صحیح جانتا ہے، اور عقائد و اعمال کی تصدیق کرتا ہے، اور اسکے بالمقابل عقائد مسائل اہل سنت کو غلط و باطل اور بدعت و شرک کہتا ہے، اور اسکے قول کے بموجب ساری امت کو بدعتی و مشرک جانتا ہے، تو اس امام کو جامع مسجد کی امامت سے علیحدہ کر دینا ضروری ہے۔اہل سنت اس کے پیچھے ہرگز ہرگز نماز نہ

پڑھیں، کہ یہ امام گمراہ ہوگیا اور گمراہوں کے پیچھے نماز کے جائز ہونے کا قول خود ہمارے امام اعظم علیہ الرحمۃ کا ہے۔

کبیری میں ہے۔ روی محمد عن ابی حنیفة و ابی یوسف ان الصلوة خلف اهل الهواء لا تجوز۔ لہذا اہل اسلام اس امام کو جامع مسجد کی امامت سے علیحدہ کر دیں کہ اس کے پیچھے کسی کی نماز نہیں ہوتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۹۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ
زید کا کہنا ہے کہ نماز پڑھنے میں امام سب کچھ پڑھتا ہے۔ مقتدی کو بھی سب پڑھنا چاہیے، اور اگر امام کے اوپر بات ہے تو مقتدی کو کچھ بھی نہ پڑھنا چاہیے، التحیات تسبیح رکوع وسجود بھی نہ پڑھنا چاہیے کہ امام تو سب پڑھتے ہیں۔　　المستفتی حبیب اللہ، مظفر پور

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

عقلاً تو مقتدی کو نماز میں سب کچھ پڑھنا چاہیے تھا کہ وہ اپنے فریضہ کو ادا کر رہا ہے لیکن قرأت کے متعلق چونکہ حدیث شریف میں وارد ہوگیا۔ من كان له امام فقرأة الامام له قرأة۔ یعنی جس کا امام ہو تو امام کا قرأت کرنا اسی کا قرأت کرنا ہے تو اس حدیث کے حکم سے مقتدی سے صرف قرأت کو معاف کر دیا گیا۔ باقی رہے اوراذکار، ثنا، تسبیحات، تشہد چونکہ ان کے لئے کوئی شارع علیہ السلام کا ایسا حکم وارد نہیں، تو مقتدی ان سب کو پڑھے گا جن میں امام کا پڑھنا مقتدی کے لئے کافی ہوسکتا ہے، فقط۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۹۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ
بڑے مقامات پر جیسے دہلی، اجمیر شریف، وغیرہ، عیدین، عرس وغیرہ کے موقع پر نماز کے لئے لوگ چھتوں پر بھی نماز پڑھتے ہیں۔ کہیں امام سے اونچے کہیں نیچے، کہیں درمیان میں، زیادہ جگہ چھوٹی ہوئی تو لوگوں کی کثرت کی وجہ سے امام کی آواز سنائی نہیں دیتی ہے، تو امام کی حرکت وانتقال کے وقت توپ چھوڑی جاتی ہے، توپ کی آواز پر لوگ رکوع سجدہ وغیرہ کرتے ہیں تو اس صورت سے نماز ہوگی یا نہیں؟ کثرت کی وجہ سے نماز کما حقہ ادا نہیں ہوسکتی ہے۔ مصلی چاروں طرف سے دبا ہوا ہے، بچوں کی طرح نماز میں دھکے لگتے جاتے ہیں، سجدہ بھی گھٹنوں کے قریب ہی ہوتا ہے، ایسی حالت کی نماز ہوگی کہ نہیں۔ اس پر بھی لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو پڑھتے ہیں خدا قبول کرے یا نہ کرے۔ امام کی آواز سنائی دینے کے لئے لاؤڈ اسپیکر استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر استعمال کیا تو نماز ہوگی یا نہیں؟۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

ازدہام کے مواقع پر چھت اور ہر اس جگہ اقتدا کی جا سکتی ہے جہاں تک صفوں کا اتصال ہو، درمیان میں فاصلہ نہ ہو، امام کے انتقالات کا صحیح طور پر علم ہوتا ہو اگر چہ بوجہ کثرت کے سجدہ گھٹنوں کے قریب ہی کرنے پڑتے ہوں۔ اور ہر طرف سے دباؤ پڑتا ہو۔ اور امام کی آواز بھی نہ سنتا ہو، صرف مکبرین کی تکبیروں کی آواز آتی ہو۔ جس پر رکوع سجدہ وغیرہ ادا کرتا ہو۔ چاہے وہ مقام امام کی جگہ سے پست ہو یا بلند ہو۔ تو اس طرح مقتدی کی نماز ہو جائے گی۔ لیکن توپ کی آواز یا لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر رکوع یا سجدہ وغیرہ انتقالات کرنا اور اس کو امام کی اقتدا سمجھنا سخت غلطی ہے، کہ یہ ہر دونوں چیزیں نمازی نہیں، لہذا ان کا امام ومقتدی کی نماز کے درمیان میں آجانا مقتدی کی نماز کے لئے مفسد صلوۃ ہے۔ تو لاؤڈ اسپیکر یا توپ کا نماز کے انتقالات کے لئے شرعاً ناجائز ممنوع ہے۔ ان کی آوازوں پر اقتدا صحیح نہیں۔ اس میں میرا ایک مستقل مبسوط فتوی ہے، جو فتاوی اجملیہ میں موجود ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۰۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ
بوقت جماعت نماز پنجگانہ میں اکثر اشخاص تکبیر کے قدقامت الصلوۃ الفاظ ہونے تک بیٹھے رہتے ہیں۔ شریعت میں یہ امر کیسا ہے؟۔

ح۔م۔اشرفی ۲۵؍اکتوبر

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

نماز پنجگانہ کی جماعتوں کے لئے لوگوں کو صف بنا کر بیٹھ جانا مستحب ہے اور پھر جب مکبر (حی علی الفلاح) پر پہونچے اس وقت سب لوگوں کو کھڑا ہونا چاہئے ابتداء تکبیر سے کھڑا ہو جانا مکروہ ہے جیسا کہ فتاوی عالمگیری وشامی وغیرہا کتب فقہ میں بالتصریح موجود ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

﴿۲۱﴾

باب الامامت

مسئلہ (۳۰۱-۳۰۲-۳۰۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ
(۱) ایک شخص یہ کہتا ہے کہ جو شخص زانی ہو یا اغلام کرتا ہو اور کراتا ہو یا قمار بازی کرتا ہو یا شراب پیتا ہو اس قسم کے تمام لوگوں کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے آیا یہ کہنا اس شخص کا درست ہے یا نہیں جواب مع حوالہ قرآن وحدیث کے ہونا چاہئے۔
(۲) جو شخص ایسا ہو کہ اس کو علم ہے کہ میری عورت کا دوسرے شخص سے تعلق ہے اور اس نے اپنی آنکھ سے اپنی عورت کو زنا کراتے دیکھ لیا ہو اور اس پر بھی اس نے عورت کو طلاق نہ دی اور نماز پڑھانے کے لئے تیار ہو تو ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟۔
(۳) اگر نکاح سے آزاد ہوگئی ہو اس نے طلاق دیدی ہو اور بغیر نکاح اپنی بیوی بنا کر رکھتا ہو تو ایسے شخص کے پیچھے بھی نماز درست ہے یا نہیں۔ بینوا وتوجروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) فاسق معلن۔ زانی۔ مغلم۔ جواری۔ شرابی۔ اور ہر وہ شخص جو کوئی گناہ کبیرہ بالاعلان کرتا ہو اس کو امام بنانا معصیت ہے اور امامت کے لئے پیش کرنا مکروہ تحریمی۔

کبیری میں ہے: لو قدموا فاسقا یاثمون بناءً علی ان کراھۃ تقدیمۃ کراھۃ تحریم لعدم اعتنائہ بامور دینہ وتساھلہ فی اتیان بلوازمہ فلایبعدہ منہ الاخلال ببعض شروط الصلوۃ وفعل ماینافیھا بل ھو الغالب بالنظر الی فسقہ۔ (ص ۴۷۹)

اور مراقی الفلاح میں ہے: کرہ امامۃ الفاسق العالم لعدم اھتمامہ بالدین فتجب اھانتہ شرعا فلایعظم بتقدیمہ للامامۃ۔ (حاشیہ طحطاوی مصری ص ۱۷۶)

طحطاوی میں ہے: ومفادہ کون الکراھۃ فی الفاسق تحریمیۃ۔ (ص ۱۷۶)

جوہرہ نیرہ میں ہے: وتکرہ الصلوۃ خلف شارب الخمر واکل الربا لانہ فاسق ۔
(ص ۸۵)

شامی میں ہے: اما الفاسق فقد عد کراھۃ تقدیمہ بانہ لایھتم لامر دینہ وبان فی تقدیمہ للامامۃ تعظیمہ وقد وجب علیھم اھانتہ شرعا ۔ (مصری ص ۳۹۳)

ان عبارات سے صاف طور پر معلوم ہوگیا کہ فاسق کا امام بنانا گناہ اور اس کا امامت کے لئے پیش کرنا مکروہ تحریمی ہے اور انتہائی درجہ ہے کہ فاسق کے پیچھے نماز مکروہ تنزیہی ہوگی اور ہر نماز جو کراہت سے ادا ہو اس کا اعادہ کرنا چاہئے ۔

مراقی الفلاح میں تجنیس سے ناقل ہیں: کل صلوۃ ادیت مع الکراھۃ فانھا تعاد ۔
(حاشیہ طحطاوی ص ۲۰۱)

طحطاوی میں ہے: اطلق الکراھۃ فعم التحریمۃ والتنزیھۃ ۔ (ص ۲۰۱)

لہذا اب کراہت کو قطع نظر کرتے ہوئے نفس جواز لیکر مسئلہ بیان کرنا فقہ سے ناواقفی کی دلیل ہے اور قلوب عوام سے عظمت شرع کم کرنے کی بری سبیل ہے ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) ایسے شخص کو امام نہیں بنانا چاہئے ۔

لعلۃ نفرۃ الناس عنہ ولکراھتھم وفیہ التقلیل بالجماعۃ ۔

حدیث شریف کا ایسے ہی امام کے متعلق ارشاد ہے:

لایقبل اللہ الصلوۃ من تقدم قوما وھم لہ کارھون ۔ (رواہ ابوداؤد)

اللہ تعالیٰ اس شخص کی نماز قبول نہیں فرماتا جو کسی قوم کا امام بنے اور وہ اس سے کراہیت کرے ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) یہ شخص بھی فاسق ہے اس کا مفصل حکم جواب اول میں مذکور ہوا ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المتوسل بنعال النبی الافضل المدعو بمحمد اجمل بن الشاہ محمد اکمل الحقھما اللہ بحزبہ الاول ناظم المدرسۃ الموسومۃ باجمل العلوم الواقعۃ فی بلدۃ سنبھل ۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۰۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ

زید وبکر عرصہ چھ سال کا ہوا ایک جنازہ میں شریک تھے اس اثناء میں بکر نے سوال کیا کہ اگر کوئی ہندو جو کہ عرصہ دراز تک کسی مسلمان کے یہاں ملازم رہے اور فوت کر جائے تو رسم میت بطریق اہل اسلام ادا کریں گے یا بطریق اہل ہنود زید نے جواباً کہا کہ بطریق اہل ہنود ۔ بکر نے کہا اس کے منہ میں کلمہ کا دم کیا ہوا پانی ڈال کر رسم میت بطریق اہل اسلام ادا ہوگی زید نے اس کے متعلق چند آیات قرآن پیش کیا اور کہا کہ ہرگز رسم میت بطریق اہل اسلام ادا نہ کریں گے ۔ بکر نے کہا کہ میں کلمہ کو مانتا ہوں قرآن کو نہیں مانتا ۔ زید نے کہا کہ تم کافر ہوگئے توبہ کرو بصورت عدم توبہ زید نے سلام وکلام اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا ترک کر دیا کچھ عرصہ بعد لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا اس نے گفتگوئے مذکورہ کا قطعاً انکار کیا اور کہا کہ میں نے ایسا نہیں کہا بلکہ یوں کہا ہے کہ کوئی مسلمان کسی ہندو کے یہاں ملازم رہے اور ارکان اسلام کو تمام وکمال ادا نہ کیا ہو اور فوت کر جائے تو رسم میت کی ادائیگی کا کیا طریقہ ہے بصورت عدم شہادت کے زید نے اس کا بیان حلفی طلب کیا اس نے اس کا بھی انکار کر دیا تو آیا بکر خارج از اسلام ہوگا یا نہیں ۔ بر بنائے مخاصمت ہذا مابین زید وبکر کچھ عرصہ ہوئے ایک متنازعہ ہوا تھا اس میں بکر نے زید کو حرامی کہا اور اس کا اعلان بھی تمام گاؤں میں کر دیا جب اس کی دلیل طلب کی گئی تو اس نے کہا کہ والدہ زید نے بغیر طلاق لئے ہوئے موضع ہذا میں آخر عقد ثانی کر لیا تھا اور یہ زید شوہر ثانی سے ہے اور اپنے قول کی صداقت میں ان شخصوں کا بیان حلفی پیش کیا جن سے زید سے دشمنی تھی زید نے کہا کہ یہ بالکل غلط ہے واقعہ دراصل یہ ہے کہ میری والدہ نے شوہر اول سے طلاق پا کر موضع ہذا میں آ کر عقد ثانی کیا تھا بلکہ بعد طلاق کے بھی وہ تین ماہ وہیں رہی اور شہادت میں والدہ کے ماموں ونانا اور ایک ایک گڈریہ کا بیان حلفی پیش کیا ۔

واضح ہو کے زید وبکر دونوں حافظ ہیں بلکہ زید نابینا اور شوہر اول وثانی دونوں فوت کر چکے ہیں شوہر اول نے جو عقد ثانی کیا تھا وہ عورت اب تک موجود ہے اور اس کا بیان حلفی مطابق زید ہے اور اس کے برادر کے اکثر بیانات اس کے خلاف ہیں تو آیا زید حرامی ہے یا نہیں اور اس کے پیچھے تراویح ودیگر نمازیں پڑھنا کیسا ہے ۔ بینوا توجروا بالکتاب وبالحساب فقط

فقیر حافظ رمضان علی عفی عنہ ڈاکخانہ واسٹیشن بھرواری ضلع الہ آباد

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بلاشک قرآن کریم کی کسی آیت یا کسی کلمہ کا بلکہ کسی حرف کا انکار کفر ہے حضرت قاضی عیاض شفا شریف میں فرماتے ہیں:

جمیع من ینتحل التوحید متفقون ان الجھود بحرف من التنزیل کفر۔

(شرح شفا مصری صفحہ ۵۵۲)

لیکن جب بکر کے اس قول پر نہ کوئی شہادت ہے نہ وہ خود اقرار کرتا ہے تو محض ایک زید کی شہادت کی بنا پر اس کو کافر قرار نہیں دیا جاسکتا اور اس کا بیان حلفی سے انکار کرنا احتمال کفر کو متعین نہیں کرتا کہ بیان حلفی نہ دینے کی اور وجوہ بھی ہوسکتی ہیں لہذا بکر کا خارج از اسلام ہونا ہرگز ثابت نہیں ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

اسی طرح زید جب حرامی ہوگا کہ بکر اس کو شہادت شرعی سے ثابت کرے۔ اور مسئلہ امامت میں بعد ثبوت زید کی امامت مکروہ تنزیہی ہے۔ کہ اس سے افضل کوئی اور امام موجود ہو۔ چنانچہ کبیری میں مبسوط سے ناقل۔

انمایکرہ تقدیم الاعمیٰ اذا کان غیرہ افضل منہ۔

اور جب اس مسجد میں زید سے افضل کوئی دوسرا امام موجود نہ ہوتو وہی اولیٰ ہے چنانچہ عینی میں بدائع سے ناقل ہیں:

اذا کان لا یوازیہ غیرہ فی الفضیلۃ فی مسجدہ فھو اولیٰ وقد استخلف النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ابن ام مکتوم علی المدینۃ (وھو کان اعمیٰ) واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۰۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
اقامت جب پڑھی جائے تو حی علی الفلاح کے بعد کھڑا ہونا سنت ہے یا کہ مستحب اس کا جواب بحوالہ کتب فقہ معہ عبارت مرحمت فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

آج کل اکثر جگہ یہ رواج پڑ گیا ہے کہ بوقت تکبیر سب لوگ کھڑے ہوجاتے ہیں بلکہ بعض جگہ تو یہاں تک نوبت پہونچ گئی کہ جب تک امام مصلی پر کھڑا نہ ہوجائے اس وقت تک تکبیر ہی نہیں کہتے تو یہ بات مکروہ اور خلاف سنت ہے اور تصریحات کتب فقہ اور اقوال فقہاء احناف بلکہ خود قول امام الائمہ سراج الامۃ حضرت امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے خلاف ہے بلکہ عمل صحابہ کرام وحدیث خیر الانام علیہ التحیۃ والسلام کے بھی خلاف ہے مسلمانوں کو چاہئے کہ ایسے غلط فعل اور بلادلیل عمل سے پرہیز کریں مکروہ اور خلاف سنت رواج سے بچیں اور شروع تکبیر سے کھڑے نہ ہوں کتب فقہ میں تو یہاں تک تاکید موجود ہے کہ اگر کوئی شخص ایسے وقت میں مسجد میں آیا کہ تکبیر ہورہی تھی تو وہ فوراً بیٹھ جائے اور جب تکبیر کہنے والا حی علی الفلاح کہے تو یہ شخص کھڑا ہو۔

(۱) چنانچہ فتاوی عالمگیری میں ہے:

اذا دخل الرجل عند الاقامۃ یکرہ لہ الانتظار قائما ولکن یقعد ثم یقوم اذا بلغ المؤذن قولہ حی علی الفلاح۔ کذا فی المضمرات (ص۴۰)

جب کوئی شخص تکبیر کے وقت آئے تو اسے کھڑے ہوکر انتظار کرنا مکروہ ہے بلکہ وہ بیٹھ جائے پھر جب تکبیر کہنے والا حی علی الفلاح پر پہونچے تو کھڑا ہو ایسے ہی مضمرات میں ہے۔

(۲) جامع الرموز میں ہے:

لو دخل المسجد احد عند الاقامۃ یقعد لکراھۃ القیام والانتظار۔ (ج۱ص۷۲)

اگر کوئی شخص تکبیر کے وقت مسجد میں داخل ہو تو قیام اور انتظار کے مکروہ ہونے کی وجہ سے بیٹھ جائے۔

(۳) ردالمحتار میں ہے: یکرہ لہ الانتظار قائما ولکن یقعد ثم یقوم اذا بلغ المؤذن حی علی الفلاح۔ (ردالمحتار ص۴۸۰)

(تکبیر کے وقت آنے والے کو) کھڑے ہوکر انتظار کرنا مکروہ ہے بلکہ وہ بیٹھ جائے پھر تکبیر کہنے والا حی علی الفلاح پر پہونچے تو وہ کھڑا ہو۔

(۴) طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

واذا اخذ المؤذن فی الاقامۃ ودخل رجل المسجد فانہ یقعد ولا ینتظر قائما فانہ مکروہ کما فی المضمرات و قھستانی ویفھم منہ کراھۃ القیام ابتداء الاقامۃ والناس عنہ غافلون ۔ (طحطاوی مصری ص۱۶۱)

جب تکبیر کہنے والا تکبیر شروع کرے اور کوئی شخص مسجد میں آئے تو وہ بیٹھ جائے اور کھڑے ہوکر انتظار نہ کرے کہ یہ مکروہ ہے جیسا کہ مضمرات اور قہستانی میں ہے اور اس سے شروع تکبیر سے کھڑے ہونے کی کراہت معلوم ہوئی اور لوگ اس سے غافل ہیں۔

ان عبارات سے ثابت ہوا کہ جب تکبیر میں آنے والے کو تھوڑی دیر کے لئے کھڑے ہوکر انتظار کرنا مکروہ ہے تو شروع تکبیر سے کھڑے ہوکر انتظار کرنا تو بدرجہ اولی مکروہ ہوا۔ اب باقی رہا یہ امر کہ مقتدیوں کو تکبیر میں کس وقت کھڑا ہونا چاہئے اس کی چند صورتیں فقہاء نے لکھی ہیں جنہیں بہ تفصیل ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) امام محراب کے قریب نہیں ہے اور تکبیر ہو رہی تھی کہ مسجد میں صفوں کے آگے سے داخل ہوا تو سب مقتدی امام کو دیکھتے ہی کھڑے ہوجائیں۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، دارمی، طبرانی، وغیرہا کتب احادیث میں یہ حدیث مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا:

(۱) (حدیث) اذا اقیمت الصلاۃ فلاتقوموا حتی ترونی ۔ (بخاری شریف ص۸۸)
جب نماز کے لئے تکبیر کہی جائے تو تم کھڑے نہ ہونا یہاں تک کہ تم مجھے دیکھ لینا۔

(۲) درمختار میں ہے: وان دخل من قدام قاموا حین یقع بصرھم علیہ۔
اگر امام صفوں کے آگے سے آئے تو اسے مقتدی جس وقت دیکھیں کھڑے ہوجائیں۔

(۳) طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے: وان دخل من قدامھم قاموا حین رأوہ ۔ (طحطاوی ص۱۶۱)
اگر امام صفوں کے سامنے سے داخل ہو تو مقتدی اسے دیکھتے ہی کھڑے ہوجائیں۔

(۴) عینی شرح کنز الدقائق میں ہے: وان دخل من قدام یقومون حین یقع بصرھم علیہ (عینی ص۳۱)
اگر امام سامنے سے آئے تو مقتدیوں کی اس پر جب نگاہ پڑے کھڑے ہوجائیں۔

(۵) بدائع میں ہے: ان دخل الامام من قدام الصفوف فکما رواہ قاموا لانہ کما

دخل المسجد قام مقام الامامۃ۔ (بدائع ص۲۰۰)
اگر امام صفوں کے آگے سے آیا تو اس کو جب مقتدی دیکھیں کھڑے ہوجائیں اس لئے کہ وہ مسجد میں داخل ہوا تو امامت کی جگہ پر قائم ہوگیا۔

(۲) امام محراب کے قریب نہ ہو اور مسجد میں صفوں کے پیچھے سے آیا ہو تو امام جس صف پر گذرتا جائے وہی صف کھڑی ہوتی جائے۔ یہ مضمون اس حدیث شریف سے بھی مستفاد ہوتا ہے اور بکثرت کتب فقہ سے ثابت ہے۔

مراقی الفلاح اور طحطاوی میں ہے: وان لم یکن حاضرا یقوم کل صف حین ینتھی الیہ الامام فی الاظھر وفی عبارۃ بعضھم فلما جاوز صفا قام ذلک الصف ۔ (طحطاوی ۱۶۱)

وان لم یکن حاضرا لایقوم القوم کل صف حین ینتھی الیہ الامام فی الاظھر وفی عبارۃ بعضھم فکلما جاوز صفاقام ذلک الصف۔ (طحطاوی مصری ۱۶۱)

اگر امام مسجد میں موجود نہ ہو تو وہ امام جس صف تک پہونچے وہی صف کھڑی ہوتی جائے اور یہی قول ظاہر تر ہے اور بعض فقہاء کی یہ عبارت ہے کہ امام جس صف پر گذرے وہی صف کھڑی ہوجائے

عینی شرح کنز الدقائق میں ہے:

وان لم یکن امام بقریب المحراب بان کان فی موضع آخر فی المسجد وخارجہ ودخل من خلف فیقوم کل صف ینتھی الیہ الامام علی الاظھر ملخصا۔ (ردالمحتار ص۳۳۲)

اگر امام محراب کے قریب نہ ہو اور مسجد کی کسی دوسری جگہ میں ہو یا مسجد سے باہر ہو اور صفوں کے پیچھے سے داخل ہو تو امام جس صف تک پہنچے وہی صف کھڑی ہوتی جائے بنا بر قول ظاہر تر کے۔

ہدایہ میں ہے:

وان کان خارج المسجد لایقومون مالم یحضر لقول النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لاتقوموا فی الصف حتی ترونی خرجت (وفیہ ایضا) وان دخل من وراء الصفوف فالصحیح انہ کلما جاز فصار فی حقھم کانہ اخذ مکان۔ بدائع ج۱ ص۲۰۰

اگر امام مسجد سے باہر ہو تو مقتدی اس کے آنے تک کھڑے نہ ہوں جیسا کہ فرمان نبی صلی اللہ تعالی علیہ وسلم ہے: تم صف میں کھڑے نہ ہو یہاں تک کہ مجھ کو نکلتا ہوا دیکھو (اور اسی میں ہے) اگر امام

صفوں کے پیچھے سے آیا تو صحیح قول یہ ہے کہ جب وہ کسی صف سے گذر گیا تو ان کے حق میں ایسا ہو گیا کہ گویا کہ وہ اپنی جگہ پہونچ گیا۔

(۳) امام مسجد میں محراب کے قریب موجود ہے تو امام و مقتدی اس وقت کھڑے ہوں جب تکبیر کہنے والا حی علی الفلاح تک پہونچے۔

علامہ قاری علی علیہ رحمۃ الباری مرقات میں اس حدیث شریف کے تحت میں فرماتے ہیں: جو نمبرا میں منقول ہوئی۔

ولعله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم كان يخرج من الحجرة بعد شروع المؤذن في الاقامة ويدخل في محراب المسجد عند قوله حي على الصلاة ولذا قال أئمتنا ويقوم الامام والقوم عند حي على الصلاة۔ (حاشیہ مشکوۃ شریف ص ۶۴)

شاید کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حجرے شریف سے تکبیر کہنے والے کی تکبیر شروع کرنے کے بعد نکلتے تھے اور محراب مسجد میں حی علی الصلوۃ کہنے کے وقت تشریف لاتے اس لئے ہمارے ائمہ نے فرمایا کہ امام اور مقتدی حی علی الصلوۃ کے وقت کھڑے ہوں۔

نووی شرح مسلم میں ہے:

كان انس رحمه الله تعالىٰ يقوم اذا قال المؤذن قدقامت الصلاة وبه قال احمد رحمه الله تعالىٰ۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس وقت کھڑے ہوتے تھے جب تکبیر کہنے والا قدقامت الصلاۃ کہتا اور یہی امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

(۳) کتاب الآثار میں ہے:

عن الامام الاعظم عن طلحة عن مطرف عن ابراهيم انه قال اذا قال المؤذن حي على الفلاح فينبغي للقوم ان يقوموا للصلوة قال محمد وبه ناخذ وهوقول ابي حنيفة۔

(صحیح البہاری ص ۴۶۹)

حضرت امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت ابراہیم نے فرمایا کہ جب تکبیر کہنے والا حی علی الفلاح کہے تو قوم کے لئے کھڑا ہونا مناسب ہے امام محمد نے فرمایا کہ ہم اسی کو دلیل بناتے ہیں اور یہی امام اعظم ابوحنیفہ کا قول ہے۔

(۴) وقایہ میں ہے:

ويقوم الامام والقوم عند حي على الفلاح۔ (شرح وقایہ ص ۱۶۸)

امام اور مقتدی حی علی الفلاح کے وقت کھڑے ہوں۔

ملتقی الابحر میں ہے: واذ قال حي على الصلاة قام الامام والجماعة۔

(شرح وقایہ فارسی ص ۲۸)

جب تکبیر کہنے والا حی علی الصلوۃ کہے تو امام اور جماعت کھڑی ہو۔

کنز الدقائق میں ہے: القيام حين قيل حي على الفلاح۔ (کنز قیومی ص ۱۳)

اور کھڑا ہونا جس وقت حی علی الفلاح کہی جائے۔

نور الایضاح میں ہے: والقيام حين قيل حي على الفلاح۔

(نور الایضاح مطبوعہ قاسمی ص ۲۸)

اور کھڑا ہونا جب حی علی الفلاح کہی جائے۔

تنویر الابصار میں ہے: والقيام حين قيل حي على الفلاح ان كان الامام يقرب المحراب۔ (شامی ص ۳۳۶)

اور کھڑا ہونا جس وقت حی علی الفلاح کہی جائے اگر امام محراب کے قریب میں موجود ہو۔

مراقی الفلاح میں ہے۔

ومن الادب القيام اي قيام القوم والامام ان كان حاضرًا يقرب المحراب حين قيل اي وقت قول المقيم حي على الفلاح لانه امر له فيجاب۔

(طحطاوی ص ۱۶۱)

اگر امام محراب کے قریب موجود ہو تو تکبیر کہنے والے کے حی علی الفلاح کے وقت امام اور مقتدیوں کا کھڑا ہونا مستحب ہے اس لئے کہ اس نے حی علی الفلاح سے قیام کا حکم کیا تو اس کی اجابت کی جائے۔

درمختار میں ہے: والقيام للامام والمؤتم حين قيل حي على الفلاح خلافاً لزفر فعنده عند حي على الصلاة۔ (حاشیہ ردالمحتار ص ۳۳۶)

اور امام اور مقتدی کو حی علی الفلاح کے وقت کھڑا ہونا چاہئے اور امام زفر سے اس کی مخالفت مروی ہے ان کے نزدیک حی علی الصلوۃ پر۔

عینی شرح کنزالدقائق میں ہے:

الخامس (من الاداب) القیام ای قیام الامام والقوم حین قیل ای حین یقول المؤذن حی علی الفلاح۔ (عینی ص۳۱)

مستحبات سے پانچواں مستحب تکبیر کہنے والے کے حی علی الفلاح کہنے کے وقت امام اور مقتدیوں کا کھڑا ہونا ہے۔

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

قولہ لانہ امربہ فیجاب ای لان المقیم امر بالقیام ای ضمن قولہ حی علی الفلاح فان المراد بفلاحھم المطلوب منھم حینئذ الصلوۃ فیبادر الیھا بالقیام۔ (طحطاوی ص۱۶۱)

مراقی الفلاح کے اس قول لانہ امر بہ فیجاب کا یہ مطلب ہے کہ تکبیر کہنے والے نے اپنے قول حی علی الفلاح کے ضمن میں کھڑے ہونے کا حکم کیا ہے کہ نمازیوں کی فلاح مراد ہے جو حی علی الفلاح سے مطلوب ہے اس وقت نماز سے اس کی طرف قیام سے مبادرت چاہئے۔

تبیین الحقائق شرح کنزالدقائق میں ہے: قولہ والقیام حین قیل حی علی الفلاح لانہ امربہ فیستحب المسارعۃ الیہ۔ (ص۱۰۸)

صاحب کنز کا یہ قول کہ حی علی الفلاح کے وقت کھڑا ہونا چاہئے اس کی علت یہ ہے مکبر حی علی الفلاح کہہ کر حکم دیتا ہے تو قیام کی طرف مسارعت مستحب ہے۔

بحرالرائق شرح کنزالدقائق میں ہے:

قولہ والقیام حین قیل حی علی الفلاح لانہ امربہ فیستحب المسارعۃ الیہ اطلقہ فشمل الامام والمأموم ان کان الامام یقرب المحراب۔ (ص۳۲۱)

صاحب کنز کا یہ قول کہ حی علی الفلاح پر قیام ہو اس کی علت یہ ہے کہ مکبر نے حی علی الفلاح سے قیام کا حکم کیا ہے تو قیام کی جانب عجلت مستحب ہے اور صاحب کنز نے قیام کو مطلق کہا تو یہ حکم امام اور مقتدی کو شامل ہے جب کہ امام محراب کے قریب موجود ہو۔

مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں ہے:

واذا قال المؤذن فی الاقامۃ حی علی الصلاۃ قام الامام والجماعۃ عند علمائنا الثلثۃ۔ (مجمع الانہر ص۳)

جب مکبر تکبیر میں حی علی الصلوۃ کہے تو چاہئے تینوں امام (یعنی امام اعظم اور ان کے شاگرد امام یوسف اور امام محمد) کے نزدیک امام اور جماعت اس وقت کھڑے ہوں۔

بدائع میں ہے: ان المؤذن اذا قال حی علی الفلاح فان کان الامام معھم فی المسجد یستحب للقوم ان یقوموا فی الصف۔ (بدائع ص۲۰۰)

جب مکبر حی علی الفلاح کہے پس اگر امام ان کے سامنے مسجد میں موجود ہو تو مقتدیوں کو صف بنا کر کھڑا ہونا مستحب ہے۔

ذخیرہ میں ہے: یقوم الامام والقوم اذا قال المؤذن حی علی الفلاح عند علمائنا الثلاثۃ۔ (شامی ص۳۳۶)

جب مکبر حی علی الفلاح کہے تو ہمارے تینوں اماموں کے نزدیک امام اور مقتدی کھڑے ہوں۔

مبسوط للامام السرخسی میں ہے: فان کان الامام مع القوم فی المسجد فانی احب لھم ان یقوموا فی الصف اذا قال المؤذن حی علی الفلاح۔ (ص۳۹)

اگر امام قوم کے ساتھ مسجد میں موجود ہو تو ان کے لئے محبوب جانتا ہوں کہ وہ صف میں اس وقت کھڑے ہوں جب تکبیر کہنے والا حی علی الفلاح کہے۔

شلبی حاشیہ زیلعی میں ہے:

قال فی الوجیز والسنۃ ان یقوم الامام والقوم اذا قال المؤذن حی علی الفلاح اھ مثلہ فی المبتغی۔ (ص۱۰۸)

جب تکبیر کہنے والا حی علی الفلاح کہے تو امام اور مقتدیوں کا کھڑا ہونا سنت ہے یہ وجیز میں کہا اور ایسا ہی مبتغی میں ہے۔

عالمگیری میں ہے: وان کان المؤذن غیر الامام وکان القوم مع الامام فی المسجد فانہ یقوم الامام والقوم اذا قال المؤذن حی علی الفلاح عند علمائنا الثلثۃ وھو الصحیح۔ (ص۴۴)

اگر مکبر امام کے علاوہ ہو اور قوم امام کے ساتھ مسجد میں موجود ہو تو ہمارے تینوں اماموں کے نزدیک جب تکبیر کہنے والا حی علی الفلاح کہے اس وقت امام اور قوم کھڑے ہوں مفتی بہ صحیح مذہب ہے۔

اسی طرح اصلاح ۲۱۔ ایضاح ۲۲۔ ظہیریہ ۲۳۔ درر۲۴۔ غرر۲۵۔ فیض ۲۶۔ نقایہ ۲۷۔

حاوی ۲۸۔ مختار ۲۹۔ طحطاوی ۳۰۔ درالمختار ۳۱۔ قہستانی ۳۲۔ مضمرات ۳۳۔ شرح کنز علامہ ملا مسکین ۳۴۔ شرح کنز علامہ شیخ مصطفی ۳۵۔ فتح المعین ۳۶۔ شرح نبلائی ۳۷۔ محیط ۳۸۔ بزازیہ ۳۹۔ وجیز ۴۰۔ مبتغی ۴۱۔ عمدۃ القاری ۴۲۔ فتح الباری ۴۳۔ درالمنتقی ۴۴۔ موطا امام محمد ۴۵۔ مالا بد منہ ۴۶۔ میں یہ مسئلہ مذکور ہے جن کی عبارات بخوف طوالت نقل نہیں کی گئی ہیں اور چار عبارات اور ایک حدیث ابتدا میں نقل ہوئی کل تعداد (۵۰) ہوگئی ان عبارات سے نہایت واضح طور پر ثابت ہوگیا کہ حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا مستحب ہے اور یہ خود امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالی عنہ کے فرمان سے ثابت ہے بلکہ احادیث سے مستفاد ہے البتہ ان عبارات میں بعض طبیعتیں یہ احساس کرینگی کہ اکثر عبارات میں حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کا حکم ہے اور بعض میں حی علی الصلوۃ پر تو بظاہر ان میں تعارض معلوم ہوتا ہے مگر حقیقۃً کوئی تعارض نہیں ہے تطبیق عبارت کی صورت یہ ہے کہ اول الذکر عبارات سے ابتدا مراد لی جائے اور ثانی الذکر سے انتہا۔ یعنی جب مکبر حی علی الصلوۃ کو تمام کر کے حی علی الفلاح پر پہنچے تو امام اور مقتدی کھڑے ہو جائیں اس طور پر ظاہری تعارض بھی نہیں رہا۔

(۴) اگر امام خود ہی تکبیر کہے تو جب تک وہ پوری تکبیر کہہ کر فارغ نہ ہو جائے اس وقت تک مقتدی کھڑے نہ ہوں یعنی اس صورت میں بعد فراغت تکبیر مقتدی کھڑے ہوں۔

عالمگیری میں ہے: وان كان المؤذن والامام واحد اقام في المسجد فالقوم لايقومون مالم يفرغ عن الاقامة۔ (ص ۴۴)

اگر امام اور مکبر ایک ہوں پس اگر امام نے مسجد میں تکبیر کہی تو مقتدی کھڑے نہ ہوں جب تک امام تکبیر سے فارغ نہ ہو۔

عالمگیری میں ہے: اگر خود ہی امام نے تکبیر کہی لیکن مسجد سے باہر کہی تو مقتدی فوراً بعد فراغت تکبیر کھڑے نہ ہوں بلکہ اس وقت کھڑے ہوں کہ امام مسجد میں داخل ہو جائے۔

عالمگیری میں ہے: وان اقام خارج المسجد فمشائخنا اتفقوا على انهم لايقومون مالم يدخل الامام المسجد۔

اگر امام نے مسجد سے باہر تکبیر کہی تو ہمارے مشائخ کا اس بات پر اتفاق کہ مقتدی اس وقت تک کھڑے نہ ہوں جب تک امام مسجد میں داخل نہ ہو۔

بالجملہ اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ مقتدیوں کو شروع سے کھڑا ہونا یقیناً مکروہ ہے اور درمیان

تکبیر میں پہلی دو صورتوں میں مقتدیوں کے کھڑے ہونے کے لئے تکبیر کا کوئی کلمہ مقرر نہیں کیا جاسکتا کہ ان دونوں صورتوں میں مقتدیوں کا کھڑا ہونا امام کے آنے پر موقوف ہے کہ وہ جب آئے گا یہ اسی وقت کھڑے ہوں گے تیسری صورت میں کلمہ حی علی الفلاح پر مقتدیوں کا کھڑا ہونا مستحب ہے سوال میں اسی صورت کو دریافت کیا گیا ہے اور اکثر یہی صورت پیش آتی ہے چوتھی صورت میں مقتدیوں کو فراغت تکبیر کے بعد کھڑا ہونا چاہئے۔

الحاصل یہ تمام صورتیں صرف مقتدیوں کے لئے ہیں اب باقی رہا امام تو اس کے لئے تیسری صورت میں تو کتب فقہ میں اس قدر تصریح ہے کہ وہ بھی حی علی الفلاح پر کھڑا ہو علاوہ اس کے امام کے لئے کوئی خاص حکم مذکور نہیں۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۰۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
زید کی عمر ۱۸ سال کی ہے کہ جو بالغ حافظ قرآن خوش آواز صحت کے ساتھ پڑھنے والا ہے البتہ اس کے ابھی تک داڑھی نہیں نکلی ہے مونچھیں نمودار ہیں اور سوا اس کے اور کوئی صحت سے پڑھنے والا بھی نہیں ہے تو ایسی صورت میں از روئے شرع شریف زید کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں اور اگر جائز ہے تو اس کا جواب بحوالہ کتب فقہ مع عبارت مرحمت فرمائے گا۔ بینوا توجروا

المستفتی حافظ عبدالوہاب سنبھل

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

شخص مذکور کی جب اٹھارہ (۱۸) سال کی عمر ہے تو وہ بلا شبہ یقیناً بالغ ہے کہ شرع میں پندرہ برس کا بالغ قرار دیا گیا ہے۔

کنز الدقائق میں ہے: ويفتى بالبلوغ فقهما بخمس عشرة سنة۔

درمختار وتنویر الابصار میں ہے: فان لم يوجد فيهما شئ فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة وبه يفتى۔

ان عبارات سے واضح ہو گیا کہ قول مفتی بہ یہی ہے کہ جب پندرہ برس کی عمر ہو جائے تو وہ شرعاً بالغ ہے اور سوال میں اس کی عمر اٹھارہ برس کی ظاہر کی گئی ہے لہذا اس کے بالغ ہونے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں اب باقی رہی امرد (بے ریش) کی امامت تو فقہاء نے اس کے مکروہ تنزیہی ہونے کی یہ علت لکھی ہے کہ وہ ایسا خوبصورت ہو کہ محل فتنہ اور شہوت بن جائے۔

شامی میں ہے: تکره خلف امرد الظاهر انها تنزيهة ايضا والظاهر كما قال الرحمتي ان المراد الصبيح الوجه لانه محل الفتنه۔

اور شخص مذکور کو سائل نے بروقت فتوی طلب کرنے کے پیش کیا تو وہ ایسا خوبصورت نہیں ہے جو محل شہوت وفتنہ ہو لہذا اس کی امامت مکروہ تنزیہی بھی نہیں ہے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ شخص مذکور یقیناً بالغ ہے اور ایسا امرد بھی نہیں ہے جس کی امامت مکروہ تنزیہی ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۰۷)

جناب مفتی صاحب اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اس ناچیز کو جمعہ کی نماز کے متعلق مسئلہ دریافت کرنا ہے

ایک مسجد میں نماز پڑھتے تھے تو ان کو معلوم ہوا کہ شیخ احمد مدینوار کے مرید ہیں تو وہاں نماز پڑھنا چھوڑ دیا ہے تب دوسری مسجد میں جانے لگے تو ان کا بھی معلوم ہوا کہ سینما وغیرہ دیکھا کرتے ہیں اور حافظ قرآن کہلاتے ہیں تو وہاں بھی جانا چھوڑ دیا تیسرے مسجد کا بھی وہی حال ہے تو چوتھے مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے لگے تو وہ امام حافظ ہیں ظاہری تقوی درست ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ کسی کو بھلا برا نہیں کہنا چاہئے اپنا اعمال کو صحیح رکھنا چاہئے اور شاہ سعود کو کہتے ہیں کہ وہ اسلام کے صحیح راستہ پر ہیں اور مدینہ شریف کے مزار کا اچھی طرح خیال کرتے ہیں تو ہم کو پورا معلوم نہیں ہے اس لئے مسئلہ دریافت طلب ہے کہ اب اس اطراف میں کوئی اور مسجد نہیں کہ جمعہ جا کر پڑھیں اور لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ تین جمعہ چھوڑ دینے سے مسلمان سے خارج ہو جاتا ہے تو اب ہم کیا کریں نماز جمعہ کے بارے میں کیا حکم نافذ ہے زیادہ کیا لکھوں

فقط والسلام　　عبدالحمید معرفت ماہنامہ سنی لکھنو

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مقتدی کی نماز کی صحت امام کی نماز کی صحت پر موقوف ہے تو جب امام ہی کی نماز صحیح نہ ہو تو پھر مقتدی کی نماز کیسے صحیح ہو سکتی ہے ادھر تو بدمذہب گمراہ کافر مرتد کی نہ نماز حقیقۃ نماز ہے نہ ان کی جماعت حقیقۃ جماعت ہے بلکہ ان کی کوئی عبادت شرعاً عبادت ہی نہیں ادھر مولوی حسین احمد صدر مدرس مدرسہ دیوبند اور شاہ سعود نجدی کو جو شخص مسلمان جانے اور ان کو اسلام کے صحیح راستے پر بتائے۔ تو گویا وہ ان کی شان الوہیت اور رسالت میں گستاخیوں اور ان کی بداعتقادیوں اور کفریات کو اسلام کا راستہ جانتا ہے تو یہ بھی ان کفریات اور گستاخیوں کے ساتھ ایسا راضی ہو گیا کہ انھیں کو اسلام کا صحیح راستہ بتائے گا لہذا یہ شخص بھی کفر کو اسلام بتا کر مرتد کافر کو مسلمان ٹھہرا کر شرعاً خود کافر ہو گیا۔

شرح فقہ اکبر اور تمام کتب عقائد میں ہے" الرضا بالکفر کفر"

تو ایسے بدمذہب وبدعقیدہ کی نہ نماز نماز ہے نہ جماعت جماعت ہے تو ایسے امام کے پیچھے نماز صحیح ادا نہیں ہو سکتی مسلمان ایسے بدمذہبوں کی ہرگز ہرگز اقتدا نہ کریں۔ اب باقی رہا ایسے امام کا حکم جو بدمذہب تو نہیں ہے لیکن وہ بدعمل فاسق ہے تو اس کے پیچھے پنج وقتہ نماز تو مکروہ تحریمی ہے اور واجب الاعادہ ہے لیکن جمعہ اس کے پیچھے بلا کراہت کے جائز ہے۔ اور ظاہر ہے کہ پہلی اور چوتھی مسجد کے امام بدعقیدہ دیوبندی ہیں ان کے پیچھے ہرگز ہرگز نماز نہ پڑھے اب باقی رہا لوگوں کا یہ قول کہ تین جمعوں کے ترک سے خارج اسلام ہوتا ہے غلط وباطل ہے۔ حدیث شریف میں جو تارک کے لئے وعیدیں ہیں وہ ان کے لئے ہیں جو جمعہ بلا عذر نہیں پڑھتے ہیں اور امام کے بدعقیدہ ہونے کی بنا پر تو ترک جمعہ بعذر ہے بلکہ اس کی اقتدا میں خود جمعہ ہی کب ادا ہو گا تو وہ جمعہ حقیقۃ جمعہ ہی نہیں ہے تو ترک جمعہ کی وعید اس کے لئے نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

۱۰ جمادی الاولی ۱۳۷۶ھ

مسئلہ (۳۰۸_۳۰۹)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

(۱) کہ بعد نماز عید بہت سے لوگ امام کے مصلے کے نیچے روپیہ یا پیسے رکھ دیا کرتے ہیں۔ کیا امام کو اس رقم کا کھانا جائز ہے یا ناجائز؟۔

(۲) بہت سے دنوں سے ہماری مسجد میں امام مستقل ہے کوئی شخص باہر کا چند دنوں کے واسطے آئے اور وہ نماز پڑھائے اس کے بعد پھر پردیس چلا جائے تو اس امام کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز۔ امام مسجد میں مستقل ہے اور لوگ دوسرے آدمیوں کی خوشنودی مزاج کے لئے دوسرے امام کو کھڑا کر دیتے ہیں اس پر چند آدمیوں نے نماز پڑھنا چھوڑ دی ہے۔ بینوا وتوجروا

المستفتی ، احمد حسن صابری چنور

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) جب وہ رقم مال زکوۃ وصدقہ واجبہ ہی سے نہ ہو یا ہو تو وہ امام اس کا اہل ومستحق ہو پھر وہ دینا بھی تنخواہ امامت کے سلسلہ میں بھی نہ ہو بلکہ یہ دینا بہ نیت محض اس کی اعانت کے لئے ہو تو اس امام کو ایسی رقموں کا لینا بلاشبہ جائز ہے۔ بلکہ لوگوں کو اپنے امام کی ایسی خدمتیں واعانتیں کرنی چاہیں واللہ تعالی اعلم بالصواب

(۲) جس مسجد میں امام مستقل ہو تو باہر کا شخص اس امام کی اجازت سے نماز پڑھا سکتا ہے اور جب وہ باہر کا شخص امام مستقل سے اعتقاداً وعملاً ہر طرح افضل ہو تو وہ امام کی اجازت سے نماز پڑھا سکتا ہے اور نمازیوں کو بغیر اس کی اجازت کے ایسی جرأت نہیں کرنی چاہئے بلکہ بہتر یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے امام سے عرض کریں اور امام ان کو نماز پڑھانے کی اجازت دے۔ اور نماز ایسے امام کے پیچھے ناجائز ہوتی ہے جس میں کوئی وجہ شرعی ہو اور جنہوں نے فقط اتنی سی بات پر جماعت ترک کر دی ان کو ایسا نہ کرنا چاہئے کہ امام کی اقتداء کسی وجہ شرعی پر چھوڑی جاتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

۱۴ رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ

مسئلہ (۳۱۰۔۳۱۱۔۳۱۲۔۳۱۳۔۳۱۴۔۳۱۵۔۳۱۶۔۳۱۷۔۳۱۸)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

(۱) زید پیش امام ہے اور باوجود سید ہونے کے بالاعلان صدقہ اور خیرات لیتا ہے اور فطرہ کھاتا ہے اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز ہے؟۔

(۲) زید پیش امام ہے اور کاشتکاری اور نکاح خوانی اور خیاطی کرتا ہے اور اپنے گھر سے کھاتا پیتا ہے لیکن صاحب نصاب ہونے کے باوجود زکوۃ نہیں دیتا اور قربانی نہیں کرتا اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز؟۔

(۳) زید پیش امام ہے اور کچہری میں دوسرے کی ضد پر جھوٹا حلف اٹھاتا ہے اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز؟۔

(۴) زید پیش امام ہے اور وہابیہ جیسے غیر مقلدین دیوبندیہ نیچریہ وغیرہ بدمذہبوں سے الحاق کرتا ہے اور ان کے ساتھ میل جول رکھتا ہے اور اپنے کو اہل سنت والجماعت کہتا ہے اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ مندرجہ ذیل مسائل پر دستخط کر دو تو دستخط نہیں کرتا ایسی صورت میں زید سنی حنفی ہے یا وہابی ہے اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا ناجائز وہ مسائل یہ ہیں۔

(۱) غیر مقلدین وہابیہ مرتد ہیں مسلمان نہیں۔

(۲) غیر مقلدین وہابیہ کے پیچھے نماز حرام ہے۔

(۳) لازم ہے اہل سنت وجماعت کو کہ غیر مقلدوں کو اپنی مسجدوں میں نہ آنے دیں اور نکال دیں۔

(۴) غیر مقلدین وہابیہ کے ذبیحہ میں احتیاط لازم ہے۔

(۵) غیر مقلدین وہابیہ سے شادی بیاہ کرنا حرام ہے۔

(۶) زید پیش امام ہے اور قرآن اور خطبہ غلط اور خلاف تجوید پڑھتا ہے اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز؟۔

(۷) زید پیش امام ہے اور حد شرع سے اپنی داڑھی کم کراتا ہے کترواتا ہے اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز؟۔

(۸) زید پیش امام ہے اور بالاعلان بدمذہبوں کا ساتھ دیتا ہے اور ان کے پس پشت اپنے کو سنی حنفی کہتا ہے ایسا شخص سنی حنفی ہے یا نہیں اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا ناجائز؟۔

(۹) زید پیش امام ہے اور ضروریات دین اور مسائل ضروریہ سے عموماً اور مسائل امامت سے

خصوصاً ناواقف ہے اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز۔

سائل، معرفت علن دھوبی ٹانڈا حرمت نگر ڈاکخانہ بلاسپور رام پور چھمن بیسلپور والے

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ان احوال کی بناپر زید کے سنی حنفی ہونے کا دعوی صحیح نہیں کہ اگر وہ فی الواقع سنی حنفی ہوتا تو بلا تامل ان بعد والے نمبروں پر دستخط کر دیتا لہذا جب اس نے ان احکام شرعیہ متعلقہ وہابیہ غیر مقلدین پر دستخط نہیں کئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ احکام اس کے نزدیک صحیح نہیں۔ اوران احکام کا صحیح نہ جاننا خود اس کے بدمذہب اور وہابی غیر مقلد ہونے کی دلیل ہے پھر مزید سوال میں اس کے فسق وفجور کے کافی افعال مذکور ہیں تو نماز تو اس کے پیچھے ناجائز ہے لہذا زید کا عمل اوراعتقاد غلط اور فاسد ہے تو نہ اس کے سنی حنفی ہونے کا دعوی صحیح نہ اس کے پیچھے نماز جائز وروا ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

۲۵ ذیقعدہ ۱۳۷۶ھ

مسئلہ (۳۱۹)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

زید نے کہا کہ اس مسجد پر لعنت اور میری امامت پر لعنت آپ لوگ مجھکو خدا کے واسطے معاف کریں میں نماز نہیں پڑھاؤں گا ایسے شخص کو امام بنانا جائز ہے یا نہیں بادلیل قوی کتب شرع شریف تحریر فرمایا جاوے۔ گواہان حاجی محمد یعقوب صاحب، حافظ عبدالریاض صاحب، حافظ محمد لئیق احمد صاحب، اقرار حسن خاں صاحب، اشفاق صاحب، محمد شفیع صاحب۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

زید کے یہ ہر دو جملے بہت سخت اور قبیح ہیں۔ فوراً اس کو توبہ کرنی چاہئے پھر جب تک وہ توبہ نہ کرے اس کو امام بھی نہ بنانا چاہئے کہ اس کی ایسی جرأت ودلیری پتہ دیتی ہے کہ شعار مذہبی واحکام د

ین کی اس کے دل میں کچھ قدر نہیں ہے تو وہ امامت جیسی ذمہ داری کی چیز میں نہ معلوم کیا کیا فروگذاشت کریگا۔ لہذا لوگوں کی نمازوں کے لئے ایسے غیر ذمہ دار شخص کو امام بنانا خلاف احتیاط اور نامناسب ہے

فقط واللہ تعالی اعلم بالصواب ۷ جمادی الاخریٰ ۱۳۷۸ھ

مسئلہ (۳۲۰)

لو قام الامام الی الرکعۃ الخامسۃ ویعلمہ رجل ہل لہ ان یقتدی بہ فیھا بنیۃ الفرض ویلقنہ ام لا ؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صح الاقتداء بہ فی ھذہ الصورۃ ولہ ان یلقنہ قبل ان یقید الخامسۃ بسجدۃ صرحہ صاحب ردالمحتار ناقلا عن البحر لو اقتدی بہ مفترض فی قیام الخامسۃ ولم یقعد قدر التشہد صح الاقتداء لانہ لم یخرج من الفرض قبل ان یقیدھا بسجدۃ ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۲۱)

ھل یحصل باقتداء الحافظ الجاھل عن شرائط الوضوء والصلوۃ وفروضھما وسننھما فضیلۃ الجماعت وایضا جاھل بمفسد اتھما ام لا؟۔ اوھل یجوز الاقتداء للعالم ام ل؟ا والانفراد افضل عن ھذا ام الجماعۃ احسن الینا یرحمکم اللہ بجاہ سید العرب والعجم ﷺ ۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

قال النبی ﷺ فلیئومکم علماء کم فتقدیم الجاھل مع کون العالم حاضرا مکروہ فاقتداء العالم لہ اولیٰ من الانفراد لحصول فضیلۃ الجماعۃ کما ھو مصرح فی کتب الفقہ واللہ تعالی اعلم بالصواب ۔

مسئلہ (۳۲۲)

امام کے لئے تنخواہ لینا جائز رکھا گیا ہے۔ اگر قرآن شریف پڑھ کر اس کا ثواب بخش دینے کے بدلے میں کچھ لینا جائز ہو تو فبہا اور اگر نا جائز ہے تو امام کے لئے تنخواہ دینا جائز قرار دیا گیا ہے، وہ بھی نا جائز ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ادھر قرآن شریف پڑھنے کا عوض ہے اور ادھر نماز پڑھانے کا عوض ہے۔

بینوا توجروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

امامت، اذان، تعلیم القرآن پر تنخواہ لینا متاخرین نے ضرورۃ جائز قرار دیا۔

چنانچہ فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے:

وبعض مشائخنا رحمهم الله تعالى استحسنوا الاستيجار على تعليم القرآن اليوم لظهور التوانى فى الامور الدينية ففى الامتناع تضييع حفظ القرآن وعليه الفتوى وزادمتن المجمع الامامة وبعضهم الاذان والاقامة والوعظ۔

ہمارے بعض مشائخ رحمہم اللہ تعالی نے اس وقت تعلیم قرآن پر اجرت لینا اچھا سمجھا کہ امور دینیہ میں سستی ظاہر ہے۔ تو منع کرنے میں حفظ قرآن کا ضائع کرنا ہے، اسی پر فتوی ہے۔ اور متن مجمع نے امامت کو اور بعض فقہا نے اذان اور تکبیر اور وعظ کو زائد کیا۔

اور میت کے ایصال ثواب کی غرض سے تلاوت پر اجرت وتنخواہ لینا کوئی ضروری چیز نہیں۔

چنانچہ ردالمحتار میں ہے:

وقد ذكرنا مسئلة تعليم القران على الاستحسان يعنى للضرورة ولا ضرورة فى الاستيجار على القرأة على القبر۔ (ردالمحتار ص ۳۶ ج ۵)

ہم نے مسئلہ تعلیم قرآن بضرورت استحسان کا ذکر کیا اور قبر پر پڑھنے کی اجرت لینے میں کوئی ضرورت نہیں۔

تو میت کے ایصال ثواب کی غرض سے تلاوت کا امامت وغیرہ پر قیاس مع الفارق ہے کہ یہاں ضرورت داعی الی الجواز اور وہاں ضرورت ہی نہیں پائی جاتی تو اس کو امامت وغیرہ پر قیاس نہیں کر سکتے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۲۳-۳۲۴-۳۲۵-۳۲۶-۳۲۷-۳۲۸-۳۲۹-۳۳۰-۳۳۱-۳۳۲-۳۳۳-۳۳۴-۳۳۵-۳۳۶-۳۳۷)

کیا فرماتے ہیں نائبان رسول کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم ومفتیان مذہب احناف مسائل مندرجہ ذیل کے بارے میں کہ

(۱) لفظ امام شہر بغیر کسی تاویل وتوجیہ کے اپنی ترکیبی حیثیت سے صحیح ہے یا غلط؟۔

(۲) لفظ امام شہر اصطلاحات شرعیہ میں منقول ہے یا نا مشروع وبے اصل ہے؟ اگر منقول ہے تو اس کی تعریف شبینہ ظاہرہ میں کیا ہے اور اس کو شرعا کن احکام کے اجراء کا اختیار ہے؟۔

(۳) کسی ایسے مقام کی جامع مسجد کا امام جمعہ وعیدین یا امام مسجد جو مقام شہر یا پرگنہ ہونے کے ساتھ شرعا بھی قول مفتی بہ پر مصر ہو، ایسے امام کو امام شہر وعیدین یا امام پنجگانہ جو مقام یا شہر یا پرگنہ ہونے کے ساتھ ساتھ شرعا بھی قول مفتی بہ مصرع ہو ایسے امام کو امام شہر یا قاضی شہر کہنا شرعا جائز ہے یا نا جائز؟۔

(۴) امام مذکور اپنے آپ کو شہر یا قاضی شہر کہے اور لکھے یا لوگوں سے امام شہر وقاضی کہلوائے یا شہر پرگنہ کے امام مسلمان ایسے امام کو امام شہر یا قاضی شہر کہیں اور لکھیں تو یہ کہنا یا کہلوانا اور لکھنا شریعت ظاہرہ میں درست ہے یا نہیں؟۔

(۵) امام مذکور جو اپنے آپ کو امیر المومنین وخلیفۃ المسلمین جانے اور اعتقاد کرے یا اپنے آپ کو ایسا قاضی متصور کرے جو سلطان اسلام کا مقرر کردہ قاضی ہو اور عوام کو بھی ایسا ہی امیر المومنین وقاضی باور کرائے یا عام مسلمان ایسے امام کو امیر المومنین اور سلطان اسلام کا مقرر کردہ قاضی اعتقاداً جانیں امام مذکور وعام مسلمان کا ایسا اعتقاد صحیح و درست ہے یا نہیں؟ اور ایسے امام وعوام مؤمنین کیلئے شرعا کیا حکم ہے؟

(۶) امام مذکور کے اختیارات واحکام وہی ہوں گے جو امیر المومنین وقاضی شرع کے ہیں یا وہ بالکل بے اختیار ہوگا اور شرعا اس کے احکام نافذ نہ ہوں گے؟۔

(۷) امام مذکور یا کسی عالم ومفتی کا کسی حکم شرع کے بارے میں عوام مؤمنین سے یہ کہنا یا اعلان کر

تا کہ میرے حکم سے یہ کام کرو اور اس کا ثواب و عذاب میرے گردن پر ہوگا جائز و روا ہے یا ناجائز و حرام و نادانی ہے؟۔

(۸) اگر امام مذکور یا کسی عالم و مفتی کے ایسے کہنے یا اعلان کرنے پر عام مسلمان اس پر عمل کریں اور فی الحقیقت امام مذکور یا مفتی و عالم کا ایسا حکم گناہ خلاف حکم شریعت ظاہرہ ہو تو کیا عام مسلمان شرعا مجرم گنہگار نہ ہوں گے اور سب کے گناہوں کا عذاب و وبال صرف امام مذکور یا مفتی و عالم پر ہوگا یا عام مسلمان بھی اس کے خلاف شرع حکم پر عمل کرنے کے باعث شرعا مجرم و گنہگار و مستحق عذاب عقبیٰ ہوں گے؟۔

(۹) کسی ایسے مقام کی بڑی مسجد کے امام کو جو شرعا مصر نہ ہو شرعا سلطان اسلام کا مقرر کردہ قاضی مانا جائے یا نہیں؟۔

(۱۰) کتاب القاضی الی القاضی کے شرعا مستند و معتبر ہونے کے لئے کتنی شرائط ضروری ہیں؟۔

(۱۱) کیا کسی شہر کی جامع مسجد کا امام یا غیر مصر کی بڑی مسجد کا امام جسے نہ باشندگان شہر نے نہ سلطان اسلام نے قاضی مقرر کیا ہو لیکن وہ امام خود کو شرعا قاضی متصور کرے اور کتاب القاضی الی القاضی کی طرح باہم احکام شرعیہ نافذ کر لینے کے لئے خط بھیجے تو شرعا ایسا امام قاضی ہوگا یا نہیں اور اس کے خط کا اعتبار ان احکام شرعیہ میں ہوگا یا نہیں جن میں شہادت ضروری ہے؟۔

(۱۲) اور اگر عام مسلمان ایسے امام کو شرعا قاضی جانیں اور اس کے مکتوبات مذکورہ کو احکام شرعیہ مذکورہ میں معتبر جانیں تو ایسے عوام خطا کار ہوں گے یا نہیں؟۔

(۱۳) کسی شہر کی جامع مسجد کے امام یا غیر مصر کی بڑی مسجد کے امام کو شرعا کیا کیا اختیارات حاصل ہیں اور ان کے کیا کیا احکام نافذ کردہ واجب العمل ہوں گے؟۔

(۱۴) اگر کسی شہر کی جامع مسجد کے امام یا غیر مصر کی بڑی مسجد کے امام اپنے آپ کو قاضی متصور کر کے کتاب القاضی الی القاضی کی بنا پر رویت ہلال عیدین کا حکم و اعلان اس طرح کریں کہ سب لوگ آج روزہ افطار کر لیں۔ یا آج قربانی کر لیں۔ لیکن نماز عید الفطر یا نماز عید الاضحیٰ کل ہوگی جبکہ تین چار گھنٹہ کے قریب نماز عیدین کا وقت باقی ہو اور کوئی عذر شرعی بھی تاخیر نماز عیدین کا نہ ہو تو اگلے روز نماز عید کیا بکراہت ادا ہوگی یا بغیر کراہت اور کسی عذر شرعی کی صورت میں اس اعلان کی بنا پر اگلے روز کی نماز مکروہ ہوگی یا غیر مکروہ؟۔

(۱۵) شہر کی جامع مسجد یا عیدگاہ سے پہلے شہر کی کسی دوسری ایک مسجد میں یا متعدد مساجد میں

جمعہ یا عیدین ادا کیجائے تو وہ نماز جمعہ یا عیدین صحیح و درست ہوگی یا نہیں؟ جبکہ اس دوسری مسجد یا متعدد مساجد میں زمانہ دراز سے نماز جمعہ و نماز عیدین ہو رہی ہوں۔ ایک شہر میں جامع مسجد یا عیدگاہ کے علاوہ دوسری متعدد مساجد میں نماز جمعہ و عیدین ادا کی جائے تو قول راجح و مفتی بہ پر وہ نماز جمعہ اور نماز عیدین جائز ہوگی یا ناجائز؟ امور مستفسرہ بالا کے جوابات مدلل بحوالہ کتب فقہیہ معتبرہ لکھے جائیں۔

المستفتی حاجی محمد ظہور صاحب کارخانہ چھچہ لال مسجد مرادآباد

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) لفظ امام شہر ترکیبی حیثیت سے صحیح ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) لفظ امام شہر فارسی ترکیب ہے جس کا عربی میں ترجمہ امام المصر ہے اور لفظ امام المصر اصطلاحات شرعیہ میں منقول ہے اور اس کی تعریف کتب فقہ میں اس طرح موجود ہے۔

مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں ہے:

امام المصر و ھو سلطانہ۔ (از مجمع الانہر مصری ج ۱ / ص ۱۸۲)

یعنی امام مصر سلطان شہر اور امیر البلدہ ہے۔ اور شرعا اس امام کو ان احکام کے اجرا کے اختیارات ہیں۔

علامہ شامی باب الامامۃ میں عقائد نسفیہ سے ناقل ہیں:

والمسلمون لا بد لھم من امام یقول تنفیذ احکامھم و اقامۃ حدودھم و سد ثغورھم و تجھیز جیوشھم و اخذ صدقاتھم و قھر المتغلبۃ و المتلصصۃ و قطاع الطریق و اقامۃ الجمع والاعیاد و قبول الشھادات القائمۃ علی الحقوق و تزویج الصغار و الصغائر الذین لا اولیاء لھم و قسمۃ الغنائم۔ اھ

(رد المحتار مصری ج ۱ ص ۳۸۴)

اور مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ ایک امام ہو جو ان کے لئے تنفیذ احکام اور اجراء حدود اور شہر کی رخنوں اور دوسرے خطروں کے انتظام اور لشکروں کی تیاری اور صدقہ کے قبول کرنے اور متغلبوں اور چوروں ڈاکوؤں پر غلبہ حاصل کرنے اور جمعہ و عیدین کے قائم کرنے اور حقوق پر شہادتوں کے سننے اور قبول کرنے اور نابالغ بچوں کے نکاح کرنے پر جن کے ولی موجود نہ ہوں اور مال غنیمت کی تقسیم کرنے پر قادر ہو۔

اس عبارت سے ثابت ہوگیا کہ جس کو ایسے اختیارات حاصل ہوں وہ شرعا امام شہر ہے اور جس کو ایسے اختیارات حاصل نہ ہوں وہ ہرگز ہرگز امام شہر نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) جامع مسجد کے امام کو کتب شرع میں امام جمعہ اور امام مسجد فقہاء کرام لکھتے ہیں:

درمختار میں ہے: اما م المسجد الجا مع اولی من اما م الحی ای مسجد محلته۔

(ردالمحتار ج ۱ ص ۶۱۶)

جامع مسجد کا امام محلّہ کی مسجد کے امام سے بہتر ہے جبکہ اس کا اہل ہو۔

علامہ حلبی کبیری میں صلوۃ الجنازہ کے ذکر میں فرماتے ہیں:

الا و لی بالامامة فیها السلطا ن ثم القا ضی ثم اما م الجمعة ثم اما م الحی ثم الو لی۔

(از کبیری مطبوعہ فخر المطابع لکھنؤ ص ۵۴۱)

نماز جنازہ کی امامت کیلئے سب سے بہتر سلطان ہے پھر قاضی پھر امام جمعہ پھر امام محلّہ پھر ولی میت۔ مجمع الانہر میں فتح القدیر سے ناقل ہیں:

الخلیفة اولی ان حضر ثم اما م المصر و هو سلطا نه ثم القا ضی ثم صا حب الشرط ثم خلیفة القاضی ثم اما م الحی (فیه ایضا) اما م المسجد الجا مع اولی من اما م الحی۔

(مجمع الانہر ص ۱۸۲)

امامت نماز جنازہ کیلئے سب سے افضل اور حقدار خلیفۃ المسلمین ہے اگر وہ موجود نہ ہو پھر امام شہر یعنی امیر بلدہ پھر قاضی شہر پھر کوتوال شہر پھر خلیفۂ والی پھر خلیفہ قاضی پھر امام محلّہ اور امام جامع مسجد امام محلّہ سے بہتر ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ فقہائے کرام جامع مسجد کے امام کو امام المسلمین الجامع اور امام الجمعہ کے لقب سے ذکر کرتے ہیں۔ اور امیر شہر کو امام المصر یعنی امام شہر کے لقب سے ملقب کرتے۔ امام جامع مسجد منجملہ والیوں کے کوئی والی بھی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ نماز جنازہ کی امامت کے حق دار ہونے میں یہ خلیفہ قاضی کے بعد ہے اور خلیفہ قاضی خلیفہ والی کے بعد ہے اور خلیفہ والی کوتوال شہر کے بعد ہے اور کوتوال قاضی کے بعد ہے اور قاضی امیر بلدہ یعنی امام شہر کے بعد ہے اور امام شہر خلیفۃ المسلمین کے بعد ہے تو یہ امام جامع مسجد اس خلیفۂ قاضی کے برابر نہ ہوسکا جو قاضی سے دو درجہ نیچے ہے۔ پھر یہ قاضی شہر کی برابر کس طرح ہوسکتا ہے پھر جب یہ قاضی کے درجہ تک نہ پہنچ سکا تو اس کو امیر البلدہ یعنی امام شہر کو

مغنی کی بنا پر کہا جاسکتا ہے۔ اور امام عیدین امام جمعہ ہی کی حیثیت رکھتا ہے اور امام پنجگانہ کا امام جامع مسجد سے بھی کم رتبہ ہے۔ لہٰذا بغیر ثبوت تامہ اور ولایت عامہ کے امام جامع مسجد کو قاضی شہر اور اس سے بڑھ کر امام شہر کہنا کتب فقہ کی تصریحات کے خلاف ہے اور فقہائے کرام کی کھلی ہوئی مخالفت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۴) جواب نمبر دو سے یہ ثابت ہوگیا کہ امام جامع مسجد اپنی شوکت و ولایت عامہ نہ ہونے کے باعث نہ شرعا قاضی شہر ہے اور نہ امام شہر تو اس کو لوگوں کا قاضی یا امام شہر کہنا یا لکھنا شریعت طاہرہ میں کس طرح درست ہوسکتا ہے اور اس کا خود اپنے آپ کو قاضی شہر یا امام شہر کہنا، یا لکھنا اور زیادہ قبیح و مذموم اور اس کا دوسروں سے یہ کہلوانا اور زیادہ بدترین شنیع فعل ہے۔

حدیث شریف میں اس کی سخت ممانعت وارد ہے۔ ابن ماجہ شریف میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

من ادعی ما لیس له فلیس منا و لیتبؤ مقعده من النا ر۔

(جامع صغیر للسیوطی ج ۲ ص)

جو شخص ایسی چیز کا دعویٰ کرے جو اس میں نہ ہو تو وہ ہم میں سے نہیں اور وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے۔

(۵) جو امام جامع مسجد اپنے اندر شوکت تامہ اور ولایت عامہ حاصل نہ ہونے اور تنفیذ احکام واجراء حدود پر قادر نہ ہونے کے باوجود بھی اپنے آپ کو امیر المؤمنین وخلیفۃ المسلمین یا قاضی جانے یا دوسروں کو یہ باور کرائے یا عوام اس کو ایسا اعتقاد کریں تو ایسا امام وعوام کالانعام انتہائی جاہل ونادان ہے ورنہ احکام شرع کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۶) جب یہ امام جامع مسجد نہ امیر المؤمنین نہ قاضی نہ اور کسی طرح کا حاکم و والی تو اس بے اختیار کے کیا اختیارات ہوسکتے ہیں اور اس کے تمام احکام کس طرح نافذ ہوسکتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۷) امام مذکور یا کسی عالم کا اپنی ناقص تحقیق اور غلط حکم کی بنا پر ایسا اعلان کرانا نہایت جرأت و دلیری اور انتہائی جہالت ونادانی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۸) امام جامع مسجد یا غیر مفتی شہر عالم کا ایسا اعلان وحکم اگر مخالف شرع ہے تو اس پر مسلمانوں کو عمل کرنا گناہ وممنوع ہے۔

بخاری ومسلم اورابوداؤد،نسائی وغیرہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا

: لاطاعة لاحد فی معصیة اللہ انما الطاعة فی المعروف ۔

(جامع صغیر مصری ج۲ ص۱۹۳)

اللہ کی معصیت میں کسی کی اطاعت نہیں کہ اطاعت تو نیکی ہی میں ہوتی ہے۔

بلکہ ان کے گناہوں کا وبال اس امام مذکور وغیرہ پر بھی ضرور ہوگا۔

حدیث شریف میں ہے جس کو ابوداؤد نے اور حاکم نے مستدرک میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ حضور نے فرمایا: من افتی بغیر علم کان اثمہ علی من افتاہ ۔

(جامع صغیر ص۱۴۸)

جس نے بلا علم کے فتویٰ دیا تو اس کا گناہ اس فتویٰ دینے والے پر ہوگا۔

(۹) جب امام مذکور کی حیات میں نہ کبھی یہاں سلطان اسلام ہوا نہ اب ہے تو اسے سلطان اسلام کا مقرر کردہ قاضی کوئی اسے سمجھ والا تو مان نہیں سکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۱۰) قیاس کا اقتضا تو یہ تھا کہ کتاب القاضی الی القاضی مطلقاً شریعت میں معتبر نہ ہوتی کہ خط مشابہ خط کے ہوا کرتا ہے اور عقلا خط قاضی خود بیان قاضی سے زیادہ قوی نہیں تو بیان قاضی قابل عمل ہونا اور خط قاضی نا قابل عمل ہوتا۔ مگر اجماع نے کتاب قاضی کو قابل عمل قرار دیا اور خود بیان قاضی کو نا قابل عمل ٹھہرایا۔

چنانچہ مجمع الانہر میں ہے: والقیاس یابی جواز العمل بکتاب القاضی لان القاضی الکاتب لو حضر بنفسہ مجلس المکتوب الیہ و عبر بلسانہ عما فی الکتاب لم یعمل بہ القاضی فکیف بالکتاب و فیہ شبہ التزویر اذ الخط یشبہ الخط والخاتم یشبہ الخاتم الا انہ یجوز استحسانا لحاجة الناس الیہ لما روی ان علیا رضی اللہ تعالیٰ عنہ جوّز لذلک و علیہ اجمع الفقہاء ۔ (مجمع الانہر ج۲ ص۱۶۵)

قیاس کتاب القاضی الی القاضی پر عمل کرنے کے جواز کا انکار کرتا ہے کیونکہ خود قاضی کاتب اگر مجلس قاضی مکتوب الیہ میں حاضر ہو جائے اور اپنی زبان سے مضمون کتاب کو بیان کرے تو اس کو قاضی مکتوب الیہ قابل عمل نہ ٹھہرائے تو کیسے اس کتاب کو قابل عمل قرار دیں جس میں گڑھ دینے کا شبہ ہو کہ خط خط کا مشابہ ہو جاتا ہے اور مہر مہر کے مشابہ ہو جاتی ہے۔ مگر لوگوں کی حاجت کیلئے کتاب القاضی کو استحسا

جائز قرار دیا کہ حضرت مولا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس کتاب القاضی کو جائز ٹھہرایا اور اسی کے اوپر فقہاء کرام نے اجماع کیا۔

اس عبارت سے بمقابلہ بیان قاضی کے خط قاضی کا باجماع حجت ہونا ثابت ہوا۔ لیکن خط قاضی کا حجت ہونا اس کے تمام شرائط کے جمع ہو جانے پر موقوف ہے۔

عالمگیری میں ہے: یجب ان یعلم ان کتاب القاضی الی القاضی صار حجة شرعا فی المعاملات بخلاف القیاس لان الکتاب قد یفتعل و یزور والخط یشبہ الخط و الخاتم یشبہ الخاتم ولکن جعلناہ حجة بالاجماع ولکن انما یقبلہ القاضی المکتوب الیہ عند وجود شرائطہ ۔ (فتاویٰ عالمگیری مجیدی ج۳ ص۱۷۲)

یہ جاننا واجب ہے کہ قاضی کا خط دوسرے قاضی کی طرف معاملات میں خلاف قیاس حجت شرعی ہے کہ خط بنایا اور گڑھا جا سکتا ہے اور خط خط کے مشابہ ہو جاتا ہے لیکن ہم نے اس کو اجماع سے حجت قرار دیا مگر اس کو بھی قاضی مکتوب الیہ اس کے تمام شرائط کے پائے جانے پر قبول کرے۔

لہٰذا شرائط کتاب القاضی الی القاضی سے اگر ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو پھر کتاب القاضی نہ حجت شرعی نہ اس پر عمل جائز۔ تو اب شرائط کتاب القاضی کا ذکر ہدایہ، درمختار، ردالمحتار، مجمع الانہر۔ فتاویٰ عالمگیری وغیرہا سے نقل کیا جاتا ہے اور ان کی عربی عبارات کو بخوف طوالت نقل نہیں کیا۔ لہٰذا وہ شرائط کتاب القاضی یہ ہیں۔

(۱) کتاب القاضی جس شہر سے دوسرے کی طرف جائے تو ان پر دو شہروں کے درمیان مقدار سفر کی مسافت کا ہونا۔ اور بقول بعض کم از کم اتنی مسافت کا ہونا کہ جانے والا اسی دن میں مکان واپس نہ آسکے۔

(۲) قاضی کاتب کا اگر نام مشہور ہو تو اس کا نام و قاضی بلد فلاں ورنہ اس کے باپ، دادا کے اسی کتاب ہی میں مکتوب ہونا۔

(۳) قاضی کاتب کے روبرو جس واقعہ پر شہادت گزرے اس واقعہ کا تفصیلی ذکر کتاب میں ہونا

(۴) شاہدین واقعہ کے اسماء مع نام پدر وجد کے اس کتاب میں ہونا۔

(۵) قاضی کاتب کے روبرو جس واقعہ پر شہادت گزرے اس واقعہ کا تفصیلی ذکر کتاب میں ہونا۔

(۶) قاضی کا ان شاہدین واقعہ کے عدالت کا کتاب میں لکھنا اور اگر قاضی کو ان کی عدالت کا خود

علم نہ ہوتو یہ بھی لکھدینا کہ میں نے ان کی عدالت پر فلان بن فلاں اور فلاں بن فلاں مزکیوں سے دریافت کر کے اعتماد کیا۔

(۷) قاضی کا شاہدین کتاب کے اسماء مع نام پدر وجد کے اور مع ان کے عدالت کے کتاب میں لکھدینا۔

(۸۔) اس کتاب پر دو عادلوں کو شاہد بنانا۔

(۹) ان شاہدین کتاب کے اسماء مع نام پدر وجد کے لکھدینا اور مع عدالت کے کتاب میں لکھدینا۔

(۱۰) کتاب میں تاریخ و یوم اور سنہ کا لکھنا۔

(۱۱) قاضی کاتب کا آخر کتاب میں یہ لکھنا کہ میں فلاں بن فلاں قاضی بلدہ ہوں، یہ میری کتاب ہے، اس میں میرا حکم ہے، میری مہر اس پر چسپاں ہے، یہ کتاب اس قدر کاغذ کی اتنی سطروں میں ہے، میں نے فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں پر اس کو لکھ کر پڑھا۔ اور اس کے مضمون وحکم پر مطلع کیا۔ اور ان کے سامنے اس پر مہر لگائی اور انہیں اس پر شاہد بنایا۔ میں نے یہ آخری سطریں اپنے حکم سے فلاں تاریخ میں لکھیں۔

(۱۲) قاضی کاتب کا شاہدین کتاب پر اس کتاب کو پڑھنا۔

(۱۳) ان شاہدین کتاب کے سامنے کتاب کو طے کر کے سربمہر کرنا۔

(۱۴) قاضی کاتب کا مجلس قضا میں ان شاہدوں کو یہ کتاب سونپنا۔

(۱۵) شاہدین کتاب کا مضمون کتاب کو محفوظ کرنا بلکہ اس کی نقل کو اپنے پاس رکھنا۔

(۱۶) ان تمام شاہدوں کا مسلمان صحیح العقیدہ ہونا عادل ہونا۔

(۱۷) خاص مکتوب الیہ کا اس کتاب کے کندہ ہونے پر اور مہر کے صحیح باقی رہنے کو بغور پہلے دیکھ لینا کہ اس کو کھلا ہوا نہ ہونا اور مہر کو ٹوٹا ہوا پانے کی حالت میں قبول نہ کرنا۔

(۱۸) خاص مکتوب الیہ پھر شاہدین کتاب کی شہادت لے اور وہ یہ کہیں کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ فلاں بن فلاں قاضی بلدہ فلاں کی کتاب ہے جو آپ کے پاس بھیجی ہے اس نے اسے ہمارے سامنے پڑھا اس کا مضمون ہے۔ اس پر ہماری موجودگی میں مہر لگائی اور ہمیں اس پر گواہ بنایا اور ہمیں یہ مجلس میں سونپی۔ یہ اسی خاص کی مہر ہے۔

(۱۹) قاضی مکتوب الیہ اس شہادت کے گزر جانے کے بعد اس کتاب کو کھول کر دیکھے۔

(۲۰) پھر مضمون کتاب کا اگر اس شہادت کے موافق ہو ورنہ بصورت مخالفت وہ کتاب قابل رد ہے۔

(۲۱) قاضی کاتب اس قاضی کے کتاب پڑھنے تک زندہ رہے نہ وہ معزول ہو نہ اسے جنون و فسق اور ردلاحق ہو۔

(۲۲) قاضی مکتوب الیہ بھی وصول کتاب تک زندہ رہے نہ وہ معزول ہو نہ وہ خارج از بلد ہو۔

(۲۳) اگر قاضی خارجی کی کتاب آئے اور قاضی مکتوب الیہ ہی جانتا ہے کہ اس کے شاہد خارجی ہیں یا یہ علم نہ ہو کہ شاہد خارجی ہیں یا اہل عدل تو یہ قاضی مکتوب الیہ اس کتاب کو قبول نہ کرے۔

(۲۴) ظاہر الروایت میں ہے کہ قاضی شہر قاضی شہر یا قاضی قریہ کو کتاب لکھ سکتے ہیں اور قاضی قریہ قاضی شہر کو نہ لکھے۔

(۲۵) قاضی مکتوب الیہ کا اس کتاب قاضی پر عمل کرنا ضروری نہیں اس کو اس پر عمل کرنے اور نہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

یہ ۲۵ شرائط کتاب القاضی ہیں جو کتاب القاضی الی القاضی کے معتبر و مستند ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۱۱) جب ایک امام جمعہ کو نہ سلطان اسلام نے قاضی مقرر کیا نہ اہل شہر کے علماء و اکابر نے قاضی تجویز کیا تو وہ شرعاً قاضی ہی نہ ہوا تو اس کا خط نہ کتاب القاضی الی القاضی نہ حجت شرعی۔ درمختار میں ہے: القاضی یکتب الی القاضی وھو نقل الشھادۃ حقیقۃ ولا یقبل من حکم بل من قاضی مولی من قبل الامام ملخصاً۔

قاضی دوسرے قاضی کی طرف خط لکھے کہ یہ حقیقۃ شہادت کا نقل کرنا ہے اور حکم کا خط قبول نہ کیا جائے گا بلکہ اس قاضی کا جو امام کی طرف سے مقرر کیا ہوا ہو۔

(۱۲) عوام کا ایسے امام جمعہ کو قاضی شرع ماننا یا اس کے خط کو حجت شرعی جاننا خلاف شرع ہے تو ان کے خطا کار و گنہگار ہونے میں کوئی شک نہیں،۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۱۳) شریعت نے امام جامع مسجد کو ولایت عامہ کے اختیارات نہیں دیئے تو نہ اسے احکام نافذ کرنے کا حق حاصل نہ اس کے ہر حکم کا ماننا اس پر عمل کرنا واجب۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۱۴) جو امام جامع مسجد شرعاً قاضی شرع نہ ہو تو شرعاً نہ اسے کتاب القاضی الی القاضی لکھنے کا حق

حاصل، نہ مکتوب الیہ کیلئے اس کا خط قبول کے قابل ۔ نہ ایسا خط ثبوت رویت ہلال کے لئے طریق موجب، نہ مسلمانوں کو اس پر عمل کرنا واجب۔ تو اس پر اس کا اعلان وحکم غلط و باطل ہے۔ لہذا اس پر نہ روزہ کے افطار کی اباحت، نہ قربانی کی اجازت۔ پھر جنھوں نے اس اعلان پر روزہ افطار کرلیا یا قربانی کرلی ان پر ایک روزہ کی قضا لازم اور قربانی واجب۔ مسلمانو! ۔ جب اس امام کی مسائل شرع اور احکام دین سے ناواقفی وجہالت کا یہ حال کہ یہ نماز عیدین کا تین چار گھنٹہ وقت باقی رہنے کے باوجود بھی بلا کسی عذر شرعی کے دوسرے دن نماز عیدین کے ادا کرنے کا اعلان کراتا ہے تو اس میں نہ قاضی شہر ہونے کی اہلیت نہ مفتی شہر بننے کی صلاحت ۔ پھر یہ بے خبر نادان انسان شرائط کتاب القاضی الی القاضی سے کس طرح واقف ہوسکتا ہے۔

بالجملہ جب اس امام کے نزدیک رویت ہلال کا ثبوت زوال سے تین چار گھنٹے قبل پہنچ چکا تو اتنے وقت میں اعلان ہوکر لوگوں کا اجتماع بھی ہوجاتا اور نماز عیدین بھی اسی دن میں ہوسکتی تھی۔ لیکن اس امام نے اس دن میں بلا کسی عذر شرعی کے نماز عیدین نہیں پڑھی۔ تو اس نے سب لوگوں کی نماز عید قضا کرادی کہ بلا عذر عید الفطر تو دوسرے دن جائز نہیں اور نماز عید الاضحیٰ مکروہ ہے۔

درمختار میں ہے: یجوز تا خیرھا الی آخر ثالث ایام النحر بلا عذر مع الکراھۃ وبہ ای بالعذر بدونھا فالعذر ھنا لنفی الکراھۃ و فی الفطر للصحۃ۔ (ردالمحتار۔ ج ۱۔ ص ۵۸۶)

اور نماز عید الاضحیٰ کی تاخیر بغیر عذر کے قربانی کے اخیر تیسرے دن تک جائز مع الکراہت ہے اور بعذر جائز بلا کراہت ہے تو عذر اس میں تو کراہت کی نفی کے لئے ہے۔ اور نماز عید الفطر میں صحت کے لئے ہے۔

مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں ہے: یسئی بالتأخیر من غیر عذر فیہ تأخیر الواجب بلا ضرورۃ عند القائل بالوجوب فالعذر فی الاضحیٰ لنفی الکراھۃ و فی الفطر للجواز۔ (ج ۱۔ ص ۱۷۵)

بغیر عذر کے نماز عید الاضحیٰ کی تاخیر اساءت ہے کہ اس میں بلا ضرورت قائل وجوب کے نزدیک تأخیر واجب ہے تو عذر نماز عید الاضحیٰ میں معنی کراہت کے لئے ہے اور نماز عید الفطر میں جواز کے لئے ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: لواخروھا الی ثلثۃ ایام من غیر عذر جاز الصلوۃ وقد اساؤ و

فی الفطر الجواز حتی لواخروھا الی الغد من غیر عذر یجوز۔ (ج ۱۔ ص ۷۸)

اگر بغیر عذر کے نماز عید الاضحیٰ کو تین دن تک مؤخر کردیا تو نماز جائز مع الکراہۃ ادا ہوئی۔ اور عذر نماز فطر میں جواز کے لئے یہاں تک کہ اگر اس کو بغیر عذر کے دوسرے دن تک مؤخر کیا تو یہ جائز نہیں۔

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ بلا عذر شرعی دوسرے دن عید الاضحیٰ کی نماز پڑھنا تو مکروہ ہے اور عید الفطر کی نماز صحیح اور جائز نہیں۔

لہذا اس امام نے جب بلا عذر شرعی دوسرے دن نماز عید الفطر پڑھائی تو وہ نماز صحیح و جائز نہیں ہوئی تو لوگوں کی یہ نماز ادا نہ ہونے کا گناہ و وبال اس امام کی گردن پر رہا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۱۵) ایک شہر میں جامع مسجد یا عیدگاہ کے علاوہ کسی اور ایک مسجد یا متعدد مساجد میں نماز جمعہ و عیدین بلاشبہ جائز ہے۔

مجمع الانہر شرح الملتقی الابحر میں ہے: تجوز صلاۃ العبد فی مصر فی موضعین وعند محمد فی ثلاثۃ مواضع کما فی الفتح لکن قد کان جواز الجمعۃ فی المصر الکبیر فی مواضع کثیرۃ لدفع الحرج لان فی اتحا دالموضع حرجا بینا لا ستد عائہ تطویل المسافۃ علی الاکثر کما بین آنفا وھذہ العلۃ تجری فی العید علی انہ صرح فی بعض المعتبرات جوازہ اتفاقا وبھذا عمل الناس الیوم۔ (مجمع الانہر۔ ج ۱۔ ص ۱۷۳)

نماز عید شہر میں دو مقام میں اور امام محمد کے نزدیک تین جگہوں میں جائز ہے جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔ لیکن بڑے شہر میں دفع حرج کیلئے اکثر جگہوں پر بھی جائز ہے۔ اس لئے کہ ایک جگہ پر خاص کرنے سے کھلا ہوا حرج لازم آتا ہے کہ اکثر لوگوں کو طویل مسافت طے کرنا پڑے گی۔ اور یہی علت عید کے لئے بھی جاری ہے، اور بعض معتبر کتابوں میں جواز عید کی بالاتفاق تصریح کی اور اس وقت لوگوں کا عمل اسی پر ہے۔

درالمنتقی شرح ملتقی میں ہے: تصح فی مصر فی مواضع کثیرۃ ھو الصحیح و علیہ الفتوی۔ (ج ۱۔ ص ۱۶۷)

ایک شہر میں کثیر مقاموں پر جمعہ کی نماز صحیح ہے اور یہی صحیح مذہب ہے اور اسی پر فتوی ہے۔

مراقی الفلاح وطحطاوی میں ہے:

وتصح اقامۃ الجمعۃ فی مواضع کثیرۃ بالمصر وفنائہ وھو قول ابی حنیفۃ و محمد

فی الاصح (فی الطحطاوی قال السرخسی و به نأخذ و علیه الفتوی۔ (ص۱۹۲)

ایک شہر میں بہت سی جگہوں پر جمعہ کا قائم کرنا صحیح ہے اور اسی طرح فناء مصر میں اور یہی امام اعظم اور امام محمد کا صحیح قول ہے۔ اور امام سرخسی نے فرمایا کہ ہم اسی قول کو اختیار کرتے ہیں اور اسی پر فتوی ہے۔

و تؤدی الجمعة فی مصر و احد فی مواضع کثیرة وهو قول ابی حنیفة و محمد وهو الصحیح و ذکره امام السرخسی انه الصحیح من مذهب ابی حنیفة و به ناخذ هکذا فی البحرالرائق۔ (عالمگیری ۔ ج۱ ص۷۵)

جمعہ ایک شہر میں چند مقامات پر ادا کیا جائے اور یہی امام اعظم و امام محمد کا صحیح قول ہے اور امام سرخسی نے ذکر کیا کہ مذہب امام اعظم کا صحیح قول یہی ہے اور ہم اسی کو اختیار کرتے ہیں۔ اسی طرح بحر الرائق میں ہے:

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ شہر میں جامع مسجد یا عیدگاہ کے علاوہ کسی ایک مسجد میں یا متعدد مساجد میں نماز جمعہ وعیدین کا بقول راجح ومفتی بہ پڑھنا جائز وصحیح ہے اور جب شہر میں تعدد جمعہ وعیدین کا جواز ثابت ہو گیا تو پھر قول راجح کی بنا پر جامع مسجد یا عیدگاہ سے پہلے یا بعد کا فرق کوئی چیز نہیں۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۳۸_۳۳۹_۳۴۰_۳۴۱_۳۴۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

اگر کسی امام کی وجہ سے محلّہ کے نمازیوں میں اختلاف ہو جائے تو ایسی حالت میں متولی کو اس امام کا رکھنا یا اس امام کا رہنا ضروری ہے۔ متولی کو بغیر اطلاع یا نمازیوں کے مرضی کے خلاف امام کا رکھنا درست ہے؟ امام کی وجہ سے مقتدیوں میں اختلاف ہونا ذیل میں درج ہے۔

(۱) نماز میں امام کو بوجہ عادت یا بغیر کسی تکلیف کے اپنے داہنے پیر کے انگوٹھے کو حرکت دینا۔

(۲) نماز فرض کے علاوہ امام کا بغیر کسی تکلیف کے سنت یا نفل یا واجب کا بیٹھ کر ادا کرنا۔

(۳) نماز میں امام کا رکوع یا سجدہ میں جاتے ہوئے اپنے پائجامہ کو بار بار حرکت دینا اور سجدہ

میں اپنی دونوں کہنیوں یا ایک کہنی کا زمین پر ٹیک دینا ایسی حالت میں نماز پوری ہوتی ہے یا نہیں؟

(۴) امام نماز کا پانچوں وقت کا پورا پابند نہ ہونا۔

(۵) امام کا اخلاق اچھا نہ ہونا۔ اور صاف نہ رہنا اور نہ دوسروں کو ہدایت کرنا وغیرہ۔

برائے کرم اس کا تحریری طور پر جواب فرما دیں تاکہ محلّہ کا اختلاف دور ہو جائے۔

المستفتی مستری محمد رمضان، جناب مولوی محمد اشفاق صاحب محمد حمید جودھپور

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

امام مذکور امور بالا کی عادات ترک کرے۔ خصوصاً یہی امور اختلاف کا باعث ہیں اور بعض ان میں مکروہ بھی ہیں۔ تو شرعاً اسے ان امور سے احتیاط اور پرہیز کرنا ضروری ہے۔ اور متولی کو بھی یہی چاہئے کہ اہل محلّہ کی رضامندی کو ملحوظ رکھے خصوصاً ان کی ایسی بات جو کسی شرعی غلطی کی بنا پر ہو۔ بالجملہ امام مذکور آداب شرعی کو مدنظر رکھے اور اہل محلّہ کے اختلاف دور کرنے کا ثواب حاصل کرے۔ اور متولی یہ ایثار کرے کہ اہل محلّہ کو راضی کر کے اختلاف بین المسلمین کو دور کرے۔ مولی تعالی ان سب کو اجر وثواب جزیل عطا فرمائے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل
یکم ربیع الاخر ۱۳۷۳ھ

مسئلہ (۳۴۶_۳۴۷_۳۴۸_۳۴۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین وشرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) ہماری مسجد میں جو امام ہیں وہ ایک پیر سے لنگڑا اور ایک ہاتھ سے لنجا ہے، لیکن چلتا پھرتا ہے۔ اس کی امامت درست ہے یا نادرست؟۔ اور اس کے پیچھے نماز پڑھنی شرع مطہرہ میں جائز ہے یا ناجائز یا مکروہ ہے؟۔ شرع محمدی میں ایسے آدمی کے پیچھے نماز پڑھنی مکروہ لکھی ہے، اور بہار شریعت میں بحوالہ فتاوی عالمگیری کے یہ لکھا ہے کہ ایسے شخص سے دوسرے شخص کو کہ جس کے اندر یہ بات نہیں ہو اس کو امام بنانا اولی ہے۔

(۲) مسجد کا تیل اپنے اور اپنی بیوی کے کھانے میں خرچ کرتا ہے، اگر اس سے منع کیا گیا تو چند

مرتبہ یہ جواب دیا کہ میرے لئے جائز ہے۔ کیونکہ میں محتاج ہوں اور یہ بات اس کی غلط ہے کیونکہ یہاں پر معقول تنخواہ پر امامت کر رہا ہے۔

(۳) صدقہ فطر بھی اس نے لیا ہے، شرح وقایہ میں لکھا ہے کہ جس کے اوپر صدقہ واجب ہے اس کو صدقہ لینا ناجائز ہے۔

(۴) مسجد کی لکڑی بھی اس نے گھر کے خرچ میں جلائیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کل وجوہات مذکورہ پر نظر ڈال کر موافق شریعت مطہرہ کے ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھیں یا اسکو امام بنانا کیا ہے۔ برائے کرام جواب بحوالہ مستند حدیث شریف کے مرحمت فرمائیں۔ جواب اس کی پشت پر ہی لکھ دینا۔

راقم عبداللطیف قریشی اشرفی موضع نگلہ ڈاک خانہ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

امام مذکور میں نہ فقط اتنے جسمانی عیوب بلکہ شرعی نقطہ نظر سے یہ اہم نقص ہیں کہ وہ حلت و حرمت کا امتیاز نہیں کرتا مسجد کے تیل کو اپنے استعمال میں لاتا ہے، مسجد کی لکڑیاں اپنے گھر میں جلاتا ہے۔ صدقہ فطر خود اس پر واجب ہے۔ لیکن وہ باوجود اس کے دوسروں سے وصول کرتا ہے، تو ایسے جری وغیر محتاط اور غیر متشرع شخص کو امام نہ بنانا چاہئے۔ بیہقی ودارقطنی کی حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

اجعلوا ائمتکم خیار کم فانهم وفد کم فیمابینکم و بین ربکم ۔

(بخاری، ج۲۔ ص۴۵۹)

تم اپنے امام بہتر شخصوں کو بناؤ کیونکہ وہ تمہارے رب کے درمیان تمہارے قاصد ہیں۔

حاکم نے مستدرک میں حضرت مرثد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ان سرکم ان یقبل صلوتکم فلیؤمکم خیارکم ۔ (ص ۴۵۹)

تمہیں اگر یہ اچھا لگے کہ تمہاری نماز مقبول ہو تو تمہارے بہترین شخص تمہاری امامت کریں۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ امام ہر اعتبار سے بہتر شخص ہو، پابند شرع ہو، نیک وصالح ہو، نظر عوام میں حقیر نہ ہو، دینی احکام میں محتاط ہو، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۵۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین بابت اس مسئلہ کے کہ

پیش امام مسجد جو امامت کی خدمت انجام دے رہا ہے، اور جو کچھ نذرانہ ان کو ملتا ہے وہ اس کو تنخواہ تصور کر لے اور یہ کہے میری تنخواہ کئی ماہ سے نہیں ملی تو اگر امامت کے نذرانہ کو تنخواہ کہہ کر لیتا ہے تو اسکی امامت جائز ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

امام اپنی امامت پر تنخواہ طے کر کے ماہ بماہ مطالبہ کر سکتا ہے۔ درمختار میں ہے: و یفتی الیوم بصحتها لتعلیم القرآن والفقه والامامة والاذان ۔ (شامی مصری ج۵ ص۳۶)

فتاوی خیریہ میں ہے: و اخذ الاجرة علی الامامة لا یقول به المتقدمون اصلا واستحسنه المتأخرون لاشتغال الناس بمعاشهم وقلة من یعمل حسنة لوجه الله تعالیٰ ۔

صاحب مجمع الانہر ذخیرہ وروضہ سے ناقل ہیں۔ یجوز الاستیجار علم التعلیم و الفقه والامامة ۔ (مجمع الانہر مصری ج۲ ص۳۸۵)

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ امامت کی اجرت اور تنخواہ لینا جائز ہے۔ متاخرین فقہاء کرام نے اس کو مستحسن قرار دیکر فتوی جواز دیا۔ تو جب امامت کی تنخواہ لینا جائز ثابت ہوئی تو اب اس امام مذکور کا یہ مطالبہ تنخواہ کوئی فعل ناجائز نہیں ہوا۔ لہذا اس بنا پر اس کی امامت جائز ثابت ہو گئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۵۱۔۳۵۲۔۳۵۳۔۳۵۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین وشرع متین حسب ذیل مسائل پر جواب معہ دستخط ومہر کے روانہ فرما

ہیں۔

(۱) ایک پیش امام ایسا نابینا ہے جسے کوئی چیزیں نظر نہیں آتی ہیں، خفیف نجاست کا اندازہ نہیں کر سکتا مگر حتی الامکان پاکی کا خیال رکھتا ہے اور گاؤں کے اندر سب سے زیادہ مسئلہ مسائل جانتا ہے اور تین پارہ کا حافظ ہے۔ گاؤں کے رئیس کے یہاں سے تنخواہ پانے والا مقررہ پیش امام عرصہ دراز سے چلا آتا ہے اور عقائد اہل سنت والجماعت رکھتا ہے۔ پر ایک لڑکوں کی تعلیم دینے والے دیوبندی مولانا کے یہاں دعوت پر جس میں گاؤں کے اور چند اشخاص بھی گئے تھے تین روز شرکت کرتا ہے اور اس شخص کے پوچھنے پر جس نے جاتے وقت اس سے کہہ دیا تھا کہ تعلیم اور لڑکوں کی بود و باش کے متعلق دریافت کیا کہتا ہے کہ انتظام معقول ہے اور تعلیم اچھی ہوتی ہے وہاں لڑکوں کو بھیجنا حرج نہیں۔ اس بنا پہ کچھ لوگ اس کی پیش امامت سے گریز کرتے ہیں حالانکہ اس کے عقائد میں کچھ فرق نہیں آیا۔ اس کے پیچھے نماز ہو سکتی ہے یا نہیں اور ان گریز کرنے والے اشخاص کا علیحدہ اسی گاؤں کی دوسری مسجد میں نماز جمعہ پڑھنا درست ہے یا نہیں؟۔

(۲) دیوبندی لوگوں سے ملنے، جلنے، اٹھنے، بیٹھنے، کھانے، پینے، سلام و دعا کرنے سے ہی کیا کفر کا فتویٰ ہوتا ہے یا نہیں یا برا و ناجائز ہے؟ اگر اس کے عقائد میں کچھ فرق نہ آئے۔

(۳) کہار کافر کے بھرے ہوئے پانی سے غسل و وضو کرنا۔ اس میں پکا ہو کھانا کھانا، بازاری (کافروں کے یہاں بنی ہوئی) مٹھائیاں کھانا، کافروں سے ملنا جلنا درست ہے یا نہیں؟۔ اور سوائی لینا کیسا ہے؟۔

(۴) سوال ۲۔۳ کے عمل پیرا لوگوں کا مقابلہ۔

محمد اسماعیل خاں ہیڈ ماسٹر اسلامیہ پرائمری اسکول ہردوئی ضلع باندہ یوپی ۱۳ راگست ۵۴ء

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) امام مذکور جب تک عقائد اہل سنت وجماعت ہی پر قائم ہے اور وہ باوجود اس کے دیوبندیوں سے اجتناب اور پرہیز نہیں کرتا تو یہ اس کی بدعملی ہے۔ اسے پہلے اس بری عادت سے روکا جائے اگر وہ اپنے ان حرکات سے رجوع کر کے دیوبندیوں سے اجتناب کرنے لگے جب تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا چاہئے اور گاؤں کی دوسری مسجد میں جمعہ قائم نہ کرنا چاہئے اور اگر وہ اپنی پہلی عادت سے باز نہ آئے اور ان

سے میل جول باقی رکھے تو اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھنا چاہئے۔ اور دوسری مسجد میں جمعہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ لانہ فاسق والصلوۃ خلف الفاسق مکروہ واجب الاعادۃ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) دیوبندیوں سے ملنا جلنا، ان کے پاس بلاضرورت اٹھنا بیٹھنا، ان کے ساتھ کھانا پینا، ان سے سلام وکلام کرنا۔ ان کے ساتھ بیاہ وشادی کرنا ناجائز ہیں۔ احادیث شریفہ میں ہے: لا تواکلوھم ولا تشاربوھم ولا تناکحوھم ولا تسلموا علیھم ایاکم وایاھم۔ (رواہ ائمۃ الحدیث فی سننھم)

اور جب اس کے عقائد میں فرق نہیں آیا ہے تو محض ان امور کی بنا پر فتویٰ کفر عائد نہیں ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) کفار کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا یا مٹھائی اگر اس میں ناپاکی کا یقین نہ ہو تو اس کو کھانا جائز ہے لیکن کفار کی بے احتیاطی اور گندہ مزاجی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا کھانا خلاف اولیٰ اور نامناسب ہے بلکہ احتیاط وتقوی کے تو بالکل خلاف ہے اور ان کے ہاتھ کا بھرا ہوا پانی جس میں ان کی انگلی کے ڈوب جانے کا گمان غالب ہے۔ اس سے وضو وغسل نہیں کرنا چاہئے۔ کفار سے ملنے جلنے کا حکم جواب نمبر (۲) میں مذکور ہوا اور سوائی لینا دینا یہ ہمارا مانوس لفظ نہیں اس لئے کوئی حکم نہ دیا جا سکا۔ اس کو آپ بالتفصیل دریافت کریں تو جواب دیا جائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۴) یہ بھی مجمل ہے اس کو آپ بالتفصیل دریافت کریں تو حکم بیان کیا جا سکتا ہے۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

۲۸ رذی الحجہ ۱۳۷۳ھ

مسئلہ (۳۵۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین وشرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک شخص وکیل یا مختار کا محرر ہے اور امامت کی اہلیت بھی رکھتا ہے، بعض حضرات کا خیال ہے کہ جو شخص وکیل یا مختار کا محرر ہو اس کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز ہے۔ امید ہے کہ جواب سے مطلع فرمائیں گے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اگر شخص مذکور فی السوال دین میں مطعون نہ ہو اور فواحش ظاہرہ سے اجتناب کرتا ہو اور اہلیت امامت رکھتا ہو تو اس کی امامت نہ فقط جائز بلکہ افضل ہے۔ شامی میں ہے: وان کان افضل القوم فہو اولی۔ پھر اس کی اقتدا میں کیا شبہ وشک کیا جاسکتا ہے، اور اگر وکیل کے محرر ہونے میں اس کو ارتکاب کبائر کرنا ہی پڑتا ہے تو اسکو امامت کیلئے خود بھی تیار نہیں ہونا چاہیے۔ اور لوگوں پر فسق ظاہر ہو تو وہ بھی اسکی اقتدا سے پرہیز کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۵۶)

ایک شخص کے ہاتھ پیر منھ پر برص کے سفید داغ ہیں اور یہ شخص حافظ قاری بھی ہے، اب اسکے لئے علماء دین اور شرع متین کا کیا فتوی ہے، اس کے پیچھے کسی قسم کی نماز ہوسکتی ہے، یا نہیں؟۔

حافظ غلام رسول

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

محض کسی کو سفید برص کے داغوں کی بنا پر امامت کے لئے نا اہل سمجھنا سخت جہالت ہے، شریعت میں اس کا کوئی وجود نہیں اور جب وہ دین میں مطعون نہیں اور فواحش ظاہرہ سے اجتناب کرتا ہے اور حافظ وقاری ہے تو اس کو امامت کے لئے منتخب کرنا بلا شک جائز ہے۔ بلکہ اولی اور افضل ہے۔ شامی میں ہے۔ وانکان افضل القوم فھو اولی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۵۷)

محترمی مکرمی جناب مولانا مفتی اجمل شاہ صاحب قبلہ السلام علیکم گذارش عرض یہ ہے:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ ہمارے سنی مسلمانوں میں چند لوگ یہ کہتے ہیں کہ سنیوں کی نماز دیوبندیوں کے پیچھے جائز ہے، اور بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ بدعقیدہ ہے، اور ان کے پیچھے سنیوں کی نماز جائز نہیں ہے۔ براہ کرم معہ صحیح حوالہ کتاب مفصل جواب سے مطلع فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

دیوبندی اپنے عقیدہ میں اپنی جماعت کے سوا تمام مسلمانوں کو بدعتی اور مشرک کہتے ہیں بلکہ ان کے حکم سے اس زمانہ سے لیکر سلف صالحین ائمہ وتابعین آل واصحاب وخلفا راشدین بلکہ حضرات انبیاء کرام ومرسلین حتی کہ خود حضور سید المرسلین محبوب رب العالمین صلوات اللہ علیہ وعلیہم اجمعین میں سے کوئی بھی شرک سے بچ نہ سکا، اسی بنا پر انہوں نے اولیا کرام کی شانوں میں گستاخیاں کیں۔ اللہ تعالیٰ کی بے عیب ذات کے لئے مکر اور جھوٹ جیسے عیوب ثابت کئے، انکی یہ بدعقیدگیاں انکی کتابوں تقویۃ الایمان، حفظ الایمان، براہین قاطعہ، تحذیر الناس، وغیرہ رسائل میں چھپی ہوئی موجود ہیں انکی انہیں بدعقیدگیوں کی بنا پر علماء حرمین شریفین نے ان پر کفر کے فتوے دئے۔ تو کم از کم ان کا گمراہ واہل ہوا ہونا ناقابل انکار بات ہے اور اہل ہوا کے پیچھے نماز ناجائز ہے۔

فقہ کی مشہور ومعتبر کتاب میں یہ حکم ہے: روی عن محمد عن ابی حنیفة وابی یوسف ان الصلوة خلف اهل الا هواء لاتجوز۔ (کبیری۔ص ۴۸۰)

امام محمد نے روایت کی حضرت امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف سے کہ بیشک اہل ہوا کے پیچھے نماز ناجائز ہے۔

یہ حکم خود حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ سے مروی ہے تو جو لوگ یہ کہتے ہیں انکے پیچھے سنیوں کی نماز جائز نہیں ہے بالکل صحیح کہتے ہیں انکی یہ بات فقہ کی کتاب اور قول حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ کے حکم کے موافق ومطابق ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۵۸_۳۵۹_۳۶۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس تلفظ اور کلمہ میں کہ

(۱) شافعی کی امامت حنفی کے لئے بالکل جائز اور درست نہیں گویا ایسے قائل کسی حدتک تعزیر کا قابل نہیں؟۔

(۲) کسی زمانے میں ایسے الفاظ بولنے والوں کے ساتھ عوام مسلمانون کو کیا سلوک کرنا چاہیے؟۔

(۳) کوئی ایسا شخص خطبہ پڑھنے کو منبر پر چڑھ رہا تھا جس نے امام محمد ادریس الشافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مذہب کی پڑھی ہے اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مذہب کی کتب فقہ درسیہ ختم کردیا ہے اور حواشی اور فتاوی میں بغیر تحقیق کے نگاہ بھی ڈالا اور پکا سنی حنفی المذہب ہونے کے ساتھ رسم رسوم میں ظاہر طور پر کوئی شرعی برائی بھی نظر آتی نہیں۔ ایسے حالت میں دوسرا ایک شخص ہاتھ پکڑ کر اس کو منبر سے اتارا اور یوں بولتے ہوئے اتارا کہ تو شافعی ہے تیری امامت صحیح نہیں۔ اور روکنے والا روکتے وقت اس کا ہاتھ میں ایک عصائے بانسا بھی موجود تھا اور اسی عالم نے فساد و شور سے ڈرتے ہوئے خاموش بیٹھ گیا، تو فوراً مانع امامت العالم نے وہاں کے (اسی مسجد کے امام) امام سے یہ کہلایا آپ مسجد کا امام ہو آپ خطبہ پڑھاؤ اور امامت کرو جو عربی الفاظ کی صحت اور مسائل حنفیہ ضروریہ کی وقفیت سے خالی ہے۔ اور ان سے خطبہ اور نماز پورا کیا، اب استفتاء یہ ہے کہ گویا مانع مخوف بالعصا کا یہ قول وکلمہ کہاں تک مقبول ہے کہ شافعی کی امامت حنفی کے لئے جائز نہیں۔ نیز ان مانع کی یہ حرکت شرعا مذموم ہے یا محبوب۔ حالانکہ عالم صاحب کا کھڑا ہونا امام کا اصرار اور محبوب ترین اجازت کے بعد تھا اگر مذموم ہو تو ایسی حرکت کرنے والوں سے اہل محلہ کس قدر اور کیسا برتاؤ وسلوک کرنا شرعا ضروری ہے۔ دلائل شرعیہ کے ماتحت میں براہین قطعیہ اگر چہ ظنیہ ہوں، جواب مرحمت فرمادیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

شافعی المذہب صحیح العقائد اور اہل سنت و جماعت ہوتا ہے وہ فروعات میں احناف سے اختلاف رکھتا ہے تو صحت عقائد کی بنا پر تو شافعی کے پیچھے حنفی کی نماز جائز ہونی چاہیے۔ باقی رہا اختلاف

فروعی تو اگر شافعی امام اختلافی مسائل میں احناف کی رعایت مدنظر رکھتا ہے۔ جیسے فصد وقی وغیرہ میں رعایت احناف کی بنا پر۔ تو ایسے شافعی امام کے پیچھے حنفی کی نماز بلا کراہت جائز ہے۔ احکام احناف اور رعایت احناف کو مدنظر نہیں رکھتا تو ایسے شافعی امام کے پیچھے حنفی کی نماز جائز مع الکراہت ہے۔

ردالمحتار میں ہے: ذهب عامة مشائخنا الى الجواز اذا كان يحتاط فى موضع الخلاف والا فلا والمعنى انه يجوز فى المراعى بلا كراهة و فى غيره معها۔

اسی میں شرح منیہ سے ناقل ہیں: واما الاقتداء بالمخالف فى الفروع كالشافعى فيجوز مالم يعلم منه ما يفسد الصلوة على اعتقاد المقتدى عليه الاجماع انما اختلف فى الكراهة۔ لہذا اب جو نادان حنفی امامت شافعی کو حنفی کیلئے مطلقا ناجائز کہتا ہے وہ غلط کہتا ہے۔ اور اگر بربنائے تعصب کہتا ہے تو اسکو اپنے اس فعل مذموم سے رجوع کرنا چاہیے۔ اہل محلہ انکو سمجھائیں اگر وہ باز آگیا تو ٹھیک ورنہ اس سے تعزیرا پرہیز کرسکتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

كتبه: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۶۱_۳۶۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ

(۱) معمہ بھرنا اور امید انعام میں معمہ بھر بھیجنا جائز ہے یا نہیں،۔ اور جو ایسا کرے اس کے اس فعل کے سبب نماز پڑھنا اس کے پیچھے جائز ہے یا نہیں،۔ اور اس کو امام بنانا کیسا ہے؟۔

(۲) کسی ناجائز کام کو کرنے میں لفظ ان شاء اللہ کہنا مثلا یوں کہ انشاء اللہ یا خدا کا حکم ہوا تو میں معمہ بھر کر بھیجوں گا۔ اس طرح کہنا کہ خدا یا اس کے رسول جل جلالہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حکم ہوا یا اولیاء کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی مدد ہوئی، تو انعام پاؤں گا۔ معمہ بھر کر بھیج رہا ہوں اس طرح کہنا شرعا کیا ہے جائز ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) معمہ بھرنا اور اس پر انعام لینا یہ سب قمار اور جوا ہے۔ اور قمار کی حرمت سے کون مسلمان نہ

واقف ہے۔تو اس کام کا کرنے والا گنہگار و فاسق ہوا۔اور فاسق کی امامت مکروہ ہے۔جو واجب الاعا
ہے۔ردالمحتار میں ہے۔و اما الفاسق فقد عللوا الکراھة تقدیمه بانه لا یهتم بامر دینه و بان فی
تقدیمه للامامة تعظیمه وقد وجب علیهم اهانته شرعا۔واللہ تعالیٰ اعلم

(۲) یہ معمہ بھر کر بھیجتے وقت لفظ ان شاءاللہ کہہ کر یا یہ کہہ کر کہ خدا اور رسول جل جلالہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حکم ہوا تو انعام پاؤں گا،اس لئے معمہ بھر کر بھیج رہا ہوں۔تو اس فعل حرام پر ایسا کہنا شرعا ناجائز ناروا ہے۔ایسے شخص پر توبہ واستغفار لازم ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل،الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول،ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۶۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ
ہمارے سنی مسلمانوں میں چند لوگ یہ کہتے ہیں کہ سنیوں کی نماز دیوبندیوں کے پیچھے جائز ہے۔
اور بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہرگز نہیں۔اس لئے کہ یہ لوگ بدعقیدہ ہیں اور انکے پیچھے سنیوں کا نماز جائز نہیں ہے۔براہ کرم صحیح معہ حوالہ کتاب مفصل جواب سے مطلع فرمائیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

دیوبندی قوم کے عقائد ومسائل چونکہ کتب عقائد واحکام اسلام کے خلاف ہیں یہاں تک کہ اکابر دیوبند کا عقیدہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی توہین کرنا ہے۔جیسے اس سبوح قدوس کے لئے کذب جیسے عیوب کو ثابت کرنا دیوبندیت کی جان ہے۔اور حضرات انبیا علیہم السلام کی شانوں میں گستاخیاں کرنا جیسے ان حضرات کو نادان ، بیخبر ، عاجز ، بے اختیار لکھنا، بڑے بھائی کی سی عزت ماننا،انکی سرداری کو چودھری اور گاؤں کے زمیندار جیسی بتانا۔انکو اللہ کی شان کے آگے چمار سے زیادہ ذلیل ٹھہرانا،انکو ذرہ نا
چیز سے کمتر قرار دینا،ان سے قوت وکمال میں جادوگر اور طلسم کو زائد کہنا۔امتیوں کو اعمال میں ان سے بڑھا دینا۔انکے علوم کو بچوں،پاگلوں،جانوروں کے علوم کی برابر بتانا۔وغیرہ کفری اقوال ہیں۔جو دیوبندیت کی بنیاد ہے۔اور انکی کتابیں مطبوعہ موجود ہیں تو انہیں اقوال کی بنا پر اکابر علماء دیوبند

عرب وعجم مفتیان حرمین شریفین نے کفر کے فتوے دئے جو حسام الحرمین اور الصوارم الہندیہ میں مطبوعہ موجود ہیں۔تو جب ان دیوبندیوں کا کفر وضلالت انکی کتابوں رسالوں سے ظاہر ہے پھر انکے پیچھے اہل اسلام کی نماز کس طرح جائز ہوسکتی ہے۔فقہ کی مشہور کتاب کبیری میں ہے۔روی محمد عن ابی حنیفة و ابی یوسف ان الصلوٰة خلف اهل الاهوا لا تجوز۔یعنی امام اعظم علیہ الرحمۃ سے مروی ہے کہ گمراہوں کے پیچھے نماز جائز نہیں۔تو جب گمراہوں کے پیچھے نماز جائز نہیں۔تو یہ دیوبندی تو حد کفر تک پہونچ چکے تو انکے پیچھے نماز کس طرح جائز ہوسکتی ہے۔لہذا جن لوگوں نے کہا تھا کہ دیوبندیوں کے پیچھے سنیوں کی نماز جائز نہیں،انکا قول بالکل صحیح ہے اور کتب فقہ کے موافق ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم،

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل،الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول،ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۶۴۔۳۶۵۔۳۶۶۔۳۶۷۔۳۶۸،۳۶۹۔۳۷۰۔۳۷۱۔۳۷۲۔۳۷۳)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

کیا فرماتے علمائے دین ومفتیان شرع متین اس امر میں کہ
ایک شخص مسمی زید نے سیکڑوں مسلمانوں کے روبرو مسجد میں ایک دلخراش تقریر کی جس سے مسلمانوں کے قلوب بے چین ہیں از راہ کرم شرعی نقطہ نظر سے ان امور کے احکام بیان فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

(۱) زید نے کہا کہ جھنڈا رسم کفار ہے۔
(۲) جھنڈا اسلام میں نہ کبھی تھا اور نہ کبھی بلند کیا گیا۔
(۳) یہ بھی کہا کہ اگر جھنڈے کا ثبوت اسلام میں پایا جاتا تو جھنڈے کا صدر مسلمان ہی ہوتا جھنڈوں کا صدر کبھی مسلمان نہیں ہوا۔باوجود اس کے کہ امروہہ میں تقریبا بیالیس جھنڈے ہیں اور ہر جھنڈے کا صدر مسلمان ہی ہے،
(۴) یہ بھی کہا کہ جتنے جھنڈے کے حامی ہیں اور ترغیب صوم وصلوۃ کے نعرے لگاتے ہیں وہ سب کے سب غنڈے نانہجار نابکار ہیں۔بدمعاش اغلام باز زنا کار ولا مذہب ہیں۔
(۵) یہ بھی کہا کہ شعراء گمراہ ہوتے ہیں وہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ایسے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔مجھے اب مدینے بلالو،

(۶) شعرائے اسلام کہتے ہیں۔ محمد ﷺ اسکو نہیں سنتے اور نہ انکو سلام پہونچ سکتا ہے۔

(۷) یہ بھی کہا کہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مثل اور مردوں کے مردہ ہو چکے ہیں انکی قبر پر جا کر کہیں تو شاید سن سکیں۔

(۸) یہی بھی کہا کہ کچھ کہہ رہا ہوں اسلامی کتب دیکھ کر اور سمجھ کر کہہ رہا ہوں، کسی کے بہکانے سے نہیں کہہ رہا ہوں،۔

(۹) کیا ایسا شخص مسلمانوں کا امام ہوسکتا ہے کیا اس تقریر کے حامی کے پیچھے مسلمانوں کی نماز ادا ہوسکتی ہے؟۔

(۱۰) ہر ایک نمبر کے محازی جواب مرحمت فرمایئے۔ کیا اسلامی کتب اسی قسم کی تعلیم سے بھرپور ہیں۔ ہر ایک نمبر کے مطابق جواب دیں گے۔۔زحمت گوارہ فرمایئے۔

حکیم ڈاکٹر اخلاق محمد محلہ منڈی چوب امروہہ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱۔۲) اسلام میں جھنڈا تھا، اور ہمیشہ رہا اور خود بانی اسلام علیہ السلام، کے دو جھنڈے تھے، ایک سیاہ رنگ کا دوسرا سفید جو غزووں میں بلند کئے جاتے تھے، حضرت شیخ محقق عبدالحق محدث دہلوی مدراج النبوۃ میں نقل فرماتے ہیں۔ وآں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رایات بود یک رایت سیاہ بود کہ عقاب نام داشت دیگر لوائے سفید بود۔ اب زید کا جھنڈا کو رسم کفار بتانا کیسی زبردست جرأت ودلیری ہے۔ اور خود اسکی جہالت ونادانی کی کیسی روشن دلیل ہے۔ بیشک یہ زید اپنے اس باطل قول سے رجوع کرے اور توبہ واستغفار کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۳) اکثر جھنڈے کا بلند کرنے والا مسلمانوں کا صدر اور سردار ہی ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جنگ خیبر میں حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ کو اسی خصوصیت وامتیاز کی بنا پر جھنڈا عطا فرمایا اور ایک دن قبل یہ مژدہ دیا۔ ولا عطین الرایۃ غدا رجلا یفتح اللہ علی یدیہ یحب اللہ و رسولہ و یحبہ اللہ و رسولہ ۔ یعنی میں جھنڈا اکل ایسے شخص کو دوں گا کہ اللہ جس کے ہاتھ پر فتح عطا فرمائے گا، جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔ اور اللہ ورسول اس سے محبت رکھتے ہیں۔

اسی طرح جنگ موتہ میں حضرت زید بن حارثہ امیر لشکر تھے جو جھنڈے کو بلند کرتے تھے جب وہ شہید ہو گئے تو حضرت جعفر طیار کو امیر بنایا گیا، تو انہوں نے جھنڈے کو بلند کیا۔ جب وہ بھی شہید ہو گئے، تو حضرت عبداللہ بن رواحہ کو امیر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے اس جھنڈے کو بلند کیا۔ جب وہ بھی شہید ہو گئے تو حضرت خالد بن ولید کو امیر متعین کیا گیا۔ انہوں نے اس جھنڈے کو بلند کیا۔ فتح مکہ میں تو ہر قبیلہ اور جماعت کا علیحدہ علیحدہ ممتاز جھنڈا تھا تو اس لشکر میں کثیر جھنڈے بلند تھے۔ جیسا کہ کتب سیر مواہب لدنیہ وغیرہ میں ہے تو اس طرح سرداران مسلمین نے جھنڈوں کو بلند کیا ولہرایا ہے۔ تو اب زید کا قول کس قدر غلط اور باطل ثابت ہوا اور وہ کس قدر دینی امور سے ناواقف اور بیخبر ظاہر ہوا۔ اور وہ کتنا بڑا جاہل، اور نادان قرار پایا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۴) احادیث میں وارد ہے، کہ زمانہ نبوی میں اعلان نماز کے لئے کثیر بن صلت کے گھر کے قریب جھنڈا نصب کیا گیا۔

ابوداؤد شریف کی حدیث میں ہے۔ فاتی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم العلم الذی عند دار کثیر بن الصلت فصلی ثم خطب الح ۔ یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس جھنڈے کے پاس تشریف لائے جو کثیر بن صلت کے گھر کے قریب تھا، پھر حضور نے نماز عید پڑھائی، اس کے بعد خطبہ پڑھا تو جب اعلان صلوۃ کے لئے جھنڈے کا ثبوت موجود ہے تو ترغیب صلوۃ کے لئے جھنڈا بلند کرنے کی بھی یہی حدیث اصل و دلیل قرار دی جا سکتی ہے۔ زید جو اس کو ممنوع کہتا ہے، وہ بھی تو اس کی ممانعت پر کوئی حدیث صریح پیش کرے۔ ورنہ دعوی بلا دلیل قابل قبول نہیں۔ اسی طرح اس جھنڈے کی حمایت شرعا ممنوع نہیں تو اس کے حامیوں پر لعن وطعن کس دلیل کی بنا پر ہے۔ پھر تو غیر صوم وصلوۃ کے لئے نعرے لگانا بھی شرعا ممنوع نہیں۔ بلکہ فعل محمود و مستحسن ہے۔ کہ حدیث شریف میں ہے۔ مارأہ المومنون حسنا فھو عند اللہ حسن۔ یعنی مسلمان جس چیز کو اچھا جانیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔ تو زید اسکی برائی کو بھی کسی نص سے ثابت کرے۔ پھر اس کا سب مسلمانوں کو غنڈا و ناہنجار نابکار و بدمعاش کہنا اور اغلام باز و زنا کار بتانا اگر درحقیقت باعتبار واقع کے صحیح ہے جب تو وہ مجرم قرار نہیں پاتا اور اگر یہ باتیں خلاف واقعہ فقط افترا و الزام ہیں یا محض اس جھنڈے کو بلند کرنے یا ترغیب صوم وصلاۃ کے نعرے لگانے کی بنا پر ہیں تو زید شرعا سخت مجرم و گنہگار اور مفتری وکذاب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۵) مطلقاً شعرا کو گمراہ کہہ دینا اسکے خود گمراہ ہونے کے دلیل ہے۔ صحابہ کرام میں حضرت حسان بن ثابت، عبداللہ بن رواحہ۔ کعب بن مالک۔ کعب بن زہیر۔ ابوسفیان بن حارث۔ عباس بن مرداس۔ عدی بن حاتم وغیرہ ہیں۔

اور امام شعبی نے فرمایا: کان ابوبکر یقول الشعر و کان عمر یقول الشعر و کان علی اشعر منھما وروی عن ابن عباس انه کان ینشد الشعر و ینشده فی المسجد۔

(تفسیر خازن، ج ۸۔ ص ۱۱۰)

یعنی حضرت ابوبکر شعر کہتے تھے، اور حضرت عمر شعر کہتے، اور حضرت مولی علی دونوں سے بڑے شاعر تھے، حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ شعر کہتے اور مسجد میں شعر پڑھواتے تھے، پھر سلف وخلف میں صدہا شعرا گزرے اور وہ مسلمان شاعر جو حمد ونعت و مدح ومنقبت وعظ ونصیحت کے اشعار حد شرع میں رہ کر کہتا ہے تو کیا یہ گمراہ ان سب کو گمراہ کہہ سکتا ہے۔ اب باقی رہا شاعر کا یہ لکھنا کہ مجھے اب مدینہ بلا لو، ہرگز ہرگز گمراہی نہیں۔ اگر زید اسکو گمراہی کہتا ہے تو کسی معتبر دلیل سے ثابت کرے لیکن انشاء اللہ تعالی وہ کسی دلیل سے اسکا گمراہ ہونا ثابت نہیں کر سکتا اور نہ اسکے ہر کہنے والے کو گمراہ کہہ سکتے ہیں۔

(۶) فقط شعرا ہی نہیں بلکہ ہر مسلمان نماز جیسی عبادت میں حضور نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم پر السلام علیک ایہا النبی کہہ کر سلام بھیجتا ہے تو اگر حضور روحی فداہ تک سلام نہیں پہنچ سکتا نہ وہ اسکو سن سکتے ہیں تو پھر ساری امت کا یہ فعل کیا زید کے نزدیک لغو وبیکار ہے۔ پھر شارع علیہ السلام نے بلکہ قرآن مجید میں خود اللہ تعالی نے مسلمانوں کو صلوۃ وسلام کا حکم کیوں دیا۔ علاوہ بریں خود زید ہی نماز میں ان کلمات سلام کو قعدہ میں پڑھتا ہے یا نہیں۔ اگر پڑھتا ہے تو کیا سمجھ کر پڑھتا ہے۔

نسائی شریف کی حدیث میں ہے۔ ان للہ ملائکة سیاحین فی الارض یبلغونی من امتی السلام۔

یعنی حضور اکرم ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالی کے کچھ فرشتے ہیں زمین میں سیر کرنے والے جو مجھ تک میری امت کا سلام پہونچاتے ہیں۔ تو یہ زید اس حدیث کا انکار کر کے خود بھی گمراہ ہوا یا نہیں۔

اسی طرح دلائل الخیرات میں یہ حدیث ہے: اسمع صلاة اهل محبتی واعرفهم۔

یعنی حضور فرماتے ہیں کہ میں اپنے عشاق کے صلوۃ وسلام کو خود سن لیتا ہوں اور ان کو پہچانتا ہوں۔

تو اب اس زید کا ان احادیث کے خلاف یہ کہنا کہ امتی کا سلام نہ حضور تک پہونچتا ہے، نہ حضور سن سکتے ہیں۔ اس زید کی کیسی جرات ودلیری وگمراہی وبیدینی ہے۔ واللہ تعالی اعلم،

۷۔ حضرات انبیا کرام علیہم السلام مثل اور مردوں کے ہرگز ہرگز مردہ نہیں ہیں، بلکہ وہ بعد وفات بھی اپنی قبور میں زندہ ہیں۔

امام بیہقی نے کتاب حیاۃ الانبیاء میں اس حدیث کی روایت کی۔

الانبیاء احیاء فی قبورهم یصلون ۔ یعنی حضرات انبیاء کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں نماز پڑھتے ہیں۔

اسی طرح یہی بیہقی شعب الایمان میں اس حدیث کے راوی:

من صلی علی عند قبری سمعته ۔ یعنی حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو میری قبر کے پاس مجھ پر درود پڑھے اس کو میں خود سن لیتا ہوں۔

اب زید کا ان احادیث کے خلاف یہ کہنا کہ حضور مثل اور مردوں کے مردہ ہو چکے ہیں اور وہ قبر کے پاس کے سلام کو شاید سن سکیں۔ کیسی جرات ودلیری اور بیدینی وگمراہی ہے۔ واللہ تعالی اعلم،

(۸) اسلامی کتب اور صریح احادیث سے اس فتوی میں زید کی ہر بات کا غلط ہونا اور خلاف دین ہونا ثابت کر دیا گیا۔ اب اس زید کی یہ جرات اور ڈھٹائی کرنا کہ اسکی ہر بات موافق کتب اسلامی ہے صریح کذب اور افترا ہے۔ اگر وہ قول کا سچا اور بات کا پکا ہے تو ان کتب اسلامی کو پیش کرے ورنہ، لعنة اللہ علی الکاذبین۔ پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لے۔

(۹) ایسا جری شخص جو قرآن وحدیث کی کھلی ہوئی مخالفت کرے۔ عقائد اسلام کے خلاف عقیدہ بنائے، مسلمانوں پر افترا وبہتان باندھے، انکو گمراہ بتائے، وہ ہرگز ہرگز مسلمانوں کا امام نہیں ہو سکتا، ایسے گمراہ اور اہل ہوا کے پیچھے، اہل اسلام کی نماز ادا نہیں ہو سکتی ہے۔ فقہ کی مشہور کتاب کبیری میں ہے:

وروی محمد عن ابی حنیفة و ابی یوسف ان الصلوة خلف اهل الا هو اء لایجوز۔

(کبیری ص ۴۸۰)

یعنی حضرت امام محمد نے حضرت امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہم سے روایت کی کہ اہل ہوا گمراہ کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ لہذا اہل اسلام ایسے گمراہ کے پیچھے ہرگز ہرگز نماز نہ پڑھیں۔ واللہ تعالی اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۷۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ

زید دہلی کا رہنے والا ہے اور مراد آباد کی کسی مسجد میں امامت کرے بیوی بچے سب دہلی میں ہی رہتے ہیں تو کیا زید کے تنہا ہونے سے امامت میں فرق آتا ہے۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

صورت مسئولہ میں زید کی امامت میں کسی طرح کا فرق نہیں آتا۔ اگر ایسا ہوتا تو سلف وخلف دوسرے دور دراز مقامات پر کسی کو امام بنا کر روانہ نہ کرتے۔ پھر اگر شرع میں یہ شرط ہوتی تو کسی کتاب میں تو نظر سے گزرتی، تو معلوم ہوا کہ یہ شرط جاہلانہ دماغ کی پیداوار ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۷۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ

زید کی بیوی بچے سب ساتھ ہیں مگر زید کی بیوی پردہ نہیں کرتی بے پردہ رہتی ہے تو کیا بیوی کے بے پردہ رہنے کی وجہ سے زید کی امامت میں کوئی فرق آئے گا۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

زید کی بیوی جب بے پردہ پھرتی ہے، اور اسکو زید بے پردگی سے نہیں روکتا تو زید کے پیچھے نماز نہ پڑھی جائے، جامع العلوم میں فتاوی برہانیہ سے ناقل ہیں:

قال ابوحنيفة رحمه الله تعالى: امرأة خرجت من البيت و لا يمنعها زوجها فهو ديوث لا تجوز الصلوة خلفه ولا يقبل شهادته وعليه الفتوى ۔

تو اس عبارت سے ظاہر ہوا ہو گیا کہ بیوی کی بے پردگی سے شوہر کی امامت میں فرق آجاتا ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم **کتبہ** : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۷۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ

زید کی لڑکی جوان ہوگئی ہے اور ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی ہے تو لڑکی کی شادی نہ ہونے سے زید کی امامت میں کچھ فرق آتا ہے؟۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

صرف لڑکی کا جوان ہو جانا اور اسکی شادی کا نہ ہونا، امامت پر اثر انداز نہیں۔ اگر باپ جوان لڑکی کی شادی میں جلدی کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۷۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ

اگر زید گنپتی کی پوجا کرے، یا حد شرع سے داڑھی کم رکھے، اور دوسری رسم اہل ہنود کی کرے، تو کیا ان صورتوں میں زید امامت کر سکتا ہے؟۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

جب زید حد شرع سے داڑھی کم رکھتا ہے تو وہ فاسق ہوا اسکی امامت اس بنا پر تو مکروہ تحریمی ہوئی اور اگر وہ گنپتی کی پوجا کرے یا اہل ہنود کی اور رسمیں ادا کرے تو اس بنا پر امامت کا بالکل اہل ہی نہیں رہا، تو اس صورت میں کوئی اسکی اقتدا ہی نہ کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ (۳۷۸)

کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ

اگرزید گائے، بکری، بیل، ذبح کرنے جاتا ہے، تو اسکی امامت میں کوئی فرق ہے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

زید پر جانور ذبح کرنے کی بناء پر کوئی الزام شرعی عائد نہیں ہوتا، تو اس بناء پر کوئی اثر اس کی امامت پر نہیں پڑتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم، بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۷۹)

کیافرماتے ہیں علمائے دین شریعت کی رو سے

ایک شخص کتنے ہی آدمیوں سے عداوت رکھتا ہے اور مجھ سے بھی عداوت رکھتا ہے اور میرے خلاف جھوٹا دعوی کیا تھا۔ پنچکورٹ میں اور اس کے متعلق یہ آواز بھی اٹھی ہوئی ہے کہ یہ شخص نماز نہیں پڑھتا۔ لیکن وہ کبھی کبھی امام کی غیر موجودگی میں نماز پڑھانے کھڑا ہوجاتا ہے اور میری طبیعت اس کے پیچھے نماز پڑھنے کو نہیں چاہتی ہے تو میرے لئے کیا حکم ہے اور ایسا شخص نماز پڑھانے کے قابل ہے کہ نہیں اور دونوں میاں بیوی ذرا ذرا سی بات پر جھگڑتے رہتے ہیں اور اسکی بیوی بستی کے باہر جانوروں کا گوبر لینے کے لئے بھی جاتی ہے ایسے شخص کے لئے امام بننے کا کیا حکم ہے شریعت کا جواب دیں باقی میرا سلام۔

نور محمد ولد خدا بخش مقام ڈاکخانہ مانگروالی ضلع کوٹہ متصل جمعہ مسجد

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

شخص مذکور کے یہ افعال واعمال اس حد تک مشہور ہوگئے کہ ان سے عام طور پر مقتدی واقف ہیں یا وہ یہ افعال بالاعلان کرتا ہے تو وہ شرعا فاسق معلن ہے اور فاسق معلن کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے لہذا اور

اگر امام بھی بن جائے تو جو شخص اس کے فاسق معلن ہونے کی بناپر اس کی اقتداء نہ کرے تو وہ شرعا مجرم نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۸۰)

کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک شخص حافظ قرآن وذی علم ہوتے ہوئے بھی اپنی منکوحہ بیوی کے انتقال ہوجانے کے بعد منکوحہ بیوی کی چھوٹی بہن کو حافظ صاحب نکال لائے ہیں جو دوسری جگہ بیاہی ہوئی تھی اس نکالی ہوئی مساۃ کو اتنی مدت تک بلا نکاح رکھے رہے کہ دو بچے پیدا ہوئے وہ اب تک بحیات ہیں اور سن تمیز کو پہونچ چکے ہیں اور حافظ صاحب کا بایاں پیر بھی کٹا ہوا ہے ایڑی ہے اور کچھ تھوڑا حصہ اور ہے پنجہ نہیں ہے لیکن چلنے پھرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہے بچوں کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد نکالی ہوئی مساۃ کے شوہر سے طلاق لیتے ہیں اور عدت گذار کر کے اپنا عقد نکالی مساۃ کے ساتھ کرتے ہیں اور حافظ صاحب کہتے ہیں کہ میں نے اپنے گناہوں سے توبہ کرلیا ہے دوئم یہ کہ حافظ صاحب نماز پنجگانہ فرض اور جمعہ کی پڑھا سکتے ہیں یا نہیں سوئم یہ کہ مقامی مولوی کے انتقال ہوجانے کے بعد دیگر قریبی موضع کے ایک حافظ قرآن صاحب تراویح ونماز عید وبقرہ عید کی پڑھاتے تھے لیکن امسال یہ حافظ صاحب مذکور عید بقرہ عید کی نماز پڑھانے کے لئے جبراً کھڑے ہوئے اور امامت کی جس کی وجہ سے مسلمانوں میں دو جماعتیں ہوگئیں اور نماز دوجگہ ہوئی۔ ایسی حالت میں ہم کو از روئے شرع محمدی جواب سے مطلع کیا جاوے آیا کہ حافظ مذکور کے پیچھے نماز پنجگانہ فرض وجمعہ پڑھنا درست ہے یا نہیں اس کی ایک نقل الہ آباد اور ایک دہلی بھی روانہ کررہا ہوں امید ہے کہ جواب سے جلد مطلع کریں۔

نوٹ:۔ جماعت میں اس سے زیادہ ذی علم کوئی نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ جند و محمد حسن فرحت
رجنٹ بہرور ری پوسٹ خاص

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

امام کے لئے جب پیر کا کٹا ہونا شرعی مجبوری کی کسی حد تک نہیں پہنچا ہے تو اتنی بات سے ان کی امامت قابل اعتراض نہیں ۔ ہاں جب غیر منکوحہ عورت کو اپنے پاس رکھا اور اس سے حرام کاری میں جو ہوا جس سے اہل محلہ بھی واقف ہیں ۔ اور اہل مسجد اس گناہ پر مطلع ہیں تو اس کا امام بنانا شرعا مکروہ ہے اس کے پیچھے نماز مکروہ واجب الاعادہ یہ نماز پنجگانہ کے لئے حکم ہے رہا جمعہ اور عیدین اس میں اس قدر کراہت نہیں ۔ واللہ تعالٰی اعلم بالصواب ۔ ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۷۹ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۸۱ـ۳۸۲ـ۳۸۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں ۔

(۱) صلوۃ عید الفطر وصلوۃ عید الاضحٰی کی جماعت سے پیشتر ایک شخص عیدگاہ کے منبر پر کھڑا ہوکر صلوۃ پکارتا ہے اس کا جواز کتاب اللہ کتاب سنت سے مدلل و مفصل طور سے ہے یا نہیں اور چند افراد کا کہنا ہے کہ جو شخص منبر پر صلوۃ کہتا ہے اس فرد پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہتے ہیں کہ اس شخص کو اپنا منھ قبلہ رخ رکھنا چاہئے جس طرح نماز میں جہت کعبہ کھڑے ہوتے ہیں ۔ جانب مشرق منھ نہیں رکھنا چاہیے ۔ یہ کیا ہے صلوۃ کہنے میں جہت قبلہ رخ کرنے کا ثبوت قرآن وحدیث سے مدلل ومسکت مع دلائل واضح عبارات صحیح وساطعہ مع متوں وشروح مطابع مصنفین وصفحات سے مطلع فرمائیں ۔

(۲) مثلا ایک امام مسجد اسمگلر یعنی افیون فروخت کرتا ہے اس کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں ایسا شخص امامت کے قابل ہے یا نہیں؟ ۔

(۳) ایک شخص نے اپنی زوجہ دوم کی بغیر طلاق دیئے ایک لڑکی سے ناجائز تعلقات کے طور سے عقد سوم اس لڑکی ہذا سے کرلیا ہے یہ نکاح سوم از روئے شریعت کے درست ہوا یا نہیں لہذا مسائل ثلاثہ کو کافی شافی وافی مستند دلائل سے تحریر فرمائیں ۔

راقم حافظ محمد قاسم عفی عنہ اجملی خادم بینوا توجروا ۱۷/ اپریل

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) کتاب اللہ اور سنت نبیہ اس کی صریح ممانعت کا نہ ہونا دلیل جواز ہے باجود اسکے کسی اور دلیل کی حاجت نہیں باقی رہی اس کا قبلہ کو رخ نہ کرنا اور لوگوں کی طرف منھ کرنا تو یہ درست ہے کہ بعد فراغت نماز امام کا لوگوں کی طرف متوجہ ہونا اور دعا کرنا اور خطیب کا جہت قبلہ سے موڑ کر لوگوں کی طرف منھ کرنا اس کی کافی دلیل ہے ۔ اعتراض کرنے والے اسی پر غور کر کے مسئلہ کو حل کرلیں ۔ واللہ تعالٰی اعلم بالصواب

(۲) افیون کا فروخت کرنا شرعا حرام ہے تو اس کا مرتکب فاسق قرار پایا اور فاسق کی امامت بہ تصریح فقہاء کرام مکروہ تحریمی بتاتے ہیں تو یہ شخص ہرگز قابل امامت نہیں اور اس کے پیچھے نماز درست نہیں ۔ واللہ تعالٰی اعلم بالصواب

(۳) زوجہ کی لڑکی سے نکاح حرام وناجائز ہے ۔
فتاوی عالمگیری میں محرمات کے ذکر میں ہے :
والثانیة بنات الزوجة و بنات اولادها وان سفلن ۔
تو یہ نکاح ہرگز صحیح نہ ہوا بلکہ باطل ہے ۔ واللہ تعالٰی اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل
یکم ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ

﴿۲۲﴾

باب سجود السہو

مسئلہ (۳۸۴)

لوقرء المصلیٰ فی الرکعۃ الاولی من السورۃ البقرۃ ثم فی الرکعۃ الثانیۃ نسی… قف وتفکر فلم یتذکر لہ وقرأ سورۃ اخری فھل علیہ سجدۃ السھوام لا ۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

لایلزمہ سجود السھو فی ھذہ الصورۃ نعم ان طال تفکرہ ومنعہ التفکر عن القرا… یجب علیہ سجود السھو صرح بہ فی الغنیۃ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۸۵)

لو قرء سورۃ فی الرکعۃ الاولیٰ ولم یختم لطولھا ثم فی الرکعۃ الثانیۃ شرع سو… اخری وھو حافظ فھل علیہ سجود السھو ۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

لا یجب علیہ سجود السھو فی ھذہ الصورۃ لعدم وجود سبب من اسبا… یفھم من کتب الفقہ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۸۶)

لو سھا عن القعدۃ الاخیرۃ وقام الی الخامسۃ فتذکر قبل السجود وجلس فھل علیہ سجود السھو ام لا ؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ذکر فی القنیۃ ان سھا عن القعدۃ الاخیرۃ فی ذوات الاربع وقام الی الخامسۃ یعود الی القعدۃ ما لم یسجد للخامسۃ ویسجد للسھو لتاخیر القعدۃ وان قید الرکعۃ الخامسۃ بالسجدۃ بطل فرضہ وتحولت صلوتہ نفلا واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۸۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسائل ذیل میں
الحمد شریف میں غالباً سات آیتیں ہیں ان میں سے ہر ایک کا پڑھنا واجب ہے یا کل الحمد کا؟۔
اگر ہر آیت واجب ہے تو اگر امام ایک آیت چھوڑ دے سہو سے، یا مکرر پڑھے، یا جہر میں اخفا اور اخفا میں جہر کرے۔ اس صورت میں کیا حکم ہے؟ اگر الحمد کی ہر آیت واجب ہے نماز کے اندر تو اس کا حکم بھی واجب کے احکام جیسا ہوگا یا اسکے خلاف؟

المرسل مولوی محمد عبداللہ خاں از نگینہ مسجد اون ضلع ایوت محل برار
۲۸ جولائی ۱۵ء بروز جمعہ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

الحمد شریف کی ہر آیت واجب ہے۔اور جب ہر آیت واجب ہوئی تو اس کے ترک یا تکرار یا اختلاف جہر وسر پر سجدہ واجب ہے۔

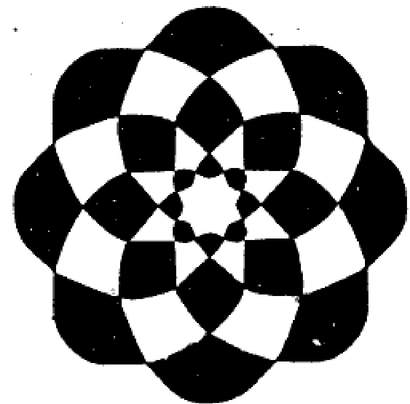
درمختار میں ہے:" ویسجد بترك آية منها (اى الفاتحة) وهو اولى قلت فكل آية واجبة "

(شامی ص۳۲۱) واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۲۷/شوال المکرم ۱۳۷۰ھ ۱۹۵۱ء

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل ،الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول،ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل



﴿۲۳﴾

باب صلوٰۃ المسافر

مسئلہ (۳۸۸-۳۸۹) از سنبھل محلّہ کوٹ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) ایک شخص نے اپنے گھر سے ارادہ پنتالیس کوس کے سفر کا کرلیا لیکن پندرہ کوس پر چل کر قیام کیا اور وہاں پر اپنے کام میں مصروف رہا اور اس کام کا ارادہ بھی اس نے گھر ہی سے اپنے دل میں کرلیا تھا،اور اسی طرح متعدد مقامات پر اپنے کاموں کی وجہ سے رکا رہا اور اپنے کام پورا کرتا رہا۔اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ یہ شخص مسافر رہا یانہیں؟اور اس پر احکامات مسافر واجب ہوں گے یانہیں؟۔بینوا وتوجروا

(۲) ایک شخص نے رمضان المبارک میں فرض جماعت کے ساتھ ادا نہیں کئے۔البتہ تراویح ضرور جماعت کے ہمراہ ادا کیں۔تو یہ شخص وتر جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے یانہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسافر جبکہ پینتالیس کوس تک اپنے گھر سے جانے کا ارادہ کرکے چلا۔یا اپنے شہر اور بستی کی آبادی سے اس نے تجاوز کیا تو اس پر مسافر کے احکام واجب ہوگئے۔اور یہ احکام جب تک واجب رہیں گے کہ جب تک کہ اپنے شہر پر واپس نہ آئے کہ پندرہ یوم یا زیادہ کی اقامت کی نیت نہ کرے۔پس شخص مذکور فی السوال کو مسافر کے احکام ادا کرنے پڑیں گے۔

شرح وقایہ میں باب صلاۃ المسافر میں ہے:

هو من قصد سيرا وسطا ثلثة ايام ولياليها وفارق بيوت بلده۔

اور اس کے بعد ہے:وله رخص تدوم وان كان عاصيا فى سفره حتى يدخل بلده او ينوى اقامة نصف شهر ببلدة او قرية۔

اور ہدایہ میں اس باب میں: واذا فارق المسافر بيوت المصر صلى ركعتين ولا يزال على حكم السفر حتى ينوى الاقامة فى بلدة او قرية۔

وتر جماعت سے ادا کرنے چاہیں اگرچہ فرض جماعت سے ادا نہ کئے ہوں۔

درمختار میں ہے: ولو لم یصلھا ای التراویح بالامام او صلاھا مع غیرہ لہ ان یصلی الوتر معہ۔

کتبہ عبدالوحید سنبھلی۔

الجواب صحیح بلا ریب، محمد معین الدین عفی عنہ مدرس مدرسہ محمودیہ ریاست چھتاری ضلع بلندشہر

الجواب صحیح سعید احمد عفی عنہ مدرس مدرسہ سراج العلوم سنبھل ر

الجواب صحیح محمد مظہر اللہ عفی اللہ عنہ سنبھلی مدرس مدرسہ عبدالرب دہلی

الجواب صحیح محمد عبدالحق عفی عنہ

المجیب مصیب:۔ خصوصا دربارہ وتر صغیری میں مذکور ہے۔

واذا لم یصل الغرض مع الامام قیل لا یتبعہ فی التراویح ولا فی الوتر وکذا اذالم یصل معہ التراویح لا یتبعہ فیا لوتر والصحیح انہ یجوز ان یتبعہ فی ذالک کلہ۔ محمد کریم غفرلہ مدرس مدرسہ الشرع سنبھل

صح الجواب:۔ اور خاص وتر کے متعلق کبیری میں یہی لکھا ہے کہ صورت مذکورہ میں جماعت کے ساتھ پڑھنا چاہئے۔

وقال ابو یوسف اذا صلی: مع الامام شیئا من التراویح یصلی معہ الوتر وکذا اذالم یدرک معہ شیئا منھا وکذا اذا صلی مع غیرہ لہ ان یصلی الوتر معہ وھو الصحیح ذکرہ ابو اللیث۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

عبدالوحید عفی عنہ سنبھلی مدرس مدرسہ [illegible]

الجواب

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم:

یہ دونوں جواب ان سوالات سے بالکل غیر متعلق ہیں۔ مجیب صاحب کو جب یہ مسائل معلوم نہیں تھے تو پھر قلم اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ اور پھر اگر کاش یہ حضرات ان عبارات کو اپنے اپنے جواب میں نقل نہ کرتے تو مجھ کو اتنی کافی بحث کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔ اس وقت صرف ان کا جواب ہی غلط ٹھہرتا۔ مگر جب انہوں نے عوام کو دھوکا دینے کے لئے کتب فقہیہ سے بے علاقہ عبارتیں نقل کی ہیں۔ لہٰذا مجھ کو ان کی علمی قابلیت اور ان عبارات کے صحیح محمل کے اظہار کی ضرورت ہوئی اور عوام کو ان کے فریب سے آگاہ کرنا لازم

ہوا۔ علاوہ بریں ان میں ہر ایک غالبا صدر مدرس ہے اور بعض کا اکثر عمر کا حصہ اسی درس و تدریس میں گذرا مگر سخت افسوس ہوتا ہے ان میں ابھی تک عربی عبارات کی صحیح مراد نکالنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی اور اپنے مدعا پر دلائل اور عبارات کا منطبق کرنا بھی نہیں آیا۔ اور سوال و جواب میں تعلق اور عدم تعلق کی معرفت بھی حاصل نہیں ہوئی۔ اور پھر یہ انہیں صاحبوں کی حالت نہیں ہے بلکہ ان کے پیشوا مولوی رشید احمد گنگوہی اور مولوی اشرفعلی تھانوی بھی اسی غلطی میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ فتاوی رشیدیہ اور فتاوے اشرفیہ میں مسئلہ وتر کو اسی طرح لکھا ہے۔ لہٰذا میں ان حضرات سے یہ التجا کرتا ہوں کہ آپ حضرات کی جب یہ حالت زار ہے تو للہ مسلمانوں کی حالت پر رحم کیجئے اور ان کو ایسے غلط فتوے دیکر فرقہ بندی کی بلا میں گرفتار نہ کیجئے۔

جواب مسئلہ سفر

شخص مذکور فی السوال مسافر نہیں ہوا بلکہ مقیم ہی رہا۔

مقدمہ اول: جو سفر احکام شرع متغیر کرنے کا سبب ہے وہ کم از کم تین دن کا سفر ہے۔

چنانچہ کبیری میں ہے: السفر التام الذی بہ یتغیر الاحکام لکونہ مظنۃ المشقۃ المقتضیۃ للتخفیف ھو الثلثۃ۔

اس لئے اگر کوئی شخص تمام دنیا کی سیر کر آیا اور کسی مکان خاص سے اس کا قصد متعلق نہ ہوا جس میں تین دن کی مسافت ہو تو یہ شخص مسافر نہ ہوگا۔ چنانچہ جوہرہ نیرہ میں ہے:

لو طاف جمیع الدنیا ولم یقصد مکانا بعینہ بینہ و بینہ ثلثۃ ایام لا یصیر مسافر۔

لہٰذا سفر کے احکام مرتب ہونے کے لئے تین دن کی مسافت کا ارادہ ضروری ہوا۔

مقدمہ دوم: اس مقدار سفر میں نزول بھی ضروری ہے۔ اب وہ نزول یا استراحت کے لئے ہوگا یا حاجت کے لئے۔ نزول استراحت تو بضرورت مدت سفر کے ساتھ لاحق کر دیا گیا۔ چنانچہ جوہرہ نیرہ میں ہے:۔

فالحقت مدۃ الاستراحۃ بمدۃ السفر للضرورۃ۔

اب رہا نزول حاجت تو یہ علت قصر سفر یعنی مشقت کی شرط ثانی کے منافی ہے۔

شامی میں ہے: العلۃ فی الحقیقۃ ھی المشقۃ واقیم السفر مقامھا ولکن لا یثبت علیتھا الابشرط ابتداء و بشرط بقاء فالاول مفارقۃ البیوت قاصدا مسیرۃ ثلثۃ ایام و الثانی استکمال السفر ثلثۃ ایام فاذا وجد الشرط الاول ثبت حکمھا ابتداءً فلذا یقصر بمجرد مفارقۃ العمران

نادیا ولا یدوم الابشرط الثانی فهو شرط لاستحكامها علة فاذا عزم على ترك السفر قبل تمامه بطل بقائوهاعلته لقبولها النقض قبل الاستحكام۔

یعنی سفر میں تخفیف کی علت حقیقیہ مشقت ہے اور سفر اس کا قائم مقام ہے۔ لیکن اس کا علت ہونا دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔

پہلی شرط تین دن کی مسافت کا قصد کر کے اپنے شہر کی عمارتوں سے جدا ہونا۔ دوسری شرط تین دن کے سفر کو کامل کرنا۔ لہٰذا جب شرط اول پائی جاتی ہے سفر کا ابتدائے حکم ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے بشرط سفر اپنے شہر کی عمارتوں سے جدا ہوتے ہی قصر کا حکم ہو جاتا ہے لیکن شرط ثانی کے ساتھ وہ حکم قصر باقی رہتا ہے۔ تو یہ دوسری شرط علت سفر کے استحکام کی شرط ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے مقدار سفر تمام ہونے کے قبل سفر کے ترک کرنے کا ارادہ کیا تو قصر کا حکم جو علت کی بقا سے حاصل ہوا تھا باطل ہو جائے گا کہ استحکام سفر سے پہلے ہی اس نے نقض کو قبول کر لیا۔

لہٰذا اس عبارت کا یہ نتیجہ نکل کر آیا کہ نزول حاجت جو مقدار سفر کے اندر ہو وہ استحکام سفر کو باطل کرتا ہے۔ اور ایسے شخص پر قصر کے بقائے حکم کو نہیں چاہتا۔

مقدمہ سوم: سفر و اقامت میں اقامت اصل ہے کہ سفر عارض ہے۔

چنانچہ شامی میں ہے: الاقامة للرجل اصل والسفر عارض۔

یہی ہدایہ وطحطاوی و جوہرہ نیرہ و درمختار و شرح وقایہ وغیرہ میں ہے۔ اور جب ایسا سفر ہو کہ نہ کہیں اس میں مقدار سفر کامل ہو نہ استحکام سفر متحقق ہو تو ایسے سفر کے لئے یقیناً اقامة اصلیہ ناقض ہو جائے گی۔ چنانچہ شامی میں اس کو ان الفاظ میں تعبیر کیا ہے:

اذا لم يتم علة فكانت الاقامة ناقضا للسفر العارض۔

لہٰذا اب اس کا محض قصد سفر بغیر استحکام سفر کے اس اقامۃ اصلیہ کو باطل نہیں کرے گا۔

مقدمہ چہارم: فقہ کا یہ قاعدہ ہے کہ جب نماز کے قصر اور اتمام دونوں کے وجوہ قائم ہوں تو احتیاطاً اتمام یعنی چار رکعت فرض پڑھنے کو ترجیح دی جائے گی۔

چنانچہ شامی میں ایک مسئلہ کی دلیل میں فرماتے ہیں:۔

اجتمع في هذه الصلوة ما يوجب الاربع ومايمنع فرجحنا ما يوجب الاربع احتياطا۔

خلاصہ کلام کا یہ ہے کہ شخص مذکور فی السوال کا حکم انہیں مقدمات سے ظاہر ہو گیا۔

مزید توضیح کے لئے عرض کرتا ہوں۔

اولاً: مقدار سفر کا ارادہ کرنا اس کو ابتداءً تو مسافر ثابت کرتا ہے لیکن اس کا پندرہ یا آٹھ آٹھ کوس پر اترنا اس کے مقدار سفر والے ارادہ کی مخالفت کرتا ہے اور بقائے سفر کے حکم کو باطل کرتا ہے۔ لہٰذا یہ شخص مقدمہ دوم کے اعتبار سے مسافر نہیں ہوا۔

ثانیاً: جب نماز قصر کے لئے تین یوم کے سفر کا قصد ضروری ہوا جیسا کہ مقدمہ اول سے معلوم ہوا۔ اب اس کا مقدار سفر کے اندر بار بار اس طرح اترنا جن کے نیت گھر ہی سے اپنی کسی حاجت کے لئے کی تھی نزول استراحت تو نہیں کیا جا سکتا جس کو سفر کے ضروریات میں شمار کیا جائے، اور اتصال قطع نہ ہو۔ بلکہ وہ شخص بلا ضرورت سفر کو قطع کر رہا ہے اور مقدار سفر کا نام لیکر محض رخصت سفر کے احکام کا افادہ چاہتا ہے۔ لہٰذا اس کا ابتدا ہی سے تین یوم کے سفر کا ارادہ نہیں ہوا۔ اور اس پر مسافر کی تعریف صادق نہیں آتی۔

ثالثاً: جب یہ شخص مسافر شرعی نہیں ہوا تو اس پر احکام سفر کس طرح مرتب ہونگے باوجودیکہ اقامت اصل ہے جیسا کہ مقدمہ سوم سے معلوم ہو چکا۔ لہٰذا شخص مذکور مقیم ہی رہا۔

رابعاً: جہاں سفر و اقامت دونوں محتمل ہوں وہاں چار رکعت پڑھنے کو فقہاء نے راجح قول قرار دیا ہے۔ اور یہاں تو سفر شروع ہی سے متحقق ہوا نہ شخص مذکور شرعاً مسافر ہوا۔ لہٰذا ایسا شخص قصر نہیں پڑھے گا بلکہ چار رکعت نماز ہی پڑھے گا۔

الحاصل مسئلہ تو نہایت وضاحت سے ثابت ہو چکا اس میں جائے سخن باقی نہیں رہی۔ منصف کے لئے بہت کافی وافی ہے اور ہٹ دھرم کے لئے ایک دفتر بھی ناکافی ہے۔ لیکن مزید اطمینان کے لئے اس کا جزیہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ چنانچہ عالمگیری بحر سے اور بحر معراج الدرایہ سے ناقل ہے:۔

من اراد الخروج الى مكان ويريد ان يترخص برخص السفر ينوى مكانا ابعد منه وهذاغلط۔

یعنی جس نے ایک مکان کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا اور یہ چاہتا ہے کہ سفر کی رخصت سے فائدہ اٹھائے اور اس سے ایک اور دوسری جگہ کی نیت رکھتا ہے، یہ غلط ہے۔ بالجملہ مسئلہ کا صحیح جواب تو یہ ہے کہ جو ان چند الفاظ میں لکھا گیا۔ اب ان ملایان دیوبند کے جوابات وہ اس قابل ہی نہیں ہیں جن کی طرف کوئی عاقل

التفات کرے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ مدرسہ دیو بند میں اسی قسم کے سوالات سے غیر متعلق جوابات لکھے تعلیم کیئے جاتے ہوں اور پھر علمی استعداد کا یہ حال ہے کہ مقدار سفر ۴۵ ر کوس قرار دیتے ہیں باوجودیکہ ہندوستان میں کوس کی مقدار انگریزی میل کے اعتبار سے بہت مختلف ہے۔ کہ کہیں سوا میل کا کوس ہوتا ہے، کہیں دو میل کا، کہیں اور بیش و کم کا۔ لہذا اب کوس سے کون سا کوس مراد لیا جائے اور کس کوس سے مقدار سفر کا تعین کیا جائے۔ اور ان ۴۵ ر کوس میں وہ کون سے کوس ہیں جس کے چلنے والے کو مسافر کہا جائے۔

اب یہ مجیب صاحبان پہلے اسی سے اپنی گلوخلاصی کرالیں پھر اپنے فتووں میں اور کچھ پیوند لگائیں۔ الحاصل میں اس وقت اتنے ہی جواب پر اکتفا کرتا ہوں اور ان کے فتووں کے باقی مواخذات کو نظر انداز کرتا ہوں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

جواب مسئلہ وتر

اس مسئلہ کی حقیقت یہ ہے کہ رمضان شریف میں وتر کے جماعت سے پڑھنے اور نہ پڑھنے کو فقہاء کرام نے چند صورتیں بیان فرمائیں ہیں جو کتب فقہیہ میں ادنی غور وفکر سے معلوم ہوسکتی ہیں۔ اور چونکہ میں نے التزام کیا ہے کہ میں بھی اپنے جواب میں انھیں کتابوں کا حوالہ دوں گا جن کو ہمارے مجیب صاحبان نے پیش کیا ہے۔ لہذا ان کتابوں میں اس مسئلہ کی بظاہر چار صورتیں بیان فرمائیں ہیں۔

(۱) فرض جماعت سے پڑھے اور تراویح جماعت سے نہ پڑھیں تو وتر جماعت سے پڑھے۔

چنانچہ درمختار میں ہے: ولو لم یصلها ای التراویح بالامام او صلا ها مع غیره له ان یصلی الوتر معه ۔

شامی اس کے تحت میں لکھتے ہیں: ای قد صلی الفرض معه ۔

یعنی خلاصہ مطلب یہ ہے کہ جس نے تراویح امام کے ساتھ نہیں پڑھیں اور فرض امام کے ساتھ پڑھ چکا ہے تو وہ وتر امام کے ساتھ پڑھے۔

(۲) فرض جماعت سے ایک امام کے ساتھ پڑھے اور تراویح دوسرے امام کے ساتھ تو وہ بھی وتر جماعت سے پڑھ سکتا ہے۔

درمختار میں ہے: او صلاها مع غیره له ان یصلی الوتر معه ۔

کبیری میں ہے: وکذا اذا صلی التراویح مع غیره له ان یصلی الوتر معه وهو الصحیح

ان دونوں عبارتوں کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ جب تراویح ایک امام کے ساتھ پڑھیں اور فرض

دوسرے کے ساتھ تو وہ دوسرے کے ساتھ وتر جماعت سے پڑھے۔

(۳) فرض جماعت سے پڑھ کر کچھ تراویح بھی امام کے ساتھ پڑھیں تو وہ بھی وتر جماعت کے ساتھ پڑھے۔

چنانچہ کبیری میں ہے: قال ابو یوسف البانی اذا صلی مع الامام شیئا من التراویح یصلی معه الوتر وهو الصحیح۔

یعنی جب امام کے ساتھ کچھ تراویح بھی پڑھیں تو وہ وتر جماعت سے پڑھے۔

(۴) فرض جماعت سے نہیں پڑھے اور تراویح جماعت سے پڑھی تو وہ وتر جماعت سے نہ پڑھے۔

اب ملاحظہ ہو کہ سائل چوتھے نمبر کا سوال کرتا ہے مگر ہمارے ان مجیب صاحبان کے جوابات کو ملاحظہ کیجئے۔ وہ لکھتے ہیں: وتر جماعت سے ادا کرنے چاہئیں اگر فرض جماعت سے ادا نہ کئے ہوں۔

اب ہمارے مجیب مولوی عبد الوحید صاحب اردو عبارت میں تو سائل کو یہ جواب دیتے ہیں اور چونکہ یہ سمجھتے ہیں کہ سائل عربی زبان سے ناواقف ہے لہذا اس کی تسلی کے لئے درمختار کی یہ عبارت نقل کر دیتے ہیں: ولو لم یصلها ای التراویح بالامام او صلاها مع غیره له ان یصلی الوتر معه۔

اور مجیب صاحب ترجمہ یا تو یوں نہیں کرتے ہیں کہ عوام پر یہ راز کھل جائے گا کہ عبارت مدعا کو ثابت نہیں کرتی۔ عبارت کی تو یہ مراد ہے کہ جو فرض جماعت سے پڑھ چکا ہے اور تراویح جماعت سے نہیں پڑھیں تو وہ وتر جماعت سے پڑھے۔ جیسا کہ پہلے نمبر میں ہم نے اس عبارت کو پیش کیا اور قدرے تفصیل آئندہ آئے گی۔ مگر حقیت یہ ہے کہ مجیب صاحب عبارت ہی کو نہ سمجھے۔ اس لئے کہ اس کے بعد لکھتے ہیں:

اس عبارت سے متبادر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ فرض بھی بغیر جماعت سے پڑھے ہوں گے۔

مجیب صاحب آفریں ہے آپ کی اس سمجھ پر۔ کیا آپ اسی سمجھ پر مدرسی کرتے ہیں؟ کیا جناب کے نزدیک تراویح کی جماعت اور فرض کی جماعت میں کوئی ملازمہ ہے جس سے آپ نے یہ نتیجہ نکالا؟ مجیب صاحب آپ کی سمجھ کی تو مجھے اتنی شکایت نہیں مگر جناب کے مقتدا حکیم الامۃ فقیہ زماں صاحب الشریعۃ والطریقہ مولانا اشرفعلی صاحب تھانوی اپنے فتاوی "امداد الفتاوی" کے جلد اول کے صفحہ ۲۰ ر اور فتاوی اشرفیہ کے حصہ اول کے صفحہ چار میں جناب ہی کی پیش کردہ عبارت درمختار کو اسی آپ کے مزعومہ

مسلک کی سند میں پیش کرتے ہیں تو آپ کے اس صاحب شریعت کی سمجھ تو سمجھ سے ورا ہے۔لہٰذا میرا خطاب نہ فقط آپ سے بلکہ آپ کی شریعت کے صاحب شریعت سے بھی ہے کہ اگر آپ کی سمجھ میں اس عبارت کی صحیح مراد نہیں آئی تھی تو اسی درمختار کا حاشیہ شامی ہی دیکھ لیا ہوتا کہ علامہ شامی "لو لم یصل الخ" کی تصویر مسئلہ لکھتے ہیں۔

ای قد صلی الفرض معه خلاصه ۔

مطلب یہ ہے کہ صاحب درمختار نے جو یہ لکھا ہے کہ تراویح امام کے ساتھ نہ پڑھنے کی صورت میں وتر جماعت سے پڑھ سکتا ہے۔یہ اسی صورت میں ہے کہ امام کے ساتھ فرض پڑھ چکا ہو۔

مسلمانو! آپ نے دیکھا کہ سائل تو یہ دریافت کرتا ہے کہ جس شخص نے فرض جماعت سے نہ پڑھے ہوں اور تراویح کی جماعت میں شامل ہو جائے ،تو وہ وتر جماعت سے پڑھے یا نہیں۔لہذا اس کے جواب میں اشرفعلی تھانوی یا ہمارے مجیب کا اس عبارت درمختار کو پیش کر دینا (جس کا شامی یہ مطلب بیان کرتے ہیں، کہ تراویح جماعت سے نہ پڑھنے کی حالت میں وتر جماعت سے جب پڑھ سکتا ہے کہ امام کے ساتھ فرض پڑھ چکا ہو۔) مسلمانوں کو صریح دھوکہ دینا ہے۔مجیب صاحب وصاحب شریعت ذرا آپ ہی انصاف سے کہئے کیا یہ درمختار کی عبارت اس سائل کے سوال کا جواب ہوگئی؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔لہٰذا آپ صاحبان کا اس عبارت کو اس کے جواب میں لکھ مارنا کیا معنی رکھتا ہے۔اب میں کہنے کے لئے مجبور ہوں کہ آپ صاحبوں سے عربی عبارت کا صحیح مفہوم نکالنا نہیں آتا تو پھر آپ کا یہ مدرسی اور صاحب شریعت اور فقیہ زماں کے دعوے کیا معنی رکھتے ہیں۔اور اگر عربی عبارت کا صحیح مفہوم سمجھنے کی لیاقت رکھتے ہو تو اس عبارت کے یہاں نقل کرنے میں سوائے مسلمانوں کو مغالطہ میں ڈالنے کے کیا آپ کا اور کوئی صحیح مقصد تھا؟

۔مسلمانو! اس عبارت میں جو بات کہی گئی تھی اس کی صحیح مراد صرف اپنی طرف سے نہیں بلکہ علامہ شامی نے جو اس کا مطلب بیان کیا وہ نقل کر دیا گیا۔اب ان مجیبوں کی ذہن دوزی کے لئے یہ عرض کرتا ہوں کہ یہی درمختار کی عبارت ہمارے مسلک کو فائدہ پہنچاتی ہے۔چنانچہ یہی علامہ شامی اسی عبارت کے تحت میں فرماتے ہیں:لکنه اذا لم یصل الفرض معه لا یتبعه فی الوتر۔

یعنی جب فرض امام کے ساتھ نہیں پڑھے تو وتر جماعت سے نہیں پڑھے گا۔

کہئے! مجیب صاحب یہ عبارت درمختار آپ کو کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔کاش اگر آپ شامی کو دیکھتے تو اتنی شرمندگی نہ اٹھانی پڑتی۔لیکن دیکھی تو ضرور ہوگی مگر شاید عبارت کا مفہوم جناب نے نہیں سمجھا ہوگا۔

عربی کی عبارت ہے ممکن ہے کہ ذہن کی رسائی نہ ہوئی ہو اس لئے میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ جناب کی اس پیش کردہ درمختار کی عبارت کا مطلب اردو زبان میں پیش کروں تاکہ جناب کے سمجھنے میں آسانی ہو اور وہ بھی آپ ہی کے پیشوا محمد احسن صاحب نانوتوی جو اسی درمختار کے ترجمے "غایۃ الاوطار" میں لکھتے ہیں:

ولولم یصلها ای التراویح بالامام او صلاها مع غیره له ان یصلّی الوتر معه۔

اور اگر نہ پڑھا تراویح کو امام کے ساتھ یا تراویح کو دوسرے امام کے ساتھ پڑھا تو نمازی کو جائز ہے کہ وتر کو امام کے ساتھ پڑھے۔

مراد اس سے یہ ہے کہ فرض کو جماعت کے ساتھ پڑھا اور تراویح کو جماعت سے نہیں پڑھا تو وتر جماعت سے پڑھ سکتا ہے۔لیکن اگر فرض تنہا پڑھے ہوں تو جماعت سے نہ پڑھے۔لہٰذا اہل انصاف غور فرمائیں کہ یہ وہی عبارت ہے جس کو صاحب شریعت دیوبند اپنے ہر دو فتاوی میں اور ہمارے مجیب صاحب اس لئے نقل کر کے لائے ہیں کہ یہ ہر دو صاحبان اسی عبارت سے یہ ثابت کریں کہ جس نے فرض تنہا پڑھے ہوں وہ وتر جماعت سے پڑھے۔اور علامہ شامی اور مولوی محمد احسن اس عبارت کا یہ مفہوم بیان کرتے ہیں کہ اگر فرض تنہا پڑھے ہوں تو وتر کو جماعت سے نہ پڑھے۔لہٰذا انھوں نے محض دھوکہ دینے کے لئے اپنے فتوں میں اسی عبارت درمختار کو نقل کیا ہے یا نہیں؟۔اور اس عبارت کی مراد ان مجیبوں کے مسلک سے نہ صرف بے تعلق بلکہ بالکل خلاف ہے اور ہمارے مسلک کا قوی ہونا ثابت کرتی ہے۔اور نہ آج تک کسی دیوبندی نے کوئی ایسی صریح عبارت پیش کی ہے جس کی صریح یہ مراد نکلتی ہو۔کہ جس نے فرض تنہا پڑھے تو وہ بلا کراہت وتر جماعت سے پڑھ لے۔

اب مجیب کا یہ کہنا: اور دوسری کتابوں میں فرض کی بغیر جماعت سے پڑھنے کی تصریح ہے۔ کہاں تک واقعیت رکھتا ہے۔مجیب صاحب اگر کچھ ہمت ہو تو پیش کیجئے لیکن خدا کے لئے کوئی درمختار کی سی عبارت پیش نہ کر دیجئے گا جو آپ کے لئے وبال جان بن جائے۔

اب رہا کلام مصححین کے متعلق ان پر بھی یہ ہی کل بحث ناطق ہے وہ بھی اپنی گلوخلاصی کی کوشش کریں۔خصوصا مولوی عبدالوحید صاحب مدرس میٹر تاسٹی کا کبیری کے بے علاقہ عبارت کو پیش کر دینا۔تو یہ ان کی انتہائے قابلیت کی بین دلیل ہے کہ مولانا صاحب کبیری ہی کے صحیح مفہوم نکالنے سے قاصر ہیں۔اور مولوی کرم بخش صاحب کی صغیری کی عبارت۔لہٰذا یہ خود انھوں نے اپنی طرف سے تلاش کر کے نہیں لکھی ہے۔چونکہ ان کی شریعت کے صاحب شریعت نے اپنے دونوں فتاوی میں اس کو لکھا ہے انھوں نے بھی بلا

سوچے سمجھے اسی عبارت کو نقل کر دیا۔ لہذا میں اس کے متعلق صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ اولاً تو یہ عبارت مراد میں صریح نہیں اور اگر آپ اس کی صراحت کے مدعی ہیں تو یہ سات سوالات حاضر ہیں ان کے جواب آنے پر پھر اور کچھ پیش کیا جائے گا۔

(۱) مع الامام میں الف لام کونسا ہے اور اس کا کیا فائدہ ہے؟۔

(۲) مع امام اور مع الامام میں کچھ فرق ہے یا نہیں اگر ہے تو کیا؟۔

(۳) جواز جب کراہت کو بھی شامل ہے تو اس پر کیا دلیل ہے کہ یہاں جواز بلا کراہت ہے؟۔

(۴) قہستانی کی اس صریح عبارت "لکنه اذا لم یصل الفرض معه لا یتبعه فی الوتر" کا کیا جواب ہے؟۔

(۵) پھر قہستانی سے نقل کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ صاحب منیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

(۶) پھر علامہ شامی کا اسی قہستانی کی عبارت کو نقل کر کے اس پر اعتماد کرنا کیا آپ کے مسلک کو قوت پہنچاتا ہے یا ہمارے مسلک کو؟۔

(۷) آپ کے پیشوا مولوی محمد احسن کا ہمارے مسلک کی تصریح کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟۔

فی الحال اتنے ہی جواب پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ جناب نے اگر حوصلہ افزائی کی تو پوری تفصیل حاضر کردوں گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۹۰)

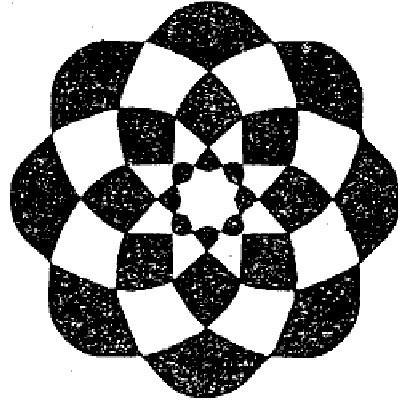
ما قولکم دام فیضکم وفضلکم فیما اذا اقتدی المقیم بالمسافر فی الرکعة الثانیة من العشاء هل یقرء فی الثلث الاتی یاتیها الامام بعد فرغ امامه ام لا ؟۔ وان قلتم بالقرأة فی الرکعة من الرکعات ففی ایتهن یقرأ استحباباً؟ ۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

اذا کان المقیم مسبوقا وامامه مسافر وفات الرکعة الاولی فیقضی الرکعة بعد سلام الامام بالقرأة لان القرأة فی حقه فرض کما صرح الطحطاوی فی حاشیة الفلاح فکان الاحتیاط فی حقه القرأة فصار جعله منفردا اولی من جعله مقتدیا فکانت قرأته فیما یقضی فرضا واما الرکعتان الاخیرتان فلا یقرء فی الاصح والله تعالی اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل



﴿۲۴﴾

باب المکروہات والمفسدات

مسئلہ (۳۹۱_۳۹۲_۳۹۳_۳۹۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

(۱) زید امامت کرتا ہے اور نماز کی حالت میں کرتے کے گریبان کے اوپر کا ایک بٹن کھلا رکھتا ہے اور حالت نماز میں اسے مسنون بتاتا ہے بلکہ نماز اور غیر حالت نماز میں ہر وقت کھلا رکھتا ہے اور اپنے اس دعوی کے ثبوت میں مشکوۃ شریف کی وہ حدیث پیش کرتا ہے جو کتاب اللباس فصل ثانی میں معاویہ بن قرہ کے والد صاحب سے مروی ہے اور شمائل ترمذی میں بھی اس کو روایت کیا ہے۔ مشکوۃ شریف کی روایت یہ ہے:

عن معاویۃ بن قرۃ عن ابیہ قال اتیت النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فی رھط من مزینۃ فبایعوہ وانہ لمطلق الازرار فادخلت یدی فی جیب قمیصہ فمست الخاتم رواہ ابوداؤد۔

تو کیا زید کا ثبوت دعوی میں اس حدیث شریف کو پیش کرنا صحیح ہے یا غلط؟۔

(۲) اور کیا ائمہ اربعہ میں سے کسی نے مسنون بتایا ہے یا محدثین یا شارحین حدیث نے سنت فرمایا ہے؟۔

(۳) کرتے کا بٹن نماز میں کھلا ہوا رکھنے کو سنت سمجھنا اور اسی حالت سے نماز پڑھنا یا پڑھانا مسنون ہے یا خلاف سنت؟۔

(۴) اگر نماز میں کھلا ہوا رکھنا سنت نہیں ہے تو اس کو مسنون کہنے والا شریعت پر افترا کرتا ہے یا نہیں؟۔ اور شریعت پر افترا کرنے والے اپنی طرف نئے مسائل گڑھ کر مسلمانوں میں فتنہ وفساد اختلاف وافتراق پیدا کرنے والے کے لئے کیا حکم ہے اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا اور اسے امام بنانا جائز ہے یا نہیں؟۔ بینوا توجروا۔ المستفتی عبد الکریم ۲۴ رذیقعدہ ۱۳۷۵ھ ساکن قصبہ آنولہ ضلع بریلی

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) حالت نماز میں کرتے کے بٹن کھلے رکھنا اور اس کے نیچے میں خوری بھی نہ ہو تو یہ سدل ہے جو مکروہ تحریمی ہے۔ فقہاء نے سدل کی یہ تعریف کی ہے کہ کسی کپڑے کو اس کے خلاف عادت لٹکا چھوڑ دینا۔

طحطاوی میں ہے: (السدل) فی الشرع الارسال بدون لبس معتادا۔ (ص۲۰۴)

کبیری میں ہے: حدالسدل وھو الارسال من غیر لبس۔ (ص۳۳۶)

اور یہ بات بدیہی ہے کہ کرتا پہنتے وقت ہر شخص عادۃ بٹن لگایا کرتا ہے تو جس نے اس کے بٹن نہ لگائے اس نے اس کے لبس معتاد کا خلاف کیا جس پر سدل کی تعریف صادق آئی اور نماز میں سدل مکروہ تحریمی ہے۔

درمختار میں ہے: (کرہ سدل) تحریما للنھی (ثوبہ) ای ارسالہ بلا لبس معتاد۔

(شامی مصری ج ا ص۴۴۸)

اور حدیث شریف میں ہے جس کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔

ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نھی عن السدل فی الصلوۃ۔

(مشکوۃ شریف ص۷۳)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نماز میں سدل سے منع فرمایا۔

اسی لئے علامہ ابراہیم حلبی نے یہ مسئلہ تحریر فرمایا کہ اگر قبا کی آستینیں پہن لیں اور بٹن نہ لگائے تو یہ سدل کے مشابہ ہو جائے گا اور اگر اس کے بٹن لگا لئے تو اس میں سدل بھی لازم نہ آیا اور مکروہ بھی نہ ہوا۔

عبارت یہ ہے: لو ادخل یدیہ فی کمیہ ینبغی ان یقید بما اذا لم یزر ازرارہ لانہ یشبہ السدل ح اما انہ الازرار فقد التحق بغیرہ من الثیاب فی اللبس فلاسدل فیہ فلایکرہ۔

(کبیری ص۳۳۶)

لہذا اس صورت میں کرتے کے بٹن کا نماز میں کھلا رکھنا مکروہ تحریمی ثابت ہوا۔

اور جب کرتے کے نیچے میل خوری بھی ہو تو حالت نماز میں کرتے کے بٹن کھلے رکھنا مکروہ تنزیہی ہے۔ علامہ شامی خزائن سے ناقل ہیں:

ذکر ابو جعفر انه لوادخل یدیه فی کمیه ولم یشد وسطه اولم یزرازراره فهو مسیئ لانه یشبه السدل ۔ (شامی ج ۱ص ۴۴۹)

یہی علامہ شامی حلیہ سے ناقل ہیں: اختلف فی کراهة شد وسطه اذا کان علیه قمیص ونحوه ففی العتابیة انه یکره لانه صنیع اهل الکتاب۔ (شامی ج ۱ص ۴۴۹)

بالجملہ کتب فقہ کی تصریحات سے تو مسئلہ واضح ہو چکا۔اب باقی رہا جاہل زید کا یہ دعوی (کرتے کے گریبان کے اوپر کے بٹن کا حالت نماز میں کھلا رہنا مسنون ہے) نہ صرف بلا دلیل بلکہ کتب فقہ کی تصریحات کے خلاف ہے۔وہ اپنے اس دعوی پر کوئی حدیث پیش نہیں کرسکتا اور اس نے جو حدیث پیش کی ہے اس سے اس کا دعوی ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے اس استدلال سے اس کی جہالت ضرور ثابت ہوتی ہے۔

اولاً: حدیث شریف میں کوئی لفظ بھی حالت نماز پر دال نہیں اور غیر حالت نماز پر حدیث کی صریح دلالت ہے تو اب زید کا غیر حال نماز کو حال نماز پر قیاس کرنا جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔

ثانیاً: اسی مشکوۃ شریف میں حدیث شریف کے وازررہ ولو بشوکة کے حاشیہ میں مرقات سے ناقل ہیں:

ومن آداب الصلوة زرالقمیص۔یعنی نماز کے آداب سے قمیص کے بٹن لگانا ہے۔

تو اب زید کا اپنی پیش کردہ حدیث کو حالت نماز کے لئے دلیل بتانا کیسی سخت جہالت ہے۔

ثالثاً: زید کی پیش کردہ حدیث میں جو امور ہیں وہ بیان جواز کے لئے ہیں۔علامہ ابراہیم بیجوری نے المواہب اللدنیہ علی الشمائل المحمدیہ میں اسی زید کی پیش کردہ حدیث کی شرح میں فرمایا:

وفی هذاالحدیث حل لبس القمیص وحل الزرفیه وحل اطلاقه وسعة الجیب لجیب تدخل الید فیه وادخال ید الغیر فی الطرق۔ (مواہب لدنیہ مصری)

لہذا اب زید اپنے زعم باطل کی بنا پر حالت نماز میں فقط بٹن کھلے رہنے کو مسنون نہ کہے بلکہ حالت نماز ہی کے اندر گریبان میں غیر کے ہاتھ داخل کرنے کو بھی مسنون قرار دے۔

ع۔ بریں عقل ودانش بباید گریست

رابعاً: زید نے شمائل ترمذی کی اسی حدیث پر عمل کیا جس میں حالت نماز پر کوئی دلالت بھی نہ تھی باوجودیکہ اسی شمائل ترمذی میں اسی حدیث کے بعد دوسری یہ حدیث بھی ہے۔

عن انس بن مالك ان النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم خرج وهو یتکئ علی اسامة بن زید علیه ثوب قطری قد توشح به فصلی بهم۔ (شمائل ص ۵)

جس میں صاف بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے اپنی چادر شریف کو داہنی بغل شریف کے نیچے سے نکال کر بائیں شانے پر محرم کی طرح امامت فرمائی۔

لہذا زید نے اس سنت پر کبھی کیوں نہیں عمل کیا اور وہ اس طرح کیوں امامت نہیں کرتا۔

خامساً: حضور اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے ہر فعل کو مسنون سمجھ کر بلاتحقیق قابل عمل جاننا خود جہل ونادانی کی دلیل ہے۔

یہی علامہ ابراہیم بیجوری اسی مواہب لدنیہ میں اسی حدیث انس کی شرح میں فرماتے ہیں:

انه صلی الله تعالیٰ علیه وسلم قد یفعل المکروه لبیان الجواز ولایکون مکروها فی حقه بل یثاب علیه ثواب الجواز۔ (مواہب ص ۶۰)

سادساً: زید ایک بٹن کھلا رکھتا ہے اور وہ جس حدیث شریف کو ثبوت میں پیش کرتا ہے اس میں ایک بٹن کی تخصیص نہیں بلکہ اس میں مطلق الازرار ہے تو اس تخصیص کا حدیث میں کہاں ذکر ہے؟۔

سابعاً: فقہ کی تصریحات کے موجود ہوتے ہوئے زید کی یہ جرأت ودلیری کہ وہ احادیث سے مسائل کا استخراج واستنباط کرتا ہے۔اس کی انتہائی جہالت کی دلیل اور ضلالت کی سبیل ہے باوجودیکہ یہ مرتبہ اب کسی کو حاصل نہیں۔

حضرت سیدی عبدالوہاب شعرانی میزان الشریعۃ الکبری میں فرماتے ہیں:

لیس فی قوة احد بعد الائمة الاربعة ان یبتکر الاحکام ویستخرجها من الکتاب والسنة فیما نعلم ابدا۔ (میزان مصری ج ۱ص ۳۶)

واللہ تعالی اعلم بالصواب

فقہ کی تصریحات سے فقہائے کرام کا مسلک معلوم ہو گیا کہ وہ نماز میں بٹن کھلے ہوئے چھوڑنے کو مکروہ کہتے ہیں۔اور محدثین وشارحین کا قول مرقات کے حوالے سے گزرا کہ آداب نماز سے بٹنوں کا لگانا ہے۔مزید ابحاث کی حاجت نہیں ہے۔جب فقہ کی کتابوں سے اس کی کراہت ثابت ہو چکی تو زید کا اس کو سنت کہنا گویا مکروہ کو سنت کہنا ہے اور اس کا اس طرح نماز پڑھنا مکروہ خلاف سنت ہے۔واللہ تعالی اعلم بالصواب

شامی سے عبارت منقول ہوئی کہ جس نے نماز میں بٹن کھلے ہوئے رکھے وہ گنہگار ہے۔
اسے مکروہ وگناہ نہ جانے اور اسے مسنون کہکر نہ فقط شریعت پر بلکہ خود شارع علیہ السلام پر عمداً افترا کیا
ہے وہ اس حدیث کا مصداق ہے۔

من كذب على متعمدا فليتبؤا مقعده من النار۔ (مشکوۃ ص ۳۲)

اسے چاہئے کہ استغفار کرے اور امت میں اختلاف وافتراق پیدا نہ ہونے دے اور مسلمانوں
میں فتنہ وفساد کی بنیاد نہ قائم کرے۔

اب باقی رہا زید کا امام بنانا اور اس کی اقتدا اس کا حکم بھی اسی تفصیل سے ظاہر ہوگیا کہ جب
اس کی نماز مکروہ ہوئی اور شرعاً ہر ایسی نماز جو بکراہت ادا ہو اس کا اعادہ کیا جائے۔

مراقی الفلاح میں تجنیس سے ناقل ہیں: كل صلوة اديت مع الكراهة فانها تعاد لا على
وجه الكراهة۔ (طحطاوی مصری ص ۲۰۱)

تو اب ایسے امام کی اقتدا میں جو نماز ہوگی اس کے اعادہ کا حکم ہوگا۔ لہذا اس میں حرج کثیر لا
آتا ہے اس وجہ سے اس امام ہی کو بدلنا چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۹۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ ذیل میں
زید مولوی کہلاتا ہے اور امامت کرتا ہے تین سال سے کرتے کے اوپر کا بٹن کھولکر نماز پڑھتا
اور اسکو سنت بتاتا رہا لیکن جب ایک اور مولوی سے اسی مسئلہ میں بحث ہوئی تو زید نے اسے مستحب
لیکن اس مولوی نے اس کو مستحب بھی تسلیم نہ کیا چونکہ زید کے اس فعل سے عام مسلمانوں میں بے
پھیل رہی تھی اور اندیشہ تھا کہ کہیں تصادم ہو جائے اس مولوی نے زید سے یہ کہا بالفرض اگر میں آ
مستحب بتانے کو تسلیم کرلوں (جو میرے نزدیک نہیں ہے) تب بھی آپ کو مناسب ہے کہ مسلمانو
بے چینی دور کرنے کے واسطے اس بٹن کو آپ بند کرلیں زید نے بٹن بند کرلیا۔ لہذا اب سوال یہ
سال سے جو نمازیں زید کے پیچھے پڑھی گئیں وہ درست ہوئیں یا نہیں اگر نہیں تو اس کی ذمہ دار

عائد ہوتی ہے اور کیا کفارہ واجب ہوتا ہے صحیح جواب سے مطلع فرمائیں والسلام
مرسلہ علیم الدین عفی عنہ کٹرہ پختہ کوچہ بنگلہ آنونہ ضلع بریلی۔

نوٹ: — اس دوران میں بٹن کے متعلق اکثر علماء دین کے فتوے بٹن کھلا رکھنے کے خلاف میں
آئے لیکن زید اس کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا اور کسی مولوی سے اس مسئلہ میں بحث کرنا گوارہ نہیں کی یہ
ایک اتفاق تھا جو زید نے مذکورہ بالا مولوی سے بحث کی اور ان کی جرح پر مستحب قرار دیا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

دو سال کے قریب ہوئے کہ اسی قصبہ آنولہ ہی سے بتوسط مولوی عبداللطیف صاحب جناب
عبدالکریم صاحب نے یہی سوال بھیجا تھا جس کا مبسوط جواب لکھدیا گیا تھا اور اس میں فقہ کی عبارات
سے بٹن کھولکر نماز پڑھنے کی کراہت پر کافی تصریحات پیش کرائی گئیں تھیں اور اس زید کے دعوے سنت کی
دھجیاں اڑادی گئیں تھیں اور اس کی پیش کردہ حدیث کے غلط استدلال پر سات رد بلیغ کئے گئے تھے۔ یہ
سائل بھی چونکہ اسی قصبہ کا ساکن ہے لہذا اس فتوے کو عبدالکریم سے حاصل کرکے ملاحظہ کرے کہ اس
میں جواب مکمل ومدلل ہے میں اس وقت بوجہ اپنی عدم الفرصتی کے اس جواب کا خلاصہ عرض کرتا ہوں۔
اگر کرتے کے نیچے کوئی کپڑا نہ ہو تو کرتے کے بٹن کھولکر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور اگر کرتے کے نیچے
کوئی کپڑا ہو تو کرتے کے بٹن کھولکر نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے اور شرعاً ہر ایسی نماز جو بکراہت ادا ہو اس کا
اعادہ کیا جائے۔

مراقی الفلاح میں ہے: كل صلوة اديت مع الكراهة فانها تعاد۔

لہذا جب امام کی نماز قابل اعادہ ہے تو مقتدی کی نماز کیوں قابل اعادہ نہ ہوگی۔

بالجملہ جس جس مقتدی نے اس امام کی اقتداء جس قدر نمازوں میں کی ہے ان تمام نمازوں کا
اعادہ کرنا چاہیئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۹۶)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں

بلا عذر شرعی بنڈی (سینڈو بنیان کے مطابق) پہن کر نماز پڑھنا کیسا ہے آیا ایسا کرنے سے نماز ہوتی ہے یا نہیں میرے دو سوال کا جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں عام فہم دیا جاوے۔

المستفتی، محمد رضا گوہر قادری قریشی ۳۲۲۹ معرفت لکھنو

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

بلا حاجت فقط بنڈی بنیائن پہن کر نماز پڑھنا مکروہ ہے مراقی الفلاح میں ہے

تکره الصلوة فی ثیاب البذلة بکسر الباء وسکون الذال المعجمة ثوب لا یصان عن الدنس ممتهن وقیل مالا یذهب به الی الکبراء۔ تو ایسی نماز کو دوبارہ پڑھنا چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۶ھ

کتبه: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۹۷)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں

تکبیر نماز کھڑے ہو کر سننا مکروہ تنزیہی یا مکروہ تحریمی؟

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

فتاویٰ عالمگیری میں ابتدا سے کھڑے ہو جانے کو اقامت میں مکروہ لکھا ہے لیکن غالبًا یہ کراہت تنزیہی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبه: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۹۸)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں

زید کہتا ہے کہ ٹوپی سے نماز مکروہ ہے۔ احکام شریعت مصنفہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ دیتا ہے۔ کیا احکام شریعت میں مکروہ لکھا ہے؟۔ جواب دیں امام ٹوپی سے نماز پڑھا دے تو کیا وہ نماز مکروہ ہے جواب مہر شدہ ارسال فرمائیں۔ نیاز، غیور علی رضوی منزل غفرلہ بری سادڑی

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

جس طرح عمامہ باندھنا سنت ہے اسی طرح صرف ٹوپی کا اوڑھنا بھی سنت ہے، تو صرف ٹوپی سے نہ تو نماز مکروہ ادا ہوتی ہے نہ امام کا ٹوپی سے نماز پڑھانا مکروہ ہے۔ احکام شریعت میں اس کی کراہت کی تصریح ہماری نظر سے تو گذری نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۸ ذیقعدہ ۱۳۷۶ھ

کتبه: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھلی

مسئلہ (۳۹۹)

حضرت مولٰینا مولوی المکرم والمحترم مفتی اعظم شاہ محمد اجمل صاحب قبلہ مدرسہ اجمل العلوم سنبھل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

گزارش خدمت شریف میں یہ ہے کہ حضرت کا فتویٰ تشریف لایا لیکن اس فرمان شرع کو زید نے غلط بتایا۔ زید کا کہنا ہے کہ ٹوپی سے نماز مکروہ ہوتی ہے جس کے پاس عمامہ موجود ہو اور کپڑا میسر ہو تو وہ ٹوپی سے نماز نہیں پڑھ سکتا۔ حوالہ میں ''راہ نجات'' نامی چھوٹی کتاب مطبوعہ نولکشو پریس لکھنو کی پیش کرتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ کپڑا میسر ہوتے ہوئے ٹوپی سے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ نماز ہو جاتی ہے مگر ثواب کم ہو جاتا ہے۔ اور آپ کے فتویٰ پر جواب کا حوالہ دلائل شرعیہ سے جلد از جلد جواب عنایت فرمائیں کہ ٹوپی سے نماز بالکل درست ہوتی ہے یا نہیں۔ اور ''راہ نجات'' کتاب سنی نے لکھی ہے یا شیعہ نے لکھی ہے وہ کتاب مستند ہے یا نہیں؟۔ آپ بہار شریعت یا احکام شریعت جیسی معتبر کتاب کا حوالہ ضرور دیں۔ آپ علاوہ اس مسئلہ کے جواب کے یہ بھی دیں کہ ٹوپی اوڑھنا سنت ہے یا نہیں؟۔

تکلیف کی جزا حق تبارک وتعالیٰ عنایت کریگا۔ اگر ایک دو دستخط مفتیوں کے اس جواب پر ہو جائیں تو بہتر

فرمائیں والسلام۔ المستفتی، قاضی سید غیور علی قادری رضوی مصطفوی

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بغیر عمامہ کے صرف ٹوپی کا پہننا سنت ہے اور خود فعل رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔

چنانچہ ابن عساکر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی " کان یلبس القلنسوۃ بغیر عمامۃ "

(از زاد المعاد مصری جلد ا صفحہ ۱۳۱)

حضور اکرم ﷺ بغیر عمامہ کے ٹوپی استعمال کرتے تھے

اس حدیث سے آفتاب کی طرح ثابت ہوگیا کہ صرف ٹوپی کا پہننا بھی سنت رسول علیہ السلام ہے۔ اور جب اس کا سنت ہونا ثابت ہو چکا تو ٹوپی سے نماز مکروہ اور نادرست کس طرح ہو سکتی ہے۔ پھر ٹوپی سے نماز کا مکروہ ہونا آج تک کسی معتبر کتاب میں تو دیکھا نہیں۔ اور کتاب راہ نجات کوئی مستند و معتبر کتاب نہیں۔ لہذا یہ کراہت کا حکم کیسے ہو سکتا ہے کہ نماز میں عمامہ کا ہونا صرف مستحب ہے۔ فقہ کی مشہور کتاب مراقی الفلاح میں ہے۔ المستحب للرجل ان یصلی فی ثلاثۃ اثواب ازار وقمیص وعمامۃ۔ (حاشیہ طحطاوی مصری صفحہ ۲۰۴)

آدمی کے لئے تین کپڑوں تہبند اور قمیص اور عمامہ کے ساتھ نماز پڑھنا مستحب ہے۔ تو جب نماز میں عمامہ کا ہونا مستحب قرار پایا تو ٹوپی سے غیر مستحب لازم آیا جو شرع میں خلاف اولی کہلاتا ہے۔ تو خلاف اولی تو مقابل مستحب کا ہے نہ کہ مکروہ۔ تو ٹوپی سے نماز کا مکروہ قرار دینا جہالت و نادانی نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ تو زید کا قول حدیث کے بھی خلاف ثابت ہوا اور فقہ کی تصریح کے بھی مقابل ٹھہرا۔ لہذا میرا پہلا فتوی حدیث وفقہ کے موافق صحیح ثابت ہوا۔ اور قول زید غلط اور مخالف حدیث وفقہ کے قرار پایا۔ نیز اسی تحقیق سے راہ نجات کے حکم کا بھی غیر مفتی بہ اور نامعتبر ہونا ظاہر ہوگیا۔ مولی تعالی زید کو حق کے قبول کر لینے کی توفیق عطا فرمائے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب ۲۹ ذیقعدہ ۱۳۷۶ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۰۰)

حضرت قبلہ علمائے دین کیا فرماتے ہیں دربارہ ان مسائل کے کہ

کسی آدمی کے پیر کے انگوٹھے اور انگلی زمین سے نہیں جمتے یعنی انگوٹھہ اور انگلیاں پیر کی ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ ایسے شخص کے لئے کیا حکم ہے کہ نماز پڑھائے یا نہیں؟۔ وہ شخص اپنی معذوری بتلاتے ہیں تو کیا ان کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟۔ فقط جواب سے مطلع فرمائیے عنایت ہوگی۔

المستفتی، شمشاد احمد منیجر سیرت کمیٹی محلہ پچھم تھوک نزد مسجد ڈونڈورہ ضلع ایٹہ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

نماز میں بحالت سجدہ پاؤں کے انگوٹھوں اور انگلیوں کے پیٹ کا زمین پر لگانا بلکہ جمنا شرعا ضروری وشرط ہے۔ صرف انگلی کی نوک زمین سے لگ جانا کافی نہیں۔ اگر شخص مذکورہ فی الواقع معذور ومجبور ہے تو اس کی نماز ہوتو ہو جائیگی لیکن وہ غیر معذور لوگوں کا امام نہیں بن سکتا۔ کہ ایسے معذور امام کے پیچھے غیر معذور مقتدیوں کی نماز درست نہیں۔ لہذا نہ ایسے معذور امام کو امام بنایا جائے نہ غیر معذور مقتدی ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھیں۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔ ۲۴ رجب المرجب ۱۳۷۶ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۰۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

نماز میں اگر تھوکنے کی ضرورت ہوتو کیا کرے۔ یا تھوک کو نگل جائے یا کسی جانب تھوکے۔ اگر مسجد میں نماز پڑھ رہا ہے اور یہ صورت پیش آئے تو اس میں کیا عمل کرے اور تھوکنے کی عادت بنالینا کیسا ہے؟۔ زید اب تک دوران نماز میں جب کبھی مکان پر نماز پڑھتا تھا سامنے کی طرف تھوکنے کا عادی تھا۔ اس عمل میں کسی نے اعتراض کیا تب اس نے ایک عالم سے یہ مسئلہ پوچھا۔ عالم نے بجائے سامنے تھوکنے کے دائیں بائیں جانب تھوکنے کی اجازت دی۔ پھر دوسرے سے دریافت کیا تو تھوکنے کی اجازت اس نے بھی دیدی لیکن اس طرح سے تھوکے کہ برابر والے کو معلوم نہ ہو۔ زید اپنے عمل کے ثبوت میں ایک عالم کے عمل کو پیش کرتا ہے۔ عالم کا عمل یہ ہے کہ نماز جماعت کی عالم موصوف پڑھاتا ہو دوران

نماز میں جب ضرورت تھوکنے کی ہوتی ہے سامنے برتن رکھا ہوا ہے، اس کو اس میں تھوک لیا اور پھر اسی
طرح سے برتن اپنی جگہ پر رکھ دیا، جھکنے اور اٹھنے میں نہیں ہوا اور اس کی نماز میں تو کوئی فرق نہیں آیا؟
مدلل طریقہ پر مسئلہ کا جواب دیں۔

ممتاز الٰہی اشرفی عفی عنہ شعبان المعظم ۱۳۶۰

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم۔

نماز میں تھوکنا مکروہ ہے، چنانچہ مراقی الفلاح میں بیان مکروہات میں ہے:

ویکرہ ان یرمی بزاقہ۔ (ص ۲۰۳)

اور اگر تھوکنے کیلئے مضطر ہو تو اس کے لئے احادیث میں یہ چند صورتیں بیان فرمائی ہیں۔

بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے کہ حضور سید عالم صلے اللہ تعالی علیہ وسلم فرماتے ہیں: ان احدکم اذا صلی قام فی الصلوۃ فانما یناجی ربہ وان ربہ بینہ وبین القبلۃ فلا یبزقن احدکم قبل قبلتہ ولکن عن یسارہ او تحت قدمہ۔ ثم اخذ طرف ردائہ فبصق ثم ردبعضہ علی بعض فقال اویفعل ھکذا۔ (مشکوۃ شریف ص ۷۱)

جب تم میں کوئی شخص نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے مناجات کرتا ہے۔ بیشک اس کے اور قبلہ کے درمیان رب ہوتا ہے تو تم میں کوئی قبلہ کی طرف ہرگز نہ تھوکے۔ البتہ بائیں جانب یا زیر پا تھوکے۔ پھر حضور نے اپنی چادر کا ایک گوشہ لیا اس میں تھوکا اور اس گوشہ کو مل دیا اور فرمایا: یا اس طرح کرے۔

حضرت شیخ محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

اواگر مسجد است البتہ ہمچنیں کند ودر غیر مسجد اختیار دارد کہ در جانب چپ بینداز دیا زیر پا:

اگر مسجد میں ہے تو ایسا ہی کرے اور اگر غیر مسجد میں تو اسے اختیار ہے کہ دائیں جانب تھوکے یا زیر پا۔

مراقی الفلاح میں ہے: ویکرہ ان یرمی بزاقہ الا ان یضطر فیاخذ بثوبہ او یلقیہ تحت رجلہ الیسریٰ اذ صلی خارج المسجد: (ص ۲۰۳)

اور نماز میں تھوکنا مکروہ ہے ہاں بحالت اضطراب اسے اپنے کپڑے میں لے یا بائیں پاؤں کے

نیچے پھینک دے۔ یہ جب ہے کہ غیر مسجد میں نماز پڑھ رہا ہو۔

بالجملہ اگر نمازی مسجد میں نماز پڑھ رہا ہے اور اسے تھوکنے کی ضرورت ہی پیش آجائے تو حرمت مسجد کے لحاظ سے اس کے لئے بہتر طریقہ یہی ہے کہ وہ اپنے کسی کپڑے کے حصہ میں تھوکے اور مسجد کو ملوث نہ کرے۔ اور غیر مسجد میں بھی دائیں جانب اور سامنے نہ تھوکے۔ بائیں جانب کی اجازت ہے اور یہ بیان اس وقت ہے جب اس کی ضرورت شدید پیش آجائے ورنہ اس کی کراہت مصرح ہے۔

اب رہا اس کی عادت بنا لینا اس کے منافی صلاۃ ہونے میں کوئی شک نہیں، اور جس عالم نے دائیں طرف تھوکنے کی اجازت دی اور پھر مسجد اور غیر مسجد کا فرق نہیں کیا یا محض اپنی رائے سے کہا کہ اس طرح تھوکو کہ برابر والے کو نہ معلوم ہو۔ یہ سب تصریحات کتب شرعیہ کے خلاف ہے اور زید اپنے عمل کے ثبوت میں جس عالم کا عمل پیش کرتا ہے یہ واقعی عمل کثیر ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۰۲)

لو رفع شخص فی الصلوۃ یدیہ او رجلیہ مرۃ أھذا فعل واحد ام کثیر؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

الاصل ان العمل الکثیر یفسد الصلوۃ وفسرہ بعضھم کما فی ردالمحتار ان ما یعمل عادۃ بالیدین کثیر وان عمل بواحدۃ کالتعمم وشد السراویل۔ وما عمل بواحد قلیل وان عمل بھما کحل السراویل و لبس القلنسوۃ ونزعھا الا اذا اتکررثلاثا متوالیۃ۔ فرفع الیدین فی الصلوۃ ان کان مما یعمل عادۃ بالیدین فکثیر ویفسد بہ الصلوۃ ولو مرۃ والا فھو قلیل لا یفسد بہ الصلوۃ لو کان مرۃ الا اذار فعھما ثلاثا متوالیۃ واما لو رفع یدیہ عند الرکوع والرفع۔

منہ کما ھو مذھب الشافعی فیکرہ عندنا فلا یفسد الصلوۃ وقس حکم عمل الرجلین علیٰ حکم عمل الیدین کما ھو مصرح فی ردالمحتار۔ واحسن الاقوال الذی علیہ عامۃ الفقھاء و ھو کل عمل یغلب علی ظن الناظر الی المصلیٰ انہ لیس فی

الصلوۃ فھو عمل کثیر ولو مرۃ ۔فرفع الیدین او الرجلین ان کان علی ھذا القدر فھو مفسد للصلوۃ ولو کان مرۃ ۔ و اللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۰۳)

حضرت علامہ الدھر وحید العصر فقیہ معظم مفتی ہند مولینا مولوی شاہ محمد اجمل صاحب دامت برکاتہم العالیہ ------------------ السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ

عرض یہ ہے کہ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ مسجد کے وسط در میں باہر کی جانب امام کے کھڑے ہونیکی جگہ دو تین چوکے رکھدیتے ہیں جنکی اونچائی باہر کے فرش سے بعض جگہ دو انگل اور بعض جگہ چار انگل اور بعض جگہ اس سے زائد ہوتی ہے۔ ایسا کرنا درست ہے یا نہیں؟ ۔اور نماز میں تو کوئی نقص لازم نہیں آتا؟ ۔اور اگر آتا ہے تو کس درجہ کا مع حوالہ جواب مرحمت فرمائیے فقط (نوٹ) مقدار اونچائی کتنی ہونی چاہیے؟ ۔

المستفتی مولوی محمد اشفاق حسین غفرلہ از پالی مارواڑ مدرسہ محافظ العلوم ۔ ۱۰ شعبان المعظم ۱۳۶۲ھ ۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد کے در میں ستونوں کے درمیان امام کا کھڑا ہونا مکروہ ہے۔

علامہ ابن عابدین معراج الدرایہ سے ناقل ہیں: الاصح ماروی عن ابی حنیفۃ انہ قال یکرہ للامام ان یقوم بین الساریتین۔ (ردالمحتار مصری ص ۳۹۹ وص ۴۵۳)

تو امام در سے باہر کھڑا ہوگا، پھر جن مساجد میں اندر کا فرش باہر کے فرش سے اونچا ہو تو باہر کے فرش کو مقدار قدم یا اکثر قدم کے اندر کے فرش کی برابر اونچا کیا جائیگا تاکہ امام در سے باہر کھڑا ہوسکے۔

لہذا یہ باہر کے فرش کا امام کے کھڑے ہونے کی مقدار اونچا کرنا کراہت سے بچنے کیلئے ہے۔ تو ایسی مساجد میں امام کے کھڑے ہونیکی جگہ کا اونچا نہ کرنا اور امام کا در میں ستونوں کے درمیان کھڑا ہونا مکروہ ہے اور یہ کراہت کا قول خود ہمارے امام مذہب حضرت امام الائمہ سراج الامہ ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ سے مروی ہے، اور جب یہ مکروہ ثابت ہوا تو نماز بکراہت ادا ہوئی اور جو نماز بکراہت ادا ہوا سکے اعادہ کا

حکم ہے۔ مراقی الفلاح میں ہے" کل صلوۃ أدیت مع الکراھۃ فانھا تعاد۔ (طحطاوی مصری ص ۲۰۱)

فتاوے عالمگیری میں یہ الفاظ اور زائد ہیں: "فان کان تلك الکراھۃ کراھۃ تحریم تجب الاعادۃ او تنزیہ تستحب ۔ (عالمگیری مجیدی ص ۵۷ ج ۱)

اور یہ اونچائی اگر ایک گز سے کم ہے تو مکروہ بھی نہیں ہے، اور اگر ایک گز یا اس سے زائد ہے اور اس پر امام تنہا ہی کھڑا ہوا تو نماز مکروہ ہوگی۔

درمختار میں ہے: وانفراد الامام علی الدکان للنھی وقدر الارتفاع بذراع ولا باس مادونہ۔ (درالمختار ص ۴۵۳ ج ۱)

مراقی الفلاح میں ہے: یکروہ قیام الامام علی مکان بقدر ذراع علی المعتمد ۔ (طحطاوی ص ۱۱)

حاصل جواب یہ ہے کہ امام نماز پڑھانے کیلئے در سے باہر ہو۔ واللہ تعالے اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۰۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

آیت سجدہ فرض نماز میں پڑھنی چاہئے یا نہیں؟ اگر پڑھی جائے تو سجدہ کیا جائے یا نہیں؟ اگر سجدہ کیا جائے تو فرض نماز میں کیا نقص ہوتا ہے؟ ۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

آیت سجدہ کو امام کا پڑھنا مکروہ ہے۔ درمختار میں ہے: "ویکرہ للامام ان یقرأھا فی مخافتہ ونحو جمعۃ وعید الا ان تکون بحیث تؤدی برکوع الصلاۃ او سجودھا۔ (درمختار مصری ص ۵۴۷)

اور امام کو آیت سجدہ کا آہستہ پڑھنا یا جمعہ وعیدین جیسے مجمع میں اس آیت کی تلاوت کرنا مکروہ ہے

۔ہاں اگر وہ رکوع یا سجدہ میں ادا ہو سکے تو آیت سجدہ کا پڑھنا مکروہ نہیں۔

تو امام اگر آیت سجدہ پڑھ کے سجدۂ تلاوت نہیں کرتا ہے تو اس میں ترک واجب لازم آتا ہے اگر سجدۂ تلاوت کرتا ہے تو مقتدی اشتباہ میں پڑ جائیں گے۔ ہاں اگر آیت سجدہ آخر آیت تھی اور اس نے فوراً رکوع وسجدہ کرلیا تو اس میں کوئی نقص لازم نہیں آتا۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۰۵۔۴۰۶)

کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے کرام ومفتیان شرع عظام دامت برکاتہم العالیہ مسائل حسب ذیل کی بابت کہ

(۱) زید کہتا ہے پیلی بھیت، بریلی، کانپور، مراد آباد میں لاؤڈ اسپیکر سے نماز پڑھنے کو علمائے کرام صرف انہیں چار شہروں کے منع کرتے ہیں اور بمبئی، لاہور، کراچی، پشاور وغیرہ تمام پاکستان اور مدینہ طیبہ مکہ معظمہ میں لاؤڈ اسپیکر پر نماز پڑھی جاتی ہے۔ صرف مذکورہ بالا شہر پیلی بھیت بریلی کانپور مراد آباد میں لاؤڈ اسپیکر سے نماز نہیں پڑھی جاتی ہے۔ اور یہاں کے علمائے کرام منع فرماتے اور لاؤڈ اسپیکر سے نماز پڑھنے کو ناجائز قرار دے کر بمبئی کراچی وغیرہ تمام پاکستان مدینہ طیبہ مکہ معظمہ وغیرہ کے علمائے کرام کے خلاف فتوی صادر فرما کر وہاں کے علمائے کرام کی مخالفت کرتے ہیں۔ اگر واقعی لاؤڈ اسپیکر پر نماز نہیں ہوتی ہے تو پھر وہاں کے علما منع کیوں نہیں کرتے؟۔ حالانکہ پاکستان میں حکومت بھی اسلامیہ ہے شرعاً کیا حکم ہے؟۔

(۲) زید یہ کہتا ہے کہ مدینہ طیبہ اور مکہ معظمہ میں جو نماز لاؤڈ اسپیکر سے ہوتی ہے وہ جس صورت سے وہاں پر ہوتی ہے وہ جائز اور نماز صحیح ہوتی ہے۔ یعنی وہاں کے لاؤڈ اسپیکر بہت زیادہ قیمت کے ہوتے ہیں اور وہاں امام کے گلے میں ایک ہارن جو ہار کی شکل میں ہوتا ہے پڑا ہوتا ہے۔ اور وہ کئی ہزار روپے کی قیمت کا ہوتا ہے۔ یہاں کے لاؤڈ اسپیکر اس قیمت کے نہیں ہوتے جس قیمت کا وہاں کا وہ ہار ہوتا ہے اور وہ امام گردن میں ڈال کر نماز پڑھاتا ہے، یہاں پر یہ نہیں ہے۔ لہذا وہاں پر نماز لاؤڈ اسپیکر پر جائز وصحیح ہے۔ اور یہاں پر صحیح نہیں ہے۔ لاؤڈ اسپیکر پر نماز اسی وجہ سے یہاں کے علماء منع کرتے ہیں۔ اور ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اور وہاں پر وہاں کے علماء منع نہیں کرتے ناجائز قرار نہیں دیتے۔ کہ یہ طریقہ نماز

ہونے کا ہے۔ شرعاً کیا حکم ہے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) زید کا یہ دعوی ہی غلط وباطل ہے۔ لاؤڈ اسپیکر سے نماز با جماعت پڑھنے کو صرف چار شہروں پیلی بھیت، بریلی، مراد آباد، اور کانپور کے علماء منع کرتے ہیں۔ اور بمبئی، لاہور، کراچی، پشاور اور تمام پاکستان، مدینہ طیبہ، مکہ مکرمہ کے علماء منع نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ اس کو جائز جانتے ہیں۔ ہاں زید کا یہ دعوی اس وقت صحیح ہوتا کہ وہ علمائے بمبئی، پاکستان، حرمین شریفین کے جواز کے فتاوی پیش کرتا۔ اور جب وہ ایسا کوئی فتوی پیش نہ کر سکا تو اس کا یہ دعوی بغیر ثبوت ہوا جو قابل قبول نہیں۔ اور فی الواقع اگر اسکے جواز کا کوئی فتوی ہوتا تو اس کا علم ہوتا، نظر کے سامنے گزرتا، لیکن میں نے تو ابھی تک کسی سے سنا بھی نہیں کہ کسی مفتی نے اس کے جواز پر فتوی دیا ہو۔ دیوبندی جماعت ایسے فتوے لکھنے میں سبقت کیا کرتی ہے۔ لیکن ابھی تک انہوں نے بھی اس کے جواز کا کوئی فتوی نہیں لکھا۔ بلکہ اسکے خلاف فتاوی دیوبند میں یہ فتوی چھپا ہوا موجود ہے۔

نماز با جماعت میں آلہ مکبر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) کا استعمال امام کی تکبیرات اور قرأت کو عام مقتدیوں تک پہنچانے کے لئے کرنا بالکل ناجائز ہے۔ اور جو لوگ تکبیر تحریمہ اس آلہ کی آواز پر کریں گے ان کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ (فتاوی دیوبند، ج ۸۔ ص ۷۰)

اور اس طرح مفتیان مظاہر العلوم، سہارنپور، اور مفتیان ڈھابیل ضلع سورت، ومفتیان مدرسہ فتح پوری ومدرسہ امینیہ دہلی نے نماز با جماعت میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ناجائز اور اسکی آواز پر اقتدا غلط اور نماز مقتدی کی فاسد قرار دی ہے۔ اور مفتی دہلی حضرت مولانا مولوی مظہر اللہ صاحب، امام مسجد فتح پوری نے تو اسکے عدم جواز پر ایسا مبسوط فتوی دیا ہے جو رسالہ ہو گیا جس کا نام قصد السبیل ہے۔

اس میں یہ ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ آلہ امام اور مقتدیوں کا غیر ہے۔ اور امام کا غیر مقتدی کے قول پر اور مقتدی کا غیر امام کے قول پر عمل کرنا مفسد صلوۃ ہے۔ پس آلہ کی آواز پر جو لوگ ارکان نماز ادا کریں گے انکی نماز نہ ہوگی۔ (قصد السبیل ص ۱۰)

اب اس سے زید کا یہ دعوی غلط ہو گیا کہ صرف چار شہروں پیلی بھیت، بریلی، مراد آباد، کانپور کے علماء منع کرتے ہیں، رسالہ امانت الاسلام جو کراچی میں شائع ہوا ہے اس میں ہندوستان کے شہروں سے

دہلی، سہانپور، دیوبند، ڈھابیل ضلع سورت، اجمیر شریف، پھوچھہ شریف۔ بھاولپور، مرادآباد، امروہہ، تھانہ بھون کے فتوے چھپے ہیں جس میں اسکو منع کیا گیا ہے۔تو زید کا جھوٹ کس قدر ظاہر ہوگیا، کہ صرف چار شہر کے علماء منع کرتے ہیں۔اسی طرح اس کا یہ کہنا بھی افترا اور جھوٹ ہے کہ تمام پاکستان کے علماء اس کو جائز جانتے ہیں۔اسی رسالہ امانت الاسلام میں ملتان، تونسہ شریف، علی پور میدان، گولڑہ شریف لاہور، کراچی، جالندھر، ڈیرہ غازی خان، راولپنڈی، لائل پور کے مفتیوں کے مطبوعہ موجود ہیں بلکہ مفتی پاکستان اور ۷۵ مفتیوں کے فتوی چھپ چکے جن میں انہوں نے اسکو منع کیا۔اور مفسد نماز قرار دیا۔تو زید کا یہ دعوی کہ لاہور کراچی وغیرہ تمام پاکستان کے علماء اس کو منع نہیں کرتے، کس قدر صریح جھوٹ اور بیجا افترا اور کھلا ہوا بہتان ہے۔

اب باقی رہا اس کا حرمین شریفین کا نام لینا تو یہ بھی علمائے حرمین پر افتراء معلوم ہوتا ہے۔کہ ان کا کوئی جواز کا فتوی ابھی تک نہ نظر سے گزرا نہ سماعت میں آیا۔اب رہا زید کا ان مقامات کے عمل سے استدلال کرنا۔تو عمل عوام ناجائز چیز کو جائز نہیں کر دیتا۔کتنے ناجائز امور عوام کے معمول ہیں تو وہ محض عمل عوام کے بنا پر جائز نہیں ہو جاتے، پھر زید کی ایک زبردست جہالت یہ ہے کہ پاکستان میں حکومت اسلام ہے، وہاں علماء نے منع کیوں نہیں کیا۔اس نادان سے پوچھو کہ مفتیان پاکستان نے اسکی ممانعت میں فتوے لکھ دیئے، رسائل چھاپ دیئے، تو پھر منع کرنا کس طرح ہوتا ہے۔ہم نے جو رسالہ امانت الاسلام کا نام پیش کیا ہے اس میں اکثر فتاوی علمائے پاکستان ہی کے ہیں۔اب آفتاب سے زیادہ روشن طور پر ثابت ہوگیا کہ علمائے بریلی، مرادآباد، پیلی بھیت، کانپور، نے جس طرح لاؤڈ اسپیکر سے نماز جماعت کو منع کیا اسی طرح بکثرت علمائے ہندوستان ومفتیان پاکستان نے بھی اس کو منع کیا ہے۔حتی کہ دیوبندی جماعت نے بھی اس میں کوئی اختلاف نہیں کیا۔تو زید سخت لغوگو، کذاب، افترا پرداز ثابت ہوا۔مولی تعالیٰ اس کو قبول حق کی توفیق دے۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب،۔

(۲) زید کا یہ قول بھی انتہائی لغو سراسر باطل ہے کہ لاؤڈ اسپیکر پر نماز حرمین شریفین میں صحیح ہے۔نہ حرمین شریفین میں اور نہ غیر حرمین میں۔حکم شرع مقامات کے بدل جانے سے بدل نہیں سکتا۔نہ لاؤڈ اسپیکر کا زائد قیمتی ہونا اور کم قیمتی ہونا شرعا فرق کرسکتا ہے۔ہر ذی عقل جانتا ہے۔کہ لاؤڈ اسپیکر جس طرح یہاں مکلّف انسان نہیں، اسی طرح وہاں بھی نہیں۔جس طرح یہاں نمازی نہیں وہاں بھی نمازی نہیں۔جس طرح یہاں آواز پہنچانے کا آلہ ہے وہاں بھی اسی طرح ہے۔یہاں اس کی آواز پر جس طرح نماز

نہیں ہوتی وہاں بھی نہیں ہوتی۔یہاں اقتدا کی جو علت فساد ہے وہاں بھی وہی علت فساد ہے۔تو اب زید کا یہاں کے لاؤڈ اسپیکر میں اور وہان کے لاؤڈ اسپیکر میں فرق کرنا جہالت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے۔اس کا کئی ہزار روپے کا قیمتی ہونا یا امام کے گلے میں بشکل ہار لٹکا دینا کیا اسکی حقیقت بدل دے گا۔یا اس کو از قسم معدنیات سے مکلّف انسان بنا دے گا۔حاصل یہ ہے کہ یہ سب زید کی جہالت ہے۔حکم شرع وہی ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کا نماز جماعت میں لگا دینا، حرمین شریفین اور غیر حرمین ہر مقام پر ناجائز ونادرست ہے۔اور مقتدی کی نماز کا مفسد ہے۔مولیٰ تعالیٰ زید کو ہدایت فرمائے۔اور باطل کی حمایت سے حفاظت فرمائے۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۰۷۔۴۰۸)

کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے کرام ومفتیان شرع متین دامت برکاتہم العالیہ مسائل حسب ذیل کی بابت کہ

(۱) زید کہتا ہے بعض لاؤڈ اسپیکر اس قسم کے ہوتے ہیں جو بولنے والے کی بعینہ آواز (اصل آواز) کیچ کر کے یعنی کھینچ کر دور تک پہنچاتے ہیں۔لہذا ایسے لاؤڈ اسپیکر سے اگر نماز پڑھی جائے تو امام اور مقتدیوں کی نماز بلا کراہت جائز وصحیح ہوگی۔کیونکہ مقتدی جو لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر رکوع وسجود کریں گے۔یہ آواز درحقیقت امام ہی کی آواز ہوگی۔لہذا مقتدیوں نے امام کی بعینہ آواز پر اقتدا کی اس لئے نماز صحیح ودرست ہوئی کہ لاؤڈ اسپیکر نے امام کی اصل آواز مقتدیوں تک پہونچائی ہے۔دریافت طلب یہ امر ہے کہ زید کا قول شرعا صحیح ہے یا نہیں؟۔کیا حکم شرعی ہے؟۔

(۲) جو لاؤڈ اسپیکر سے نماز پڑھائے اور جو پڑھیں وہ سب مجرم شرعی اور گنہگار ہوں گے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

تقریروں میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال سے یہ ثابت ہوا کہ لاؤڈ اسپیکر سے قرع اول منتقل نہیں ہوا جیسے گراموفون میں قرع اول کا انتقال نہیں ہوتا بلکہ اس سے آواز بازگشت پیدا ہوتی ہے۔اور برقی

طاقت کی بناپراس کا احساس مشکل ہوجاتا ہے۔ اور جب یہ حقیقت ہے تو اس میں بعینہ اصل آواز امام کا انتقال نہیں ہوا۔ تو اب آواز اسی آلہ لاؤڈ اسپیکر کی ہوئی۔ اسی لئے تو اس کی آواز سنکر ہر شخص یہی کہتا ہے کہ لاؤڈ اسپیکر بول رہا ہے۔ میں لاؤڈ اسپیکر کی آوازیں سن رہا ہوں، سنو لاؤڈ اسپیکر کی آواز آرہی ہے۔ تو آواز کی نسبت آلہ کی طرف کی جاتی ہے؟۔

پھر جب یہ آواز اس آلہ ہی کی ہوئی تو یقیناً یہ آلہ غیر امام ہے۔ اور غیر نمازی ہے۔ لہذا جب مقتدی نے اس آلہ کی آواز پر اقتدا کی تو اس نے غیر امام ہی کے قول پر تو عمل کیا اور غیر نمازی کے واسطے سے ارکان نماز ادا کئے۔ اور یہ امور مفسد صلوۃ مقتدی ہیں۔

ردالمحتار میں ہے: و کذا الاخذ ای اخذ المصلی غیر الامام یفتح من فتح علیه مفسد۔

تو اب قول زید کا غلط وباطل ہونا ظاہر ہوگیا اور مقتدی کی نماز کا غیر صحیح و نادرست ہونا ثابت ہوگیا

اور اگر فرض کر لیجئے کہ اس آلہ میں بعینہ اصل آواز امام ہی منتقل ہوتی ہے لیکن یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ امام کی آواز ہوا میں مکیف ہوکر اس آلہ میں پہنچی، اور اس آلہ نے اگلی ہوا میں نیا تموج پیدا کیا تو اگلی ہوا کے تموج کا سبب قریب یہ آلہ ہی تو قرار پایا۔ تو اب اس آواز کی نسبت اس آلہ لاؤڈ اسپیکر کی طرف ضرور کی جائے گی۔ نیز امام کی آواز جہاں تک پہونچی اس آلہ نے اس میں اتنا تصرف کیا کہ اب وہ آواز اس مقام پر بھی پہونچادی جہاں اصل آواز امام کسی طرح پہونچ نہیں سکتی تھی۔ تو اس لاؤڈ اسپیکر کا اتنا تصرف تو نا قابل انکار ہے۔ اور جب لاؤڈ اسپیکر کا یہ تصرف تسلیم ہے اور اس آواز کی نسبت لاؤڈ اسپیکر کی طرف صحیح ہے، تو پھر وہی نتیجہ نکلا کہ مقتدی کے حق میں غیر امام کا تصرف اور آواز واسطہ بنی۔ تو مقتدی کی نماز کے فاسد ہوجانے کے لئے اسقدر کافی ہے۔ جیسا کہ عبارت ردالمحتار سے ثابت ہوچکا۔ لہذا زید کا قول ہر طرح غلط ثابت ہوگا۔ اور لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ سے مقتدی کی نماز کسی طرح صحیح و درست ثابت نہ ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۲) جب لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ سے اقتدا ہی صحیح نہیں، اور مقتدی کی نماز ہی ادا نہیں ہوتی تو جو اس سے نماز پڑھائے اور جو پڑھیں وہ سب شرعاً مجرم وگنہگار رہوں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

رسالہ مکبر الصوت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله الذی بین لنا احکام الدین ۔ والصلوۃ والسلام علی رسوله وحبیبه الذی اظهر لنا مسائل الشرع المبین ۔ وعلی آله وصحبه الذین اید وا الاسلام بالقوۃ المتین وعلی المجتهدین والفقهاء الذین اسسوا الاصول للحوادث الی یوم الدین وعلی علماء امته العاملین والمفتیین اجمعین ۔

امابعد: حمد اسکے وجہ کریم کو جس نے اپنے دین کے محافظت کیے لئے مجتہدین اور فقہاء کو پیدا کیا اور صلوۃ وسلام اس رسول پاک صاحب لولاک پر جنہوں نے اپنی شریعت کی حفاظت کے لئے ہر صدی وقرن میں ایسے مفتی اور عالم بنائے جنہوں نے ایسے فتاوے اور احکام دیئے جو ہر زمانہ میں حوادث وواقعات کے لئے مثل نص کے ثابت ہوتے ہیں۔

چنانچہ ریڈیو اور لاؤڈ اسپیکر اگرچہ نوایجاد آلے ہیں لیکن فقہ میں انکی نظیریں آج بھی موجود ہیں رویت ہلال کے متعلق ریڈیو، وائرلیس، ٹیلی ویزن وغیرہ کے شرعی احکام میں میرا ایک مستقل ومکمل رسالہ اجلی القال مطبوعہ موجود ہے اور لاؤڈ اسپیکر کے متعلق مستقل رسالہ یہ ہے جسکے مطالعہ کے بعد اور کسی تحقیق کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ پہلے ۴۰ء میں جب تک اس لاؤڈ اسپیکر کی معرفت اور تجربہ نہیں ہوا تھا تو اس کا نماز میں امام کے سامنے لگانا مکروہ قرار دیا گیا تھا اور صرف کراہت کا فتوے دیا گیا تھا۔ اب چونکہ اس کی مکمل تحقیق اور تجربہ ہوا تو اس کا صدا اور آواز بازگشت ہونا ثابت ہوا۔ تو اب اسکو مفسد صلوۃ مقتدی قرار دیا گیا۔

لہذا حکم سے پہلے یہ چند مقدمات پیش کئے جاتے ہیں تا کہ فہم جواب میں آسانی ہو اور مسئلہ میں بصیرت حاصل ہو...

فاقول وبتوفیق اللہ تعالی اجول:

مقدمہ اولی: لاؤڈ اسپکر میں قرع اول بعینہ منتقل ہوتا ہے اور امام یا قائل کی اصل آواز اس آلہ سے مقتدیوں یا سامعین تک پہنچتی ہے، اس دعوے پر ابھی تک کوئی دلیل شرعی قائم نہ ہوسکی۔ اور ادھر تجربہ شاہد ہے کہ اگر یہ بات فی الواقع ہوتی تو اس لاؤڈ اسپیکر میں بولنے والے کی آواز پہچان لی جاتی اور آواز ممتاز ہوجاتی لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ بسا اوقات معرفت آواز میں غلطی ہوجاتی ہے۔ تو ثابت ہوگیا کہ یہ آلہ اصل آواز کو اخذ کرکے اپنے خصوصیات سے متکیف کرکے آواز کا اعادہ کرتا ہے۔ چنانچہ نغمہ والی آواز اور بے نغمہ والی آواز اس میں ایک سی معلوم ہوتی ہے۔ رہا اسکا آواز کو بلند کردینا تو یہ مسلم ہے۔ تو اسکی مثال اس طرح ہے جیسے کسی نے گیند کو پھینکا کچھ اوپر جاکر محرک اول کی تحریک کمزور ہوگئی۔ تو اس میں کسی نے ٹھوکر لگادی تو اس ٹھوکر سے اسکی حرکت ضرور قوی ہوجائے گی اور وہ بجائے دس گز کے بیس گز تک پہنچ جائے گی۔ تو اس کا ۲۰ گز تک پہنچ جانا یہ محرک اول کی حرکت سے نہیں ہوا بلکہ محرک ثانی کی ٹھوکر سے ہوا۔ ابھی چند سال ہوئے کہ جامع مسجد بریلی میں ایک جلسہ تھا جس میں یہ لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا اور اس میں کافی تعداد میں علمائے کرام تھے۔ جن میں حضرت مفتی اعظم فقیہ لاثانی مولانا مولوی شاہ الحاج مصطفے رضا خانصاحب ضرور قابل ذکر ہیں۔ تو یہ لاؤڈ اسپیکر واعظ کے الفاظ اور جملوں کا اسکے بعد اعادہ کرتا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر میں اعادہ کراتا اور تخت پر بیٹھنے والے دوہرا بیان سن رہے تھے۔ میں نے یہ احساس کرکے علمائے کرام سے عرض کیا کہ اسوقت ثابت ہوگیا کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز صدا اور آواز بازگشت ہے۔ سب نے بالاتفاق اسکو تسلیم کیا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز صدا اور آواز بازگشت ہے۔

مقدمہ ثانیہ: جب مقدمہ اولی سے یہ ثابت ہوچکا کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز صدا اور آواز بازگشت ہے تو فقہ میں صدا کے احکام موجود ہیں۔

چنانچہ آیت سجدہ اگر صدا سے سنی جائے تو سامع پر سجدہ تلاوت واجب نہیں۔

تنویر الابصار میں ہے:

لا تجب بسماعه من الصداء ۔ صدا سے آیت سجدہ سننے سے سجدہ تلاوت واجب نہیں ہوتا۔

(از شامی ص ۵۴۰ ۔ ج ۱)

مراقی الفلاح میں ہے: لا تجب بسماعها من الصداء وما هو يجيبك مثل صوتك في الجبال والصحاری ونحوها۔ (طحطاوی ص ۲۸۱)

صدا ہے اور اس سے جو بھی آواز لوٹا دے جیسے پہاڑوں اور جنگلوں میں تو ان سے آیت سجدہ سننے سے سجدہ تلاوت واجب نہیں ہوتا۔

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

فانه لا اجابة في الصدى وانما هو محاكاة ۔ (طحطاوی ص ۲۸۱)

غنیۃ شرح منیہ میں ہے: ولو سمعها من الطائر او الصدى لا تجب لا نه محاكاة وليس بقرأة۔ (غنیۃ ص ۴۶۸)

اگر آیت سجدہ کو پرندے یا صدا سے سنا تو سجدہ تلاوت واجب نہیں اس لئے کہ یہ آواز حکایت ہے قرأت نہیں ہے۔

در المنتقی میں ہے: لا تجب عليه لو سمعها من طائر او صدى ۔

(حاشیہ مجمع الانہر مصری ص ۱۵۶ ج ۱)

اگر آیت سجدہ کو پرندے یا صدا سے سنا تو سننے والے پر سجدہ تلاوت واجب نہیں۔

ان عبارات فقہاء سے ثابت ہوگیا کہ صدا کی آواز کو فقہاء نے معتبر نہ مانا اور اس سے سجدہ تلاوت واجب نہیں کیا۔ تو مقتدی کے حق میں لاؤڈ اسپیکر کی صدا کیسے معتبر و کافی قرار دی جاسکتی ہے۔

مقدمہ ثالثہ: نماز میں خشوع کا حاصل ہونا اشد ضروری ہے۔ طحطاوی میں ہے:

الخشوع حضور القلب وتسكين الجوارح والمحافظة على الاركان ۔

(طحطاوی ۲۰۱ ج ۱)

خشوع قلب کا حاضر رہنا اور جوارح کا ساکن ہونا اور ارکان صلوۃ کی حفاظت کرنا۔

شامی میں ہے:

مبنی الصلوۃ علی الخشوع والخشوع الذی ھو روح الصلوۃ ۔

مراقی الفلاح میں ہے:

نماز کی بنیاد خشوع پر ہے، اور خشوع نماز کی روح ہے۔

خشوع کا لحاظ جب نماز میں اس قدر ضروری ہے کہ وہ روح نماز اور مبنی صلوۃ ہے تو کون نہیں جانتا ہے کہ امام پر لاؤڈ اسپیکر کی پابندی ضرور خشوع کی منافی ہے۔ مقررین کو اس کی پابندی کبھی ایسی مشغول کرلیتی ہے کہ انھیں اپنی تقریر پوری کرنے کیلئے کبھی اس کو سامنے سے ہٹانا پڑ جاتا ہے۔ تو امام پر اس کی پابندی کس قدر شاغل قلب اور نماز کے منافی ہوگی۔ تو اس لاؤڈ اسپیکر کا امام کے سامنے لگانا روح نماز اور مبنی صلوٰۃ کے خلاف ہے۔

مقدمہ رابعہ: جو چیز خشوع قلب کو زائل کرے وہ نماز میں مکروہ تحریمی ہے۔

بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے ایک منقش چادر میں نماز ادا فرمائی اور اسکو بعد نماز واپس کردیا۔

قال النبی ﷺ کنت انظر الی علمھا وانا فی الصلوۃ فاخاف ان یفتننی۔

(بخاری ص ۵۴ ج ۱)

عینی میں اس حدیث کے تحت میں فرماتے ہیں:

فیہ طلب الخشوع فی الصلوۃ والا قبال علیھا ونفی کل ما یشغل ویلھی عنہ۔

(عینی ص ۲۵۹ ج ۲)

مراقی الفلاح میں ہے:

وتکرہ بحضرۃ کل ما یشغل البال کزینۃ وبحضرۃ مایخل بالخشوع۔

(طحطاوی ص ۲۰۱)

کبیری میں ہے:

فان کان اجنبیا من الصلوۃ لیس فیہ تتمیم لھا ولا فیہ دفع ضرر فھو مکروہ کاللعب بالثوب او البدن وکل ما یحصل بسببہ شغل القلب ۔ (کبیری ص ۳۳۴)

ردالمحتار میں ہے:

منھا الصلوۃ بحضرۃ ما یشغل البال ویخل بالخشوع ۔ (ردالمحتار ص ۲۵۹ ج ۱)

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ ہر وہ چیز جس سے شغل قلب ہو اور دل میں تشویش ہو اور خشوع زائل ہو وہ نماز میں مکروہ تحریمی ہے۔ اس سے اجتناب واحتراز ضروری ہے۔ لہذا لاؤڈ اسپیکر کے نماز میں لگانے سے ظاہر ہے کہ شغل قلب اور تشویش ہوگی اور خشوع زائل ہوگا۔ تو اس کا نماز میں لگانا کم از کم مکروہ تحریمی ہے اور منافی نماز ہے۔

مقدمہ خامسہ: ظاہر ہے کہ یہ لاؤڈ اسپیکر جب نماز میں امام کے سامنے لگایا گیا تو یہ نہ امام ہے نہ اس کا مقتدی کہ اس میں شرائط امام ومقتدی نہیں پائے جاتے۔ تو یہ اجنبی ہوا اور بقول استعمال کرنے والوں کے امام کی تکبیرات کا مقتدیوں تک پہونچانے والا واسطہ ہوا۔ گویا وہ مقتدیوں کے حق میں مبلغ تکبیرات امام قرار پایا۔ اور فقہائے کرام نے مبلغ کیلئے کچھ شرائط واحکام مقرر فرمائے ہیں۔

(۱) مسلم ہو۔ (۲) مکلّف ہو۔ (۳) پابند شرع ہو۔ (۴) متصف بعبادت یعنی نمازی ہو۔ (۵) صاحب قصد وارادہ ہو۔ (۶) اور وہ تبلیغ انتقالات بھی بقصد احرام کرتا ہو۔ یہاں تک کہ اگر مبلغ نے بقصد احرام تبلیغ نہیں کی بلکہ محض تبلیغ کیلئے آواز پہونچائی تو نہ خود اسکی نماز صحیح نہ اسکی تبلیغ پر جو لوگ انتقالات کرنے والے ہیں نہ انکی صحیح ہے۔

چنانچہ ردالمحتار میں ہے:

وکذا لک المبلغ اذا قصد التبلیغ فقط خالیا عن قصد الاحرام فلا صلوۃ لہ ولا عن

بند ہو جانے کا خطرہ غالب ہے۔ علاوہ بریں اسکی تبلیغ مفسد صلاۃ بھی ہے تو ایک سنت قدیمہ اور سہل الحصول خالی از خطرات کو چھوڑ کر بلا ضرورت شرعی کے ایسی بدعت کو جو مشکل الحصول پر از خطرات کو اختیار کرنا بلکہ اس کو ترجیح دینا کونسی فقہ دانی ہے۔ کہ اس میں ترک سنت لازم آئے۔ بدعت کو رائج کیا جائے۔ لوگوں کو پریشانی میں مبتلا کیا جائے۔ انکی نمازوں کو فاسد کیا جائے۔ لہذا شریعت بمقابلہ سنت قدیمہ اقامت مکبرین کے موجود ہوتے ہوئے اس بدعت استعمال لاؤڈ اسپیکر کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتی۔ تو لاؤڈ اسپیکر کو نماز میں ہرگز استعمال نہ کیا جائے۔

ان مقدمات پر غور کرنے کے بعد مسئلہ کا جواب واضح ہو گیا کہ نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ناجائز و بدعت ہے۔ اور جو لوگ اس کی آواز پر اقتدا کرتے ہیں ان کی نماز صحیح نہیں ہوتی بلکہ فاسد و باطل ہو جاتی ہے۔ اور اس کا نماز میں استعمال نماز کی بنیاد اور اس کی روحانیت کے خلاف اور منافی ہے۔

اب باقی رہا اذان کا حکم تو چونکہ اذان میں مقصود اعظم اعلام ہے۔

شامی میں ہے: ان الاصل فی مشروعیة الاذان الاعلام لدخول الوقت۔

تو جب اذان کی مشروعیت ہی اعلام کے لئے ہے اور اس لاؤڈ اسپیکر میں اعلام علی وجہ الکمال ہے لہذا جب اس میں کوئی محظور شرعی لازم نہیں آتا ہو اور ضرورت متقاضی ہو تو اس کا اذان میں استعمال جائز ہوا، اگر کوئی محظور شرعی لازم آئے تو اس کا استعمال نہ کریں۔ فقط واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۰۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
نماز کے واسطے اگر دوہرا یعنی دو جانماز بچھائے تو نماز میں کوئی کراہیت نہ ہوگی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ نماز نہیں ہوتی ہے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

دو جانمازوں کے بچھا لینے سے کسی طرح کی کراہت پیدا نہیں ہوتی۔ اور جب کراہت ہی اس میں نہیں تو نماز کے نہ ہونے کا خطرہ ہی پیدا نہ ہوا۔ تو جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس سے نماز نہیں ہوتی انکا یہ حکم غلط ہے۔ یہ بیچارے مسائل دین سے ناواقف ہیں اسی بنا پر ایسی غلط بات کہہ رہے ہیں۔ واللہ تعالی اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۱۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس بارے میں کہ
ایک امام صاحب ۴ر رمضان المبارک نماز تراویح کے وتروں کی رکعت میں بغیر دعائے قنوت پڑھے رکوع میں جھک گئے۔ لیکن امام صاحب کو فورا خیال آ گیا۔ اور کھڑے ہو کر دعا قنوت پڑھی لی اور سجدہ سہو ادا کر لیا بعدہ سلام پھیر دیا۔ سوال یہ ہے کہ وتر ہو گئے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صورت مسئولہ میں امام کو رکوع میں پہونچ جانے کے بعد قیام کی طرف نہ لوٹنا تھا وہ آخر میں سجدہ سہو کر لیتا تو ترک دعا قنوت کا نقصان پورا ہو جاتا و تر ادا ہو جاتے۔ لیکن جب امام غلطی سے قیام کی طرف لوٹ ہی گیا اور آخر میں اس نے سجدہ سہو بھی کر لیا تو وہ وتر بلا شک ادا ہو گئے۔ کہ سجدہ سہو کی غرض ہی اسی قسم کی غلطیوں کی اصلاح کرنا ہے۔ ردالمحتار میں ہے۔ لانہ لا صلاح مافات ای ماترک من الواجبات

فی محلہ ۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب ۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل ، الفقیر الی اللہ عز وجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۱۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ

اکثر اشخاص مسجد کے دروں میں نماز پڑھتے ہیں ۔ اور جمعہ کی نماز میں بالخصوص قلت جگہ کے باعث نماز کو کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ آیا امام جماعت کو ہی مسجد کے در میں نماز پڑھنا جائز ہے یا مقتدیوں کو بھی ۔ یا مسجد کے دروں کی کتنی چوڑائی نماز پڑھنے کے لئے درکار ہے ۔ اکثر دروں کی محراب نہیں ہوتی اس میں بھی ہر جامع مسجد میں اکثر دروں میں نماز پڑھتے ہیں ۔ اس کی بابت شریعت کے کیا احکام ہیں؟ ۔

ح ۔ م ۔ اشرفی ۲۵ ر اکتوبر

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بلاضرورت مسجد کے دروں میں نماز پڑھنا خلاف اولی ومکروہ ہے ۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل ، الفقیر الی اللہ عز وجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

﴿۲۵﴾

باب الجمعہ

مسئلہ (۴۱۲ ـ ۴۱۳ ـ ۴۱۴ ـ ۴۱۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ نماز جمعہ کے متعلق جو ذیل میں درج ہیں ۔
جواب اس کا مع حوالہ کتب معتبرہ مرحمت فرمایا جائے ۔

(۱) آیا نماز جمعہ کی ادائیگی میں خطبہ ہونا ضروری ہے یا واجب یا سنت موکدہ یا غیر مؤکدہ یا مستحب ہے؟ ۔

(۲) آیا نماز مذکور میں خطبہ نہ پڑھا جائے تو نماز کی ادائیگی میں کچھ فرق آئے گا یا نہیں؟ ۔

(۳) آیا خطبہ کا نماز جمعہ سے پہلے ہونا ضروری ہے یا بعد میں بھی ہو سکتا ہے اور پیش امام اور خطیب کا ایک ہونا ضروری ہے یا علیحدہ علیحدہ بھی ہو سکتے ہیں؟ ۔

(۴) جو نماز بکراہت تحریمی ادا ہوئی تو اس کا اعادہ ضروری ہے یا نہیں؟ ۔ بینوا توجروا ۔

از بھوپال وکیل عدالت

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) خطبہ نماز جمعہ کے لئے فرض ہے ۔ اسی لئے شرائط جمعہ میں اس کا شمار ہے ۔

تنویر الابصار میں ہے ۔ والرابع الخطبۃ ۔

یعنی چوتھی شرط صحت جمعہ کی خطبہ ہے ۔ اور اس سے واضح تصریح درمختار میں ہے :

(وکفت تحمیدہ و تھلیلہ او تسبیحہ للخطبۃ) المفروضۃ مع الکراھۃ ۔

یعنی کافی ہے خطبہ فرض کے لئے ایک بار'' الحمد للہ یا لا الہ الا اللہ یا سبحان اللہ'' کہنا مگر انھیں الفاظ پر اکتفا کرنا مکروہ ہے باوجودیکہ فرضیت ادا ہو جائے گی ۔ کیونکہ سنت یہ ہے کہ دو خطبے پڑھے جائیں ۔ جیسے تنویر الابصار میں ہے : ویسن خطبتان بجلسۃ بینھما ۔

اور مسنون ہیں دو خطبے مع ایک جلسہ کے ان کے درمیان میں۔

لہذا نفس خطبہ جمعہ کے لئے فرض ہوا۔

(۲) جب خطبہ نماز جمعہ کی صحت کے لئے شرط ہے۔ جیسا کہ تنویر الابصار اور اس کی شرح میں ہے۔ و يشترط لصحتها سبعة اشياء۔ یعنی جمعہ کی صحت کے لئے سات چیزیں شرط ہیں اور منجملہ ان کے چوتھی شرط جمعہ کی خطبہ ہے۔ تو جمعہ بغیر خطبہ کے ہرگز نہ ہوگا۔ کیونکہ شرط کی نفی سے مشروط کی نفی ہوتی ہے۔ درمختار میں ہے: فلو خطب قبله وصلى فيه لم تصح ۔

یعنی اگر کسی نے خطبہ وقت سے پہلے پڑھ لیا اور نماز وقت میں پڑھی تو جمعہ درست نہیں ہوگا۔ لہذا جمعہ کی صحت کے لئے خطبہ کا ہونا ضروری ہے۔

(۳) خطبہ قبل نماز ہی ہوگا۔ درمختار میں ہے: والخامس كونها قبلها لان شرط الشئ سابق عليه۔

یعنی پانچویں شرط صحت جمعہ کی خطبہ کا نماز جمعہ سے پہلے ہونا ہے۔ اس لئے کہ شرط چیز کی اس سے پیشتر ہوا کرتی ہے۔ رہا پیش امام اور خطیب کا ایک ہونا تو یہ کوئی شرط نہیں ہے۔ اسی میں ہے:

لا يشترط اتحاد الامام والخطيب۔ یعنی خطبہ پڑھنے والے اور نماز پڑھانے والے کا ایک ہونا شرط نہیں ہے۔ علاوہ بریں علامہ تمرتاشی صاحب تنویر الابصار نے اس کی اور زیادہ تصریح فرمائی ہے:

لا ينبغي ان يصلى بالقوم غير الخطيب فان فعل بان خطب صبي باذن السلطان وصلى بالغ جاز ۔

یعنی مناسب نہیں کہ سوائے خطبہ پڑھنے والے کے دوسرا شخص آدمیوں کو نماز پڑھائے۔ پس اگر ایسا کیا جائے کہ امام جدا ہو اور خطیب جدا اس طرح کہ خطبہ ایک نابالغ لڑکا سلطان کی اجازت سے پڑھے اور نماز کوئی بالغ پڑھائے تو جائز ہے۔ صاحب درمختار لفظ جائز کے بعد لکھتے ہیں: وهو المختار۔

یعنی یہی قول علماء کا اختیار کیا ہوا ہے۔ لہذا بنا بر مذہب مختار کے امام اور خطیب علیحدہ علیحدہ ہو سکتے ہیں اور ہرگز اس نماز میں کسی قسم کی کراہت یا خرابی نہیں ہوگی۔

(۴) شامی وغیرہ نے تصریح کر دی ہے کہ جو نماز بکراہت تحریمی ادا کی گئی ہو اس کا اعادہ واجب ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۱۶) از محلہ چمن سرائے سنبھل

نحمده ونصلي على رسول الكريم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین درمیان خطبے میں اردو نظم کا پڑھنا ممنوع ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

خطبہ غیر عربی میں پڑھنا خلاف سنت ہے، اب چاہے وہ اردو زبان میں ہو یا فارسی میں۔ اب رہی نظم اس کو علمائے کرام خود زبان عربی میں بھی پسند نہیں کرتے۔ چہ جائیکہ کسی اور زبان میں۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۱۷) از گوالیار۔ قاسم جی، جان جی صاحب

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و حامیان شرع متین ان مسائل میں کہ

جو دونوں خطبہ کے درمیان علمائے سلف نے بروز جمعہ یا عیدین زبان اردو یا فارسی میں نظم اشعار وغیرہ پڑھنے کے لئے ترتیب وار لکھے ہیں اور لوگ پڑھتے آئے ہیں۔ اور اب بھی پڑھتے ہیں لیکن کہیں کہیں روک تھام ہونے کی وجہ سے زمانہ حال میں اختلاف ہو رہا ہے۔ کوئی خلاف سنت اور کوئی کچھ کہتا ہے۔ بالخصوص مولانا اشرفعلی تھانوی بہشتی زیور، حصہ یازدہم، ص ۶۵ پر میں تحریر فرماتے ہیں کہ "دونوں خطبوں کا عربی زبان میں ہونا اور کسی اور زبان میں پڑھنا یا اس کے ساتھ کسی اور زبان کے اشعار وغیرہ ملا دینا جیسا کہ ہمارے زمانہ میں بعض عوام کا دستور ہے خلاف سنت مؤکدہ اور مکروہ تحریمی ہے" کیا یہ ارشاد آپ کا ہی ہے اور اسی صفحہ میں وعظ اور نصیحت کا خطبہ میں ہونا مسنون فرماتے ہیں۔ تو کیا وعظ ہر زبان میں ہونا چاہئے یا عربی زبان میں؟ اگر مولوی صاحب کا یہ ارشاد بالا ٹھیک ہے تو خیال پیدا ہوتا ہے کہ مجموعات خطبات تصنیفات علمائے دین بڑے بڑے مفسرین زمانہ سابقہ کی ہوئی موجود ہے جس میں دونوں خطبوں

شریعت سے بے خبر تھے یا کہ انھوں نے غلطی کی ہے؟ اور اگر خلاف سنت تھا تو اسی وقت کیوں نہ روکا گیا مکروہ تحریمی فعل حرام اور خلاف سنت مؤکدہ کا کرنے والا گنہگار ہوتا ہے تو کیا علمائے دین سابقین سب کے سب گنہگار اور سزاوار ہوئے؟ اور جواب بھی خطبوں میں اردو نظم پڑھتے ہیں مستوجب سزا کے ہوتے ہیں؟۔

اگر مولوی صاحب موصوف کا قول غلط ہے تو جو اس آپ کی تصنیف مثلاً حفظ الایمان، اصلاح الرسوم، تعلیم الدین وغیرہ پر اعتماد رکھے اور نظم پڑھنے سے روک دیوے اور اذان میں حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے نام کو بوسہ نہ دیوے اور دوسروں سے فرض واجب کی دلیل طلب کرے اور قبر کی مٹی جو میت کو لحد میں رکھ کر ایصال ثواب کے لئے دی جاتی ہے روک دیوے۔ غرض کہ جتنے کام علمائے دین نے ایصال ثواب کے لئے مرجہ کئے ہوئے ہیں سب کی ممانعت کرے اور جدید طریقہ رائج کرے اور قدیم کو چھڑا دے۔ تو ایسے شخص کا کیا مذہب ہے اور شریعت میں اس کا کیا حکم ہے اور اس کی امامت جائز ہے یا نہیں؟ اور جس جگہ زبان عربی کو کوئی نہ سمجھتا ہو خطیب تو درکنار سامعین اور مانعین بھی عربی کے مترجم نہ ہوں تو ایسے دیہات میں دونوں خطبہ عربی زبان میں پڑھ دینے سے خطبہ کی ایجاد کا مقصد ادا ہو سکتا ہے، اور خطبہ میں نظم کا رواج کب سے ہوا ہے اور کیوں ہوا؟ اس کی ضرورت تھی جو علمائے دین نے رائج کی اور بہ نسبت حال زمانہ کے وہ زمانہ علم اور دیانت داری میں کیسا ہے؟ اور از روئے خبر اس زمانہ سے بہتر تھا یا نہیں؟ اور اس زمانہ کو اجماع امت مانا جائے گا یا نہیں؟ بینوا و توجروا

حضرت جو کچھ بانکا ترچھا آیا واہی تباہی لکھ کر پیش خدمت عالیہ میں گذارش کر دیا ہے، آپ حضرات مقصد ضروریہ کو مد نظر رکھ کر فتاوی عنایت فرما کر مشکور فرمائیں گے۔ یہاں پر ایسا موقع ہے کہ اگر نظم کے جواز کا فتوی مل گیا تو وہابیہ کا اعتقاد سب غلط مانا جائے گا ورنہ برعکس۔ اس منادر کے گرد و نواح میں کیا دیہات کیا شہر چاروں طرف نظم پڑھی جاتی ہے اور یہاں بھی پڑھی جاتی ہے، لیکن چند ماہ سے نئی روشنی والوں کی سازش سے روک دی گئی ہے۔ لہذا فتوی کی ضرورت ہے۔

الجواب

نحمده ونصلي على رسوله الكريم

احکام شرع دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ ہیں کہ جن کو عقائد سے تعلق ہے اور ان کو اعتقادیات کہتے ہیں۔ اس میں جو شخص مخالفت کرے گا وہ گمراہ، بددین ہو جائے گا۔ دوسرے وہ ہیں جو عمل سے تعلق رکھتے

ہیں ان کو شرعیات کہا جاتا ہے۔ ان کے اختلاف سے کفر یا گمراہی یا بد مذہبی پیدا نہیں ہوتی۔ وہابیہ سے جو ہمارا اختلاف ہے وہ عقائد کے اعتبار سے ہے۔ وہ سید عالم نور مجسم فخر بنی آدم نبی مکرم رسول معظم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخیاں اور بے ادبیاں کرتے ہیں، چھاپتے ہیں، شائع کرتے ہیں، اور مسائل شرعیہ عملیہ میں یعنی حلت و حرمت میں اگر ان کا ہمارا کہیں اتفاق ہو جائے تو وہ اتفاق ہمارے لئے کوئی مضر نہیں ہے، ہم پر یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ان کی ہر بات میں خلاف کریں۔ چنانچہ اگر وہ نماز عصر میں چار رکعتیں بیان کرتے ہیں تو ہم ان کی مخالفت میں پانچ یا تین رکعتیں کہنے لگیں۔ یا وہ زنا کو حرام کہتے ہیں تو ہم ان کی مخالفت میں اس کو حلال کہنے لگیں۔

خلاصہ کلام کا یہ ہے کہ اس مسئلہ میں اگر وہ ہمارے موافق ہیں تو اس سے ان کے مذہب کی حقانیت ثابت نہیں ہوتی، نہ ان کو اس پر سنیوں سے کچھ کہنے کا حق ہے، اور نہ سنیوں کو خواہ مخواہ ان کی مخالفت کرنی روا ہے۔

اب اصل مسئلہ کے جواب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں کہ مسائل شریعت کے دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ ہیں کہ جن کی علت اور غرض تک ہماری عقل کو رسائی ہو جاتی ہے۔ مثلاً شراب کی حرمت اس وجہ سے ہے کہ اس میں نشہ ہے۔ اب اس علت کی وجہ سے ہم ہر اس چیز کو حرام کہہ دیں گے جس میں نشہ ہو۔ دوسرے وہ کہ جن کی علت و غرض تک ہماری عقل کو رسائی نہیں ہو سکتی ہے۔ مثلاً کسی شخص کی پشت میں پھوڑا ہے اور اس سے خون بہا اور اب شریعت اس کے لئے وضو کرنے کا حکم دیتی ہے۔ اب یہ بالکل عقل کے خلاف ہے کہ خون تو کہیں سے نکلے اور دھونے کا حکم دوسرے حصہ کو دیا جائے۔ لہذا اس بارے میں تمام علماء یہی لکھتے ہیں کہ اس کو بے تکلف جیسا شریعت نے بیان فرمایا ہے ہم تسلیم کر لیں گے۔ اپنی عقل سے اس میں تبدیلی اور تغیر ہرگز نہ کر سکیں گے۔ بالجملہ خطبہ کا عربی میں پڑھا جانا حضور اقدس صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے زمانہ سے آج تک برابر ہر ملک اور ہر اقلیم میں جاری ہے۔ باوجود کہ دور صحابہ میں عرب کے علاوہ عجمیوں میں جمعے قائم کر دیئے اور وہ عربی ہی پڑھے جاتے تھے باوجودیکہ وہ لوگ عربی زبان نہیں جانتے تھے۔ لیکن اس وقت یہ سوال نہیں اٹھا کہ خطبہ میں ہر ملک کی زبان شامل کر دی جائے، نہ پہلے ائمہ نے اس ضرورت کو محسوس کیا، نہ اور ہر صدی کے علماء نے اس کی اہمیت محسوس کی۔ آج چند برس سے کوتاہ اندیشوں اور سادہ لوحوں نے بغیر کسی عالم کے فتوے کے خود بخود اپنی طرف سے اردو، فارسی کے اشعار عربی خطبہ میں شامل کر دیئے ہیں اور اس وقت ہر جگہ سے یہی سوالات آ رہے ہیں کہ خطبہ بالکل اردو میں

ہونا چاہئے اور حقیقت یہ ہے کہ خطبہ میں اردو یا فارسی زبان کو عربی میں شامل کرنا خلاف سنت متوارثہ ہے چنانچہ حاشیہ شرح وقایہ میں ہے۔

لا شك ان قرأة الخطبة بغير العربية خلاف السنة المتوارثه من النبي صلى الله تعالىٰ عليه و سلم و الصحابة رضوان الله تعالىٰ عليهم اجمعين فيكون مكروها تحريما و كذا قراة اشعار الفارسية و الهندية فيها ۔

یعنی بیشک خطبہ میں عربی کا پڑھنا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی سنت کے خلاف ہے۔ پس مکروہ تحریمی ہوا اور ایسے ہی خطبہ میں فارسی اور ہندی کے اشعار کا پڑھنا۔

علاوہ بریں اس کے جواز کی اجازت دینے میں جو آئندہ نقصانات ہیں ان کا لحاظ رکھنا علماء کے لئے بہت ضروری ہے۔ عوام کو ان پر کیونکہ اطلاع نہیں ہے اس لئے وہ خواہ مخواہ اس مسئلہ کے لئے جبر کرتے ہیں۔ ہاں خطبہ کے مضمون کو بطریقہ وعظ بعد نماز جمعہ یا خطبے سے پہلے بیان کرنے کی اجازت ہے۔

اگر اس کی کافی تحقیقات دیکھنی ہو تو سنی کتب خانہ سے رسالہ ’’السنية السنية في كون الخطبة بالعربية‘‘ منگا کر ملاحظہ کیجئے۔

اور ان تھانوی صاحب پر علمائے عرب وہند نے اسی ’’حفظ الایمان‘‘ وغیرہ کی عبارتوں پر کفر کے فتوے دیئے ہیں۔ لہٰذا ان کی کتابیں، ان کے مسائل، ان کے فتوے، ہرگز قابل عمل نہیں۔ خود ان کے پیچھے یا باوجود ان کی کتابوں پر مطلع ہونے کے جو ان کو صحیح عقیدہ پر جانے اس کی اقتدا کرنا اور اس کو امام بنانا ہرگز ہرگز جائز نہیں۔ اور نام اقدس پر اذان میں انگوٹھے چومنا۔ یا قبر میں قل کئے ڈھیلے رکھنا۔ یا ایصال ثواب کے کام کرنا بالکل جائز ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۱۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی شخص کسی موقع پر کسی ذکر خیر یا کہیں مجمع میں کوئی بات بیان کرے تو اس وقت از روئے نصیحت کہ ہاتھ کے اشارہ سے سمجھانا اور بتلانا جائز ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

وعظ یا خطبہ کی حالت میں فقط شہادت کی انگلی کے ساتھ اشارہ تو خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہے چنانچہ مشکوۃ شریف میں بروایت مسلم شریف یہ حدیث مروی ہے

عن عمارة ابن زويب انه راى بشير ابن مروان على المنبر رافعا يديه فقال قبح الله هاتين العبدين لقد رأيت رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه و سلم ما يزيد على ان يقال بيده هكذا او اشار باصبعه المسبحة۔

یعنی حضرت عمارہ ابن زویب سے مروی ہے کہ انہوں نے بشیر ابن مروان کو منبر پر ہاتھ اٹھائے ہوئے دیکھ کر کہا: اللہ تعالیٰ ان دونوں ہاتھوں کو ہلاک کرے، میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ نہیں زیادہ فرماتے کچھ فرماتے وقت مگر اپنے ہاتھ کے ساتھ اس طرح۔ پھر انہیں حضرت عمارہ نے اپنی انگشت شہادت کے ساتھ اشارہ کر کے دکھایا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۱۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

امام نے خطبہ پڑھا اور جب پڑھ چکا دوسرے شخص سے کہا آپ نماز پڑھائیے۔ اس شخص نے کہا خطبہ دوبارہ پڑھوں گا ورنہ نماز نہیں ہوگی، امام نے کہا کہ اگر دوبارہ پڑھوں گا تو گنہگار ہونگا ان دو میں کون صحیح پر ہے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

امام اور خطبہ پڑھنے والے کا ایک ہونا ضروری نہیں۔ چنانچہ درمختار میں ہے:

لا يشترط اتحاد الامام والخطيب۔

طحاوی میں قنیہ سے ناقل ہیں: اتحاد الخطيب والامام ليس بشرط على المختار نهر

لہٰذا صورت مسئولہ میں دوبارہ خطبہ پڑھنے کی ضرورت نہیں پہلا خطبہ کافی ہے۔

مسئلہ (۴۲۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ امام جمعہ کے دن خطبہ پڑھ کر پہلے نماز کے یعنی خطبہ اور نماز کے درمیان میں بات چیت کرسکتا ہے یا نہیں بینوا توجروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

خطبہ اور نماز کے درمیان دنیوی کلام کرنا مکروہ ہے۔ چنانچہ جوہرہ نیرہ میں ہے:

اما المتعلق بامور الدنیا مکروہ اجماعا وھکذا کلہ قبل الخطبۃ او بعدھا

اور اسی طرح درمختار اور سراج اور بحر اور عنایہ اور نہایہ وغیرہا میں ہے۔ اب رہا کلام وافر تو اس میں بھی امام صاحب کا یہی مسلک ہے کما ھو عامۃ الکتب ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۲۱-۴۲۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) سنت آخر ظہر کے پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ مولوی اشرفعلی صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اخیر الظہر پڑھنا جائز نہیں۔ اور بہت کہتے ہیں کہ گاؤں میں پڑھنا چاہئے شہر میں نہیں، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مثل نفل کے ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مثل واجب کے ہے، ان میں کس کا قول صحیح ہے؟ اس مسئلہ میں بہت اختلاف ہو رہا ہے اب عرض یہ ہے کہ اس مسئلہ کی پوری تحقیق کردی جائے اور ساتھ ہی ساتھ دلیلیں بھی نقل کردیں جائیں اور ترجمہ اردو میں ہو۔

(۲) عیدگاہ میں جمعہ کی نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر عیدگاہ سے ایک سو (۱۰۰) ہاتھ پر مسجد بھی ہو جب کہ سال گذشتہ عید الفطر جمعہ کے دن ہوئی اور اسی جگہ چار مسجد کے لوگ عیدگاہ میں جمع ہوئے اور چاروں مسجدیں عیدگاہ سے قریب ہیں کوئی ایک سو (۱۰۰) ہاتھ فاصلہ پر، کوئی تین سو ہاتھ فاصلہ پر، کوئی پانسو ہاتھ فاصلہ پر، اس صورت میں جمعہ کی نماز عیدگاہ میں پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

العبد المذنب عبد الکریم خاں ضلع ہوشنگ ملک بنگال

الجواب

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

(۱) اقول وباللہ التوفیق۔ ایسی آبادی جس میں چند محلے ہوں اور بازار بھی ہوں اور اس میں کوئی ایسا بااختیار حاکم بھی ہو کہ مظلوم کا ظالم سے انصاف لینے پر قدرت رکھتا ہو اور جس کے متعلق کچھ دیہات بھی ہوں، اس کو بنا بر قول صحیح کے مصر کہتے ہیں۔ اور ہمارے عرف کی بنا پر وہ آبادی ضلع تحصیل یا پرگنہ کہلاتی ہے۔

چنانچہ غنیہ میں ہے:

صرح بہ فی تحفۃ الفقہاء عن ابی حنیفۃ انہ بلدۃ کبیرۃ فیھا سکک واسواق ولھا رساتیق وفیھا وال یقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمہ وعلمہ او علم غیرہ جمع الناس الیہ فیما یقع من الحوادث وھذا ھو الاصح۔

تحفۃ الفقہاء میں امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے تصریح ہے کہ مصر وہ بڑی آبادی ہے جس میں متعدد محلے اور بازار ہوں اور اس کے متعلق دیہات ہوں اور اس میں شہر کا حاکم ہو اپنی شوکت اور اپنے یا دوسرے کے علم کے ذریعہ سے مظلوم کا انصاف ظالم سے لینے پر قادر ہو، لوگ اس کے یہاں نالش میں رجوع کرتے ہوں اور یہی تعریف سب سے زیادہ صحیح ہے اور اسی تعریف کو بحر الرائق اور بدائع اور عینی شرح کنز الدقائق وغیرہ کتب فقہ نے اصح قول قرار دیا ہے۔ اور قریہ جات یعنی ان آبادیوں میں جہاں یہ مصر کی تعریف بالیقین صادق نہیں آتی وہاں جمعہ پڑھنے سے ظہر کی فرضیت ذمہ ہی باقی رہتی ہے۔

چنانچہ عینی اور بحر الرائق میں ہے:

شرط صحتھا ان تودی فی مصر حتی لا تصح فی قریۃ ولا مفازۃ لقول علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ: لا جمعۃ ولا تشریق ولا صلوۃ فطر ولا اضحی الا فی مصر جامع او فی مدینۃ عظیمۃ رواہ ابن حبان وابن ابی شیبہ وصححہ ابن حزم وکفی بقولہ قدوۃ واماما۔

غنیۃ شرح منیہ میں ہے:

الشرط الاول المصر اوفناءہ فلا تجوز فی القریٰ عندنا وھو مذھب علی ابن ابی طالب وحذیفہ وعطاء والحسن ابن ابی الحسن والنخعی ومجاھد وابن سیرین والثوری وسحنون۔

خلاصہ ان دونوں عبارتوں کا یہ ہے کہ صحت ادائے جمعہ کی پہلی شرط اس آبادی کا مصر یا فناء مصر ہونا یہاں تک کہ ہمارے نزدیک گاؤں اور جنگل میں جمعہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ حضرت مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے مروی ہے کہ جمعہ اور تشریق اور عید الفطر اور عید اضحیٰ سوائے مصر جامع اور بڑی آبادی کے ادا نہیں ہوتے۔ اس کو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا، اور ابن حزم نے تصحیح فرمائی۔ اور یہی حضرت علی اور حذیفہ اور عطا اور حسن ابن ابی الحسن اور نخعی اور مجاہد اور ابن سیرین اور ثوری اور سحنون رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مذہب ہے۔

لہذا جب کسی آبادی پر مصر کی تعریف صادق آئے اور دیگر شرائط جمعہ بھی پائے جائیں تو وہاں ہمارے ذمہ سے یقیناً حتماً جزماً فرض وقت یعنی نماز ظہر کی فرضیت ساقط ہو جائے گی۔ اب رہا چار رکعت آخر الظہر کا اس کے متعلق میرے خیال میں اقوال فقہاء کو جمع کر کے ان میں تطبیق کی جائے تو چار حکم کتب فقہ سے معلوم ہوتے ہیں۔

حکم اول: جس آبادی پر مصر کی تعریف مذکور صادق آئے اس میں کسی قسم کا تردد اور شک نہیں ہے بلکہ اس کا مصر ہونا یقینی ہے اور اس میں جمعہ کی جماعت صرف ایک جگہ ہوتی ہے تو وہاں آخر الظہر پڑھنے کی حاجت نہیں۔

چنانچہ بحر میں ہے: وقد افتيت مرارا بعدم صلوة الاربع بعدها بنية اخر الظهر خوف اعتقاد عدم فرضية الجمعة وهو الاحتياط في زماننا۔

میں نے چند مرتبہ جمعہ کے بعد بنیت آخر ظہر چار رکعت نہ پڑھنے کو بخوف اس بات کے فتوی دیا کہ عوام جمعہ کے فرض نہ ہونے کا کہیں اعتقاد نہ کرلیں اور یہی ہمارے زمانہ میں احتیاط ہے۔

اور حاشیہ بحر میں ہے: واما في البلاد فلاشك في الجواز ولاتعاد الفرضية۔

لیکن شہروں میں پس جواز جمعہ میں کوئی شک ہی نہیں اور ظہر کا اعادہ نہ کیا جائے گا۔

حکم دوم: جس آبادی کا بنا بر تعریف مذکور کے مصر ہونا تو یقینی ہے لیکن اس شہر میں جمعہ چند مساجد میں ہوتا ہے تو وہاں آخر الظہر کا پڑھنا ایسے خواص کے لئے ہے جن کو فرض جمعہ ادا ہونے میں شک نہ ہو اور اختلاف علما سے پرہیز کرنا بنظر تقوی ہو، اور شبہات سے بچنا بلحاظ اپنی حفاظت دین کے لئے ہو اور جن عوام کو آخر الظہر پڑھنے میں جمعہ کے ادا ہونے میں شک اور تردد ہونے لگے وہ اس آخر ظہر کو نہ پڑھیں۔ چنانچہ شامی نے بحر کے اس قول: انه لااحتياط في فعلها لانه العمل باقوى الدليلين

کے جواب میں فرمایا:

اقول وفيه نظر بل هو الاحتياط بمعنى الخروج عن العهدة بيقين لان جواز التعدد وان كان ارجح واقوى دليلا لكن مبنية على شبهة قوية لان خلافه مروى عن ابي حنيفة ايضا واختار الطحاوى والتمرتاشي وصاحب در المختار و جعله العتابي الاظهر وهو مذهب الشافعي والمشهور عن مالك واحدى الروايتين عن احمد كما ذكره المقدسي في رسالته نور الشمعة في ظهر الجمعة بل قال السبكي من الشافعية انه قول اكثر العلماء ولايحفظ عن صحابي ولا تابعي تجويز تعددها الخ وقد علمت قول البدائع انه ظاهر الرواية وفي شرح المنية عن جوامع الفقه انه اظهر الروايتين عن الامام قال في النهر وفي الحادي القدسي وعليه الفتوى وفي التكملة للرازي وبه ناخذ اه فهو حينئذ قول معتمد في المذهب لاقول ضعيف ولذا قال في شرح المنية الاولىٰ هو الاحتياط۔ لان الخلاف في جواز التعدد وعدمه قوى و كون الصحيح الجواز للضرورة للفتوى لايمنع شرعية الاحتياط للمتقى الخ۔ قلت على انه لو سلم ضعفه فلاالخروج عن خلافه اولىٰ فكيف مع خلاف هولاء الائمة وفي الحديث المتفق عليه فمن اتقى الشبهات استبرأ لدينه وعرضه۔

میں نے آخر ظہر نہ پڑھنے کو احتیاط اس لئے کہا کہ آخر ظہر کی اجازت جواز تعدد جمعہ کے ضعف پر مبنی تھی اور باوجود یکہ جواز تعدد جمعہ اقوی وارجح دلیل سے ثابت ہے، تو اب آخر ظہر نہ پڑھنے میں احتیاط ہوئی۔ تو اس کے جواب میں علامہ شامی فرماتے ہیں: مجھے اس میں اعتراض ہے بلکہ احتیاط اس میں ہے کہ آخر ظہر کو پڑھنے میں یقین کے ساتھ ذمہ سے نکل جاتا ہے کہ جواز تعدد جمعہ کا قول بھی امام صاحب سے مروی ہے اور اس کو طحاوی اور تمرتاشی اور صاحب درمختار نے مختار کہا اور عتابی نے اس کو ظاہر تر قول قرار دیا اور یہی مذہب امام شافعی کا اور امام مالک کا مشہور مذہب اور ایک قول امام احمد کا ہے۔ جیسا کہ اس کو مقدسی نے اپنے رسالہ ''نور الشمعۃ فی ظہر الجمعۃ'' میں ذکر کیا۔ بلکہ امام سبکی نے فرمایا کہ اکثر علمائے شافعیہ کا یہی قول ہے اور تعدد جمعہ کی تجویز نہ کسی صحابی سے اور نہ کسی تابعی سے روایۃً محفوظ ہے۔ اور میں نے بدائع کے قول سے جانا کہ یہی ظاہر الروایت کا قول ہے اور شرح منیہ میں جوامع الفقہ سے ناقل ہیں کہ دونوں روایتوں میں یہ (ط) کی ظاہر تر روایت ہے اور نہر میں کہا کہ حاوی قدسی نے اسی پر فتوی دیا اور تکملہ میں رازی نے کہا کہ ہم اسی کو اخذ کرتے ہیں۔ لہذا اب عدم جواز تعدد کا قول مذہب میں معتمد ہوا،

کہ ضعیف۔ اسی لئے تو شرح منیہ مین کہا کہ اولی یہی ہے کہ احتیاطا آخرظہر پڑھی جائے اس لئے کہ جواز تعدد اور عدم جواز دونوں قوی ہیں اور جواز تعدد جمعہ کی صحت پر بضرورت فتوی ہے تو یہ بنظر فتوی ظہر احتیاطی آخرظہر کی مشروعیت کو کیسے مانع ہوگی۔ کہ اگر عدم جواز تعدد کے قول کو ضعیف بھی تسلیم کرلیا جائے جب بھی اس خلاف سے نکلنا (یعنی اخرظہر پڑھنا) اولی ہے اور خاص کر ایسے ائمہ کا خلاف ہو۔ حدیث متفق علیہ میں ہے کہ جوشبہات سے بچا اس نے اپنے دین کو اور آبرو کو بچالیا۔

پھر یہی علامہ شامی قنیہ سے ناقل ہیں:

لما ابتلى اهل مرو باقامة الجمعتين فيها مع اختلاف العلماء في جوازها امرائمتهم بالاربع بعدها حتما احتياطا۔

یعنی جب مرو کے رہنے والے اس میں دو جمعہ قائم کرنے میں مبتلا ہوئے باوجودیکہ اس کے جواز میں علما کا اختلاف تھا تو ان پیشواؤں نے احتیاطا لازمی طور پر ان کو بعد جمعہ چار رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا۔

اور اسی میں ظہیریہ سے ناقل ہیں:

واكثر مشائخ بخاری عليه ليخرج عن العهدة۔

یعنی اکثر بخارا کے مشائخ اسی پر ہیں کہ اخرظہر پڑھنے میں یقین کے ساتھ ذمہ سے نکلنا پایا جاتا ہے۔

اور اسی میں فتح سے ناقل ہیں۔

فائدة الخروج عن الخلاف المتوهم او المحقق وان كان الصحيح صحة التعدد فهي نفع بلاضرر۔

یعنی آخرظہر پڑھنے سے یہ فائدہ ہے کہ متحقق یا وہمی خلاف سے نکلنا ہے اگرچہ تعدد جمعہ کی صحت کا قول صحیح ہے۔ تو آخرظہر پڑھنے میں نفع بلاضرر ہے۔

اور اس میں نہر سے ناقل ہیں۔

انه لا ينبغي التردد في ندبها على القول بجواز التعدد خروجا عن الخلاف۔

یعنی جواز تعدد کے اقوال پر آخرظہر کے مستحب ہونے میں شک کرنا ہی مناسب نہیں ہے کہ اس میں خلاف سے نکل جانا مانا جاتا ہے۔

اور شرح باقانی مین اسی کو مفتی بہ قول قرار دیا ہے۔ لہذا ان عبارتون سے نہایت واضح طور پر یہ ثابت ہوگیا کہ جس شہر میں متعدد جگہ جمعہ کی جماعت ہوتی ہو تو وہاں پر احتیاطا آخرظہر پڑھنا بہتر واولی ہے۔ ہاں اگر آخرظہر کے التزام میں عوام کے لئے کوئی ایسا مفسدہ ہو جیسا علامہ طحطاوی نے لکھا:

هو اعتقاد ان الجمعة ليست فرضا لما يشاهدون من صلاة الظهر فيتكا سلون عن اداء الجمعة او اعتقادهم افتراض الجمعة والظهر بعدها۔

یعنی جب وہ نماز ظہر کا مشاہدہ کرینگے تو اس کا اعتقاد کرینگے کہ جمعہ فرض ہی نہیں ہے اور پھر وہ جمعہ کے ادا کرنے میں سستی کرینگے یا ان کا یہ اعتقاد کہ جمعہ فرض ہے اور اس کے بعد ظہر فرض ہے ہو جائے گا تو ایسے عوام کو آخرظہر کا حکم نہ دیا جائے گا۔

چنانچہ یہی علامہ طحطاوی فرماتے ہیں:

نحن لانقول به ولا نفتي بفعلها اصلا بل ندل عليه الخواص الذين يحتاطون لامر دينهم ويتركون مايريبهم الى تحصيل يقينهم۔

یعنی ہم آخرظہر کا عام فتوی نہیں دیتے ہیں بلکہ ہم ایسے خواص کو اجازت دیتے ہیں جو اپنے امور دینی میں احتیاط کرتے ہیں اور حصول یقین کے لئے شک میں ڈالنے والی چیزوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔

اور علامہ شامی فرماتے ہیں:

ان ادى الى مفسدة لا تفعل جهارا والكلام عند عدمها ولذا قال المقدسي نحن لانامر بذلك امثال هذا العوام بل ندل فيه الخواص ولو بالنسبة اليهم۔

یعنی اگر آخرظہر کا پڑھنا کسی فساد تک پہونچے تو اس کو علی الاعلان نہ پڑھا جائے اور گفتگو تو اس صورت میں ہے جب کسی فساد کا اندیشہ نہ ہو۔ اسی وجہ سے مقدسی نے فرمایا کہ ہم ایسے عوام کو حکم نہیں دیتے بلکہ خواص کو بتائینگے اگرچہ وہ باعتبار ان کے خواص ہوں۔

درمختار میں ہے: واما من لا يخاف عليه مفسدة منها فالاولى ان تكون في بيته خفية۔

یعنی اور وہ شخص جس پر فساد کا اندیشہ نہیں ہے تو اس کے لئے اولی یہ ہے کہ وہ اپنے گھر میں چھپ کر پڑھے۔

اور یہی مضمون مراقی الفلاح میں ہے:

وبفعل الاربع مفسدة اعتقاد الجهلة عدم فرض الجمعة او تعدد المفروض في

وقتها ولا یفتی بالاربع الا للخواص ویکون فعلهم ایاها فی منازلهم۔

یعنی آخر ظہر پڑھنے میں عوام کو جمعہ کے فرض نہ ہونے یا ایک وقت میں چند فرض کا اعتقاد ہو جائے تو ان کا حکم صرف خواص کو دیا جائے گا اور وہ بھی اس کو اپنے گھروں میں پڑھیں۔

اور یہی علامہ مقدسی سے نقل ہیں:

نقول انما نهی عنها اذا ادیت بعد الجمعة بوصف الجماعة والاشتهار۔

یعنی ہم نے جو بعد جمعہ آخر ظہر ادا کرنے کی عوام کو ممانعت کی وہ جب ہے کہ اس کو علی الاعلان جماعت کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

بالجملہ اب حکم دوم بھی فقہاء کی بہت سی تصریحات سے ثابت ہو چکا۔ لہذا اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حکم سوم: وہ آبادی جس کے مصر ہونے میں بنا بر تعریف مذکور کے شک وتردد ہو تو وہاں آخر ظہر کا پڑھنا سب کے لئے واجب ہے۔

چنانچہ عالمگیری میں ہے:

ثم فی کل وقع الشك فی جواز الجمعة لوقوع الشك فی المصر او غیره اقام اهله الجمعة ینبغی ان یصلوا بعدالجمعة اربع رکعات وینوؤا بها الظهر حتی لولم تقع الجمعة موقعها یخرج عن عهدة فرض الوقت بیقین۔

یعنی ہر وہ جگہ جس میں جمعہ ادا ہونے میں اس وجہ سے شک واقع ہوا کہ اس کے خود مصر اور غیر مصر ہونے میں شک ہے اور وہاں کے رہنے والوں نے جمعہ قائم کر لیا تو انہیں چاہئے کہ وہ بعد جمعہ چار رکعتیں بنیت ظہر پڑھیں یہاں تک کہ اگر جمعہ سے اپنے وقت کا فریضہ ادا نہیں ہوا تو وہ اس کے پڑھنے سے یقین کے ساتھ فرض وقت کے ذمہ سے نکل جائے گا۔

اور یہی کافی اور محیط اور شامی اور غنیۃ اور فتاوی حجہ میں اور بحر میں ہے:

واذا اشتبه علی الانسان ذلك (المصر) فینبغی ان یصلی اربعا بعد الجمعة وینوی بها آخر فرض ادرکت وقته ولم أده بعد فان لم تصح الجمعة وقعت ظهره وان صحت کانت نقلا۔

یعنی جب کسی شخص پر کسی جگہ کا مصر ہونا مشتبہ ہوا سے چاہئے کہ جمعہ کے بعد چار رکعت بنیت آخر

فرض ظہر کے ادا یوں کہے کہ میں نے اس کا وقت پایا اور اب تک ادا نہیں کیا تھا۔ لہذا اگر اس کا جمعہ صحیح نہیں ہوا تو اس کی ظہر ادا ہو جائے گی اور اگر جمعہ صحیح ہو گیا تو یہ نفل ہو جائے گی۔

اور غنیۃ میں فتاوی حجہ سے ناقل ہیں کہ:

والاحتیاط فی القری (الکبیرة) ان یصلی السنة اربعا ثم الجمعة ثم ینوی سنة الجمعة اربعا ثم یصلی الظهر ثم رکعتین سنة الوقت هذا هو الصحیح المختار فان صحت الجمعة فقد ادی سنتها علی وجهها والا فقد صلی الظهر مع سنة۔

یعنی اور بڑے گاؤں (یعنی جس کے مصر ہونے میں شک ہو) میں یہ ہے کہ پہلے چار رکعت سنت پڑھے پھر جمعہ پھر چار رکعت سنت جمعہ کی نیت کرے پھر ظہر پڑھے اور دو رکعتیں سنت وقت کی پڑھے، یہی صحیح مختار ہے۔ تو اگر جمعہ صحیح ہو گا تو اس نے سنت کو اس کے طریقہ پر ادا کیا ورنہ اس نے ظہر تو مع اس کی سنت کے پڑھا۔ اب باقی رہی یہ بات کہ آیا اس صورت میں آخر ظہر کا پڑھنا واجب ہے یا مستحب تو۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

قال المقدسی ذکر الشحنة عن جده التصریح اما عند قیام الشك والاشتباه فی صحة الجمعة فالظاهر الوجوب ونقل عن شیخه ابن الهمام مایفیده۔

یعنی مقدسی نے کہا کہ ابن شحنہ نے اپنے دادا سے اس تصریح کو ذکر کیا کہ جب صحت جمعہ میں کوئی اشتباہ یا شک قائم ہو پس ظاہر وجوب ہوا۔ اور جو ان کے شیخ ابن ہمام سے منقول ہے وہ اسی کا افادہ کرتا ہے۔ اور تمرتاشی اور قنیہ کی تفصیل بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔

بالجملہ ایسی آبادی جس کے شہر ہونے میں شک اور تردد ہو جیسے بڑے بڑے گاؤں ان میں بعد جمعہ عوام وخواص ہر ایک کو آخر الظہر کیا خود ظہر پڑھنا ضروری ہے اور لازمی ہے۔

حکم چہارم: جو آبادی ایسی ہے کہ اس پر تعریف مصر کا کسی طرح صدق نہیں ہوتا جیسے گاؤں دیہات جس میں مصر ہونے کا شک تو کیا وہم بھی نہیں ہے۔ لہذا ایسے دیہات میں یقیناً جمعہ ادا نہیں ہوتا جیسا کہ ابتدا میں بحر الرائق اور غنیہ کی عبارتوں سے ظاہر ہو چکا کہ فرض وقت یعنی ظہر ان کے ذمہ باقی رہتا ہے۔ لہذا ان کو ظہر کا پڑھنا فرض ہے۔

چنانچہ علامہ شامی جواہر سے ناقل ہیں: لو صلوا فی القری لزم اداء الظهر۔

یعنی اگر دیہات والے دیہات میں جمعہ کی نماز پڑھیں تو ان کو ظہر ادا کرنا ضروری ہے۔

بلکہ عالمگیری اور فتاوی قاضی خان میں تو یہ عبارت ہے۔

ومن لا یجب علیهم الجمعة من اهل القری اوالبوادی لهم ان یصلوا الظهر بجماعة یوم الجمعة باذان واقامة۔

یعنی جولوگ ایسے ہیں جن پر جمعہ واجب نہیں جیسے گاؤں اور جنگل کے رہنے والے ان کو چاہئے کہ جمعہ کے دن ظہر کی نماز اذان واقامت کے ساتھ پڑھیں۔

ہاں جن دیہات میں نماز جمعہ عوام پڑھتے ہوں تو وہاں جمعہ تو ادا نہیں ہوتا لیکن بلحاظ دیگر مصالح دینی کے ان کو منع نہ کیا جائے اتباعا الحدیث ابن ابی طالب رضی اللہ تعالی عنہ۔

وکفی بقوله قدوة واماما۔

کہ آخر نام الٰہی لیتے ہیں اور اس کے بعد ظہر کا ضرور حکم دیا جائے گا کہ ان کے لئے فرض وقت ظہر ہے اور اس جمعہ سے ظہر کی فرضیت ذمہ سے ساقط نہیں ہوئی۔ لہذا ظہر کا پڑھنا سب پر فرض ہے۔

الحاصل آخر ظہر کا جس نے مطلقا ہر جگہ ایک حکم دیا ہے اس کی نہایت نادانی اور اس کو اقوال فقہاء پر اطلاع نہیں ہے۔ ہماری اس تفصیل سے مسئلہ کہ ہر پہلو پر متعدد طریقہ پر روشنی پڑ گئی اور ہر جگہ کے لئے علیحدہ حکم معلوم ہو گیا۔ اگر مزید تفصیل درکار ہو تو آئندہ کسی فرصت کے وقت روانہ کیجا سکتی ہے۔ بحمد اللہ تعالی منصف کے لئے یہی کافی ووافی اور معاند کے لئے دفاتر بھی ناکافی۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

(۲) عیدگاہ میں نماز جمعہ جائز ہے۔ اس لئے کہ جب نماز عید اس میں صحیح ہے تو نماز جمعہ بھی اس میں ادا ہو جائے گی۔

چنانچہ علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالی علیہ فرماتے ہیں:

کما ان المصر وفناء ه شرط جواز الجمعة فهو شرط جواز صلوة العید۔

یعنی جیسے کہ مصر یا فناء مصر جواز جمعہ کی شرط ہے ایسے ہی جواز نماز عید کی شرط ہے۔

اور مراقی الفلاح میں ہے:

(ویشترط لصحتها) ای صلوة الجمعة (ستة اشیاء) الاول المصر اوفناء ه سواء مصلی العیدا وغیره لانه بمنزلة المصر فی حوائج اهله۔

یعنی نماز جمعہ کی صحت کی چھ (۶) شرطیں ہیں۔ پہلی چیز مصر ہونا یا فناء مصر ہونا۔ اب چاہے وہ عیدگاہ ہو یا علاوہ اس کے اور جگہ کہ یہ اہل شہر کے حوائج کے اعتبار سے بمنزلہ مصر کے ہے۔ اور عینی شرح

کنز الدقائق۔ او مصلاہ۔ کے تحت میں لکھتے ہیں۔

عطف علی المصر او مصلی المصر مثل مصلی العید۔

یعنی اداء جمعہ کی ایک شرط مصر ہے یا اس کی عیدگاہ۔

اور غنیہ میں ہے: والمسجد الجامع لیس بشرط ولهذا اجمعوا علی جوازها بالمصلی۔

یعنی نماز جمعہ کے لئے جامع مسجد ہونا ہی شرط نہیں ہے۔ اسی لئے تو فقہاء نے جمعہ کی نماز عیدگاہ میں جائز ہونے پر اجماع کیا ہے۔

بالجملہ اس مسئلہ میں فقہا کی تصریحات تو بہت زیادہ کتب میں موجود ہیں لیکن منصف کے لئے یہی بہت کافی ووافی ہے۔ اب باقی رہا چند مساجد کا اس کے قرب میں ہونا یہ عیدگاہ میں جواز جمعہ کے لئے مانع نہیں جیسا کہ ابھی غنیہ کی عبارت سے ثابت ہو چکا بلکہ میرے خیال میں اگر کوئی مانع شرعی نہ ہو تو ان چار مسجدوں میں علیحدہ علیحدہ محلہ میں جمعہ ہونے سے بھی زیادہ بہتر ہے کہ ان چار مسجدوں کے نمازی ایک جگہ جمع ہو کر جمعہ ادا کریں کہ اس میں تعدد جمعہ کی بحث سے ایک گونہ احتیاط لازم ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبه: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۲۳)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک شخص نے نماز جمعہ پڑھائی اور ہر دو رکعت میں رکوع سے اٹھ کر زیادہ قیام کیا اور اسی طرح سجدتین کے درمیان کچھ مقدار سے زیادہ بیٹھے نماز کے بعد امام صاحب سے معلوم کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے رکوع سے کھڑے ہو کر اور سجدتین کے درمیان وہ دعائیں پڑھیں تھیں جو حدیث شریف میں حضور رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم سے ان حالتوں میں پڑھنی منقول ہیں دریافت طلب یہ امر ہے کہ آیا یہ صورت نماز درست ہے یا نہیں اور کیا امام موصوف پر سجدہ سہو واجب تھا۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

امام نماز جمعہ کے قومہ (یعنی رکوع کے بعد قیام) اور جلسہ (یعنی دونوں سجدوں کے درمیان کا قعدہ) میں احادیث میں کسی چیز کا پڑھنا منقول نہیں ہے۔

تنویرالابصار میں ہے:

ویجلس بین السجدتین مطمئناً ولیس بینھماذکر مسنون وکذابعد رفعه من الرکوع علی المذھب ۔

اور دونوں سجدوں کے درمیان اطمینان سے بیٹھے اور اس میں کوئی ذکر ودعا سنت نہیں اور اسی طرح رکوع کے بعد قومہ میں کوئی دعا نہیں یہی مذہب صحیح ہے۔

طحطاوی، سراج اور مجمع الانہر سے ناقل ہیں:

ومقدار الجلوس عندنابین السجدتین مقدار التسبیحة ولیس فیه ذکر مسنون کمافی السراج کذا لیس بعد الرفع من الرکوع دعاء وماورد فیھما محمول علی التھجد کما فی المجمع الانھر ۔

اور ہمارے نزدیک دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنے کی مقدار ایک تسبیح سبحان اللہ کہنے کی مقدار ہے اور اس میں کوئی ذکر مسنون نہیں جیسا کہ سراج میں ہے اسی طرح رکوع کے بعد قومہ میں کوئی دعا نہیں اور جو دعائیں ان دونوں میں وارد ہوئی ہیں وہ تہجد پر محمول کی گئی ہیں۔ جیسا کہ مجمع الانہر میں ہے۔

اسی طرح درمختار میں ہے تنویرالابصار کے اسی قول کو تحریر فرماتے ہیں:

وماورد محمول علی النفل۔

یعنی جو دعائیں قومہ وجلسہ میں وارد ہوئی ہیں وہ نماز نافلہ کے لئے خاص کردی گئی ہیں

اور اسی طرح درر اور حلیہ اور خزائن وغیرہا کتب میں ہے۔ لہذا ان عبارتوں سے واضح طور پر معلوم ہوگیا کہ فرائض کے قومہ اور جلسہ میں کسی دعا کا پڑھنا منقول نہیں خصوصاً اگر مقتدی کو اتنا انتظار ناگوار ہو تو امام کو ہرگز نہیں پڑھنا چاہئے اور اگر امام سے فرائض میں ایسا واقعہ ہوجائے تو اختلاف سے بچنے کے لئے احتیاطاً سجدہ کرنا لینا چاہئے۔

شامی نے ایک یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

لو اطال ھذہ الجلسة وقومة الرکوع اکثر من تسبیحة بقدر تسبیحة ساھیا یلزمه السجود سھوا ۔

یعنی اگر جلسہ اور قومہ کو ایک تسبیح کی مقدار سے زائد ایک تسبیح برابر بھول کر طول دیا تو اسکو سجدہ سہو لازم ہے۔

بالجملہ قومہ اور جلسہ میں جو احادیث کی دعائیں منقول ہیں وہ فقہاء کے نزدیک نوافل کے ساتھ خاص ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۲۴۔۴۲۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ان مسائل میں کہ

(۱) جن گاؤں میں مدت سے جمعہ ہوتا آیا اسے بند کردینا چاہئے یا اسے جاری رکھا جائے؟۔

(۲) ایک مسجد میں ایک وقت میں دو جماعتیں ہوتی ہیں۔ ایک جماعت اہلسنت والجماعت کی ہوتی ہے اور ایک وہابی فرقہ کی۔ ان میں کونسی جماعت شرعاً جماعت ہوتی ہے؟۔ اور ایک ساتھ ایک مسجد میں دو جماعتیں ہوسکتی ہیں یا نہیں؟۔ بینوا توجروا

المستفتی محمد اسحاق ساکن موضع گھنسور پور پرگنہ سنبھل

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

(۱) جن مواضعات میں عرصہ سے جمعہ کی جماعت ہوتی ہے اسے بہت سے مصالح دینی کی بنا پر بند نہ کیا جائے البتہ اس کے بعد فرض ظہر چار رکعتیں پڑھنی فرض ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) وہابیہ کی نماز اور جماعت بسبب ان کی گمراہی وضلالت کے شرعاً نہ نماز ہے نہ جماعت نہ ان کی جماعت میں شریک ہونے کا فریضہ اس کے ذمہ سے ساقط ہو۔ اہلسنت کی جماعت واقعی جماعت ہے اس کے مقابلہ میں وہابیہ کی جماعت کو جماعت کہنا ہی غلطی ہے۔ ایک وقت میں صحیح العقیدہ لوگوں کی دو جماعتیں واقعی ممنوع ہیں لیکن اہلسنت کی جماعت وہابیہ کی جماعت کے وقت قائم کرنے میں شرعاً تو کوئی حرج نہیں البتہ بخوف فتنہ وفساد کے ایک وقت میں دو جماعتیں ہرگز نہیں ہونی چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ

(۴۲۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ان مسائل میں کہ جمعہ کے روز جمعہ کے پہلے صلوۃ پڑھنا کیسا ہے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

سائل نے جس میں صلوۃ کو دریافت کیا ہے غالبا یہ وہ صلوۃ ہے جو جمعہ کے دن پہلی اذان کے بعد دروازہ یا خارج مسجد میں بآواز بلند پکاری جاتی ہے جیسا کہ بمبئی، کلکتہ، بریلی وغیرہ مقامات میں رائج ہے۔ لہذا یہ صلوۃ جمعہ کے روز دونوں اذانوں کے مابین اور سوائے مغرب کے چاروں اوقات میں اذان وتکبیر کے درمیان میں بلاشک جائز ہے۔

متاخرین فقہائے کرام نے اس کے نہ فقط جواز بلکہ استحسان کا حکم دیا اور اس کا نام تثویب رکھا۔ چنانچہ نور الایضاح میں اور اس کی شرح مراقی الفلاح میں ہے:

(ویثوب) بعد الاذان فی جمیع الاوقات لظهور التوانی فی الامور الدینیة فی الاصح وتثویب کل بلد بحسب ماتعارفه اهلها ۔ (طحطاوی مصری ص۱۱۴)

اور صحیح مذہب میں تمام وقتوں میں اذان کے بعد تثویب کہے کہ دینی باتوں میں سستی ظاہر ہے اور ہر شہر کی تثویب وہ ہے جو اس کے رہنے والے اسے سمجھیں (یعنی یہ جان لیں) کہ اذان کے بعد اس دوسرے اعلان سے نماز کے لئے بلایا جا رہا ہے۔

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

(قوله ویثوب الخ) هو لغة مطلق العود الی الاعلام بعد الاعلام وشرعا هو العود الی الاعلام المخصوص (قوله بعد الاذان) علی الاصح لابعد الاقامة کما هو اختیار علماء الکوفة (قوله فی جمیع الاوقات) استحسنه المتاخرون وقدروی احمد فی السنن والبزار وغیرهما باسناد حسن موقوفا علی ابن مسعود مارآه المسلمون حسنا فهو عندالله حسن ۔

(طحطاوی مصری ص۱۱۴)

تثویب لغت میں پہلے اعلان کے بعد دوسرے اعلان کی طرف مطلق لوٹنے کو کہتے ہیں

شریعت میں وہ دوسرے مخصوص اعلان کی طرف لوٹنا مراد ہوتا ہے کہ صحیح مذہب میں تثویب اذان کے بعد ہے نہ کہ تکبیر کے بعد جیسا کہ وہ علمائے کوفہ کا مختار یہ قول ہے۔ تثویب کا اذان کے بعد تمام اوقات نماز میں کہنا اسے متاخرین فقہاء نے مستحسن جانا اور استحسان کا ثبوت اس حدیث سے ہے جس کو امام احمد نے سنن میں اور دیگر محدثین نے بسند حسن حضرت عبداللہ بن مسعود سے موقوفا روایت کیا کہ جسے مسلمان حسن جانیں وہ فعل اللہ کے نزدیک اچھا ہے۔

کنز الدقائق اور شرح عینی میں ہے:

(ویثوب) من التثویب وهو العود الی الاعلام بعد الاعلام وانما اطلقه تنبیها علی ما استحسنه المتاخرون من التثویب فی کل الصلوات بظهور التوانی فی الامور الدینیة ۔

(عینی مصری ج۱ص۴۷)

تثویب وہ پہلے اعلان کے بعد دوسرے اعلان کی طرف لوٹنے کا نام ہے۔ صاحب کنز نے اس کو مطلق بیان کرنے میں اس بات پر تنبیہ کی کہ متاخرین نے اس تثویب کو تمام نمازوں میں مستحسن جانا اس لئے کہ دینی امور میں سستی ظاہر ہوچکی ہے۔

جوہرہ نیرہ شرح مختصر قدوری میں ہے:

المتاخرون استحسنوه فی الصلوات کلها لظهور التوانی فی الامور الدینیة وصفته فی کل بلد علی مایتعارفونه ۔ (جوہرہ نیرہ ج۱ص۴۵)

متاخرین نے سب نمازوں میں تثویب کو مستحب جانا کہ امور دینیہ میں سستی ظاہر ہے اور تثویب کے الفاظ ہر جگہ کے لئے وہ ہیں جنہیں وہاں کے رہنے والے سمجھیں۔ (یعنی تثویب کے لئے کوئی خاص الفاظ مقرر نہیں ہیں۔

تنویر الابصار و در مختار میں ہے: (ویثوب) بین الاذان والاقامة فی الکل للکل بماتعارفوه ۔ (ردمختار ج۱ص۲۷۲)

اذان اور تکبیر کے درمیان تمام اوقات نماز میں ہر اس لفظ سے تثویب کہیں جسے لوگ جانتے ہوں۔

علامہ شامی عنایہ سے ناقل ہیں:

احدث المتاخرون التثویب بین الاذان والاقامة علی حسب ماتعارفوه فی جمیع

الصلوات سوی المغرب۔ (شامی ج۱ص۲۷۲)

متاخرین نے سوائے مغرب کے تمام نمازوں میں اذان وتکبیر کے مابین تثویب کہنا ہر اس لفظ کے ساتھ جسے لوگ سمجھتے ہوں یہ نیا طریقہ ایجاد کیا۔

خود وہابیوں کے پیشوا مولوی خرم علی غایۃ الاوطار ترجمہ اردو درمختار میں لکھتے ہیں ''تثویب یعنی اعلام بعد الاذان کا طریقہ یہ ہے کہ بعد اذان بقدر بیس آیت پڑھنے کے ٹھہر جائے، پھر بلاوے اس طرح کہ الصلوۃ ۔ یا یہ کہے چلو نماز تیار ہے۔ یا جس طرح رواج ہو۔ پھر اس کے بعد بقدر بیس آیت کے توقف کرے۔ پھر اقامۃ کہے کذا فی البحر۔ مگر مغرب میں تثویب نہیں۔ (غایۃ الاوطار ج۱ص۱۸۱)

بخیال اختصار چند عبارات پیش کی گئیں ہیں ورنہ اس کا جواز قنیہ، ملتقط، بحر الرائق، ہدایہ فتاوی قاضیخان ۔ نہر۔ مجتبے ۔ درر ۔ غرر۔ نہایہ۔ حسن المحاضرہ۔ خزائن۔ القول البدیع وغیرہ کتب میں ہے۔

بالجملہ ان عبارات سے روشن ہو گیا کہ تثویب نہ فقط جائز بلکہ مستحسن ہے اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ فقہائے کرام نے تثویب کے کوئی الفاظ خاص مقرر نہیں فرمائے بلکہ اس کے الفاظ کو عرف اور رواج پر موقوف رکھا ہے۔ لہذا ہمارے عرف میں الصلوۃ والسلام علیک یارسول اللہ کے جیسے الفاظ صلوۃ وسلام میں رائج ہیں اب کسی منکر کو ان تصریحات کتب فقہ کے موجود ہوتے ہوئے جمعہ کے دن یا کسی اور دن صلوۃ پڑھنے پر لب کشائی اور دم مارنے کی کیا مجال ہے۔ لیکن وہابی کی دہن دوزی کے لئے خود انہیں کے پیشوا مولوی خرم علی کا قول نقل کیا جاتا ہے جو انہوں نے درمختار کی عبارت کے ترجمہ میں لکھا ہے۔

''رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم پر سلام کہنا نیا پیدا ہوا ربیع الآخر ۷۸۱ سال ہجری میں عشاء کی نماز میں دوشنبہ کی رات پھر جمعہ کے دن پھر دس برس کے بعد پیدا ہوا سب نمازوں میں سوائے مغرب کے۔ پھر مغرب میں بھی دوبار سلام کہنا رائج ہو گیا۔ اور یہ امر بدعت حسنہ ہے۔ یہ فائدہ شارح نے جلال الدین سیوطی شافعی رحمۃ اللہ تعالی علیہما کے حسن المحاضرہ سے نقل کیا اور سخاوی کے قول بدیع میں ہے کہ اس کی ابتداء حدوث سلطان صلاح الدین بن مظفر بن ایوب کے حکم سے ہوئی ۷۹۱ھ میں۔ طحطاوی نے کہا کہ مغرب کا سلام ہمارے وقت میں رائج نہیں اور نہ سیوطی کی اس عبارت میں ہے جو نہر الفائق میں منقول ہے انتہی۔ بدعت حسنہ وہ ہے جو قواعد شریعت کے مخالف نہ ہوں''۔ (غایۃ الاوطار ج۱ص۱۸۱)

حاصل کلام یہ ہے کہ صلوۃ کہنا فقط جمعہ کی نماز اور خطبہ سے قبل بلکہ سوائے مغرب کے چاروں

اوقات نماز میں مستحسن ہے۔ سلف صالحین ۔ فقہائے متاخرین کا محبوب طریقہ ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۲۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسائل مندرجہ ذیل میں۔

لاؤڈ اسپیکر کا نماز عید میں لگانا جائز یا نہیں؟۔

ضروری نوٹ

(۱) مجالس اسلامیہ محافل وپند میں علمائے کرام کا لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ تقاریر کرنا۔ اور تقریر میں قرآن کریم واحادیث نبویہ کی تلاوت کرنا۔ مسائل دین کی تعلیم دینا اس امر کی دلیل صریح ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کوئی آلہ لہو ولعب نہیں بلکہ ایک شئی مباح ہے۔

(۲) ماہرین فن برقیات سے تحقیق کی گئی کہ آلہ خالق الصوت نہیں بلکہ دافع الصوت ہے امام کی پست آواز کو بلند کرتا ہے جس طرح بولنے والا خود ہلکی اور باریک آواز سے گفتگو کرتے ہوئے گلے کی زیادہ طاقت صرف کرتے ہوئے بلند آواز سے بولے۔ اس کی نظیر غالبا ضعیف البصر کے لئے چشمہ۔ بہرے کے لئے آلہ مسماع الصوت ہو سکتے ہیں۔

(۳) لاؤڈ اسپیکر کی آواز امام ہی کی آواز ہے۔ امام کی آواز کے مدات، ادغام، غنہ سرعت، بطوء، مخارج حروف وصفات کسی میں کوئی فرق نہیں آتا، صرف پستی وبلندی میں امتیاز ہوتا ہے اور یہ بلندی وپستی خود امام کی آواز میں موجود ہے۔

(۴) جماعت کثیرہ میں صفوف تک امام کی آواز نہ پہونچنے کی شکل میں مکبرین کا انتظام کیا جاتا ہے لیکن امام اگر خود جہیر الصوت ہے اور آواز آخر صف تک پہونچتی ہے تو مکبرین کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، تو پھر لاؤڈ اسپیکر سے جب امام کی آواز بلند ہو جاتی ہے تو مکبرین کی ضرورت پیش ہی نہ آ...

گی تو اس صورت میں سنت کے خلاف بھی نہ ہوگا۔ سنت کے خلاف اس وقت ہوسکتا ہے کہ مکبرین قائم نہ کئے جائیں اور امام کی آواز کے علاوہ کسی اور چیز سے آواز پہونچائی جائے اور وہ آواز امام کی آواز سے بالکل تابع نہ ہو۔

(۵) آلہ کے استعمال کے واسطے نماز میں امام کو ہاتھ پاؤں میں حرکت دینا نہیں۔ وضع قطع میں تغیر وتبدل نہیں۔ جس طرح بجلی کے پنکھوں سے ہوا لینے میں نمازی کو کوئی دخل نہیں اگر چہ اپنے ہاتھ سے پنکھا ہلانا جائز نہیں۔

(۶) جب نماز میں مریض لاٹھی کی ٹیک سے کھڑا ہوسکتا ہے اس کے بھروسہ پر رفع وخفض ہوسکتا ہے اور یہ محض اس کے ضعف معذوری سے۔ تو آلہ کے ذریعہ آواز پہونچانا کیونکر منع ہوسکتا ہے حالانکہ نمازی کے ہاتھ میں لاٹھی رہتی ہے اور یہ آلہ نمازی سے دور۔

امید کہ امور مذکورہ پر غور فرماتے ہوئے لاؤڈ اسپیکر کے متعلق تسلی بخش جواب مرحمت فرمائیں۔

اگر جواب جواز ہے تو اختصار کافی۔ دلائل کی ضرورت نہیں۔ اور اگر عدم جواز ہے تو مدلل ومتحقق درکار ہے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جواب سے قبل تین مقدمات پیش کئے جاتے ہیں تا کہ مسئلہ کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

مقدمہ اولیٰ:- نماز میں خشوع کا حاصل ہونا ضروری چیز ہے۔ خشوع قلب کے حضور اور ارکان صلوۃ کی محافظت اور جوارح کے سکون کا نام ہے۔

طحطاوی میں ہے: الخشوع حضور القلب وتسکین الجوارح والمحافظة علی الارکان۔ (طحطاوی ص ۲۰۱)

مراقی الفلاح میں ہے:

واختلفوا فی الخشوع هل هو من اعمال القلب كالخوف او من اعمال الجوارح كالسكون او هو عبارة عن المجموع قال الرازی الثالث اولیٰ وعن علی رضی الله تعالیٰ عنه الخشوع فی القلب۔ (طحطاوی ص ۲۱۰)

شامی میں ہے:

قد حکی اجماع العارفین علیه وان من لوازمه ظهور الذل وغض الطرف وخفض الصوت وسکون الاطراف۔ (شامی ج ۱ ص ۴۵)

ان عبارات سے خشوع کی حقیقت اور اس کے لوازم معلوم ہوگئے۔ لہذا خشوع کا لحاظ نماز میں کس قدر ضروری ثابت ہوا اس لئے خشوع کو بعض نے نماز کی روح فرمایا:

چنانچہ مراقی الفلاح میں ہے: الخشوع الذی هو روح الصلوة۔ (طحطاوی ص ۲۰۱)

اور بعض نے نماز کا مبنی قرار دیا۔

چنانچہ شامی میں ہے: مبنی الصلوة علی الخشوع۔ (شامی ج ۱ ص ۴۵۰)

الحاصل جب خشوع میں حضور قلب وتسکین جوارح ومحافظت ارکان داخل اور عجز وحیا اور پستی آواز اس کو لازم تو اسے کیونکر نماز کا مبنی اور روح نہ قرار دیا جائے اور اسے نماز میں کیونکر ملحوظ نہ رکھا جائے۔

مقدمہ ثانیہ:- جو چیز اس خشوع کو زائل کرے۔ اور قلب کو دوسری طرف مشغول کرے وہ چیز نماز میں مکروہ اور نمازی کو ہر ایسی چیز سے اجتناب وپرہیز لازم وضروری ہے

چنانچہ بخاری شریف میں حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک چادر میں نماز پڑھی جو منقش تھی اس کو واپس فرمایا اور آپ نے اندیشہ شغل قلب کا اس طرح اظہار فرمایا:

قال النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم کنت انظر الی علامها وانا فی الصلوة فاخاف ان یفتننی۔ (بخاری شریف مصطفائی ج ۱ ص ۵۴)

عینی میں اس حدیث کے تحت میں فرماتے: فیه طلب الخشوع فی الصلوة والاقبال علیها ونفی کل مایشغل ویلهی عنه۔ (عینی ج ۲ ص ۲۵۹)

مراقی الفلاح میں مکروہات صلوۃ کے بیان میں ہے: وتکره بحضرة کل مایشغل البال کزینة وحضرة مایخل بالخشوع۔ (طحطاوی ص ۲۱۰)

طحطاوی میں ہے: علة الکراهة المعقولة مایحصل من تشویش البال وشغل الخاطر۔ (طحطاوی ص ۲۰۹)

کبیری میں ہے:

فان کان اجنبیا من الصلوۃ لیس فیه تتمیم لها و لا فیه دفع ضرر فھو مکروہ له
کاللعب بالثوب او البدن و کل مایحصل بسببه شغل یخل بالخشوع ۔
(ردالمحتار ج ۱ ص ۴۵۹)

ان عبارات سے واضح ہوگیا کہ ہر وہ چیز جن سے شغل قلب ہو۔ اور طبیعت میں تشویش ہو۔ اور خشوع زائل ہو وہ نماز میں مکروہ ہے اور نمازی کو اس سے اجتناب واحتراز ضروری ہے۔

مقدمہ ثالثہ:۔ اس میں چندان چیزوں کا ذکر ہے جو محض شغل قلب اور منافی خشوع ہونے کی بنا پر مکروہ قرار دی گئیں۔ مراقی الفلاح میں مکروہات کے بیان میں فرمایا:

کعبثه بثوبه و بدنه لانه ینافی الخشوع ۔ (طحطاوی ص ۲۰۱)

یعنی نمازی کا اپنے کپڑے یا بدن کے ساتھ شغل کرنا اس لئے مکروہ ہے کہ یہ خشوع کے منافی ہے
ردالمحتار میں ہے: یکرہ للمصلی جعل نحو نعله خلفه لشغل قلبه ۔
(ردالمحتار ج ۱ ص ۴۵۹)

نمازی کو اپنے جوتے کا پیچھے رکھنا اس لئے مکروہ ہے کہ اس میں اس کا قلب مشغول رہے گا۔
عالمگیری میں ہے: کرہ بعض مشائخنا النقش علی المحراب و حائط القبلة لانه یشغل قلب المصلی۔ (شامی ج ۱ ص ۴۶۲)

کتب فقہ میں اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں مگر بخوف طوالت یہاں انہیں کو کافی سمجھا گیا۔
بالجملہ لاؤڈ اسپیکر میں یہ امور روز روشن کی طرح ظاہر ہیں کہ یہ منافی خشوع ہے اسکے ساتھ شغل قلب ہوگا۔ اس کی رعایت خضوع علی وجہ الکمال کو مانع ہوگی۔ اس کی پابندی امام کے لئے انتشار طبیعت کا باعث ہوگی۔ بلکہ یہ مشاہدہ ہے کہ واعظین کو بھی اس کی پابندی باعث تشویش خاطر ہوتی ہے۔ تو نماز میں اس کی کس طرح اجازت ہوسکتی ہے۔ اور مقدمہ ثانیہ میں جو حدیث منقول ہوئی کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب ایک منقش کپڑے کو باندیشہ شغل قلب دفع فرمائیں تو کوئی ایسا جری شخص ہے کہ لاؤڈ اسپیکر جیسی چیز سے شغل قلب کا اندیشہ نہ رکھے اور اسکو بجائے دفع کرنے کے اس کے اجراء کی سعی کرے اور فقہائے کرام جب بدن اور کپڑے کے شغل قلب کو منافی خشوع قرار دیکر مکروہ ٹھہرائیں

اور نقوش محراب کو بخیال شغل قلب مکروہ قرار دیں اور جوتے کے پیچھے رکھنے میں شغل قلب کا لحاظ فرما کر کراہت کا فتوی دیں تو کون ایسا دلیر ہے کہ لاؤڈ اسپیکر جیسی نئی شی میں شغل قلب کا احتمال بھی نہ جانے اور فقہاء کی علت کراہت کا مقابلہ کرے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کا نماز عیدین یا جمعہ وغیرہ میں استعمال کرنا ضرور باعث شغل قلب ہے اور اس کی پابندی ضرور خشوع کے منافی ہے۔ لہذا علت کراہت بوجہ احسن موجود ہے تو اس کا نماز میں استعمال ضرور مکروہ ہے۔

اب مستفتی صاحب کے چند نوٹ کے متعلق بھی مختصر عرض کیا جاتا ہے۔

(۱) مجالس وعظ اور نماز ایک چیز نہیں کہ جو چیزیں مجالس وعظ میں روا ہیں وہ نماز میں بھی جائز ہو جائیں۔ نماز میں صرف لہو ولعب ہی ممنوع نہیں۔ کھانا پینا۔ کسی سے بات کرنا۔ داہنے بائیں دیکھنا۔ آگے پیچھے بڑھنا۔ ہاتھوں سے بار بار حرکتیں کرنا۔ یہ سب مباحات ہیں نماز میں کب جائز ہیں۔ یہ دعوی نہیں ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کی وضع مثل آلات غنا کے لہو ولعب کے لئے ہوئی اور واضع کا اس سے یہ مقصود ہے بلکہ اس کی غرابت وندرت اور اس کی قوت صوت اور اس میں واقع ہونے والے تغیرات اپنی طرف ایسا مشغول کر لیتے ہیں کہ بعض اوقات مقرروں کو اپنے سامنے سے لاؤڈ اسپیکر ہٹانا پڑ جاتا ہے اور مخل مقصد تک پہنچا دیتا ہے۔

(۲) یہ گفتگو ہی بیکار ہے اور تعجب ہے کہ مستفتی صاحب نے یوں لکھی۔ خلق الصوت کی کیا بحث یہ کسے وہم ہوسکتا ہے کہ کوئی ہو یا نہ ہو خود آواز پیدا کر لیتا ہے۔ احتمال ہے تو یہ ہے کہ متکلم کے جس قرع وتحریک سے ہوا کے اجزاء متکیف ہوتے چلے آرہے تھے انہیں کو آلہ نے دوسری طرف پہونچایا یا اس ہواء متکیف سے پھر قرع جدید پیدا ہوا۔ اور یہ بھی مسئلہ زیر بحث میں یکساں ہے کہ شغل تو دونوں صورتوں میں ہے۔

(۳) یہ بحث بیکار ہے بلکہ اور غلط۔ کہ حروف کے مخارج وصفات اور نغمات کا متوافق ہونا دلیل وحدت صلوۃ نہیں۔ فوٹو کی تصویر ذی صورت سے اس کے نقشہ وہیئت ومناسبت اعضا سے کس قدر مطابق ہوتی ہے مگر کون کہہ سکتا ہے کہ صورت اور ذی صورت میں مباینت نہیں۔

(۴) کثرت جماعت کی صورت میں امام ہی کی آواز پہونچانے کا شریعت نے حکم نہیں دیا اور امام پر جدوجہد لازم نہیں کی کہ اپنی طاقت سے جہاں تک آواز پہونچا سکتا ہے وہاں تک ضرور پہونچائے

اس سے زیادہ کے لئے مکبر ہے بلکہ امام اعتدال کے ساتھ قرأت کرے اور مکبر تبلیغ کیا کرے جب امام پر جہد نہیں رکھا گیا تو آلہ کس لئے ۔ یہ آلہ تو بہت جہد تبلیغ نے اور ضرور سنت تبلیغ بالتکبیر اس سے معدوم ہوتی ہے۔

(۵) یہ سب بیکار باتیں ہیں یہ کہتا کون ہے کہ ہاتھ پاؤں سے حرکت کی جاتی ہے اسلئے اس آلہ کا استعمال ناجائز ہے ۔ بجلی کا پنکھا کونسی سنت کو معدوم کرتا اور کس شغل کا موجب ہے اور اگر ہے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

(۶) اگر یہ مقیس علیہ قرار دیا جاسکے تو امام کو بگل کے ذریعہ سے تکبیرات کے پہونچانے کی ضرورت پڑے گی ۔ نماز نہ ہوئی کھیل ہوگیا۔ وما کان صلوتھم عندالبیت الامکاء وتصدیة ۔ والعیاذ باللہ تعالی۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۲۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
اکثر گاؤں میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے اور بعض مفتیوں نے یہ فتوے دیا ہے کہ گاؤں میں جو جمعہ ہوتا ہے اس کو بند کردیا جائے چاہے وہاں ایک زمانہ سے جمعہ کی جماعت قائم ہو اب دریافت طلب یہ امور ہیں کہ آیا گاؤں میں نماز جمعہ کو واقعی بند ہی کردینا چاہیئے یا اسے قائم رکھا جائے اور قائم رکھنے کی صورت میں ظہر کی نماز بھی ادا کی جائے یا نہیں اگر ادا کیجائے تو اس کی کیا صورت ہے؟ ۔ بینوا توجروا۔
المستفتی صوفی ظہور شاہ از موضع دبھائی تحصیل ہاپوڑ ضلع میرٹھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اس وقت دیہات کے مسلمانوں کی ایسی ناگفتہ بہ حالت ہورہی ہے کہ ہر شخص فکر معاش میں مدہوش ہے زراعت کی مشغولیت میں منہمک ہے خوف الہی قلب سے نکل رہا ہے ۔ نیکیوں کا شوق کم ہورہا ہے عبادات کا ذوق مٹ رہا ہے ۔ فرائض کا احترام کم ہورہا ہے ۔ بدیوں کی اشاعت ہے ۔ گناہوں کی کثرت ہے ۔ علی الاعلان کبائر کا ارتکاب کیا جارہا ہے ۔ نہایت دلیری سے نماز روزہ کو ترک کر

جارہا ہے۔ مساجد نمازیوں سے خالی نظر آرہی ہیں دین سے بے رغبتی بڑھتی جارہی ہے ۔ پھر ان میں وعظ ونصائح کے سلسلہ بند ہیں ترغیب وترہیب کے ذریعے بہت کم ہیں اور اس پر ان لوگوں کی بے رغبتی اور بد شوقی اور زیادہ رنگ لاتی ہے چنانچہ ان کی مساجد میں نماز پنج وقتہ کی پابندی کے ساتھ جماعت کم ہوتی ہے بسا اوقات اذان سے مسجد خالی رہجاتی ہے ، مسلمانوں کے بڑے سے بڑے گاؤں میں چند نمازی نظر آتے ہیں ، ہاں ان کے مردہ جذبات میں جان ڈالنے والا ، ان کے بے حس یا قلوب میں شوق کی لہریں پیدا کرنے والا ، ان میں غسل وطہارت کا جذبہ پیدا کرنے والا ، ان میں خط بنوانے اور کپڑے بدلنے کا ذوق پیدا کرنے والا ، ان کے مشاغل دنیوی کو بند کرنے والا ، ان کے کاروبار زراعت سے روکنے والا ، ان کو مسجد کی طرف متوجہ کرنے والا ، ان کو نماز کی جانب رغبت دلانے والا ، ان کی جبین نیاز کو جھکانے والا ، اگر کوئی دن ہے تو یہی جمعہ کا دن ہے ۔ اس دن کا ان کے قلوب میں بڑا احترام ہے ، اس دن لوازم نیاز مندگی کا اظہار کرنا ان کے نزدیک نہایت ضروری کام ہے ، اس روز وہ لوگ نماز جمعہ کو ایسا امر اہم تصور کرتے ہیں کہ جو اس میں شرکت نہ کرے اس پر زبان طعن دراز کرتے ہیں ، اس کو معیوب نظروں سے دیکھتے ہیں ، پھر یہ بھی مشاہدہ ہے کہ اس نماز جمعہ کی وجہ سے بعض لوگ ایک دو روز بعض تین چار روز تک نماز کی پابندی بھی کر لیتے ہیں ، بعض اپنے جذبہ شوق میں شہر میں جمعہ کے لئے چلے جاتے ہیں ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ گاؤں میں جمعہ ہونے کی وجہ سے مسجد میں زینت ہوتی ہے ، نمازیوں کی کثرت ہوتی ہے ، نماز کی تبلیغ ہوتی ہے ، دین داری کی ترویج ہوتی ہے ، طہارت کا ذوق دعاء ومناجات کا ذوق پیدا ہوتا ہے ، بلکہ اس کے طفیل میں اور دو تین روز تک نماز ادا کرنے کی صورت پیدا ہوجاتی ہے ۔

لہذا ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے گاؤں میں جمعہ کی جماعت کو جاری رکھنا قابل لحاظ اور قرین مصلحت ہے ، بلکہ دیہات کے حالات پر مطلع ہونے کے بعد ہر مذہبی درد رکھنے والا شخص اس چیز کے لئے مضطر ہوجائے گا کہ ان میں جمعہ کی جماعت کو قائم رکھا جائے اور ان کے قلوب سے اس شعار مسلمین کا احترام کم نہ کیا جائے اور اس نازک دور میں ان کی اس قابل قدر رغبت کو ٹھیس نہ لگائی جائے ۔ "مگر تعجب ہے ان مفتیوں پر جو ان تمام مصالح دینی سے آنکھیں بند کر کے جمعہ کو بند کرانے کے در پے ہوگئے ہیں ، تو نہ ایسے مفتیوں کا حکم قابل عمل ہے ، نہ ایسا فتوی لائق اعتماد ہے ، یہ لوگ اگر غور کرتے" تو شریعت میں ایسی بکثرت نظیریں موجود ہیں جن میں فقہائے کرام نے عوام کو فعل مکروہ سے محض ان کی امور خیر سے قلت رغبت اور ان سے خوف ترک فرض کا لحاظ فرماتے ہوئے نہیں منع کیا ۔ ہم بخوف طوالت اس وقت صرف

دو نظیریں اسی سلسلہ نماز ہی میں پیش کرتے ہیں۔

علامہ شامی بحر سے بحوالہ تجنیس ناقل ہیں:

ان كسالى العوام اذا صلوا الفجر عند طلوع الشمس لايمنعون لانهم اذا منعوا تركوها اصلا واداؤها مع تجويز اهل الحديث لها اولى من تركها اصلا۔

(شامی مصری ج۱ص۵۸۲)

عوام کے سست لوگ جب نماز فجر بوقت طلوع آفتاب پڑھیں تو انہیں منع نہ کیا جائے اس لئے کہ جب وہ منع کئے گئے تو وہ اس نماز کو بالکل ہی نہ پڑھیں گے اور محدثین کی تجویز پر اس وقت اس نماز کا ادا کرنا اس کے بالکل نہ پڑھنے سے بہتر ہے۔

علامہ شامی ردالمحتار میں اس عبارت کے چند سطر بعد فرماتے ہیں:

عدم منعهم عن صلاة الفجر عند طلوع الشمس لان ذلك لخوف تركها اصلا فيقع التارك في محظور اعظم۔ (ردالمحتار مصری ج۱ص۵۸۲)

طلوع آفتاب کے وقت نماز فجر سے ان لوگوں کو منع نہ کرنا اس لئے ہے کہ اس میں بالکل نماز نہ پڑھنے کا خوف ہے تو وہ ترک نماز کے گناہ عظیم میں واقع ہو جائے گا۔

اسی طرح عوام کو عیدگاہ میں عید کے دن نماز نفل سے نہیں روکا جاتا ہے درمختار میں ہے۔

اما العوام فلا يمنعون من تكبير ولا بنفل اصلا لقلة رغبتهم في الخيرات۔

(شامی مصری ج۱ص۵۸۲)

ان عبارات میں صاف طور پر موجود ہے کہ عوام کے سست لوگ نماز فجر بوقت طلوع آفتاب بھی پڑھیں تو انہیں اس وقت مکروہ میں بھی نماز پڑھنے سے منع نہ کیا جائے گا بخوف اس بات کے کہ وہ پھر نماز بالکل ہی نہ پڑھیں گے اور ان کی اس وقت مکروہ پر نماز کو محض ایک قول ضعیف کی تجویز پر اولیٰ قرار دیا گیا اور انہیں تارک کے فرض کے گناہ عظیم میں واقع ہونے سے بچا لیا گیا اسی طرح عوام کو ان کے امور خیر میں رغبت کم ہونے کی بنا پر عیدگاہ میں نفل نماز سے نہیں منع کیا جاتا۔

بالجملہ فقہائے کرام نے جب عوام کے لئے خوف ترک فرض اور ان کی امور خیر سے کم رغبتی کا اس قدر لحاظ فرمایا کہ انہیں اسی بنا پر فعل مکروہ سے نہیں روکا اور ان کے فعل کو قول ضعیف کی بنا پر اولیٰ قرار دیا تو کیا گاؤں کے جمعہ میں ان امور کا لحاظ نہیں کیا جائے گا بلکہ گاؤں میں جمعہ کی جماعت بند کرنے میں نہ

فقط ایک فرض کے ترک ہونے بلکہ چند فرائض کے ترک ہو جانے کا نہ صرف خوف بلکہ یقین ہے۔" تو کیا ان مفتیوں کے قول سے گاؤں میں جمعہ کی جماعت توڑ کر ان لوگوں کو ترک فرائض کے گناہ عظیم میں مبتلا کر دیا جائے"۔ پھر نیز گاؤں کے لوگوں کی نماز سے بے رغبتی کا حال کسی پر پوشیدہ نہیں ہے۔

لہٰذا اب جمعہ کی جماعت کس بنیاد پر بند کی جا سکتی ہے اور جب یہ مشاہدہ ہے کہ جمعہ کی نماز کی وجہ سے دو تین روز تک اور بھی چند اوقات کی نماز وہ لوگ پڑھ لیتے ہیں۔" تو ان مفتیوں کے نزدیک یہ دو تین روز کی نمازیں بالکل قابل لحاظ نہیں"۔ علاوہ بریں ہمارے نزدیک قول راجح واصح کی بنا پر گاؤں پر تعریف مصر صادق نہیں آتی لیکن دوسرا قول مرجوح جو اکثر فقہا کے نزدیک مفتی بہ بھی ہے اس کی بنا پر گاؤں مصر ہے اور آپ نے ابھی سنا کہ فقہاء نے ایک قول ضعیف کی بنا پر بخوف ترک فرض فعل مکروہ اولیٰ قرار دیا تو یہاں کیا جماعت جمعہ کو بخوف ترک فرائض قول مفتی بہ کی بنیاد پر بھی اولیٰ نہ قرار دیا جائے گا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ فقہاء کرام کی یہ دونوں نظیریں دیکھتے ہوئے گاؤں میں جمعہ کی جماعت کو بند کرنا سخت غلطی ہے لوگوں کو گناہ عظیم میں واقع کرنے کی تجویز ہے اور ان کے قلوب سے اس شعار مسلمین کی عظمت کم ہو جانے کی تدبیر ہے تعجب ہے کہ ان مفتیوں کو ایسی جرأت و دلیری کرتے ہوئے خوف الٰہی نہیں معلوم ہوتا یہ لوگ حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ کا فرمان دیکھ کر کچھ سبق حاصل کریں۔

درمختار میں اس عبارت مذکورہ کی دلیل بنا کر قول نقل کیا:

لان عليا رضي الله تعالىٰ عنه راى رجلا يصلي بعد العيد فقيل اما تمنعه يا امير المؤمنين فقال اخاف ان ادخل تحت الوعيد قال الله تعالىٰ ارأيت الذي ينهى عبداً اذا صلى۔ (شامی ج۱ص۵۸۳)

کیونکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کو بعد نماز عید نفل نماز پڑھتے ہوئے دیکھا عرض کیا گیا اے امیر المومنین کیا آپ اس کو نماز نفل پڑھنے سے منع نہیں فرماتے تو فرمایا میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ میں بھی اللہ تعالیٰ کے فرمان کی اس وعید میں داخل نہ ہو جاؤں بھلا دیکھئے تو جو منع کرتا ہے بندے کو جب وہ نماز پڑھے۔

بالجملہ گاؤں میں جب جمعہ ہوتا ہے تو اس کی جماعت کو قائم رکھا جائے گا اور برابر جمعہ کو پڑھا جائے گا" بلکہ اس کی شرکت کی لوگوں کو ترغیب دلائی جائے اور کسی ایسے غلط فتوے کی وجہ سے جمعہ کو بند نہ کیا جائے"۔ البتہ گاؤں کے لوگوں کو اس کے بعد ظہر کی نماز ادا کرنی ضروری اور فرض ہے۔

علامہ شامی ردالمحتار میں جواہر سے ناقل ہیں۔

ولو صلوا فی القری لزمهم اداء الظهر ۔ (شامی ج ا ص ۵۶۰)

اگر گاؤں میں جمعہ کی نماز پڑھیں تو انہیں ظہر کا ادا کرنا بھی لازم ہے۔

لیکن ظہر کے ادا کرنے کی بہتر صورت یہ ہے۔ جو علامہ خیرالدین رملی کے فتاوی خیریہ میں ہے جس کی عبارت یہ ہے:

والاحتیاط فی القری ان یصلی السنة اربعا ثم الجمعة ثم ینوی اربعا سنة الجمعة ثم یصلی الظهر ثم یصلی رکعتین سنة الوقت فهذا هو الصحیح المختار۔

(فتاوی خیریہ مصری ص ۱۲)

گاؤں میں احتیاط یہ ہے کہ چار رکعت سنت پڑھے پھر جمعہ پھر چار رکعت سنت پڑھے جمعہ کی نیت کرے پھر ظہر پڑھے پھر دو رکعتیں سنت وقت کی پڑھے یہی قول صحیح مختار ہے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ جس گاؤں میں جمعہ ہوتا ہے اس کو ہرگز بند نہ کیا جائے بلکہ اس کی جماعت کو برابر قائم رکھا جائے اور جمعہ کو پڑھا جائے اور اس کے بعد چار رکعت سنت جمعہ پڑھ کر پھر ظہر کو ضرور ادا کیا جائے اس کے بعد دو رکعت سنت وقت اور نفل پڑھے منصف کے لئے یہ جواب نہایت کافی وافی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم الصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۲۹)

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم ۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ احناف رحم کرے اللہ آپ لوگوں پر اور برکت دے علم میں کہ فیض پہنچاتے ہیں علم سے خلائق کو اس مسئلہ میں کہ۔

ہمارا گاؤں جو سات آٹھ سو گھر آبادی پر مشتمل ہیں لیکن اس میں نہ کوئی نہر اور نہ بازار ہے عرصہ بعید سے ایک بڑی مسجد میں (جو جامع مسجد کے نام سے موسوم ہے) لوگ نماز جمعہ پڑھتے چلے آرہے تھے، اب دو چار ماہ سے ایک دوسری چھوٹی سی مسجد کے امام نے از راہ عناد وحسد وتخریب جامع مسجد قدیمہ یہ حیلہ تراش کر کہ جامع مسجد کا خطیب داڑھی سنت سے کم رکھتا ہے یعنی کترواتا ہے اسکے پیچھے نماز جمعہ

ہو سکتی اسی چھوٹی مسجد میں الگ نماز جمعہ پڑھا رہا ہے نیز دو ماہ سے ایک سید مولوی صاحب ہمارے گاؤں آئے ہوئے ہیں جو آپنے آپ کو (الرضوی الحنفی الچشتی النظامی الخراسانی الهروی) لکھتے ہیں انہوں نے ایک تیسری چھوٹی سی مسجد میں مذکورہ بالا حیلہ تراش کر براہ عناد وحسد وتخریب جامع مسجد قدیمہ الگ نماز جمعہ پڑھانی شروع کر دی ہے سید صاحب موصوف سے اگر کوئی شخص تعدد نماز جمعہ کے متعلق اور شرائط ادائے صحت نماز جمعہ کے متعلق مسئلہ دریافت کرتا ہے تو سید صاحب ممدوح ارشاد فرماتے ہیں کہ شرائط نماز جمعہ جو کتب فقہ میں مندرج ہیں وہ فرقہ معتزلہ اور رافضیہ کی بنائی ہوئی ہیں نہ کہ جمہور ائمہ حنفیہ کی مزید برآں یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ نماز جمعہ بغیر شرائط کے ہر قریہ کی دو چار مسجدوں میں (خواہ قریہ صغیرہ تیس (۳۰) گھر کی آبادی پر مشتمل ہو) پڑھ لینا جائز ہے کیونکہ نماز جمعہ عین فرض ہے نہ کہ مقید بالشرائط۔ ونیز صاحب وممدوح سید صاحب نماز جمعہ جو نہ پڑھنے والے شخص کو بحوالہ مشکوۃ شریف منافق کہتے ہیں۔

اب دریافت طلب امور یہ ہیں کہ۔

(۱) مذکور بالا آبادی کا قریہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟۔

(۲) مذکورہ بالا آبادی کے قریہ میں (جس کا اطلاق عرف عام میں قدیم الایام سے قریہ چلا آتا ہے) امام اعظم کے مذہب پر نماز جمعہ جائز ہے یا نہیں؟۔

(۳) مذکورہ بالا قریہ میں امام اعظم کے مذہب پر مذکورہ بالا حیلہ تراش کر دو چار مسجدوں میں نماز جمعہ پڑھانی جائز ہے یا نہیں؟۔

(۴) آیا سید صاحب موصوف جو شرائط ادائے صحت نماز جمعہ کے انکاری ہیں اور شرائط ادائے صحت نماز جمعہ کو فرقہ معتزلہ ورافضیہ کی بنائی ہوئی بتلاتے ہیں اور کتب فقہ کو مشکوک بتلاتے ہیں وہ (الرضوی الحنفی الچشتی النظامی الخراسانی الهروی) کہلانے کے مستحق ہیں یا نہیں اور وہ لاامام وخطیب ہونے کے مستحق ہیں یا نہیں؟۔

(۵) آیا بموجب ارشاد صاحب مذکور صاحب کنز وقدوری وہدایہ وشرح وقایہ جنکی مصنفہ سب میں شرائط ادائے صحت نماز جمعہ مندرج ہیں) واقعی معتزلہ ورافضی حق پر تھے یا نہیں۔

(۶) اگر نہیں تو فقہائے کرام پر افترا واتہام ہے یا نہیں؟۔

(۷) اگر افترا واتہام ہے تو سید صاحب مذکور از روئے شریعت کس تعزیر کے مستوجب ہیں؟۔

(۸) آیا واقعی موجب ارشاد سید صاحب نماز جمعہ عین فرض ہے یا مقید با شرائط؟۔

(۹) اگر مقید با شرائط ہے تو شرائط کا اثبات آیات شریف اور حدیث سے ہے یا محض قیاس میں مجتہد سے اور موقوف علیہ ہونے میں جمعہ کے لئے برابر ہیں یا نہیں؟۔

(۱۰) اگر شرائط جمعہ کا اثبات آیت شریف اور حدیث شریف سے ہے تو بحوالہ کتب معتبرہ تفسیر وحدیث وفقہ مفصل ومدلل متفق علیہ تحریر فرمادیں؟۔

(۱۱) نیز جمعہ کی نماز اگر مقید بالشرائط ہے تو باوجود مفقود ہونے شرائط کے جو شخص نماز جمعہ نہ پڑھے وہ بموجب ارشاد سید صاحب مذکور واقعی منافق ہے یا کیا اگر منافق نہیں ہے۔تو منافق کہنے والے پر از روئے شریعت کیا تعزیر عاید ہوتی ہے؟۔

(۱۲) از راہ عناد وحسد وتخریب جامع مسجد قدیمہ ایک قریہ کی دو تین مسجدوں میں نماز جمعہ پڑھنا امام اعظم رحمۃ اللہ تعالی علیہ کے مذہب پر جائز ہے یا کیا؟ جیسا کہ آج کل ہمارے گاؤں میں پڑھی جارہی ہے؟۔بینوا توجروا

نوٹ :- ہر ایک امور مذکورہ بالا کا جواب باصواب بدلائل عقلی ونقلی بحوالہ کتب معتبرہ تفسیر وحدیث وفقہ بمعہ ترجمہ اردو عبارات عربیہ مفصل ومدلل ومتفق علیہ ہوتا کہ جواب الجواب کی نوبت نہ آئے نیز سوالات ہمراہ جوابات واپس ارسال فرما کر مشکور وممنون فرمائیں عین مہربانی ہوگی۔

المستفتی احقر العباد غلام رسول ولد چوہدری غلام مصطفی صاحب کھوکھر راجپوت
متوطن خاجیوالہ تحصیل وضلع گجرات (پنجاب) ۱۳۔۶۔۴۱

الجواب

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم علیہ وعلی الہ وصحبہ الصلوۃ والتسلیم

اہل اسلام میں ایسا اختلاف وگروہ بندی نہایت مذموم اور بہت زیادہ قابل افسوس ہے۔اگر کاش مسلمان اپنی ذاتی عداوتوں اور نفسانی اغراض کو پس پشت ڈال کر احکام شرعی پر عمل کرنے کا خلوص قلب سے مصمم ارادہ کرلیں تو کوئی اختلاف ہی رونما نہ ہو اور بیچارے عوام گروہ بندی کی مصیبت سے نجات پائیں۔مگر مشکل تو یہ ہے کہ چند خود غرض عالم بنکر ناواقف مسلمانوں میں اپنا علمی وقار قائم کرلیتے ہیں اور اپنے حصول غرض کے رات دن نیا اختلاف پیدا کرتے رہتے ہیں عوام ان کا شکار بن جاتے ہیں اور گروہ بندی کے دلدل میں پھنس جاتے ہیں اور یہ جستجو نہیں کرتے کہ شریعت مطہرہ کا اس میں کیا حکم ہے اس اختلاف میں کون حق پر ہے اور کون باطل پر قرآن کریم نے ہر ایسے اختلاف کے ختم کرنے کا یہ طریقہ تعلیم

فرمایا ہے۔

فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لاتعلمون۔

یعنی اگر تم کسی چیز کو نہیں جانتے ہو تو جاننے والوں سے دریافت کرو۔

لہذا مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے ہر اختلاف میں معتمد ومستند علماء کرام ومفتیان عظام سے فتوے طلب کریں اور حکم شرعی کے ظاہر ہوجانے کے بعد اپنے تمام اختلافات کو ختم کردیں اور آپس میں محبت ووداد والفت واتحاد پیدا کریں اور خود غرضوں کی کسی بات کی طرف التفات وتوجہ نہ کریں۔

بالجملہ میں اپنی عدیم الفرصتی کیوجہ سے اس وقت مفصل اور مبسوط جوابات پیش کرنے سے قاصر ہوں مختصر جواب دیا جائے گا جو مدلل ہوگا جس میں بغیر کسی کی جانب داری کے صریح الفاظ میں حکم شرعی کا اظہار کردیا جائے گا اور طالب حق کے لئے بہت کافی ثابت ہوگا اور معاند اور متعصب کے لئے دفتر کے دفتر ناکافی ہیں۔

(۱) اگر فی الواقع اس آبادی میں سات آٹھ سو گھر ہیں اور مسلمانوں کی اکثریت ہے اور اس میں چند مساجد ہیں تو اس کے قریہ کبیرہ ہونے میں کیا کلام ہے جب کہ فقہاء کرام کے ایک قول مفتی بہ کی بنا پر غالبا اس پر مصر کی تعریف بھی صادق آجائے۔

درمختار میں ہے: المصر وهو مالا يسع اكبر مساجده اهله المكلفين بها وعليه فتوى اكثر الفقهاء۔

یعنی مصر وہ آبادی ہے جس کی بڑی مسجد میں وہاں کے مکلف مسلمان سمانہ سکیں اور اس قول پر اکثر فقہاء کا فتوی ہے۔

اگرچہ ہمارے نزدیک مصر کی وہ تعریف زیادہ معتمد ہے جو خود صاحب مذہب حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے:

عن ابی حنيفة انه بلدة كبيرة فيها سكك واسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على انصاف المظلوم من الظالم بحشمه وعلمه او علم غيره يرجع الناس اليه فيما يقع من الحوادث وهذا هو الاصح۔ (شامی ص ۵۶۰)

یعنی امام اعظم علیہ الرحمۃ سے مروی ہے کہ مصر وہ بڑی آبادی ہے جس میں چند کوچے اور بازار

ہوں اور اس کے متعلق دیہات ہوں اور اس میں کوئی ایسا حاکم ہو جو اپنی سطوت اور علم سے یا دوسرے کے علم سے ظالم سے مظلوم کے انصاف پر قادر ہو لوگ اس کے یہاں حوادث میں رجوع کرتے ہیں یہ تعریف زیادہ صحیح ہے۔

بالجملہ اس آبادی مذکور پر یہ تعریف صادق نہیں آتی تو اسکا مصر ہونا تو ثابت نہیں ہوا اور اس قدر زبردست آبادی کو باوجود چند مساجد کے قریہ صغیرہ قرار دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا تو اس آبادی مذکور کو قریہ کبیرہ ہی مانا جائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) اس آبادی مذکور کا جب کبیرہ ہونا متحقق ہو تو قریہ کبیرہ میں وجوب جمعہ کا تو حکم دیا نہیں جاتا لیکن مذہب مختار کی بنا پر جمعہ پڑھنے کے بعد احتیاط الظہر پڑھنے کا حکم دیا جائے گا۔

فتاوی خیریہ میں ہے:

والاحتياط في القرى (الكبيرة) ان يصلى السنة اربعا ثم الجمعة ثم اربعا سنة الجمعة ثم يصلى الظهر ثم يصلى الركعتين سنة الوقت فهذا هو الصحيح المختار۔

(فتاوی خیریہ ص ۱۲۵)

غنیۃ شرح منیہ میں ہے:

قالوا في كل موضع وقع الشك في جواز الجمعة ينبغي ان يصلى اربع ركعات وينوى بها الظهر حتى لو لم تقع الجمعة موقعها يخرج عن عهده فرض الوقت بيقين كذا في الكافي قال في فتاوى الحجة هذا في القرى الكبيرة ۔ (غنیۃ ص ۵۱۲)

ان عبارات کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ بڑے گاؤں میں احتیاط یہ ہے کہ چار سنت پڑھے پھر جمعہ پھر چار جمعہ کی سنت پڑھے پھر ظہر پھر دو رکعت سنت وقت کی پڑھے یہی مذہب صحیح ومختار ہے اور فقہاء نے فرمایا ہر وہ مقام جس میں جمعہ کے جائز ہونے میں شک ہو تو وہاں بہ نیت ظہر چار رکعت پڑھنا مناسب ہے یہاں تک کہ اگر جمعہ ادا نہیں ہوا تو وہ فرض وقت کے ذمہ سے تو یقیناً نکل جائے گا اسی طرح کافی میں ہے اور فتاوی حجہ میں فرمایا کہ یہ حکم بڑے قریہ میں ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ قریہ کبیرہ میں جمعہ کی ممانعت نہیں البتہ اس کے بعد احتیاط الظہر بنا بر مذہب مختار کے ادا کی جائے۔ لہذا جب مذکورہ آبادی کا قریہ کبیرہ ہونا ثابت ہو چکا تو اس میں جمعہ پڑھ سکتے ہیں البتہ اس کے بعد احتیاط الظہر کو پڑھنا چاہیئے اور اس تفصیل وترتیب سے ادا کیا جائے۔ ج

ذکر اوپر گذرا کہ اس طریقہ میں فرض وقت بیقین ذمہ سے ساقط ہوتا ہے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) جس آبادی پر بہ یقین مصر کی تعریف صادق آ رہی ہے خود اس میں بھی تعدد جمعہ کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔

کبیری میں ہے: واما من حيث جواز التعدد وعدمه فالاولى هو الاحتياط لان الخلاف فيه قوى اذ الجمعة جامع للجماعات ولم تكن في زمن السلف تصل الا في موضع واحد من المصر وكون الصحيح جواز التعدد وللضرورة للفتوى لايمنع شرعيه الاحتياط للتقوى۔ (کبیری ص ۵۱۲)

ردالمحتار میں ہے: جواز التعدد وان كان ارجح واقوى دليلا لكن فيه شبهة قوية لان خلافه مروى عن ابى حنيفة ايضا واختاره الطحاوى والتمرتاشى وصاحب المختار وجعله العتابى الاظهر وهو مذهب الشافعى والمشهور عن مالك واحدى الروايتين عن احمد كما ذكر المقدسى في رسالة نور الشمعة في ظهر الجمعة بل قال السبكى من الشافعية انه قول اكثر العلماء ولا يحفظ عن صحابى ولا تابعى تجويز تعددها۔

(ردالمحتار ج ۱ ص ۵۶۵)

ان عبارات کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ تعدد جمعہ میں خلاف بہت قوی ہے کہ جمعہ تمام جماعتوں کا جامع ہے اور زمانہ سلف میں مصر میں بھی ایک ہی جگہ پر نماز ہوتی تھی اور تعدد جمعہ کا جواز فتوی کی ضرورت کے لئے ہے تو یہ تقوی کے لئے احتیاط کی مشروعیت کو مانع نہیں اور تعدد جمعہ کا جواز اگر باعتبار دلیل کے راجح اور قوی ہے لیکن اس میں قوی شبہ بھی ہے کہ اس کے خلاف امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی اور اس کو طحاوی اور تمرتاشی اور صاحب مختار نے اختیار کیا اور عتابی نے اسی کو اظہر مانا اور یہی امام شافعی کا مذہب ہے اور امام مالک کا قول مشہور اور امام احمد سے یہ مروی ہے امام سبکی نے فرمایا کہ یہ اکثر علماء کا قول ہے اور کسی صحابی وتابعی سے تعدد جمعہ کی تجویز محفوظ نہیں۔

اگر چہ مصر میں قول اصح کی بنا پر تعدد جمعہ کو جائز قرار دیا گیا مگر مصر میں بھی افضل یہی ہے کہ بلا عذر شرعی جمعہ جامع مسجد ہی میں پڑھا جائے۔

غنیۃ میں ہے:

والافضل هو الجامع الواحد وذلك للخروج من الخلاف والخروج عن العهدة

بیقین۔ (غنیۃ ص ۵۱۲)

تو وہ قریہ کبیرہ جس میں جمعہ کا جواز ہی محل تردد وشک میں ہے اس میں تعدد جمعہ کی کس طرح اجازت ہوسکتی ہے۔

بالجملہ مذکورہ بالا آبادی میں جامع مسجد ہی میں جمعہ ہونا چاہئے متعدد مساجد میں نہیں پڑھنا چاہئے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۴ تا ۷) شخص مذکور سخت جاہل ہے اور دین سے بے بہرہ ہے اور احکام شریعت سے بے خبر ہے اور کتب فقہ کا منکر ہے سلف وخلف کا مخالف ہے فقہاء کرام کا دشمن اور بدگو ہے اس پر توبہ اور استغفار لازم ہے اور تجدید ضرور ہے شرح فقہ اکبر میں ہے "من ابغض عالما من غیر سبب ظاھر خیف علیہ الکفر قلت الظاھر انہ یکفر" یعنی جس نے کسی عالم سے بغیر کسی سبب ظاہر کے بغض رکھا تو اس پر خوف کفر ہے۔ ملا علی قادری فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہ ہے کہ وہ کافر ہو جائیگا۔ لہذا شخص مذکور اس عبارت میں اپنا حکم دیکھے کہ فقہائے کرام کو بلاوجہ معتزلہ ورافضی کہکر اپنی عداوت قلبی اور بغض دلی کا صاف طور پر اظہار کررہا ہے تو جبتک یہ شخص تائب نہ ہو اسکو امام نہ بنایا جائے۔ نہ اس سے سلام وکلام روا رکھا جائے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۸ تا ۱۰) نماز جمعہ فرض عین ہے۔ نور الایضاح ومراقی الفلاح میں ہے:

صلوۃ الجمعہ فرض عین بالکتاب والسنۃ والاجماع (طحطاوی صفحہ ۲۹۱)

یعنی جمعہ کی نماز کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور اجماع امت سے فرض عین ہے۔

شخص مذکور کی یہ انتہائی جہالت ہے کہ وہ فرض عین کا مقابل فرض مقید بالشرائط قرار دیتا ہے اگر کسی معمولی طالب علم سے بھی دریافت کرلیتا تو اسکی یہ جہالت طشت از بام نہ ہوتی، پھر وہ فرض عین کے کیا معنی سمجھتا ہے کیا اس کے نزدیک شرائط کی قید فرض عین کی عینیت کو باطل کردیتی ہے، اگر اس کے زعم باطل میں ایسا ہی ہے تو کیا اس کے ناپاک خیال میں نماز پنجگانہ مقید بالشرائط نہیں ہیں باوجودیکہ یہ فرض عین ہیں کیا وہ طہارت ستر عورت وقت نیت وغیرہ کو نماز کے شرائط نہیں جانتا اگر جانتا ہے تو کیا یہ نماز کے فرض عین ہونے کے منافی ہے، پھر جمعہ کے شرائط کا ثبوت آیات سے بھی ثابت ہے۔

چنانچہ تفسیر احمدی میں ہے: ان ثلثۃ نفر یشترط فی الجمعۃ سوی الامام عند ابی حنیفہ خلافا لھما والحجۃ لہ قولہ فاسعوا الی ذکر اللہ (احمدی صفحہ ۳۵)

اسی میں ہے: کما شرط لوجوب الجمعۃ اشروط الستتہ المذکورۃ لذلک یشترط لصحت ادائھا ستۃ اخری المصر او فنائہ (احمدی صفحہ ۳۸۶)

ان عبارات کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ جمعہ میں امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک سوا امام کے تین شخصوں کا ہونا شرط ہے اور ان کی دلیل یہ آیت ہے اللہ کے ذکر کی طرف سعی کرو اور جس طرح وجوب جمعہ کے لیے چھ شرطیں ہیں اسی طرح اس کی صحت ادا کے لیے چھ شرطیں اور ہیں مصر وفنائے مصر وغیرہ اس طرح احادیث سے بھی ثابت ہے چنانچہ بیہقی میں بروایت حضرت علی کرم اللہ وجہہ حدیث میں مروی ہے "لا جمعہ الا فی مصر جامع (اصح البہاری صفحہ ۵۲۷)

یعنی جمعہ مصر ہی میں ادا ہوتا ہے۔

یہ بطور نمونہ جمعہ کے شرائط کا ایک ایک آیت وحدیث سے اثبات کیا گیا ورنہ جمعہ کی ہر شرط آیت یا حدیث سے مستفاد ہے۔ بالجملہ شخص مذکور کا قول سراسر باطل ہے اور اس کی جہالت کی بین دلیل ہے مولیٰ تعالیٰ اسکو ہدایت کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۱۱) نماز جمعہ فی الواقع مقید باشرائط ہے جیسا کہ اوپر کے جوابات سے ظاہر ہو چکا اور حدیث شریف میں اس تارک جمعہ کو منافقین میں شمار فرمایا ہے جو شرائط جمعہ کے موجود ہوتے ہوئے ادائے جمعہ پر قادر ہو کر بقصد جمعہ ترک کرے، چنانچہ الفاظ حدیث سے خود ظاہر ہے "من ترک الجمعۃ من غیر ضرورۃ کتب منافقا" لیکن جو شرائط مفقود ہونے کی بنا پر جمعہ نہ پڑھے اس کو منافق کہنا مفہوم حدیث کے خلاف ہے اور اپنی رائے سے دین میں مداخلت ہے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۱۲) اسکا جواب نمبر ۳ میں گذرا کہ قریہ کبیرہ میں چند مساجد میں جمعہ نہ قائم کیا جائے پھر بلا عذر محض تخریب جامع مسجد کی نیت سے کرنا بہت قبیح مذموم ہے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۳۰)

الحمد للہ رب العلمین والعاقبۃ للمتقین اما بعد سلام وآداب۔

عرض یہ ہے کہ جب خطیب منبر پر ہو اور موذن اذان پڑھے تو اذان کے بعد امام ومقتدیوں کو دعا

پڑھنی چاہیے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں علمائے دین کیا فرماتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ آپ پر رحمت فرمائے۔

المستفتی شبیر حسین از حسن پور

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جمعہ کے دن خطیب کے روبرو موذن اذان ثانی کہکر فارغ ہو تو خطبہ شروع کر دے۔

چنانچہ ابوداؤد شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے:

كان النبي صلى الله تعالىٰ عليه وسلم يخطب خطبتين كان يجلس اذاصعد المنبر حتى يفرغ اراه المؤذن ثم يقوم فيخطب ثم يجلس فلايتكلم ثم يقوم فيخطب۔ (ابوداؤد شریف مجتبائی ج ۱ص ۱۶۳)

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دو خطبے پڑھتے تھے اور جب منبر پر تشریف لیجاتے اور خطبہ پڑھتے پھر بیٹھ جاتے اور کوئی کلام نہ فرماتے پھر کھڑے ہوجاتے اور خطبہ پڑھتے۔

ابوداؤد نے اپنے مراسیل میں حضرت ابن شہاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی:

بلغنا ان رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم كان يبدأ فيجلس على المنبر فاذاسكت المؤذن قام فخطب فيخطب الخطبة الاولىٰ ثم جلس شيئا يسيرا ثم قام فخطب الخطبة الثانية حتى اذا قضاها استغفرالله ثم نزل فصلى۔ (صحیح البہاری۔ج ۲ص ۵۳۳)

ہمیں یہ بات پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خطبہ شروع کرتے اور منبر پر جلوس فرماتے پس جب موذن خاموش ہوجاتا تو کھڑے ہوجاتے اور خطبہ اولیٰ پڑھتے پھر کچھ دیر بیٹھتے پھر کھڑے ہوجاتے اور خطبہ دوسرا پڑھتے یہاں تک کہ جب اسے پورا فرمالیتے تو استغفار کرتے پھر منبر سے نیچے تشریف لاتے اور نماز پڑھاتے۔

ابن مندہ نے حضرت سعید بن خاطب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی:

كان النبي صلى الله تعالىٰ عليه وسلم يخرج فيجلس على المنبر يوم الجمعة ثم يؤذن المؤذن فاذ فرغ قام يخطب۔ (صحیح البہاری ج ۲ص ۵۳۲)

نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لاتے اور جمعہ کے دن منبر پر جلوس فرماتے پھر جب موذن اذان کہکر فارغ ہوجاتا تو حضور کھڑے ہوجاتے اور خطبہ پڑھتے۔

طبرانی نے کبیر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی:

قال رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم اذ دخل احدكم المسجد والامام على المنبر فلاصلاة ولا كلام حتى يفرغ الامام۔ (صحیح البہاری ج ۲ص ۵۴۴)

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جب تمہارا کوئی شخص مسجد میں پہنچے اور امام منبر پر ہو تو اس کے فارغ ہونے تک نہ کوئی نماز پڑھے نہ کوئی کلام۔

پہلی تین احادیث سے یہ ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم موذن کے اذان سے فارغ ہونے اور خاموش ہوجانے کے بعد خطبہ کے لئے کھڑے ہوجاتے اور خطبہ شروع کر دیتے تھے لہذا فعل شارع علیہ السلام میں اذان اور خطبہ کے درمیان دعا کرنے کی تصریح مذکور نہیں ہے اور چوتھی حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صاف طور پر یہ فرمایا کہ امام کے منبر پر پہنچنے سے فارغ ہونے تک کوئی کلام اور نماز نہیں اور ظاہر ہے کہ کلام کا عموم دعا کو بھی شامل تو اس حدیث سے دعا کی ممانعت مستفاد ہورہی ہے اسی طرح کتب فقہ میں اس دعا کا ثبوت نہیں ملتا فقہ کی مشہور کتاب۔

درمختار میں ہے اور وہ حاوی قدسی سے ناقل ہیں۔

اذا فرغ المؤذن قام الامام۔ (ردالمحتار ج ۱ص ۵۷۷)

جب اذان کہنے والے فارغ ہوجائیں تو امام خطبہ کے لئے کھڑا ہوجائے۔

ہدایہ کے متن ہدایہ اور قدوری میں ہے:

اذا خرج الامام يوم الجمعة ترك الناس الصلاة والكلام حتى يفرغ من خطبته۔

(ہدایہ ج ۱ص ۱۵۱ جوہرہ نیرہ ج ۱ص ۵۲)

جب امام جمعہ کے دن نکلے تو لوگ نماز اور کلام چھوڑ دیں یہاں تک کہ امام اپنے خطبہ سے فارغ ہوجائے۔

جوہرہ نیرہ شرح قدوری میں اس عبارت کے تحت میں ہے:

المراد مطلق الكلام سواء كان كلام الناس اوالتسبيح او تشميت العاطس اوردالسلام في العيون المراد به اجابة المؤذن اما غيره من الكلام يكره بالاجماع۔(وفيه ايضا) قيل خلاف في كلام يتعلق بالاخرة اماالمتعلق بامور الدنيا فمكروه اجماعا وهذا كله قبل الخطبة وبعدها امام فيها فلايجوز شئ من الكلام والقرأة والذكر اصلاً۔

(جوہرہ نیرہ ج ۱ ص ۹۲)

مراد مطلق کلام ہے برابر ہے کہ لوگوں کا کلام ہو یا تسبیح ہو یا چھینکنے والے کے لئے دعا کرنا ہو یا سلام کا جواب ہو اور عیون میں ہے کہ کلام سے مراد موذن کے کلمات کا جواب دینا ہے لیکن اس کے سوا اور کلام تو وہ باجماع مکروہ ہے اور بعض نے کہا کہ فقہاء کا اختلاف اس کلام میں ہے جو آخرت سے متعلق ہو لیکن وہ کلام جو امور دنیا سے متعلق ہو تو وہ اجماعا مکروہ ہے اور یہ کل بحث خطبہ سے قبل اور بعد میں ہے لیکن خطبہ کے درمیان تو اس میں اصلا کوئی کلام اور قرات اور ذکر جائز نہیں۔

تنویر الابصار درمختار میں ہے: اذ خرج الامام من الحجرة ان کان والا فقیامه للصعود شرح المجمع فلا صلاۃ و الکلام الی تمامها۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۵۷۴)

جب امام حجرہ میں ہو اور اس سے نکلے ورنہ اس کا منبر پر خطبہ کے لئے کھڑا ہونا تو تمام خطبہ تک نہ کوئی نماز ہے اور نہ کوئی کلام۔

علامہ شامی قوله الی تمامها کے تحت میں محیط اور غایۃ البیان سے ناقل ہیں:

انها یکرهان من حین یخرج الامام الی ان یفرغ من الصلاۃ۔

(ردالمحتار ج ۱ ص ۵۷۴)

نماز اور کلام امام کے نکلنے کے وقت سے نماز سے فارغ ہونے تک مکروہ ہیں۔

ان عبارات سے یہ واضح ہو گیا کہ امام موذن کی اذان سے فارغ ہونے کے بعد ہی خطبہ کے لئے کھڑا ہو جائے تو اذان کے بعد اگر دعا ہوتی تو فقہاء کرام اس کی تصریح فرماتے لہذا ثابت ہوا کہ اذان وخطبہ کے درمیان کوئی دعا مسنون نہیں نیز متون فقہ میں یہ مسئلہ موجود ہے کہ خروج امام سے فراغت خطبہ تک کوئی کلام ونماز نہیں شارحین فرماتے ہیں کہ عین خطبہ میں تو مطلق کلام ممنوع حتی کہ قرات وذکر بھی ناجائز اب رہا خطبہ کا قبل وبعد تو اس میں کلام دنیوی تو باجماع مکروہ ہے لیکن اجابت موذن وذکر وتسبیح اور جواب سلام وغیرہ کلام اخروی انہیں بھی لفظ کلام کے عموم داخل کر کے نفی کر دیا گیا تو دعا کلام ہوئی اور کلام کا خروج امام سے فراغت نماز تک مکروہ ہونا بتصریح فقہ ثابت ہے اور یہ دعا خروج کے بعد یا کہ اذان کے بعد میں ہے تو اس دعا کا مکروہ ہونا انہیں عبارات سے ہے بلکہ اس دعا کی کراہت خود قول امام اعظم علیہ الرحمہ سے مستفاد ہے۔

مراقی الفلاح میں ہے: کان ابو حنیفة رحمة الله علیه یکره تشمیت العاطس ورد

السلام اذا خرج الامام حتی یفرغ من صلاته۔ (طحطاوی ص ۳۰۱)

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ چھینکنے والے کے لئے دعا کو اور سلام کے جواب کو خروج امام سے فراغت نماز تک مکروہ قرار دیتے تھے۔

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ جب خروج امام سے فراغت نماز تک جواب سلام مکروہ جو شرعا ضروری بھی ہے تو یہ دعا تو نہ شرعا ضروری ہے نہ سنت لہذا اس درمیان میں دعا کی کراہت کیوں نہ ہوگی خاص کر وہ وقت اجابت جس میں دعا کی بکثرت احادیث میں ترغیب ہے لیکن اس وقت میں زبان سے دعا کرنے کی اجازت نہیں صرف قلب سے دعا کرنا مسنون قرار دیا گیا۔

چنانچہ علامہ شامی اسی ساعت اجابت کے متعلق فرماتے ہیں۔

وفی هذه الساعة اقوال اصحها او من اصحها انها فیما بین ان یجلس الامام علی المنبر الی ان یقضی الصلاۃ کما هو ثابت فی صحیح مسلم عنه صلی الله تعالیٰ علیه وسلم ایضا حلیه. قال فی المعراج سن الدعا بقلبة لابلسانه لانه مامور بالسکوت۔

(ردالمحتار ج ۱ ص ۵۷۸)

ساعت اجابت میں چار اقوال ہیں اصح قول یہ ہے کہ وہ ساعت امام کے منبر پر بیٹھنے سے فراغت نماز تک کے درمیان ہے جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت سے ثابت ہے جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی حلیہ معراج میں کہا کہ دعا قلب سے مسنون ہے زبان کے ساتھ نہیں کیونکہ سکوت کا حکم کیا گیا ہے۔

تو یہ دعا جس کا ذکر احادیث میں بھی نہیں اس کو زبان سے کس طرح کیا جائے گا بالجملہ اذان ثانی کے بعد زبان سے دعا کرنے کی بلا کراہت اجازت نہ احادیث سے ثابت نہ تصریح فقہاء سے ظاہر نہ قول امام سے مستفاد اب اسکے محض رواج کو پیش کرنا کوئی دلیل شرعی نہیں رسم کو سند بنانا کسی عاقل کا کام نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۳۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

موضع بھکاری پور میں دو مسجدیں ہیں۔ ایک چھوٹی مسجد اور ایک بڑی جامع مسجد جس میں ستراسی سال سے زائد جمعہ قائم اور ہوتا آیا ہے۔ آبادی اس گاؤں کے کل مسلمان نماز جمعہ میں آجاتے ہیں تو بڑی جامع مسجد موضع بھکاری پور کی بھر جاتی ہے۔ اور کچھ مختصر نمازی مسجد کے دروازے کے باہر انتظام کے ساتھ نماز جمعہ پڑھ لیتے ہیں۔ ایسا اتفاق رمضان المبارک میں الوداع کو ہو جاتا ہے یا کثرت نمازیوں کے علاوہ رمضان المبارک کے اور زمانے میں کبھی جامع مسجد بھر جاتی ہے اور کبھی خالی رہ جاتی ہے۔ ایک جگہ نماز جمعہ ہونے میں شوکت اسلام اور اتفاق واتحاد آپس میں مسلمانوں کا ظاہر ہوتا ہے۔ ویسے تو گاؤں میں دنیاوی رنجش نا اتفاقیاں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ مگر نماز جمعہ اور عیدین ایک جگہ گاؤں کے کل مسلمان جمع ہو کر مل جل کر پڑھنے میں میل ملاپ اسلامی شان وشوکت اتفاق محبت میں بڑی ترقی تقویت ہوتی ہے، کتاب قانون شریعت بیان جمعہ میں لکھا ہے کہ جمعہ شعائر اسلام سے ہے اور جامع جماعت ہے یعنی عند المؤمنین۔ اب قریب ایک ماہ سے دوسرے چھوٹی مسجد میں جمعہ پڑھنے لگے ہیں جس میں کل اہل محلہ کا اتفاق نہیں۔ کچھ جامع مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے جاتے ہیں۔ اور بقیہ چھوٹی مسجد میں جمعہ پڑھتے ہیں۔

دریافت طلب یہ امر ہے جس میں اسلام کی شوکت گھٹتی کم ہوتی ہو اور محلہ میں سے کچھ اتفاق نہ کرتے ہوں۔ اور محلہ اور گاؤں میں اسلامی اتحاد میں فرق آتا ہو۔ اور مسلمانوں کی جماعت کے ٹکڑے ہوتے ہوں ایسی صورت میں جامع مسجد کو چھوڑ کر چھوٹی مسجد میں جمعہ پڑھ سکتے ہیں جمعہ ہو جائیگا یا نہیں؟ اور پڑھنے پڑھانے سے رک جانا چاہئے یا نہیں؟۔ دونوں مسجدوں کی تعمیر سو سال زائد کی ہیں ابھی تک چھوٹی مسجد میں امام مقرر نہیں تھا ایک ماہ ہوا امام مقرر کرنے پر جمعہ بھی قائم کرلیا ہے آبادی مردم شماری دو ہزار جس میں آٹھ سو نابالغ بچے لڑکے لڑکیاں۔ چھ سو عورتیں اور چودہ سو مرد بالغ ہیں۔ دونوں مسجدوں میں جمعہ ہو جائیگا یا نہیں؟ شرع مطہرہ سے آگاہی فرمائی جاوے۔

المستفتی مقبول احمد شاہ بھکاری پور ڈاکخانہ خاص ضلع پیلی بھیت۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ایسے موضعات میں جمعہ کی نئی جماعت قائم نہیں کی جاسکتی۔ لہذا چھوٹی مسجد میں نئی جماعت کا قائم کرنا ہی غلط ہے اور بڑی مسجد میں جب زمانہ دراز سے جمعہ کی جماعت قائم ہے تو نہ اس جمعہ کو بند کیا جائیگا اور نہ اس کی جماعت کو توڑا جائیگا اور نہ ایسے موضع میں دو جمعہ کی جماعتیں کی جائیں نہ مسلمانوں کے

اتحاد اتفاق کو ٹھیس لگائی جائے بلکہ سب لوگ صرف بڑی مسجد میں نماز جمعہ پڑھا کریں اور اس کے بعد چار رکعت فرض وقت ظہر کی ضرور پڑھا کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ المتوسل النبی المرسل العبد الارذل محمد اول بن المفتی مولینا الحاج محمد اجمل
نائب مفتی اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۷ھ
الجواب صحیح محمد اجمل غفرلہ عزوجل مفتی مدرسہ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل۔

مسئلہ (۴۳۲)

کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین نسبت مسائل کے حوالہ جات قرآن واحادیث سے جواب عنایت فرمایا جائے

کیا خطبہ جمعہ کے دوران میں اردو اشعار پڑھنا چاہئے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جائز ہے مع الکراہتہ اور خلاف سنت متوارثہ۔ ہدایہ میں ہے۔

یجوز عند العجز الا انه یصیر شیئا لمخالفة السنة المتوا رثه

تو جب عربی سے عاجز ہونے کی صورت میں بھی اردو میں خطبہ پڑھنا خلاف سنت متوارثہ ثابت ہوا تو باوجود قدرت کے اردو کے اشعار پڑھنا کیسے خلاف سنت متوارثہ نہ ہونگے۔ واللہ اعلم

کتبہ، المتوسل بالنبی المرسل العبد الارذل محمد اول بن المفتی
مولینا الحاج محمد اجمل نائب مفتی اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل
یکم جمادی الاخرہ ۱۳۷۷ھ

الجوب صحیح محمد اجمل غفرالله عز و جل بلدة سنبهل

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۳۳)

کیا فرماتے ہیں علماء دین اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) میں چنگی حسن پور میں ملازم ہوں۔ صبح ۸ بجے سے شام کے ۸ بجے تک ۱۲ گھنٹہ ڈیوٹی رہتی

ہے۔ایک مہینہ کی ڈیوٹی ایک چنگی پر رہتی ہے۔جس میں پندرہ دن رات کو ڈیوٹی دینی پڑتی ہے اور پندرہ دن دن میں کیش ہر وقت رہتا ہے، مال آتا رہتا ہے ایسی حالت میں چنگی چھوڑ کر نماز جمعہ نہیں پڑھ سکتا اس حالت میں ہر مہینہ دو یا تین جمعہ نکل جاتے ہیں۔جب کہ مولویوں کا مسئلہ ہے کہ اگر ایک جمعہ چھوٹ جائے تو یہ ہوجاتا ہے اور دوسرے پر یہ اور تیسرے پر یہ لہذا مجھے بتایا جائے کہ میرے لئے کیا حکم صادر ہوتا ہے واللہ اعلم جب ایسی حالت میں میں پابند غلام کے مانند ہوں اور میرے لئے شرعی حکم کیا ہے؟۔

(۲) محصول چنگی آرندہ مالی کو چھپا کر لیجانا اسلامی قانون کیا ہے اور ملازم چنگی کو آرندہ مال سے ملکر محصولی پیسہ بچانا کیسا حکم۔معہ حدیث اور دلائل سے بتایا جائے۔

المستفتی منشی مہربان حسن منشی عبد الرحمن لال باغ چنور

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) بلا شبہ نماز جمعہ فرض ہے اور یہ کوئی ایسی مجبوری نہیں ہے۔جس کی بنا پر جانب شرع سے ترک جمعہ کی اجازت مل سکے۔ہفتہ بھر میں صرف نماز جمعہ کے لئے کس طرح کا انتظام کیا جائے چاہے اتنے وقت کے لئے کسی کو پیسہ دیکر مقرر کیا جائے۔یا اتنے وقت کی پابندی کو مستثنی کرایا جائے ورنہ پھر ایسی ملازمت شرعا جائز نہیں جس میں ترک فرائض کرنا پڑے۔

(۲) چھپ کر مال آرندہ سے ملازم چنگی کو کوئی پیسہ حاصل کرنا ممنوع ہے اسی طرح مال آرندہ کو اپنے حال کو چھپا کر نہ لیجانا چاہئے۔فقط کارڈ میں دلائل قرآن و حدیث نہیں لکھے جاسکتے اس لئے مجبوری ہے۔یکم اگست ۱۹۵۸ء

مسئلہ (۴۳۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
کوئی شخص نماز جمعہ میں قعدہ اخیرہ میں زریک ہوا تو اس کو جمعہ کی نماز ملی یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

نماز جمعہ کے قعدہ اخیرہ میں جو شخص شامل جماعت ہوگیا وہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد صرف دو رکعت فرض جمعہ پڑھے کہ اس نے یقیناً جمعہ پالیا ہے۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۳۵)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین ان مسائل میں کہ
اذان ثانی جمعہ میں کہاں کھڑا ہو کر کہنا چاہئے؟ اور صلوۃ قبل از جماعت اور جماعت میں قد قامت الصلوۃ پر کھڑے ہونا واسطے نماز باجماعت میں۔مدلل مع حوالہ کتاب کے جواب باصواب سے سرفراز فرمایئے، بینوا توجروا

سائل، چندا میاں حیات نگر ضلع مراد آباد یوپی

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جمعہ میں اذان ثانی یعنی خطبہ کی اذان کا خارج مسجد میں ہونا حدیث شریف سے ثابت ہے۔ابو داؤد شریف میں حضرت سائب رضی اللہ عنہ سے مروی "کان یوذن بین یدی رسول اللہ ﷺ اذا جلس علی المنبر یوم الجمعۃ علی باب المسجد وابی بکر وعمر الخ"

(ابوداؤد مجتبائی ص ۱۶۲)

حدیث کا مضمون یہ ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ بروز جمعہ منبر پر تشریف فرما ہوجاتے تو دروازہ مسجد پر حضور کے سامنے اذان دیجاتی تھی اسی طرح خلافت صدیقی وفاروقی میں ہوتا رہا۔

اس حدیث شریف سے ثابت ہوگیا کہ خطبہ سے پہلے جو اذان ثانی ہوتی ہے وہ زمانہ نبوی سے برابر منبر کے مقابل دروازہ مسجد پر ہوتی رہی کسی بھی حالت میں اس کو مسجد کے اندر نہیں دیا گیا۔اور یہ ظاہر ہے کہ دروازہ مسجد خارج مسجد ہوتا ہے تو اس اذان کا مسجد سے باہر ہونا مسنون قرار پایا، اسی بنا پر فقہاء نے اذان کو مسجد کے اندر کہنا ممنوع قرار دیا۔فتاوی قاضی خاں وفتاوی عالمگیری میں ہے:

"ینبغی ان یوذن علی المئذنۃ او خارج المسجد ولا یوذن فی المسجد"

تو خطبہ سے پہلے اس اذان ثانی کا خارج مسجد میں خطیب کے سامنے ہونا حدیث شریف اور کتب فقہ سے ثابت ہوگیا۔واللہ تعالی اعلم بالصواب اذان کے بعد جو دوسرا اعلان کیا جاتا ہے اس کو تثویب کہتے ہیں بکثرت کتب فقہ میں اس تثویت کو جائز لکھا ہے لیکن اس تثویب کے لئے الفاظ خاص متعین نہیں ہیں اور صلاۃ وسلام کے الفاظ تثویب میں ۸۱ھ میں جاری ہوئے فقہاء نے انہیں جائز بلکہ

مستحسن قرار دیا۔ چنانچہ فقہ کی مشہور کتاب درمختار میں ہے:

التسلیم بعد الاذان حدث فی ربیع الاول اخر سنة سبعمائة واحدی وثمانین فی عشاء لیلة الاثنین ثم یوم الجمعة ثم بعد عشرین حدث فی الکل الا المغرب ثم فیھا مرتین وھو بدعة حسنة۔ (درمصری ج ۱ ص ۲۷۳)

تو اس عبارت سے ثابت ہوگیا کہ اذان کے کچھ دیر کے بعد قبل از جماعت صلوۃ وسلام کہنا نہ فقط جائز بلکہ مستحسن ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

قد قامت الصلوہ سے پہلے حی علی الفلاح پر مقتدیوں کو کھڑا ہونا چاہئے اور اس سے پہلے کھڑا ہو جانا مکروہ ہے فتاوی عالمگیری میں ہے:

"اذدخل الرجل عند الاقامة کرہ له الا نتظار قائما ولکن یقعد ثم یقوم اذا بلغ المؤذن قوله حی علی الفلاح کذافی المضمرات ان کان المؤذن غیر الامام وکان القوم مع الامام فی المسجد فانه یقوم الامام والقوم اذاقال المؤذن حی علی الفلاح عندعلمائنا الثلثة وھو الصحیح"۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۱۹ جمادی الاخریٰ ۷۸/ ۱۳ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ

(۴۳۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیین شرع متین مسائل ذیل کہ

(۱) آیا گاؤں میں نماز جمعہ ائمہ اربعہ کے مذہب میں پڑھنی جائز ہے یا نہیں؟۔

(۲) جس گاؤں میں نماز جمعہ پڑھی جاتی ہو آیا اس گاؤں میں ان لوگوں کو جو گاؤں میں عدم جواز جمعہ یا تساہل کی وجہ سے نماز جمعہ میں شامل نہ ہوئے ہوں واقعی جمعہ کے دن نماز ظہر کا با جماعت یا فرداً فرداً نماز جمعہ سے قبل یا بعد جامع مسجد یا دیگر مسجدوں میں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب میں پڑھنا مطلقاً حرام ہے یا کیا؟۔

(۳) مسلمانوں کو ہندو کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا کھانا یا بھرا ہوا پانی پینا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ یا دیگر ائمہ کے مذہب میں شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو آیت (انما المشرکون نجس۔الخ) کا کیا جواب؟ اگر نا جائز ہے تو کن وجوہات کی بنا پر؟۔

(۴) مسلمان قصاب کو گوشت فروخت کرنے کے لئے روزمرہ خود ذبیحہ کا ذبح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر نا جائز ہے تو کن وجوہات وواقعات کی بنا پر؟ ۔(بینوا توجروا)

(نوٹ) ہر ایک سوال کا جواب بمع وجوہات کتب معتبرہ فقہ وحدیث سے بمع ترجمہ اردو عبارت عربیہ مفصل ومدلل تحریر فرما کر مشکور فرمادیں۔ تاکہ جواب الجواب کی نوبت نہ آنے پائے۔

المرسل۔ چودہری نصر اللہ خاں طالب علم مدرسہ عربیہ حاجیوالہ

ڈاکخانہ خاص تحصیل وضلع گجرات ۴۲-۱۰-۱۶

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

(۱) حنفیہ کے نزدیک گاؤں میں جمعہ واجب نہیں، حدیث شریف میں ہے جس کو طبرانی نے اوسط میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا:

قال رسول اللہ ﷺ خمسه لا جمعة علیھم المراة والمسافر والعبدوالصبی واھل البادیة۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچ وہ شخص ہیں جن پر جمعہ نہیں، عورت، مسافر، غلام، گاؤں والے، بچے۔

ہدایہ میں ہے: لا تصح الجمعة الافی مصر جامع او فی مصلی المصرو لا تجوز فی القری لقوله علیه السلام: لا جمعة ولا تشریق ولا فطرو لا اضحی الا فی مصر جامع۔

جمعہ شہر یا اس کی عیدگاہ ہی میں صحیح ہے اور گاؤں میں جائز نہیں، حدیث شریف میں حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جمعہ اور تشریق اور فطر اور اضحیٰ شہر ہی میں ہے۔

غنیۃ شرح منیہ میں ہے:

الشرط الاول المصراوفناء ه فلا تجو ز فی القری عندنا وھو مذھب علی ابن ابی طالب وحذیفة عطاء والحسن بن ابی الحسن والنخعی ومجاھد وابن سیرین والثوری وسخنو ن خلا فا للائمه الثلثة۔

جمعہ کی پہلی شرط شہر یا فنائے شہر ہے۔ تو ہمارے نزدیک جمعہ گاؤں میں جائز نہیں اور یہی حضرت امیر المومنین علی اور حذیفہ اور عطاء اور حسن ابن ابی الحسن اور نخعی اور مجاہد اور ابن سیرین اور ثوری اور سخنون کا

مذہب ہے، ائمہ ثلثہ اس کے خلاف ہیں۔

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ حنفیہ کے نزدیک گاؤں میں جمعہ جائز نہیں اور ائمہ ثلثہ اس کے خلاف ہیں۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۲) جس گاؤں میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے تو بلحاظ مصالح دینی کے اسے بند نہ کیا جائے گا۔ کما فصلناہ فی فتاونا۔ لیکن ان لوگوں کو فرض ظہر پڑھنا ضروری ہے۔ شامی میں ناقل جواہر سے ہے:

لو صلوا فی القری لزمهم اداء الظهر "۔ اگر گاؤں میں جمعہ پڑھا تو ان پر ادائے ظہر لازم ہے۔ اب چاہے یہ لوگ فرض ظہر فردا فردا پڑھیں یا با جماعت۔

کبیری میں ہے:

ویکره للمعذورین والمسجونین اداء الظهر بجماعة فی المصر یوم الجمعة سواء کان قبل الفراغ من الجمعة او بعده لان الجمعة جامعة للجماعات فینبغی ان لا تکون جماعة غیرها فی المصر الذی هی فیه ولئلا یتطرق الی الاقتداء بهم غیرهم بخلاف اهل القری لانه لا جمعة علیه فکان هذا الیوم فی حقهم لغیره کالایام ۔

اس عبارت کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ معذورن اور قیدیون کو جمعہ کے دن نماز جمعہ سے قبل یا بعد شہر میں فرض ظہر کا با جماعت پڑھنا مکروہ ہے اور گاؤں میں فرض ظہر کا با جماعت پڑھنا مکروہ نہیں یعنی بلا کراہت جائز ہے۔

بالجملہ گاؤں میں ظہر کا پڑھنا فرض ہے چاہے کے وہ جمعہ کی جماعت میں شامل بھی ہو چکا ہو واللہ تعالی اعلم بالصواب،

(۳) آیت کریمہ " انما المشرکون نجس " کی تفسیر میں علامہ ابوالبرکات نسفی تفسیر مدارک میں فرماتے ہیں:

انهم لا ینظهرون ول یغتسلون ولا یجتنبون النجاسات فهی ملابسة لهم
(مدارک مصری ص ۹۳ ج ۲)

بیشک مشرکین طہارت نہیں کرتے اور غسل نہیں کرتے اور نجاستوں سے پرہیز نہیں کرتے تو نجاست ان کے ملابس ہوگئی یعنی وہ نجاست والے ہوئے۔

ہندوں کے پلید مزاجوں اور گندی طبیعتوں کے بھی دن رات مشاہدے ہوتے ہیں اور انکا

ستوں سے پرہیز نہ کرنا ایسی ناقابل انکار بات ہے جسکے لئے ثبوت کی کوئی حاجت نہیں۔ پھر مسلمانوں کو ان کے ہاتھوں کے پکائے ہوئے کھانے اور پانی سے کیوں نہ احتیاط کرنی چاہیے خصوصا وہ مسلمان کے ہاتوں کی چیزوں سے کمال درجے کی احتیاط کرتے ہیں اور انکا کھانا پینا کسی طرح گوارہ نہیں رکھتے تو نہایت شرم وغیرت کی بات ہے کہ مسلماں طاہر وپاک ہوکر ان ناپاکوں کے ہاتھ کی چیزیں کھائیں اور جواز کی آڑ لیکر احتیاط کی صورت مٹائیں اور بمقابلہ کفار کے اپنی اسلامی شان گھٹائیں اور اپنی بیداری وحیات کے فنا ہوجانے کی یہ شرمناک تصویر اہل دنیا کو دکھائیں۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب ۔

(۴) مسلمان قصاب کا ذبیحہ بلاشک جائز ہے۔ تنویر الابصار ودر مختار میں ہے:

شرط کون الذابح مسلما ۔ یعنی ذبح کرنے والا مسلمان ہونا شرط ہے۔

کنز الدقائق میں ہے: وحل ذبیحة مسلم۔ یعنی مسلمان کا ذبیحہ حلال وجائز ہے۔

اور اگر اس کا محتاط اور دیندار ہونا قابل اعتماد نہ ہوتو اسی بنا پر اس سے احتیاط کیجائے، تو یہ ناجائز ہو نیکی بنا پر نہیں ہے بلکہ صرف احتیاط کی بنا پر ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۳۷)

ما قولکم دام فضلکم؟ بلدة فی فنائها محطة الریل ومدرسة الانکلیزیة الکبیرة وبوسطه محطة الشرطیة (پولیس اسٹیشن) وفی قرب المحطة ارض عمر فیها عمارة علی سکونة المسافرین (مسافر خانہ) وفی تلک الارض ایضا بنی عمارة للعبادة یصلی فیها الجماعة فی کل الاوقات مع جم غفیر من الطلباء الانکلیزیة وهم خمسة وعشرون بعد المأة وهذه العمارة لیس فیها محراب العرفی ولا المنبر العرفی بل یفرش للامام خاصة مصلی ولا یرفع الاعند التنظیف فهل یجوز ان تقام الجمعة فی البقعة المذکورة ام ل؟! فصلوا فی الجواب وفصلوا فی الثواب۔

هل یحصل الفضیلة فی تلک البقعة مع الکمال ام ل؟! فما ذا یفعل لتحصیل الفضیلة الکاملة والارض والعمارات موقوفة فهل یجوز ان تجعل تلک العمارة مسجدا حقیقیا ام لا؟ بینوا توجروا ۔ المستفتی مولوی احمد الملی باری ۲۶ رجب المرجب ۱۳۶۲ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

شرط صحۃ الجمعۃ ان یکون المصر وفناء ہ وصرح بالمصر فی تحفۃ الفقہاء عن ابی حنیفۃ علیہ الرحمۃ انہ بلدۃ کبیرۃ فیہا سکک واسواق ولہا رساتیق وفیہا وال یقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمہ وعلمہ اوعلم غیرہ یرجع الناس الیہ فیما یقع من الحوادث وھذا ھوالاصح کما فی الغنیۃ والعینی والشامی وغیرھم وصرح العینی شرط ادائہا ای اداء صلوٰۃ الجمعۃ المصرفلا تجوز فی القری ولا مفازۃ، یقول علی رضی اللہ تعالی عنہ: لا جمعۃ ولا تشریق ولا صلوٰۃ فطرولا اضحی الافی مصر جامع فان صدق علی ھذہ البلدۃ حد المصر بتمامہا تقام الجمعۃ فیہا وفی فنائہا ولا یلزم فی فناء المصران یکون مسجد او اذاکانت ھذہ البقعۃ فناء المصر یحصل فضیلۃ الجمعۃ فیہا۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۳۸)

علمائے دین اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں کہ
جامع مسجد کو خالی رکھ کر قرب وجوار کی مسجدوں میں نماز جمعہ ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟
نیز خصوصا ان مساجد میں جہاں پر کہ جامع مسجد کی اذان وقرات اچھی طرح سنتے ہیں نیز جامع مسجد شہریوں کیلئے کافی گنجان ہے براۓ کرم اس بارے میں فتوے صادر فرما کر مشکور فرمادیں کہ تعدد جمعہ جائز ہو کر بھی قرب وجوار کی مساجد میں نماز جمعہ ادا کرکے مسجد جامع کو خالی رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفیان مسلمانان قصبہ اسلام آباد کشمیر بذریعہ واعظ جلدم محمد وطاہر وپردیشی۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

علاوہ جامع مسجد کے اور مساجد میں جواز جمعہ میں تو کوئی شک ہی نہیں ہوسکتا کہ تعدد جمعہ کا

مفتی بہ ہے۔ درمختار میں ہے۔ تودی الجمعۃ فی مصرواحد بمواضع کثیرۃ مطلقاعلی المذھب وعلیہ الفتوی۔ (ردالمحتار ص ۵۶۵ ج ۱)

اور جامع مسجد میں جمعہ کا ادا کرنا افضل واولی ہے۔ چنانچہ الاشباہ والنظائر میں ہے۔
اعظم المساجد حرمۃ المسجد الحرام ثم مسجد المدینۃ ثم مسجد بیت المقدس ثم الجوامع ثم مساجد المحال۔ (اشباہ ص ۵۶۱)

غنیۃ میں ہے: والافضل ھو الجامع الواحد وذلک للخروج من الخلاف الخروج من العھدۃ بیقین۔

اور ردالمحتار میں ہے: والحاصل ان بعدالقدس الجوامع ای المساجد الکبیرۃ الجامعۃ للجماعۃ الکثیرۃ لکن الاقدم منہا افضل۔ (درالمحتار ص ۴۶۴ ج ۱)

لہذا قرب وجوار کی مساجد میں جمعہ پڑھنا خلاف اولے اور ترک افضل ہے بلکہ حق جامع مسجد کو باطل کرنا ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۳۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ان مسائل میں

(۱) ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام؟۔

(۲) ہندوستان میں جمعہ فرض ہے یا نہیں؟۔

(۳) ایک امام جمعہ کی نماز بہ نیت نفل پڑھائے تو کیا مقتدیوں کی نماز جمعہ جو بہ نیت فرض پڑھتے ہیں ادا ہو جائیگی یا نہیں؟ اور جن مقتدیوں نے اس کے پیچھے جمعہ پڑھا ہے ان کے ذمہ سے فرض وقت یعنی فرض ظہر ساقط ہوگیا یا نہیں؟۔

(۴) جمعہ کے فرض کے بعد جو چار رکعت سنت پڑھتے یہ جناب رسول اقدس ﷺ سے مروی ہیں یا زمانہ اقدس کے بعد علماء نے ایجاد کئے ہیں؟۔ بینوا توجروا۔

الجواب

(۱) ہندوستان ہمارے امام اعظم ابوحنیفہ وامام ابویوسف وامام محمد رحمہم اللہ تعالی کے مذہب کی تصریحات کی بنا پر ہرگز ہرگز دارالحرب نہیں ہے بلکہ دارالاسلام ہے۔ فتاوے عالمگیری میں ہے:

اعلم ان دارالحرب تصیر دارالاسلام بشرط واحد وھو اظھار حکم الاسلام فیھا قال محمد فی الزیادات: انما تصیر دار الاسلام دارالحرب عند ابی حنیفۃ بشروط ثلاثۃ۔ احدھما اجراء احکام الکفار علی سبیل الاشتھار وان لا یحکم فیھا بحکم الاسلام۔ والثانی ان تکون متصلۃ بدار الحرب لا یتخلل بینھما بلد من بلاد الاسلام الثالث ان لا یبقی فیھا مومن ولا ذمی آمنا بامانہ الاولی الخ۔
(عالمگیری ص۲۶۹ ج۲)

جانو کہ دارالحرب ایک شرط سے دارالاسلام ہوجاتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں اسلام کے احکام علانیہ طور پر جاری ہوں۔ امام محمد نے زیادات میں فرمایا کہ امام اعظم کے نزدیک دارالاسلام کے دارالحرب ہوجانیکی تین شرطیں ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں احکام کفار علانیہ طور پر جاری ہوں اور احکام اسلام مطلقاً نہ جاری ہوں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ یہ دارالحرب دوسرے دارالحرب سے ایسا متصل ہو کہ ان کے درمیان بلاد اسلامیہ میں سے کوئی شہر نہ ہو۔ تیسری شرط یہ ہے کہ اس میں کوئی مسلمان اور ذمی اسلام کی اپنی پہلی امان پر باقی نہ ہو۔

مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں ہے:

دارالحرب تصیر دارالاسلام باجراء احکام الاسلام فیھا کاقامۃ الجمعۃ والاعیاد وان بقی فیھا کافر اصلی وان لم یتصل بدار الاسلام (مجمع الانہر مصری ص۶۵۹ ج۱)

دارالحرب میں جمعہ اور عید قائم کرنیکا احکام اسلام جاری ہوجانے کی بنا پر وہ دارالاسلام ہوجاتا ہے اگرچہ اس میں کفار باقی رہ جائیں اور وہ دارالاسلام سے نہ ملے۔

درمختار وتنویر الابصار میں ہے:

دارالحرب تصیر دارالاسلام باجراء احکام اہل الاسلام فیھا کجمعۃ وعید وان بقی فیھا کافر اصلی وان لم تتصل بدار الاسلام (شامی مصری ص۲۶۱ ج۳)

دارالحرب میں جب احکام مسلمین جاری ہوجائیں تو وہ دارالاسلام ہوجاتا ہے اگرچہ اس میں کافر اصلی باقی رہیں اگرچہ وہ دارالاسلام سے متصل نہ ہو۔

علامہ شامی طحطاوی سے ناقل ہیں:

لو اقرت احکام المسلمین واحکام اھل الشرك لا تکون دار حرب
(ردالمحتار مصری ص۲۶۱ ج۳)

اگر کہیں احکام مسلمین اور احکام مشرکین دونوں جاری ہوں تو وہ دارالحرب نہ ہوگا۔

ان عبارات سے آفتاب کی طرح روشن ہوگیا کہ جب ہندوستان میں مسلمان جمعہ وعیدین۔ اذان واقامت۔ نماز باجماعت وغیرہ احکام اسلام علی الاعلان ادا کرتے ہیں اور ہندوستان کو اور کوئی دارالحرب احاطہ نہیں کررہا ہے بلکہ دو جانبیں بلاد اسلامیہ سے متصل ہیں تو یہ دارالحرب کس طرح قرار دیا جاسکتا ہے۔ اب باقی رہا یہ شبہ کہ اس میں احکام مشرکین بھی جاری ہیں تو اس شبہ کو طحطاوی کی عبارت نے صاف کردیا کہ جہاں احکام مسلمین اور احکام مشرکین دونوں جاری ہوں تو وہ دارالحرب نہیں۔ لہذا اب باوجود ان عبارات کے ہندوستان کو دارالاسلام نہ کہنا اقوال ائمہ کی مخالفت ہے اور تصریحات فقہا سے انکار ہے اور اپنی عقل وفہم کی دین میں مداخلت ہے۔ مولی تعالے قبول حق کی توفیق عطا فرمائے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۲) بلاشبہ جمعہ فرض ہے۔ مراقی الفلاح میں ہے:

صلوٰۃ الجمعہ فرض عین بالکتاب والسنۃ والاجمع (طحطاوی مصری ص۲۹۱)

قرآن اور حدیث اور اجماع سے نماز جمعہ فرض عین ہے۔

اب باقی رہا یہ عذر کہ جمعہ پڑھنے کیلئے بادشاہ کا ہونا شرط ہے اور ہندوستان میں بادشاہ اسلام نہیں ہے بلکہ کفار کی حکومت ہے تو جمعہ کی شرط ہی نہیں پائی جاتی۔ لہذا جمعہ فرض ہی نہیں ہوا۔ اس عذر کا جواب کتابوں میں موجود ہے کہ جہاں بادشاہ اسلام نہ ہو اور کفار کی حکومت ہو تو وہاں مسلمانوں کو جمعہ وعید قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ طحطاوی میں مجمع الفتاوے سے ناقل ہیں:

غلب علی المسلمین ولاۃ الکفار یجوز للمسلمین اقامہ الجمع والاعیاد
(طحطاوی مصری ص۲۹۴)

کفار کے والی مسلمانوں پر غالب آگئے تو مسلمانوں کیلئے عیدوں اور جمعوں کا قائم کرنا جائز ہے،

فتاوی عالمگیری میں ہے: بلاد علیھا ولاۃ الکفار یجوز للمسلمین اقامۃ الجمعۃ۔
(عالمگیری ص۷۵ ج۲)

جن شہروں پر کفار کے احکام ہوں تو مسلمانوں کو جمعہ کا قائم کرنا جائز ہے۔

ردالمحتار میں ہے: اما فی البلاد علیها ولاۃ الکفار فیجوز للمسلمین اقامة الجمع والعیاد (ردالمحتار مصری ص ۲۶۱ ج ۳)

احکام کفار جن شہروں میں مسلط ہوں تو اہل اسلام کیلئے عیدوں اور جمعوں کا قائم کرنا جائز ہے۔

صاحب درمختار شرح ملتقی میں فرماتے ہیں:

اذالم یکن احد من ذکر (ای من السلطان و نائبه) فللناس ان یجتمعوا علی واحد یصلی بهم للضرورة (شرح ملتقی ص ۵۶۵ ج ۱)

جب بادشاہ اسلام اور اس کے نائب میں سے کوئی موجود نہ ہو تو ضرورۃ لوگ ایک شخص پر اتفاق کرلیں کہ وہ انہیں نماز جمعہ پڑھائے۔

غنیۃ شرح منیہ میں ہے:

فان لم یکن احد من هو لاء (ای السلطان و نائبه) فاجتمع الناس علی واحد فصلی بهم جاز۔ (غنیۃ مطبوعہ لکھنو ص ۵۱۳)

بادشاہ اسلام اور اس کے نائب میں سے جب کوئی نہ ہو تو لوگ ایک شخص پر اتفاق کرلیں اور وہ انہیں نماز جمعہ پڑھائے تو جائز ہے۔

ان عبارت سے صاف یہ نتیجہ نکل آیا کہ ہندوستان میں اگر چہ کفار کی حکومت ہے اور بادشاہ اسلام نہیں لیکن جمعہ کی صحت کیلئے اسقدر کافی ہے کہ مسلمان جمعہ وعیدیں قائم کرتے ہیں اور ایک شخص کو امام مقرر کرتے ہیں ۔ لہذا ہندوستان میں جمعہ کا فرض ہونا ثابت ہوا اور ادائے جمعہ سے نماز ظہر کی فرضیت ساقط ہوگئی۔ اور اب کسی کا جمعہ کو نفل قرار دینا ان تصریحات فقہ کی مخالفت اور سخت نادانی وجہالت ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۳) جو امام شہروں میں نماز جمعہ بہ نیت نفل پڑھتا ہے وہ سخت غلطی کا مرتکب ہے۔ پہلی غلطی یہ ہے نفل کی جماعت قائم کرتا ہے اور نفل کی جماعت ناجائز ہے۔ ردالمحتار میں ہے۔ "النفل بجماعة وهو غیر جائز۔ (ردالمحتار ص ۵۶۶ ج ۱)

دوسری غلطی یہ ہے کہ وہ فرض پڑھنے والوں کی امامت کرتا ہے باوجودیکہ مسئلہ یہ ہے کہ فرض پڑھنے والا نفل پڑھنے والے کی اقتدا نہیں کرسکتا۔

غنیۃ میں ہے۔ ص ۴۸۱، لا یقتدی المفترض بالمتنفل۔

ملتقی میں ہے۔ ص ۱۱۱، وفسد اقتداء مفترض بمتنفل۔

عالمگیری میں ہے۔ ص ۴۴، لا اقتداء مفترض بالمتنفل۔

تیسری غلطی یہ ہے کہ جب اس کے نزدیک جمعہ فرض نہیں تو وہ فرض وقت یعنی ظہر کو جماعت سے کیوں نہیں پڑھتا۔ جیسے قریہ جات میں نماز ظہر کا باجماعت پڑھنے کا حکم ہے۔

چنانچہ عالمگیری ص ۷۵ میں ہے۔ من لا تجب علیهم الجمعة من اهل القری والبوادی لهم ان یصلی الظهر بجماعة یوم الجمعة باذان واقامة۔

بالجملہ فقہائے کرام نے تو عوام کے لئے بعد جمعہ آخر الظہر کی چار رکعتیں پڑھنے کو اسلئے فساد عظیم قرار دیا کہ وہ لوگ جمعہ کی ادائیگی میں سستی اور کسل کرینگے اور جمعہ کے فرض نہ ہونے کا اعتقاد کرلیں گے،

چنانچہ طحطاوی ص ۴۵۴ میں ہے:

وفی فعل الاربع مفسدة عظیمة و هی اعتقاد ان الجمعة لیست فرضا لما یشاهدون من صلوة الظهر فیتکاسلون عن اداء الجمعة او اعتقادهم افتراض الجمعة والظهر بعدها۔

اور یہ امام تصریحات فقہ کے خلاف بغیر کسی دلیل کے محض اپنی ناقص فہم سے جمعہ کی فرضیت ہی کا انکار کرتا ہے تو یہ تو بہت زبردست فساد پیدا کرتا ہے اور مقتدیوں کی نماز کو فاسد کررہا ہے۔ لھذا اس امام کا یہ فعل نہایت مذموم ہے اور ان مقتدیوں کی نماز جو جمعہ بہ نیت فرض پڑھتے ہیں اس امام کے پیچھے ہرگز ادا نہیں ہوتی کہ یہ اقتدا فاسد ہے اور انکا فریضہ وقت ان کے ذمہ سے ساقط نہیں ہوتا بلکہ اس امام کے پیچھے باوجود اس اعتقاد کے ان لوگوں نے جس قدر جمعے پڑھے ہیں انکا حساب لگا کر اسی قدر قضائے ظہر پڑھنا ان کے ذمہ فرض ہے واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۴) بعد جمعہ جو چار رکعتیں بہ نیت سنت پڑھی جاتی ہیں یہ واقعی سنت رسول ﷺ ہیں اور حدیث شریف سے ثابت ہیں۔

مسلم شریف وابن ماجہ وبیہقی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیه وسلم: اذا صلیتم بعد الجمعة فصلوا ها اربعا،

نیز ترمذی شریف ومسلم شریف ودارمی وبیہقی میں ہے:

من کان منکم مصلیا بعد الجمعة فیصلی اربعا "یعنی جو تم میں جمعہ کے بعد نماز پڑھے چار رکعتیں پڑھے۔

طبرانی اوسط میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی:

کان رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم یصلی قبل الجمعه اربعا و بعدها اربعا"

یعنی رسول اللہ ﷺ سے پہلے چار رکعتیں پڑھتے اور بعد میں چار رکعتیں پڑھتے۔

ان احادیث سے ثابت ہوگیا کہ جمعہ کے بعد چار رکعتوں کا پڑھنا حدیث قولی و فعلی دونوں سے ثابت ہے۔ تو انہیں جو سنت نہ کہے وہ سخت جاہل اور دین سے ناواقف ہے واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۴۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین صورت مسئولہ میں کہ

موضع اٹواں بازار میں تقریباً ساٹھ گھر مسلمانوں کے آباد ہیں اور اطراف و جوانب کے مواضعات میں جہاں مسلمان آباد ہیں یہاں مسلمانوں کی آبادی نسبتاً زیادہ ہے۔ بقائے حیات کا ضروری اشیاء یہاں بروقت مل جاتی ہیں اور ہر طرح کے ہنرمندوں اور پیشہ وروں کے لئے یہاں کسب معاش کی آسانیاں ہیں۔ زمانہ دراز نا یادگار سے یہاں عیدین اور جمعہ کی نمازیں ہوا کرتی ہیں، اور اطراف و جوانب کے مواضعات سے مسلمانان عیدین اور جمعہ کی نمازیں پڑھنے آیا کرتے ہیں، اب موضع بہٹیا میں جو موضع اٹواں بازار سے بالکل ملحق ہے اور جہاں کل بارہ گھر مسلمان ہیں ایک نوتعمیر کھپریل پوش مکان میں جو اسکول کے نام سے تعمیر کیا گیا تھا ایک امسال عید الفطر کے موقع پر اس بستی کے باشندوں نے جو نماز اور طہارت کے مسائل میں مہارت تامہ نہیں رکھتے ملت بیضائے اسلامیہ کی یکجہتی و اجتماعیت کو پاش پاش کر کے جماعت اسلامیہ میں افتراق و انتشار کی صورت پیدا کردی، اور نماز عید موضع بہٹا میں پڑھی، بعد ازیں جمعہ بھی قایم کرلیا، اور اپنے اقربا اور ملنے جلنے والوں کو اٹواں بازار کی مسجد کی بجائے بہٹا کی نوتعمیر عمارت میں نماز عیدین اور جمعہ ادا کرنے کی فہمائش شروع کردی۔

موضع اٹواں بازار میں جمعہ کو ہاٹ لگتی ہے، اطراف و جوانب کے علاوہ دور دور کے کاروباری مسلمان خرید و فروخت کی غرض سے اٹواں بازار آیا جایا کرتے ہیں جس سے مسجد میں بہت اچھی

جماعت ہو جایا کرتی تھی، اب موضع بہٹا کے باشندوں کے اس طرز عمل سے اٹوان بازار کی مسجد اور جماعت کو شدید نقصان پہونچا ہے اور مسلمانوں میں افتراق و انتشار بھی رونما ہوگیا ہے۔

اندریں حالات موضع بہٹیا مذکور میں عیدین و جمعہ کی نمازیں پڑھنی اور قائم کرنا کتاب و سنت کے موافق ہے یا مخالف جواب باصواب دیکر عنداللہ ماجور ہوں۔

نیز یہ بھی ارقام فرمائیں کہ "ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعدما جاء هم البینات واولئك لهم عذاب عظیم۔"

کا منشور خداوندی اور نص قطعی ہوتے ہوئے جو لوگ اسلامی برادری اور اجتماعیت کے خلاف عام مسلمانوں کو قبائلی جماعت بندی کی تعلیم دیکر اور حمایت کرکے جماعت اسلامیہ میں انتشار و افتراق پیدا کرتے ہیں انہیں شریعت حقہ کی روشنی مین نیکوکار اور مصلح قوم سمجھا جائے یا گمراہ کن۔ ہر ایک سوال کا جواب بصواب دیکر مسلمانوں کو افتراق و انتشار اور بے جا جماعت بندی سے بچائیں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی ارقام فرمائیں کہ اسلامی اجتماعیت اور اسلامی برادری کے ہوتے ہوئے نسلی اور قبائلی جماعت بندی رائج کرکے مسلمانوں میں افتراق و تشتت پیدا کرنا کیسا ہے؟ جائز ہے یا ناجائز؟ اور اسکی تلقین و ہدایت کرنے والا شریعت کی اصطلاح میں کیا ہے؟۔

والسلام محمد واصل پیش امام جامع مسجد اٹوان ڈاکخانہ لکھئے پور (ضلع گیا)

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

مواضعات میں جمعہ وعیدین کی جدید جماعت قائم کرنے کے شریعت اجازت ہی نہیں دیتی۔

حدیث شریف میں ہے:

لا جمعة ولا تشریق ولا صلوة فطر ولا اضحی الا فی مصر جامع او مدینة عظیمة۔

یعنی سوائے شہر جامع اور بڑے قصبہ کے اور کہیں جمعہ اور تشریق اور نماز عید الفطر و عید الاضحی نہیں ہوتی۔

اس سے ثابت ہوگیا کہ جمعہ وعیدین کے ادا ہونے کے لئے شہر یا بڑے قصبہ کا ہونا ضروری ہے۔ تو مواضعات میں جمعہ وعیدین ادا نہیں ہوتے۔ اسی بنا پر جمعہ وعیدین کی نمازوں کی جماعت مواضعات میں قائم کرنا غیر مشروع ہے۔ البتہ جس موضع میں زمانہ دراز سے جمعہ وعیدین کی نمازیں ہوتی

چلی آرہی ہیں اس میں جمعہ وعیدین کی جماعت کو بسبب دینی مصالح کے ہرگز ہرگز بند نہیں کیا جائے
۔اوران لوگوں کو بعد میں فرض ظہر کی چار رکعتوں کے پڑھنے کا حکم دیا جائے گا کہ ان پر ظہر کا پڑھنا فرض
ہے۔علامہ شامی ردالمحتار میں جواہر سے ناقل ہیں:

لو صلوا فی القری لزمهم اداء الظهر۔ (ردالمحتار مصری۔ص ۵۶۰ ج۱)

اگر گاؤں میں جمعہ کی نماز پڑھیں تو انہیں فرض ظہر کا ادا کرنا لازم ہے۔اور ظہر کے ادا کرنے کی
صورت یہ ہے جسکو علامہ خیرالدین رملی نے تحریر فرمایا۔

فتاوے خیریہ میں ہے:

والا حتیاط فی القری ان یصلی السنة اربعاثم الجمعة ثم ینوی اربعا سنة الجمعة
ثم یصلی الظهر ثم یصلی رکعین سنة الوقت فهذا هو الصحیح المختار۔

(فتاوی خیریہ مصری ص ۱۲ ج۱)

گاؤں میں احتیاط یہ ہے کہ پہلے چار رکعت سنت کی پڑھے پھر جمعہ پڑھے پھر چار رکعت سنت
جمعہ کی نیت کر کے پڑھے پھر فرض ظہر پڑھے پھر دو رکعتیں سنت وقت کی پڑھے، یہی قول صحیح مختار ہے۔

الحاصل صورت مسئولہ میں جب موضع اٹواں میں زمانہ دراز سے جمعہ وعیدین کی نمازیں ہوتی
چلی آرہی ہیں۔تو اس موضع اٹواں میں جمعہ وعیدین کو بند نہیں کیا جاسکتا۔لیکن وہ موضع بیٹیا جو موضع اٹواں
کے ملحق اور قریب ہے اس میں اب جدید جماعت قائم کرنے کی جرات نہیں کرنی چاہیے اور خاص کر جب
اس جماعت کے قائم کرنے سے نئی ٹولیاں بن جانے کا خوف ہے پھر تو انہیں موضع بیٹیا میں جمعہ وعیدین
کی جدید جماعت قائم کرنا حرام وگناہ عظیم ہے۔مولے تعالی انہیں قبول حق کی توفیق دے اور اختلاف
بین المسلمین کے شر سے محفوظ رکھے اور ان میں محبت ووداد اور اتفاق واتحاد کی لہر پیدا کرے۔واللہ تعالی
اعلم بالصواب۔۶رصفر المظفر ۱۳۷۲ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۴۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
زید کہتا ہے کہ خطبہ کا اردو میں ترجمہ کرنا اس مطلب سے کہ نمازیوں کی سمجھ میں آجائے جائز

ہے۔بکر یہ کہتا ہے کہ خطبہ نماز کا حکم رکھتا ہے اور اردو میں ترجمہ کرنا ناجائز ہے۔کیونکہ نماز اللہ تعالی سے
گفتگو ہے تو اللہ تعالی کی زبان مبارک عربی ہے تو اللہ تعالی کے دربار مقدس میں اردو بولنا گویا سخت گستاخی
ہے۔لوگ کہتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں کیسے آئے تو نیازمند کو تسکین بخش جواب مرحمت فرمایا جائے۔اور جو
لوگ کہتے ہیں کہ نیت نمازیوں کی اردو میں کہی جاتی ہے تو یہ نیت نماز کے اندر ہے یا باہر؟

المستفتی کفش بردار آستانہ عالیہ رضویہ قادریہ محمد حنیف ورئیس احمد رضوی قادری
۳ر ربیع الثانی ۷۲ھ

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

زید کا خطبہ کو اردو میں مطلقا جائز کہنا خلاف تحقیق اور غلط ہے۔

ھدایہ میں ہے: الخطبة و التشهد علی هذا الخلاف۔

اور بکر کی اتنی بات تو صحیح ہے کہ اکثر امور میں خطبہ نماز کا حکم رکھتا ہے۔

درمختار میں ہے: کل ما حرم فی الصلوة حرم فیها ای الخطبة۔

لیکن بکر کا یہ قول (کہ خطبہ کا اردو میں پڑھنا ناجائز ہے) صحیح نہیں کہ خطبہ کا غیر عربی میں پڑھنا
جائز مع الکراھۃ اور خلاف سنت متوارثہ ہے۔

ہدایہ میں ہے: یجوز عند العجز الا انه یصیر مسیئا لمخالفة السنة المتوارثة۔

جب عربی سے عاجز ہونے کی صورت میں بھی اردو میں خطبہ پڑھنا خلاف سنت متوارثہ ثابت
ہوا تو غیر عاجز کا اردو میں خطبہ پڑھنا بدرجہ اولی سنت متوارثہ کے خلاف ثابت ہوا۔اسی طرح بکر کی یہ
بات بھی غلط ہے کہ اللہ تعالی کی زبان مبارک عربی ہے۔اسلئے کہ پہلی کتب آسمانی عربی میں کہاں تھیں تو
صرف عربی کو اللہ تعالی کی زبان بتانا بھی غلط ہے۔(ہاں عربی اللہ تعالی کے محبوب نبی کریم صلی اللہ تعالی
علیہ وسلم کی زبان ہے۔اہل جنت کی زبان ہے۔اسی طرح بکر کی یہ بات بھی غلط ہے کہ اللہ کے دربار میں
اردو بولنا سخت گستاخی ہے۔

کتب فقہ میں ہے: ردالمحتار کی یہ عبارت ہے:

واللہ تعالی لا یحب غیر العربیة ولهذا کان الدعاء بالعربیة اقرب الی الاجابة فلا یقع
غیرها من الالسن فی الرضا والمحبة لها موقع کلام العرب۔

اس عبارت سے عربی زبان کا اللہ تعالیٰ کی زبان محبوب وپسندیدہ ہونا ثابت ہوا نہ کہ غیر عربی زبان میں دربار الٰہی میں بولنا سخت گستاخی ہو۔

اب باقی رہا یہ عذر کہ عربی سمجھ میں کیسے آئے۔ تو یہ خاص خطبہ ہی میں نہیں بلکہ کل نماز عربی میں ہے تو کیا اس عذر کی بنا پر نماز بھی اردو میں پڑھ لی جائے گی۔ درحقیقت خطبہ ونماز عبادت ہیں اور عبادت کا سمجھ میں آنا ضروری نہیں۔ اور سمجھ میں نہ آنے کا اگر احساس ہے تو عربی زبان کو سیکھا جائے کہ عربی میں مسلمان کے مذہبی ضروریات ہیں۔ غور کیجئے بلکہ قرآن کریم عربی میں ہے۔ تفاسیر عربی میں۔ احادیث عربی میں۔ عقائد اسلام عربی میں۔ احکام شرع فقہ عربی میں۔ کتب سیر عربی میں۔

مسلمان جب دنیوی ضروریات کے لئے انگریزی، ہندی زبان سیکھتا ہے تو اس ضرورت کی اس کی نظر میں اس قدر اہمیت بھی نہیں۔

اب باقی رہا اردو میں نماز کی نیت کرنا تو یہ عوام کیلئے جائز ہے۔ اور نیت کا زبان سے کرنا ضروری نہیں بلکہ نیت کرنا حقیقۃ دل کا کام ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ نیت نماز سے خارج ہے۔ اب رہی یہ بات کہ فلاں مولانا صاحب خطبہ کا ترجمہ اردو کرتے ہیں تو وہ اپنے فعل کے ذمہ دار ہیں۔ ان کا فعل کوئی دلیل شرع نہیں۔ ہم نے جب کتب فقہ سے خطبہ کا اردو میں پڑھنا خلاف سنت متوارثہ ثابت کردیا تو ان کا فعل سنت متوارثہ ثابت نہیں کرسکتا ہے کہ زمانہ اقدس سے صحابہ وتابعین ائمہ مجتہدین سلف وخلف سے غیر عربی میں خطبہ پڑھنا ثابت نہیں۔ بہار شریعت میں جو بعد نماز جمعہ کے خطبہ سنوانا مستحب لکھا ہے یہ صحیح ہے اور درمختار کی عربی عبارت کا ترجمہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔　۲۰ر جمادی الاول ۷۲ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۴۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ذیل کے مسائل میں کہ
جمعہ کو جس شخص کو دوسری رکعت کا رکوع بھی نہ ملے یا صرف قعدۂ اخیرہ ملے تو اس کی نماز جمعہ ادا ہوگی یا نہیں؟۔ ایک شخص نے فقیر سے دریافت کیا تھا کہ دوسری رکعت کا رکوع جمعہ کی نماز میں امام کے پیچھے نہ ملا تو نماز جمعہ ہوئی یا نہیں۔ فقیر نے بتایا ہو جائے گی۔ پھر اس نے کتاب طریق احمدی حصہ اول دکھایا۔ شروع کا ورق نہ تھا مصنف کا نام معلوم نہ ہوا اس میں تھا کہ جس کو امام کے پیچھے نماز جمعہ میں ایک

رکعت نہ ملے وہ بعد کو پوری کرلے۔ اور جس کو امام کے پیچھے ایک رکعت بھی پوری نہ ملے تو وہ ظہر کی نماز پڑھے۔ فقیر کی سمجھ میں نہ آیا شرعا جو حکم ہو صادر فرمایا جائے؟۔ بینوا توجروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جمعہ کی جماعت میں کسی کو اگر صرف قعدہ اخیرہ ہی امام کیساتھ مل سکا تو اس نے فضل جماعت کو پالیا تو پھر اسکا جمعہ بھی ادا ہوگیا یہی قول معتمد ومفتی بہ ہے۔ طریق احمدی کے قول کا ضعف خود اس سے ظاہر ہوگیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم　نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۴۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ذیل کے مسائل میں کہ

(۱) ہمارے ملک گجرات میں دعائے ثانی سنت ونوافل (یعنی نماز پوری کر لینے کے بعد) اوسط آواز سے پڑھتے ہیں۔ ان کے دعا مانگنے سے دیگر مصلیوں کی نماز میں کوئی خلل نہیں آتا، اور مقتدی آمین کہتے ہیں۔ اخیر میں فاتحہ کا اعلان امام کرتے ہیں، اور سب فاتحہ پڑھ لیتے ہیں، پھر امام صاحب وسلموا تسلیما کی آیت پڑھتے ہیں اور سب لوگ درود شریف پڑھتے ہیں، پھر امام صاحب سبحان ربک پورا پڑھکر ختم کرتے ہیں۔ یہ طریقہ مستحسن ہمیشہ سے برابر چلا آرہا ہے۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جمعہ کی اذان کے بعد فورا تحیۃ الوضو پڑھ کر چند آدمی باری باری بلا آواز سے سورۂ کہف پڑھتے ہیں، اور اس خیال سے جو لوگ نہ پڑھے ہوں وہ بھی شریک ثواب ہیں باقی لوگ خاموش ہوکر سنتے ہیں سورہ کہف پڑھے جانے کے بعد فاتحہ خوانی ہوتی ہے پھر سب لوگ سنتیں پڑھتے ہیں، پھر امام خطبہ پڑھتا ہے۔ یہ طریقہ مستحسنہ بھی ہمیشہ سے چلا آرہا ہے۔ عوام کو بھی اسی معمول سے خبر ہے۔

(۳) یہاں پنجگانہ نماز کے بعد امام اور مقتدی آپس میں مصافحہ کرتے ہیں، چند آدمی اس پر بھی معترض ہیں کیا یہ فعل جائز ہے؟۔

(۴) مزرات اولیا کی آستانہ بوسی وتبرکات کا بزرگان دین کا بوسہ دینا اور بزرگان دین کی قدم بوسی وغیرہ کے متعلق کیا حکم ہے اور شریعت حقہ کے کیا دلائل ہیں؟۔

(۵) گجرات میں عام طور سے سنیوں میں یہ رواج ہے کہ جمعہ کا پہلا خطبہ کچھ عربی پڑھتے ہیں اور اردو پھر خطبے ثانیہ عربی میں پڑھتے ہیں۔ رواج ایسے زور پکڑے ہوئے ہے کہ اگر کوئی امام ایسا نہ کرے تو اس کے لئے مصیبت ہے ملازمت جاے عوام میں فتنہ فساد برپا ہو، اسطرف زیادہ تر عوام پیران طریقت وقاضی صاحبان کے کہنے پر چلتے ہیں، یہ حضرات بھی مذکورہ بالا طور پر خطبہ پڑھنے پر زور دیتے ہیں، علاوہ ازیں چند فتاوے جواز اردو کے متعلق آچکے ہیں، جواز کے استدلال میں منقول ہے وہ یہ ہیں،

آیۃ کریمہ۔ و ما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ۔ و ارسلنک کافۃ للناس بشیرا ونذیرا۔۔

و کما قال فی در المختار۔ صح لو شرع فی غیر عربیۃ ای لسان کان و شرطا عجزہ و علی ھذا الخلاف الخطبۃ و ایضا فیہ والا مربالسعی الی الذکر لیس الا استماع و فی العید ویعلم الناس فیھا ای فی الخطبۃ عید الفطر من لم یودھا ینفی تعلیمھم فی الجمعۃ التی قبلھا لیخرجوھا فی محلھا و ھکذا کل حکم احتیج الیہ لان الخطبۃ شرعت للتعلیم فافھم انتھی ۔، کما فی السراجیۃ اذا لم یکن المفتی مجتھدا فالاصح انہ یفتی بقول الامام۔وفی التجنیس الواجب عندی ان یفتی علی قول ابی حنیفۃ علی کل حال والحاصل انہ لا یرجح قول صاحبیہ او احدھما علی قول الامام الا بموجب عن ضعف دلیل او ضرورۃاو تعامل او اختلاف لسان وفی السراجیۃولو خطب بالفارسیۃیجوز۔

جواہراخلاطی میں ہے۔ ولو کبر بالفارسیۃاو بای لسان کان وھو یحسن العربیۃ اولا جاز بالاتفاق۔

غیاث المفتین میں ہے ۔لا یجوز صلوۃ الجمعۃ اذا لم یعلم الخطیب ما یقول۔

فتاوی علماء عرب وعجم ۱۳۳۵ھ سوال ۔ما قولکم دام فضلکم نفعنااللہ بعلومکم فی الدین بلا دالاسلام و اھلھا لا یعلمون لسان العرب لا یفھمون معانی النصوص القرآنیۃ والاحادیث الشریعۃ بلغۃ العربیۃ فھل یجوز للخطیب ان یقرا اولا شیئا خطبۃ الجمعۃ بالعربیۃ ثم یترجم بلسانھم من نفس الخطبۃ ما یتضمن الا وا مروالنواھی ال

لابدمنھا انہ یسمعھاالناس فیمتنعون من المعاصی ویقترفون الحسنات من الاعمال الصالحات بینوا توجروا۔

الجواب۔۔ نعم یجوز ذلک اذا کان المترجم من المواعظ والاو امر والنواھی ماعد القرآن العظیم واللہ اعلم۔ امر برقمہ خادم الشریعۃ والمنھاج عبد اللہ بن عبد الرحمن سراج الحنفی قاضی القضاۃ و مفتی للاقطار العربیہ بمکۃ المحمیۃ۔ کان اللہ لھما۔

حامدا و مصلیا و مسلما باسمہ سجانہ و تعالیٰ اثبت الجواب واستمد بہ الھدایہ والصواب۔ عبداللہ بن عبدالرحمٰن سراج الحنفیۃ ۱۳۲۵ھ مکہ معظمہ۔

اور بہار شریعت واحکام شریعت والملفوظ وفتاوی افریقہ میں خلاف سنت متوارثہ مکروہ لکھا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر سنی ائمہ مذکورہ بالا طور پر خطبہ نہیں پڑھتے تو ان فتاوی کا خلاف ہوتا ہے، ملازمت جاتی ہے، عوام میں فتنہ فساد ہوتا ہے۔ اور اگر پڑھتے ہیں تو بہار شریعت واحکام شریعت والملفوظ وفتاوی افریقہ کا خلاف ہوتا ہے۔ مخالفین کو موقع ملتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا کریں اگر انہیں کتابوں پر عمل ضروری ہے تو ان عبارتوں اور فتاوی حرمین کا کیا جواب ہے۔۔

نوٹ اس طرف اردو خطبہ مذکورہ بالاسوالات معیار سنت سمجھے جاتے ہیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

سنن ونوافل سے فارغ ہونے کے بعد امام کا بآواز دعا مانگنا بلا شبہ جائز ہے۔ بلکہ اس کی اصل حدیث شریف سے ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی انہوں نے فرمایا۔

مایفوت النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فی د بر صلوۃ مکتوبۃ ولا تطوع الاسمعتہ اللھم اغفر خطایای کلھا اللھم اھدنی لصالح الاعمال والاخلاق الخ۔

(رواہ ابونعیم الحافظ فی کتاب عمل الیوم واللیلۃ)

اس حدیث شریف سے ثابت ہوگیا کہ خود نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بعد فراغت نوافل بھی دعا کرتے تھے اور یہ دعا اس قدر بلند آواز سے ہوتی تھی کہ جس کو صحابہ کرام نے بھی سن لیا تو دعا کا بعد نوافل بلند آواز سے کرنا خود قول شارع علیہ سلام سے ثابت ہوگیا۔ نیز نماز کسوف، استقا

،نماز حاجت وغیرہ بھی نوافل ہی سے ہیں انکے بعد میں خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بآواز بلند دعائیں کیں اور دوسروں کو حکم بھی دیا تو نوافل وسنن کے بعد بآواز دعا کرنے کو کس طرح ناجائز وبدعت کہا جاسکتا ہے۔اب باقی رہا امام کی بآواز دعا پر مقتدیوں کا آمین کہنا۔تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ کتب فقہ میں جب بوقت اجتماع ایک شخص بآواز دعا پڑھے تو یہی طریقہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اور لوگ آمین کہیں۔

مراقی الفلاح میں ہے:اذ دعا یومنون علی دعائه۔ پھر سورۃ فاتحہ خود احسن دعا ہے نیز وہ حمد وثنائے الٰہی پر بھی مشتمل ہے۔اور اس کے بعدو سلموا تسليما۔ پر درود شریف کا پڑھنا تعمیل حکم ہے اور یہ سب آداب دعا سے ہیں پھر دعا حمد وثنائے الٰہی پر ختم کرنا بھی آداب اجابت سے ہے اس کے لئے آیہ سبحان ربك ،الآیہ سے تبرک حاصل کرنا اور زیادہ بہتر ہے۔لہذا ملک گجرات کا یہ دعائے ثانی کا طریقہ شرعاً محمود ومستحسن ہے جو اسکو ناجائز وبدعت کہتا ہے وہ دین سے ناواقف ہے اور احکام شرع کو محض اپنی رائے ناقص سے ناجائز وبدعت قرار دیتا ہے ورنہ وہ انکے ناجائز وبدعت ہونے پر کوئی شرعی دلیل پیش کرے۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) جہاں اذان جمعہ فوراً بعد زوال اول وقت میں ہوتی ہے تو تحیۃ الوضو یا تحیۃ المسجد اسی وقت پڑھنا چاہئے کہ وقت زوال میں نوافل ممنوع ہیں،اس کے بعد اگر ایک آدمی بآواز بلند سورۂ کہف پڑھتا ہے اور سب لوگ خاموش سنتے ہیں تو اس میں کوئی ممانعت شرعی لازم نہیں آتی بلکہ اس میں سب لوگ جتنے سن لیں وہ بھی مستحق اجر وثواب ہو جائیں گے،پھر بعد تلاوت قرآن دعا کرنا آداب اجابت دعا سے ہے کہ حدیث شریف میں ہے من قرء القرآن فليسال الله به۔ تو جس نے قرآن پڑھا تو اللہ سے اسکے توسل سے سوال کرے۔پھر سورۃ فاتحہ خود احسن دعا ہے۔تو سورہ کہف کے بعد فاتحہ خوانی کو کون ممنوع ٹھہرا سکتا ہے۔پھر سنن جمعہ کا پڑھنا اور خطبہ کا سننا امور مختلف فیہ میں سے نہیں،۔جس کے جواز میں کوئی کلام ہو۔لہذا عوام کے اس معمول میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔جو اس کو ناجائز کہتا ہے وہ اس کے عدم جواز پر کوئی صریح دلیل قائم کرے۔ورنہ امور مباحہ کو محض اپنی ناقص عقل سے ناجائز وبدعت قرار دیتا ہے۔دین میں اپنی عقل سے دخل دیتا ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم،

(۴) مسلمان سے مصافحہ کرنا سنت ہے۔،حدیث شریف میں ہے: تصافحو ايذهب الغل۔

(مشکوۃ شریف۔ص۴۰۱)

یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو تم مصافحہ کیا کرو کہ مصافحہ کینہ کو دور کرتا ہے۔

پھر یہ مصافحہ تمام اوقات میں سنت ہی ہے،طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے: المصافحة سنة فی سائر الاوقات۔ اب کسی ملاقات اور کسی وقت کی تخصیص کر کے اس خاص وقت اور ملاقات کے مصافحہ کو اس مصافحہ مسنونہ سے خارج نہیں کر سکتا۔لہذا نماز پنجگانہ کے اوقات کا مصافحہ بھی اس مصافحہ مسنونہ کے تحت میں داخل ہو کر بلاشبہ جائز ثابت ہوا۔

درمختار میں ہے:ان المصافحة مستحبة عند كل لقاء اماما اعتاده الناس من المصافحة بعد صلاة الصبح والعصرفلا اصل له فی الشرع علی هذا الوجه ولكن لا باس به فان اصل المصافحة سنة و كونهم حافظين عليهما من بعض الاحوال او اكثروفرطوافی كثيرمن الاحوال اوا كثر ها لا يخرج ذالك البعض عن كونه المصافحة التی ورد الشرع باصلها ـ قال الشيخ ابو الحسن البكری و تقييده بما بعد الصبح والعصر علی عادة كانت فی زمنه والا فعقب الصلوات كها كذالك۔ (ردالمحتار۔ج۵۔ص۲۵۲)

بیشک مصافحہ کرنے کی عادت مقرر کر لی ہے تو اس طریقہ پر شرع میں کوئی اصل اسکی نہیں ہے لیکن اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے کیونکہ مصافحہ کی اصل سنت ہے اور انکا بعض احوال میں مصافحہ پر محافظت کرنا اور اکثر احوال میں اس سے کوتاہی کر جانا ان بعض احوال کو اس مصافحہ سے خارج نہیں کر دیتا جس کی اصل شرع میں وارد ہوئی۔شیخ ابوالحسن بکری نے فرمایا کہ مصافحہ کو فجر وعصر کو ساتھ مقید کر دینا اس عادت کی بنا پر ہے جو انکے زمانہ میں موجود تھی ورنہ مصافحہ کا سب نمازوں یعنی پنجگانہ نمازوں کے بعد بھی یہی حکم ہے کہ وہ جائز ہے۔اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ نماز پنجگانہ کے بعد مصافحہ کا جواز شرع سے ثابت ہے۔کتب فقہ میں یہ تصریح موجود ہے۔اور جب ان اوقات میں مصافحہ کرنا جائز ثابت ہوا۔اب چاہے مقتدی امام سے مصافحہ کریں یا آپس میں مصافحہ کریں۔بالجملہ اس مصافحہ کا جواز حدیث اور فقہ سے ثابت کر دیا گیا جو اس کے جواز پر اعتراض کرتا وہ محض اپنی کم فہمی کی بنا پر مذہب پر اعتراض کرتا ہے۔خود اسکے پاس اسکے عدم جواز کی کوئی دلیل نہیں ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم،۔

(۴) مزارات حضرات اولیاء کرام کا بوسہ جائز تو ہے،حضرت علامہ احمد مقری مغربی فتح المتعال فی مدح النعال میں ناقل ہیں: ان بعضهم كان اذا رأى المصاحف قبلها وا ذا رأى اجزاء الحديث قبلها و اذا رأى قبور الصالحين قبلها۔ (فتح المتعال)

بیشک بعض علماء جب مصاحف کو دیکھتے تو انکو چومتے اور جب حدیث کی جلدوں کو دیکھتے تو ان[کو]
بوسہ دیتے، اور جب اولیا کی قبروں کو دیکھتے تو ان کو بوسہ دیتے،

اور بعض روایات فقہ میں قبر والدین کے بوسہ دینے کا جواز منقول ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق
محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں:

در بعض روایات فقہیہ بوسہ دادن بر قبر پدر و مادر را نیز آمدہ است۔

لیکن اولی یہ ہے کہ عوام کے سامنے مزارات اولیا کرام پر بوسہ نہ دے۔

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے: ولا یمس القبر ولا یقبله فانه من عادة اهل الكتاب،

(طحطاوی۔ ص ۶۲۳)

اور قبر کو نہ چھوئے نہ بوسہ دے کہ یہ اہل کتاب کی عادت ہے۔

اب باقی رہا بزرگان دین کو بوسہ دینا او اشیاء معظمہ آثار صالحین کا بوسہ دینا اور علماء اور صلحا کی
دست بوسی و قدم بوسی کرنا تو یہ نہ فقط جائز بلکہ حسن و محمود ہے۔

فتح المتعال میں علامہ عراقی کا قول منقول ہے: اما تقبيل الاماكن الشريفة على قصد
التبرك و ايدى الصالحين وارجلهم فهو حسن محمود باعتبار قصد النية۔ (ص ۳۳۹)

اور بقصد تبرک معظم مقاموں اور صالحین کے ہاتھوں اور قدموں کو بوسا دینا باعتبار قصد و نیت کے
حسن اور محمود ہے۔

اسی فتح المتعال میں ہے: كان ثابت البناني لايدع يد انس رضى الله تعالىٰ عنه حتى
يقبلها ويقول يد مست يد رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم (فيه ايضا) ان الامام احمد
يسئل عن تقبيل قبرا لنبى صلى الله تعالىٰ عليه وسلم و تقبيل منبره فقال لا باس به وعنه انه
غسل قميص الشافعي وشرب الماء الذى غسله به۔ (فتح المتعال۔ ص ۳۲)

و فيه ايضا قد صرح جماعة من ائمتنا المهتدى بهم بتقبيل اسمه الشريف ﷺ فيما
هو مكتوب فيه و بتبجيله والتبرك به ورفعه على العيون والرؤس۔

حضرت ثابت بنانی حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ کو بغیر بوسہ دیئے ہوئے نہ[یں]
چھوڑتے اور فرماتے یہ وہ ہاتھ ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دست مبارک کو چھو[ا]
ہے۔ حضرت امام احمد سے حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبر شریف اور ممبر شریف کے بوسہ د[ینے]

کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں، انہیں امام احمد نے حضرت امام شافعی کی
قمیص کو دھویا اور دھوئے ہوئے پانی کو پی لیا۔ ہمارے ائمہ ہادی و رہبر ہیں ایک جماعت علماء نے ان سے
حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نام شریف جس چیز پر لکھا ہوا ہو اس کو بوسہ دینے اور اسکی تعظیم کرنے اور اس
سے تبرک حاصل کرنے اور اسکو آنکھوں اور سروں پر رکھنے کی تصریح کی۔

فقہ کی مشہور کتاب درمختار میں ہے:

طلب من عالم او زاهد ان يدفع اليه قدمه ويمكنه من قدمه ليقبله اجابه۔

(درالمختار۔ ج ۵، ص ۲۵۳)

کوئی کسی عالم یا زاہد سے اسکا قدم اپنی طرف دراز کرنے اور اس قدم پر اسے بوسہ دینے کی موقع
پانے کی خواہش کرے تو وہ عالم یا زاہد اس کی اجابت کرے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اخبار الاخیار میں حضرت شیخ احمد مجد شیبانی کے حال میں لکھتے
ہیں جو جامع شریعت و صاحب ورع و تقوی تھے۔

اگر کسے پیش آمدہ گفتی کہ من حضرت رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم در خواب دیدہ ام باادب
نشستے و تمام قصہ رویا را بشنودے و دست و پائے وے بوسیدے و داماں و آستینش او را بر روئے خود فرو
مالیدے و بر جائے کہ آں شخص می گفت کہ در فلاں جا دیدہ ام آنجا رفتے و بوسہ دادے و گرد آں جائے را
بگردے و بر تن و بر جامہ چوں گلاب پاشیدے۔ (اخبار الاخیار۔ ص ۱۸۵)

اگر کوئی شخص شیخ احمد کے سامنے آکر کہتا کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خواب
میں دیکھا ہے تو مودب ہو کر بیٹھ جاتے اور خواب کا پورا قصہ سنتے اور اس کے [ہاتھ] پاؤں کو بوسہ دیتے، اور
اس کے ہاتھوں اور آستینوں کو اپنے چہرے پر ملتے اور جس جگہ کو وہ کہتا کہ فلاں جگہ میں نے دیکھا ہے
وہاں جاتے اور اس کو بوسہ دیتے اور اس مقام کی خاک کو اپنے چہرے پر ملتے، اور وہ پتھر ہوتا تو اس پتھر کو
دھوتے اور اس پانی کو پی لیتے، اور اپنے بدن اور کپڑے پر گلاب کی طرح چھڑکتے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ علما و صلحا کی دست بوسی و قدم بوسی اور آثار صالحین و تبرکات
بزرگان دین کو بوسہ دینا اور مقام مقدسہ و اشیاء معظمہ کا بوسہ دینا اور اس سب اور اس ہر چیز کی جو کسی بزرگ
کی طرف منسوب ہو تعظیم و توقیر کرنا اس سے تبرک حاصل کرنا انکو آنکھوں سے لگانا جائز و مستحسن ہے۔ اور
صحابہ و تابعین اور سلف و خلف صالحین کا مبارک فعل ہے اور عشق و محبت کی علامت ہے، اور جو انکے بوسہ کو

ناجائز اور بدعت کہے اور انکی تعظیم وتوقیر سے جلے ان سے تبرک حاصل نہ کرے انکو اپنی آنکھوں سے لگا برا جانے وہ عمل صالحین کا مخالف ہے۔ بزرگان دین کا دشمن ہے۔ فعل سلف کو ناجائز کہتا ہے۔ طریقہ صالحین سے منحرف ہے۔ صرف باعتبار صورت کے مسلمان ہے۔ مولی تعالیٰ اس کو ہدایت کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۵) بہار شریعت واحکام شریعت وفتاوے افریقہ میں جو اردو کے خطبہ پڑھنے کو خلاف سنت متوارثہ ومکروہ تنزیہی لکھا ہے یہ حق ہے یہی میری بھی تحقیق ہے اور خاص اس مسئلہ میں میرا ایک مستقل رسالہ بھی ہے لیکن اگر وہاں کی مقامی خصوصیات کی بنا پر یہ بات فی الواقع صحیح ہے کہ انکے خلاف کرنے سے یقیناً فتنہ وفساد برپا ہوجائے گا تو رفع فتنہ کو مدنظر رکھتے ہوئے خطبہ کو اردو میں بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ کہ وہ جائز تو ہے لیکن بتدریج آہستہ آہستہ عوام تک صحیح مسئلہ پہنچایا جائے۔

اب رہیں سوال کی منقولہ عبارات اور فتاوے انکا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ ہمارے خلاف نہیں کہ ان عبارات اور فتاوے کا مقدمہ اور خلاصہ حکم اردو میں خطبہ پڑھنے کی جواز ہے۔ اور جواز کے ہم بھی مخالف نہیں لیکن جواز خلاف اولے مکروہ تنزیہی کو بھی عام ہے۔ ردالمحتار میں ہے۔ اطلق الجائز واراد بہ مایعم الکراھۃ۔ تو اس بنا پر بہار شریعت واحکام شریعت وفتاوے افریقہ میں اور ان فتووں میں کوئی تناقض نہیں اور حکم میں کوئی زبردست مخالفت نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۴۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں۔

ایک گاؤں جس کی آبادی دوسو گھر کی ہے ساٹھ گھر جس میں مسلمانوں کے ہیں ضرورت کی تمام اشیا تقریبا مل جاتی ہیں جس کے چوطرفہ بارہ بارہ کوس دور شہر لگتے ہیں وہاں مسجد نہیں ہے اب مسلمان وہاں کے مسجد بنانا چاہتے ہیں اور جمعہ پڑھنا چاہتے ہیں کیا ایسی بستی میں مسجد بنانا اور جمعہ قائم کرنا از روئے شرع شریف کیسا ہے شہر کی مفصل تعریف لکھئے گا۔ جس پر علمائے کرام کا اتفاق ہے۔

محمد شفیع مدرس مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد ساد ولیا پور ضلع چورو راجستھان

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بلاشبہ ایسے گاؤں میں مسجد بنائی جائے اب رہا جمعہ کا قائم کرنا تو اس کے لئے شہر کا ہونا ضروری ہے۔ شامی میں ہے: لاجمعة فی القری۔

شہر کی مفصل تعریف یہ ہے کہ اس میں مختلف محلے ہوں اور اس قدر بازار ہوں کہ وہاں کی ضروریات کے لئے کافی ہو اور اس میں ایک ایسا حاکم ہو جو معمولی مقدمات کا فیصلہ کرے کما حققہ علامہ شامی فی ردالمحتار۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۴۵)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اہلسنت وجماعت کشف اللہ تعالیٰ نصرہم وامدادہم مسئلہ ذیل

(۱) میں کہ گذشتہ عید الفطر کا واقعہ ہے کہ ہمارے بلدہ گوہاٹی کی دس بارہ عورتوں سے عید الفطر کی نماز الگ الگ جماعت قائم کر کے پڑھ لئے ہیں۔ ایک نیم ملا خطرہ جان ناقص العقل نے امام ہو کے عورتوں کی عید کی نماز پڑھا دیا ہے ابھی اس کے بارے میں بہت فتنہ فساد ہو رہے ہیں اور ہونے کے اندیشے ہیں عورتوں کو بہت روکا گیا ہے آخر مانا نہیں سنتے ہیں اور عید الاضحیٰ کی نماز جماعت قائم کر کے پڑھنے کی تبلیغ کر رہے ہیں کیا یہ طریقہ شریعت میں جائز ہے یا نہیں؟۔

(۲) کیا فرماتے ہیں علماء کرام شرع متین اس مسئلہ میں کہ ہمارے شہر گوہاٹی میں عیدین کی نماز بہت بھاری جماعت ہوتی ہیں۔ لاؤڈ اسپیکر کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ اسپیکر کی آواز بہت بلند ہے دور تک جاتی ہے لہذا امام کے سامنے لاؤڈ اسپیکر رکھکر نماز پڑھا دیتے ہیں اور سب لوگ سنتے اور خوش ہوجاتے ہیں کیا یہ جدید آلہ شریعت میں جائز رکھا ہے یا نہیں۔ بینوا توجروا والسلام۔

احقر الناس خادم محمد عابد الرحمن پیش امام گوہاٹی

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) عورتوں پر نماز جمعہ وعیدین واجب نہیں ہے۔

طحطاوی میں ہے: فلاتجب علی امرأۃ۔

مراقی الفلاح میں ہے: فتجب علی من تجب علیه الجمعة بشرائطها۔

تو جب جمعہ عیدین کی نماز ان پر واجب ہی نہیں تو عورتوں کا اس کے لئے جماعت قائم کرنا غلط وباطل ہے نیز عورتوں کی جماعت مکروہ تحریمی ہے۔

درمختار میں ہے: یکرہ تحریما جماعة النساء ولو فی التراویح فی غیر صلوۃ جنازۃ۔

لہذا جب ان کی جماعت مکروہ تحریمی ہے تو اس کے لئے اہتمام وتداعی کرنا بھی ممنوع ہے وہ ہرگز ہرگز عیداضحیٰ کی جماعت قائم نہ کریں۔

(۲) نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا لگانا بلاضرورت شرعی جو مقتدیوں کیلئے مفسد نماز ہے لہذا لاؤڈ اسپیکر کا امام کے سامنے ہونا ممنوع وناجائز قرار پایا ہے اگر اس کی تفصیل وادلہ دیکھنی ہوں تو میرے ایک رسالہ میں جمع ہیں اور اس میں یوں نہیں لکھ سکتا کہ تقریبا ایک سال سے بیمار ہوں دلائل کثیرہ پیش کرنے سے مجبور ہوں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۶ رذیقعدہ ۱۳۷۹ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

اللہ اکبر

﴿۲۶﴾

باب العیدین

مسئلہ (۴۴۶)

جناب مفتی جی صاحب ہادی دین وجامع علوم ظاہری ومنبع فیوض باطنی بعد مسنون السلام علیکم کے واضح ہو کہ آپ برائے مہربانی مسائل ذیل کے جواب باقاعدہ مہر کے تحریر فرمادیجئے گا عین مہربانی ہوگی۔ بندہ کو ممنون ومشکور فرمائیگا۔ (نوٹ) خط صاف ہوتا کہ پڑھنے میں مشکوک نہ ہو۔

عیدالاضحیٰ کو مسجد میں جگہ نہ رہنے کی وجہ سے تقریبا تیس یا چالیس آدمی مسجد سے باہر تھے۔ ایک شخص مسجد سے باہر ٹین یعنی صحن میں تکبیر کہنے کے لئے مقرر کئے گئے۔ اب امام صاحب نے تکبیر تحریمہ کہی۔ ٹین میں جو تکبیر کہنے والے تھے انہوں نے بھی کہی لیکن اس وقت تک باہر کوئی انتظام صفیں سیدھی ہونے وغیرہ کا نہیں ہوا تھا۔ نہ امام صاحب نے اس پر غور کیا کہ انتظام نہیں ہوا ہے۔ وہ باہر والے اشخاص انتظام کرنے میں شور وغل کرتے رہے۔ انہوں نے اسی شور غل میں تکبیر تحریمہ نہیں سنی۔ بعد میں ان لوگوں کے بیان سے معلوم ہوا کہ انہوں نے مسجد کی طرف غور کیا تو نماز میں اندرون مسجد سب آدمی مشغول تھے۔ تب ہم لوگوں نے نیت کی۔ ان لوگوں کو اختتام نماز کے بعد معلوم ہوا کہ ہماری تو ایک ہی رکعت ہوئی ہے۔ کیونکہ ان کے شور وغل کے وقت پہلی رکعت فوت ہو چکی تھی اب ٹین میں جو تکبیر کہنے والے شخص تھے انہوں نے تکبیر تحریمہ کہی لیکن اس کے بعد پھر کوئی تکبیر یا ربنا لک الحمد پہلی رکعت میں نہیں کہا دوسری رکعت میں تکبیر کہی پھر شروع کی اور وہ پوری تکبیریں اور ربنا لک الحمد کہی اب سلام پھیرنے کے وقت جب امام صاحب نے سلام سیدھی جانب کو سلام پھیرا تو جو شخص ٹین میں تکبیر کہنے والے تھے انہوں نے بھی پھیرا لیکن امام صاحب کو یہ عادت تھی کہ ہمیشہ دوسری جانب کو سلام کچھ رک کر پھیرتے ہیں یعنی تسلی کے ساتھ۔ لیکن اس شخص نے جو ٹین میں تکبیر کہنے والے تھے انہوں نے امام صاحب سے پہلے بائیں جانب کو سلام پھیر دیا۔ تو اکثر لوگوں نے جو صحن مسجد اور ٹین میں تھے ان کے ساتھ سلام پھیر دیا اور کچھ لوگوں نے امام صاحب کی تائید کی اور اندرون مسجد سب لوگوں نے امام صاحب کی تائید کی اور بیرون مسجد والوں نے بھی کسی نہ کسی کی تائید پر سلام پھیرا۔ اس کے بعد بیرون مسجد کے آدمیوں نے کہا کہ ہماری تو ایک

رکعت ہوئی ہے۔ تو میں نے اور چند آدمیوں نے کہا کہ نماز دوبارہ پڑھ لو کیونکہ آدمی بہت رہ گئے۔ تو امام صاحب نے بھی یہی کہا۔ لیکن اس کے بعد امام صاحب کہنے لگے کہ جن لوگوں کی نماز نہیں ہوئی ہے وہ آدمی دو دو رکعت نفل نماز ادا کریں تو عید کی نماز ادا ہو جائیگی یعنی دو دو رکعت نفل پڑھنے سے نماز عید الاضحیٰ درست ہوگئی۔ حل کر دیجئے گا۔ نماز عید الاضحیٰ ہوئی یا نہیں؟۔ یا کوئی شخص ان میں گنہگار رہا یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صورت مسئولہ میں مکبر نے بھی سخت غلطی کی کہ اس نے پہلی رکعت کی تکبیرات انتقال ترک کر دیں اور دوسرا سلام امام سے قبل پھیر لیا۔ پھر سب سے زائد امام صاحب کی نہ صرف ایک غلطی بلکہ کثیر غلطیاں ہیں کہ انتظامات صفوف سے قبل ہی اس نے تکبیر تحریمہ شروع کر لی اور اس ناواقف شخص کو اپنی جانب سے ایسا مکبر تجویز کر دیا جو دوسروں کی نماز عید فوت ہو جانے کا سبب بنایا۔ پھر اس کی یہ غلطی بھی ہے کہ وہ اس صورت میں دوبارہ نماز عید پڑھنے کو تیار ہوگیا۔ پھر اس کی غلطی یہ ہے کہ اس نے یہ مسئلہ بتایا کہ دو رکعت نفل پڑھ لینے سے نماز عید الاضحیٰ ہو جائیگی اور حکم شرع یہ ہے کہ ان دو رکعات نفل سے ہرگز نماز عید الاضحیٰ ادا نہیں ہوگی۔ پھر جن لوگوں نے اس امام کے ساتھ ہر دو رکعات نماز عید ادا کر لی ہے ان کی نماز عید ہوگئی اور بیرون مسجد کے وہ لوگ جنھوں نے امام کے ساتھ صرف ایک رکعت پڑھی ہے اور امام کے ساتھ سلام پھیر دیا ہے ان کی نماز عید ادا نہیں ہوئی تو یہ چار رکعت بہ نیت نماز چاشت پڑھ سکتے تھے؟۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۴۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسائل ذیل میں
عید کی نماز کا سلام پھیر کر فوراً امام کو خطبہ پڑھنا چاہئے، یا سلام کے بعد دعا ''اللھم انت السلام'' پڑھنے کے بعد خطبہ کے لئے کھڑا ہونا چاہئے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

نماز عید کا سلام پھیرنے کے بعد امام کو خطبہ پڑھنا چاہئے کہ نماز اور خطبہ کے درمیان کوئی دعا وا

جب نہیں۔ بخاری شریف میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی:

کان النبی ﷺ یخرج یوم الفطر والاضحی الی المصلی فاول شئی یبدء به الصلاۃ ثم ینصرف فیقوم مقابل الناس والناس جلوس علی صفوفهم فیعظهم ویوصیهم ویأمرهم
(صحیح البخاری (ص۵۸۱ج۱)

حضور نبی کریم ﷺ عید الفطر اور عید اضحیٰ کے روز عید گاہ کی طرف تشریف لے جاتے اور سب سے پہلی چیز یہ تھی کہ نماز پڑھتے پھر نماز سے فارغ ہو کر لوگوں کے سامنے کھڑے ہوتے اور لوگ صف بہ صف بیٹھے ہوتے اور حضور انہیں نصیحت فرماتے اور وصیت کرتے اور حکم فرماتے۔

طبرانی اور مسند امام احمد میں حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی:

کنا جلوسا ننتظر رسول اللہ ﷺ یوم الاضحی فجاء فسلم علی الناس وقال ان اول نسکنا یومکم هذا الصلاۃ فتقدم فصلی بالناس رکعتین ثم سلم فاستقبل القوم بوجهه ثم اعطی قوسا او عصا فاتکاء علیها فحمد الله واثنی علیه فامرهم ونهاهم"
(صحیح البخاری ص۵۸۲)

ہم عید قربانی کے دن رسول اکرم ﷺ کے انتظار میں بیٹھے تھے تو حضور تشریف لائے اور لوگوں کو سلام کیا اور فرمایا آج کے دن پہلا فعل یہ نماز ہے پھر نماز پڑھانے کے لئے آگے بڑھے اور لوگوں کو دو رکعتیں پڑھائیں پھر سلام پھیر کر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور کمان یا لاٹھی حاضر کی گئی تو اس پر اعتماد کیا پھر اللہ کی حمد وثنا کی اور لوگوں کو بعض چیزوں کا حکم دیا اور بعض سے منع فرمایا۔

کتاب الآثار میں خود امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی:

کانت الصلاۃ فی العیدین قبل الخطبة ثم یقف الامام علی راحلته بعد الصلاۃ فیدعو الخ۔
(صحیح البخاری (ص۵۷۳ج۱)

دونوں عیدوں میں نماز خطبہ سے پہلے ہے پھر بعد نماز امام اپنی سواری پر کھڑے ہو کر خطبہ دے پھر دعا مانگے۔

ان احادیث سے ثابت ہوگیا کہ نماز عید کی فراغت کے بعد امام کو خطبہ ہی پڑھنا چاہئے اور دعا بعد خطبہ کے پڑھے اور نماز وخطبہ کے درمیان کسی دعا کا پڑھنا ثابت نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۴۴۸)

کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں
ایک صاع کا وزن کتنا ہوتا ہے؟ ایک جگہ چار سیر دیکھا ہے اور ایک جگہ ساڑھے چار سیر دیکھا ہے۔ آپ اس کا وزن تولے کی شمار سے تحریر فرمایے کہ صاع اتنے تولے کا ہوتا ہے۔ گیہون یا گیہوں کا آٹا فطرے میں نصف دیا جائے گا اور کوئی چیز بھی ایسی ہے جو گیہوں کے برابر دی جائے گی، یا اس کے علاوہ ہر چیز گیہوں سے دوگنی دی جائیگی ۔ بینواوتوجروا

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

صاع حنفیوں کے نزدیک آٹھ رطل کا ہے۔ علامہ برہان الدین مرغینانی۔ ہدایہ میں فرماتے ہیں:
" الصاع عند ابی حنیفة ومحمد ثمنیة ارطال "(ہدایہ ص ۱۹۰)
امام ابوحنیفہ وامام محمد علیہما الرحمۃ کے نزدیک صاع آٹھ رطلوں کا ہوتا ہے۔
امام اجل ابوالحسن بغدادی قدوری میں فرماتے ہیں:
الصاع عند ابی حنیفة ومحمد ثمانیة ارطال بالعراقی "(مختصر القدوری ص ۵۱)
حضرت امام ابوحنیفہ وامام محمد رحمۃ اللہ تعالی علیہما کے نزدیک صاع آٹھ رطل عراقی کا ہے۔
علامہ برہان الشریعۃ وقایہ میں فرماتے ہیں:
"الصاع ما یسع فیه ثمانیة ارطال من مج اوعدس" صاع وہ ہے جس مین ماش یا مسور کے عراقی آٹھ رطل بھرتے ہیں۔
علامہ ابوالبرکات نسفی کنزالدقائق میں فرماتے ہیں: " وهو (الصاع) ثمانیة ارطال "
(کنزالدقائق قیوبی س ۲۲۹ ج ۱)
صاع آٹھ رطل کا ہوتا ہے۔ علامہ ابراہیم حلبی ملتقی الابحر میں فرماتے ہیں:
والصاع ما یسع ثمانیة ارطال بالعراقی من نحو عدس او مج
(مجمع الانہر مصری ص ۲۲۹ ج ۱)
صاع وہ جس میں ماش یا مسور کے عراقی آٹھ رطل بھرتے ہیں:
فقیہ حنفی ابوالفتح خوارزمی کتاب المغرب میں فرماتے ہیں: الصاع ثمانیة ارطال عند اهل العراق۔
(المغرب ص ۳۱۱ ج ۱)

اہل عراق کے نزدیک صاع آٹھ رطلوں کا ہے،
ان عبارات سے ثابت ہوگیا ہے کہ ہمارے امام اعظم رضی اللہ تعالی عنہ کے نزدیک عراقی صاع آٹھ رطل کا ہے اور اس میں یہ بھی تفصیل ہے کہ اس صاع میں مسور یا ماش کے آٹھ عراقی رطل سما جائیں۔ یا اس صاع کو اس طرح سمجھئے کہ صاع چار مد کا ہوتا ہے۔
علامہ شامی ردالمحتار میں شرح درالبحار سے ناقل: اعلم ان الصاع اربعة امد والمد رطلان والرطل نصف من۔ (از ردالمحتار مصری ص ۷۹ ج ۲)
جاننا چاہئے کہ صاع چار مدوں کا ہوتا ہے اور ایک مد دو رطلوں کا اور ایک رطل آدھے من کا۔
علامہ شیخ محمد طاہر مجمع بحارالانوار میں فرماتے ہیں: " واجمعوا علی انه (الصاع) اربعة امداد"
(ص ۲۷۱ ج ۲)
سب نے اس پر اجماع کیا ہے کہ صاع چار مدوں کا ہے۔
ان ہر دو عبارات سے یہ ثابت ہوا کہ فقہاء کا اس پر اجماع ہوا کہ صاع چار مدوں کا ہے اور مد دو رطل کا ہوتا ہے یا صاع تو یوں سمجھئے کہ صاع چار من کا ہوتا ہے اور من دو رطل کا ہوتا ہے۔
علامہ علاء الدین حصکفی صاحب درمختار اپنی کتاب بدرالمنتقی شرح ملتقی میں فرماتے ہیں: " الصاع اربعة امناء والمن رطلان " (بدرالمنتقی مصری ص ۲۱۵)
صاع چار من کا ہے اور من دو رطل کا ہوتا ہے۔
علامہ صدرالشریعہ شرح وقایہ میں فرماتے ہیں: " وعندنا نصف صاع من العراق وهو منوان"
(شرح وقایہ ص ۲۳۱ ج ۱)
ہمارے نزدیک عراقی آدھا صاع دو من کا ہے۔
ان ہر دو عبارتوں سے ثابت ہوا کہ عراقی صاع چار من کا ہوتا ہے اور ہر من دو رطل کا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ صاع کو اگر چار مد یا چار من کا بھی مان لیا جائے تو جب ہر مد اور من دو دو رطل کا ہے تو چار مد یا چار من کے بھی وہی آٹھ رطل ہوتے ہیں جو مذکور ہوئے تو یہ اقوال تو مختلف ہوئے مگر سب کا نتیجہ ایک ہی ہے۔ تو اب رطل کی تحقیق ضروری ہوئی کہ اس کی تفصیل سے صاع کا وزن معلوم ہوجائے گا۔
علامہ محقق شیخ زادہ مجمع الانہر میں فرماتے ہیں: " وکل رطل عشرون استاراً "

(مجمع الانہر مصری ص ۲۲۹ ج ۱)

اور ہر رطل بیس استار کا ہوتا ہے۔ فتاوی عالمگیری میں ہے: " الصاع ثمانية ارطال بالبغدادی ورطل البغدادی عشرون استاراً والاستار اربعة مثاقيل ونصف مثقال"

(عالم گیری مجیدی ص ۹۸)

صاع بغدادی آٹھ رطلوں کا ہے اور بغدادی رطل بیس استار کا ہے اور استار ساڑھے چار مثقال کا ہے۔

قاضی عبدالنبی احمد نگری جامع العلوم میں فرماتے ہیں: " الصاع ثمنية ارطال والرطل نصف المن عشرون استارا والاستار اربعة مثاقيل ونصف مثقال " وباید دانست کہ ہر مثقال چہار و نیم ماشہ است پس از استار یک تولہ وہشت وربع ماشہ می شود و بریں حساب صاع دوصد وہفتاد تولہ شود هذا صاع عراقی ذهب اليه ابو حنيفة رحمه الله تعالى "

(جامع العلوم حیدر ابادی ص ۲۳۰ ج ۲)

صاع آٹھ رطل کا ہے اور رطل نصف من یعنی بیس استار کا ہے اور استار ساڑھے چار مثقال کا ہے۔ اور جاننا چاہئے کہ ہر مثقال ساڑھے چار ماشہ کا ہے تو استار ایک تولہ سوا آٹھ ماشہ کا ہوا۔ پس اس حساب سے صاع دو سو ستر تولہ کا ہوا۔

اور یہ عراقی صاع ہے۔ ہمارے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالی علیہ کا یہی مسلک ہے۔

اسی جامع العلوم میں ہے: " وفی القنية مثقال بالكسر چهار و نیم ماشه فيعلم من ههنا ان المثقال ستة وثلثون حبة خمراء " (جامع العلوم وحیدرآبادی ص ۲۱۰ ج ۲)

قنیہ میں ہے۔ مثقال ساڑھے چار ماشہ کا ہے۔ تو اسی سے معلوم ہوا کہ مثقال چھتیس سرخ کا ہموزن ہے۔

ان عبارات سے ظاہر ہو گیا کہ مثقال ساڑھے چار ماشہ کا ہے اور استار ساڑھے چار مثقال کا تو استار ایک تولہ سوا آٹھ ماشہ کا ہوا، اور رطل بیس استار کا تو رطل تینتیس تولہ نو ماشہ کا ہوا، اور صاع آٹھ رطل کا ہے تو صاع دو سو ستر تولہ کا ہوا جو انگریزی روپیہ سے سوا گیارہ ماشہ کا ہے، دو سو اٹھاسی روپیہ بھر کا قرار پایا۔ اور اس کا نصف صاع ایک سو چوالیس روپیہ بھر کا ٹھہرتا ہے۔ لیکن جب سیدنا اعلی حضرت رضی اللہ تعالی عنہ نے اس نصف صاع کا تجربہ کیا کہ اس پیمانے میں جو بھر کر تولے تو وہ ایک سو چوالیس بھر ہوئے اور

جب اسی نصف صاع شعیری مین گیہوں بھر کر تولے تو وہ ثمن رطل کم پانچ رطل آئے یعنی ایک سو چوالیس روپیہ بھر جو کی جگہ ایک سو پچھتر روپیہ آٹھ آنے بھر گیہوں ہوئے۔ اور اس قدر وزن میں فرق ہو جانا بعید از قیاس نہیں ہے۔ کیونکہ جو ہلکا ہوتا ہے اور گیہوں بہ نسبت اس کے وزنی ہے تو جس برتن میں ایک سو چوالیس روپیہ بھر جو وزن میں اترے اسی میں جب گیہوں اسی طرح بھر کر تولے جائیں گے تو وہ یقیناً اس مقدار سے زائد ہوں گے کہ گیہوں جو سے زائد وزنی ہے۔ لھذا احتیاط اسی میں ہے کہ جب صدقہ فطر میں گیہوں یا اس کا آٹا دیا جائے تو ایک سو پچھتر روپیہ آٹھ آنے بھر یعنی اس اسی روپیہ کی تول سے دو سیر تین چھٹانک اٹھنی بھر دیا جائے۔ اور جو اور گیہوں کے علاوہ جو غلہ دینا چاہیں تو ایک صاع جو یا نصف صاع گیہوں کی قیمت کے حساب سے دیا جائے، اس میں وزن کا اعتبار نہیں ہے۔

درمختار میں ہے: " ما لم ينص عليه كذرة وخبز تعتبر فيه القيمة ۔

واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

(۲۷)

باب النوافل

مسئلہ (۴۴۹)

کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام مسئلہ ذیل میں کہ

آیا سنتوں اور نفلوں کی چار رکعت کی نیت میں قعدہ اولی میں صرف التحیات پڑھی جائیگی یا اس کے بعد درود شریف اور دعا پڑھ کر تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوں اور تیسری رکعت میں بسم اللہ اور الحمد شریف سے قرأت شروع کی جائے یا اس سے پہلے سبحنك اللهم اور اعوذ بالله بھی پڑھی جائے گی بحوالہ کتب جواب سے مطلع فرمائیں۔ بینوا توجروا

المستفتی، عبداللہ ساکن دیپا سرائے سنبھل

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

ظہر کی پہلی چار سنت مؤکدہ اور جمعہ کے قبل وبعد کی چار چار سنت کا حکم تو فرض جیسا ہے کہ ان کے قعدہ اولی میں صرف التحیات پڑھ کر تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہو جائیں اور تیسری رکعت سبحنك اللهم اور اعوذ بالله سے شروع نہ کیا جائے بلکہ بسم اللہ اور الحمد للہ سے شروع کریں۔ لیکن ظہر اور جمعہ کی ان سنتوں کے علاوہ اور تمام سنتوں۔ مستحبات۔ نفلوں کی چار رکعتوں میں قعدہ اولی میں بعد التحیات کے درود شریف اور دعا بھی پڑھی جائے اور تیسری رکعت کو سبحنك اللهم اور اعوذ بالله سے شروع کیا جائے۔

چنانچہ فقہ کی مشہور کتاب درمختار میں ہے " ولا يصلي على النبي ﷺ في القعدة الاولى في الاربع قبل الظهر والجمعة وبعدها ولو صلى ناسيا فعليه السهو وقيل لا شئي ولا يستفتح اذا قام الى الثالثة منها لانها لتاكدها اشبهت الفريضه وفي البواقي من ذوات الاربع يصلي على النبي ﷺ ويستفتح ويتعوذ ولو نذرًا لان كل شفعة صلاة "

(ردالمحتار مصری جلد ا صفحہ ۴۷۲)

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۵۰)

هل يو مر الصبيان با لنوافل كا ربع قبل العصر وضربوا على تركها ام لا؟

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

نعم يومر الصبي با لنوافل ويضرب اذا كان ابن عشر سنة ليتخلق بفعلها وبعتاده ولقوله عليه السلام مروا اولادكم بالصلوة وهم ابناء سبع واضربوهم عليها وهم ابناء عشر وفرقوا بينهم في المضاجع رواه ابو داؤد۔ يستدل من الحديث على الصلوة وهي مشتملة على النوافل ايضا وعلى ان الفرض في حق الصبي نوافل فثبت الا مر والضرب للنوافل ايضا ويستوى في التخلق والا عتياد الفرائض والنوافل بل ينبغي ان يومر بجميع المامورات وينهى عن جميع المنهيات كما صرح به في رد المحتار والله تعالى اعلم بالصواب:

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۵۱)

سنت فجر کے متعلق جو حدیث ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ایک شخص کو فجر کی نماز کے بعد دو رکعتیں پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ۔ صلوة الصبح ركعتين ركعتين۔ تو اس شخص نے جواب دیا کہ میں فرض سے پہلے کی سنتیں نہیں پڑھی تھیں اب پڑھی ہیں اتنا سن کر حضور خاموش رہے اور کچھ نہ فرمایا تو زید اس حدیث کی بنا پر کہتا ہے کہ فرض پڑھنے کے بعد فجر کی سنتیں پڑھ سکتے ہیں اگر فرض کے بعد سنتیں جائز نہ ہوتیں تو حضور خاموش کیوں رہتے اس کو منع کرتے کہ ایسا آئندہ نہ کرنا۔ اگر اس حدیث کی ناسخ کوئی حدیث ہو تو جواب میں تحریر کیجئے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

فقہ کی کتب متون وشروح وحواشی وفتاوی وغیرہ میں فقہائے کرام کی یہ تصریحات موجود ہیں۔

ردالمختار کی عبارت یہ ہے: لا یقضی سنة الفجر الا اذا فاتت مع الفجر فیقضیها تبعا لقضائه لو قبل الزوال واما فاتت وحدها لا تقضی قبل طلوع الشمس بالاجماع لکراهة النفل بعد الصبح۔

(شامی ص ۵۰۳)

سنت فجر کی قضا نہ کی جائے مگر جب فرض کے ساتھ قضا ہو جائیں تو زوال سے پہلے تک فرض کی قضا کی متابعت میں ان کی بھی قضا پڑھیں۔ لیکن جب فقط سنت قضا ہو جائیں تو باجماع طلوع آفتاب سے پہلے قضا نہ پڑھیں کہ صبح کے بعد نفل مکروہ ہیں۔

تو اگر زید مقلد حنفی ہے تو اسے باوجود تصریحات فقہا اور روایات مذہب کے حدیث سے استدلال کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں اور جب فقہاء نے اس حدیث کے خلاف پر اجماع کیا تو خلاف ظاہر ہو گیا، بلاشبہ یہ حدیث ضعیف نا قابل عمل ہے کہ اجماع فقہاء حدیث صحیح کے خلاف پر کبھی نہیں ہو سکتا۔

اور اگر زید غیر مقلد ہے تو یہ بتائے کہ یہ کہاں ہے؟۔ اور اس کے رجال کیسے ہیں؟۔ اور اس کی صحت کا کیا حال ہے؟۔ اور اس کا کونسا زمانہ ہے؟۔ اور اس کے معارض یہ احادیث ہیں:

عن ابن مسعود ان رجلا صلی مع النبی ﷺ الصبح فلما انصرف صلی رکعتین فقال له ﷺ الصبح اربعا؟۔ قال: یا رسول الله ! انی کنت لم اصل رکعتی الفجر قال فلا اذا ۔ راوہ رزین۔

عن قیس جد یحیی بن سعید الانصاری انه فعل مثل ذلك فقال له ﷺ مهلا یاقیس! اصلاتان معا؟۔ فقال: انی لم ارکع الرکعتین قال فلا اذا۔

(رواہ ابو داؤد و الترمذی)

اب زید اپنی پیش کردہ حدیث اور ان احادیث میں یہ بتائے کہ کون مقدم ہے اور کون متاخر اور سکوت وممانعت صریح میں کون راجح ہے کون مرجوح ہے۔ بالجملہ جب زید ان امور صغیرہ کو بالتفصیل بیان کر دیگا تو پھر اس کے استدلال کی حقیقت بھی ظاہر کر دی جائیگی۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول۔

مسئلہ (۴۵۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

صلاۃ اوابین جو چھ رکعت پڑھی جاتی ہے وہ فرض کے بعد کی دو سنتوں کے علاوہ چھ رکعتیں پڑھی جاتی ہیں یا معہ سنتوں کے چھ رکعتوں کو پوری کی جاتی ہیں۔ حضور ہر مسئلہ کا جواب اطمینان بخش ہونا چاہئے معہ حوالہ کتب کے۔

المستفتی محمد عبداللہ خاں مدرس مدرسہ عربیہ متصل رسالہ مسجد جھنڈ باڑاہ۔ سی۔ پی۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اوابین کی چھ رکعتوں کی ایک نیت ہی باندھی جائے، دو رکعتیں سنت کی اسی میں محسوب ہونگی۔

درمختار میں ہے: هل تحسب المؤکدة من المستحب ویؤدی الکل بتسلیمة واحدة اختار الکمال نعم۔

(شامی ص ۴۷۳ ج ۱)

کبیری میں ہے: وقع عندی انه اذا صلی اربعا بعد الظهر بتسلیمة واحدة او اثنتین یقع عن السنة والمندوب سواء احتسب هو المؤکدة منها اولا ۔ وفیه ایضا والحال فی الست بعد المغرب کالحال هذه الاربع والله تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۵۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

اگر ایک شخص رمضان کے مہینہ میں دو جگہ نماز تراویح پڑھاوے تو کیا یہ نماز تراویح ہو سکتی ہے۔ پہلی دفعہ اول رات میں اور دوسری دفعہ پچھلی رات میں اور امام صاحب کہتے ہیں کہ میں تو نفل پڑھاتا ہوں تو کیا ایسی نماز ہو سکتی ہے اور اس امام کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بار نوافل ہونگے اور نوافل کی جماعت مکروہ ہے۔

شامی میں ہے: والنفل بالجماعۃ غیر مستحب۔

اور جب اس امام میں سوا اس کے اور کوئی موانع امامت نہ ہوں تو اس کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ہاں اسے ایسی عادت سے منع کیا جائے واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۵۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ
بعض حضرات ایسے ہیں کہ وہ کبھی فرائض ادا نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں تو کبھی کبھی بخلاف اس کے کہ وہ نفل واحکام مستحبہ کرنے کو تو اڑے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ بغیر ان باتوں کے تو دین ہی بیکار ہے۔ مثلا سوم، کونڈہ، گیارہویں شریف، تعزیہ داری، مروجہ عرس شریف، برسی، چہلم، رجبی شریف وغیرہ۔ دیگر یہ کہ کچھ حضرات یہ کہتے ہیں کہ بھائیو پہلے جب تک آپ لوگ فرائض ادا نہیں کریں گے، تو یہ تمہارے اوپر والے تمام اعمال کام نہیں دیں گے۔ اور نہ یہ قبول ہوں گے۔ اور وہ اس کی سند کے واسطے حضرت مولانا مولوی احمد رضا خان صاحب کی عبارت پیش کرتے ہیں، جو معہ حوالہ نقل کی جاتی ہے،

کتاب الوظیفۃ الکریمہ مطبوعہ مطبع اہل سنت وجماعت بریلی واقع آستانہ عالیہ رضویہ بارسوم ۵۰ جلد ص ۱۴ کے آخر میں عبارت تحریر ہے۔ فقیر احمد رضا قادری غفرلہ پنجم محرم ۱۲۳۸ھ بھی تحریر ہے۔ اصلی عبارت۔

جس پر فرض باقی ہوں اس کے نفل اور اعمال مستحبہ کام نہیں دیتے بلکہ قبول نہیں ہوتے جب تک فرائض ادا نہ کرے۔

اس عبارت کے پیش کرنے پر بھی وہ لوگ احکام شریعت سے روگردانی کرتے ہیں۔ تو ایسے حضرات کی بابت شرعا کیا حکم ہے؟ کیا وہ حق بجانب ہیں جو اعمال مستحبہ ونفلی پر اڑے رہیں اور فرائض ادا نہ کریں؟۔

المستفتی لیاقت حسین انصاری۔ بلاری مراد آباد ۱۳ ر رمضان المبارک ۷۵ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

فرائض کی ادا ذمہ پر ضروری ہے یہاں تک کہ اس کا تارک سخت گنہگار اور فاسق ہوجاتا ہے اور نوافل واعمال مستحبہ نہ ذمہ پر ضروری نہ انکا تارک فاسق گنہگار۔ اور بلاشک جس پر فرائض باقی ہوں اسکے اعمال مستحبہ ونوافل قبول نہیں ہوتے۔ تو فرائض کا ادا کرنا تو فرض ہی ہوا اور مستحبات ونوافل صرف باعث اجر وثواب ہوئے تو فرائض ونوافل کا یہ فرق باعتبار عمل اور ادا کے ہے اور یہ امر تو اتفاقی ہے اس میں کوئی بھی شمہ بھر کا اہل سنت وجماعت اور فرقہ ضالہ وہابیہ میں فرق نہیں، جو ہے اس کو سائل یا تو اپنی جہالت کی بنا پر نہیں سمجھ سکا یا وہ جان بوجھ کر مسلمانوں کو مغالطہ میں ڈالنا چاہتا ہے۔

فرق یہ ہے کہ اہل سنت نوافل میں مستحبات کو جائز اور سبب اجر وثواب اعتقاد کرتے ہیں، اور وہابیہ ان مستحبات کو ناجائز وبدعت کہتے ہیں، تو ان وہابیہ نے ان مستحبات کو ناجائز وبدعت بتا کر گویا فعل حلال کو حرام قرار دیا، جو گمراہی وضلال ہے۔ لہذا اب فرق یہ ہوا کہ تارک فرض فاسق وگنہگار تو ہوا لیکن گمراہ وضال نہیں ہوا۔ اور جو مستحبات کو ناجائز بدعت کہتا ہے وہ نہ صرف گنہگار بلکہ گمراہ وضال قرار پایا۔ تو حقیقۃ یہ تقابل عمل کا عمل سے نہیں ہے بلکہ تقابل عمل کا عقیدہ سے ہے۔ تو اب اس سائل کی سخت جہالت یہ ہے کہ ترک عمل کا مخالفت عقیدہ سے تقابل کر رہا ہے۔ یا اس کا انتہائی فریب یہ ہے کہ وہ ترک فرض کی اہمیت دکھا کر اعتقادی امور سے گمراہ کرنے کی ناپاک سعی کرتا ہے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ سوم، گیارہویں شریف، فاتحہ، عرس، برسی، رجبی شریف، وغیرہ امور مختلف فیہا تو یہ عملی طور پر تو ضرور مستحبات سے ہیں جو ان کو جائز اعتقاد کرتے ہوئے اگر نہ کرے تو نہ وہ گنہگار ہے نہ اس پر ملامت نہ عذاب۔ لیکن انکا عملا وہابیہ تو کرتے ہی نہیں اور اس کے ساتھ ان امور کو ناجائز وبدعت کہتے ہیں۔ تو یہ ان مستحبات کو ناجائز وحرام ٹھہرا کر سخت گنہگار بھی ہوئے۔ اور گمراہ وضال بھی ہوئے۔ تو ان مستحبات کو جائز اعتقاد کرنا شعار اہل سنت ہے۔ اور انکو بدعت وناجائز اعتقاد کرنا شعار وہابیہ اہل ضلال سے ہے۔ تو وہابیہ کا ان امور مستحبہ کو ناجائز وبدعت کہنا، گویا حلال کو حرام قرار دینا ہے تو اس اعتبار سے اہل سنت کا اڑنا بالکل صحیح ہے، کہ یہ شعار اہل سنت ہے اور ان امور کو ترک کرانے والے وہابیہ ہیں جو اپنی فریب کاری سے مسلمانوں کو طریقہ حقہ سے گمراہ کرنے کی فکر میں ہیں۔ مولی تعالیٰ ان وہابیہ کے شر اور فریب ومکر سے بچائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۵۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ
عشاء کی دوسنت اور وتر کے درمیان جو دونفل پڑھنے کا اکثر رواج ہے، اس کا کیا ثبوت ہے اور سنت وتر کے درمیان دونفل کیسے آئے؟۔ درمیان میں نہ پڑھتے ہوئے آخر میں چار نفل پڑھے جائیں تو کیسا ہے؟ اور جمعہ، ظہر، مغرب عشا میں جونفل پڑھتے ہیں، انکا ثبوت کہاں سے ہے؟۔ آیا کسی حدیث سے ہے یا کسی بزرگ کے مقرر کردہ ہیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

فرض عشا کے بعد علاوہ دوسنت مؤکدہ کے چار رکعت نفل پڑھنا مستحب ہے۔

مراقی الفلاح میں ہے: وندب اربع بعد العشاء لما روینا لقولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم من صلی قبل الظھر اربعا کان کانما تہجد من لیلتہ و من صلی ھن بعد العشا کان کمثلھن من لیلۃ القدر۔

یعنی فرض عشا کے بعد چار رکعت پڑھنا مستحب ہے، اس حدیث کی بنا پر جو ہم نے روایت کی اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اس حدیث کی بنا پر کہ جس نے فرض ظہر سے پہلے چار رکعت پڑھیں تو گویا اس نے اس رات کی تہجد کی نماز پڑھی۔ اور جس نے فرض عشا کے بعد چار پڑھیں تو وہ لیلۃ القدر میں چار رکعت پڑھنے کے مثل ہے۔ تو اس سے بعد عشا چار نوافل پڑھنا مستحب ثابت ہو گیا پھر اگر ان نوافل کی دو رکعت سنت مؤکدہ کے بعد اور پڑھ لی جائیں اور دو رکعت بعد وتر پڑھ لی جائیں تو اس میں کوئی محظور شرعی لازم نہیں آتا۔ کہ حقیقۃً نوافل جبر نقصان کے لئے مشروع ہوئے ہیں۔

اسی مراقی الفلاح میں ہے: النوافل شرعت لجبر نقصان یمکن فی الفرض۔

تو پہلی دو رکعتیں فرائض کے جبر نقصان کے لئے ہو گئیں اور بعد کی دو رکعات نفل وتر کے جبر نقصان کے لئے ہوئیں۔ لہذا یہ طریقہ اس سے اولی ہے کہ چاروں رکعات نفل اخیر میں پڑھے جائیں اگر چہ اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح بعد جمعہ وظہر اور بعد مغرب وعشا جو نوافل پڑھے جاتے ہیں، ان کا ثبوت بھی احادیث سے ثابت ہے۔

حدیث ترمذی شریف میں حضرت ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

من حافظ علی اربع رکعات قبل الظھر و اربع بعدھا حرمہ اللہ علی النار۔ یعنی، جس نے فرض ظہر سے پہلے چار رکعتوں اور بعد والی چار رکعتوں پر ہمیشگی کی تو اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ حرام فرما دے گا۔

حدیث دیلمی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے، کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

من صلی اربع رکعات بعد المغرب قبل ان یتکلم احد ارفعت لہ فی علیین و کان کمن ادرک لیلۃ القدر فی المسجد الاقصی و ھو خیر من قیام نصف لیلۃ۔

یعنی جس نے بعد فرض مغرب کے چار رکعتیں کسی سے بات کرنے سے پہلے پڑھ لیں تو وہ اس کو علیین میں بلند کرائیں گی۔ اور وہ شخص اس کی مثل ہو جائے گا۔ جس نے مسجد اقصی میں لیلۃ القدر کو پالیا اور وہ نصف شب کے قیام سے افضل ہے۔

حدیث طبرانی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

من صلی العشاء فی جماعۃ وصلی اربع رکعات قبل ان یخرج من المسجد کان کعدل لیلۃ القدر۔

یعنی جس نے فرض عشاء جماعت میں پڑھے او چار رکعتیں مسجد سے نکلنے سے پہلے پڑھیں، تو وہ لیلۃ القدر میں پڑھنے کے مثل ہیں۔ تو ان احادیث سے بعد ظہر و جمعہ اور بعد مغرب وعشا نوافل کا پڑھنا ثابت ہو گیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۵۶)

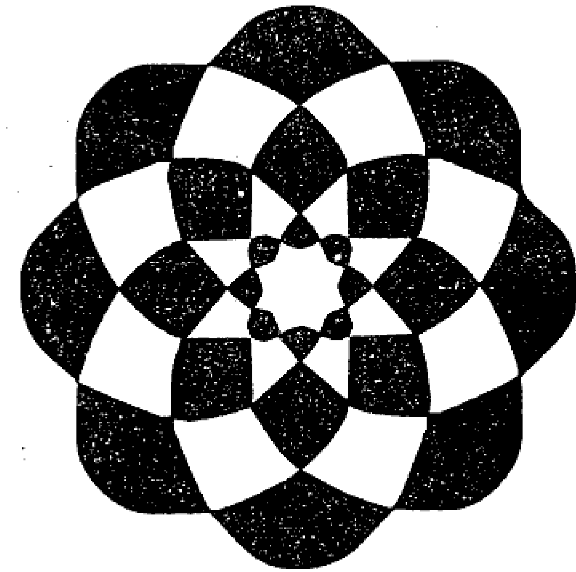
کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ
مسجد میں جا کر کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اکثر اشخاص تحیۃ الوضو۔ تحیۃ المسجد۔ یا مستحب نوافل یا سنت موکدہ ادا کرتے ہیں۔ یہ وقفہ شریعت میں کیسا ہے؟۔ ح۔م۔ اشرفی ۲۵ راکتوبر

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد میں داخل ہونے کے بعد تحیۃ المسجد ودیگر نوافل بلاکسی وقفہ کے پڑھنے چاہئیں اور کچھ دیر بیٹھنے کے بعد تحیۃ المسجد یا نوافل کا پڑھنا نامناسب وخلاف اولی ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل



(۲۸)

باب التہجد

مسئلہ (۴۵۷)

کیا فرماتے ہیں حضرات علماء اہل سنت اس مسئلہ میں کہ

زید کہتا ہے کہ تہجد کی نماز کا وقت عشاء کی نماز پڑھ کر سونے کے بعد ہے جب رات کے کسی حصہ میں آنکھ کھلے پڑھ سکتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص عشاء کی نماز پڑھکر ۹ بجے سویا اور دس بجے بیدار ہوگیا تو ۱۰ بجے پڑھ سکتا ہے اگر شب بیداری کرے تو تہجد نہیں پڑھ سکتا ہے۔ بکر کہتا ہے کہ یہ مسئلہ غلط ہے اگر کوئی شخص شب بیداری کرے تو بھی ۱۲ بجے کے بعد تہجد پڑھ سکتا ہے دریافت طلب امر یہ ہے زید صحیح کہتا ہے یا بکر؟ بینوا توجروا

المستفتی، رمضان علی محلہ قاضی پورہ بہرائچ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

تہجد کے معنی بہ تکلف نیند کا زائل کرنا ہے۔ ردالمختار میں ہے " التھجد از الة النوم بتکلف " تو تہجد والا وہی شخص قرار پایا جو سونے کے بعد نماز نفل پڑھے۔ چنانچہ معجم طبرانی کی حدیث میں ہے:

یحسب احدکم اذا قام من اللیل یصلی حتی یصبح انه قد تھجد انماتھجد المرأ یصلی الصلوۃ بعد رقدۃ۔ (ردالمختار جلد ا صفحہ ۴۸۰)

یعنی تمہارا کوئی شخص گمان کرتا ہے کہ جب رات کے کسی حصہ میں نماز پڑھے یہاں تک کہ صبح ہوجائے تو اس نے تہجد کو ادا کرلیا۔ بلکہ تہجد پڑھنے والا وہی شخص ہے جو سونے کے بعد نماز پڑھے تو اس حدیث سے ثابت ہوگیا کہ نماز تہجد سونے کے بعد ہی ہوا کرتی ہے۔ اب باقی رہا یہ امر کہ تہجد کا وقت کب سے شروع ہوجاتا ہے تو حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وقت تہجد نماز عشاء کے بعد ہی سے شروع ہوجاتا ہے۔

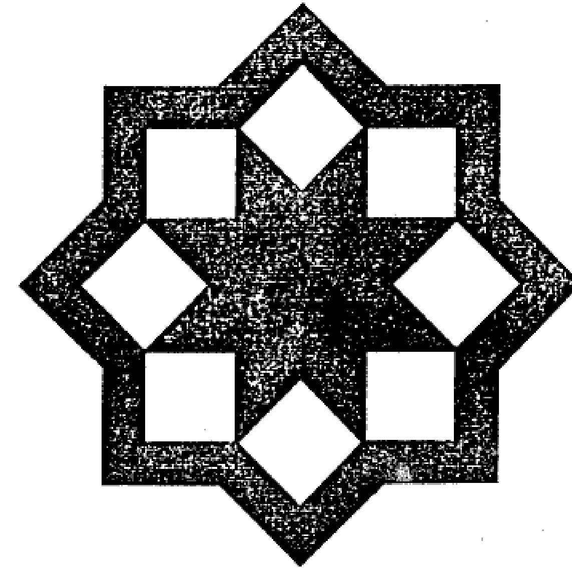
چنانچہ طبرانی کی حدیث مرفوع میں ہے:

" وما كان بعد صلوة العشاء فهو من الليل "(ردالمحتار جلد اصفحہ ۴۸۰)

یعنی نماز عشاء کے بعد جو نفل بھی ہوگا وہ تہجد ہی ہے۔تو اب جو شخص اول وقت میں نماز عشاء پڑھ کر سو گیا۔ پھر ایک گھنٹہ کے بعد آنکھ کھل گئی تو اب وہ جس قدر نفل پڑھیگا وہ نماز تہجد ہی ہوگی۔ تو اسی سے قول زید کا صحیح ہونا اور قول عمر کا خلاف تحقیق ہونا ثابت ہوگیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۲ ربیع الآخر ۱۳۷۶ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل





باب قضاء الفوائت

مسئلہ (۴۵۸)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین دامت برکاتھم العالیہ مسائل ھذا میں جس شخص کی نماز فجر قضا ہو تو وہ پہلے ظہر کی نماز پڑھے یا فجر کی قضا؟۔ یونہی اگر ظہر کی قضا ہو تو عصر کو۔ یا عصر کی قضا ہو تو مغرب کو۔ اگر مغرب کی قضا ہو تو عشاء کو۔ اور عشاء کی قضا ہو تو فجر کو پہلے قضا نماز پڑھے بعد کو وقتی فرض نماز پڑھے۔ یا پہلے وقتی فرض پڑھنے کے بعد اگر جماعت ہو رہی ہو تو جماعت میں شریک ہو یا قضا پڑھے؟۔

زید یہ کہتا ہے کہ جس وقت کی نماز قضا ہوئی تو دوسرے روز اسی وقت پر پہلے قضا بعد کو وقتی فرض نماز پڑھے۔ مثلا دوشنبہ مبارکہ کو نماز ظہر قضا ہوئی تو اب یوم سہ شنبہ کو پہلے قضا پڑھے بعد کو سہ شنبہ کی ظہر اگرچہ جماعت ہی کیوں نہ ہو رہی ہو۔ کیا زید کا کہنا صحیح ہے؟۔ بینوا بالتفصیل توجروا بالجلیل۔

المستفتی، فقیر محمد عمران قادری رضوی مصطفوی غفرلہ ربہ محلہ میر خاں پیلی بھیت شریف

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

صاحب ترتیب پہلے قضا نماز پڑھے اس کے بعد وقتیہ نماز ادا کرے۔ نیز اگر جماعت ہو رہی ہو تو وہ پہلے اپنی قضا نماز پڑھے اور جماعت میں شرکت نہ کرے۔ اور غیر صاحب ترتیب پہلے وقتیہ نماز پڑھ سکتا ہے اور وہ قضا سے پہلے جماعت میں شریک ہو جائے۔

زید کا قول صحیح نہیں ہے کہ صاحب ترتیب پر وہ وقتی نماز سے پہلے قضا نماز کا پڑھنا ضروری ہے تو وہ دوسرے دن کے اوقات کا انتظار کر ہی نہیں سکتا اور غیر صاحب ترتیب کو بھی جلد از جلد پہلی فرصت میں قضا نماز ادا کرنی چاہئے دوسرے روز کا انتظار پھر اسی وقت خاص کا التزام اس کے لئے ثابت کرنا مسائل دین سے ناواقفی کی دلیل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۲۲ صفر المظفر ۱۳۷۸ھ

کتبہ : الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول



باب المساجد

مسئلہ (۴۵۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
ایک مسجد میں کڑیوں کی چھت ہے۔ اہل محلہ یہ چاہتے ہیں کہ چھت کو اکھاڑ کر ڈاٹ لگوادی جائے۔ اہل محلّہ کے پاس صرف سو روپیہ جمع ہیں اس سے زیادہ دام ہونے کی توقع نہیں اور یہ کڑیاں مسجد کے کام میں آنے والی نہیں اور اسی طرح پڑی رہنے سے ضائع ہونے کا خوف ہے۔ لہذا دریافت طلب یہ امر ہے کہ ان کڑیوں کو فروخت کرکے کڑیوں کی قیمت ڈاٹ میں صرف کر سکتے ہیں یا نہیں؟۔ بینوا توجروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

کڑی تختے اجزائے مسجد میں داخل ہیں۔ اگر وہ فی الواقع اس مسجد کی حاجت سے زائد اور آئندہ بھی عمارت مسجد میں کام نہ آئیں اور ان کے اٹھا رکھنے میں ضائع ہونے کا خوف ہو تو اس محلّہ کا ایک مسلمان دیندار خدا ترس مؤتمن معتمد اس بار کو اپنے اوپر اٹھا کر مناسب قیمت کے ساتھ فروخت کر سکتا ہے اور وہ قیمت ڈاٹ میں صرف ہو سکتی ہے۔

عالمگیری میں ہے: مسجد اراد رجل ان ينقضه ويبنيه احكم ليس له ذلك۔ لانه لاولاية له مضمرات الا ان يخاف ان ينهدم تاتار خانيه ۔وتاويله ان لم يكن الباني من اهل تلك المحلة واما اهلها فلهم ان يهدموا ويجددوا ابناءه وليفرشوا الحصير ويعلقوا القناديل لكن من مالهم لامن مال المسجد الا بامرالقاضي خلاصه اه۔ وفي العقود الدرية عن البحر عمدة الفتاوى لايجوز بيع بناء الوقف قبل هدمه اه۔ وفي الهندية عن السراجية لو باعوا غلة المسجداو نقض المسجد بغير اذن القاضي الاصح انه لايجوز اه۔ وفي الدر صرف الحكم اوالمتولي نقضه ثمنه ان تعذر اعادة عليه الى عمارته ان احتاج والاحفظه ليحتاج الا اذا خاف فباعه فيبيعه ويمسك ثمنه ليحتاج۔ وفي الخانية من فصل المقابر والرباطات لو

ذكرنا ان الصحيح من الجواب ان بيعهم بغير امر القاضي لايصح الا ان يكون في موضع لا قاضي هناك ۔

مگر ہاں جو ان کو خریدے وہ کسی ناپاک یا تحقیر کی جگہ جیسے پاخانہ وغسل خانہ وغیرہ میں نہ لگائے، کہ مسجد کے اجزا کی حرمت کا لحاظ ضروری ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۶۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ عورتوں کو مسجد میں دن یا رات میں بغرض عمارت دیکھنے مسجد کے اندر جانا جائز ہے یا نہیں؟۔

عبدالغفار ساکن محلّہ کوٹلہ ۲۸ شعبان ۵۴ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

عورتوں کے لئے مساجد میں جانے۔ جمعہ اور عیدین اور پنجوقتی جماعتوں کی شرکت کرنے کو شرع نے ممنوع قرار دیا حالانکہ شریعت میں ان چیزوں کی کیسی سخت تاکید ہے۔

درمختار میں ہے: ويكره حضورهن الجماعة ولولجمعة وعيد ووعظ مطلقا ولو عجوزا ليلا على المذهب المفتي به لفساد الزمان۔

مراقی الفلاح میں ہے: ولايحضرن الجماعات لما فيه من الفتنة والمخالفة ۔

جوہرہ نیرہ میں ہے: الفتوى اليوم على الكراهية في الصلوات كلها لظهور الفسق في هذا الزمان ۔

علامہ شیخ مصطفی کی شرح کنز میں ہے: ولايحضرن الجماعات مطلقا ولو عجائز في الفجر اوغيره وعليه الفتوى۔

اسی طرح عینی۔ غنیۃ۔ طحطاوی۔ بحر۔ نہر وغیر کتب فقہ میں ہے۔

ان عبارات سے واضح طور پر ظاہر ہوگیا کہ ہمارے مذہب کا اس زمانہ میں قول مفتی بہ یہی ہے کہ بوڑھی عورتوں کی بھی خصوصا شب کے وقت میں خاص ادائے فریضہ کے لئے مساجد میں جانا جائز

نہیں۔ تو ایک غیر ضروری چیز محض عمارت دیکھنے کے لئے عورتوں کا جانا کس طرح جائز ہوسکتا ہے۔ عمارت دیکھنے کی نہ کوئی حاجت۔ نہ وہ شرعاً موکد۔ اور حدیث میں وارد ہے:

فاذا خرجت استشرفها الشيطان رواه الترمذی وفی رواية مسلم تقبل فی صورة شيطان وتدبر فی صورة شيطان الحديث۔

کہ جب عورت نکلتی ہے دو شیطان اس کے ساتھ ہوتے ہیں ایک آگے ایک پیچھے۔

بالجملہ عورت کا صرف عمارت دیکھنے کی غرض سے ہمارے زمانہ فسق وفجور میں نکلنا احتمال فتنہ وفساد سے خالی نہیں۔ لہذا وہ شرعاً ناجائز ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۶۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ سود کے مال سے مسجد بنانا یا عیدگاہ بنانا عندالشرع جائز ہے یا ناجائز؟ بینوا توجروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد پاک مکان ہے اور سودی روپیہ مال خبیث ہے۔ لہذا مال خبیث سے مسجد کی تلویث ممنوع ہے۔ شامی میں ہے۔

لو انفق فی ذلك مالا خبيثا ومالا سببه الخبيث والطيب فيكره لان الله تعالىٰ لايقبل الا الطيب فيكره تلويث بيته بمالا يقبل ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۶۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
مسجد کے فرش کے باہر کوئی درخت عشق پیچاں وغیرہ بوکر اس کی بیل دیوار یا سائبان مسجد پر برائے زیبائش پھیلانا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

خارج مسجد درخت بوکر اس کی بیل دیوار یا سائبان مسجد پر بقصد زیبائش پھیلانا جب بہ نیت تعظیم مسجد ہو شرعاً ممنوع نہیں۔ کما هو مصرح فی كتب الفقه لانه فيه تعظيم المسجد وتقع للناس وليس فيه تفريق الصفوف والضيق على الناس كمافی الهندية ورد المحتار والدر المختار والخلاصة وغيرها فقط۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۶۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
کسی مسجد کو ایک معاہدہ یا اقرار نامہ کے ذریعہ سے جس کی نقل اس استفتاء کے ہمرشتہ ہے گورنمنٹ ہند بن کے محکمہ آثار قدیمہ کی سپرد کردینا اور اس محکمہ کو مندرجہ اقرار نامہ اختیارات دیدینا اور پابندیاں قبول کرنا جائز ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجدیں خاص اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ: ان المسٰجد لله۔

اور ولایت کافر کی مسلم پر جائز نہیں: لا ولاية للكافر على المسلم كما قال الله تعالیٰ: لن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلا۔

اقرار نامہ کی رو سے بہت امور میں نامسلم حکومت کے مقابلہ میں متولیان مسجد کو مجبور ہوجانا پڑتا ہے۔ کیونکہ مسجد کی تعمیر وحرمت قربت ہے اور یہ غیر مسلم سے صحیح نہیں۔

مسجد کی تعمیر مسلمان کے پاک مال سے ہوسکتی ہے۔ کافر کا مسجد بنانا اور اپنے روپے اور اختیار سے اس کی تعمیر کرنا یا مرمت کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ مسجد کی تعمیر ومرمت قربت ہے اور وہ غیر مسلم سے صحیح نہیں۔

درمختار میں ہے:

وشرط سائر التبرعات كحرية وتكليف ان يكون قربة في ذاته ۔

مسجد عبادت کے لئے ہے سوائے معتکف کے دوسرے کے لئے اس میں کھانا۔ پینا۔ سونا۔ بیٹھنا۔ بلکہ دنیا کی باتیں کرنا تک ممنوع ہے۔ ان امور کی مسلمانوں کو بھی اجازت نہیں چہ جائے کہ مومن وکافر سب کے لئے ایک تماشا گاہ بنا دینا۔

الاشباہ والنظائر میں ہے: ومن البيع والشراء كل عقد لغير المعتكف ويجوز له بقدر حاجة ان لم يحضر السلعة وانشاد الضالة والاشعار والاكل والنوم لغير غريب ومعتكف والكلام المباح ۔

مسجدوں میں بلحاظ حرمت مسلمانوں کے بچے تک لانے کی ممانعت ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

جنبوا مساجدكم صبيانكم ومجانينكم وبيعكم وشراءكم ورفع اصواتكم وسيوفكم واقامة حدودكم ۔

مسجد میں آواز بلند کرنے کی ممانعت بھی اسی حدیث سے معلوم ہوگئی، پھر چہ جائیکہ ہر شخص مومن یا کافر کو سیر یا تماشا کے لئے مسجد میں آنے کی تمام اجازت دینا۔

مسجد میں مسلمانوں کو بھی خاص نماز وذکر کے لئے آنے کی اجازت ہے اور ان کے داخلہ کے بھی بہت پابندیاں ہیں۔ چنانچہ جب یعنی بے غسل اور حائضہ اور نفساء مسجد میں داخل نہیں ہو سکتے۔

الاشباہ والنظائر میں ہے: فمنها (اى من احكام المسجد) تحريم دخوله على الجنب والحائض والنفساء ولو على وجه المرور۔

اسی طرح پیاز لہسن یا کوئی ایسی چیز کھانے والا جس کی بدبو کھانے کے بعد اس کے منہ سے آتی ہو مومن بھی داخل نہیں ہوسکتا۔

الاشباہ والنظائر میں ہے: ويكره دخوله لمن اكل ذا ريح كريهة ويمنع منه ۔

اسی طرح جس کے بدن پر نجاست لگی ہوئی ہو وہ بھی مسجد میں داخل نہ ہوگا۔

عالمگیری میں ہے: لايدخل المسجد من على بدنه نجاسة۔

نیز مسلم ونامسلم بے پردہ عورتیں بھی آئیں گی علاوہ اس کے کہ بے پردہ عورتوں کا اور پردہ نشینوں کا دن میں جماعتوں کے اوقات میں بھی آنا ممنوع ہے۔ عامہ کتب۔

لہذا اب کون تحقیق کرے گا کہ وہ عورتیں حائضہ ہیں یا نہیں؟۔ اور اس عام داخلہ کی اجازت کی صورت میں پاک اور ناپاک کا امتیاز کس طرح رہے گا۔ اور یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اس کے بدن یا کپڑے پر نجاست لگی ہے یا نہیں؟۔ اور کس کس کا منھ سونگھا جائے گا کہ شرابی تک مسجد میں آئینگے۔ اس لئے اس تعمیم سے مسجد کی بے حرمتی ہوتی ہے۔

یہ اقرار نامہ متولیوں کے شرعی اختیارات سلب کرتا ہے اور اس سے تولیت کو نقصان پہنچتا ہے اور یہ واقف کے منشا کے خلاف ہے۔

ونية الواقف كنص الشارع۔

علاوہ بریں متولیوں کو ایسا اقرار نامہ لکھنا اور کسی نا مسلم کو اسے اختیارات دینا جائز نہیں۔ کیونکہ واقف نے جب تصرف کی اجازت نہ دی ہو متولی اس تصرف کا اختیار نہیں رکھتا۔

كماهو مصرح فى الكتب۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۶۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) بخدمت جناب قبلہ علمائے دین اسلام علیکم گذرش یہ ہے کہ ہمارے گاؤں کے سب مسلمانوں نے یہ رائے پاس کیا کہ جو مسلمان نماز جمعہ نہ ادا کرے جنازے میں نہ شامل ہو وہ پانچ آنہ جرمانہ دیں۔ وہ جرمانہ مسجد کی مرمت میں لگے سب نے اقرار کیا۔ اور ایک آدمی نے کہا میں نہیں دوں گا۔ جرمانہ دیکر نماز نہیں پڑھوں گا۔ بلکہ الگ رہوں گا ایسے آدمی کے ساتھ کیا کیا جائے۔

(۲) اس آدمی کے باپ نے زندگی میں کچھ روپیہ مسجد کے تعمیری میں چندہ دیا تھا زمانہ زیادہ گذر چکا اس نے سوال کیا ہمارا چندہ واپس کردو سب کی رائے ہوئی کہ واپس کردو وہ واپس کر دیا گیا۔ دینے کے بعد کہا کہ اس وقت چاندی کے روپیہ چلتے تھے ہم چاندی روپیہ کے بھاؤ لیں گے لوگوں نے کہا کیا لو گے کہا ایک کا ڈیڑھ۔ دیا گیا بتائیں آپ اسلامی قانون کیا ہے۔

(۳) پہلے سوال کے جرمانہ کی رقم مسجد میں لگ سکتی ہے یا نہیں۔ کسی عالم کو روپیہ دیکر یا غلہ دے کر نماز اس کے پیچھے پڑھنا روا ہے یا نہیں۔

خطبہ میں جو درود میں نظم درج ہیں پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟۔ برائے مہربانی جواب عنایت کریں۔اور میں جاہل ہوں غلطی اور بے ادبی کی معافی چاہتا ہوں۔اور سوالات بھی زیادہ اس کی بھی معافی چاہتا ہوں۔

المستفتی ،عبدالجبار خاں معرفت رسالہ سنی لکھنو

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) بے نمازی کی تنبیہ کے لیے ایسی سزا کے دینے میں کوئی حرج نہیں جو شرع کے خلاف نہ ہو،لیکن جنازہ میں شامل ہونا تو میت کا حق ہے جس کو کسی رشتہ دار کی سزا کی بنا پر ترک نہیں کرنا چاہیے۔اور سزا میں مالی جرمانہ کرنا تو شرعا جائز ہی نہیں۔

چنانچہ ردالمحتار میں ہے:"الحاصل ان المذہب عدم التعزیر باخذ المال"

اور جب مالی جرمانہ ناجائز ثابت ہوا تو شرعا یہ مال خبیث قرار پایا۔اور مال خبیث کو مسجد میں نہیں لگا سکتے۔لہذا ایسی خلاف شرع رائے طے کرنا اور لوگوں کا اسکو اقرار کر لینا یہ سب غلط فیصلہ ہوا۔اور جس شخص نے جرمانہ دینے سے انکار کیا اگر وہ جرمانہ ہی کا منکر ہے جب تو اس کا انکار کرنا صحیح ہے۔اور اگر وہ نماز سے بھی انکار کرتا ہے تو وہ قابل سزا ہے۔واللہ تعالی اعلم

(۲) شخص مذکور کے باپ نے جو چندہ تعمیر میں دیا تھا اور وہ تعمیر ہی میں صرف بھی ہو چکا تو اسکے بیٹے کو اب اس رقم کے طلب کرنے کا شرعا کوئی حق حاصل نہیں۔نہ لوگوں کو اسے اس رقم واپس کرنا چاہیے تھا۔اور مزید اس کا ایک روپیہ کے مقابلے میں ڈیڑھ روپیہ کا مطالبہ ایسا غلط ہے جس کی اسلام اجازت ہی نہیں دیتا۔واللہ تعالی اعلم

(۳) سوال اول کے جواب میں مذکور ہوا کہ جرمانہ کا مال خبیث مال ہے اور اس کا مسجد میں لگانا جائز نہیں۔واللہ تعالی اعلم

(۴) فقہائے متأخرین نے امامت کی تنخواہ کو جائز قرار دیا ہے تو تنخواہ دار امام کے پیچھے نماز بلا شبہ جائز ہے۔ہدایہ و درمختار وغیرہ واللہ تعالی اعلم۔

(۵) خطبہ کا اردو کی نظم یا نثر میں پڑھنا خلاف سنت متوارثہ ہے اور مکروہ تنزیہی ہے۔اس کا مفصل و مدلل جواب فتاوی اجملیہ میں ہے واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ : الفقیر الی اللہ عزوجل ،العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۴۶۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

گذارش یہ ہے کہ قصبہ کوچندہ میں آج زمانہ ۳۵ سال کا ہوتا ہے کہ اس وقت یہاں مسلمانوں کی حالت اچھی تھی اور سب گیا، پٹنہ، بنارس وغیرہ وغیرہ کے رہنے والے تھے،اور راجہ بامڑہ ان لوگوں کو بہت عزت اور قدر کرتا تھا۔یہ لوگ عہدہ دار بھی تھے۔یہاں ایک مسجد بنوائی اور اس وقت مسلمانوں کا خرچ ہوا اور راجہ بامڑہ نے بھی کافی روپیہ اور انجام دیکر مسجد بنوائی۔بعد جب مسجد بن گئی تو چند جگہ سے چند عالموں اور علاموں کو بلوا کر میلا دہوئی۔بعد اس کے جتنا روپیہ راجہ بامڑہ کا خرچ ہوا تھا سب کے سامنے وقف کر دیا۔وقف کرنے کے بعد بھی راجہ بامڑہ چند دفعہ اور بھی مسجد کی مرمت تعمیری بھی کیا۔لہذا اس وقت اب وہ مسلمان بھی نہیں۔اگر ہیں بھی تو ان کے خاندان والے۔تو ان کی حالت اچھی نہیں۔وہ عہدہ اور ہستی نہیں علاوہ ازیں اب راجہ بامڑہ کا وہ خود سر زمانہ نہیں۔اسٹیٹ اس وقت ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔مسجد کی حالت اس وقت بالکل خراب ہے۔تمام سے شق ہوگئی ہے ممکن ہے اگر اس سال مرمت تعمیر یہ لوگوں نے نہیں کیا تو شہید ہو جانے میں کوئی اندیشہ نہیں۔خدانخواستہ اگر ایسی حالت ہوئی تو آئندہ از سر نو بنانا غیر ممکن ہے۔یہاں کے غیر مسلم مارواڑی اڑیسہ جو ان کی آبادی بہت ہے یہ لوگوں کا سوال یہ ہوتا ہے اگر آپ لوگوں سے نہیں ہوتا ہے ہم لوگوں کو دیدیجئے ورنہ چندہ ہم لوگوں سے کافی روپیہ لیکر مسجد کی مرمت کرائیے ہم لوگ خوشی سے دینگے، دینے کو تیار ہیں،ہم چند ایسے غیر مسلموں سے سنا ہے رامپور شفق صاحب کے یہاں لکھا ہوا حوالہ فتوے کا آپ کے یہاں کا جواب دیا۔امید کہ آپ جواب سے بندہ کو آگاہ فرمائینگے۔فقط

راقم الحروف عبدالرزاق عراقی مقام وڈاکخانہ کوشمی اسٹیٹ بامرۃ ضلع سجھیر اڑیسہ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

غیر مسلموں سے مرمت مسجد میں بھی چندہ نہیں لینا چاہئے۔ہاں ایک یہ صورت ہوسکتی ہے کہ وہ لوگ کسی مسلمان کو اس چندہ کی رقم کا مالک بنادیں اور پھر وہ مسلمان اس رقم کو تعمیر مسجد میں خرچ کردے اس میں کسی قسم کا حرج وخطرہ نہیں۔واللہ تعالی اعلم ۱۱ جمادی الاخری ۱۳۷۶ھ

کتبہ : الفقیر الی اللہ عزوجل ،العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ

(۴۶۶)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

کہ میں ایک مسجد کا متولی ہوں اور مسجد کا کچھ روپیہ میرے نام سے بینک میں جمع ہے جس کا سود نہیں لیا جاتا ہے۔ مقامی حکومت مجھے مجبور کر رہی کہ یا تو مسجد کا یہ روپیہ خرچ کر دیا جائے ورنہ اس روپیہ سے سرکاری قرضہ کی دستاویزات خرید لی جائیں۔ سر دست مسجد کا کوئی ایسا کام بھی نہیں ہے جس میں یہ روپیہ خرچ کر دیا جائے نہ ہی حکومت مسجد کے لئے کوئی زمین یا مکان وغیرہ خریدنے کی اجازت دیتی ہے۔ جس سے مسجد کی آمدنی میں اضافہ ہو سکے لہذا اس بارے میں مجھے مفصل جواب سے سرفراز فرمائیں کہ

(۱) ازروئے شرع شریف مسجد کا روپیہ دیگر امور خیر میں خرچ کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

(۲) اگر خرچ کیا جا سکتا ہے تو اس کا صحیح مصرف کیا ہو سکتا ہے۔

(۳) بینک میں مسجد کا جو روپیہ جمع ہے اس کا سالانہ سود لینا جائز ہے یا نہیں اگر سود لیا جائے تو اس روپے کو کن امور میں خرچ کیا جائے۔

نوٹ مسجد کا محل وقوع ایسا ہے کہ جہاں مسلم آبادی بہت کم بلکہ الشاذ کالمعدوم کے مصداق ہے جسکی وجہ سے اس مسجد میں کوئی دینی درسگاہ بھی قائم نہیں کیجا سکتی۔

خاکپائے علماء حاجی غلام مصطفےٰ مسلم سوسائٹی احمد آباد

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صورت مسئولہ میں فی الواقع اس وقت جب وہ مسجد روپئے سے بے نیاز ہے سر دست اس میں کوئی ایسا کام نہیں جس میں یہ روپیہ خرچ کر دیا جائے نیز اس کا ماحول بھی ایسا نہیں ہے جس کی بنا پر کوئی دینی درسگا بھی جاری کی جا سکے اور حکومت اس روپیہ سے مسجد کے لیئے کوئی زمین یا مکان وغیرہ خریدنے کی بھی اجازت نہیں دیتی اور بصورت خرچ نہ ہونے کے اس روپیہ کو حکومت لینا چاہتی ہے تو اس مال موقوفہ کے تحفظ کے لیے صرف ایک صورت ہے اس رقم کو کسی حاجتمند مسجد یا مدرسہ کو بطور قرض دیا جائے اور حکومت کو اس روپیہ کا خرچ باور کرا دیا جائے پھر جب اس مسجد کو کوئی حاجت ہو یا حکومت کی نہ دینے سے بچنے کی کوئی صورت پیدا ہو تو اس قرض کو وصول کر لیا جائے اور مصالح مسجد میں صرف کیا جائے لہذا اس صورت میں وہ روپیہ اس دوسری مسجد یا مدرسہ میں درحقیقت اس کا مصرف صحیح سمجھ کر خرچ نہیں کیا

گیا ہے بلکہ اسکے ضائع ہو جانے سے تحفظ مقصود ہے جسکی ایک نظیر فتاوے عالمگیری میں ہے:

مال موقوف علی المسجد الجامع و اجتمعت من غلاتها ثم نابت الا سلام نائبة مثل حادثة الروم و احتیج الی النفقة فی تلك الحادثة اما المال الموقوف علی المسجد الجامع ان تکن للسمجد حاجة للحال فللقاضی ان یصرف فی ذلك لکن علی القرض اقول فی هذه الصورة المتولی قائم مقام القاضی فی تصرف المال الموقوف بل صرح فی الاشباه فی قاعدة الولایةالخاصة اقوی من الولایة العامة بعدان ذکر فروعا و علی هذا لا یملك القاضی التصرف فی الوقت مع وجود ناظر ای متول الخ فان لم یثبت للمتولی هذه التصرف و لم ینقل مال هذه المسجد بطریق القرض الی مسجد أخر او مدرسة المحتاجین الی النقل الیهما فیاخذ الحکومة وضاع وقف هذه المسجد و ایضا خرب المسجد الاخر او المدرسة فغرض الواقف بما قلنا و یعود الوقف الی محله۔

اور سود تو حرام و ناجائز ہی ہے پھر مسجد کے روپیہ پر سود لینا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ البتہ اس وقت اس منافع کی رقم کو بینک ہی میں نہ چھوڑ دینا چاہیے۔ بلکہ اس کو وہاں سے وصول کر کے فقراء کو بغیر نیت ثواب دیدیا جائے کہ ایسے مال حرام کا مصرف صرف فقراء ہی ہیں۔'' اور ایسا مال خبیث مسجد میں تو کسی طرح صرف نہیں کیا جا سکتا'' ''فیکرہ تلویث بیت الله بالمال الخبیث'' واللہ اعلم بالصواب۔

۱۴ رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ

(۴۶۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) مسجد کی آمدنی سے جو دوکانیں وغیرہ وقف مسجد کی ہیں اس سے فاتحہ وغیرہ دلا کر شیرینی لوگوں کو تقسیم کرنا کیسا ہے؟۔

(۲) جو شخص مسجد کو ملکیت ثابت کرے اس میں نماز ہو جائیگی یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) جس دوکان کی آمدنی مسجد کے لئے وقف ہے تو اس آمدنی سے فاتحہ وغیرہ کے لئے شیرنی نہیں خریدی جاسکتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) اگر فی الواقع جو مسجد کسی کی خاص ملک ہو اور اس میں دوسروں کو نماز پڑھنے کی اجازت نہ ہو پھر بھی اگر کسی نے اس میں نماز پڑھ لی تو ہو جائیگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۶۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
مسجد کا فرش عیدگاہ لیجانا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا مع حوالہ کتب تسلی بخش مرحمت فرمائیں
المستفتی، زید الدین فرید پور ضلع بریلی

الجواب

جو فرش مسجد کی ضرورت سے زائد ہو اس کو بوقت ضرورت عیدگاہ لے جاسکتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۶۹)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں
کہ مسجد کی آمد کے لئے مسجد کے صحن میں جو قبرستان تھا وہ تمام قبروں کا صفایا کروا کر دوکانیں بنالیں۔ اور زید سود کے چٹیاں چلاتا ہے جو ہر ہفتہ میں ایک وقت سوال پکارتا ہے جو ہزار اور پانچسو نہیں سوال میں جو آدمی سود بڑا کر لیتا ہے اس کے نام سے وہ چٹ چھوڑتا ہے پھر وہ سود کے روپئے کو بھی سوال چھوڑتا ہے۔ غرض یہ روپئے سے مسجد کے لئے دوکانیں طیار ہوتی ہیں زید اس طرح روپیہ جمع کرکے مسجد کے لئے کام میں لانا جائز ہے یا ناجائز؟ عنداللہ ماجور وعندالناس مشکور فرمائیں۔
غوث ۹/۳ پیر مرچنٹ دکھنی پیٹ مدن پلی (ضلع چتر آندھرا)

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد میں کسی مال خبیث سود وغیرہ کا کوئی پیسہ ہرگز صرف نہیں کیا جاسکتا۔ نہ مسجد کے لئے ایسے خبیث مال سے دوکانیں تیار کرنے کی اجازت ہے۔ اور شرعاً قبرستان کی ایسی بے حرمتی کرنا اور اس کی قبروں کو صاف کرنا بھی ممنوع ہے۔ بالجملہ دین پاک مسجد کے لئے ایسی ناپاک آمدنی کی اجازت نہیں دیتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۳ شوال المکرم ۶/۱۳۷۶ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۷۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
اس بستی میں دو مسجد ہے۔ ایک مسجد بالکل شہید ہموار زمین اور ایک مسجد جو ٹوٹی پھوٹی مرمت کے لائق تھی جس میں پنجوقتہ جماعت ہوتی تھی۔ بستی کے لوگوں نے چندہ کیا اور مشورہ ہوا کہ ٹوٹی پھوٹی مسجد کو اچھے حالت میں بنایا جائے اور اسی مسجد کا چندہ صحیح ہے۔ مگر ایک وہابی عالم نے فتویٰ دیا کہ جو مسجد بالکل شہید ہے ہموار زمین ہے اس کو بنایا جائے۔ چند لوگوں نے بالکل شہید مسجد کو بنایا۔ بعد میں ٹوٹی پھوٹی مسجد جس میں جماعت ہوتی ہے بالکل شہید ہوگیا۔ اب لوگ جماعت کی نماز نئی مسجد میں پڑھتے ہیں۔ ایک عالم صاحب نے فرمایا کہ اس مسجد کا روپیہ اس مسجد میں لگانا یہ مسجد کا قرض ہے۔ اس لیے اس مسجد میں نماز نہیں پڑھنا چاہیے ورنہ نماز باطل ہوجاتی ہے۔ ایسی حالت میں ہم لوگ کیا کریں؟۔
ایم، اے جلیل معرفت رسالہ سنی لکھنوء

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

یہ تو صحیح ہے کہ ایسی مسجد کا چندہ جو خود مرمت کی محتاج تھی دوسری ایسی مسجد میں جو بالکل منہدم ہو چکی ہے ہرگز نہیں لگانا چاہئے تھا۔ لیکن جب ایسی غلطی ہوچکی اور اس چندہ سے وہ منہدم شدہ مسجد تعمیر ہو چکی تو اس میں نماز اور جماعت کا پڑھنا بلاشک جائز و درست ہے۔ اس میں نماز کو باطل قرار دینا خود باطل حکم ہے۔ البتہ پھر چندہ کرکے اس مسجد کا قرض ادا کردیا جائے اور وہ مسجد بھی تعمیر کردی جائے۔ واللہ تعالیٰ

اعلم بالصواب ۔ ۴ شوال المکرم ۶ ۱۳۷ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل ، الفقیر الی اللہ عز وجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۷۱)

مکرمی جناب قبلہ مولوی مفتی محمد اجمل شاہ صاحب سنبھل شریف ...... السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) گذارش یہ ہے کہ یہاں منڈی ٹنکپور ضلع نینی تال میں ہم دو فریق ہیں اول ہم بفضل خدا حنفی اہل سنت اور دوئم دیوبندی خیال یہاں مسجد ایک ہے اور اس ہی میں دونوں فرقہ کا ایک ہی امام ہے اہل سنت کے پیچھے نماز پڑھتے چلے آرہے تھے اور پیش امام وغیر کا انتظام بھی فریق اول ہی کیا کرتے تھے مگر کچھ ماہ سے ہم لوگوں کی سچائی اور سیدھائی سے فریق دوئم اپنا ہم خیال پیش امام مقرر کرنے میں کامیاب ہوگئے ۔ بعد میں جب یہ معلوم ہوگیا ۔ جیسا کہ ہمارے علماء کرام کا حکم ہے ہم فریق اول نے ان کے پیچھے نماز پڑھنا چھوڑ دیا اور زیادہ جھگڑا بڑھنے کی وجہ سے چند ماہ مسجد بھی چھوٹی رہی مگر کہاں تک صبر کیا جاتا پھر ہم فریق اول نے متفق ہوکر اپنا امام بلا کر یہ ارادہ کیا کہ ہم اپنی نماز الگ پڑھنگے ۔ اس پر فریق اول دیوبندی صاحبان نے بڑا اثر پیدا کیا اور نماز الگ پڑھنے کی ہماری جائز بات کا جھگڑا اقرار ادے کر نماز روکنے کی کوشش کی مگر درمیان میں یہاں بفضل خدا مسجد اور حجرات وغیرہ من جملہ آٹھ دوکان کے چار دوکان ہم فریق اول ایک کو دینا قرار پایا اور جس پر بفضل خدا وہ قابض ہیں علاوہ زمیں جو پشت مسجد پر واقع ہے ۔ وہ چار دوکانات کے فریق دوم دیوبندی صاحبان کو دی گئی جس کا اقرار نامہ باہمی مرتب ہوگیا اب اس ہی آراضی میں فریق دوم نے ایک مسجد جو کہ ضد کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے بنالی اور اس ضد سے مسلمانوں کو ضرر پہنچا جیسا کہ سورہ توبہ میں مسجد ضرار کا واقعہ گذرا لہٰذا اب وہ اپنی نماز الگ پڑھتے ہیں اور اس نوتعمیری مسجد میں نماز جو قرأت پڑھی جاتی ہے اس کا آواز قدیم مسجد میں بالکل صاف آتا ہے اور فاصلہ بھی اندازہ دس پندرہ گز کا ہے کیا ایسی حالت میں اس مسجد میں نماز جائز ہے ۔

(۲) اب بموقع عید الفطر دیوبندی صاحبان میں ہم میں سے بعض حضرات اہل سنت کو بہ اصرار اپنے مکان پر لیجا کر سوئیاں وغیرہ کھلائیں اور پھر ان ہی حضرات فریق اول نے بھی دیوبندی صاحبان کو بلا بلا کر خاطر مدارات سے کھلایا پلایا جب کہ پیچھے مسجد اور مسجد خدا کے واسطے سے دیوبندی صاحبان نے

سلام دعا میل ملاپ بھی ترک کیا ہوا ہے ۔ لہٰذا ان دونوں مسئلوں میں روشنی ڈال کر خدا اور رسول کے حکم سے ہم کو آگاہ فرمایا جائے تا کہ راہ راست نصیب ہو اور آئندہ غلط راہ سے بچیں اس مسئلہ میں اگر ہم پر کوئی کفارہ وغیرہ بھی واجب ہوتا ہو تو وہ بھی صاف صاف حکم خدا اور رسول سے جلد از جلد آگاہ فرما کر ثواب دارین حاصل فرمائیں ۔

المستفتی ، عبد الرؤف بقلم خود ، جمیل بقلم خود ، شفاعت خاں
۴ شوال المعظم ۶ ۱۳۷ھ ٹنکپور منڈی ضلع نینی تال

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) نماز تو ان میں سے ہر ایک مسجد میں جائز ہے رہا قرأت دوسری کے لئے مانع قرار نہیں پاتی ۔ ہاں یہ بات پہلے ہی ضرور قابل لحاظ تھی کہ جدید مسجد کو مسجد قدیم کے اسقدر قریب تعمیر نہیں کرنا چاہئے تھا اب جب کہ وہ تعمیر ہو چکی ہے تو ان میں سے کسی کو غیر آباد اور ویران نہیں کیا جا سکتا ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) دیوبندیوں ، غیر مقلدوں ، قادیانیوں ، رافضیوں وغیرہ گمراہوں سے میل جول ، سلام کلام ، ان کے ساتھ نشست وبرخاست ان کے ساتھ کھانے پینے ۔ نماز پڑھنے نکاح کرنے کی ممانعت احادیث میں وارد ہے :۔

وفی صحیح مسلم ایاکم وایاھم لا یضلونکم ولا یفتنونکم (وفی ابی داود) وان مرضو فلا تعودوھم وان ماتو فلا تشھدوھم (وزاد ابن ماجه) وان لقیتمو ھم فلا تسلموا علیھم (وعند العقیلی) لا تجالسوھم ولا تشاربوھم ولا تواکلوھم ولا تناکحوھم (زاد ابن حبان) لا تصلوا علیھم ولا تصلوا معھم ۔

ان احادیث کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ گمراہوں سے الگ رہو ۔ انہیں اپنے سے دور رکھو کہ وہ کہیں تمہیں بہکا نہ دیں اور تمہیں فتنہ میں ڈال نہ دیں ۔ وہ اگر بیمار پڑیں تو پوچھنے نہ جاؤ ۔ اور اگر مر جائیں تو جنازہ پر حاضر نہ ہو ۔ جب تم ان سے ملو تو سلام نہ کرو ۔ ان کے پاس نہ بیٹھو ۔ ان کے ساتھ پانی نہ پیو ۔ ان کے ساتھ کھانا نہ کھاؤ ۔ ان کے ساتھ نکاح نہ کرو ۔ ان کے جنازے کی نماز نہ پڑھو ۔ ان کے ساتھ نماز نہ پڑھو ۔

لہٰذا ان گمراہوں کے ساتھ تعلقات کے بارے میں حضور نبی کریم ﷺ کے یہ احکام ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۹ شوال المکرم ۱۳۷۳ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۷۲)

بخدمت جناب مولوی مفتی والحاج اجمل خان صاحب مدظلہ العالی

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں مدلل جواب عنایت فرمائیں

(۱) ہماری مسجد کا صحن کافی وسیع ہے نمازیوں کی تعداد کافی کم ہے صحن کا فرش شروع ہی سے سمنٹ کا بنا ہوا ہے موسم گرما میں بہت گرم رہتا ہے دری وغیرہ کا کافی انتظام ہے اور پانی بھی چھڑکا جا سکتا ہے جس سے قدرے سکون نصیب ہو جاتا ہے چند احباب کا یہ کہنا ہے کہ مسجد کی چھت پر نماز پڑھی جایا کرے اگر ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ مسجد کی چھت پر نماز مکروہ ہے تو وہ چند مقامی مسجدوں کی جن کی چھت پر نماز پڑھی جاتی ہے مثالیں پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کی چھت کے سامنے کی دیوار قد آدم بنالی جائے اور محراب بنادی جائے نماز مکروہ نہیں ہوگی۔ فرمائیے کہ کیا حکم ہے اس بات میں۔

(۲) ایک مسلم کا ایک غیر مسلم عورت سے برسوں سے ناجائز تعلق ہے اس نے نکاح نہیں پڑھا ہے اور اس کے بطن سے بچے پیدا ہوتے ہیں اچانک کسی حادثہ کے باعث ناگہانی دونوں کی موت ہو جاتی ہیں فرمائیے ان کی تجہیز و تکفین کس طرح سے ہو کیا اصول اسلامی کے مطابق ہو ان کی جنازے کی نماز پڑھائی جاوے یا نہیں اگر کسی عالم کے فرمانے کے بموجب اس کی نماز جنازہ پڑھائی جاوے تو کیا نماز پڑھانے والے پر کفارہ واجب ہو جاتا ہے۔

(۳) کیا نابالغ کے پیچھے تراویح پڑھنا جائز ہے برائے کرم مذکورہ مسائل پر مکمل روشنی ڈالیں اور جواب عنایت فرمائیں۔

(۴) کیا فرماتے ہیں علماء دین ان مسائل میں کہ اگر کسی شخص نے دو سگی بہنوں سے نکاح کر رکھا ہے جو قطعاً حرام ہے اگر ان دونوں کے بطن سے اولاد ہو اور بالفرض سن بلوغیت کے پہنچنے سے پہلے

ان کا انتقال ہو جائے تو ان کی تجہیز و تکفین کیسے کی جاوے۔ یہ بھی فرمائیں کہ ایسے بچے جن کا ذکر ابھی کیا ہے سن بلوغیت پر پہنچ جائیں تو ان کی شادی کے کیا حکم ہے؟۔ اور مرنے پر تجہیز و تکفین کیا اسلامی اصول کے مطابق کی جا سکتی ہے؟۔ اور کیا ان کے جنازے کی نماز پڑھ سکتے ہیں؟۔ جواب عنایت فرمائیں سن بلوغ ہونا بالغ دونوں حالتوں میں اگر جدا احکام ہوں تو مرحمت فرمائیں۔ ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ

احقر العباد عبد الحمید پیش امام مسجد واقع محلہ دھوبی تلائی۔ بیکانیر راجستھان

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

(۱) بلا ضرورت کے مسجد کی چھت پر نماز پڑھنا مکروہ ہے کہ اس میں ترک تعظیم ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے " وتكره الصلوة على سطح الكعبة لما فيه من ترك التعظيم"

ردالمحتار میں ہے " ولزمه كراهة الصلوة ايضاً فوقه (اى المسجد) "

بلکہ بلا حاجت مسجد کی چھت پر چڑھنا بھی مکروہ ہے۔

ردالمحتار میں ہے" نقل عن المفيد كراهة الصعود على سطح المسجد "

تو ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ بلا ضرورت مسجد کی چھت پر نماز کا پڑھنا مکروہ ہے بلکہ صرف چڑھنا بھی مکروہ ہے کہ اس میں ترک تعظیم مسجد ہوتی ہے۔ اور صورت مسئولہ میں مسجد کی چھت پر بلا ضرورت ہی نماز پڑھنا اور چڑھنا ہے تو یہ مکروہ ہوا۔ اور اس میں ترک تعظیم مسجد کا گناہ بھی ہوگا۔ اور اوپر دیوار بنالینے اور اس میں محراب قائم کر دینے سے اس کی کراہت نہیں اٹھ سکتی۔ اور ترک تعظیم مسجد جائز نہیں ہو سکتی پھر اگر دوسری مساجد میں خلاف شرع کوئی فعل جاری ہو جائے تو وہ دلیل جواز نہیں بن سکتا بلکہ ان اہل مساجد کو بھی بلا ضرورت ایسا فعل مکروہ نہیں کرنا چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) صورت مسئولہ میں جب وہ کہ زنا سے ہے تو اس بچہ کا نسب شرعاً اس حکم سے تو ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس کا باپ ہے قرار نہیں پاتا۔

فتاوی عالمگیری میں ہے" ان قال انه فى من الزنا فلا يثبت نسبه ولا يرث منه "

تو وہ بچہ احکام تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ میں اس حکم زانی کا تابع تو نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا یہ بچہ اپنی ماں کے تابع ہوگا اور ماں غیر مسلمہ ہے تو اس بچہ کی نہ تو شرعی طور پر تجہیز و تکفین کی جائے گی نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے۔ پھر اگر کسی عالم نے اسی صورت مسئولہ میں اس بچہ کی نماز جنازہ کا غلط حکم دیدیا اور اس

غلط حکم کی بنا پر کسی امام نے اس کی نماز جنازہ پڑھادی تو اس امام پر شرعاً کوئی کفارہ تو لازم نہیں آتا لیکن پھر بھی اس کو توبہ واستغفار کر لینی چاہیے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) نابالغ کے پیچھے تراویح پڑھنا صحیح نہیں کبیری میں ہے:

ولا یصح اقتداء البالغ بغیر البالغ فی الفرض وغیرہ وھو الصحیح۔

(کبیری صفحہ ۴۸۱)

درمختار میں ہے: ولا یصح اقتداء رجل بامرأۃ وخنثیٰ وصبی مطلقا ولو فی جنازۃ ونفل علی الاصح۔

(از ردالمختار صفحہ ۲۰۵)

ردالمختار میں ہے: انہ لا یجوز فی الصلوت کلھا۔

طحطاوی میں ہے: قال بعض مشائخ بلخ یصح اقتداء البالغ بالصبی فی التراویح والسنن المطلقۃ والنفل والمختار عدم الصحۃ بلا خلاف بین اصحابنا۔

(طحطاوی صفحہ ۱۶۷)

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

وعلی قول ائمۃ بلخ یصح الاقتداء بالصبیان فی التراویح والسنن المطلقۃ کذا فی فتاویٰ قاضی خان والمختار انہ لا یجوز فی الصلوت کلھا کذا فی الھدایۃ وھو الاصح ھکذا فی المحیط وھو قول العامۃ وھو ظاھر الروایۃ ھکذا فی البحر الرائق

(عالمگیری قیومی جلد ۱ صفحہ ۲۲)

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ بالغوں کو نابالغ کے پیچھے تراویح پڑھنا صحیح نہیں یہی عام فقہا کا قول صحیح اور مختار اور اصح ہے اور یہی ظاہر الروایت ہے اور یہی اکثر مشائخ کا مسلک ومذہب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۴) بلاشبہ دو سگی بہنوں کا ایک وقت میں جمع کرنا حرام ہے قرآن کریم میں ہے:

وان تجمعوا بین الاختین۔ (سورہ النساء)

پھر جب ان سے اولاد ہو جائے تو وہ اگر سن بلوغ کو پہونچ جائے تو ان کے خود مسلمان ہونے کی بنا پر نکاح شادی بھی کی جائے گی۔ اور اگر شرعی طور تجہیز وتکفین بھی ہوگی اور نماز جنازہ بھی پڑھی جائیگی۔ اور اگر وہ اولاد سن بلوغ کو نہیں پہونچی ہے تو بھی وہ اپنی اپنی مسلمان ماں کی تبعیت میں شرعی طور پر تجہیز

وتکفین کے مستحق اور ان کی نماز جنازہ بھی پڑھی جائیگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۱۹ محرم الحرام ۱۳۷۷ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۷۳)

کیا فرماتے ہیں علماء کرام مفتیان عظام مسائل مندرجہ ذیل کے جواب میں

(۱) کہ شہر ناگور میں ایک مسجد محلّہ نکاس میں مسجد حمالوں کے نام سے مشہور ہے کئی برسوں پہلے مسجد مذکور بہت نیچے چلی جانے کی وجہ سے بھرتی بھروا کر اوپر دوسری منزل کی شکل میں لے لی گئی تھی اور پہلی منزل میں بھرتی بھروادی گئی تھی اس پہلی منزل مسجد میں جس جگہ جماعت کی پہلی صف نماز پڑھا کرتی تھی ایک شخص نے دیوار میں دروازہ بنا کر ایک دوکان سی بنالی تھی اور اب وہاں ایک شخص دیگر چائے کا ہوٹل کرتا ہے۔

اسی پہلی منزل کی مسجد میں جہاں پہلی صف جماعت کی نماز پڑھتی تھی دوکان کا ہونا جائز ہے یا نہیں برائے کرم پوری طور پر جواب مرحمت فرمائیں۔

(۲) ایسے شخص کے لئے کیا حکم ہے جو کہ خلاف مرضی مسلمانان اہل محلّہ زبردستی اس مسجد مذکور کی پہلی منزل میں جہاں پہلے صف نماز پڑھتی تھی دوکانداری کرتا ہوا اور خالی نہیں کرتا ہو۔

(۳) ایک شخص جو مسئلہ سے واقف ہوتے ہوئے اس دوکاندار مذکور بالا کو غلط راستہ بتا کر مذکور مسجد خالی نہیں کرنے دیتا ہوا ایسے شخص کے لئے شرعاً کیا حکم ہے۔ برائے کرم تینوں مسائل کے جواب مفصل طور پر مرحمت فرمائیں۔

المستفتی، مسجد محلّہ نکاس ناگوار محمد صدیق۔ صدر انجمن محمد حسین معتمد انجمن تبلیغ العلی محمد یوسف

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جس محدود زمین کا مسجد ہونا متعین ہو چکا تو وہ تحت الثریٰ سے آسمان تک مسجد قرار پا چکی۔ شرعاً اس کے کسی جز پر دوکان بنالینا ناجائز وحرام ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: اذا اراد الانسان ان یتخذ تحت المسجد حوانیت غلۃ لحرمۃ المسجد او فوقہ ولیس لہ ذلک کذا فی الذخیرۃ۔

(عالمگیری قیومی جلد۲ صفحہ ۳۴۷)

درمختار میں ہے: لو تمت المسجدیة ثم اراد البناء منع۔

(ردالمحتار جلد۳ صفحہ ۳۸۲)

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ مسجد کے کسی جز پر نیچے اور اوپر اس کی مسجدیت کے تمام ہوجانے کے بعد ضرورت مسجد کے لئے بھی دوکانیں یا کوئی تعمیر کا بنانا ممنوع وناجائز ہے شرعاً متولی کو یا اہل محلہ کو یا کسی مسلمان کو اس کے کسی حصہ کی مسجدیت کے باطل کردینے اور اس میں تصرف کرکے دوکان بنانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ لہذا شخص مذکور اگر اپنے اس خلاف شرع تصرف اور زبردستی دوکانداری سے باز نہ آوے۔ اور اس حصۂ مسجد کو اپنے تصرف سے خالی نہ کرے۔ تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ قانونی اخلاقی ہر طرح کے دباؤ ڈال کر اس کے ناجائز تصرف سے اس حصۂ مسجد کو خالی کرائیں۔ اور اس کے جدید دیوار کو منہدم کرکے اور دروازہ کو بند کرکے جیسی پہلی مسجد کی شکل تھی اسی طرح قابل جماعت ونماز بنا دیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

۳ صفر المظفر ۱۳۷۷ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۷۴)

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں

کہ ایک مسجد کی کچھ رقم چندہ کی بسلسلہ تعمیر مسجد جمع ہے لوگوں کا ارادہ ہے کہ اس رقم سے سینگ کا کھاد۔ یا انگریزی کھاد۔ یا آلو کی بیج خرید کر اہل ضرورت حضرات مسلم یا غیر مسلم کو کچھ نفع سے ادھار دیدیا جائے۔ جب آلو کی فصل آئے تب وہ روپیہ ان لوگوں سے وصول کرلیا جائے۔ اس صورت سے مسجد کا روپیہ بڑھ جائیگا اور تعمیر مسجد میں سہولت ہوگی۔ چونکہ اہل محلہ غریب لوگ ہیں۔ اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ روپیہ مذکور کو جو مسجد کی ملکیت ہوچکا ہے اس طرح سے تجارت میں لگانا اور پھر اس پر جو منافع حاصل ہوں مسجد میں لگانا شرعاً درست ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صورت مسئولہ میں اگر چندہ دہندگان یہی لوگ ہیں جو اس محدود رقم کو تجارت میں لگا کر

بڑھانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور یہ چندہ تعمیر مسجد ہی کی غرض سے جمع کیا گیا ہے۔ اور اہل محلہ اپنی غربت کی بنا پر اس عمارت مسجد کی تکمیل نہیں کرسکتے ہوں۔ اور تجارت سے رقم کثیر ہوکر مسجد کی تعمیر مکمل ہوجانے کی امید ہو۔ تو ظاہر ہے کہ یہ مقصد محض منفعت مسجد اور تکمیل عمارت مسجد ہی کے لئے ہے تو بنا بر قاعدہ فقہ کے ”الامور بمقاصدها“ اس سلسلہ تجارت میں اگر منافع کا ظن غالب ہے اور فساد و تضیع رقم کا خطرہ نہ ہو اور بہتر یہ ہے کہ کوئی نیک شخص اس رقم کا ضامن بنکر اس سے اشیاء مذکورہ یا اور کوئی چیز خرید کر منافع کے ساتھ بیع کرے۔ اور اپنے اعتماد پر ادھار بھی بیچ دے تو شرعاً ایسا کرنا درست ہے۔ اور جائز طور پر جو اسکے منافع حاصل ہوں ان کے مسجد میں صرف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور اگر ان ارادہ کرنے والے لوگوں کا چندہ ہی نہیں ہے تو چندہ دہندگان سے اس رقم سے تجارت کرنے کے لئے اجازت کا حاصل کر لینا ضروری ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۷۵)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

کہ حالیہ میونسپل انتخابات میں ہمارے حلقہ سے جملہ امیدواران غیر مسلم تھے۔ ان میں سے ایک نے کچھ رقم اس شرط پر پیش کی کہ جملہ مسلم ووٹران میری حمایت کریں چنانچہ اس پر عمل کیا گیا۔ اب رائے یہ قرار پائی کہ اس رقم کو مسجد کی مرمت میں صرف کردیا جائے اور متعلقہ مسجد دکان تعمیر کردی جائے جس کے کرایہ کی آمدنی مسجد میں صرف ہوتی رہے۔ زید کہتا ہے کہ اس قسم کی رقوم مسجد میں لگانا یا دوکان بنا کر اس کا کرایہ مسجد میں لگانا جائز نہیں ہے بکر کہتا ہے کہ مسجد میں لگانا تو واقعۃً جائز نہیں مگر دوکان بنا کر اس کا کرایہ لگا سکتے ہیں اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کس کی رائے صائب ہے اور کون حق پر ہے۔ بینوا توجروا فقط

السائل: قدرت اللہ ٹیلر ماسٹر بازار برازہ چندوسی ضلع مراد آباد یوپی ۲۱ اکتوبر ۱۹۵۷ء

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بہتر یہ ہے کہ ایسی رقم سے مسجد کو محفوظ رکھا جائے اگرچہ ووٹروں نے جب اپنی طرف سے اس رقم کو دیا ہے تو یہ تعمیر دوکان متعلقہ مسجد میں شرعاً صرف کی جاسکتی ہے اور اسکا کرایہ بھی مسجد میں صرف کیا

جاسکتا ہے لیکن حرمت مسجد کی ملحوظ رکھتے ہوئے احتیاط اسی میں ہے کہ مسجد کو ایسی رقم سے بچایا جائے۔
واللہ تعالی اعلم بالصواب ۲۵ ربیع الآخر ۷۷ ۱۳ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۷۶)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں
ایک مسجد کی افتادہ زمین ہے اس میں مدرسہ بنانا چاہتے ہیں تو اس زمین میں مدرسہ تعمیر ہوسکتا ہے مدرسہ کے لئے وہ زمین خریدی جاسکتی ہے یا کرایہ پر لی جائے تو تعمیر کا حق ہوگا یا عمارت تیار شدہ مسجد ہی کا وقف ہوگی۔ اور یہ کرسکتے ہیں کہ زمین مسجد ہی کی رہے اور عمارت مدرسہ پر وقف رہے۔ بہر حال شرعا جو صورت درست وجائز ہو تحریر فرمائی جائے۔
المستفتی، مبین الدین عفی عنہ دار العلوم شاہ عالم احمد آباد گجرات

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم
جب وہ مسجد کی افتادہ زمین ہے تو وہ مسجد ہی کی موقوفہ زمین ہوئی پھر جب مسجد کی موقوفہ ہے تو اس کو خرید نہیں سکتے اب باقی رہا بغیر خرید کیئے ہوئے اور بلا کرایہ کے اس پر مدرسہ کے لئے تعمیر کر لینا تو اس میں کچھ حرج نہیں کہ وہ تعمیر تو مسجد ہی کی قرار دی جائیگی۔ فتاوی عالمگیری میں ہے:
" متولی وقف بنى في عرصة الوقف فهو للوقف " لیکن اس میں دینی درس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تو مسجد کی افتادہ زمین میں دینی درس دیا جارہا ہے۔ دینی درس تو خود مسجد میں جائز ہے۔
درمختار میں ہے "لا لدرس او ذكر في المسجد۔
ردالمحتار میں ہے "اس پر یہ تصریح کی گئی " لانه مابنى لذلك وان جاز فيه "
یہاں تک کہ مسجد کے چراغ سے درس دینے میں کوئی حرج نہیں:
قاضی خاں میں ہے " قالو لا باس بان يدرس به الى ثلث الليل "تو جب خود مسجد میں درس دینا جائز ہے تو افتادہ زمین مسجد میں درس کیونکر نا جائز ہوسکتا ہے فقط واللہ تعالی اعلم بالصواب

۲۵ ذیقعدہ ۷۷ ۱۳ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۷۷)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں
موضع سانجور میں ایک مسجد کے اندر بجانب مشرق کنواں ہے اور غسل خانہ بھی انکا راستہ مسجد کے اندر سے گذرتا ہے بایں صورت جنبی وغیرہ کو غسل کرنے اور پانی بھرنے کے لئے از راہ مسجد گذرنا جائز ہے یا نہیں جب کہ دوسرا راستہ نہ ہے نہ بنوانے کی جگہ ہے اور اس شکل کا حل درکار ہے بینوا توجروا
المستفتی، ظہور الدین احمد ناگوری

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم
اگر جنبی کو کنویں اور غسل خانے تک جانے کے لئے صرف ایک ہی راستہ ہو جو مسجد کے اندر سے ہو اور اسکے سوا کوئی دوسرا راستہ بنوانے کی جگہ بھی نہ ہو تو ایسی مجبوری اور ضرورت کے وقت مسجد کے اندر سے تیمم کر کے صرف گذر جانا جائز و درست ہے۔
ردالمحتار میں ایسی ضرورت کی چند نظیریں موجود ہیں: " مسافر مر بمسجد فيه عين ماء وهو جنب ولا يجد غيره فانه يتيمم لدخول المسجد عندنا (وفيه عن درر ومجمع البحار) لا نجوز العبور في المسجد بلا تيمم (وفيه ايضا) فالظاهر وجوبه على من كان بابه الى المسجد اراد المرور فيه " واللہ تعالی اعلم بالصواب ۲۵ جمادی الاولی ۷۸ ۱۳ھ۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۷۸)

هل يجوز ادخال الصبيان في المسجد واجلا سهم على فرش المسجد مع انهم لا يستحون بالاحتياط؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

قال رسول اللہ تعالی علیہ وسلم: جنبوا مسا جد کم صبیانکم ومجانینکم

الحدیث ۔فیحرم ادخال الصبیان والمجانین حیث غلب تنجیسهم والا فیکرہ ولا

یذهب منه حرمة المسجد ومها بتة صرح به فی الدر المختار وقال ابن الهمام یکرہ

ان لم یکن ضرورة کان نفس التعلیم ومرا جعه الا طفال لا یخلو عما یکرہ فی المسجد

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۷۹)

کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

درمیان زید وبکر وعمر وغیرہ کے بابت چندہ محرم و چندۂ مسجد کے نزاع پیدا ہوگیا ہے جس کو

تقریبا تو عرصہ ۳ ماہ کا ہوا۔صرف اس بات پر زید یہ کہتا تھا کہ روپیہ چندہ مسجد کا تحصیل کرنا چاہئے کیونکہ

چندہ محرم وصول کرنے عمر وبکر وغیرہ گئے تھے چندہ پہلے محرم کا وصول کیا جائے گا بعد کی چندہ مسجد کا کیا جا

گا۔چونکہ عمر بکر وغیرہ ذی اثر ہستیاں ہیں اور اکثریت بھی اسی جانب ہے۔اس حصہ سے عمر بکر وغیرہ نے

اہل قریہ پر زور ڈالا اور مجھے کہا اس بات پر ضرور زید کا حقہ کا پانی بند کردیں اور زید کے کئی معاملہ

دنیاوی گاؤں کا کوئی شخص شریک حال نہ ہو مثلا موت شادی وغیرہ یہاں تک کہ زید کے یہاں ایک میت

ہوگئی تو اس کے تجہیز وتکفین میں گاؤں کا کوئی شخص شریک نہ ہوا اور دیگر موضع سے آدمی بلوا کر اس میت کو

دفن کیا۔یہاں تک کہ زید کے ساتھ عمر بکر وغیرہ نے یہاں تک مستحق اختیار کی جائے کہ گاؤں میں یہ حکم

ہے کہ زید کا جو کوئی شریک حال ہوگا اس کا بھی یہی تدارک حشر کیا جائیگا:

اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ صورت مذکور میں جبکہ محرم اس اہمیت کو پہونچ گیا ہے کہ مسجد کے

چندے کو پس پشت ڈال کر محرم کے چندے کو اس قدر جدوجہد کے ساتھ وصول کیا جارہا ہے تو مسجد کے

مقابلہ میں محرم کو ترجیح دینا شرعا جائز ہے یا ممنوع اور محرم بنانے میں جو روپیہ صرف کیا جاتا ہے شرعا

روپیہ کا صرف کرنے والا مستحق ثواب ہے یا عذاب؟۔

(۲) عمر بکر وغیرہ کا زید کے ساتھ اسقدر شدت کا برتاؤ شرعا کس حد تک ہوگا اور عمر بکر وغیرہ شرعا

کس تعزیر کے مستحق ہونگے:

(۳) یہ بیان فرمائیں عمر بکر وغیرہ کا فتوی محرم کے متعلق حاصل کر کے دکھلایا جاتا ہے تو وہ کہتے

ہیں ہم اس کو نہیں مانیں گے ان کے فتوے کو نہ ماننے پر شرعا علمائے کرام کیا حکم فرمائیں گے؟۔

بینوا توجروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) اللہ عزوجل اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے نزدیک مساجد محبوب ترین جگہ

ہے۔ترمذی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے:

قال رسول اللہ تعالی صلی اللہ علیہ وسلم: اذا مررتم بریاض الجنة فا رتعوا۔قیل

یارسول اللہ ﷺ وما ریاض الجنة قال المساجد ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم جنت کے باغوں پر گزرو تو میوہ چنا کرو۔میں نے

عرض کیا یارسول اللہ ﷺ جنت کے باغوں سے کیا مراد ہے فرمایا: مسجدیں:

مسلم شریف میں انہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے:

قال رسو ل اللہ صلی اللہ تعالی علیه وسلم احب البلا د الی اللہ مساجد ھا .

رسول اقدس صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا: محبوب ترین جگہوں میں اللہ کے نزدیک مساجد

ہیں۔

بیہقی وطبرانی میں حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے:

قال رسول اللہ ﷺ ان عمار المسجد هم اهل اللہ :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسجد کے تعمیر کرنے والے اہل اللہ ہیں:

ابو الفرع نے کتاب العلل میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کی:

قال رسول اللہ تعالی صلی اللہ تعالی علیه وسلم :من بنی للہ مسجدا بنی اللہ له

بیتا فی الجنة۔ ومن علق فیه قندیلا صلی علیه سبعون الف ملك حتی یطفی ذالك القندیل۔

ومن بسط فیه حصیرا صلی علیه سبعون الف ملك حتی ینقطع ذالك الحصیر۔ ومن

اخرج منه قذاة كان له كفلان من الاجر ۔

رسول مصطفی صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اللہ کے لئے مسجد بنائی اللہ تعالی اس کے لئے جنت میں گھر بنائیگا جس نے مسجد میں قندیل لگائی تو اس پر ستر ہزار فرشتے اس قندیل کے گل ہونے تک رحمت بھیجتے ہیں۔ اور جس نے مسجد پر چٹائی بچھائی اس پر ستر ہزار فرشتے رحمت کی دعا کرتے ہیں اور جس نے مسجد سے خس وخاشاک نکالا تو وہ اس کے لئے اجر وثواب کا باعث ہوں گے۔

ان احادیث سے مساجد کی عظمت وعزت اور اس کی امداد کرنے والے اس میں چندہ دینے والے اور ان کی خدمت کرنے والے کا اجر وثواب معلوم ہو گیا اور محرم یعنی تعزیہ کی عزت وعظمت کا احادیث میں کہیں ذکر نہیں اور اس میں خرچ کرنے والوں کا اجر وثواب بھی کہیں شریعت میں موجود نہیں تو پھر مقابلہ کیا۔ ہر ادنی شخص ہر ناداں آدمی بھی ذرا غور وفکر سے کام لینے کی کوشش کرے تو اسے بھی مسجد کے چندہ کو محرم کے چندے پر یقیناً ترجیح دینی پڑیگی مسجد کے عبادت گاہ ہونے کا ایسا تعلق ہے جو مسلمانوں کے قلب سے کبھی مسجد کی عزت کم نہیں ہونے دیتا لہذا ایسا کون مسلمان ہے جو مسجد کے چندہ کو باوجود ضرورت مسجد کے محرم کے چندہ پر ترجیح نہ دیگا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس اختلاف میں نفسانیت رنگ دکھا رہی ہے۔ مولی تعالی مسلمانوں میں محبت والفت پیدا کرے اور انہیں نفسانیت سے بچائے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۲) مسلمان سے ایسا ترک تعلق شرعاً منع ہے۔

بخاری شریف میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے:

قال رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم: لا يحل لرجل ان يهجر اخاه فوق ثلاثة ايام: رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا کسی شخص کے لئے اپنے بھائی مسلمان سے تین دن سے زیادہ ترک تعلق نہیں:

ابوداؤد شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے:

ان رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم قال: لا يحل لمسلم ان يهجر اخاه فوق ثلاث فمن هجر فوق ثلاث فمات دخل النار ۔

بیشک رسول اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا کسی مسلمان کے لئے اپنے بھائی مسلمان سے تین روز سے زیادہ علیحدگی حلال نہیں اور جس نے تین دن سے زیادہ جدائی کی پھر مر گیا تو وہ دو

میں داخل ہوگا:

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ مسلمان اپنے مسلمان بھائی سے ترک تعلق نہ کرے اور ایسا ترک تعلق جو نہ فقط زندہ کے ساتھ بلکہ مردہ کے ساتھ بھی کیا جائے اشد گناہ ہے اور اس کی انتہائی حق تلفی ہے واقعہ یہ ہے کہ یہ نہایت بدترین حرکت ان سے صادر ہوئی: واللہ تعالی اعلم بالصواب

(۳) علمائے اہل سنت کے شرعی فتوے سے انکار کرنا گناہ عظیم ہے کہ فتوے کے انکار سے ایک حکم شریعت کا انکار لازم آتا ہے اور یہ بات مسلمان کی شان سے بہت بعید ہے مولی تعالی اہل اسلام میں اخوت ومحبت پیدا کرے اور ان میں مذہب کا سچا جذبہ پیدا کرے اور انہیں احکام شرعی پر عمل کرنے کی توفیق دے اور ان کے درمیان کے نفاق وعداوت کو دور کرے: واللہ تعالی اعلم بالصواب:

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۸۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

جامع مسجد بھرت پور جملہ مسلمانان وملازمان کے چندہ سے تعمیر ہوئی اور صدر دروازہ شرقی کی بلندی پر کتبہ کندہ ہو کر لگ چکا ہے اس جامع مسجد کے جنوبی وشمالی دونوں دروازہ اسوقت تک بلا تعمیر تھے میمن وزیر بخش مرحوم منہاران کی بیوہ نے اپنی برادری چوڑی فروشان بھرتپور کو ۴۰ تولہ طلائی زیورات دیکر عرض کیا کہ تم اس کو فروخت کروا اور شمالی دروازہ جامع مسجد جو بازار کی طرف ہے اس رقم سے تعمیر کرایا جائے اور میرے خاوند کی یادگار کا اس دروازہ پر ایک کتبہ نام کنندہ کرا کر لگایا جائے۔ چونکہ جامع مسجد کی تنظیم کے واسطے ایک کمیٹی مقرر ہے ہم پنچوں نے بیوہ سے عرض کیا کہ ہم یہ رقم داخل خزانہ جامع کرتے ہیں اور اسوقت درخواست دیتے ہیں چنانچہ ہماری قوم کے پنچ جامع مسجد کمیٹی کی خدمت میں پہونچے۔ اور عرض کیا کہ مبلغ نوسو روپیہ دو آنہ ہم بطور امانت اس غرض سے جمع کئے ہیں کہ ہمکو وقت ضرورت تعمیر دروازہ کیلئے لے اور دروازہ بنانیکی اجازت عطا فرمائی جائے اور ہم اس کو اپنی ہی منشاء کے موافق بنوائینگے اور جو کمی پڑیگی تو ہم اپنی اہل برادری سے رقم چندہ فراہم کر کے لائیں گے اور دروازہ مذکور کو مکمل کرائیں گے مگر مرحوم کے نام کا اور ہماری برادری کا کتبہ دروازہ پر لگائیں گے۔

چنانچہ اس سوال پر ایک ممبر صاحب نے جواب دیا کہ حسب منشاء میں سب چیز شامل ہے اس کو

تحریر میں لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ہم لوگ خاموش ہو گئے اور تکمیل دروازہ کیلئے انتظامات شروع کئے گئے اور تخمینہ کیا گیا تو رقم مذکور بالا بہت ناکافی تھی تب ہم نے اہل برادری سے چندہ فراہم کر کے تعمیر شروع کردی۔چونا سمنٹ خشت ٹالس چینی وغیرہ کی اور کتبہ کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی جب دروازہ قریب مکمل پر آیا اور کتبہ بن کر آیا اور لگانے کا وقت آیا تو اہل شہر کے وہ افرد جو ہم سے عداوت رکھتے تھے اور ہمارے پیشہ کو اور ہم کو ذلیل سمجھتے تھے انہوں نے موقع کو غنیمت سمجھ کر اس قسم کی شورش پیدا کردی کہ کتبہ دروازہ پر لگانے سے پوری مسجد پر انکا قبضہ ہو جائیگا اس وجہ سے ان بعض افراد نے تمام شہر کو ورغلایا کہ ہم کتبہ تمہاری برادری کے نام سے ہرگز نہ لگانے دینگے ہم لوگوں نے عرض کیا کہ کتبہ اگر شریعت سے ناجائز ہو گا تو ہم ہرگز نہ لگائیں گے اور اگر جائز ہوا تو لگائیں گے۔بعض حاسدین نے اس پر یہ جواب دیا کہ اگر فتوی جواز کی صورت میں بھی آ گیا ہم فتوی کو ہی ہرگز ہرگز نہ مانیں گے چاہے کچھ ہو جائے اب قابل طلب بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ۔

(۱)۔کتبہ لگایا جانا قبول کے نام سے جائز ہے یا نہیں صرف وقت شدہ شئی پر۔

(۲) فتوی کے نہ ماننے والوں پر کیا حکم ہے شریعت سے۔

(۳) ہم چوڑی والان نے وعدہ کیا بیوہ وزیر مرحوم سے کتبہ لگانے کا ہم کیا کریں۔

(۴)۔اور ہم سے وعدہ کیا کمیٹی جامع مسجد نے کہ ضرور کتبہ لگانا کمیٹی کا کیا ارشاد ہے ایسی وقف شدہ چیز پر رقم نہو یا فروخت کرنا جائز یا ناجائز ہے۔

(۵) اور مخالفین کا یہ بھی کہنا ہے جو رقم تم نے دروازہ پر صرف کی ہے لے لو ایسی وقف شدہ چیز پر رقم کہنا یا فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں۔

(۶) کتبہ کا مضمون یہ ہے۔باب الوزیر مرحوم دروازہ جماعت چوڑی سوداگران بھر تپور اور سنہ تاریخ و حکم طبیعت اللہ اکبر کنندہ یہ سب سنگ مرمر پر خوش قلم عمدہ ڈزاین سے تیار ہے۔

(۷) اس معاملے کے کتبہ لگانے میں کون کون ذمہ دار ہیں لگایا جائے یا نہیں براہ کرم جلد از جلد جواب مرحمت فرمایا جائے فقط والسلام۔

المستفتی احقر ریاض الحسن عرف بندا اشرفی چوڑی سوداگر بھر تپور۔۳،۴۳،۳۔۱۵۔

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

بلاشک مسجد میں روپیہ صرف کرنا باعث اجر و ثواب ہے لیکن جب فخر و ناموری کیلئے نہ ہو اور جو کام فخر و ناموری کیلئے ہے وہ رب العزت کی بارگاہ میں قبول نہیں۔حدیث شریف میں ہے:

یقول الله لهم یوم یجازی العباد باعمالهم اذهبوا الی الذین کنتم ترائون فی الدنیا فانظروا هل تجدون عندهم جزاء خیرا رواه البیهقی فی شعب الایمان۔

(مشکوۃ شریف ص ۴۵۶)

یعنی اللہ تعالی جس روز بندوں کو ان کے اعمال کی جزاء دے گا تو جو لوگ دکھاوے کے لئے اعمال کرتے تھے ان کے لئے فرمائیگا انہیں ان کی طرف لیجاؤ جنہیں یہ دنیا میں دکھانے کیلئے اعمال کرتے تھے تو دیکھیں کہ کیا ان سے جزاء خیر پاتے ہیں۔

تو مسلمان کا ہر نیک کام رضائے الہی کیلئے ہونا چاہیئے۔اس میں خواہش نفسانی اور وسوسہ شیطان کا دخل نہ ہونا چاہئے۔لہذا اگر یہ کتبہ محض فخر و شہرت اور ریا و ناموری کی بنا پر ہے تو زوجہ وزیر بخش اور ان کی برادری کو اس پر ہرگز ہرگز اصرار نہ کرنا چاہئے اور درگاہ رب العزت میں رجوع کر کے یہ دعا کرنا چاہئے کہ مولی تعالی اس خدمت کو قبول فرمائے اور اسکا اجر و ثواب مرحوم کی روح اور جن جن لوگوں نے شرکت کی ہے ان کو اپنے فضل و کرم سے عطا کرے اور ہمیں فخر و ناموری کے شیطانی خیالات سے بچائے۔

اور اگر اس کتبہ کا نصب کرنا فخر و ناموری کی غرض سے نہیں ہے تو اسکا لگانا نہ فقط جائز بلکہ سلف سے منقول ہے بلکہ اس کی اصل حدیث شریف سے ثابت ہے ابوداؤد و نسائی شریف میں ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے سرکار رسالت میں آ کر عرض کیا:

یا رسول الله ان ام سعد ماتت فای صدقة افضل قال الماء فحفر بیرا وقال هذا لام سعد۔

(از مشکوۃ ص ۱۶۹)

حضور ام سعد کا انتقال ہو گیا تو کونسا صدقہ افضل ہے؟۔حضور نے فرمایا: پانی، تو حضرت سعد نے اپنی ماں کے نام کا کنوں کھودوایا اور کہا کہ یہ کنواں ام سعد کے لئے ہے۔

تو اس حدیث اس کنوئیں کی نسبت ام سعد کی طرف کی گئی۔اسی طرح بکثرت مقامات پر نسبتوں کا وجود ہے۔خود مساجد کو لیجئے کہ انہیں ایسی نسبتیں ہوتی ہیں۔مدینہ منورہ میں ایک مسجد علی ہے۔ایک مسجد ابوبکر ہے۔ایک مسجد ابی ابن کعب ہے۔ایک مسجد سلمان فارسی ہے۔اور مسجد بنی جعفر میں یہ کتبہ لکھا ہوا موجود ہے جس کو حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی۔نے جذب القلوب میں نقل کیا۔

درہمیں محراب سنگے است بروے نوشتہ خلد اللہ ملک الامام ابی جعفر المنصور المستنصر باللہ امیر المومنین عمر سنۃ ثلثین وستمائۃ"

تو اگر ایسی نسبتیں اور کتبہ لگانا ناجائز ہوتا تو علمائے کرام وفقہائے عظام خود مدینہ شریف میں اس کو کب روا رکھتے اور اس پر عدم جواز کا فتوی صادر فرماتے۔ خود مسجد نبوی میں جب بادشاہ روم سلطان مراد نے ممبر شریف ۹۹۸ھ میں پتھر کا تیار کرایا اور علمائے روم نے اس کی یہ تاریخ نکالی۔

منبر عمر سلطان مراد۔

اس قسم کی بکثرت مثالیں جذب القلوب میں ہیں۔ تو یہ بات نہایت صاف طرح پر ثابت ہوگئی کہ مساجد وغیرہ اوقاف پر بانی کا نام کندہ کرنا ایسا جائز ہے کہ اس پر کبھی کسی نے اعتراض ہی نہیں کیا تو یہ کہنا کہ کتبہ لگانے سے وقف پر قبضہ ثابت ہو جائے گا سخت جہالت اور نادانی کی بات ہے اور مسلمانوں میں بلاوجہ کی شورش پیدا کرنا اور مسلمانوں کو ذلیل وحقیر کہہ کر ان کے دل دکھانا اذیت اور تکالیف پہونچانا شرعا حرام ہے اور اپنی نفسانیت وضد میں اس حد تک پہنچ جانا کہ اپنے خلاف حکم شرعی کے فتوی کے انکار کر دینے کا اظہار کرنا انتہائی اور دین سے بے تعلقی کی دلیل ہے مولی تعالی مسلمانوں کی حالت پر رحم فرمائے اور انہیں اختلاف ونفاق سے محفوظ رکھے اور حسد وخودنمائی سے بچائے اور حق کے قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان میں حقیقی اتفاق واتحاد پیدا کرے واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۸۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

سی۔ پی کے علاقہ میں کچھ لوگ ایسے مسلمان ہیں کہ جاروبکشی کرتے ہیں جیسے کہ یوپی میں بھنگی سڑکوں پر جھاڑو لگاتے ہیں۔ اگر وہ سی پی کے جاروب کش مسلمان یوپی میں آئیں اور کسی مسجد میں نماز پڑھنے جائیں تو کیا ان کو مسجدوں میں داخل ہونے سے منع کیا جائیگا؟۔ اس کے متعلق جو مسئلہ ہو مطلع کیا جائے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بلاشبہ جاروب کش بوجہ اسلام کے متقین میں داخل ہے اور حدیث شریف میں ہے۔

المساجد بیوت المتقین۔ یعنی مساجد متقیوں کے گھر ہیں۔ رواہ الطبرانی۔

تو مسجد جاروب کش مسلمان کا بھی گھر ہوا۔ تو اس کو مسجد میں داخل ہونے سے کون روک سکتا ہے۔ ہاں جب مسلمان ناپاک ہو یا اس کے بدن اور کپڑے پر کسی طرح کی نجاست ہو یا اس سے کوئی بو آتی ہو تو اس کو دخول مسجد سے منع کیا جائے گا اس میں جاروب کش اور غیر جاروب کش سب برابر ہیں۔ محض جاروب کشی کا پیشہ دخول مسجد کے لئے مانع نہیں۔ جن مقامات پر مسلمان اس پیشہ کو کرتے ہیں وہ پاک وصاف ہو کر اچھے کپڑے بدل کر مسجد میں باجماعت نماز پڑھتے ہیں پھر جب وہ مسلمان ہیں تو انہیں جماعت اور مسجد کے اجر وثواب سے کس طرح محروم کیا جا سکتا ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۸۲)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

جب مسجد کا ٹین یا کڑی یا اینٹ وغیرہ اس مسجد کی عمارت سے جدا کر دئے گئے ہوں اور پھر ان کے تعمیر میں لگانے کی ضرورت باقی نہ رہے تو انہیں متولی فروخت کر سکتا ہے یا نہیں۔ اور خریدار انہیں اپنے مکان یا دوکان میں لگا سکتا ہے یا نہیں؟۔ بینوا توجروا۔

المستفتی عبدالمجید برف والا ساکن محلہ سرائے سنبھل۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد کا ٹین، اینٹ، وغیرہ جب اس مسجد میں پھر نہ لگ سکے یا اس کے پڑے رہنے میں ضائع ہونے یا خراب ہو جانے کا خوف ہو تو انہیں فروخت کر سکتے ہیں اور اس کی قیمت مسجد کی عمارت میں صرف کی جائے گی۔ صاحب درمختار، در المنتقی شرح ملتقی میں فرماتے ہیں:

و نقص الوقف ای المنقوض من خشب و حجر و اجر و غیرها یصرف الی عمارته ان احتاج الیها بالفعل و الا حفظ الی وقت الحاجة الیها و ان تعذر صرف عینه بان لا یصلح لذلك یباع ای باعه القاضی و المتولی و یصرف ثمنه الیها اقامة للبدل مقام

المبدل ۔

پھر جب شرعا ان کی بیع جائز قرار پائی تو خریدار ان کو جہاں چاہے لگا سکتا ہے۔ ہاں اتنا ادب و احترام چاہئے کہ انہیں ناپاک مقام پر نہ لگائیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۴ رجمادی الاول ۱۳۷۳ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۸۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
مسجد کی چھت پر نماز پڑھنا از روئے شریعت جائز ہے یا ناجائز؟۔ اگر چھت کی دیوار پر از سر نو محراب بنوادی جائے تو اس صورت میں بھی نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ از روئے شریعت جواب جلد مرحمت فرمایا جائے۔ عین بندہ نوازی ہوگی فقط والسلام

سائل عثمان غنی عرف لاڈو میوہ فروش سبزی منڈی پالی مارواڑ جودھپور
مورخہ دو رمضان المبارک یوم جمعہ ۱۳۷۰ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد کی چھت بھی مسجد ہی ہے جو احکام مسجد کے ہیں وہ مسجد کی چھت کے بھی ہیں۔ کبیری میں ہے
:" کما لا یکرہ فی المسجد لایکرہ فو قہ ایضا"
تو ناجائز کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ خود خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھنا ترک تعظیم ہے مگر باوجود اس کے جماعت سے نماز پڑھا بکراہت تنزیہی جائز ہے۔

درمختار میں ہے: یصح فرض ونفل فیھا وفو قھا ولو بلا سترۃ وان کرہ الثانی للنھی وترک التعظیم منفرد او بجماعۃ'

تو ان مساجد کی چھت پر جماعت ناجائز کس طرح ہوسکتی ہے۔ بیت اللہ کے لئے تو صراحۃ نہی وارد ہے اس لئے جواز مع کراہت تھا اور باقی مساجد کے لئے بلا کراہت جواز ثابت ہوگا۔

لھذا جس کی مسجد میں نیچے صحن نہ ہو، یا ہو لیکن کم ہو اور گرمی اور گرمی کے موسم میں نیچے سخت گرمی معلوم ہوتی ہو اور چھت پر ایسی چہار دیواری ہو جس سے کسی مکان کی بے پردگی نہ ہوتی ہو تو اس

ضرورت کی بنا پر اوقات گرمی میں جماعت سے نماز پڑھی جا سکتی ہے یہ خلاصہ تحقیق ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۸۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین سوالات ذیل کے متعلق

(۱)۔ آیت کریمہ۔ ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکر فیھا اسمہ وسعی فی خرابھا اولئک ما کان لھم ان یدخلوھا الا خائفین لھم فی الدنیا خزی ولھم فی الآخرۃ عذاب عظیم۔ میں ذکر سے کون کون سے ذکر مراد ہیں؟۔

(۲)۔ زید جو ایک مسجد کا متولی حکومت کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے وہ مسجد میں اپنے آمرانہ طور پر عمل کیا تھا اہل جماعت کو مسجد کے اندر اکثر بیشتر (یہاں تک کہ رمضان المبارک میں روزے کی حالت میں) فحش فحش گالیاں بہت شور کے ساتھ بکتا ہے کہ آواز مسجد کے باہر سڑک کے لوگ بھی بآسانی سن سکتے ہیں۔ جب کہ مسجد کے اندر دنیا کی باتیں کرنا منع ہے تو پھر اہل جماعت کو بلند آواز سے گالی دینے والے خاص کر مسجد کے اندر اس کے متعلق کیا حکم ہے۔ (مسجد کے اندر اس صورت میں گالی دینے کے باعث بعض مصلیان حنفی سنی نے فتنے کے اندیشے سے مسجد ترک کر دی ہے۔

(۳)۔ قمری ماہ کی سترہ تاریخ کو حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وابستگی اور عقیدت کے اظہار کے لئے کوئی شخص خود یا اہل جماعت چندہ کر کے میلاد مبارک مسجد میں کرنا چاہیں تو ممانعت کرنے والے کے متعلق کیا حکم ہے؟۔

(۴)۔ اسی طرح اگر مصیبت زدہ انسان مشکل کشائی کے لئے آیت کریمہ کا وظیفہ کرنا چاہے یا اہل جماعت اعدا کی شرانگیزیوں سے بچنے کی غرض سے باجازت عالم دین متین بعد نماز عشا یا بعد نماز مغرب مسجد میں بیٹھ کر آیت کریمہ کا وظیفہ یا کوئی دوسرا ورد کرنا چاہیں تو ایسا کرنے کی ممانعت کرنے والے کے متعلق کیا حکم ہے؟۔

(۵)۔ یہاں اہل سنت والجماعت کی مسجد میں عام طور پر یہ قاعدہ ہے کہ ہر ماہ گیارہویں شریف اور بارہویں شریف کی فاتحہ ہوتی ہے مگر مسجد کے متولی زید کا کہنا ہے کہ بغیر میری اجازت کے مسجد میں کچھ

نہیں کر سکتے۔ درست ہے یا نہیں؟۔

لہذا صورت مسئولہ یہ ہے کہ ایسا شخص جو مسجد میں وظیفہ کریمہ گیارہویں شریف یا بارہویں شریف میلاد مبارک ختم قرآن یا درود، وظائف کی مجلس مقرر کرنے سے روکے شرعاً کسی مسجد کا متولی ہو سکتا ہے؟ اور کیا حکومت کو ایسے شخص کو متولی مقرر کرنے کا حق ہے؟ کیا مسجد کے متولی کو شریعت حقہ نے ایسے اختیار دئے ہیں کہ بغیر اس کی مرضی اور اجازت کے مسجد میں سوائے نماز پنجگانہ ذکر وفکر اور درود اور وظائف، ختم ومیلاد مبارک کی کوئی مجلس منعقد کی جاسکتی، اور کیا آیت مذکورہ بالا کا ایسے شخص پر اطلاق نہ ہوگا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱)۔ آیت کریمہ مذکورہ میں ذکر سے مراد ذکر اللہ ہے، جو خود آیہ کریمہ ہی کے کلمات سے ظاہر ہے۔ فرمایا جاتا ہے کہ "ان یذکر فیھا اسمہ" یعنی مساجد میں نام خدا ذکر کرنے سے روکے۔ اور ذکر اللہ جس طرح تسبیح وتحمید اور تہلیل وتکبیر ہیں اسی طرح تمام عبادات ودعا اور تلاوت قرآن کریم اور علم دین بھی ذکر اللہ ہی میں داخل ہیں۔

تفسیر احمدی میں ہے: و اذکر ربك فی نفسك عامة فی الاذکار من قراة القران والدعا والتسبیح والتهلیل وغیره ذلك۔ (تفسیر احمدی۔ ص ۲۴۷)

اور تفسیر مدارک التنزیل میں ہے:

بنیت المساجد للعبادة والذکر ومن الذکر درس العلم۔
(تفسیر مدارک ج ۲۔ ص ۹۱)

اور اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ذکر پاک اور صحابہ وصالحین رضی اللہ عنہم کا ذکر بھی ذکر اللہ میں داخل ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی شرح شفا شریف سے مع شرح کے نقل کی جاتی ہے۔

جعلتك ذکرك من ذکری) ای نوع ذکر من اذکاری (فمن ذکرك ذکرنی) ای فکانه ذکرنی۔ (شرح شفا۔ ج ۱۔ ص ۴۶۰)

یعنی میں نے اپنے ذکروں میں سے آپکو ایک ذکر کی قسم قرار دیا تو جس نے آپ کا ذکر کیا تو گویا

کہ اس نے میرا ذکر کیا۔ اسی بنا پر منجملہ اسمائے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آپ کا نام ذکر اللہ بھی ہے۔ چنانچہ زرقانی میں ہے:

قال مجاهد فی الا بذکر الله تطمن القلوب انه محمد و اصحابه صلی الله تعالیٰ علیه وسلم (زرقانی شرح مواہب۔ ج ۳۔ ص ۱۳۰)

تو ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ ذکر رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وذکر صحابہ وصالحین رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی ذکر اللہ میں داخل ہے۔ اور تفسیر مدارک کی عبارت سے ثابت ہوا کہ مساجد ذکر اللہ ہی کے لئے بنائی گیں ہیں۔ لہذا مساجد میں آیہ کریمہ کا وظیفہ پڑھنا یا حلقہ ذکر کرنا یا کوئی درود ودعا کرنا، یا محافل میلاد شریف وگیارہویں شریف کرنا یا وعظ اور مسائل شرعیہ کا بیان کرنا یا تلاوت قرآن کریم کرنا بلاشک جائز ودرست ہیں۔ کہ یہ سب ذکر اللہ میں ہی داخل ہیں۔ یہاں تک کہ مسجد میں نکاح کی مجلس منعقد کرنا مستحب ہے۔

درمختار میں ہے: ویندب اعلانه (ای النکاح) وتقدیم خطبة وکونه فی مسجد۔ (ردالمحتار۔ ج ۲۔ ص ۲۶۸)

نیز قاضی کو مسجد میں مقدمات کرنے کی منجانب شرع اجازت ہے۔ درمختار میں ہے:

و یقضی فی المسجد و یختار مسجدا فی وسط البلد تیسیرا للناس و یستد برا لقبلة کخطیب و مدرس۔ (ردالمحتار۔ ج ۲۔ ص ۳۳)

لہذا جب شریعت مطہرہ نے قاضی کو مسجد میں مقدمات کرنے سے نہیں روکا، لوگوں کو مسجد میں مجلس نکاح سے منع نہیں کیا تو شریعت مطہرہ ذکر میلاد شریف، گیارہویں شریف، محفل وعظ، تعلیم مسائل شرعیہ، تلاوت قرآن کریم، حلقہ ذکر، وظیفہ آیہ کریمہ، مجلس شہادت، وغیرہ ذکر خیر سے کس طرح منع کر سکتی ہے۔ کہ یہ سب امور ذکر اللہ ہیں اور مساجد ذکر اللہ ہی کے لئے بنائی گئی ہیں۔ تو انکا منع کرنے والا آیت کریمہ کے تحت میں دخل ہو کر گنہگار وظالم قرار پایا۔

تفسیر مدارک میں ہے: وھو حکم عالم لجنس مساجد الله و ان مانع من ذکر الله مفرط فی الظلم۔ (تفسیر مدارک، ج ۱۔ ص ۵۵) واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۲) مسلمان کو گالی دینا اور اذیت پہنچانا ممنوع ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

سباب المسلم فسوق رواہ الصحیحین عن ابن مسعود رضی الله تعالیٰ عنه۔

اور مسجد میں گالیاں بکنا مزید قباحت کو مستلزم ہے اور احترام مسجد کے خلاف ہے۔ اسی طرح مسجد میں آواز بلند کرنا اور شور مچانا ممنوع ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

جنبوا مساجد کم صبیانکم و مجانینکم و شراء کم و بیعکم و خصوماتکم و رفع اصواتکم الحدیث۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۳) میلاد شریف سترہ تاریخ یا کسی تاریخ میں کرنا بلاشک جائز و مستحب ہے جس کے جواز کے قران وحدیث اور اجماع وقیاس سے تفصیلی دلائل میری رسالہ ''عطر الکلام فی استحسان المولد والقیام'' میں بکثرت موجود ہیں۔ لہذا امیلاد شریف کا مسجد میں منعقد کرنا یقیناً جائز و مستحب ہے کہ یہ ذکر اللہ میں داخل ہے تو اس کا منع کرنے والا گویا ذکر اللہ کا منع کرنے والا ہے۔ اور بحکم آیۂ کریمہ گنہگار و ظالم ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۴) آیۂ کریمہ کا وظیفہ یا کوئی قرآن وحدیث کی دعاؤں کا ورد ذکر اللہ ہی میں داخل ہیں تو ان کے جواز میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ ہاں اگر کسی نمازی یا قاری کے لئے باعث تشویش ہو تو باآواز بلند نہ پڑھا جائے۔

ردالمحتار میں ہے: اجمع العلماء سلفا و خلفا علی استحباب ذکر الجماعۃ فی المساجد وغیرها الا ان یشوش جهر هم علی نائم و مصل او قاری الخ۔

تو اس کو منع کرنے والا اجماع علما کا مخالف اور بحکم آیۂ کریمہ ظالم ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۵) مسجد میں مسائل شرعیہ کے ذکر کرنے کو بلاوجہ شرعی کے منع کرنا بڑی سخت جرأت و دلیری ہے۔ تفسیر مدارک سے معلوم ہوا کہ مساجد علم دین کے درس کے لئے ہیں اور یہ شخص مسائل شرع کے ذکر کو منع کر کے کیسا سخت مجرم و گنہگار رہنا۔ مولیٰ تعالیٰ اس کو چشم بصیرت عطا فرمائے، واللہ تعالیٰ اعلم،

(۶)۔ گیارہویں شریف و بارہویں شریف کی فاتحہ مساجد میں بلاشک درست و جائز ہیں، کہ یہ ذکر اللہ میں داخل ہے تو مسلمان کے لئے سب سے ضروری شریعت کی اجازت ہے اور جب شریعت کی اجازت ہے تو متولی کی اجازت کو کون پوچھتا ہے۔ ایسا شخص اہل سنت کی مساجد کا یقیناً متولی نہیں ہوسکتا، نہ حکومت ایسے شخص کو اہل سنت کی مساجد کا متولی بنانے کا حق رکھتی ہے۔ نہ متولی کو شریعت نے ایسے اختیارات دئے ہیں۔ لہذا یہ شخص آیۂ کریمہ کے حکم میں داخل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۴۸۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

جو کہ حوض وضو کرنے کا مسجد کے صحن سے ملا ہے حوض تو دہ دردہ ہے اور مسجد کے صحن کے باہر جہاں جوتے اتارے جاتے ہیں اس سے ملا ہوا غسل خانہ ہے اور اس سے نل لگا ہوا ہے جو کبھی بند بھی ہو جاتا ہے مگر غسل کرنے والے اہل محلہ جس میں کثیر تعداد بے نمازیوں کی ہے تو لوگ گھر سے بالٹیاں لا کر مسجد کے حوض سے پانی لیکر جہاں جوتے اتارے جاتے ہیں وہاں بیٹھ کر غسل کرتے ہیں، ایک بالٹی سے بدن بھگو کر صابن لگا کر دوبارہ سہ بارہ پھر اسی بالٹی کو حوض سے بھرتے ہیں اور مسجد کا صحن بھگوتے ہوئے آتے جاتے ہیں، ان کے بدن کا پانی ناپاک پانی صحن میں گرتا ہے، جماعت والے بخیال فساد کے کوئی مزاحمت نہیں کرتے۔ اس کے لئے کیا حکم ہے علمائے دین کا؟۔ اور مسجد کے قریب تالاب کنوئیں نل وغیرہ ہیں مگر وہاں نہ جا کر مسجد ہی میں آتے ہیں اکثر اوقات حوض کا پانی بہت نیچے چلا جاتا ہے جس سے وضو کرنے والوں کو دقت اٹھانا پڑتی ہے، اور کپڑے دھو کر مسجد کے صحن میں سکھانے کو ڈالتے ہیں اور کوئی ضرورت مند گھڑی دیکھنے کے واسطے آیا تو وہ ہی پانی پر یوں پاؤں میں لگا ہوا مسجد میں چلے جاتے ہیں تو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے۔

سائل شیخ جمن متولی مسجد پتھر پھوڑ۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

مسجد کی تعظیم واحترام اور تطہیر وتنظیف یعنی اس کو پاک اوستھرا رکھنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔

کبیری میں ہے: تنزیه المسجد من القذر واجب۔ (کبیری۔ ص ۵۶۸)

یہاں تک کہ مسجد کی دیوار اور صحن پر حتی کہ بوریوں پر تھوکنا ممنوع ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: ولا یبزق علی حیطان المسجد ولا بین یدیه علی الحصیر ولا فوق البواری ولا تحتها و کذا المخاط۔ (عالمگیری۔ ص ۵۷)

اسی طرح صحن مسجد میں کلی کرنا یا وضو کرنا مکروہ ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: تکره المضمضة والوضوء فی المسجد۔

علامہ شامی ردالمحتار میں اس کی دلیل ان الفاظ میں فرماتے ہیں: لان ماءه مستقذر طبعا

فیجب تنزیهه من المخاط و البلغم۔ (ردالمحتار ص ۴۶۳)

یعنی وضو کا پانی ناپاک طبعا ہے تو مسجد کا اس سے بچانا واجب ہے، جیسے رینٹ اور بلغم سے مسجد کی حفاظت واجب ہے۔ (تو جب مسجد کی وضو کے پانی سے حفاظت ضروری ہے تو غسل کے پانی سے مسجد کی حفاظت کس قدر ضروری ہے۔ لہذا ایسے بے نمازی لوگوں کا غسل کے پانی سے صحن مسجد کا آلودہ ملوث کرنا سخت ممنوع اور گناہ ہے، اور ان کی یہ نازیبا حرکت بالکل حرمت مسجد کے خلاف ہے، جو مسلمان کی شان سے بہت بعید ہے۔ اسی طرح کپڑے دھو کر صحن مسجد میں سکھانا یہ بھی احترام مسجد کے خلاف ہے۔

بالجملہ مسلمان کو اپنی عبادت گاہ مسجد کا انتہائی احترام ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اور وہ اپنے کسی فعل و عمل سے اہل مسجد کو ایذا و تکلیف ہرگز ہرگز نہ پہچائیں۔ واللہ تعالی اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۸۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس امر میں کہ

ایک مسجد یہاں عرصہ دراز سے قائم ہے جس کے گرد و نواح ہر جانب مسلمان مقیم ہیں اور مسجد مذکورہ کی دیکھ ریکھ بذمہ اہل محلّہ کے ہے جنکی تعداد تقریبا سو گھروں کی ہے۔ مسجد کی چبوتری سرکار کی طرف سے توڑنے پر اہل محلّہ کو معلوم ہوا کہ مسجد کا قبالہ نہیں ہے۔ تب سب اہل محلّہ نے متعین رائے سے اہل محلّہ کہ نام قبالہ بنانے کی درخواست حکومت موصوف میں کی گئی تو محلّہ سے ایک قوم جو کہ چند گھروں کے شورگروں کے نام سے معروف ہے انہوں نے عذرداری حکومت موصوف میں پیش کی کہ یہ مسجد ہماری مورثی و مملوکہ و مقبوضہ ہے اس کا قبالہ محلّہ کے نام نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ ہمارا ذاتی قبالہ ہونا چاہئے۔ ایسی صورت میں کیا اس مسجد میں نماز جائز ہے، یا نہیں، کیا قبالہ عذرداروں کے نام کا ہو جائے۔ ان کے کل گھروں کی تعداد آٹھ گھر کی ہے۔ قبالہ ان کے نام جائز ہے یا نہیں، اگر چند لمحہ کے لئے مان لیا جائے کہ عدالت موصوف نے عذرداروں کے نام قبالہ بنا دیا اور اہل محلّہ مسجد مذکورہ سے دست بردار ہو گئے تو ایسی صورت مین ذمہ اہل محلّہ کو کچھ علت تو نہیں ہے۔ فقط جواب بکتب حدیث و فقہ مرحمت فرمائیں۔

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم

جو قوم ایسی مسجد کو اپنی مورثی مملوکہ کہتی ہے وہ بر سر غلطی ہے کہ مسجد کسی کی مورثی مملوکہ نہیں ہوتی، بلکہ وہ موقوفہ ہوتی ہے، حکومت کسی کے نام کا بھی قبالہ دیدے لیکن اس میں نماز ہر مسلمان کو پڑھنا جائز ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی بانی مسجد نے کسی خاص اہل محلّہ ہی کے لئے مسجد تعمیر کرائی تو دوسرے محلّہ کے لوگوں کو بھی اس میں نماز پڑھنا جائز ہے۔

عالمگیری میں ہے: لو بنی مسجد الاهل محلة وقال جعلت هذا المسجد لا هل هذه المحلة خاصة كان لغير اهل تلك المحلة ان يصلي فيه ۔ تو پھر اس مسجد کے اہل محلّہ ہی کو اس میں نماز پڑھنا کیسے ناجائز ہے۔ لہذا اگر وہ قبالہ اس قوم ہی کے نام ہو جائے تو اہل محلّہ نہ اس مسجد سے دست بردار ہوئے نہ ان کا اس میں نماز پڑھنے کا حق باطل ہوا نہ انہیں اس بات کی اجازت ہے کہ وہ حقوق مسجد سے بے پرواہی کریں۔ واللہ تعالی اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۸۷)

کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے کرام و مفتیان شرع عظام دامت برکاتہم النوریہ مسائل حسب ذیل میں۔

(۱) قبرستان میں اور مسجد میں اور مسجد کے اندر اور بیرون مسجد یعنی جو مسجد بمعنی موضع صلوٰۃ کے با ہر حدود مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں۔ اگر ان جگہوں میں اگر نماز جنازہ پڑھی جائے تو نماز بلا کراہت ادا ہوگی یا نہیں شرع کا حکم کیا ہے؟۔ بینوا توجروا۔

(۲) قبرستان میں اور مسجد کے اندر (مسجد بمعنی موضع صلوۃ اور بیرون مسجد یعنی وہ جگہ جو مسجد بمعنی موضع صلوۃ کے باہر اور حدود مسجد میں ہو اس جگہ اور میت کے ساتھ جاتے وقت قبرستان کے اور میت کو کاندھا دیتے وقت حقہ پینا جائز ہے۔ یا نہیں؟۔ بعض جگہ یہ دستور ہے کہ میت کے ساتھ جاتے وقت بلکہ میت کو کاندھا دیتے وقت قبرستان تک حقہ لیتے ہوئے جاتے ہیں ان کا یہ فعل کیسا ہے اور ان پر شرعا کیا حکم ہے نیز میت کو دفن کرنے سے پہلے یا بعد دفن موضع قبرستان سے باہر حقہ پینا جائز ہے یا نہیں۔ امام یا

موذن جو مسجد کے حجرے کے سامنے خارج مسجد میں حقہ پیئے تو کیا حکم ہے کیا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

المستفتی فقیر محمد عمران دادری رضوی مصطفوی غفرلہ ربہ محلہ خیر خان پیلی بھیت شریف۔

(۱۴ ذی الحجۃ الحرام ۱۳۷۲ھ ۔ ۱۵ راگست ۱۹۵۲ء)

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) خاص مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے۔

فتاوے عالمگیری میں ہے: وصلوۃ الجنازۃ فی المسجد الذی تقوم فیہ الجماعۃ مکروھۃ ''اور حدود مسجد کے اندر فرش مسجد سے علیحدہ جو صحن ہو اور وہ داخل مسجد میں شمار نہ ہو اسمیں نماز جنازہ بلا کراہت جائز ہے۔ قبرستان میں اگر نماز جنازہ کے لئے کوئی جگہ متعین ہے تو اسمیں تو نماز جنازہ بلا شبہ جائز ہے۔ اور اگر کوئی جگہ متعین نہ ہو تو پھر اسمیں نماز جنازہ ضرورۃ پڑھی جائے بلا ضرورت نہیں پڑھنی چاہیے واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۲) مسجد میں حقہ پینا ناجائز ہے اور قبرستان میں یا میت کو اٹھاتے ہوئے حقہ کا پینا ترک ادب ہے اور قبور سے علیحدہ فاصلہ پر قبل دفن یا بعد دفن حقہ پینے میں کوئی حرج نہیں۔ امام اور موذن کو خارج مسجد میں یا اس حجرہ میں جو صحن مسجد سے جدا ہو حقہ پینے میں کوئی حرج نہیں واللہ تعالی اعلم بالصواب۔ ۱۲ صفر المظفر۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۴۸۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ

ایک شخص منشی عبدالحمید مرحوم نے موضع گدنا میں مسجد ومدرسہ کی تعمیر کی ہے مدرسہ کی احاطہ میں بھی ایک مسجد ہے ان ہر دو مساجد کے صدر دروازوں پر حسب ذیل کتبات سنگ مرمر نصب ہے۔

عبارات کتبات

(۱)

میری خدائے پاک سے ہے التجا سدا — بھولے سے بھی قدم نہ رکھیں اسمیں بیوفا

اہل حدیث۔ غیر مقلد۔ محمدی — سنت جماعت کیلئے معبد ہے یہ بنا

حنفی وشافعی حنبلی مالکی — اہل فتن وہابی رہیں اس سے سب جدا

بہر نماز اہل تقی وصفا وفا — حمد ایزد حمید بنا خانہ خدا۔ ۱۳۱۴ھ

(۲)

بنایا خوب ہے مسجد ومدرسہ حمیدیہ — عبدالحمید حاجی نے مال وقف بھی کیا

حنفی وشافعی وحنبلی ومالک — سنت جماعت کیلئے مفید ہے یہ بنا

اہل حدیث غیر مقلد محمدی — اہل فتن وہابی یہ ہیں اس سے سب جدا

بہر نماز مومن ومسلم واتقیا — فضل خدا سے جب بنا ہے خانہ خدا۔ ۱۳۲۵ھ

ان ہر دو کتبات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بانی مسجد ومدرسہ کے نزدیک۔ اہل حدیث غیر مقلد محمدی اور وہابی اہل فتن اور بیوفا ہیں اور سنت جماعت سے خارج ہیں۔ اس لئے وہ اس مسجد ومدرسہ میں نماز وغیرہ کے لئے نہیں آسکتے ہیں اور مدرسہ کی تعمیر محض حنفی وشافعی وحنبلی ومالکی۔ اہل سنت جماعت کیلئے ہوئی ہے۔

کتبہ ثانی کے آخری شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسجد ومدرسہ کی تعمیر محض ان مومن ومسلم اور اتقیاء کیلئے ہوئی ہے جو اہل حدیث غیر مقلد محمدی اور وہابی اہل فتن نہ ہوں۔ ان تشریحات کی موجودگی میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ

(۱) بانی مسجد ومدرسہ کا مساجد میں اس قسم کا کتبہ نصب کرنا ازروئے شریعت پاک جائز ہے یا نہیں۔

(۲) اہل حدیث غیر مقلد محمدی اور وہابی اہل فتن بیوفا ہیں یا نہیں۔ اور سنت جماعت سے خارج ہیں یا نہیں۔

(۳) اگر بانی مسجد ومدرسہ کا نصب کتبہ صحیح وجائز ہے اور جس فریقوں کا تذکرہ انہوں نے اس کتبہ میں کر کے انہیں سنت جماعت سے خارج بتایا ہے اس کو جو صحیح وجائز تسلیم نہ کرے اور اس پر عامل نہ ہو تو دریں صورت ایسے شخص کے متعلق کیا حکم ہوگا۔ اس سلسلہ میں گزارش ہے کہ جواب مدلل معہ حوالہ کتب ہوں تو بہتر ہے۔

محمد سلیم اختر موضع سان ڈاکخانہ ابویل گنج۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) شرعا واقف اپنی بنا کردہ مسجد ومدرسہ کو مذہب اہلسنت وجماعت کے ایک خاص فرقہ حنفیہ کیلئے بھی متعین کرسکتا ہے۔ پھر تو اس میں اہلسنت وجماعت ہی کے دوسرے فرقہ مالکی شافعی۔ حنبلی کو مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں رہتا اگر چہ یہ فرقہ بھی یقیناً اہلسنت وجماعت ہی میں داخل ہیں۔ چنانچہ ردالمحتار میں ہے۔۔ مدرسة مو قوفة علی الحنفية مثلا لا يملك احدان يجعلها لا هل مذهب آخرون۔ (ص ۴۸۰ ج ۳)

تو جو مخالف اہلسنت وجماعت ہو اور اسکے آنے سے بدمذہبی کا فتنہ پھیلنے کا خوف ہو تو واقف کا اس فتنہ بدمذہب سے حفاظت کیلئے اور گمراہی وضلالت کا سدباب کرنے کی غرض سے اس مسجد ومدرسہ کا اہلسنت وجماعت کیلئے مخصوص ومتعین کردینا نہ فقط جائز بلکہ مستحسن اور ضروری ہے "كما هو ظاهر من اكتب الفقه۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۲) علماء عرب وعجم کے فتوؤں سے وہابی۔ دیوبندی۔ غیر مقلد۔ نجدی مودودی۔ قادیانی۔ وغیر فرقہ باطلہ یقیناً۔ اہل فتن اور سخت بیوفا ہیں ۔ اور بلاشک اہلسنت وجماعت سے خارج ہیں جن کا تفصیلی ذکر اور حکم حسام الحرمین ۔ الصوارم الہندیہ۔ فتاوے اہل سنت وغیرہ مطبوعہ کتب سے ظاہر ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۳) بانی مسجد ومدرسہ کے نصب کئے ہوئے۔ کتبوں کی صحت جواب نمبر (۱) سے ثابت ہو چکی ۔ اوران میں جن فرقوں کو خارج از اہلسنت وجماعت ظاہر کیا ہے اسکی صحت جواب نمبر (۲) سے ثابت ہوگی پھر جو اسکو صحیح نہ جانے اور اس پر عامل نہ ہو وہ منکر احکام شریعت اور مخالف اہلسنت وجماعت ہے ۔ بلکہ وہ انہیں گمراہ فرقوں میں سے ایک فرقہ میں داخل ہے تو وہ شرط واقف کے خلاف نہ اس مسجد ومدرسہ کا متولی بنایا جاسکتا ہے نہ امام مقرر کیا جاسکتا ہے۔ نہ وہ کسی طرح کی ان مین مداخلت کرسکتا ہے کہ فقہاء کرم کا مسلمہ مشہور حکم ہے۔۔ شرط الوقف كنص الشاع ای فی المفهوم والد لا لة و وجوب العمل به (از درمختار) واللہ تعالی اعلم بالصواب۔ ۴ ربیع الاخر شریف۔ ۴ ۷ ۱۳ھ۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۸۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

یہاں جبل پور محلہ مکارم گنج میں ایک چھوٹی سی مسجد لب سڑک واقع ہے۔ جسکی مالی حالت کمزور ہے مسجد کے انتظامات مثلاً۔ صفائی پتائی۔ مرمت روشنی امام وموذن وغیرہ مصارف کے لئے ضرورت آمدنی کا کوئی معقول مستقل ذریعہ نہ ہونے کے باعث مسجد کے بعض مصلیان نے مسجد مذکورہ کے سائے اور برآمدہ اور صحن کے شمال دیوار سے اندر کی جانب مسجد میں جہاں نماز ہوتی ہے مسجد کی چھ فٹ اور بیس فٹ طول لانبے فرش پر ایک پختہ دیوار بنا کر دو دکانیں بنانا چاہتے ہیں۔ تاکہ مسجد کی آمدنی بڑھ جائے۔ مگر اس صورت میں مسجد کی شمالی جانب تقریبا چھ صفوں کا کافی حصہ مسجد سے کٹ جاتا ہے جس کی وجہ سے تقریبا چوبیں نمازیوں کی جگہ مسجد سے نکل جاتی ہے اور یہ مسجد کا فرش مسلم دوکانداروں کے استعمال میں آسکتا ہے۔ (جیسا کہ مندرجہ ذیل میں مسجد کے نقشے سے معلوم ہوسکتا ہے۔)

مگر اس کو بعض مصلیان مسجد۔ مسجد مذکورہ کی بے حرمتی اور نمازیوں کی تکلیف کے باعث سمجھتے ہوئے اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسجد کے فرش پر جہاں نماز ہوتی ہے دوکانیں نہیں بنائی جاسکتی ہیں۔

لہذا بعد ادب التماس یہ ہے کہ کیا مسجد کے اندرونی فرش پر جہاں نماز ہوتی ہے دوکانیں بنائی جاسکتی ہیں اور صورت مذکورہ میں مسجد کے اندر ایسی دیوار قائم کر کے صفوں کی جگہ مسجد سے خارج کرنا اور مسلم وغیر مسلم دوکانداروں کو حسب مرضی استعمال کے لئے دینا جائز ہے یا نہیں۔ جواب باجواب سے بحوالہ کتب سرفرازی بخشی جائے تاکہ اس پر عمل ہوسکے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بانی مسجد نے جس قدر زمین کو مسجدیت کے لئے متعین ومحدود کردیا ہے اس کا تحت الثری سے آسمان تک مسجد ہونا ایسا متعین ہوگیا ہے کہ اب کسی متولی یا اہل محلہ یا کسی مسلمان کو اس کے حصہ کی مسجدیت کو نہ باطل کرنا جائز۔ نہ اس کا علاوہ ذکر ونماز کے کسی اور شغل کے لئے مقرر کردینا جائز۔ نہ اسکو اجرت پر دینا جائز۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:" ان ارادوا ان یجعلوا شیئا من المسجد

فقد قیل لیس لھم ذلك وانه صحیح كذا فی المحیط ۔ (فیه ایضا)المسجد وان خرب
واستغنی عنه اهله لا یعو د الی ملك البانی هو مسجد ابدا لا یصح والفتوی علی هذا
القول ۔ ملخصا ۔ (وفیه ایضا) اذا ارا د انسا ن ان یتخذ تحت المسجد حوانیت غلة لمر
مة المسجد او فوقه لیس له ذلك كذا فی الذخیرة ۔

صورت مسئولہ میں برآمدہ اور صحن مسجد کے اس حصہ کا مسجد ہونا ظاہر ہے تو اب اس میں دیوار یا دو
کان بنا کر اس حصہ کا مسجد سے خارج کر دینا کسطرح جائز ہو سکتا ہے۔ نیز اس کے دوکان بنا دینے میں
اس کو نماز سے روک دینا ہے اور یہ بھی ممنوع ہے۔ لان فیھا شغل ما اعد للصلاة و نحوھا كما
ذکرہ العلامة الشامی۔ نیز اس حصہ زمین مسجد کا اجرت پر دینا لازم آتا ہے۔ لزم ایجا ر قطعة منه
ذلك لا یجوز ''لھذا مسجد کے ان ہر دو مقاموں پر دوکانیں بنانا یا دیوار بنا کر اس کو مسجد سے خارج کر
دینا ناجائز و ممنوع ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۹۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
ایک مسجد تین سو سال کی تقریبا پرانی ہو گئی جو اونچی کرسی کی ہے اس کے خرچ کیلئے یہ خانہ "
دو کان بنی ہوئی ہے اور اس مسجد کے دروازے کے سامنے ملتا ہوا زینہ ہے اور زینہ کے ہر دو طرف مسجد کی
کی زمین میں چبوترہ اس عمارت یعنی مسجد کی حد تک ہے مسجد کے اندر ایک مزار بھی ہے جس کو دیوار کھینچ کر
علیحدہ کر دیا ہے بوجہ مزار کی دیوار کھینچنے کے مسجد کے اندر سے چھوٹی اور تنگ ہو گئی ہے اکثر و بیشتر جمعہ کے
روز دو چبوتروں پر نماز پڑھتے ہیں بوجہ تنگی۔ مسجد تمام پختہ بنی ہوئی ہے۔ سقف خدہ ایک طرف غسل خانہ
آب دست خانہ ہے اور چبوترہ کے پاس جوتا اتارنے کیلئے کچھ جگہ ہے غرض کہ مسجد کے لوازمات
میں سے جو چیزیں ہوتی ہیں وہ سب ہیں۔ مذکورہ عمارت کو پیش نظر رکھتے ہوئے عرض یہ ہے کہ مسجد کے
ان چبوتروں و غسلخانہ و آب دست خانہ کی جگہ کو دنیوی رفاہ عام کے لئے یعنی سڑک وغیرہ کے لئے دے
سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ واضح رہے کہ یہ چبوترہ یاں وغیرہ سب مسجد کی زمین میں ہیں۔ اہل محلہ کی خواہش

کہ ان چبوتریوں کو مسجد کے اندر لے لیا جائے تا کہ کشادگی ہو جائے اور بعض آدمیوں نے اپنا دنیاوی مفاد
پیش نظر رکھتے ہوئے سڑک کے لئے ان کا فیصلہ کر لیا۔ شریعت کا اس کے لئے کیا حکم ہے اور مسجد کے
وقف شدہ زمین کو سڑک بنانے کے لئے دینے والوں کو شرع شریف کیا حکم دیتی ہے؟۔
المستفتی قاضی بخش اللہ راجستھان

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسوله الكریم

جب یہ ہر دو موقعہ پر چبوترے مسجد ہی کے اس سے متصل ہیں تو صحن مسجد یا اس کے لواحق کو شرعا
سڑک کیلئے دینا جائز نہیں۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: ان ارا د وا ان یجعلوا شیئا من المسجد طریقا للمسلمین
فقد قیل لیس لهم ذ لك و انه صحیح كذا فی المحیط ۔

اور خاص کر جب مسجد نمازیوں کیلئے تنگ ہو چکی ہو تو ان چبوتروں سے مسجد وسیع کر لینا ہے یہاں
تک کہ اگر مسجد لوگوں پر تنگ ہو رہی ہو اور مسجد کے پڑوس میں کسی کی زمین پڑی ہو تو اس سے زبردستی وہ
زمین بقیمت لیکر مسجد کو وسیع کرنے کا حکم ہے۔ چنانچہ فتاوی عالمگیری میں ہے:

لو ضاق المسجد علی النا س وبجنبه ار ض الر جل توخذ ار ضه بالقیمة كر ها
كذا فی الفتا وی قا ضی خا ن ۔

تو یہاں تو جو حاجت مسجد کے پورا ہونے کیلئے ہے اسی کے متصل اس کے موقوفہ مسجد کے ان چبو
تروں کو سڑک میں دیدینا مسجد کی سخت حق تلفی ہے جس کا استحقاق کسی متولی یا اہل محلہ کو ہرگز نہیں حاصل
ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۳ / ذی القعدہ ۱۳۷۴ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۹۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ
ایک شخص نے ایک مکان کہ جس میں صرف ایک کوٹھہ ہے اور کچھ صحن ہے، ایک مسجد کے واسطے
وقف کیا کہ اس مکان کی آمدنی اس مسجد میں خرچ ہوتی

شکستہ ہوا۔ زید متولی نے درستی بھی اسی مسجد کے روپے سے کرائی جس مسجد کیواسطے وہ مکان وقف کیا گیا ہے، وہ کوٹھہ موجود ہے۔ اب کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اس مکان کو خود مسجد بنائیں اور اس کوٹھہ کو گرا کر مسجد پختہ تعمیر کر دی جائے۔ اجازت تعمیر لی گئی ہے، مسجد تعمیر نہیں ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے صرف ایک دروازہ تعمیر کیا ہے اور ایک غسلخانہ بنایا ہے اور نل لگا ہے۔ اور اس موقوفہ مکان میں نماز پڑھنی شروع کی ہے، مراد آباد جامعہ نعیمہ وغیرہ سوال بھیجا گیا، جواب آیا کہ مسجد نہیں تعمیر ہو سکتی۔ یہ مکان دوسری مسجد کی ملکیت ہے۔ لہذا عرض یہ ہے کہ صورت مذکور میں شرعا کیا حکم ہے مسجد تعمیر ہو سکتی ہے یا نہیں؟۔

ضروری نوٹ۔۔ اس سے قبل آپ کے پاس ایک سوال قصبہ راجا کا سہسپور سے بھیجا گیا تھا اس میں کیا سوال کیا گیا تھا یہی سوال تھا یا کچھ اور تھا، اس کا جواب بھی مرحمت فرمائیں۔ کچھ لوگ آپ کا نام لے کر شہرت لے رہے ہیں کہ مسجد بنانا جائز ہے، ہم مسجد بنائیں گے۔

مولوی صاحب نے حکم دے دیا ہے، ہر دو سوالوں کا جواب مرحمت فرمائیں۔ یہاں اختلاف بڑھ رہا ہے جلد سے جلد جواب تحریر فرمائیں۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

جب مکان ایک مسجد خاص کے لئے وقف ہے اور اس کی آمدنی بھی اس مسجد میں صرف ہوتی ہے۔ اس مکان کا کسی کو نہ مسجد بنا لینا جائز ہے نہ اس مسجد کو نقصان پہنچانا درست کہ کسی کو ایسی تغیرات کا شرعا اختیار حاصل نہیں۔ جامعہ نعیمیہ کا جواب صحیح ہے کہ اس مکان کی جگہ مسجد نہ تعمیر کی جائے۔ شریعت کا یہ نہایت کھلا ہوا حکم ہے، اس کے خلاف کوئی حکم نہ دیگا۔

راجہ کے سہس پور سے جو سوال آیا تھا غالبا اسکا یہ مفہوم تھا کہ اس مکان کو مسجد تعمیر کر لیا گیا ہے تو اس کی مسجدیت کو برقرار رکھا جائے یا نہیں، تو اس کا جواب جس کے پورے الفاظ تو محفوظ نہیں لیکن اس کا خلاصہ حکم یہ تھا کہ اس مکان کو ہرگز مسجد نہ بنانا تھا لیکن جب ناواقفی سے اس مکان کی جگہ مسجد تعمیر کر کے اس کو مسجد بنا لیا گیا ہے تو اب احترام مسجد کے لحاظ سے اس کی مسجدیت باقی رکھنی چاہیے۔ جواب کی اگر نقل ہوتی تو اس کو بلفظہ نقل کر دیا جاتا۔ لیکن میری طرف یہ نسبت غلط ہے کہ میں نے اس میں آئندہ کے لئے یہ حکم دیا کہ اس مکان موقوفہ کو مسجد تعمیر کر لینا اور متولی کا اسکو مسجد بنا دینا جائز ہے۔ وہ فتوی جب موجود ہے تو اس کو پڑھ لیا جائے۔ بلا وجہ آپس میں اختلاف پیدا کرنا اور محض اپنی غرض کے ماتحت حکم شرع

طور پر استعمال کرنا شان مسلم کے خلاف ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۹۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بیان میں کہ

ہمارے یہاں مسجد میں اس جگہ جہاں پنج گانہ باجماعت نماز امام صاحب پڑھاتے ہیں وہاں مٹی کا تیل کی بتی روشن کیجاتی ہے، یہ کیا بتی جلانا مسجد کے لئے جائز ہے یا نہیں۔ کتاب کے حوالے سے مفصل طور پر ازراہ کرم مطلع فرمائیں۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

مٹی کے تیل میں بو ہوتی ہے، اور مسجد کو ہر بدبو کی چیز سے پاک رکھا جائے۔ ردالمحتار میں ہے۔

علة النهی عن حدبان آکل الثوم و البصل المسجد) اذی الملئکة و اذی المسلمین ولا یختص بمسجده علیه الصلوة والسلام بل الکل سواء لزوایة مساجدنا بالجمع خلافا لمن شذ ویلحق بما نص علیه فی الحدیث کل ماله رائحة کریهة ماکولا او غیره۔

لہذا مسجد میں مٹی کی تیل جلانا ممنوع ہے۔ والله تعالیٰ اعلم،

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۹۲)

کیا فرماتے ہیں علماء اہل سنت وجماعت ذیل کے اندر کہ

زید نے عرصہ دو سال گزرے حکومت موجودہ کے جنگل سے کچھ لکڑیاں بلا اجازت ذمہ داران حکومت کے حاصل کر لیا، اور بیشتر لکڑی کا حصہ اپنے مکان کی تعمیر کے اندر صرف کر دیا، کچھ لکڑی مثلا ایک دروازہ کی تیاری کے لئے مسجد کو دے دیا۔ بر وقت دینے منتظمین مسجد سے دریافت نہ کیا کہ وہ اس لکڑیوں کو لینگے یا نہیں، اور نہ تو منتظمین کو پتہ چلا کہ کیسی لکڑی ہے بلکہ منتظمین حضرات نے یہ جانا کہ زید کی

ملکیت ہے اور زید خانہ خدا میں دیتا ہے۔ اور دروازہ تیار کرایا گیا۔ بعد کو پتہ چلا کہ یہ لکڑی چرا کر بلا اجازت مالک لائی گئی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر مالک لکڑی سے کہا جاوے تو زید کی عزت کو نقصان پہونچے اور سزا پاوے۔ اور ادھر مشکل ہے کہ اثاثہ سے دروازہ تیار کرایا گیا تو کیا یہ ممکن ہے کہ دروازہ کسی غریب محتاج کو دے دیا جاوے۔ اور اس سے بقیمت خرید کر مسجد کے اندر نصب کرا دیا جاوے۔ یا کون سی شکل ایسی ہے کہ وہ دروازہ مسجد کے اندر کام آسکے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد میں پاک حلال مال لگایا جاسکتا ہے، اور ناپاک حرام خبیث مال چاہے وہ خود خبیث مال اس کا سبب خبیث ہو ایسے مال کا مسجد میں لگانا مکروہ ہے۔

ردالمحتار میں ہے: لو انفق فی ذالک ای المسجد، مالا خبیثا و مالا له سببه الخبیث و الطیب فیکرہ لان اللہ تعالیٰ لایقبل الا الطیب فیکرہ تلویث بیتہ بما لا یقبلہ۔ اور ظاہر ہے کہ جب وہ لکڑی چوری کی ہے اجازت مالک کے بغیر حاصل کی گئی ہے تو وہ خود مال خبیث ہوگئی۔ اور جب اس کو کسی چیز سے بدلہ جائے گا، تو اس کا سبب پھر وہی خبیث قرار پایا جائے گا۔ لہذا اس دروزہ کو ہرگز مسجد میں نصب نہ کیا جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۹۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین

زید نے ایک زمین چھوڑی جس کے ورثا عبدالمجید، مجیدا، سعیدا، شبیر، کلو، قدیر، آل رسول، بابو، کلو، قدیر، آل رسول، بابو، رشیدا، کنیزا، اکبری، عرصہ دراز سے پاکستان چلے گئے اور وہیں پر مقیم ہیں۔ بقیہ ورثہ یہاں موجود ہیں۔ جس میں عبدالمجید، مجیدا، شبیرا، محمد زادی، بسم اللہ، یہ یہاں موجود ہیں۔ اور اس میں بحکم قانون شرعی عبدالمجید، سعید، مجیدا، گیارہ آنہ کے حقدار ہیں۔ تو اہل محلہ عبدالمجید، سعیدا، مجیدا، کو بجائے، گیارہ آنہ کے سات آنہ کو حصہ دینا چاہتے ہیں اور بقیہ زمین شبیرا سے مسجد کو لکھوا

رہے ہیں۔ تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں۔ بغیر اجازت اور ورثا کے لکھوا رہے ہیں، تو اہل محلہ کو کیا یہ حق حاصل ہے، کہ بغیر اجازت ورثا کے ایک ورثا سے مسجد شریف کو لکھوا سکتے ہیں۔ آپکا خادم، حافظ عبدالمجید،

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ظاہر ہے کہ خطہ زمین یا کوئی پیسہ بلا اجازت مالک کے ناپاک خبیث مال ہے۔ تو ایسا مال سوائے مضطر کے کسی کے لئے جائز نہیں۔ چہ جائیکہ وہ ناپاک وخبیث مال مسجد جیسی پاک چیز کے لئے جائز ہو سکے۔ کہ مسجد میں تو نہایت پاک اور طیب مال صرف کیا جاتا ہے۔ ردالمحتار میں ہے۔ لو انفق مالا خبیثا ومالا سببه الخبیث والطیب فیکرہ لان اللہ تعالیٰ لا یقبل الا الطیبَ فیکرہ تلویث بیتہ بما لا یقبلہ۔ تو جب یہ زمین بنا بر حصہ شرعی کے عبدالمجید، وسعیدا وغیرہ کی ملک ہے۔ تو نا مساۃ بشیرن، کو اس ملک غیر کو بد کے لکھ دینے کا حق حاصل نہ اہل محلہ کو بغیر اجازت مالکان انکی مملوکہ زمین کے کسی حصہ کا لکھوانا جائز۔ نہ مسجد کے لئے ایسے ناپاک مال کا لکھنا درست۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۹۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ

چھوٹی مسجد سیتاپلڈی ناگپور کا اندرونی حصہ ۲-۱-۲ فٹ اور مسجد کا صدر دروازہ جس پر اذان دی جاتی ہے۔ اور مسجد سے ملحق اس کی چار دوکانیں جن کی آمدنی مسجد کے لئے وقف ہے۔ ان سب کو کارپوریشن ناگپور منہدم کرا کے سڑک چوڑی کرنا چاہتی ہے۔ اور اس کے بدلہ میں دوسری زمین کا وعدہ کرتی ہے۔ کیا از روئے شرع شریف مسجد کے کسی حصہ کا توسیع سڑک کے لئے منہدم کرانا اور اس کے بدلے میں دوسری زمین لینا جائز ہے۔ جواب مع حوالہ کتب جلد عنایت فرمائیں کہ نوٹس میں ۳۱ جنوری تک کی مدت ہے۔ حوالہ قرآن کریم کی آیتوں سے بھی ہو تو زیادہ مناسب ہوگا۔ فقط

السائل حاجی عبدالبشیر خاں متولی چھوٹی مسجد سیتاپلڈی ناگپور

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد کے کسی حصہ کا توسیع سڑک کے لئے منہدم ہونا بلاشبہ تخریب مسجد ہے۔ اور تخریب کی ممانعت خود وحی جلی قرآن کریم میں ہے۔

اللہ تعالٰی فرماتا ہے:

ومن اظلم ممن منع مسجد الله ان يذكر فيها اسمه وسعى فى خرابها ط اولئك ماكان لهم ان يدخلوها الا خائفين ط لهم فى الدنيا خزى ولهم فى الأخرة عذاب عظيم۔ (سورہ بقرہ ع ۱۴ ج ۱)

اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ کی مسجدوں کو روکے ان میں نام خدا لئے جانے سے اور ان کی تخریب میں کوشش کرے۔ ان کو نہیں پہونچتا تھا کہ مسجدوں میں جائیں مگر ڈرتے ہوئے ان کے لئے دنیا میں رسوائی اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

تفسیر احمدی میں اس آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں:

المقصود من ذكر الاية انها تدل على ان هدم المساجد وتخريبها ممنوع۔ (تفسیرات احمدیہ مطبوعہ برقی پریس دہلی ج ۱ ص ۳)

مقصود اس آیت کے ذکر کا یہ ہے کہ آیت نے اس بات پر دلالت کی کہ مسجدوں کا گرانا اور ان کی تخریب کرنی ممنوع ہے۔

اس آیت اور اس کی تفسیر سے ثابت ہو گیا کہ مسجد کا انہدام وتخریب ممنوع وناجائز ہے۔ اور مسجد کا انہدام وتخریب کرنے والا ظالم اور خدا سے نڈر شخص ہے اور وہ دنیا میں رسوائی کی سزا اور آخرت میں عذاب عظیم کا مستحق ہے۔ پھر مسجد کا انہدام وتخریب بھی کس حقیر ودنی چیز کے لئے عام راستہ اور سڑک کے لئے جس کو ہمارے نبی کریم ﷺ نے علامت قیامت قرار دیکر اس کی برائی ومذمت۔ اور قباحت وممانعت کی طرف تنبیہ کی چنانچہ وحی خفی یعنی حدیث نبوی شریف میں وارد ہے جس کو طبرانی حضرت انس رضی اللہ تعالٰی عنہ سے راوی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من اقتراب الساعة ان تتخذ المساجد طرقا۔ (جامع صغیر۔ ج ۲ ص ۱۳۸)

علامات قرب قیامت سے یہ ہے کہ مسجدوں کو راستے اور سڑک بنایا جائے گا۔

دیکھو مسجد کو راستہ اور سڑک بنانے کی مذمت وممانعت خود شارع علیہ الصلوۃ والسلام کی حدیث سے بھی ثابت ہو گئی۔ تو جب قرآن وحدیث جیسے اصول سے مسجد کو راستہ اور سڑک بنانے کی مما

ثابت ہو گئی تو اب کسی فقہ کی کتاب پیش کرنے کی حاجت باقی نہیں رہی مگر چونکہ سوال میں مسجد کے دروازہ اور ملحقہ دو کانوں کا ذکر بھی ہے تو شرعا وعرفا دروازہ وملحقہ دو کانات احاطہ مسجد سے علیحدہ نہیں بلکہ یہ دونوں اتصال مسجد کی بنا پر شرعا فناء مسجد میں داخل ہیں۔

چنانچہ فتاوی قاضی خاں وفتاوی عالمگیری میں ہے:

يصح الاقتداء لمن قام على الدكاكين اللتى تكون على باب المسجدلا نهامن فناء المسجد متصلة بالمسجد كذا فى قاضى خان۔ (عالمگیری ج ۱ ص ۵۷)

اقتداء اس شخص کی بھی صحیح ہے جو ان دوکانوں پر کھڑا ہو جو دروازہ مسجد پر ہیں کیونکہ وہ دکانیں مسجد سے متصل ہونے کی بنا پر فناء مسجد میں ہیں

اس عبارت سے ثابت ہوا کہ اتصال مسجد کی بنا پر مسجد کا دروازہ اس کی ملحقہ دوکانات فنائے مسجد قرار پائیں اور یہ طے شدہ قول ہے کہ مسجد کے لئے جو حکم ہے وہی حکم فنائے مسجد کا ہے۔

چنانچہ اسی فتاوی عالمگیری میں ہے:

فناء المسجد له حكم المسجد۔ (عالمگیری ج ۱ ص ۵۷)

تو جب مسجد کو راستہ وسڑک بنانا ممنوع وناجائز ہے تو اب فنائے مسجد یعنی دروازہ مسجد اور اس کی ملحقہ دوکانات کا بھی راستہ اور سڑک بنانا ممنوع وناجائز ثابت ہوا۔ لہذا کسی متولی یا اہل محلّہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مسجد کے صحن یا دروازہ یا ملحقہ دوکانات کو راستہ اور سڑک بنانے کے لئے دیں۔ اور اسکے بدلے میں کسی دوسری زمین کو لیں۔

اسی فتاوی عالمگیری میں ہے: ان ارادوا ان يجعلوا شيئا من المسجد طريقا للمسلمين فقد قيل ليس لهم ذلك وانه صحيح كذا فى المحيط۔ (عالمگیری قیومی کانپور ج ۲ ص ۳۴۷)

اگر قوم یہ ارادہ کرے کہ مسجد کے کسی حصہ کو مسلمانوں کے لئے راستہ بنادیں تو حکم دیا گیا کہ انہیں اس بات کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہی قول صحیح ہے اسی طرح محیط میں ہے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ متولی یا اہل محلّہ دروازہ مسجد یا اس کی ملحقہ دوکانات کو یا مسجد یا فنائے مسجد کے کسی حصہ کو ہرگز ہرگز راستہ اور سڑک کی توسیع کے لئے نہ دیں۔ نہ مسجد کی اس موقوفہ زمین سے کسی دوسری زمین کا تبادلہ کر سکیں۔ واللہ تعالٰی اعلم بالصواب۔ ۲۸ رجمادی الاخری ۱۳۷۸ھ

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۴۹۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
مسجد کلاں محلہ مموانی شہر فتحپور عرصہ تخمینا دو تین سو سال کی تعمیر ہے اور اسی وقت سے منبر جس پر جمعہ یا عیدین کے پیش امام صاحب کھڑے ہو کر خطبہ پڑھتے ہیں منبر محراب کے باہر جانب شمال تعمیر ہے اور اسی زمانہ سے اب تک اسی منبر پر پیش امام صاحب کھڑے ہو کر خطبہ پڑھتے چلے آئے ہیں اور اب اس سابق منبر سے ملا کر محراب کے اندر جدید منبر اور بنا کر شامل کر دیا گیا ہے اور اب اسی جدید منبر پر کھڑے ہو کر محراب کے اندر پیش امام صاحب کھڑے ہو کر خطبہ پڑھتے ہیں مطلع فرمایئے کہ جبکہ ایک منبر سابق محراب کے باہر بنا ہوا تھا اور ہے تو دوسرا جدید منبر محراب کے اندر بنانا سنت ہے یا نہیں لہذا جو امر مسنون ہو اسی سے از روئے حدیث وفقہ آگاہ کیا جاوے۔
المرقوم ۳۰ / مارچ ۱۹۵۹ء سلامت اللہ خاں ولد عبد الکریم خاں ساکن محلہ مموانی شہر فتحپور

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم
منبر کا باہر داہنی طرف ہونا سنت ہے۔ چنانچہ طحطاوی میں ہے:
وذکر البدر العینی فی شرح البخاری ان من السنۃ اتخاذ المنبر عن یمین المحراب،
تو سابق منبر جب محراب کے باہر جانب شمال میں تھا تو وہ سنت کے موافق تھا۔ اس کو بلا حاجت شرعی کے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ ہاں اگر اس کے چھوڑ دینے میں کوئی مقصد صحیح ہو مثلا۔ (۱) سابق ستون کے مقابل تھا۔ خطبہ کی اذان خارج مسجد میں کہنے میں ستون مانع ہوتا تھا اور خطیب کا صحیح طور پر مقابلہ نہیں ہوتا تھا اس لئے محراب کے اندر جدید منبر بنایا گیا ہے۔
(۲) یا اسکی سیڑھیاں اتنی جگہ گھیر رہی تھیں کہ اس سے صف کی کمی ہو رہی تھی اور اس کے جدا کرنے سے مزید ایک صف کا اضافہ ہو جائے گا اور جمعہ وعیدین مین نمازیوں کی کثرت کی بنا پر اس کے علیحدہ کرنے کی ضرورت تھی تو محراب میں منبر بنا کر ایک صف کی جگہ اور نکل آتی۔
(۳) یا منبر بہت بڑا ہے اور مسجد تنگ ہے تو ایسا منبر خود مکروہ ہے۔
اسی طحطاوی میں ہے: ویکرہ المنبر الکبیر جدا اذا لم یکن المسجد متسعا۔
تو اگر ان امور میں سے کوئی بات ہو تو اس جدید منبر کا محراب میں بنا لینا صحیح ہے۔ واللہ تعالیٰ

اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۹۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں۔
زید کہتا ہے مسجد کے اندر درود شریف اور مولود شریف پڑھنا حرام وناجائز ہے اور بکر کہتا ہے مسجد کے اندر درود شریف پڑھنا جائز وثواب ہے۔ مسائل کیا کہتے ہیں مدلل جواب سے مشکور وممنون فرمایئے فقط۔
السائل ادریس حسین

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم
مسجد اعمال آخرت ہی کے لئے بنائی جاتی ہے۔
چنانچہ علامہ حلبی کبیری میں فرماتے ہیں: ان المساجد بنیت لاعمال الآخرۃ۔
(کبیری ص ۵۶۷)
اور درود شریف اعمال آخرت میں سے ہے جس کی نہایت روشن دلیل یہ ہے کہ وہ نماز جس کی جماعت مساجد میں قائم کیجاتی ہے۔ یہ درود شریف اس نماز میں داخل ہے۔ تو اگر یہ درود شریف عمل آخرت نہ ہوتا تو نماز جیسے عمل آخرت میں ہرگز داخل نہ ہوتا۔ درود شریف کو عمل دنیا کون کہہ سکتا ہے۔
اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:
ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی یایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔
بیشک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبی پر اے ایمان والو ان پر درود اور خوب سلام بھیجو۔
اس آیہ کریمہ سے ثابت ہو گیا کہ درود شریف وہ ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ کس قدر تاکید سے دیتا ہے اور اس درود شریف کو خود اپنا اور اپنے مقربین فرشتوں کا عمل بتاتا ہے۔ تو پھر اس درود شریف کو کون عمل دنیا کہہ سکتا ہے۔ لہذا جب درود شریف کا عمل آخرت سے ہونا خود قرآن شریف سے ثابت ہو گیا تو جو مساجد اعمال آخرت کے لئے بنائی گئی ہیں ان میں اس درود شریف کا پڑھنا کس طرح حرام وناجائز ہو سکتا ہے۔ اور جو اس کو حرام کہتا ہے وہ فضیلت درود سے جاہل۔ اور اس کے محبوب خدا ہونے سے جاہل اور اس

کے حکم قرآنی ہونے سے جاہل۔ اور اس کے عمل آخرت ہونے سے جاہل۔ اور مسجد کی بنا کی غرض سے جاہل۔ اس کو جلد از جلد توبہ کرنی چاہئے۔ کہ وہ درود شریف جیسی محبوب چیز سے عداوت و دشمنی رکھتا ہے۔ اسی طرح ذکر مولود شریف یقیناً ذکر رسول علیہ السلام ہے اور ذکر رسول بلا شبہ ذکر الٰہی ہے کہ حدیث قدسی میں ہے۔

قاضی عیاض نے شفا شریف میں ان الفاظ میں روایت کیا۔

جعلتك ذكرامن ذكرى فمن ذكرك ذكرنى۔

یعنی اللہ فرماتا ہے کہ اے رسول میں نے تمہیں اپنا ذکر بنا دیا ہے جس نے تمہارا ذکر کیا اس نے میرا ذکر کیا۔ تو جس نے ذکر مولود کو حرام و ناجائز کہا تو اس نے ذکر خدا اور رسول کو حرام و ناجائز قرار دیا۔ اور اس کو کوئی مسلمان تو کہہ نہیں سکتا۔

بخاری و مسلم وغیرہ کی احادیث میں وارد ہے کہ خود نبی کریم علیہ السلام حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے مسجد نبوی شریف میں منبر رکھواتے تھے اور وہ اس پر کھڑے ہو کر حضور کے فضائل کا ذکر کرتے تھے تو ذکر رسول کا مسجد میں ہونا خود فعل رسول علیہ السلام سے ثابت ہے۔ اور یہ ذکر رسول کو مسجد میں حرام و ناجائز کہتا ہے۔ ذکر رسول تو قرآن میں مذکور۔ احادیث میں مذکور۔ نماز میں مذکور۔ خطبہ میں مذکور۔ اذان میں مذکور۔ تو یہ مسجد میں قرآن و حدیث پڑھنے کو بھی ناجائز و حرام قرار دیگا۔ نماز و خطبہ کو بھی ناجائز و حرام ٹھہرائے گا۔ تو ذکر مولود کی مخالفت میں قرآن کی مخالفت۔ حدیث کی مخالفت۔ کس قدر دینی احکام کی مخالفت لازم آرہی ہے۔ لہٰذا یہ شخص جلد توبہ کرے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۵ شوال المکرم ۱۳۷۸ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

اللہ اکبر



سجود التلاوۃ

مسئلہ (۴۹۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین ان مسائل مفصلہ ذیل میں۔ مگر یہ عرض ہے کہ بحوالہ کتب فقہیہ و احادیث نبویہ جوابات مرحمت ہوں بلکہ سطر و صفحہ کا بھی حوالہ ہو تو بہتر ہے مع ترجمہ اردو کے۔ آپ کا نیاز مند ممتاز الٰہی محافظ دفتر میونسپلٹی سنبھل

اول : تمام کلام مجید میں جو سجدے ۱۴ / یا ۱۵ / واجب ہیں۔ ان سجدے تلاوت واجب کا ماہ رمضان شریف میں حفاظ کو نماز تراویح میں فوراً ادا کرنا اولی و افضل ہے یا نہیں؟۔

دوم : ان سجدوں کے فوراً ادا کرنے کا کچھ ثواب بھی ملتا ہے یا نہیں؟۔

سوئم : ان سجدوں کے نہ کرنے کا کچھ عذاب بھی ملے گا یا نہیں؟۔

چہارم : اگر کسی امام صاحب نے برعکس اس کے جملہ سجدوں میں سے مع مقتدیوں ایک بھی سجدہ تلاوت فوراً ادا نہ کیا ہو تو ان کا بروز حساب کیا نتیجہ ہوگا؟۔

پنجم : ادائیگی تمام سجدوں کی کس طرح ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جناب مولوی صاحب دریافت پر ایسا فرماتے ہیں کہ درمیان نماز تراویح آیت سجدہ ختم ہونے پر امام نیت ادائیگی سجدہ قبل رکوع یا درمیان رکوع کر لے تو ادائیگی سجدہ ہو جاتی ہے؟ پس ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ درمیان نماز جب کہ دو رکعت نماز تراویح کی نیت امام نے باندھ لی ہو اس درمیان میں خواہ قبل از رکوع یا درمیان رکوع نیت ادائیگی سجدہ مکرر یعنی بحالت نیت تراویح کے امام صاحب کریں تو کچھ نقص نماز میں پیدا ہوگا یا نہیں؟ اور مقتدیوں کو اس کا علم کس طرح ہوگا؟ اور فوراً سجدہ کر لینے پر جس قدر ثواب ملنے کا مستحق ہوتا وہ اس طرح کرنے پر ثواب کا مستحق ہوگا یا نہیں؟۔

بعدہ مقتدیوں کو علم ادائیگی سجدہ تلاوت نہ ہو تب بھی سجدہ تلاوت کلام مجید ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

اسی طرح تمام کلام مجید ختم ہو جائے اور ایک بھی سجدہ فوراً ادا نہ کیا جائے بلکہ مقتدیوں کی تعداد بھی صرف ۸ / یا ۱۰ / تک روزانہ ہوتی ہو، گویا مسجد میں ایک پوری جماعت بھی نہ ہو ایسی صورت میں کیا سجدے بطریق مذکورہ ادا ہو جائیں گے یا نہیں؟ اور کن مجبوریوں پر ان سجدوں کی ادائیگی بشمول رکوع و دونوں سجدوں نماز کے سجدہ تلاوت کلام مجید ادا ہو جائیگی اور کچھ ثواب بھی حاصل ہوگا یا نہیں؟۔ یا صرف بار سجدوں کا اتر جائے گا۔

ششم: اولا طریقہ سجدہ تلاوت کلام مجید کیا ہے؟ اور ان دونوں طریقوں میں سے کس طریقہ میں زیادہ ثواب ملتا ہے؟۔

ہفتم: مقتدیوں کو یہ بھی نہ بتلایا جائے کہ امام نے نیت ادائیگی سجدہ تلاوت کلام مجید بشمول دو رکعت نماز تراویح کر لی ہے یا نہیں بلکہ امام صاحب اس قدر جلدی رکوع و سجدوں میں نماز کے خود کرتے ہوں کہ پورے طریقہ پر مقتدی ارکان ورکوع وسجدوں کے ادا بھی نہ کر چکے ہوں اور امام صاحب ارکان رکوع وسجدوں سے فراغ حاصل کر لیں۔ پھر کس طرح یہ باور کر لیا جا سکتا ہے کہ امام صاب نے نیت ادائیگی سجدہ تلاوت کلام مجید بھی کر لی تھی یا نہیں۔ البتہ امام صاحب فوراً سجدہ تلاوت کلام مجید کر لیتے تو اس کی ادائیگی کا اظہار آسانی سے ہو جاتا۔ یا امام صاحب بالغ ہوتے تب بھی مان لینے کے قابل ہوتا کہ نیت ادائیگی سجدہ کر لی ہوگی۔ پھر بھی شبہ والی بات تھی۔ اور شبہ جس ارادہ میں پیدا ہو وہ کس قدر نقص نماز میں پیدا کرتا ہے۔ الا ایسی حالت میں کس طرح مان لیا جاوے کہ حافظ صاحب نے ضرور نیت ادائیگی سجدہ تلاوت کلام مجید کر لی ہوگی۔ جن کی عمر بھی اس وقت ۱۴ / سال سے کم ہو۔ پس ایسی صورتوں میں حافظ صاحب کے سرپرست والد صاحب جو ایک مشہور عالموں میں کہلائے جاتے ہوں تو یا جنہوں نے شروع رمضان شریف سے ختم کلام مجید عشاء کی نماز فرض کی پیش امامی بھی کی ہو اور ان کے ہی صاحبزادہ نے کلام مجید تراویح میں سنایا ہو۔ وہ صاحب ایسا فرماتے ہیں کہ تلاوت کلام مجید کے بحالت نیت امام قبل رکوع یا درمیان رکوع کر لینے پر سجدے واجب تلاوت کلام مجید ادا ہو جاتے ہیں اور دریافت پر حوالہ ادائیگی سجدوں کا کتاب بہشتی گوہر حصہ یازدہم بہشتی زیور صفحہ ۸۳ / متعلقہ بیان سجدہ تلاوت نظیر میں پیش کرتے ہیں۔ اور یہ کتاب مولوی اشرفعلی تھانوی مقام تھانہ بھون کی تصنیف شدہ ہے اور اس میں درمختار و رد المحتار کا حوالہ دیا ہے۔

ہشتم: یہ فعل مولوی صاحب کا کس حد تک جائز و ناجائز ہے؟ کہ انھوں نے باوجود مولوی ہونے اور عالم ہونے کے اس قدر معلومیت پر بھی قصداً تمام کلام مجید کے فوراً سجدے ادا نہ کئے اور نہ کرائے۔ بلکہ جو ثوابات فوری سجدے کرنے پر ملتے ان کو ترک کی اور کرایا گیا یا نہیں؟ اور مقتدیوں کو ایسے متبرک ماہ رمضان شریف میں جب کہ ایک سال بعد بہ تندرستی حیات مستعار نصیب ہوتا ہے اس نعمت مترقبہ ثوابات سے محروم رکھا یا نہیں؟ اور اس ترک کئے ثوابات کا ان پر کچھ بار ہوا یا نہیں کیا رعایت پسری شرع کے معاملہ میں ان کے کچھ ادائیگی یا نہیں۔

نہم: اب فرض نماز کی ادائیگی میں مولوی صاب کا یہ فعل کہ شروع الحمد شریف کرنے کے درمیان میں رحیم پر سانس کا توڑنا اور بجائے ''اَيَّاكَ نعبد'' کے ''اِيَاكَ نعبد'' بلا تشدید کے پڑھنا اور ''مستقیم'' پر سانس کا توڑنا یا ''مستقیم میم'' یعنی دو میم میں ایک میم ادا کرنا اور ''غیر المغضوب'' کی بجائے ''غیر المغضوبی'' پڑھنا اور ''ولا الضالین'' کی بجائے ''ولا الضالین'' پڑھنا اور سلام پھیرتے وقت سلام میں ''اسلام وعلیکم ورحمۃ اللہ'' پڑھنا۔ آیا صحیح ہے یا غلط؟ اگر غلط ہے تو جرم خداوندی بہ احادیث نبویہ وکتب فقہیہ کیا ہوگا؟ اور فرض کی ادائیگی ہوئی یا نہیں؟۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

اول: مصلی نے جب چودہ سجدہ تلاوت سے کوئی آیت نماز میں تلاوت کی تو اس کے لئے فوراً سجدہ کرنا واجب ہے۔ چنانچہ مراقی الفلاح کے صفحہ ۷۷ / میں ہے: وصفتها الوجوب على الفور في الصلاة۔ یعنی سجدہ تلاوت کی صفت نماز میں علی الفور واجب ہوتا ہے۔

شامی جلد اول کے صفحہ ۵۴۰ میں ہے: فان كانت صلوتية فعلى الفور۔

یعنی اگر سجدہ تلاوت نماز میں بسبب قرأت کے واجب ہوا ہو تو اس کا حکم فوراً ادا کرنا ہے۔

دوم وسوم وچہارم: سجدہ کے فوراً ادا کرنے میں یقیناً ثواب ہوگا اور تاخیر میں گناہ۔

طحطاوی صفحہ ۲۷۸ / میں ہے: حتى لو اطال التلاوة تصير قضاء ويأثم فيكره تحريما تاخیر الصلوة عن وقت القرأة۔

درمختار میں ہے: ويأثم بتاخيرها۔

خلاصہ مطلب ان عبارات کا یہ ہے کہ سجدہ صلوتیہ میں تاخیر کرنا مکروہ تحریمی ہے یہاں تک کہ اگر

تلاوت کو طویل کر دیا تو وہ سجدہ قضا ہو جائے گا اور وہ شخص گنہگار رہوگا۔ لہٰذا اگر مصلی نے آیت سجدہ کے بعد چار آیتیں اور تلاوت کیں تو فوراً منقطع ہو جائے گا۔

چنانچہ کبیری کے صفحہ ۴۷۲ میں ہے: فان قرء بعدها اربع آیات انقطع للفور بلاخلاف۔

شامی جلد اول کے صفحہ ۵۴۰ میں ہے: ثم تفسیر الفوری هدم طول المدة بین التلاوة والسجدة بقرأة اکثر من آیتین او ثلث۔ یعنی سجدہ تلاوت کے فوراً ادا کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اس سجدہ اور تلاوت کے درمیان دو یا تین آیتوں سے زائد کا فاصلہ نہ ہو۔

اب ان عبارات سے واضح ہوگیا کہ سجدہ تلاوت کو فوراً ادا کیا جائے اور اگر اس آیت سجدہ کے بعد دو یا تین آیات سے زیادہ تلاوت کر لیں تو یہ سجدہ قضا ہوگیا اور اب اس سجدہ کا ادا کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ اور وہ شخص گنہگار رہوا۔ اب اگر وہ امام ہے اور اس نے قصداً ایسی حرکت کی تو اس نے نہ فقط اپنا گناہ بلکہ تمام مقتدیوں کا گناہ اپنے ذمہ لے لیا۔

پنجم و ششم: سجدہ تلاوت کی اگر رکوع یا سجدہ میں نیت کی جائے تو ادا ہو جاتا ہے لیکن اس آیت سجدہ اور اس رکوع سجدہ میں دو آیتوں سے زیادہ آیات کا فاصلہ نہ ہو۔ چنانچہ درمختار کے صفحہ ۵۴۱ میں ہے۔ تو دی (برکوع صلوٰۃ) اذ کان الرکوع (علی الفور من قرائة آیة) او آیتین۔

یعنی سجدہ تلاوت نماز کے رکوع میں ادا ہو جاتا ہے جب رکوع فوراً ایک یا دو آیات کے بعد کر لیا جائے۔

کبیری کے صفحہ ۴۷۲ میں ہے اسی مسئلہ کو لکھ کر فرماتے ہیں: یشترط نیتها ایضا ویشترط فی ذالک کله ان لا ینقطع الفور بل یکون الرکوع والسجود عقیب تلاوتها او بعد آیة او آیتین۔

یعنی سجدہ تلاوت کے رکوع یا سجدہ میں ادا ہونے کے لئے نیت شرط ہے اور یہ بھی شرط ہے کہ فوراً منقطع نہ ہوا ہو۔ بلکہ رکوع یا سجدہ اس آیت سجدہ کی تلاوت کے ایک یا دو آیت کے بعد کر لیا جائے۔

خلاصہ کلام کا یہ ہے کہ فقہائے کرام نے سجدہ تلاوت کے رکوع یا سجدہ میں ادا ہونے کی یہی شروط لکھی ہیں جو ان عبارات سے ظاہر ہوئیں۔ لیکن اگر آیت سجدہ کے بعد تین آیات پڑھ کر رکوع یا سجدہ میں نیت ادائیگی سجدہ تلاوت کی جائے گی تو وہ سجدہ تلاوت ادا نہ ہوگا اور اس سجدہ تلاوت کے لئے اب مستقل سجدہ کرنا لازم ہوگا۔

چنانچہ شامی جلد اول کے صفحہ ۵۴۱ میں ہے فلو انقطع الفور لا بد لها من سجود خاص

یعنی اگر فوراً منقطع ہوگیا تو اس کے لئے سجدہ خاص ضروری ہے۔

بالجملہ حقیقت سجدہ تلاوت کی یہی ہے کہ اس کے لئے ایک مستقل سجدہ کیا جائے۔ اگرچہ رکوع یا سجدہ میں نیت کرنے سے وہ ادا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مراقی الفلاح کے صفحہ ۱۸۱ میں ہے:

(وتؤدی برکوع او سجود) کائنین (فی الصلوة غیر رکوع الصلاة (سجودها) والسجود افضل۔

شامی جلد اول کے صفحہ ۵۴۱ میں ہے: والا صل فی ادائها السجود وهو الافضل۔

خلاصہ مطلب ان عبارات کا یہ ہے کہ سجدہ تلاوت نماز کے رکوع سجدہ میں ادا ہو جاتا ہے، اور اصل اس کی ادائیگی میں سجدہ ہی ہے اور یہی افضل ہے۔

بالجملہ رکوع یا سجدہ میں نیت کرنے سے وہ ادا ہو جاتا ہے۔ اور سجدہ میں نیت کرنا رکوع سے افضل ہے۔ لیکن کتب فقہیہ پر غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لئے مستقل سجدہ کرنا اولیٰ وافضل ہے۔

ہفتم و ہشتم: جواب پنجم و ششم سے یہ تو ظاہر ہو چکا کہ رکوع یا سجدہ میں اگر سجدہ تلاوت کی نیت کی جائے تو وہ ادا ہو جاتا ہے لیکن اگر کسی مقتدی نے اپنے رکوع میں سجدہ تلاوت ادا ہونے کی نیت نہیں کی اور امام نیت کر چکا ہے تو امام کا نیت کرنا اس مقتدی کے لئے کافی نہیں ہے۔ چنانچہ طحطاوی کے صفحہ ۲۸۹ پر ہے: ولو لم ینوها المؤتم لم یجزه۔

یعنی اگر اس سجدہ تلاوت کی مقتدی نے نیت نہیں کی تو مقتدی کو امام کی نیت کافی نہیں ہے۔

درمختار کے صفحہ ۵۴۲ پر ہے: ولو نواها فی رکوعه ولم ینوها المؤتم لم یجزه۔

یعنی اگر امام نے سجدہ تلاوت کی اپنے رکوع میں نیت کی اور مقتدی نے نیت نہیں کی تو یہ مقتدی کے لئے کافی نہیں ہے۔

فقہائے کرام اس مقتدی کے لئے یہ طریقہ تحریر فرماتے ہیں۔

طحطاوی میں ہے: ویسجد اذا سلم مع الامام ویعید القعدة۔

درمختار میں ہے: فلو لم ینو المقتدی لا ینوب علی رای فیسجد بعد سلام الامام ویعیدا لقعدة الاخیرة۔

خلاصہ مطلب ان عبارات کا یہ ہے کہ اگر امام نے رکوع سجدہ میں سجدہ تلاوت کی نیت کی اور

مقتدی نے نہیں کی تو امام کا نیت کرنا مقتدی کی لئے قائم مقام نہ ہوگا اور مقتدی امام کے سلام پھیرنے کے بعد سجدہ تلاوت کرے اور اس کے بعد قعدہ کرے۔

خلاصہ ان جوابات کا یہ ہے کہ سجدہ تلاوت شروط مندرجہ فی السوال کو مدنظر رکھتے ہوئے رکوع یا سجدہ میں ادا ہو جاتا ہے پھر اگر امام نے اپنی نیت کا مقتدیوں میں اظہار نہیں کیا ہے تو اس کا بار امام ہی کی گردن پر ہے اور مقتدیوں کو ترک سجدہ پر استغفار کرنا چاہئے۔ لیکن امام کی نیت ظاہر کرنے کے بعد پھر شبہ کو کوئی دخل نہیں۔

اب رہا امام کا نابالغ ہونا تو نابالغ کی امامت ہی مکروہ ہے۔ کتاب بہشتی زیور اغلاط کا مجموعہ ہے۔ اگر چہ اس میں یہ اور متعدد مسائل صحیح بھی نکل آئیں۔ لہذا مسلمانوں کو اس کتاب سے پرہیز کرنا بہت ضروری ہے۔

نہم: سورہ فاتحہ میں بالاتفاق سات آیات ہیں لہذا "رحیم و مستقیم" پر وقف کرنا صحیح ہے۔ اور "ایاك" کو بلا تشدید پڑھنا ہماری قرأت کے ضرور خلاف ہے لیکن مفسد صلاۃ نہیں۔ اور "غیر المغضوب" میں "ضاد" کی جگہ "ظا" پڑھنا نماز کو فاسد کر دیتا ہے۔

چنانچہ کبیری صفحہ ۴۴۸ میں ہے:

اما اذا قراء مكان الذال المعجمة ظاء معجمة او الظاء المعجمة مكان الضاد المعجمة او على القلب۔ مثال الاول ما لو قرء تلظ الاعين مكان تلذ ومما ظرء مكان ذرء۔ ومثال الثاني المغظوب مكان المغضوب۔ ومثال الثالث ظعف الحيوة مكان ضعف الحيوة ۔فتفسد صلوة وعليه اى على القول بالفساد اكثر الائمة ۔

خلاصہ مطلب ان عبارات کا ہمارے مسئلہ کے متعلق یہ ہے کہ اگر کسی نے "ظا" کی "ضاد" یا "ضاد" کی جگہ "ظا" پڑھا۔ مثلاً "مغضوب" کی جگہ "مغظوب" تو اکثر ائمہ کے نزدیک اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔

نیز محیط برہانی میں ہے: سئل الامام الفضلی عمن یقرأ الظاء المعجمة مكان الضاد المعجمة او على العكس فقال لا تجوز امامته۔

یعنی امام فضلی سے اس شخص کا حکم دریافت کیا گیا جو "ضاد" کی جگہ "ظا" یا "ظا" کی جگہ "ضاد" پڑھتا ہے۔ فرمایا: اس کی امامت ناجائز ہے۔

اور اسی طرح عالمگیری وغیرہ کتب فقہیہ میں مذکور ہے۔

آخر میں عرض کرتا ہوں کہ سائل کے سوالات کے تو یہ جوابات ہیں لیکن ان سوالات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مولانا جن کا تذکرہ سوالات میں کیا گیا ہے غیر مقلد معلوم ہوتے ہیں۔ اگر چہ وہ بظاہر حنفیت کا جامہ پہنے ہوئے ہوں۔ اس لئے "ضاد" کو "ظا" پڑھنا۔ اور آئے دن اس قسم کے مسلمانوں میں نئے نئے فسادات پیدا کرنا انھیں غیر مقلدوں کے رات دن کے کرشمے ہیں۔ لہذا مسلمانوں کو ایسے امام کے اس ظاہری جامہ حنفیت کے لباس پر دھوکہ نہ کھانا چاہئے اور ایسے امام کی اقتدا سے پرہیز کرنا لازم ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۴۹۸)

کیا فرماتے ہیں علماء دین مسائل مندرجہ ذیل میں

نماز کے علاوہ اگر کوئی شخص لاؤڈ اسپیکر میں آیت سجدہ تلاوت کرے تو سامعین پر سجدہ تلاوت واجب ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

لاؤڈ اسپیکر کیا عمل کرتا ہے اس کی تحقیق ضروری ہے۔ لہذا اگر اس کی وساطت سے قرع اول ہی نقل ہوتا ہوا پہونچا تو وجوب سجدہ میں شک ہی نہیں۔ اور اگر آلہ نے اعادہ کیا جیسا کہ گرامفون میں ہوتا ہے تو سجدہ واجب نہیں کما حقه هو حكم الصدى۔

تنویر الابصار میں ہے: لاتجب بسماعه من الصدى۔ (شامی ج۱ص۵۴)

مراقی الفلاح میں ہے: لاتجب بسماعها من الصدى وما هو يجيبك مثل صوتك في الجبال والصحارى ونحوها۔ (طحطاوی ص۲۸۱)

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے: فانه لا اجابة في الصدى وانما هو محاكاة۔ (طحطاوی ص۲۸۱)

غنیۃ شرح منیہ میں ہے: ولو سمعها من الطائر والصدى لاتجب لانه محاكاة وليس بقراءة۔ (غنیۃ ص۴۶۸) واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول



باب الدعاء

مسئلہ (۴۹۹)

کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ۔

ایک امام صاحب ہرفرض نماز کے بعد دعا مانگتے ہیں مگر سنت اور نفل کے بعد دعا مانگنے کو منع کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم نے سنت اور نفل کے بعد دعانہیں مانگی ہے۔ کہیں اس کا ثبوت بھی نہیں ملتا۔ لہذا برائے کرم سنت اور نفل ادا کرنے کے بعد دعا مانگنے کا ثبوت احادیث وفقہ سے تحریرفرمائیں اور ساتھ ہی معیار سنیت تحریرفرمائیں کہ عوام کو معلوم ہوجائے کہ مذکورامام صاحب کے پیچھے نماز جائز ہے یانہیں؟۔ بینوا توجروا۔ ۲۳ محرم الحرام ۱۳۵۵ھ

المستفتی غلام نظام الدین قادری برکاتی عفی عنہ

کھاروادا متصل بالا پیر علیہ الرحمۃ۔ سورت

الجواب

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔

جن فرض نمازوں کے بعد سنن ونوافل ہیں ان فرائض کے بعد صرف وہ دعا مانگ کر جو حدیث شریف میں مروی ہے سنن ونوافل کو فرائض سے متصل کردینا چاہئے۔

مراقی الفلاح میں ہے۔

کل صلوۃ بعدھا سنۃ یکرہ القعود بعدھا والدعاء بل یشتغل بالسنۃ کی لایفصل بین السنۃ والمکتوبۃ۔ وعن عائشۃ ان النبی صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کان یقعد مقدار مایقول: اللّٰھم انت السلام الخ کماتقدم فلایزید علیہ اوعلی قدرہ۔

ہرنماز جس کے بعد سنت ہوتو اس کے بعد دعا اور بیٹھنا مکروہ تنزیہی ہے بلکہ سنت پڑھنے میں مشغول ہوجائے تاکہ سنت اور فرض میں فصل نہ ہو۔ اور حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالٰی عنہا سے مروی ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم مقدار۔ اللّٰھم انت السلام ومنک السلام

والیک یرجع السلام تبارکت یاذالجلال والاکرام۔ پڑھنے کے بیٹھتے تھے۔

تو اس پر یا اس مقدار پر زیادہ نہ کرے۔ لہذا اب اس حدیث اور عبارات فقہ کی بنا پر ظہر اور مغرب اور عشاء کی نمازوں میں اوراد یا طویل دعا بعد سنت ونفل ہونی چاہئے کہ سنت کا فرض سے متصل کرنا مستحق ہے۔

نورالایضاح میں ہے: القیام الی السنۃ متصلا بالفرض مسنون۔

یعنی فرض سے سنت کی طرف متصل کھڑا ہونا مسنون ہے۔

تو سنن ونوافل سے بعد دعا کا انکار سخت جہالت ہے۔

اولاً: یہ دعا جو سنن ونوافل کے بعد کی جائے گی وہ حقیقۃ فرض ہی کے بعد ہے۔

شامی میں ہے: اماما ورد من الاحادیث فی الاذکار عقیب الصلوۃ فلا دلالۃ فیہ علی الاتیان بھا نبل السنۃ بل یحمل علی اتیان بھا بعدھا۔ لان السنۃ من لواحق الفریضۃ وتوابعھا ومکملاتھا فلم تکن احنبیۃ عنھا فمایفعل بعدھا یطلق علیہ انہ عقیب الفریضۃ۔

مراقی الفلاح میں ہے: لایقتضی وصلھا بالفرض بل کونھا عقیب السنۃ۔

خلاصہ مضمون ان عبارات کا یہ ہے کہ احادیث میں جن اذکار وادعیہ کا بعد فرض نماز پڑھنا وارد ہوا تو ان کو قبل سنت پڑھنے پر کوئی دلالت نہیں اور ان کو فرض سے ملانے کا حکم نہیں بلکہ ان کا پڑھنا مابعد سنت پر محمول ہے۔ اس لئے کہ سنت فرض کے توابع اور لواحق اور مکملات سے ہے تو سنت فرض سے اجنبی نہیں ہوئی۔ پس جو ذکر ودعا سنت کے بعد کیا جائے گا اس پر یہی اطلاق کیا جائے گا کہ وہ بعد فرض ہے۔

ثانیا: دعا کو فرض کے ساتھ خاص کردینا۔ یاکسی وقت کے ساتھ ایسا معین کردینا کہ اس کے سوا اور کسی وقت میں منع کرے یہ خود مکروہ وممنوع ہے۔

ثالثا۔ نوافل کے بعد دعا کرنا مستحب ہے کہ وقت اجابت ہے۔

شامی میں ہے: اذا ابتلی المسلم بالقتل یستحب ان یصلی رکعتین یستغفر اللّٰہ تعالٰی بعدھا۔

یعنی جب کوئی مسلمان قتل میں مبتلا ہوجائے تو اسے یہ مستحب ہے کہ دورکعت نفل پڑھ کر اس کے بعد استغفار کرے، اگرچہ فرض کے بعد کی دعا نفل کے بعد کی دعا سے ضرور افضل ہے۔

مواہب لدنیہ میں ہے: اخرج الطبرانی من روایۃ جعفربن محمد الصادق۔ فالدعاء

بعدالمکتوبة افضل من الدعاء بعدالنافلة کفضل المکتوبة علی النافلة۔

یعنی طبرانی نے بروایت حضرت جعفر بن محمد صادق تخریج کی کہ فرض کے بعد کی دعا نفل کے بعد کی دعا سے افضل ہے جس طرح فرض کو نفل پر فضیلت ہے۔

لہذا یہ امام سخت ناواقف ہے۔ سنت ونوافل کے بعد کی دعا کا انکار کرتا ہے اور فرض کے ساتھ دعا کو خاص کرتا ہے اور شریعت کے مسائل میں اپنی رائے کو دخل دیتا ہے۔

اب باقی رہا اس کا یہ کہنا کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سنت ونوافل کے بعد دعا نہیں مانگی ہے۔ کہیں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ یہ اس کی مذہب سے ناواقفی کی بین دلیل ہے۔

اولاً: اس جاہل کو یہ قاعدہ معلوم نہیں ہے کہ۔

الفعل یدل علی الجواز وعدم الفعل لایدل علی المنع کما فی المواھب اللدنیه۔

یعنی کرنا جواز کی دلیل ہے اور نہ کرنا منع کی دلیل نہیں۔ لہذا وہ عدم فعل کو منع کی دلیل کس طرح قرار دیتا ہے۔

ثانیا: مراقی الفلاح میں ہے: کان علیه السلام اذا سلم یمکث قدر مایقول اللّٰھم انت السلام الخ۔ ثم یقوم الی السنة۔

یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب سلام پھیرتے تو اس دعا "اللّٰھم انت السلام" کے پڑھنے کی مقدار ٹھہرتے پھر سنت کی طرف قیام فرماتے۔ تو یہ امام صاحب اس حدیث کو مدنظر رکھتے ہوئے فرمائیں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وہ ادعیہ واذکار جو بمواظبت ان اوقات میں حضور سے ثابت ہیں وہ قبل سنت ثابت ہونگی یا بعد سنت۔ ہمارے نزدیک تو اس کا وہی جواب ہے جس کو علامہ شامی نے بیان کیا جس کی پوری عبارت اوپر منقول ہوئی۔

ثالثا: اگر یہ امام صاحب مطلق نوافل کے بعد دعا کو منع کرتے ہیں تو بکثرت احادیث اس امر پر دال ہیں۔ بنظر اختصار چند احادیث پیش کی جاتی ہیں۔

بخاری شریف میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ سے مروی ہے:

کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیه وسلم یعلمنا الاستخارة فی الامور کما یعلمنا السورة من القرآن ویقول اذا ھم احدکم بالامر فلیرکع رکعتین من غیر الفریضة ثم یقول اللّٰھم انی استخیرك ۔ الحدیث

یعنی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہم کو تمام امور میں استخارہ کی تعلیم دیتے تھے جس طرح ہم کو قرآن کی سورۃ سکھاتے تھے۔ فرماتے جب تم کسی امر کا قصد کرو تو علاوہ فرض کے دو رکعتیں پڑھو! پھر یہ کہو۔

اللّٰھم انی استخیرك۔

پوری دعا استخارہ ترمذی شریف میں ہے:

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیه وسلم: من کانت له حاجة الی اللّٰہ او الی احد من بنی ادم فلیتوضأ فلیحسن الوضوء ثم یصلی رکعتین ثم یثنی علی اللّٰہ تعالیٰ ویصلی علی النبی صلی اللّٰہ تعالیٰ علیه وسلم ثم یقول: لا اله الا اللّٰہ الحلیم الکریم ۔ الحدیث۔

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف یا کسی آدمی کی طرف کوئی حاجت ہو تو وہ اچھی طرح وضو کرے پھر دو رکعتیں پڑھے پھر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرے پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھے۔ پھر **لا اله الا اللّٰہ الحلیم الکریم**. پوری دعا پڑھے۔

ان احادیث میں نماز نوافل کے بعد دعا کرنے کا خود حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حکم فرمایا۔ اگر یہ امام وہابیہ کی کفری عبارات کو کفر نہیں جانتا۔ یا ضروریات دین سے کسی چیز کا انکار کرتا ہے۔ تو اس کی اقتداء درست نہیں، اس کو امام بنانا صحیح نہیں۔ بحمد اللہ منصف کے لئے یہ مختصر تحریر کافی ہے۔ مولی تعالیٰ قبول حق کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب وعلمہ جل مجدہ اتم واکمل واحکم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۰۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

نماز عشاء میں دعائے قنوت بوقت نزول حوادث عظیمہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں اور اس کا ثبوت حدیث وفقہ سے ہے یا نہیں اور بصورت عدم جواز جو ایسا کرے وہ کس حکم کا مستحق ہے۔ بینوا توجروا

السائل ملا نذیر حسین۔ ساکن محلہ دیپا سرائے بلد سنبھل ضلع مرادآباد

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

حنفیوں کے نزدیک علاوہ وتر کے پنجوقتہ کسی نماز میں دعائے قنوت پڑھنا جائز نہیں ہے۔ کتب فقہ میں یہ مسئلہ صاف طور پر موجود ہے۔

نورالایضاح میں ہے: لایقنت فی غیر الوتر ۔

(نورالایضاح ص ۴۰)

غیر وتر میں قنوت نہ پڑھی جائے۔

غنیۃ شرح منیہ میں ہے: لایقنت فی صلوۃ غیر الوتر عندنا ۔

(غنیۃ ص ۳۹۸)

حنفیوں کے نزدیک سوا وتر کے نماز میں قنوت نہ پڑھی جائے۔

درمختار میں ہے: لایقنت لغیرہ ای غیر الوتر ۔ (ردالمحتار مصری ص ۴۷۱)

وتر کے علاوہ قنوت نہ پڑھی جائے۔

ہاں اگر کوئی حادثہ عظیمہ ومصیبت شدیدہ نازل ہو تو اس وقت صرف نماز فجر میں قنوت پڑھ سکتا ہے۔ اسکے علاوہ اور کسی نماز جمعہ۔ ظہر۔ عصر۔ مغرب۔ عشاء میں اس کا پڑھنا جائز نہیں۔

فقہ کی مشہور کتاب شامی میں ہے: ان قنوت النازلۃ عندنا مختص بصلاۃ الفجر دون غیرھا من الصلوات الجھریۃ او السریۃ ۔ (شامی ص ۴۷۱)

حنفیہ کے نزدیک قنوت نازلہ نماز فجر کے ساتھ خاص ہے اس کے علاوہ اور نمازوں جہری اور سری میں نہیں۔

کبیری شرح منیہ میں ہے:

قال الحافظ ابو جعفر الطحاوی انما لایقنت عندنا فی صلوۃ الفجر من غیر بلیۃ فاذا وقعت فتنۃ او بلیۃ فلاباس بہ فعلہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم واما القنوت فی الصلوات کلھا عند النوازل فلم یقل بہ الا الشافعی وکانھم حملوا ماروی عنہ علیہ الصلوۃ والسلام انہ قنت فی الظھر والعشاء علی مافی مسلم وانہ قنت فی المغرب ایضا علی مافی البخاری علی النسخ۔ (کبیری ص ۴۰۰)

حافظ امام ابو جعفر طحاوی نے فرمایا: حنفیہ کے نزدیک بغیر بلا کے نماز فجر میں قنوت نہ پڑھی جائے۔ اور جب کوئی فتنہ یا بلا نازل ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

نے کیا۔ لیکن وقت نوازل قنوت کا تمام نمازوں میں پڑھنا تو اسے سوا امام شافعی کے اور کسی نے نہیں کہا اور فقہا نے (جو مسلم شریف میں حضور علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضور نے نماز ظہر اور عشاء میں قنوت پڑھی اور بخاری شریف میں مروی ہے کہ حضور نے نماز مغرب میں بھی قنوت پڑھی) ان احادیث کو منسوخ ہونے پر محمول کیا۔

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ علاوہ فجر کے جو اور نمازوں میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی ہے وہ منسوخ ہے بلکہ نماز فجر میں بھی عموم حکم منسوخ ہے صرف بوقت نزول حوادث اجازت ہے۔

چنانچہ ردالمحتار میں ہے:

قولھم بان القنوت فی الفجر منسوخ معناہ نسخ عموم الحکم لانسخ اصلہ ۔

(ردالمحتار۔ ص ۴۷۱)

فقہاء کا یہ قول کہ فجر میں قنوت منسوخ ہے اسکے معنی یہ ہیں کہ عموم حکم منسوخ ہے اصل حکم منسوخ نہیں۔

اب جن مفتیوں نے علاوہ فجر کے اور اوقات مغرب عشاء وغیرہ میں دعا قنوت کے جواز کا غلط فتوی دیا ہے، اگر یہ ان کی کم علمی اور کتب فقہ سے نافہمی کی بنا پر ہے تو وہ مذہب حنفیہ سے ناواقفیت اور احادیث سے لاعلمی کی دلیل ہے اور حنفیوں کے لئے قول امام شافعی وامام احمد وامام سفیان ثوری کو پیش کر کے خلاف مذہب حنفیہ عمل کرنے کی تجویز ہے باوجود یکہ۔

درمختار میں تصریح موجود ہے: الحکم والفتیا بالقول المرجوح خرق للاجماع ۔

(ص ۵۳)

ردالمحتار میں ہے:

الثبات علی مذھب ابی حنیفۃ خیر واولی واقول لھم کمافی البحر والعجب کیف یختارون خلاف ظاھر المذھب مع انہ الاتباع علی مقلد ابی حنیفۃ ۔

اگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مفتی وہابی ہیں اور وہابی در پردہ غیر مقلد ہوتا ہے اور ایک معین امام کی تقلید کو شرک بتاتا ہے جیسا کہ ان کے امام اسمعیل دہلوی تنویر العینین میں تقلید شخصی کو شرک قرار دیا ہے۔ لہذا یہ حنفیوں سے علاوہ فجر کے اور اوقات میں قنوت پڑھوا کر خلاف مذہب حنفی کی ترغیب دیتے ہیں اور ہمارا مذہب ہمیں تبدیل مذہب کی اجازت نہیں دیتا اور ایک امام کے مذہب کو چھوڑ کر دوسرے امام کے مذہب

پرعمل کرنے کا اختیار نہیں دیتا۔

فقہ کی مشہور کتاب شامی میں ہے:

لیس للعامی ان یتحول من مذہب الی مذہب ویستوی فیہ الحنفی والشافعی۔

حاصل جواب یہ ہے کہ نماز عشاء میں دعائے قنوت پڑھنا ناجائز ہے اور کتب فقہ حنفی اور احادیث کے خلاف ہے اور جو یہ فعل لاعلمی سے کرے وہ فعل ناجائز کا مرتکب ہے اور جو مذہب حنفیہ کو جانتے ہوئے بالقصد ایسا کرے وہ مستوجب تادیب وتعزیر ہے اور وقت نزع اس کے ایمان سلب ہونے کا خوف ہے اور وہ مذاہب ائمہ کے ساتھ استہزا و مذاق کرتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۰۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

اس زمانے میں جب کہ ہر جگہ مسلمانوں کو ستایا جارہا ہے اور طرح طرح مظالم کا شکار بنایا جارہا ہے ایسی حالت میں صبح کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھنا جائز ہے کہ نہیں؟۔ اور اس کی ممانعت ہو تو تفصیل سے جواب دیں۔ مولوی حسین احمد ٹانڈوی آج کل قنوت نازلہ پڑھنے کے بارے میں زوروں سے تاکید کررہے ہیں۔ لہذا سنیوں کو بھی لائحہ عمل بتایا جائے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

قنوت نازلہ برائے دفع مصیبت وحفاظت مسلمین وہلاکت اعداء صرف نماز فجر میں بعد رکوع جائز ہے مگر خلاف اولیٰ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ بعد نماز اس مقصد کے لئے دعاء کرے۔ رہا مولوی حسین احمد ٹانڈوی کا حکم تو وہ فریب سے خالی نہیں۔ کہ ہندوستان میں تو وہ قنوت نازلہ پڑھنے کی تاکید کرکے قوم کو یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر مظالم ہورہے ہیں۔ اور عرب میں جاکر مسلمانان عالم میں یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ مسلمانان ہند نہایت امن اور آرام میں ہیں۔ تو مسلمانو فیصلہ کرو کہ اس کی کونسی بات سچی ہے اور کونسی جھوٹی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۰۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام مسئلہ ذیل میں

عرض خدمت میں یہ ہے کہ وہ ذکر عطا فرمایا جاوے جو عند اللہ وعند الرسول (جل جلالہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) محبوب ترین ہو اور اس کے پڑھنے کی اجازت مع دعاء برکات۔

ایک مسئلہ اور حضور حل فرمادیں کہ کھانا کھانے کے بعد دعا مانگنا سنت ہے یا نہیں؟۔ اور اگر سنت ہے تو کھانے کے بعد بغیر ہاتھ دھوئے مانگے یا ہاتھ دھوکر مانگے اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگے یا یونہی دل سے دعا ماثور پڑھے؟۔

آپکا کفش بردار محمد عبداللہ نعیمی رضوی کھیری محلہ ڈہ پور۔ ضلع وپوسٹ آفس
کھیری ٹاؤن ۴ دسمبر ۱۹۵۸ء

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

کھانے کے بعد حمد ودعا کرنا مسنون ہے فتاوی عالمگیری میں ہے

وسنن الطعام البسملۃ فی اولہ والحمد فی آخرہ"

اب رہی یہ تفصیل کہ دعا بغیر ہاتھ دھوئے مانگے یا ہاتھ دھوکر مانگے تو فتاوی میں ہے

"اما دعا کردن بعضے احادیث مشعر اند باینکہ بعد از غسل دست سنت باشد وبعضے مشعر اند باینکہ قبل از غسل سنت باشد"

یعنی بعض احادیث میں تو دعا کرنا ہاتھ دھونے کے بعد آیا ہے اور بعض میں ہاتھ دھونے سے قبل سنت ہونا مروی ہے۔ لیکن میں نے اپنے اکابر کو یہ دیکھا کہ وہ ہاتھ دھونے سے قبل دعا کرتے تھے اسی کا میں بھی عامل ہوں۔ رہا دعا میں ہاتھ کا اٹھانا تو یہ دعا کی سنت ہے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

اعمال میں میرے نزدیک سب سے محبوب ترین درود شریف ہے کہ ترمذی کی حدیث حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ میں آپ پر بکثرت درود پڑھتا ہوں تو کس قدر پڑھوں؟۔ فرمایا: تو جتنا چاہے۔ میں نے عرض کیا: چوتھائی اوقات میں؟ فرمایا: تو جتنا چاہے اس سے زیادہ ہو تو اور بہتر ہے۔ میں عرض کیا: دو تہائی اوقات میں؟۔ فرمایا: جتنا چاہے اگر اس پر

زیادہ کرے تو تیرے لئے اور بہتر ہے۔ تو میں نے عرض کیا: تو علاوہ فرائض وحوائج کے سب اوقات درود کے لئے مقرر کرلوں فرمایا:"اذا یکفی ھمك ویکفر لك ذنبك" تو یہ اس وقت تیرے غم کے لئے کفایت کریگا اور تیرے گناہ کے لئے کفارہ ہو جائیگا۔ اس حدیث شریف سے ثابت ہو گیا کہ درود شریف محبوب ترین اعمال سے ہے۔ ۵ جمادی الاخری ۱۳۷۸ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۰۳)

کیا فرماتے ہیں علماء دین و شرع متین اس مسئلہ میں کہ
اگر کوئی شخص تراویح کے اندر ہر ترویحہ پر دعاء مسنون سبحان ذی الملك والملكوت الخ پڑھنے کے بعد صلوۃ خمسہ کی طرح ہاتھ اٹھا کر دعا مانگے تو از روئے قرآن و حدیث وفقہ جائز و درست ہوگا یا نہیں؟ کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ بدعت و ناجائز ہے کس حد تک صحیح ہے اگر اس کو غلط قرار دیا جائے تو "الدعاء مخ العبادة" کے کیا مطلب ہونگے۔ اس لئے التماس ہے کہ مسئلہ مذکورہ کا جواب جواز و عدم جواز کی حیثیت سے مدلل و مشرح معہ حوالہ کتب و عبارات تحریر فرمایا جاوے۔ تاکہ ہر خاص و عام کے لئے دلیل و حجت قاطعہ بن سکے والسلام

السائل عبد الرزاق امام مسجد سرائے ترین سنبھل

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ہر نماز فرض ونفل کے بعد دعا کرنا سنت ہے اور حدیث سے ثابت ہے۔
حافظ ابو نعیم کتاب عمل الیوم واللیلۃ میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالی عنہ سے راوی:
قال ما یفوت النبی صلی اللہ تعالی علیہ سلم فی دبر صلوۃ مکتوبۃ ولا تطوع الا سمعتہ یقول: اللھم اغفر لی خطایای کلھا، اللھم اھد نی لصالح الاعمال والاخلاق الخ"

اس حدیث سے ثابت ہو گیا کہ جس طرح فرائض کے بعد دعا سنت ہے اسی طرح سنن ونوافل کے بعد بھی سنت ہے اور آداب و مستحبات دعا سے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا ہے۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے
"ان النبی صلی اللہ تعالی علیہ سلم کان اذا دعا فرفع یدیہ۔ (مشکوۃ شریف)
ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ سنت ونوافل کے بعد بھی ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا سنت ہے اور تراویح کا سنت ہونا کس پر پوشیدہ ہے تو ہر ترویحہ پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا سنت ہونا انہیں احادیث سے ثابت ہو گیا۔ جو اس کو بدعت کہتا ہے وہ تا قیامت اس کا بدعت ہونا ثابت نہیں کر سکتا بلکہ اس جاہل نے محض اپنی عقل سے سنت کو بدعت قرار دیا۔ بلکہ یہ ستم کیا کہ حدیث شریف کے جائز کردہ عمل کو فقط اپنی رائے ناقص سے ناجائز ٹھہرا دیا۔ اور مسلمانوں کو غلط مسئلہ بتا کر اہل اسلام میں اختلاف و فساد پیدا کر دیا۔ لہذا مسلمان ایسے کم علم و جاہل مفتی کی بات پر ہرگز ہرگز عمل نہ کریں اور اس سے کوئی دینی مسئلہ دریافت نہ کریں۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۷۷ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۰۴)

بسم اللہ الرحمن الرحیم
کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ان مسائل میں
(۱) بعد فراغ پنجگانہ نماز فرائض وسنن ونوافل امام بالجہر دعا مانگتا ہے اور مقتدی آمین کہتے ہیں جمعیت کے ساتھ جیسا کہ رواج گجرات میں اکثر ہے یہ دعا مانگنا گناہ ہے یا کیسا؟ عند الاحنا ف۔
ثانیا۔ نماز تراویح کے ہر ترویحہ کے بعد تسبیح یا درود شریف یا کلمہ شریف وغیرہ اذکار بالجہر پڑھتے ہیں یہ جائز ہے یا ناجائز ہے؟۔
ثالثا۔ بزرگان دین کے مزار پر پھولوں کا رکھنا شرعا جائز ہے یا ناجائز مدلل طور سے کتاب کے حوالے کے ساتھ اس کا جواب باصواب عنایت فرمادیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

امام فرائض ونوافل سے فارغ ہونے کے بعد بآواز دعا مانگ سکتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی انہوں نے فرمایا:

ما يفوت النبی صلی الله تعالیٰ عليه سلم فی دبرصلوٰة مكتوبة ولا تطوع الا سمعته يقول: اللهم اغفر خطايا ی كلها اللهم اهد نی لصالح الاعمال والا خلاق الخ (رواه ابو نعيم الحافظ فی كتاب عمل اليو م والليلة)

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ سلم بعد نماز دعا فرماتے اور دعا بھی اتنی آواز سے ہوتی کہ صحابہ کرام سن لیتے تھے۔ لہذا اس دعا کا بالجہر پڑھنا خود فعل نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ سلم سے ثابت ہے۔

اب باقی رہا امام کا مقتدیوں کو شریک کر کے دعا مانگنا اس میں کوئی حرج نہیں اور مجمع عام میں دعا کا یہی قاعدہ ہے کہ قوم کا ایک شخص دعا کے الفاظ بالجہر کہتا ہے اور لوگ آمیں کہتے ہیں۔

چنانچہ مراقی الفلاح میں ہے: واذ ادعا يو منو ن علی دعا ئه ۔ لہذا گجرات کا یہ طریقہ دعا نہ گناہ ہے، نہ ناجائز واللہ تعالی اعلم۔

ہر ترویحہ پر تسبیح وصلوۃ اور ادعیہ واذکار کا بآواز پڑھنا بھی جائز ہے کہ بالجہر پڑھنے میں نشاط کا زائد ہونا، نیند کا دفع ہونا، سامعین کو فائدہ پہونچنا، فکر وسمع کا ایک سا ہوجانا وغیرہ وغیرہ فوائد ہیں، اسلئے اس کو بعض فقہاء نے افضل تک قرار دیا۔

ردالمحتار میں ہے: قال بعض اهل العلم ان الجهر افضل لا نه اكثر عملا۔

تو جو بلا کسی وجہ شرعی کے اوراد ادعیہ واذکار کے جہر کو ناجائز قرار دیتا ہے تو وہ تصریحات فقہاء کے مخالف کرتا ہے۔ اجمع العلاء سلفا وخلفا علی استحبا ب ذكر الجهر فی الجماعة فی المساجد وغير ها الا ان يشوش جهر هم علی قائم اومصل او قاری الخ ۔ واللہ تعالی اعلم۔

قبروں پر پھولوں کا رکھنا نہ فقط جائز بلکہ حسن ہے۔ فتاوے عالمگیری میں ہے۔ وضع الورد الريا حين علی القبور حسن۔ (عالمگیری مطبوعہ مجیدی کان پور ص ۱۱۰ ج ۴)

تو جب عامۃ المسلمیں کی قبور پر پھولوں کا رکھنا حسن ہے تو بزرگان دین کے مزارات پر پھولوں کا رکھنا بدرجہ اولی حسن ہوا۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفر لہ الاول

مسئلہ (۵۰۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ

بعد نماز فرض جماعت پنج وقتہ بآواز بلند سہ مرتبہ کلمہ طیب پڑھنا کیسا ہے، بعض علماء منع کرتے ہیں اور مثال دیگر کہتے ہیں کہ عید الاضحیٰ میں تکبیر جو پڑھتے ہیں اس میں کلمہ بھی ہے اس کے پڑھنے کا روزانہ کیوں حکم نہیں ہوا، میں نے اس پر یہ کہا کہ آپ کے کہنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح قربانی کا تین یوم حکم ہے کہ تین یوم قربانی کرو اس کو روزانہ تمام عمر کرنے کا حکم کیوں نہیں ہوا۔ برائے کرم جواب سے مطلع فرمائے کہ کلمہ طیبہ کا بعد نماز جماعت فرض کے بآواز بلند پڑھنا درست ہے یا درست نہیں ہے؟۔ فقط والسلام

نیاز مند حافظ عبد الحمید رنگساز سنبھل محلہ چمن سرائے۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۵۰ء۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الكريم

اذکار کے بعد جماعت فرض بآواز بلند پڑھنا سنت ہے اور کلمہ طیبہ افضل ذکر ہے۔

چنانچہ مسلم شریف میں حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی:

كان رسول الله ﷺ اذا سلم من صلوته يقول بصوته الا علی لااله الا الله وحده لاشريك له الملك وله الحمد وهو علی كل شئ قدير الحديث ۔

(مشكوة شريف ص ۸۸)

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ سلم جب اپنی نماز کا سلام پھیرتے تو بلند آواز سے یہ فرماتے تھے:

لا اله الا الله وحده لا شريك له الخ۔

اس حدیث شریف سے ثابت ہوگیا کہ کلمہ شریف۔ لا الہ الا اللہ کا بعد نماز بآواز بلند پڑھنا خود حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ سلم کا فعل ہے بلکہ یہ زمانہ اقدس میں جماعت فرض کے ختم ہوجانے کی علامت تھا۔

چنانچہ مسلم شریف ہی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے:

ان رفع الصوت بالذكر حين ينصر ف النا س من المكتو بة كان علی عهد النبی صلی الله تعالیٰ عليه سلم، قال ابن عباس: كنت اعلم اذا انصرفو بذلك اذا سمعته۔

(مسلم شریف معہ نووی مجتبائی۔ ص ۲۱۷ ج ۱)

زمانہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ سلم میں جب لوگ نماز فرض سے فارغ ہوتے تو بلند آواز سے ذکر کرتے تھے، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: جب میں ذکر کی آواز سن لیتا تو جان لیتا تھا کہ لوگ نماز سے فارغ

ہو چکے۔

اس حدیث سے معلوم ہوگیا کہ صحابہ کرام فرضوں کی جماعت سے فراغت کے بعد بہ التزام بآواز بلند ذکر کیا کرتے تھے جبھی تو یہ ختم جماعت کی علامت قرار پایا تھا۔ اسی بنا پر علامہ سیدی احمد طحطاوی نے حاشیہ مراقی الفلاح میں یہ استدلال کیا:

ویستفاد من الحدیث الاخیر جواز رفع الصوت بالذکر والتکبیر عقب المکتوبات بل من السلف من قال باستحبابه وجزم به ابن حزم ۔

(طحطاوی مصری۔ ص ۱۸۱)

فرضوں کے بعد ذکر وتکبیر کے بلند آواز سے پڑھنے کا جواز حدیث اخیر سے مستفاد ہوا بلکہ سلف میں سے بعض نے اسکا مستحب ہونا بیان کیا اور ابن حزم نے اسی پر جزم کیا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ روز روشن کیطرح ثابت ہوگیا کہ کلمہ طیبہ کا بعد جماعت فرض بآواز بلند پڑھنا خود حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ سلم کا فعل ہے اور ان کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا فعل ہے تو یہ سنت رسول علیہ السلام بھی قرار پایا اور سنت صحابہ بھی ٹھہرا۔

اب وہابی اس کو بدعت ناجائز کہکر اور اسکو منع کر کے سنت کو بدعت وناجائز کہتا ہے اور سنت کی مخالفت کرتا ہے۔ بظاہر تو اسکا دعوے یہ ہے کہ ہم سنت پر عمل کرتے ہیں، لیکن درحقیقت کلمہ طیبہ کے دشمن ہیں۔ سنت کو بدعت کہتے ہیں۔ فعل رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ سلم کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔

ہم مسلمانوں کا عمل یہ ہے کہ کلمہ طیبہ کا بعد جماعت فرض بآواز بلند پڑھنا سنت جانتے ہیں۔ اور اسکا التزام کرنا موجب اجر وثواب سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کی تصریحات سے ظاہر ہو چکا۔ مولیٰ تعالیٰ ان مخالفین کو چشم بینا عطا فرمائے اور انہیں قبول حق کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ

(۵۰۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ

(۱) نماز ودعا ونفل سے فارغ ہوکر آخر میں امام ومقتدی کا دعائے ثانی کرنا کیسا ہے؟

(۲) نماز ودعا سے فارغ ہوکر متوسط آواز سے کلمہ شہادت پڑھنا کیا ہے؟

(۳) ہر نماز کے بعد یا عشاء وفجر کے بعد باداموں پر درود شریف پڑھنا جائز ہے یا ناجائز؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) سنن ونوافل سے فراغت کے بعد بھی دعا کرنا حدیث شریف سے ثابت ہے جس کے حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ راوی وہ فرماتے ہیں:

ما یفوت النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فی دیر صلوٰۃ مکتوبۃ ولا تطوع الا سمعته یقول اللھم اغفر خطایای کلھا اللھم اھدنی لصالح الاعمال والاخلاق الخ ۔

(رواہ ابو نعیم فی کتاب عمل الیوم واللیلۃ)

یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے فرض نماز کے بعد اور اسی طرح نفل نماز کے بعد یہ دعا فوت ہی نہیں ہوتی میں نے حضور کو وہ دعا اسی طرح کرتے سنا۔ اے اللہ میری سب خطاؤں کو بخش دے۔ اے اللہ مجھے بہتر اعمال واخلاق کی ہدایت کر الخ۔

اس حدیث سے واضح طور پر ثابت ہوگیا کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جس طرح فرائض کے بعد دعا کیا کرتے تھے۔ تو یہ دعا تو دعا اول ہوئی اسی طرح حضور نفل نمازوں کے بعد دعا کرتے تھے تو جو نوافل فرائض کے بعد میں ہوں ان کے بعد کی دعا گویا ثانی دعا نہ ہوئی۔ پھر جب اس دعائے ثانی کا بھی سنت ہونا ثابت ہوگیا تو کون ایسا امتی ہے جو سنن ونوافل کے بعد کی دعائے ثانی کو ترک کر دیگا۔ لہٰذا جو امام سنن ونوافل کے بعد بموافق اس حدیث کے اس قدر آواز سے دعا کرے جس کو مقتدی بھی سن رہے ہوں تو بمطابق آداب دعا کے ان مقتدیوں کو اس کی دعا پر آمین کہنا چاہیئے۔ جیسا کہ صلوٰۃ کسوف واستسقاء کے بعد امام بلند آواز سے دعا کرتا ہے تو مقتدیوں کو آمین کہنے کا حکم ہے۔

مراقی الفلاح میں ہے: اذا دعا یؤمنون علی دعائه ۔

(طحطاوی مصری ص ۳۱۷)

یعنی جب امام دعا کرے تو مقتدی اس کی دعا پر آمین کہیں۔ لہٰذا سنت ونفل کے بعد امام ومقتدیوں کا دعائے ثانی کرنا بلاشک جائز ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) نماز فرض کے بعد بآواز بلند ذکر حدیث شریف سے ثابت ہے۔ حدیث شریف میں حضرت معبد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے ان ابن عباس اخبرہ ان رفع الصوت بالذکر حین

ینصرف الناس من المکتوبة کان علی عهد النبی صلی الله تعالی علیه وسلم و انه قال قال ابن عباس کنت اعلم اذا انصر فوابذلك اذا سمعته۔

(مسلم۔ج ا۔ص ۲۱۷)

یعنی حضرت ابن عباس نے انہیں خبر دی کہ لوگوں کا فرض سے فارغ ہونے کے وقت ذکر کا بلند آواز سے کرنا زمانہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں تھا اور حضرت ابن عباس نے فرمایا جب میں ذکر کی آواز سن لیتا تو اسی سے ان کا نماز سے فارغ ہونا جان لیتا۔

اور طحطاوی میں ہے: فی مسلم عن عبد الله بن الزبیر کان رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم اذا فرغ من صلوته قال بصوته الا علی لا اله الا الله وحده لا شریك له۔ ویستفاد من الحدیث الاخیر جواز رفع الصوت بالذکر والتکبیر عقب المکتوبات بل من السلف من قال باستحبابه ملخصا۔ (طحطاوی ص ۱۸۱)

یعنی مسلم میں حضرت عبداللہ بن زبیر سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی نماز سے فارغ ہوتے تو بلند آواز سے لا اله الا الله وحده لا شریك له الخ فرماتے۔ علامہ طحطاوی نے فرمایا اس حدیث سے فرائض کے بعد ذکر اور تکبیر کا بلند آواز سے جائز ہونا مستفاد ہوا بلکہ بعض سلف نے اس کا مستحب ہونا بیان کیا۔

ان احادیث اور عبارات فقہ سے فرض نمازوں کے بعد ذکر کلمہ شریف کا باآواز بلند کہنا نہ فقط جائز بلکہ مستحب بلکہ سنت صحابہ بلکہ سنت نبی علیہ السلام ثابت ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۵) درود شریف کا وظیفہ ہر نماز کے بعد یا عشا وفجر کے بعد۔ باداموں پر یا تسبیحوں پر نہ فقط جائز بلکہ سنت ہے۔ خود حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کے بکثرت ورد کا حکم فرمایا۔

ترمذی شریف میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی: قال: قلت: یا رسول الله! انی اکثر الصلوة علیك فکم اجعل لك من صلوتی؟۔ فقال: ماشئت قلت: الربع، قال: ماشئت فان زدت فهو خیر لك، قلت: النصف قال: ماشئت فان زدت فهو خیر لك، قلت: فالثلثین قال: ماشئت فان زدت فهو خیرلك، قلت: اجعل لك صلوتی کلها قال: اذا یکفی همك و یکفرلك ذنبك رواه الترمذی۔ (مشکوۃ۔ص ۸۶)

کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں آپ پر بکثرت درود بھیجتا ہوں تو کس قدر اپنا درود آپ کے لئے کروں؟ تو حضور نے فرمایا تو جس قدر چاہے۔ میں نے عرض کیا: چوتھائی وقت؟ فرمایا تو جتنا چاہے۔ پس اگر چوتھائی سے زیادہ کرے تو وہ تیرے لئے زیادہ بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا: آدھا وقت معین کروں؟۔ فرمایا تو جتنا چاہے۔ پس اگر نصف سے زیادہ کرے تو وہ تیرے لئے زیادہ بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا: کہ دو تہائی وقت معین کروں؟۔ تو فرمایا تو جتنا چاہے۔ پس اگر دو تہائی سے زیادہ کرے تو وہ تیرے لئے بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا: کہ وقت دعا کا کل وقت آپ کے لئے معین کروں؟۔ فرمایا جب کل وقت دعا درود میں گزار دیگا تو یہ تیرے غم کی کفایت کرے گا۔ اور تیرے لئے گناہوں کا کفارہ ہوگا۔

اس حدیث شریف سے ثابت ہوگیا کہ بعد فرائض کے درود شریف کا بکثرت پڑھنا حصول مقاصد دینی و دنیوی اور کفارہ گناہوں کے لئے بہتر وظیفہ ہیں اور کفالت مہمات وحصول فیوضات کے لئے عمدہ ترین ذریعہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۰۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ملک دکھن میں اکثر شہر اور دیہات میں زمانہ دراز سے پنجوقتہ نمازوں میں بعد نماز نفل جو امام اور مقتدی سب مسجد میں ادا کرتے ہیں ثانی دعا امام معہ مقتدی پڑھکر کبھی درود کبھی فاتحہ معہ درود کرتے ہیں، اور جمعہ کی نفل نماز کے بعد بھی اور عیدین کی نفل نماز کے بعد بھی اس کا دستور ہے۔ بعد جمعہ اور عیدین امام سے مصافحہ کرتے ہیں اور باہم مقتدی بھی مصافحہ کرتے ہیں۔ اب ایک مفتی صاحب دیوبندی وعظ بیان کرتے ہیں، کہ یہ چاروں عمل یعنی دعائے ثانی معہ امام، درود بعد دعا، فاتحہ معہ درود بعد دعا، اور مصافحہ بعد نماز جمعہ وعیدین، یہ سب عمل خلاف سنت رسول وصحابہ ہیں، بدعت ضلالت ہیں، جہنمی ہیں۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت ان بدعتیوں کو نہوگی۔ یہ سنکر سب لوگ متوحش ہیں متردد اور متفکر ہیں، کہ یہ عمل ہم ایصال ثواب برائے رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور دیگر اہل بزرگان دین کے لئے کرتے تھے، اب مفتی صاحب گناہ کے کام بتارہے ہیں۔ آپ یہ چاروں کام بدعت حسنہ ہیں یا بدعت سیہ ہیں، بتا کر ہماری صحیح رہنمائی فرمائیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

فرض اور نفل سے فارغ ہونے کے بعد دعا کرنا حدیث شریف سے ثابت ہے جس کو حافظ ابو نعیم نے اپنی کتاب عمل الیوم واللیلۃ میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے تخریج کی کہ انہوں نے کہا: ما یفوت النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فی دبر صلوۃ مکتوبۃ ولا تطوع الا سمعتہ یقول اللھم اغفر خطایای کلھا اللھم اھدنی لصالح الاعمال و الاخلاق الحدیث۔

میں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نماز فرض ونفل کے بعد یہ دعا کرتے ہوئے سنا اور حضور یہ دعا ترک نہ فرماتے: اے اللہ میری سب خطاؤں کی مغفرت فرما۔ اے اللہ مجھے اچھے اعمال واخلاق کی طرف ہدایت کر۔

اس حدیث سے ثابت ہوگیا کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نہ فقط نماز فرض کے بعد بلکہ نماز نفل کے بعد بھی دعا کرتے اور دعا بھی اس قدر بلند آواز سے کرتے کہ صحابہ کرام اس کو سن لیتے، تو دعا کا کرنا جس طرح بعد فراغت نماز فعل رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت اسی طرح نوافل کے بعد بھی فعل رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ صورت مسئولہ میں جس دعا کا ذکر ہے وہ بعد نوافل ہی تو ہے۔ تو یہ دعا خلاف سنت کس طرح ہوئی اور جب حدیث میں بعد نوافل کے دعا کرنا فعل رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت ہے تو اس کو بدعت کہنا کیسے روا ہوگیا، تو جو اس دعا بعد نوافل کو خلاف سنت اور بدعت کہے وہ خود بدعتی وجہنمی ہے، اور فعل رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ناواقف ہے۔ مولی تعالیٰ اس کو قبول حق کی توفیق عطا فرمائے۔

اسی طرح درود شریف کا دعا کے ساتھ پڑھنا، یہ بھی کیسے ناجائز و بدعت ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں درود شریف پڑھنے کا اس طرح حکم فرماتا ہے۔

ان اللہ و ملئکتہ یصلون علی النبی یا ایھا الذین امنوا صلوا علیہ و سلموا تسلیما۔

بیشک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم ان پر درود بھیجو اور سلام بھیجو۔

اس آیت کریمہ میں درود شریف کے لئے کوئی خاص وقت معین نہیں کیا تو جس وقت بھی درود پڑھی جائے، وہ اسی حکم کی تعمیل ہوگی تو جو درود دعا پڑھا جائے گا، وہ اسی عموم حکم آیت کے تحت میں داخل

ہے اور حدیث شریف سے بھی جس طرح درود شریف کا نماز کے اندر پڑھنا ثابت ہے اسی طرح بعد نماز اس کا دعا کے ساتھ پڑھنا بھی ثابت ہے۔

چنانچہ ترمذی شریف، ابوداؤد اور نسائی میں حضرت فضالہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی انہوں نے کہا:

بینما رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قاعد اذ دخل رجل فصلی فقال اللھم اغفرلی و ارحمنی فقال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عجلت ایھاالمصلی اذا صلیت فقعدت فاحمد اللہ بما ھو اھلہ وصل علی ثم ادعہ ثم صلی رجل آخر بعد ذلک فحمد اللہ وصلی علی النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فقال لہ النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایھا المصلی دع تجب۔ (مشکوۃ۔ص ۱۸۶)

اس درمیان کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اچانک ایک شخص آیا اور اس نے نماز پڑھی پھر کہا اے اللہ میری مغفرت کر اور مجھ پر رحم فرما تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا اے نمازی تو نے عجلت کی جب تو نماز پڑھ چکے تو بیٹھ اور اللہ کی حمد کر جس کا وہ اہل ہے اور مجھ پر درود پڑھ، پھر خدا سے دعا کر، راوی نے کہا پھر ایک دوسرا شخص اس کے بعد آیا اس نے اللہ کی حمد کی اور نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر درود پڑھا تو اس سے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا اے نمازی دعا طلب کر قبول کی جائے گی۔

اس حدیث سے ثابت ہوگیا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب آداب دعا تعلیم فرمائے تو یہ ترتیب بتائی کہ پہلے حمد وثنا ہو پھر درود شریف پڑھا جائے اس کے بعد دعا کی جائے۔ نیز یہ درود شریف قبول دعا کا ذریعہ اور حصول مقاصد کا وسیلہ ہے، جیسا کہ ترمذی کی حدیث شریف میں ہے کہ حضرت امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

ان الدعاء موقوف بین السماء والارض لا یصعد منھا شی حتی تصلی علی نبیک۔

بیشک دعا آسمان وزمین میں روک دی جاتی ہے اس کا کوئی حصہ اوپر نہیں چڑھتا، یہاں تک کہ تم اپنے نبی پر درود پڑھو۔

تو درود شریف کا قبل دعا کیلئے زیادہ مناسب ہوا اسی بنا پر اہل اعمال درود شریف کو دعا سے پہلے بھی پڑھتے ہیں اور بعد میں بھی پڑھتے ہیں۔ لہذا درود شریف کا فاتحہ کے ساتھ پڑھنا جو خود دعا بھی ہے

اورحمد پر بھی مشتمل ہے۔اسی طرح اس کا بعد دعا پڑھنا نہ خلاف سنت ہوا نہ بدعت ضلالت تو جو اس کو باوجود ان روشن دلائل آیت واحادیث کے محض اپنی ناقص عقل سے خلاف سنت اور بدعت کہتا ہے وہ خود جہنمی ہونے کی تیاری کرتا ہے۔اوراپنے آپ کو بدعتی قرار دیتا ہے،اب باقی رہا جمعہ وعیدین کے بعد کا مصافحہ اس میں کوئی مسلمان تو کوئی بحث کر نہیں سکتا،کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے:تصافحو یذھب الغل۔ (مشکوۃ ص۴۰۱)

یعنی مصافحہ کرو کہ وہ حسد کو دور کرتا ہے۔

فقہ کی مشہور کتاب طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے۔المصافحۃ سنۃ فی سائر الاوقات۔
یعنی مصافحہ سنت تمام اوقات میں ہی سنت ہے،تو جمعہ اور عیدین کے بعد کا وقت بھی منجملہ اوقات کے ایک وقت ہی تو ہے۔اس میں مصافحہ کس طرح مخالف سنت ہو سکتا ہے،چنانچہ" وشاح الجید فی معانقۃ العید "میں بحوالہ تکمیل شرح اربعین منقول ہے۔

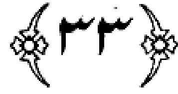
مشروعیۃ المصافحۃ مطلقا اعم من ان تکون عقیب الصلوات الخمس والجمعۃ و العیدین وغیر ذالک لان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لم یقید ھا لوقت دون وقت۔

مطلقا مصافحہ کا جائز ہونا اس کو اعم ہے،کہ وہ پانچوں نمازوں اور جمعہ اور عیدین کے بعد ہو۔اس لئے کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو کسی خاص وقت کے ساتھ مقید نہیں کیا۔

ان دلائل سے ثابت ہو گیا کہ پنج وقتہ نمازوں اور جمعہ وعیدین کے بعد کا مصافحہ بلاشک جائز و فعل سنت ہے اور عموم حکم حدیث شریف کے تحت میں داخل ہے،تو جو اس کے خلاف سنت اور بدعت ضلالت قرار دیتا ہے وہ مخالف سنت اور بدعتی ہے،اور وہ جائز امور کو محض اپنی رائے سے ناجائز ٹھہرا کر خود جہنمی بنتا ہے۔

بالجملہ ان چاروں امور کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔انکے ناجائز و بدعت کہنے والے کے پاس عدم جواز کی کوئی صریح دلیل موجود نہیں ہے،محض اپنی ناقص عقل سے ان چار امور کو ناجائز اور بدعت کہتا ہے،مولی تعالی اس کو قبول حق کی توفیق عطا فرمائے۔واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل،الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول،ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل



باب القرآن والتفسیر

ھوالقادر

مسئلہ (۵۰۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس شخص کے بارے میں جس نے تفسیر قرآن کے نام پر بلغۃ الحیوان نامی ایک کتاب لکھی اور اس کے صفحہ ۲ پر

فاتوا بسورۃ من مثلہ

کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا

(۱)اس جگہ مفسرین یہ معنی کرتے ہیں کہ قرآن بلیغ وفصیح کلام ہے اس کی مثل کوئی ایسا بلیغ اور فصیح کلام لاؤ۔لیکن خیال کرنا چاہئے کہ کفار کو عاجز کرنا کوئی فصاحت سے نہ تھا کیونکہ قرآن خاص واسطے کفار فصحاء وبلغاء کے نہیں آیا تھا۔اور یہ کمال بھی نہیں ہے انتہی بلفظہ۔تو کیا احناف اہل سنت کے مذہب میں قرآن کریم کی فصاحت کا اس طرح انکار جائز ہے؟۔

(۲)صفحہ ۱۵سطر ۳ پر لکھا

وادخلو الباب سجدا

میں باب سے مراد مسجد کا دروازہ ہے جو کہ نزدیک تھا اور باقی تفسیروں کا کذب ہے انتھی بلفظہ۔
کیا مفسرین کرام کو کاذب کہنا درست ہے اور اگر نہیں تو قائل کا کیا حکم ہے؟۔

(۳)صفحہ ۱۵سطر ۲۰ پر سورۂ بقرہ میں

فقلنا اضربوہ ببعضھا

کی تفسیر میں لکھا مفسرین نے تو یہ کہا ہے کہ انہوں نے نفس کو قتل کیا تھا اور قاتل معلوم نہ ہوا تھا لہذا امر کیا کہ ایسے بقرہ کو ذبح کر کے اس قتیل کو مارو تو وہ زندہ ہو جائیگا اور پھر اپنے قاتل کا نام بتائیگا۔اس وقت بعضھا کی ضمیر بقرہ کی طرف راجع ہوگی۔لکھا اصل میں یہ بات غلط ہے چونکہ حکم ذبح اور ذبح کے درمیان چالیس برس کا فاصلہ آ گیا تھا۔تو وہ قتیل اتنی مدت کس طرح پڑا رہ سکتا ہے۔انتھی بلفظہ

کیا یہ تفسیر درست ہے اور اگر نہیں تو اس مفسر کا کیا حکم ہے۔

(۴) صفحہ ۴۳ پر آیۃ الکرسی کی تفسیر کے بعد لکھا۔ اور طاغوت کا معنیٰ کلما عبد من دون اللہ فھو الطاغوت معنیٰ کے بموجب طاغوت جن اور ملائکہ اور رسولوں کو بولنا جائز ہوگا۔

پھر صفحہ ۲۳۳ پر لکھا کہ عبادت کے لائق ایک اللہ تعالیٰ ہے اور رسولوں کا کمال عذاب الٰہی سے نجات پالینا ہے انتہیٰ بلفظہ۔

کیا یہ مرسلین کی توہین و تنقیص نہیں ہے۔ اور کیا عام صالح امتی عذاب الٰہی سے نجات نہ پائینگے

(۵) صفحہ ۱۵۷ پر سورۂ ھود کی تفسیر میں لکھا: کل فی کتاب مبین۔ یہ علیحدہ جملہ ہے ماقبل کے ساتھ متعلق نہیں تا کہ یہ لازم آئے کہ اولاً تمام باتیں کتاب میں لکھی ہوئی ہیں جب کہ اہل سنت وجماعت کا مذہب ہے بلکہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تمہارے تمام اعمال لکھ رہے ہیں فرشتے۔

پھر اس کے بعد معتزلہ کا مذہب بیان کر کے لکھا: اور اللہ کو پہلے اس سے کوئی علم نہیں کہ کیا کریں گے بلکہ اللہ کو ان کے کرنے کے بعد معلوم ہوگا۔ اور آیات قرآنیہ جیسا کہ ولیعلم الذین وغیرہ بھی اور احادیث کے الفاظ بھی اس مذہب پر منطبق ہیں انتہیٰ بلفظہ۔

کیا یہ علم باری تعالیٰ کی تنقیص و آیات قرآنیہ واحادیث نبویہ کی تکذیب اور تمام کتب عقائد کی تغلیط نہیں؟۔

(۶) صفحہ ۲۰۵ پر سورۂ کہف میں یاجوج ماجوج کا قصہ بیان کر کے آخر میں لکھا: باقی امور یاجوج کی پوری تفصیل آگے ذکر کی جائیگی اور معلوم ہوتا ہے کہ کافر اور انگریز مراد ہیں۔ انتھیٰ بلفظہ۔

کیا یہ مرازؤں کی موافقت اور یاجوج ماجوج کے متعلق وارد روایات کے خلاف نہیں ہے۔

(۷) صفحہ ۲۶۶ سورۂ احزاب میں لکھا

ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی سے لیکر اثماً مبینا تک اول تو مؤمنوں کو کہا گیا کہ تم آفریں آفریں کرو۔ جس طرح اللہ تعالیٰ اور ملائکہ آفریں کر رہے ہیں کہ یا رسول تو نے اپنے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی ہے یہ معنیٰ مثنوی والا نے کئے ہیں انتھیٰ بلفظہ

کیا آیت مذکورہ کی یہ تفسیر درست ہے۔

(۸) صفحہ ۲۶۷ سورۂ احزاب میں لکھا: اے مومنو! اگر نکاح کرو مومنات کے ساتھ خواہ متبنی کی عورت ہو یا نہ ہو اور قبل الدخول طلاق دو تو اس عورت پر عدت لازم نہ ہوگی جیسا کہ زینب کو طلاق قبل

الدخول دی گئی اور رسول اللہ نے اس کو بلا عدت نکاح کر لیا انتھیٰ بلفظہ

کیا یہ احناف اہل سنت کی کھلی ہوئی مخالفت نہیں اور حضور پر غلط الزام نہیں لگایا گیا؟۔

جواب طلب امر یہ ہے کہ اس مصنف کے شاگرد مولوی اور معتقدین اس کتاب کی اشاعت کرتے اور اپنی تقریر وتحریر میں ہر طرح اس کا پروپیکندہ کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اہل سنت وجماعت کا صحیح مذہب یہی ہے اور ہم لوگ حنفی سنی ہیں تو کیا حقیقتاً ایسے نظریات رکھنے والے لوگ حنفی سنی کہلائے جانے کے مستحق ہیں یا کچھ اور؟۔ بینوا بالدلیل توجروا عند الجلیل والسلام خیر ختام

محمد احمد قادری ۸/۱۰ انائٹ روڈ لاسلگرتی راولپنڈی ۲۳ اپریل ۱۹۵۷ء

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

الحمد للہ وکفیٰ والصلوۃ علی من اصطفیٰ وعلی آلہ وصحبہ وعلی من اجتبیٰ

امابعد سوالات کے جوابات سے پہلے چند مقدمات پیش کیئے جاتے ہیں جن کے سمجھ لینے کے بعد جوابات کے سمجھنے میں بہت کچھ آسانی ہو جائے گی۔

مقدمہ اولیٰ: تفسیر باب تفعیل کا مصدر ہے اس کے لغوی معنیٰ بیان کرنے اور کھول دینے کے ہیں اور یہ فسر سے مشتق ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی اتقان فی علوم القرآن میں فرماتے ہیں:

التفسیر من الفسر وھو البیان والکشف " (اتقان المصریٰ صفحہ ۱۸۳)

تفسیر خازن میں ہے: اما التفسیر فاصلہ فی اللغۃ من الفسر وھو کشف ما غطی وھو البیان المعانی المعقولہ فکل مایعرف بہ الشئی ومعناہ فھو تفسیر

تو لغت میں تو تفسیر کے معنیٰ پوشیدہ معانی کا بیان کر دینا ہے تو وہ ہر شئی جس سے معنیٰ کی معرفت حاصل ہو تو وہ لغۃً تفسیری کہلائیگی۔ اور شرعاً تفسیر کے معنیٰ جامع العلوم میں ہے۔

وفی الشرع توضیح معنیٰ کی معنی الآیۃ وشانھا وقصتھا والسبب الذی نزلت فیہ بلفظ یدل علیہ دلالۃ ظاھرۃ التفسیر بیان مرادا لمتکلم۔ (جلد۱ صفحہ ۳۳۰)

جلالین کے حاشیہ جمل میں ہے:

التفسیر تعین معنیٰ اللفظ بواسطۃ نقل من قرآن او سنہ او اثر او بواسطۃ التخریج علی القواعد الادبیۃ (وفیہ ایضا) التفسیر کشھادۃ علی اللہ وقطع بانہ عنی بھذا اللفظ ھذا

المعنیٰ ولا یجوز الا بتوقیف ولذا جزم الحاکم بان تفسیر الصحابی مطلقا فی حکم المرفوع ۔

اشعۃ اللمعات میں ہے: تفسیر آنکہ جزم کند کہ مراد حق ہمیں است ایں معنی جز بنقل از ائمہ اہل تفسیر کہ برسند تا آنحضرت رسالت درست نباشد۔ (اشعہ جلد ۱ صفحہ ۱۶۵)

ان عبارات کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ شریعت میں تفسیر کے یہ معنیٰ ہیں کہ آیات کے معنیٰ کو اور ان کی شان اور قصہ کو اور اس سبب کو جس میں وہ نازل ہوئی اسے الفاظ میں واضح کرنا جو ظاہر طور پر دلالت کریں۔ یا بتوسط قرآن وحدیث واثر کے یا بواسطۂ تخریج بقواعد عربیہ لفظ کے معنیٰ کو متعین کرنے اور مراد متکلم کے بیان کرنے کو تفسیر کہتے ہیں۔ تو تفسیر اللہ تعالیٰ پر شہادت کے مثل ہے اور اس پر یقین کر لینا ہے کہ اللہ نے اس لفظ کے یہی معنیٰ مراد لئے ہیں تو تفسیر بلا توقیف کے جائز ہوئی۔ اور وہ ائمہ تفسیر کی بغیر اور سند کے درست نہیں ہوسکتی بالجملہ تفسیر کے لغوی وشرعی معنیٰ سلف وخلف نے یہ بیان فرمائے ہیں جس میں کسی کو مجال سخن وجائے رفتن باقی نہیں ہے۔

مقدمہ ثانیہ: اتقان میں ہے:

یجوز تفسیره لمن کان جامعا للعلوم التی یحتاج المفسر الیها وهی خمسة عشر علما احدها اللغة الثانی النحو الثالث التصریف الرابع الاشتقاق الخامس المعانی السادس البیان السابع البدیع الثامن علم القرأت التاسع اصول الفقه العاشر اسباب النزول الحادی العشر القصص الثانی عشر الناسخ والمنسوخ الثالث عشر الفقه الرابع عشر الاحادیث الخامس عشر علم الموهبة فهذه العلوم التی هی لازمة للمفسر ولا یکون مفسراً الا بتحصیلها۔ (ملخصاً اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۸۱)

اس عبارت سے ظاہر ہوگیا کہ جب تک ان پندرہ علوم لغت، نحو، صرف، اشتقاق، معانی، بیان، بدیع، علم قرأت، اصول فقہ، جامع اسباب نزول، قصص، ناسخ منسوخ، فقہ، حدیث علوم موہبہ کا تفسیر کرنے والا جامع نہ ہو اس کو تفسیر کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

مقدمہ ثالثہ: جو مفسر ان پندرہ علوم کا جامع بھی ہو جو مقدمہ ثانیہ میں مذکور ہوئے لیکن وہ بدمذہب مخالف سنت ہو تو شرعاً نہ وہ مفسر قرآن ہوسکتا ہے اور نہ اس کی تفسیر قابل اعتماد ہوسکتی ہے کہ شرائط مفسر سے اہم شرط عقیدہ کا صحیح ہونا ہے۔ اتقان میں ہے:

قال الامام ابو طالب الطبری فی اوائل تفسیره القول فی آداب المفسر اعلم ان من شرطه صحة الاعتقاد اولا ولزوم سنة الدین فان من کان مغموصا علیه فی دینه لا یؤتمن علی الدنیا فکیف علی الدین ثم لا یؤتمن فی الدین علی الاخبار عن عالم فکیف یؤتمن فی الاخبار عن اسرار الله تعالیٰ ولانه لا یؤمن ان کان متهما بالالحاد ان یبغی الفتنة ویغر الناس بلیه وخداعه کداب الباطنیة وغلاة الرافضة وان کان متهما بهوی لم یؤمن ان یحمله هواه کلما یوافق بدعته کداب القدریة فان احدهم یصنف الکتاب فی التفسیر ومقصوده منه الایضاح الساکن لیصدهم عن اتباع السلف وطریق الهدیٰ۔

(اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۷۶)

اس عبارت سے ظاہر ہوگیا کہ جو شخص بدعقیدہ ہو اور دین میں مطعون ہو تو جب وہ دین ہی میں معتمد نہیں ہوتا تو عین میں کیسے معتمد ہوگا اور وہ احکام قرآنی واسرار الٰہی میں کس طرح امین ہوسکتا ہے اور اس کی یہ تفسیر لوگوں کو محض دھوکہ دینے اور فتنہ میں مبتلا کرنے اور اتباع سلف سے روکنے کے لئے ہے تو اس سے فرق باطلہ مثلاً رافضی، قادیانی چکڑالوی، دیوبندی، غیر مقلد، مودودی، نیچری کے مفسرین اور ان کی تفسیروں کا حکم ظاہر ہوگیا کہ وہ اپنی بدعقیدگی وگمراہی کی بنا پر شرعاً نہ تو وہ مفسر ہوسکتے ہیں نہ ان کی تفسیرین اہل اسلام کے لئے قابل استناد ولائق اعتماد ہوسکتی ہیں۔

مقدمہ رابعہ: قرآن کریم کی صحیح تفسیر وہ ہے جو قرآن وحدیث واقوال صحابہ وتابعین سے روایۃً ثابت ہو۔ اور بمقتضائے قواعد ادبیہ لغت، نحو، صرف، معانی، بیان، بدیع اور اصول اسلامی کے موافق ہو۔ اور جو تفسیر اپنے ناقص اجتہاد اور اپنی خواہش اور رائے سے ہو تو وہ شرعاً تفسیر قرآن نہیں اسی کو تفسیر بالرائے بھی کہتے ہیں۔

اتقان میں ہے: قال الماتریدی التفسیر القطع علی ان المراد من اللفظ هذا والشهادة علی الله انه عنی باللفظ هذا فان قام دلیل مقطوع به فصحیح والا فتفسیر بالرائے وهو المنهی عنه ۔

اسی میں ہے: لا یجوز تفسیر القرآن بمجرد الرائے والاجتهاد ومن غیر اصل

بلکہ اس تفسیر بالرائے کی ممانعت میں احادیث مروی ہیں۔

حدیث (۱) ترمذی میں ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی کہ رسول اللہ صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:" من قال فی القرآن برأیه فلیتبوأ مقعده من النار "

(مشکوۃ صفحہ ۳۵)

جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کہا تو چاہئے کہ وہ اپنے بیٹھنے کی جگہ دوزخ میں بنائے۔

حدیث (۲) من فسر القرآن برأیه فلیتبوأ مقعده من النار"

(رواہ فی مسند احمد از کنوز جلد ۲ صفحہ ۱۷۵)

جس نے قرآن کی اپنی رائے سے تفسیر کی تو وہ دوزخ میں اپنی جائے نشست بنائے۔

علامہ محی السنۃ علاء الدین علی خازن لباب التاویل فی معانی التنزیل میں اسی حدیث کے تحت میں فرماتے ہیں:

قا ل العلماء المنهي عن القول فی القرآن بالرائے انما ورد فی حق من یتاول القرآن علی مراد نفسه وما هو تابع لهو اه وهذا لا یخلوا ما ان یکون من علم اولا فان کان بمن علم کمن یحتج ببعض آیات القرآن علی تصحیح بدعته وهو یعلم ان افرادا من الآیات غیر ذالکن غرضه ان یلبس علی خصمه بما یقوی حجته علی بدعته کما یستعمله الباطنیة والخوارج وغیر هم من اهل البدع فی المقاصد الفاسدة لیغروا بذلك الناس وان کان القول فی القرآن بغیر علم لکن عن جهل وذلك بان تکون الآیة محتملة لوجوه فیفسرها بغیر ما تحتمله من المعانی والوجوه فهذا ن القسمان مذمومان و کلا هما داخل فی النهی والوعید الوارد فی ذالك۔ (تفسیر خازن مصری جلد ۱، ۶)

یہاں تک کہ اس تفسیر بالرائے کی ممانعت میں ترمذی وابوداؤد میں حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

حدیث (۳) من قال فی القرآن برائیه فاصاب فقد اخطأ۔ (مشکوۃ شریف)

جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کہا اور درست وحق بات اس نے کہی تو بلاشبہ اس نے جب بھی خطا کی۔

اتقان میں اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

من قال فی القرآن قولا یوافق هواه ولم یاخذه عن ائمة السلف واصاب فقد اخطأ لحکمه علی القران بمالا یعرف اصله ولا یقف علی مذاهب اهل الاثر والنقل فیه۔

(اتقان جلد ۲ صفحہ ۸

ان عبارات سے ظاہر ہو گیا کہ ایسی تفسیر بالرائے جو تفاسیر سلف کے خلاف ہو وہ نامقبول اور غیر معتبر ہے اور جس نے ایسی تفسیر بالرائے کی وہ گمراہ بدعتی بلکہ کافر ہے۔

اتقان میں ہے: من عدل عن مذاهب الصحابة والتابعین وتفسیر هم الی ما یخالف ذلك کان مخطیا فی ذالك بل مبتدعا لانهم کانوا اعلم بتفسیره ومعانیه۔

(اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۷۸)

تفسیر حضرت محی الدین بن العربی میں ہے " من فسر برأیه فقد کفر"

ملا علی قاری کے شرح فقہ اکبر میں یہ حدیث مذکور ہے " من فسر القرآن برائیه فقد کفر"

(شرح فقہ اکبر صفحہ ۱۵۴)

یعنی جس نے قرآن کی تفسیر بالرائے کی تو وہ کافر ہو گیا۔

تو اب تفسیر بالرائے کرنے والے کا حکم حدیث شریف سے ثابت ہو گیا کہ وہ کافر ومرتد ہے۔ ان مقدمات کے سمجھ لینے کے بعد سوالات کے جوابات خود ہی سمجھ میں آ جانے چاہئیں۔ لیکن مزید اطمینان کے لئے ہر سوال کا جواب تفصیلی طور پر بھی لکھ دیا جاتا ہے۔

جواب سوال اول: قرآن کریم کی آیۃ فأتو بسورة من مثله کی تفسیر میں جو مفسرین سلف وخلف نے فرمایا کہ قرآن کریم اپنی فصاحت وبلاغت میں معجزہ ہے اور اس کا فصیح وبلیغ ہونا ہی ہمارے نبی کی نبوت کی روشن دلیل اور زبردست حجت ہے۔

تفسیر بیضاوی میں ہے: الحجة علی نبوة محمد صلی الله تعالیٰ علیه وسلم هو القرآن المعجز بفصاحته التی بذت فصاحة کل منطق وافحامه من طولب بمعارضته من مصاقع الخطباء من العرباء مع کثرتهم وافراطهم فی المضادة والمعارضة وتهالکهم علی المعزة والمعارة وعرف ما یتعرف به اعجازه ویتقین انه من عند الله کما یدعیه۔

اور تحدی یہ حقیقۃ قرآن کا فصاحت وبلاغت میں بلاغت ہونا ہی ہے۔

تفسیر مدارک میں ہے: فیه دلیلان علی اثبات النبوة صحة کون المتحدی به معجزا والا خبار بانهم لن یفعلوا وهو غیب لا یعلمه الا الله۔

تو اس آیۃ کریمہ کی تفسیر تو یہی ہے جو ان مفسرین کرام نے تحریر فرمائی۔ اور اسی پر ہمیشہ سے اہل

اسلام کا اعتقاد رہا اور آج تک ہے۔

اب باقی رہا اس نام نہاد مفسر کا ان سب کے خلاف یہ کہنا ''لیکن خیال کرنا چاہیے کہ کفار کو عاجز کرنا کوئی فصاحت سے نہ تھا الخ'' خود نص قرآنی کے خلاف ہے کہ آیت میں (مثلہ) فرمایا گیا یعنی اسکا سورت لاؤ جو فصاحت وبلاغت میں حسن وترتیب میں سورۂ قرآن کے مثل ہو۔ پھر اگر اس میں فصاحت وبلاغت ہی کا اعتبار نہ کیا جائے تو اس مفسر کے نزدیک ''مثلہ'' کا کلمہ ہی بیکار اور زائد قرار پاتا ہے اور کلام الٰہی میں یہ بات ممکن نہیں۔ پھر جب بقول اس کے کفار کا عاجز کرنا فصاحت کی بنا پر نہ تھا تو اگلی آیۃ میں ''لن تفعلوا'' کا ہمیشہ کے لئے دعوی کون سے عجز کی بنا پر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دعوی فصاحت وبلاغت میں مثل قرآن کے عاجز ہو جانے کی بنا ہی پر تو ہے تو اس جری مفسر نے قرآن کریم کا بھی مقابلہ کیا بلکہ اللہ عزوجل کی مخالفت بھی کی۔ اور جب یہ عجز دلیل نبوت اور سبب ظہور معجزہ بھی تھا تو یہ گمراہ مفسر نہ فقط فصاحت قرآن کا منکر بلکہ دلیل نبوت اور سبب ظہور معجزہ کا بھی منکر قرار پایا۔ لہذا جمہور مفسرین کی مخالفت کا یہ نتیجہ نکل آیا کہ وہ اپنا دین بھی کھو بیٹھا۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

جواب سوال دوم: ۔آیۂ کریمہ وادخلو الباب سجدا میں باب کے متعلق چند اقوال منقول ہیں۔ اور ایک چیز میں مفسرین کے چند اقوال خصوصاً قصص میں اکثر اختلاف روایات کی بنا پر ہوتے ہیں کی قصہ میں رائے واجتہاد کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ سماعت پر موقوف ہوتا ہے۔

چنانچہ اتقان میں ہے: الثالث علوم علمها الله نبيه مما اودع كتابه من المعانى الجلية والخفية وامره بتعليمها وهذا ينقسم الى قسمين منه لا يجوز الكلام فيه الا بطريق السمع وهو اسباب النزول والناسخ والمنسوخ والقرأت واللغات وقصص الامم الماضية واخبار ما هو كائن من الحوادث وامورا الحشر والمعاد ومنه ما يوخذ بطريق النظر والاستدلال والاستنباط والاستخراج من الالفاظ الخ ۔

(اتقان جلد۲ صفحہ۱۸۳)

تو جو بات سماعت بالروایت سے ثابت ہے اس کو اس نام نہاد مفسر کا کذب کہنا گویا اس روایت کو کذب قرار دینا ہے اور ثابت بالروایت کی تکذیب کرنے والے کے گمراہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لہذا یہ گمراہ مفسر حضرات مفسرین کرام کو کاذب کہہ کر خود کاذب وگمراہ قرار پایا بلکہ روایات کا منکر اور سلف وخلف کا مخالف ٹھہرا۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

جواب سوال سوم: مفسرین کرام نے فقلنا اضربوه ببعضها کی تفسیر میں جو قصہ تفصیلی تحریر فرمایا ہے وہ درست اور صحیح ہے اور اس کو روایات سے اخذ کیا گیا ہے۔ اور اجمالی قصہ تو خود قرآن میں بھی موجود ہے جس کا مطلقاً انکار کوئی مسلمان تو کر ہی نہیں سکتا۔ اور یہ نام نہاد مفسر اسکا انکار محض اپنی ناقص رائے سے کرتا ہے۔ اور یہ کہتا ہے کہ وہ قتیل چالیس برس کی مدت تک کس طرح رہ سکتا ہے تو یہ مفسر نہ فقط روایت ہی کا انکار کرتا ہے بلکہ خود منصوص فی القرآن کا بھی انکار کر رہا ہے۔ نیز جب اس کے نزدیک چالیس سال کے فاصلہ کے بعد مردہ کا زندہ ہونا قابل انکار ہے تو وہ سو برس کے پڑے رہنے کے بعد مردے کے زندہ ہو جانے پر کس طرح ایمان لائیگا۔ لہذا اس گمراہ مفسر کے نزدیک حضرت عزیر علیہ السلام اور ان کے گدھے کا سو برس کے بعد زندہ ہونا بدرجہ اولیٰ غلط ہوگا۔ اور حضرت مسیح علیہ السلام کا صدہا برس پڑے رہنے کے بعد مردوں کا زندہ کرنا بالکل ہی غلط قرار پائیگا باوجودیکہ ایسے احیاء موتی کے واقعات قرآن کریم میں موجود ہیں۔ تو یہ مفسر بلاشبہ گمراہ وبیدین ہوا کہ ثابت الروایت بلکہ منصوص فی القرآن کو وہ کس دلیری وجرأت سے غلط کہتا ہے اور محض اپنی رائے سے ان کی تغلیط کرتا ہے العیاذ باللہ تعالیٰ

جواب سوال چہارم: ۔مفسرین نے طاغوت کے معنی كل عبد من دون الله بیان کر کے شیطان وبت مراد لئے ہیں۔

تفسیر جلالین میں ہے: فمن يكفر بالطاغوت الشيطان اوالاصنام

تفسیر مدارک التنزیل میں ہے: فمن يكفر بالطاغوت بالشيطان اوالاالصنام

حضرات ملائکہ کرام ومرسلین عظام پر تو کسی طرح لفظ طاغوت کا اطلاق جائز نہیں ہو سکتا کہ آیۃ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے "فمن يكفر بالطاغوت ويومن بالله فقد استمسك بالعروة الوثقى

یعنی تو جو شیطان کو نہ مانے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے بڑی محکم گرہ تھامی۔

تو اس آیۃ کریمہ میں کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ میں صفت تقابل ہے اور کفر بالطاغوت ایمان باللہ پر مقدم ہے۔ اور دوسری آیت میں یہ فرمایا گیا:

يا ايها الذين آمنو آمنو بالله ورسوله والكتاب الذى نزل على رسوله والكتب الذى انزل من قبل ط ومن يكفر بالله وملكته وكتبه ورسله واليوم الآخر فقد ضل ضلالا بعيدا۔

(سورۃ النساء ع ۲۰)

یعنی اے ایمان والو ایمان رکھو اللہ اور اس کے رسول پر اور اس کی کتاب جو اپنے ان رسولوں پر

اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جو اللہ اور اس کے فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں اور قیامت کے ساتھ کفر کرے تو وہ دور کی گمراہی میں ضرور پڑا۔

اس آیت کریمہ سے یہ ثابت ہوا کہ ایمان بالملٰئکۃ والرسل ایمان باللہ ہی میں داخل ہے تو وہ کفر بالطاغوت پر مقدم قرار پایا اور اس کا مقابل ٹھہرا۔ اب ٹھنڈے دل سے فیصلہ کیجئے کہ اگر بقول اس گمراہ مفسر کے لفظ طاغوت ملائکہ اور رسولوں کو بھی شامل ہوتا تو نہ ایمان بالملٰئکۃ والرسل ایمان باللہ ہی میں داخل ہوتا نہ کفر بالملٰئکۃ والرسل کفر باللہ قرار پاتا بلکہ ایمان بالملائکہ والرسل کفر باللہ کے ساتھ جمع ہوتا اور کفر بالملائکہ والرسل ایمان باللہ کے ساتھ پایا جاتا جیسا کہ کفر بالطاغوت ایمان باللہ کے ساتھ آیۂ اولیٰ میں جمع ہے بلکہ ایمان باللہ کا مقابل کفر بالملائکہ والرسل ہوتا۔ اور ایمان باللہ پر کفر بالملائکہ والرسل مقدم ہوتا۔ تو اس صورت میں کس قدر ایمانیات وعقائد اسلام وآیات قرآن سے انکار لازم آتا ہے علاوہ بریں حضرات ملائکہ کرام ومرسلین عظام کو طاغوت میں داخل کر کے ان کا شیاطین واصنام کے ساتھ ذکر سخت بے ادبی وگستاخی ہے اور ملائکہ ورسل کی تنقیص شان کو مستلزم ہے اور رسولوں میں صرف اس قدر کمال ماننا کہ وہ عذاب الٰہی سے نجات پالیتے ہیں ان کے علو مراتب اور فضائل خاصہ سے صاف انکار ہے۔ لہٰذا اس گمراہ مفسر نے مرسلین کی نہ صرف ایک توہین وتنقیص شان کی بلکہ چند توہینیں اور تنقیصیں کیں تو یہ مفسر شان ملائکہ ومرسلین کا سخت گستاخ وبے ادب ثابت ہوا۔

جواب سوال پنجم:۔ کتاب مبین کو تمام باتوں کا جامع نہ ماننا قرآن کریم کی تکذیب ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ولا حبة فی ظلمت الارض ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین

یعنی کوئی دانہ نہیں زمیں کی اندھیریوں میں اور نہ کوئی تر اور خشک جو ایک کتاب مبین میں لکھا ہو۔

اس آیت کریمہ سے صاف ظاہر ہے کہ ہر تر اور خشک کتاب مبین میں لکھا ہوا ہے تو اس مفسر نے اس طرح کثیر آیات کا انکار کیا۔ اور اس سے زیادہ بدتر اس کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اعمال ان کے کرنے سے پہلے کا کوئی علم نہیں کہ لوگ کیا عمل کریں گے بلکہ اللہ کو ان کے کرنے کے بعد معلوم ہوگا۔ لہٰذا اس بیدین مفسر نے اپنے اس قول میں علم الٰہی کی صریح توہین وتنقیص کی اور کثیر آیات واحادیث سے صاف انکار کیا۔ اور کتب عقائد کی تکذیب کی تو اس مفسر کے کافر وبیدین ہونے میں کیا شبہ باقی رہا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

جواب سوال ششم:۔ یاجوج ماجوج سے کافر اور انگریز مراد لینا بھی تفسیر بالرائے ہے اور اس

مفسر سے بلا شک ان تمام آیات واحادیث کی تکذیب اور انکار لازم آتا ہے جن میں ان کے نام اور پھر ان کے احوال وارد ہیں اس سے اس مفسر کی دلیری وجرأت کا پتہ چلا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

جواب سوال ہفتم:۔ آیۂ کریمہ ان الله و ملئكته يصلون على النبى الآية کی جو تفسیر اس نام نہاد مفسر نے لکھی یہ بھی تفسیر بالرائے ہے میری نظر سے کسی تفسیر میں نہیں گذرا تو اس تفسیر کے نادرست ہونے کے لئے اس قدر بات کافی ہے کہ یہ تفسیر بالرائے معلوم ہوتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

جواب سوال ہشتم:۔ سورۂ احزاب میں یہ فرمایا گیا:

يا ايها الذين آمنوا اذا نكحتم المؤمنٰت ثم طلقتموهن من قبل ان تمسوهن فما لكم عليهن من عدة تعتدونها

یعنی ایمان والو جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو پھر انہیں بے ہاتھ لگائے چھوڑ دو تو تمہارے لئے ان پر کچھ عدت نہیں جسے گنو اس آیۂ کریمہ سے یہ معلوم ہوا کہ عورت کو اگر قبل قربت یا خلوت صحیحہ کے طلاق دی تو اس پر عدت واجب نہیں۔ لیکن اس مفسر کا کس بے ادبی سے یہ کہنا بلکہ یہ اقرار کرنا کہ زینب کو طلاق بالدخول دی گئی۔ اولاً اس نے حضرت ام المؤمنین زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نام گرامی کس گستاخی کے ساتھ لکھا کہ تعظیم کا کوئی کلمہ اول وآخر کہیں نہیں لکھا ثانیاً یہ صریح کذب ہے کہ ان کو طلاق قبل دخول دی گئی کتب سیر میں ہے کہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت زینب سے نکاح ہجرت سے اٹھ سال قبل کیا تھا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حضرت زینب سے نکاح ہجرت کے پانچ یا چار یا تین سال بعد کیا ہے۔ تفسیر جمل میں ہے:

و كان تزوج زيد بزينب قبل الهجرة بنحو ثمان سنين

اور مواہب لدنیہ اور زرقانی میں ہے:

و كان تزوجها له صلى الله عليه و سلم فى سنة خمس من الهجرة و قيل سنة اربع وقيل سنة ثلث۔

تو اس بنا پر حضرت زینب حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ۱۱ یا ۱۲ یا ۱۳ سال کی مدت تک رہیں۔ چنانچہ مواہب میں ہے "فمكثت عنده مدة ثم طلقها" یعنی حضرت زینب حضرت زید کے پاس ایک مدت تک رہیں پھر حضرت زید نے انہیں طلاق دی تو کیا اس دراز مدت تک ان میں زن وشوہر

کے تعلقات نہ رہے اور دخول یا خلوۃ صحیحہ کی نوبت ہی نہیں آئی ۔ یہ کس قدر بعید از عقل بات کہی حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ ان کے مابین ایسی نوبت آئی اور بار و بار آئی ۔ چنانچہ تفسیر خازن وجمل وغیرہ تحت آیہ کریمہ فلما قضی زیدمنھا و طرا کے تحت میں فرماتے ہیں:

و طلقھا و انقضت عدتھا و ذکر قضاء الوطر یعلم ان زوجۃ المتبنی تحل بعد دخول بھا۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہوگیا کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق بعد دخول دی گئی اب ملاحظہ ہو کہ یہ مفسر کیا سخت کاذب اور افترپرداز اور بہتان طراز ثابت ہوا۔

ثالثا: اس مفسر کا یہ قول (اور رسول صلعم نے آپ کو بلا عدت نکاح کرلیا) کیا صریح افترا اور بہتان اور کتنا جیتا جھوٹ ہے بلکہ تمام مفسرین واصحاب سیر کی تصریحات کے خلاف ہے واقعہ یہی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب سے عدت گذر جانے کے بعد عقد کیا ہے تو اس بیدین مفسر نے احکام دینیہ کی کیسی کھل کر مخالفت کی ۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا ناپاک الزام اور صریح افترا اور بہتان لگایا۔ اور بموجب حدیث شریف " من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعدہ من النار " کے وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنایا۔

بالجملہ یہ گمراہ مفسر ہرگز ہرگز نہ سنی ہے نہ حنفی بلکہ مذہب اہل سنت سے خارج اور سخت گمراہ وضال ومضل ہے ۔ اور اس کی یہ تفسیر سخت گمراہ اور مخالف عقائد واحکام اسلام ہے ۔ اور سلف وخلف مفسرین کے خلاف تفسیر بالرائے ہے ۔ تو اس کی اشاعت کرنا اور اس کے متعلق پروپیگنڈہ کرنا یقیناً گمراہی اور بددینی کی اشاعت کرنا ہے ۔ اور عقائد واحکام اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا ہے ۔ اہل اسلام ایسی غلط و باطل تفسیر کو ہرگز ہرگز نہ دیکھیں ۔ اور اس کے مطالعہ سے انتہائی اجتناب و پرہیز کریں ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۸ شوال المکرم ۱۳۷۶ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۰۹)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

بعض روایات میں ہے کہ رزق ، عمر ، موت ، حیات وغیرہ شعبان کی پندرہویں شب میں امور ملائکہ کو اللہ تعالیٰ تقسیم کرتا ہے اور مغرب کے بعد سے رحمت الٰہی بندوں کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور

بعض روایات میں ہے کہ رمضان شریف کی ستائیسویں تاریخ کی رات ہے دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان دونوں تاریخوں میں کونسی تاریخ ہے کہ جس میں سال بھر کا حساب ملا کر سونپ دیا جاتا ہے۔

﴿ انا انزلناہ فی لیلۃ القدر ﴾ کی تفسیر میں لیلۃ القدر اس لئے نام رکھا گیا کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ امور رزاق احکام کی تقدیر ملائکہ پر ظاہر کر دیتا ہے اور احادیث میں بھی اس شب کو رمضان المبارک میں آخری عشرہ میں بیان کیا ہے۔

اور پچیسویں پارے سورۂ دخان میں ﴿حم الکتاب المبین انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ ﴾ کی تفسیر میں بھی کہا ہے کہ ھی لیلۃ النصف من شعبان ۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ کی حدیث آگے بیان کی ہے رحمت باری آسمان دنیا پر نازل ہوتی ہے اور ندا کرتی ہے بندوں کو نیز قرآن کریم کے نازل کرنے کو فرمایا ہے کہ اس رات میں جملہ واحدۃ آسمان دنیا پر نازل کر دیا گیا پھر ضرورت کے مطابق حضور پر اترتا رہا (لیلۃ المبارک اور لیلۃ القدر کو ایک ہی کہا گیا ہے نیز اس شب میں جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عبادت مروی ہے وہ بھی تحریر کی جائے جیسا کہ بعض روایات میں ہے ۔ دس بھی ہیں دو نفل بھی ہیں سو نفل بھی ہیں ۔ بینوا توجروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

سورہ دخان کی آیۃ کریمہ ﴿ حم والکتاب المبین انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ ﴾ میں لیلۂ مبارکہ کی تفسیر میں مختلف اقوال وارد ہیں بعض کے نزدیک اس سے مراد شب برائت ہے لیکن جمہور مفسرین کے نزدیک اس سے مراد لیلۃ القدر ہے۔

تفسیر مدارک میں ہے ﴿ لیلۃ مبارکۃ ﴾ ای لیلۃ القدر او لیلۃ النصف من شعبان والجمہور علی الاول "

تفسیر جمل میں ہے " اختلف فی قولہ تعالیٰ فی لیلۃ مبارکۃ فقال قتادۃ وابن زید واکثر المفسرین وھی لیلۃ القدر وقال عکرمۃ وطائفۃ انھا لیلۃ البرأۃ وھی لیلۃ النصف من شعبان۔

تفسیر صاوی میں ہے:

" ان انزلناه فی لیلة مبارکة " هی لیلة القدر هذا قول قتادة وابن زید واکثر المفسرین ثم قال بعد ادلة هذا القول)هذا ادلة ظاهرة واضحة علی انها لیلة القدر وهو المعتمد "

ان تفاسیر سے یہ ثابت ہوگیا کہ وہ قول معتمد جس پر جمہور مفسرین ہیں وہ یہی ہے کہ لیلۃ مبارکہ سے مراد لیلۃ القدر ہے پھر جب اس کا لیلۃ القدر ہونا ثابت ہوگیا تو پھر رزق، عمر، موت، حیات سال بھر کے حساب کا ملائکہ کو سونپ دینا اس شب کے لئے بھی ثابت ہوگیا۔

چنانچہ تفسیر خازن میں ہے "قال ابن عباس یکتب من ام الکتاب فی لیلة القدر ما هو کائن فی السنة من الخیر والشر والارزاق والآجال حتی الحجاج '

'نیز بعض روایات سے ان امور کا شب برأت میں سونپنا بھی ثابت ہے چنانچہ ما ثبت من السنۃ میں ہے "قال عکرمة فی لیلة نصف من شعبان یبرم امر السنة وینسخ الاحیاء ویکتب الحاج فلا یزاد فیهم احد ولا ینقص منهم احدا "

تو سلف وخلف نے ان مختلف روایات میں اس طرح تطبیق کردی ہے کہ ان امور کے سونپنے کی ابتدا تو شب برأت سے کردی جاتی ہے اور اس سے فراغت لیلۃ القدر میں حاصل ہوجاتی ہے۔

چنانچہ ما ثبت من السنۃ میں ہے " اکثر اهل العلم الیٰ ان ذالك یکون فی لیلة القدر والابتداء فیه یکون من لیلة النصف من شعبان "

تفسیر جمل میں ہے " وقیل یبدأ فی استنساخ ذالك من اللوح المحفوظ فی لیلة البرأة ویقع الفراغ فی لیلة القدر ۔

بالجملہ ان امور کا سونپنا ان دونوں شبوں کے لئے ثابت ہوگیا اگرچہ یہ امر متحقق ہے کہ شب قدر شب برأت سے افضل ہے۔شب برأت میں نوافل کی تعداد میں مختلف احادیث وارد ہیں بعض میں چودہ رکعات ہیں بعض میں ایک سو رکعات ہیں پھر محدثین نے خود ان روایات میں کلام کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۱۰)

هل یجوز للصبیان ان تهدی ثواب قرأة القرآن للمیت وان یو مر وابه ا م لا ۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

قرآة القرآن للصبی حسنة اذلا ذنوب علیه حتی تکفر بها فیثاب علی الحسنات ولا جل ذلك صرح فی الفتاوی السراجیة والخانیة اذا فعل الصغیر شیئا من الحسنات تکون له واهداؤه للمیت ثواب قرآة القرآن ایضا حسنة له اذ هو فعل الصحابة کما اخرج الخلال فی الجامع عن الشعبی قال کانت الانصار اذا مات لهم المیت اختلفوا الی قبره یقرؤن له القرآن ووقع علیه اجماع المسلمین کما نقله العلامة السیوطی فی شرح الصدور ان المسلمین مازالوا فی کل عصر یجتمعون ویقرؤن لموتاهم من غیر نکیر فکان ذلك اجماعا بل ورد فی الحدیث ان هدیة الاحیاء الی الاموات الاستغفار لهم ورواه البیهقی فی شعب الایمان والدیلمی عن ابن عباس وروی الطبرانی فی الاوسط و البیهقی فی السنن عن ابی هریرة قال: قال رسول الله تعالیٰ صلی الله تعالیٰ علیه وسلم ان الله لیرفع الدرجة للعبد الصالح فی الجنة فیقول یارب انی لی هذه فیقول باستغفار ولدك لك ولفظ البیهقی بدعاء ولدك لك فظهر لك ان اهداء الصبی ثواب القراءة والدعاء والاستغفار للمیت حسن له وثابت من عمل الصحابة و الاجماع والاحادیث ونافعة للاموات علی ان فی هذه لا ضرر علیه بل له منفعة عظیمة لحدیث مروی فی الفتاوی الخانیة حسناته تکون لابویه لما روی عن انس بن مالك انه قال من جملة ما ینتفع به المرء بعد موته ان یترك ولدا علمه القرآن والعلم فیکون لوالده اجر ذالك من غیر ان ینقص من اجر الولد شیء واخرج ابو محمد السمرقندی فی فضائل قل هوالله احد عن علی مرفوعا من مر علی المقابر وقرأ قل هوالله احد احدی عشرة مرة ثم وهب اجره للاموات اعطی من الاجر بعدد الاموات وایضا ان الصبی یومر باهداء ثواب القرأة للمیت لانه حسنة له ویومر الصبی للحسنات کما فی رد المحتار انه یومر بجمیع المامورات وینهی عن جمیع المنهیات

فهذا غاية التحقيق فی هذه المسئلة :والله تعالیٰ اعلم بالصواب ؛

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۱۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

اگر زید بکر سے کہے کہ ایک قرآن شریف پڑھ کر میرے باپ کی روح کو اس کا ثواب بخش دیجئے میں آپ کی کچھ خدمت کروں گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ زید نے بکر سے کہا کہ آپ ایک قرآن شریف پڑھ کر میرے والد کی روح کو اس کا ثواب بخش دیجئے اور فلاں روز ان کا چہلم ہے اور فاتحہ میں بھی شریک ہو جایئے جب فاتحہ کے بعد بکر اپنے مکان کو آنے لگا تو زید نے معافی وغیرہ مانگی جیسا کہ عام رواج ہے اور مصافحہ کرتے ہوئے بکر کو دس بارہ یا پانچ چھ روپیہ دیے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ زید نے بکر سے کہا میرے والد کا انتقال ہو گیا ہے ان کے لئے ایک قرآن پڑھ کر ثواب بخش دیجئے۔ بکر نے قرآن شریف پڑھ کر مردہ کی روح کو اس کا ثواب بخش دیا۔ اس کے بعد بکر زید کو ملا تو پوچھا کیوں صاحب آپ نے قرآن ختم کر لیا یا ابھی نہیں؟ بکر نے کہا جی ہاں فلاں روز ختم ہو گیا ہے تو زید نے شیرینی دی کہ اسے بچوں میں تقسیم کر دینا اور چھ روپیہ دیے کہ یہ آپ کے لئے ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے ان تمام صورتوں میں بکر کو کچھ لینا جائز ہے یا ناجائز۔ بینوا توجروا۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

ان تینوں صورتوں میں اگر زید بغرض اجرت دے رہا ہے اور بکر بھی بخیال اجرت لے رہا ہے تو ایسی اجرت ناجائز ہے نہ میت کو اس تلاوت کا ثواب پہنچے۔

ردالمحتار میں ہے:

لا يصح الاستيجار على القرأة واهدائها الى الميت لا نه لم ينقل عن احدمن الائمة الا ذن فی ذلك وقد قال العلماء ان القاری اذا قرأ لا جل المال فلا ثواب له فای شئ يهديه الى الميت وانما يصل الى الميت العمل الصالح والا ستيجار على مجرد التلاوة لم

يقل به احد من الائمة ۔ (ردالمحتار ص ۳۷ ج ۵)

قرأت پر اجرت لینا اور اسکا ثواب میت کیطرف ہدیہ کرنا صحیح نہیں کیونکہ اس کی اجازت ائمہ میں سے کسی سے منقول نہیں اور علماء نے فرمایا کہ جب قاری مال کیلئے پڑھے تو اسے ثواب نہیں ہوتا پھر وہ کس چیز کا میت کیلئے ہدیہ کرتا ہے اور میت کو تو عمل صالح پہنچتا ہے اور صرف تلاوت پر اجرت کو ائمہ میں سے کوئی بھی نہیں کہتا۔

اور اگر زید بکر میں نہ اجرت طے ہوئی نہ اس پر کچھ گفتگو ہوئی لیکن وہاں کے عرف ورواج میں دینے والا اسی نیت سے دیتا ہے اور پڑھنے والا اسی نیت سے پڑھتا ہے اور ختم قرآن کریم پر لینے دینے کا دستور ہے تو اسکا بھی یہ حکم ہے کہ یہ ناجائز ہے۔ فقہاء کرام کا مشہور قاعدہ ہے۔ المعروف کا لمشروط (ردالمحتار ص ۳۶ ج ۵)

ہاں اگر پڑھنے والا بہ نیت ثواب پڑھے اور دینے والا بلا لحاظ اجرت مشروطہ ومعروفہ کے محض صدقہ کی نیت سے دے تو اس کے جواز میں کوئی شک نہیں نہ لینے والے کیلئے کوئی قباحت نہ دینے والے کے لئے کوئی قباحت اور میت کیلئے باعث اجر وثواب ہے۔

درمختار میں ہے: ولا يكره الدفن ليلا ولا اجلا س القارئين عند القبر وهو المختار۔ (شامی ص ۶۳۳ ج ۱)

شب میں دفن کرنا اور قبر کے نزدیک قاریوں کا بٹھانا مکروہ نہیں۔ یہی قول مختار ہے۔

لہذا بکر کو اس آخر صورت میں لینا جائز ہے اور پہلی ہر دو صورتوں میں ناجائز ہے، واللہ تعالے اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۱۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

دفن کے بعد قبر میت پر کسی عالم یا حافظ سے تین یا چار دن یا جمعرات یا جمعہ تک قرآن شریف کا پڑھوانا جائز ہے یا نہیں؟۔ بعض عالم دن معین کرنا جائز نہیں سمجھتے اور بعض تین یا چار دن یا جمعرات یا جمعہ تک تلاوت کلام پاک کرنا حرام کہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ کسی کتاب میں نہیں ہے اس کا جواب مع

دلائل شرعیہ کے تحریر فرمائیں۔

المستفتی رحیم الدین نعیمی ساکن بڑاگنہ پوسٹ جلدی ضلع چاٹگام۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بعد دفن قبر پر قرآن کا پڑھنا یا پڑھوانا بلاشک جائز ہے بلکہ سنت صحابہ ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی اپنی کتاب شرح الصدور بشرح حال الموتے والقبور میں اس کے لئے باب تحریر فرماتے ہیں:

اخرج الخلال فی الجامع عن الشعبی قال کانت الانصار اذا مات لهم المیت اختلفوا الی قبره یقرؤن له القرآن ۔ (شرح الصدور مصری ص ۱۳۰)

خلال نے اپنی جامع میں شعبی سے روایت کی کہ امام شعبی نے فرمایا کہ انصار میں جب کوئی مرجاتا تو اس کی قبر کی طرف جاتے تھے اور اس کے لئے قرآن شریف پڑھتے تھے۔

فقہ کی مشہور کتاب درمختار میں ہے:

لا یکره الدفن لیلا ولا اجلاس القارئین عند القبر وهو المختار۔ (شامی مصری ص ۶۳۳ ج ۱)

نہ شب میں دفن کرنا مکروہ ہے نہ قاریون کا قبر کے پاس بٹھانا مکروہ یہی قول مختار ہے۔ یعنی مفتی بہ ہے۔

غنیۃ شرح منیہ میں ہے: واختلف فی اجلاس القارئین لیقرؤا عند القبر والمختار عدم الکراهة۔ (غنیۃ مطبوعہ لکھنؤ ص ۵۶۴)

قبر کے پاس قاریوں کے پڑھنے کیلئے بٹھانے میں اختلاف ہوا تو قول مختار اور مفتی بہ مکروہ نہ ہونا ہے۔

فتاوے عالمگیری میں ہے:

وقرأة القرآن عند القبور عند محمد رحمه الله لا یکره ومشائخنا رحمهم الله اخذوا بقوله وهل ینتفع والمختار انه ینتفع هكذا فی المضمرات ۔ (عالمگیری ص ۸۵ ج ۱)

امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک قبر کے پاس قرآن شریف پڑھنا مکروہ نہیں جانا اور ہمارے فقہا

علیہ الرحمہ نے اسی قول کو اختیار کیا اور کہا تلاوت سے میت کو نفع پہنچتا ہے تو قول مختار یہ ہے کہ نفع پہنچتا ہے ایسا ہی مضمرات میں ہے۔

نورالایضاح متن مراقی الفلاح میں ہے:

ولا یکره الجلوس للقرأة علی القبر فی المختار۔ (نورالایضاح ص ۶۶)

مختار مذہب میں قبر پر قرآن پڑھنے کیلئے بٹھانا مکروہ نہیں۔

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے" واخذ من ذالك جواز القرأة علی القبر وقال محمد تستحب لورود الآثار وهو المذهب المختار ملخصا۔ (طحطاوی ص ۳۶۳)

حدیث سے قبر پر قرآن پڑھنے کا جواز حاصل ہوا۔ امام محمد علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ آثار وارد ہونے کی وجہ سے مستحب ہے اور یہی مذہب مختار ہے۔

بدرالمنتقی شرح الملتقی میں ہے:

اختلف فی اجلاس القارئین عند القبر والمختار عدم الکراهة۔ (بدرالمنتقی مصری ص ۱۸۸ ج ۱)

قبر کے پاس قرآن پڑھنے والوں کے بٹھانے میں اختلاف ہوا تو قول مختار یہ ہے کہ یہ مکروہ نہیں

فتاوے قاضی خاں میں ہے:

وان قرأة القرآن عند القبور ان نوی بذلك ان یونسهم صوت القرآن فانه یقرأ فان لم یقصد ذلك فاالله تعالی یسمع قراة القرآن حیث کانت ۔ (قاضی خاں ص ۷۲۶ ج ۴)

اگر قبر کے پاس قرآن شریف پڑھا اور نیت یہ کی کہ قرآن کی آواز سے مردہ کو انس حاصل ہوگا تو وہ قرآن شریف پڑھے اور اگر یہ قصد نہیں تو اللہ تعالی جہاں کہیں قرآن پڑھا جاتا ہے سنتا ہے۔

شرح الصدور میں ہے "وان ختموا القرآن علی القبر کان افضل۔ (شرح الصدور ص ۱۳۰)

اگر لوگ قبر پر قرآن شریف ختم کریں تو افضل ہے۔

فتاوی برہنہ میں ہے۔ ص ۳۶۳ ج ۱:

در کنز گفتہ کہ مستحب است تصدق بروے تا ہفت روز واگر نماز یا روزہ یا عتاق یا عبادتے دیگر کند تا

ثواب او بمیت رسد رواست۔

کنز میں کہا ہے کہ مردہ کے لئے سات دن تک صدقہ کرنا مستحب ہے اور اگر نماز روزہ غلام آزاد کرنا یا کوئی عبادت کرے اور اسکا ثواب مردہ کو پہچائے تو جائز ہے۔

ان عبارات سے واضح ہوگیا کہ مذہب مفتی بہ اور قول مختار کی بنا پر قبر میت پر قرآن شریف پڑھنا جائز و مستحب ہے بلکہ سنت صحابہ اور حدیث شریف سے ثابت ہے اور تلاوت کلام اللہ سے میت کو نفع پہنچتا ہے اور انس حاصل ہوتا ہے اور ایک قرآن شریف کا ختم ہونا افضل ہے اور ایک ہفتہ تک صدقات وعبادات کا ثواب پہنچانا مستحب ہے۔

یہ وہ دلائل ہیں جن کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اب باقی رہے یہ تعینات سوم ہفتم دہم بستم چہلم وغیرہ تو یہ تعینات شرعی نہیں بلکہ وقتی مصلحتوں کی بنا پر ہیں جنکے عدم جواز پر کوئی دلیل شرعی نہیں ہے۔ اس قسم کے تعینات ہر زمانہ میں ہوئے اور اب بھی موجود ہیں۔

جیسے اوقات نماز پنجگانہ کے تعینات۔ اذان کے اوقات معینہ۔ تنخواہ امام وموذن کا تعین۔ درس قرآن کا تعین۔ درس حدیث کا تعین۔ درس نظامی کا تعین۔ نصاب درجات کے تعین۔ ہر درجہ کے استاذ کا تعین۔ تنخواہ مدرسین کے تعینات۔ تعلیم مدرسہ کے لئے دن کا تعین۔ ہر کتاب کے وقت کا تعین۔ ہر مدرس کیلئے کتابوں کا تعین۔ ایام تعطیل کا تعین۔ دستار بندی کے لئے ماہ شعبان کا تعین۔ تعلیمی سال کے ابتدا اور انتہا کا تعین۔ وعظ کیوقت کا تعین۔ اوراد ووظائف کے تعینات۔ اعمال کے تعینات۔ عقیقہ ونکاح کیلئے تعین۔ کھانے ودعوت کا تعین۔ اور اس کے علاوہ بکثرت تعینات نہ فقط عامۃ المسلمین میں بلکہ علماء وفضلا ومشائخ وصلحا میں جاری وساری ہیں۔ تو کیا ان تعینات کو معترضین نے کسی معتبر ومستند کتاب میں دیکھا ہے اور کسی شرعی دلیل سے ثابت پایا ہے۔ اگر یہ تعینات ثابت ہیں فتوی پیش کرو۔ ورنہ ان تعینات کیوجہ سے اس سب امور خیر کو بدعت وناجائز ٹھہراؤ۔ اور عاملان تعینات کو گمراہ وبیدین قرار دو۔ تعجب ہے کہ جو خود تعینات کے پابند ہوں انہیں کیا حق حاصل ہے کہ سب کے ایصال ثواب کے تعینات پر زبان اعتراض کھول سکیں اور لوگوں کو امور خیر کے ایصال ثواب سے روکیں۔ بالجملہ مندرجہ فی السول کے تعینات نہ شرعا ممنوع وناجائز نہ ان کے عدم جواز پر کوئی دلیل شرعی قائم۔ لہذا ان تعینات کی وجہ سے قبر پر تلاوت قرآن کریم ناجائز نہیں ہوسکتی۔ مولے تعالے منکرین کو قبول حق کی توفیق عطا فرمائے واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ : الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۱۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

عمر کہتا ہے کہ قرآن شریف ہر شئی کا بیان ہے اور اس آیت سے ثابت ہے۔" وکذلك تبیانا لکل شئی " اس سے حضور کا عالم الغیب ہونا ثابت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حضور کائنات کے ذرہ ذرہ کے عالم ہیں کوئی دانہ زمین کی خشکی اور تری میں ایسا نہیں جو قرآن کریم مین بیان نہ ہو" ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین" اس آیت سے ثابت ہوا کہ حضور کے احاطہ علم سے کوئی چیز باہر نہیں۔ اور زید کہتا ہے کہ قرآن شریف ہر شئی کا بیان نہیں ہے بہت سی باتیں دنیا کی تو درکنار سب دین کی باتیں بھی نہیں ہیں۔ جیسے نماز کی رکعات اور سجدہ سہو واجب ہونے کی صورتیں، زکوۃ کا سونے چاندی کا نصاب، بکری گائے بھینس اونٹ کی تعداد، پھر انکی مقدار زکوۃ، روزہ کیسے ٹوٹ جاتا ہے، احرام باندھنا وغیرہ۔ ہزاروں وہ مسائل ہیں جو احادیث میں ملتے ہیں قرآن شریف میں ان کا کہیں پتہ بھی نہیں ہے۔

آگے چل کر وہ احکام مستنبطہ ائمہ مجتہدین نے نکالے ہیں۔ جیسے حضرت ابوبکر کا خلیفہ اول ہونا، اور پھر حضرت عمر کا ولی عہد ہونا، اور حضرت عثمان کا شہید ہونا، اور حضرت علی کا شہید ہونا، انبیاء کی تعداد، فرشتوں کی تعداد، اصحاب نبی کی تعداد، ستاروں کی تعداد، اور ہزاروں ایسے واقعات ہیں جن کا قرآن شریف میں سراغ نہیں ملتا۔ زید اپنے مضمون کو ان آیات سے ثابت کرتا ہے۔

" واوتیت من کل شئی " (سورۃ نمل رکوع ا)

بلقیس کے لئے ثابت کرتا ہے اور کہتا ہے دینی امور کا تعلق علم نبوت سے ہوتا ہے۔

(سورۃ اعراف رکوع ۱۷) "وکتبن له فی الالواح من کل شئی مو عظة تفصیلا لك لشئی۔

(سورۃ انعام ع ۱۹) ثم آتینامو سی الکتاب تماما علی الذی احق لکل تفصیلا لکل شئی وهد ی ورحمة ''

ان آیات مذکورہ سے ثابت کرتا ہے کہ قرآن شریف میں ہر شئی کا بیان نہیں تو حضور بھی ہر شئی کے عالم نہیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان دونوں میں کون حق پر ہے۔ بغیر توبہ کے دینی تعلیم حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟۔ اس کا جواب براہ کرم قرآن وحدیث سے اور فقہ سے ہونا چاہئے۔ بینوا توجروا۔ المستفتی عبد الحفیظ سرائے ترین سنبھل ضلع مراد آباد رمضان المبارک ۷۱ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بلا شک قرآن کریم ہر شئی کا بیان ہے اور علوم کا جامع اور غیوب پر مشتمل ہے۔
شیخ الاسلام علامہ ابراہیم باجوری شرح قصیدہ بردہ شریف میں تحریر فرماتے ہیں:

لھا (ای آیات القرآن) معان کموج البحر فی الکثرۃ التی لا غایۃ لھا (فیہ ایضا) انھا لا تعد ولا تحصی وما فیھا العجیبۃ لعدم تناھیھا (فیہ ایضا) حکی عن بعضھم من انہ قال لکل آیۃ ستون الف فھم وما بقی من فھمھا اکثر (وفیہ ایضا) اقل ما قیل فی العلوم التی فی القرآن من ظواھر المجموعۃ فیہ اربعۃ وعشرون الف علم وثمان مأۃ علم"

(شرح بردہ مصری ص۵۲)

آیات قرآنی کے معانی کثرت میں سمندر کی موج کی طرح ہیں جن کی کوئی انتہا نہیں (اسی میں ہے) بیشک آیات کے عجیب معنی انگنت اور بے شمار ہیں کیونکہ وہ غیر متناہی ہیں (اسی میں ہے) بعض علماء سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ہر آیت کے لئے ساٹھ ہزار فہم ہیں اور جو فہم باقی ہے وہ بہت زیادہ ہیں (اسی میں ہے) بلحاظ ظاہری معنی کے علوم قرآن میں کم سے کم یہ قول ہے کہ ان کا مجموعہ آٹھ سو چوبیس ہزار علم ہیں۔

علامہ علی قاری شرح شفا میں فرماتے ہیں:

اشتمالہ (القرآن) علی اخبار الاولین وآثار الآخرین وتضمنہ الامور الغیبیہ الواقعۃ سابقا ولا حقا فھو معجزۃ۔

(شرح شفا مصری ص۵۳۴ ج۱)

قرآن کا اولین وآخرین کی خبروں پر مشتمل ہونا اور ان امور غیبیہ پر شامل ہونا جو پہلے گزر چکے اور آئندہ واقع ہونے والے ہیں یہی تو معجزہ ہے۔

علامہ قسطلانی مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں: "السادس ان وجہ اعجازہ ھو کونہ جامعا للعلوم الکثیرۃ لم تتکلم العرب فیھا الکلام ولا یحیط بھا من علماء الامم واحد منھم ولا یشتمل علیھا کتاب بین اللہ فیہ خبر الاولین والآخرین وحکم المتخلفین وثواب المطیعین وعقاب العاصین"

(مواہب لدنیہ ص۳۵۳ ج۱)

چھٹی وجہ اعجاز قرآن کی وہ علوم کثیرہ کا جامع ہونا ہے جس میں نہ تو عرب نے تکلم کیا نہ پہلی امتوں کے علماء سے کسی نے اس کا احاطہ کیا نہ اس پر کوئی کتاب مشتمل ہے۔ اس میں اللہ تعالی نے اولین وآخرین کی خبریں اور متخلفین کے حکم اور نیکوں کا ثواب اور بدوں کا عذاب بیان فرمایا۔

علامہ قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں اور علامہ زرقانی نے اس کی شرح میں فرمایا:

الخامس ان وجہ اعجازہ ھو ما فیہ من علم الغیب وھو شامل لما سبق مما لم یدرکہ ھو ولا اھل عصرہ اما یقع بعد ذلک مما لا یعلمہ الا اللہ۔

(زرقانی مصری ص۹۸ ج۵)

پانچویں بات وجہ اعجاز قرآن کی یہ ہے کہ اس میں علم غیب کا بیان ہے کہ قرآن غیب کے ان امور کو شامل ہے جو پہلے گزر چکے جنہیں نہ حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے پایا نہ آپ کے اہل زمانہ نے اور جو بعد کو واقع ہوں گے جنہیں اللہ تعالی ہی جانتا ہے۔

بخیال اختصار اس وقت صرف اسی قدر تصریحات علمائے کرام پر اکتفا کیا گیا مگر ان سے بھی یہ ظاہر ہو گیا کہ معانی قرآن سمندر کی موج کی طرح ہیں جن کی انتہا نہیں اور وہ معانی غیر متناہی ہیں جن کی نہ گنتی نہ شمار اور ہر آیت کے لئے ساٹھ ہزار فہم ہیں اور علوم قرآن باعتبار معنی کے چوبیس ہزار آٹھ سو علوم ہیں اور قرآن کریم اولین وآخرین کی خبریں دیتا ہے اور امور غیبیہ ماضیہ ومستقبلہ پر مشتمل ہے اور قرآن جامع العلوم ہے اور یہ خود حدیث شریف سے بھی ثابت ہے جس کی دیلمی نے روایت کی کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا: "من اراد علم الاولین والآخرین فلیتدبر القرآن

(کنوز الحقائق فی احادیث خیر الخلائق ص۱۶۴)

جو اولین وآخرین کے علم کا ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ وہ قرآن میں غور کرے۔ اس حدیث شریف سے نہایت واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ قرآن کریم میں اولین وآخرین کے علوم ہیں۔ پھر یہی مضمون کثیر آیات سے ثابت ہے۔

اللہ تعالی فرماتا ہے: (۱) "ما فرطنا فی الکتاب من شئی" (سورۃ انعام ع۴)
ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھا نہ رکھا۔

(۲) "وتفصیل الکتاب لا ریب فیہ من رب العالمین" (سورۃ یونس ع۴)
اور لوح میں جو کچھ لکھا ہے سب کی تفصیل ہے اس میں کچھ شک نہیں پروردگار عالم کی طرف سے

(۳)"ولکن تصدیق الذی بین یدیہ وتفصیل کل شئی "(سورۃ یوسف ع ۱۲)

لیکن اپنے سے اگلے کلاموں کی تصدیق ہے اور ہر چیز کا مفصل بیان ہے۔

(۴)"ونزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شئی "(سورۃ نحل ع ۱۲)

اور ہم نے تم پر قرآن اتارا کہ ہر چیز کا روشن بیان ہے۔

(۵)"وکل شئی فصلنہ تفصیلا " (سورۃ اسراء ع ۲)

اور ہم نے ہر چیز خوب جدا جدا ظاہر فرمادی۔

علامہ محی السنہ ناصر الشریعہ علاء الدین بغدادی تفسیر خازن میں آیت نمبر تین (۳) کے تحت فرماتے ہیں: "وتفصیل کل شئی "یعنی ان ھذا القرآن المنزل علیک یا محمد تفصیل کل شئی تحتاج الیہ من الحرام والحلال والحدود والاحکام والقصص والمواعظ والامثال وغیرہ ذلک مما یحتاج الیہ العباد فی امر دینھم ودنیاھم "

(تفسیر خازن مصری ص ۲۶۴ ج ۳)

اور ہر چیز کا مفصل بیان یعنی یہ قرآن جو اے اللہ کے رسول آپ پر نازل ہوا ہر اس چیز کا مفصل بیان ہے جس کی طرف آپ کو احتیاج ہے حلال وحرام۔ حدود واحکام۔ قصص اور نصیحتوں اور مثالوں سے اور ان کے علاوہ ان امور سے جن کی طرف بندے اپنے دین ودنیا کے کام میں محتاج ہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی تفسیر جلالین میں آیت نمبر پانچ (۵) کے تحت فرماتے ہیں:

"(وکل شئی)یحتاج الیہ(فصلنہ تفصیلا بینہ تبیینا "

اور ہر چیز کی طرف احتیاج ہے ہم نے اس کو خوب مفصل بیان کردیا۔

علامہ جمل اس کے حاشیہ الفتوحات الالہیہ میں فرماتے ہیں: " یحتاج الیہ ای فی الدین والدنیا قولہ بینہ تبیینا بلا التباس فھو کقولہ ما فرطنا فی الکتاب من شئی وقولہ ونزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شئی "

(جمل مصری ص ۶۱۸ ج ۲)

یعنی دین ودنیا میں جس کی طرف احتیاج ہے ہم نے اسے بلا اشتباہ خوب بیان کردیا تو یہ اللہ تعالی کے اس کلام کی طرح ہے کہ ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھا نہ رکھا اور اللہ تعالی کے اس فرمان کے مانند ہے کہ ہم نے تم پر یہ کلام اتارا کہ ہر چیز کا روشن بیان ہے۔

عارف باللہ شیخ احمد تفسیر صاوی میں آیت (۵) کے تحت فرماتے ہیں: " (تفصیلا) مصدر مو

کد لعاملہ اشارۃ الی ان اللہ لم یترک شئی من امور الدین والدنیا الا بینہ نظیرہ قولہ تعالی ما فرطنا فی الکتاب من شئی "

(صاوی مصری ص ۲۹۱ ج ۲)

تفصیلا مصدر اپنے عامل کی تاکید ہے اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بیشک اللہ تعالی نے امور دین ودنیا سے کوئی چیز نہیں چھوڑی مگر اس کو اپنے حبیب سے بیان فرمادیا۔ یہ نظیر ہے اللہ کے اس کلام کی کہ ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھا نہ رکھا۔

"الطبقات الکبری میں ہے: کہ عارف باللہ حضرت ابراہیم دسوقی آیت نمبر (۱) کی تفسیر میں فرماتے ہیں:" لو فتح الحق تعالی من قلوبکم اقفال السدد لاطلعتم علی ما فی القرآن من العجائب والحکم والمعانی والعلوم واستغنیتم عن النظر فی سواہ فان فیہ جمیع ما رقم فی صفحات الوجود ۔قال تعالی: ما فرطنا فی الکتاب من شئی "

(طبقات کبری مصری ص ۱۴۹ ج ۱)

اگر حق تعالی تمہارے دلوں کے موانع کے قفل کھول دے تو تم قرآن کے عجائب اور حکمتوں اور معانی وعلوم پر مطلع ہوجاؤ اور اس کے غیر میں نظر کرنے سے مستغنی ہوجاؤ۔ بیشک قرآن میں صفحات وجود پر جو کچھ ہے مرقوم ہے کہ اللہ تعالی نے فرمایا ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھا نہ رکھا۔ بخیال اختصار تفاصیل عبارات اور زیادہ پیش نہیں کیں کہ منصف کے لئے تو اسی قدر بہت کافی اور معاند کے لئے دفتر ناکافی۔ بالجملہ ان آیات وتفاسیر اور حدیث شریف اور تصریحات کتب سے نہایت روشن طور پر ثابت ہو گیا کہ قرآن کریم ہر شئی کا روشن بیان ہے، اور علوم کا جامع اور غیب کی خبروں پر مشتمل ہے، اور علوم اولین وآخرین کو حاوی ہے اور ہمارے نبی صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کو ان کے رب تبارک وتعالی نے علوم قرآن تعلیم فرمائے۔

قرآن کریم میں ہے۔" الرحمن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان "

(سورۃ رحمن ع ۱)

رحمن نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا انسانیت کی جان محمد کو پیدا کیا" ما کان وما یکون کا بیان انہیں سکھایا۔

تو اب کائنات کا ذرہ ذرہ حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے احاطہ علمی سے باہر نہیں کہ آپ عالم قرآن کریم ہیں۔ تو قول عمرو تو حدیث قرآن کے مطابق ثابت ہوا۔ اب باقی رہا قول زید اور اس کا

استدلال وہ سراسر غلط اور باطل ہے اور وہ یہ کہ قرآن ہر شئی کا بیان نہیں ہے کہہ کر ان تمام تصریحات علماء وآیات وحدیث کی مخالفت اور انکار کرتا ہے اور قرآن کریم اور نبی رحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سخت توہین کرتا ہے اور اپنا منکر قرآن اور عدو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہونے کا اظہار کرتا ہے۔ اب باقی رہا زید کا استدلال کہ قرآن میں نماز وزکوۃ وغیرہ کے مسائل اور دین کی بہت سی باتیں نہیں ہیں۔ تو آج یہ نیا اعتراض نہیں ہے۔ ہمارے علمائے کرام اس کا پہلے جواب دے چکے ہیں۔ چنانچہ ہماری پیش کردہ آیت نمبر (۴) ونزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شئی'' کی تفسیر میں حضرت عارف باللہ شیخ احمد تفسیر صاوی میں اس سوال کو نقل کر کے جواب دیتے ہیں۔

ان قلت انا نجد کثیر امن احکام الشریعة لم یعلم من القرآن تفصیلا کعدد رکعة الصلاة ونصاب الزکوة وغیر ذلك فکیف یقو ل الله تبیانا لکل شئی ۔ اجیب با ن البیان اما فی ذا ت الکتاب او با حالته علی السنة قال تعالی وما اتکم الرسول فخذوه وما نهکم عنه فانتهوا اوباحا لته علی الاجما ع قال تعالی ومن یشا قق الرسول من بعدما تبین له الهدیٰ ویتبع غیر سبیل المو منین الآیة او علی القیا س قا ل تعالی فا عتبروا یا اولی الابصار والاعتبا ر النظر والاستدلا ل اللذان یحصل بهم القیا س فهذه اربعة طرق لا یخرج شئی من احکام شریعة عنها فکلها مذکو رة فی القرآن فکا ن تبیانا لکل شئی بهذا الا عتبار"

(تفسیر صاوی مصری ص۲۷۲ ج۲)

اگر تو یہ اعتراض کرے کہ ہم احکام شریعت بہت سے پاتے ہیں جن کی تفصیل قرآن سے نہیں معلوم ہوتی جیسے نماز کی رکعتوں کی تعداد اور زکوۃ کا نصاب اور اس کے سوا اور مسائل تو اللہ تعالیٰ نے اسے کیسے فرمایا کہ وہ ہر شئی کا بیان ہے پس اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ بیشک اس کا بیان ہونا یا تو خود قرآن ہی میں ہے۔ یا سنت پر حوالہ کرنے میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: تمہیں جو رسول دیں اس کو لو اور جس چیز سے منع فرمائیں باز رہو۔ یا اجماع پر حوالہ کرنے میں ہے کہ اللہ فرماتا ہے کہ ''جس نے رسول کی مخالفت کی ہدایت کے ظاہر ہونے کے بعد اور مسلمانوں کی راہ کے سوا اتباع کی آخر آیت تک''۔ یا قیاس پر کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''پس عبرت حاصل کرو اے عقل والو:: اور اعتبار سے مراد وہ نظر و استدلال ہیں جن سے قیاس حاصل ہو۔ تو یہ چار طریقے ہیں جن سے احکام شریعت کا کوئی مسئلہ خارج نہیں ہوسکتا۔ پس یہ کل قرآن ہی میں مذکور ہے تو اس اعتبار سے قرآن ہر شئی کا بیان ہوگیا۔

علامہ جمل ''الفتوحات الالٰہیہ'' میں اسی آیت کی تفسیر میں یہ سوال وجواب اس طرح تحریر فرماتے ہیں جس کے الفاظ تو مختلف ہیں لیکن مضمون واحد ہے۔ تو ان ہر دو تفاسیر سے ثابت ہوگیا کہ زید کا یہ استدلال نیا نرالا نہیں ہے بلکہ منکرین کا پرانا اعتراض ہے جس کا بارہا جواب دیا جاچکا ہے۔

پھر زید کا آیت " واو تیت من کل شئی " سے استدلال کرنا بھی غلط ہے۔

تفسیر جلالین میں اس آیت کریمہ کے متعلق فرمایا " واوتیت من کل شئی " یحتا ج الیه الملو ك من الآلة والعدة " اور بلقیس کو وہ ہر شئی جس کی طرف بادشاہ آلات اور اسباب وسامان کے محتاج ہوتے ہیں عطا کی۔

علامہ جمل ''الفتوحات الالٰہیہ'' میں اسی آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں: (من کل شئی) عام ارید به الخصوص کما اشار له بقوله تحتا ج الملو ك من الآلة والعدة "

(جمل مصری ص۳۰۹ ج۳)

کلمہ ''کل شئی'' کا عام ہے اور اس سے خاص مراد ہے جس کی طرف مفسر نے اشارہ کردیا کہ وہ بادشاہوں کا آلات واسباب کی طرف محتاج ہونا ہے۔

علامہ خازن تفسیر خازن میں اسی آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں:" یعنی ما تحتاج الیه الملوك من الما ل والعدة "

(تفسیر خازن مصری ص ۱۱۸ ج۵)

یعنی وہ چیزیں جن کی طرف بادشاہ مال واسباب سے محتاج ہوتے ہیں۔

ان تفاسیر سے ثابت ہوگیا کہ آیت کریمہ میں ''کل شئی'' اپنے عموم پر نہیں ہے بلکہ وہ خاص چیزیں مراد ہیں جن کی طرف بادشاہوں کو احتیاج ہوا کرتی ہے۔ اور آیت میں بلقیس کا ذکر ہے تو اس آیت سے قرآن کے ہر شئی کے بیان نہ ہونے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نفی علم پر استدلال کرنا تحریف قرآن کریم ہے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عداوت کی دلیل ہے اور قرآن کریم اور اللہ تعالیٰ پر افتراء ہے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

اسی طرح زید کا آیت ''وکتبن له فی الالواح من کل شئی موعظة وتفصیلا لکل شئی اور آیت "ثم اتینا موسی الکتاب تما ما علی الذی احسن تفصیلا لکل شئی" سے استدلال کرنا بھی غلط ہے کہ ان ہر دو آیات میں توریت شریف کا بیان ہے جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ تو ان آیات میں " تفصیلا لکل شئی "اپنے عموم پر نہیں ہے

چنانچہ تفسیر خازن میں آیت اولی کے تحت ہے۔ (وتفصیلا لکل شئی) یعنی تبیانا لکل شئی من الامر والنہی والحلال والحرم والحدود والاحکام مما یحتاج الیہ فی امور الدین"۔ (خازن ص ۲۳۶ ج ۲)

یعنی ہر شئی کا بیان کرنا امر، نہی، حلال، حرام، حدود، اور احکام سے وہ جن کی طرف امور دین میں احتیاج ہوتی ہے۔

اسی تفسیر خازن میں آیت ثانیہ کے تحت ہے" وتفصیل لکل شئی "یعنی وفیہ بیان لکل شئی یحتاج الیہ من شرائع الدین واحکامہ" (خازن ۱۲۶ ج ۲)

یعنی اس میں ہر اس شئی کا بیان ہے جس کی طرف احکام دین میں محتاج ہیں۔

تفسیر جلالین میں آیت اولی کے تحت ہے "یحتاج الیہ فی الدین" اس پر جمل فرماتے ہیں: محتاج الیہ فی الدین ای دینہم" (جمل مصری ص ۱۸۹ ج ۲)

جس کی طرف بنی اسرائیل کے دین میں احتیاج تھی۔

اسی طرح آیت ثانیہ کے تحت تفسیر جلالین میں ہے" یحتاج الیہ فی الدین"

ان تفاسیر سے ثابت ہوگیا کہ توریت شریف دین بنی اسرائیل کے احکام کی تفصیلی کتاب ہے۔

اب زید کا ان ہردو آیات کو قرآن شریف کی ہر شئی کے بیان کے خلاف اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نفی علم پر استدلال کرنا تحریف آیات قرآنی ہے اور اللہ تعالی پر افتراء ہے۔ بالجملہ ان ہر سہ آیات سے نہ قرآن کریم کے ہر شئی کے بیان کرنے کی نفی ثابت ہوئی نہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہر شئی کے عالم ہونے کا انکار ظاہر ہوا۔ تو زید کا استدلال غلط و باطل قرار پایا۔ زید کی پیش کردہ پہلی آیت میں بلقیس کا ذکر تھا تو یہ واقعہ ہے کہ بلقیس کو جہان کی ہر شئی نہیں دی گئی تھی۔ اور اس کی پیش کردہ پچھلی ہردو آیات میں سیدنا موسی علیہ السلام کا تذکرہ ہے تو ہمارا حضرت موسی علیہ السلام کے لئے یہ دعوی نہیں ہے کہ انہیں بھی کائنات کے ذرے ذرے کا علم دیا گیا ہے بلکہ ہمارا یہ دعوی تو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے ہے کہ وہ کائنات کے ذرے ذرے کے عالم ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم توریت شریف سے افضل ہے۔ اسی بناء پر دیکھو کہ " تفصیلا لکل شئی" کی تفسیر توریت شریف کے لئے صرف امور دین کے ساتھ خاص کی۔ اور قرآن کریم کیلئے اس کو اپنے عموم پر برقرار رکھا کہ امور دین و دنیا ہر دو مراد لئے۔ زید کی یہ بے ایمانی ہے کہ اس نے ان آیات کی صحیح مراد چھوڑ کر اپنے دل سے غلط مراد گڑھ کر اپنے غلط عقیدہ کی تائید کرنے کی

ناپاک سعی کی ہے، تو زید پر اس جرات کی بنا پر توبہ لازم اور بغیر توبہ کے اس سے دینی تعلیم حاصل کرنا جائز نہیں کہ وہ اس میں اپنا باطل عقیدہ سکھائے گا۔ اور قول عمر بالکل صحیح اور حق ہے۔ فقط واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۱۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین کثرھم اللہ تعالیٰ مسطورہ ذیل مسائل میں کہ

(۱) ہمارے محلہ کی مسجد میں ہر سال شبینہ ہوا کرتا ہے اور اس طرح پر کہ پانچ یا چھ حفاظ تراویح میں ایک ہی شب میں پورا قرآن مجید ختم کرتے ہیں لیکن ابھی دو چار رکعتیں باقی رہ جاتی ہیں کہ صبح صادق طلوع کر آتی ہے اور نماز وتر وغیرہ صبح صادق ہی کے وقت پڑھی جاتی ہے۔ بہت سے مقتدی ایک ہی رکعت میں چند بار اٹھتے بیٹھتے رہتے ہیں۔ بعض لوگ چھوڑ کر بھاگ جاتے اور بعض دوسری میں بیٹھ کر پہلی میں کھڑے ہو کر ادا کرتے ہیں۔ کیا ایسا شبینہ جائز ہے؟۔

(۲) اگر نفل نماز کی جماعت سے شبینہ پڑھا جائے تو اس کا شرعا کیا حکم ہے؟۔

(۳) کسی طرح کا شبینہ شرعا جائز ہے یا نہیں اگر ہے تو اس کی کیا صورت ہے؟۔

(۴) بعض علمائے کرام کا قول ہے کہ تین روز سے پہلے قرآن مجید کا ختم کرنا مکروہ ہے۔ اگر یہ مسئلہ صحیح ہے تو شبینہ کے جواز کی کیا صورت ہے؟ بینوا توجروا۔

المستفتی محمد قمر الزماں سکریٹری جامع مسجد ٹیٹا گڑھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ایک شب یا ایک دن میں ختم قرآن کریم کر لینا سلف کرام سے ثابت ہے۔ حضرت امام وکیع بن جراح ہر شب میں ایک ختم قرآن کرتے۔

ردالمحتار میں ہے:

وکیع بن الجراح بن ملیح بن عدی الکوفی شیخ الاسلام واحد الائمۃ الاعلام قال یحیٰ بن اکثم کان وکیع یصوم الدھر ویختم القران کل لیلۃ۔

(ردالمحتار مصری ج ۱ ص ۴۲)

خود ہمارے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ رمضان مبارک میں اکسٹھ قرآن کریم ختم فرماتے۔ ایک ہر دن میں اور ایک ہر رات میں اور ایک ختم لوگوں کے ساتھ یہاں تک کہ حضرت امام نے تو صرف دو رکعتوں میں ایک ختم قرآن کریم کیا ہے۔

مراقی الفلاح میں ہے:

عن ابی حنیفۃ رحمہ اللہ انہ کان یختم فی رمضان احد و ستین ختمۃ فی کل یوم ختمۃ و فی کل لیلۃ ختمۃ و فی کل التراویح ختمۃ و صلی بالقران فی الرکعتین۔

(حاشیہ طحطاوی مصری ص ۲۴۱)

تو ایک شب میں ختم قرآن کریم کرنے کا جواز فعل سلف سے ثابت ہوا اور نوافل میں خصوصاً تراویح میں قرآن کریم کا پڑھنا مسنون بھی ہے۔

کبیری میں ہے: و فی النوافل باللیل لہ ان یسرع بعد ان یقرا کما یفھم و ذلک مباح الا یری ان ابا حنیفۃ رحمہ اللہ کان یختم القران فی لیلۃ واحدۃ۔

(کبیری ص ۴۶۳)

ردالمحتار میں ہے: قراءۃ الختم فی صلاۃ التراویح سنۃ۔

(ردالمحتار ج ۱ ص ۴۹۶)

لیکن نوافل میں صرف تنہا پڑھ سکتا ہے کہ نوافل کی جماعت جائز نہیں۔

ردالمحتار میں ہے: النفل بجماعۃ وھو غیر جائز۔

اور تراویح کی جماعت سنت کفایہ ہے۔

نور الایضاح میں ہے: وصلاتھا بالجماعۃ سنۃ کفایۃ۔

تو اب ثابت ہو گیا کہ ایک شب میں ختم قرآن کریم صرف تراویح کی جماعت میں کر لینا بلا شبہ جائز ہے۔ اسی کا نام شبینہ ہے۔ اب اس میں بجائے ایک حافظ کے چند حافظوں کے ختم کر لینے میں کوئی حرج لازم نہیں آتا۔ ہاں موسم گرما کی شبیں چونکہ بہت چھوٹی ہوتی ہیں ان میں صبح صادق سے قبل اگر ختم ہو سکے تو جب صبح صادق قریب ہو جائے تو اس سے پہلے بعجلت باقی رکعات تراویح کو چھوٹی چھوٹی سورتوں سے پوری کریں اور آخر میں وتر پڑھ لیں۔ صبح صادق کے طلوع ہونے کے بعد نہ تراویح پڑھ سکتے ہیں اور

نہ وتر بہ نیت ادا پڑھ سکتے ہیں۔ پھر مقتدی بھی بذوق و شوق اگر سب نہیں تو بعض کھڑے ہو کر اور بعض بیٹھ کر آخر تک شریک جماعت رہیں تو ایسا شبینہ جائز ہے۔ اور جو شبینہ نفل کی جماعت میں ہو اور اس کو صبح صادق کے طلوع ہو جانے کے بعد بھی پڑھتے رہیں اور وتر کو قضا کر دیں، اس میں نہ حفاظ میں صحت عقیدہ کا لحاظ ہو، نہ دینداری کا خیال ہو، نہ صحیح خوانی کی رعایت ہو۔ نہ اس کی تیز رفتاری سے کلمات سمجھ میں آتے ہوں، نہ فہم معنی حاصل ہوتے ہوں۔ اور مقتدیوں میں شوق ہی نہ ہو، ان پر جماعت کی شرکت بار ہو، ایک رکعت میں کبھی اٹھیں کبھی بیٹھیں، کوئی بیٹھ کر باتیں کرے، کوئی لیٹے، کچھ چائے پینے میں مشغول رہیں، کچھ مسجد کے باہر پان کھانے اور حقہ بیڑی پینے میں وقت گذارتے رہیں، اگر کسی کے دل میں آ گیا تو ایک آدھ رکعت میں شامل ہو گیا۔ بعض دور ہی سے رونق دیکھ کر اپنے مکان کو بھاگ جائیں تو ایسے شبینہ کو کون جائز کہہ سکتا ہے۔

اب باقی رہا وہ قول کہ تین روز سے پہلے ختم قرآن کریم مکروہ ہے۔ تو یہ قول میری نظر سے نہیں گذرا۔ ہاں ایک دن میں ختم قرآن کریم کو بعض نے مکروہ کہا ہے۔ تو اس قول کی بناء پر اس صورت میں ہے کہ قاری اس تیز رفتاری سے پڑھے جس میں رعایت ترتیل اور فہم معنی کا لحاظ نہ ہو ورنہ ایک ہی دن میں ختم قرآن کریم کرے اور اس میں رعایت ترتیل اور فہم معنی کو ملحوظ رکھے تو وہ مکروہ نہیں جیسا کہ سلف کرام کا ایک شب میں ختم قرآن کریم کرنا شروع جواب میں منقول ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۹ / ذیقعدہ ۱۳۷۲ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۱۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

زید کہتا ہے کہ بجلی کا گرجنا جو کہ بوقت بارش ہوتا ہے، تو ایک فرشتہ بادلوں کے کوڑا مارتا ہے اور اس کوڑے کی آواز کو گرج کہتے ہیں، آیا یہ کس حد تک درست و صحیح ہے۔ اور بجلی اور گرج کی اصل حقیقت کیا ہے۔ تفصیل وار جواب مرحمت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بعض مفسرین نے گرج کی حقیقت بیان کی ہے جو سوال میں ہے کہ فرشتہ بادلوں کو چلانے کیلئے جب کوڑا مارتا ہے تو یہ آواز اس کوڑے کے مارنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی کو گرج کہتے ہیں۔ جیسا کہ جمل حاشیہ تفسیر جلالین تحت آیۃ کریمہ ویسبح الرعد بحمدہ میں مذکور ہے۔ قیل ھو صوت الآلۃ التی یضرب بھا السحاب ای الصوت الذی یتولد عند الضرب۔ (جمل ج۱ ص۱۹۵)

تو اس قول کی بنا پر قول زید صحیح ثابت ہوا۔ لیکن اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ رعد ایک فرشتہ ہے اور گرج اسکی تسبیح کی آواز ہے۔

تفسیر خازن اسی آیۃ کریمہ کے تحت میں ہے: اکثر المفسرین علی ان الرعد اسم ملک الذی یسوق السحاب والصوت المسموع من تسبیحہ۔ (خازن، ج۴ ص۹)

اور حدیث شریف میں ہے کہ گرج رعد فرشتہ کے بادلوں کی ڈانٹنے کی آواز ہے۔ ترمذی شریف میں ہے۔

اقبلت یھود الی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فقالوا اخبرنا عن الرعد ماھو قال ملک من الملائکۃ مؤکل بالسحاب معہ مخاریق من نار یسوقہ بھا حیث شاء اللہ قالوا فما ھذا الصوت الذی یستمع قال زجر السحاب حتی ینتھی حیث امرت قالوا صدقت۔ (خازن ج۴۔ ص۸)

اور بجلی ایک روشنی ہے جو بادل کے درمیان سے ظاہر ہوتی ہے۔ تفسیر خازن میں ہے۔ البرق ھو لمعان یظھر من خلال السحاب۔ (خازن ج۴۔ ص۸)

اور دوسرا قول یہ ہے کہ بادلوں کے چلانے کے لئے جو کوڑا آگ کا ہے اس کوڑے کی چمک کو بجلی کہتے ہیں۔ البرق لمعان سوطہ آلۃ من یزجرہ بھا السحاب۔ (جمل ج۱ ص۲۳)

اور تیسرا قول یہ ہے کہ جب رعد فرشتہ کا غصہ شدید ہو جاتا ہے تو اس کے منہ سے آگ نکلتی ہے وہی بجلی ہے۔ تفسیر خازن میں ہے: اذا اشتد غضبہ یخرج من فیہ النار فھی البرق (خازن)

یہ مفسرین کے اقوال بجلی اور گرج کی حقیقت کے بیان میں ہیں، جو شارع علیہ السلام سے بروایات ثابت ہیں مسلمان کیلئے ان سے بہتر اور معتبر کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۱۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

سائنسداں سمجھتے ہیں کہ بادل جب گرجتے ہیں جب یہ آپس میں ٹکرا جاتے ہیں تب بادل گرجتا ہے، آیا یہ قول صحیح ہے، یا غلط؟۔ جواب تسلی بخش دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

تفاسیر کی بعض روایات میں یہ بھی وارد ہے کہ جب فرشتہ کا بادلوں پر غصہ شدید ہوتا ہے تو اس کے منہ سے آگ یا نور اڑنے لگتا ہے تو بادل لرزتے ہیں اور گرجتے ہیں۔

حاشیہ جلالین جمل میں ہے: روی ان اذا اشتد غضبہ علی السحاب طارت من فیہ النار فتضطرب اجرام السحاب و ترتعد۔ (جمل ج۱ ص۲۳)

اور یہ ممکن ہے کہ بادلوں میں آپس میں ٹکرا کر بھی گرج کی آواز پیدا ہو جاتی ہو۔ سائنسدانوں کی بات بھی صحیح ہو سکتی ہے۔ لیکن اسی کو صرف گرجنے کا سبب متعین کر لینا یہ اسباب منقولہ عن الشرع سے صاف انکار ہے، اور تحقیق شرعی کے خلاف ہے۔ کہ گرجنے کے وہ وجوہ واسباب بھی ہیں جو جواب سوال اول میں بہ تفصیل منقول ہوئے۔ سائ[illegible] کی زبردست غلطی یہ ہے کہ انکی جو ناقص سمجھ میں آیا اس پر تو جزم ویقین کر لیا اور جو شرعی تحقیقات ہیں، [illegible]س پر جزم ویقین نہیں۔ مولی تعالیٰ ان کو فہم صائب عطا فرمائے اور قبول حق کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

کتاب الجنائز

﴿۳۴﴾

باب الوصیت

مسئلہ (۵۱۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک شخص موت سے قبل وصیت کر گیا کہ میرے انتقال کے بعد میری ملکیت کا ثلث ۱۔۳ حصہ اللہ کے لئے نکالا جائے اور اسی اللہ کے لئے نکالی ہوئی رقم میں سے یا اللہ کے لئے نکلی ہوئی رقم کی یافت کر کے اتنی رقم فلاں کو دینا، مگر مرحومہ کی وصیت کے موافق اب تک ایک ثلث رقم علیحدہ نہیں نکالی گئی اسی طرح اللہ رقم کی کچھ یافت نہیں کی گئی ہے اسی طرح جس شخص کو اللہ کے لئے رقم کی مد میں سے جو رقم مرحومہ کی وصیت کے موافق دینے کی تھی انتقال ہو گیا اس واقعہ کو مدنظر رکھتے ہوئے انتقال شدہ مرحومہ کا حق مرحومہ کے ورثہ کو حاصل کرنے کا حق شرع شریف کے موافق باقی رہتا ہے یا کہ فوت ہو جاتا ہے۔

بینوا توجروا المستفتی سیٹھ غلام حسین حاجی ابراہیم مورخہ ۳ راگست ۱۹۳۸ء

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اگر مرحومہ موصی لہا یعنی جس کے لئے وصیت کی گئی ہے شرعا قابل وصیت تھی اور شخص موصی (یعنی وصیت کرنے والا) کی موت کے بعد مقرر رقم کی وصیت کو بغیر ادا کئے ہوئے فوت ہوگئی تو مرحومہ موصی لہا کے وارث اس مقررہ رقم کے بعد اسی وصیت کی بنا پر حقدار ہیں۔

درمختار میں ہے:

وانما تملك بالقبول الا اذا مات موصيه ثم هو بلاقبول فهو اى المال الموصىٰ به لورثته بلاقبول استحسانا۔ واللہ تعالٰی اعلم بالصواب

کتبہ : الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۱۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین زاداللہ برکاتہم۔

صورت مسئولہ میں ایک شخص مسمی اللہ بخش متوفی جس کے کوئی بیوی بچہ نہیں ہے اپنا حصہ زمینداری ۴ پائی ۷/۱ کرانت دوم جو اتل واقع محال خدابخش پکسر انوان پرگنہ وتحصیل سلون ضلع رائے بریلی بذریعہ دستاویز وقف نامہ رجسٹری شدہ بحق جامع مسجد پکسر انوان مورخہ ۲۷ رفروری ۱۹۴۰ء وقف کیا اور مسمی شیخ مولوی عبدالوہاب ولد خدابخش وعبدالحکیم وعبدالجبار ومحمد علیم پسران عبدالسبحان کو متولی تاحیات وہ اس کے بعد ان کے وارث جائز کو مقرر کیا مسمیان رحیم بخش وعبدالشکور پسران عبداللہ جو چچا زاد بھائی وصاحب اولاد ہیں جن کا خورد ونوش وجملہ کاروبار دو پشت سے علیحدہ ہے رحیم بخش وعبدالشکور سے اور اللہ بخش ہمیشہ ناراض رہا اور نہیں چاہتا تھا کہ چھوڑے چنانچہ پہلے اس نے چند نمبر مزروعہ آراضی اپنے حصہ کی بیع کر ڈالا بقیہ بحق جامع مسجد وقف کیا مسمی اللہ بخش وقف کنندہ بعارضۂ دق عرصے سے بیمار تھا اور دن بدن اس کی حالت خراب ہو رہی تھی یہ وقف ڈیڑھ ماہ قبل انتقال کیا اور اپنا مکان مسکونہ چھوڑ کر مسمی پسران بخش کے مکان میں اٹھایا تھا یہیں عارضہ میں اس کا انتقال ہوا اسے یہ شکایت تھی کہ رحیم بخش وعبدالشکور رات کو گلا دباتے ہیں اللہ بخش کو یہ معلوم ہوا کہ عبدالحکیم وعبدالجبار متولیان نے درخواست داخل خارج دیا ہے اور ان لوگوں نے یہ چالاکی کی ہے کہ متولی ہمیشہ یہی رہیں گے ان کے بعد ان کے وارث متولی ہوں گے لہذا مسمی سراج الدین جو رحیم بخش کا سمدھی ہے اللہ بخش کو کچہری میں لیجا کر عذر داری نسبت اخراج متولی کرائیں لیکن بجائے موقوفی متولیان درخواست منسوخی وقف نامہ لکھوا کر داخل کر دیا اللہ بخش محض ان پڑھ تھا انتقال کے چار روز قبل اللہ بخش نے کل بستی کے اشخاص کو بلا کر جو تقریبا پچاس ساٹھ کے تھے سب کو مخاطب کر کے کہا کہ میں نے اپنی کل جائداد جامع مسجد کے نام وقف کر دی ہے سب بھائی ملکر انتظار کرو اور منشی عبداللہ صاحب ہیڈ ٹیچر اسکول پکسر انوان اور مولوی عبدالوہاب صاحب کو متولی کیا تم لوگ ذمہ دار ہو ہم حشر میں دامن گیر ہوں گے جو اس کے خلاف ہوگا بعد انتقال اللہ بخش رحیم بخش وعبدالشکور عذر دار مقدمہ داخل خارج ہیں کہ ہم لوگ وارث وحقدار ہیں اللہ بخش نے ہماری حق تلفی کی ہے اب دریافت طلب امر یہ ہے از روئے شرع شریف یہ جائداد ملک مسجد کی ہوئی یا رحیم بخش وعبدالشکور کی وارثا ملنی چاہئے۔ امور ذیل قابل لحاظ ہیں۔

(۱) مسمی اللہ بخش عرصہ ڈیڑھ سال سے بعارضہ دق بیمار اس مرض میں اس کا انتقال ہوا اور حالت بیماری ہی میں یہ وقف ڈیڑھ ماہ قبل از انتقال کے۔

(۲) بعد تحریر کے وقف اس کے متولی مولوی عبدالوہاب وعبدالحکیم تھے مسمی اللہ بخش تحریر وقف

نامہ سے لیکر انتقال کے وقت تک مولوی عبدالوہاب ومولوی عبداللہ صاحب کو متولی کہتا رہا۔

(۳) مولوی عبدالوہاب ومنشی عبداللہ کی تولیت کو سب اہل بستی پسند کرتے ہیں ناپسند نہیں کرتے

(۴) نقل مسودہ وقف نامہ بجنسہ لفظ بلفظ ارسال ہے بندہ نواز من بعد سلام اصلاً گذارش یہ ہے کہ بنظر بندہ نوازی جواب جلد عنایت فرمائیں کہ عدالت میں سات ۷ رجون ۱۹۴۰ء کو پیشی مقرر ہے اگر قبل از پیشی جواب آجائے گا تو اس کے مطابق صلح نامہ داخل کر دیا جائے گا۔

المستفتی عبدالوہاب از پکسر انوان ڈاکخانہ پکسر انوان ضلع رائے بریلی

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

اگر یہ واقعہ ہے کہ اللہ بخش نے مرض الموت میں اپنی کل جائداد جامع مسجد موضع پکسر انوان پرگنہ سلون ضلع رائے بریلی کے لئے وقف کی ہے اور اس کے صرف چچا زاد دو بھائی رحیم بخش وعبدالشکور وارث موجود تھے اور انہوں نے اس وقف کو جائز نہیں رکھا تو شرعا ایک تہائی کی قدر کا وقف درست ہے اور باقی دو تہائی کا باطل ہے۔ ان دونوں کی ملک ہے اس لئے کہ مرض الموت کا وقف وصیت کا حکم رکھتا ہے جو تہائی میں نافذ ہوگا۔

ردالمحتار میں ہے: ولاشك ان الوقف في مرض الموت وصية۔
(ردالمحتار ج ۳ ص ۴۲۴)

اور اس بات میں شک نہیں کہ مرض الموت میں وقف کرنا وصیت ہے۔

فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے:

لو وقف في مرض موته قال الطحطاوي هو بمنزلة الوصية بعد الموت والصحيح انه لايلزمه عند ابي حنيفة وعندهما يلزمه الا انه يعتبر من الثلث والوقف في الصحة من جميع المال۔ (ہدایہ اولین ص ۶۱۸)

اگر مرض موت میں وقف کیا تو امام طحطاوی نے فرمایا کہ یہ وقف بمنزلہ وصیت کے ہے بعد موت کے اور صحیح مذہب یہ ہے کہ امام اعظم علیہ الرحمہ کے نزدیک وہ لازم نہیں اور صاحبین کے نزدیک لازم ہے لیکن وہ وقف تہائی میں معتبر ہوگا اور تندرستی کے زمانہ کا وقف پورا مال ہوتا ہے (اور قول صاحبین زیادہ معتمد ہے)

لہذا ایک تہائی جائداد جامع مسجد مذکور کے لئے وقف ثابت ہوئی اور دو تہائی رحیم بخش وعبدالشکور کی بطریق ارث مملوکہ ہوئی۔ اس کی نظیریں کتب فقہ میں بکثرت موجود ہیں چنانچہ علامہ شامی بحرالرائق سے ناقل ہیں۔

والحاصل ان المريض اذا وقف على بعض ورثته ثم على اولادهم ثم على الفقراء فان جاز الوارث الاخر كان الكل وقفا واتبع الشرط والا كان الثلثان ملكا بين الورثة والثلث وقفا۔ (ردالمحتار ج۳ص۴۷۴)

اور حاصل یہ ہے کہ مریض نے جب اپنے بعض وارثوں پر وقف کیا پھر ان کی اولاد پر پھر فقراء پر تو دوسرے وارث نے اس کو جائز رکھا تو کل وقف ہوجائے گا اور شرط کی متابعت ہوگی ورنہ دو تہائی وارثوں کی ملک ہوجائے گا اور ایک تہائی وقف۔

شامی میں بحر وفتاوی ظہیریہ سے ناقل ہیں:

رجل وقف دارا له في مرضه على ثلث بنات له وليس له وارث غيرهن قال الثلث من الدار وقف والثلثان مطلق يصنعن بهما ماشئن قال الفقيه ابو الليث هذا اذا لم يجزن اما اذا اجزن صار الكل وقفا عليهن۔ (ردالمحتار ج۲ص۴۷۴)

ایک شخص نے مرض الموت میں اپنے مکان کو اپنی تین لڑکیوں پر وقف کیا اور لڑکیوں کے علاوہ اس کا کوئی اور وارث نہیں ہے تو فرمایا کہ تہائی مکان وقف ہے اور دو تہائی مطلق تو وہ لڑکیاں اس دو تہائی کا جو چاہیں کریں فقیہ ابو اللیث نے فرمایا کہ یہ جب ہے کہ انہوں نے اس کو جائز رکھا ہو لیکن جب انہوں نے ناجائز رکھا تو کل مکان ان پر وقف ہوجائے گا۔

اور جب تہائی جائداد جامع مسجد مذکور کے لئے وقف ہوچکی تو اب واقف کو اس کے بالقصد باطل ومنسوخ کرانے کا حق حاصل نہیں چہ جائے کہ کسی فریب سے بلا قصد واقف نامہ کی منسوخی عمل میں لائی جائے۔

درمختار میں ہے: فلایجوز له ابطاله ولا یورث عنه وعليه الفتوى۔
(ردالمحتار ج۳ص۲۶۹)

واقف کو وقف کے باطل کرنے کا حق حاصل نہیں اور نہ اس میں ارث جاری ہوسکے اسی قول پر فتوی ہے۔

بالجملہ اللہ بخش کی تہائی جائداد جامع مسجد مذکور کے لئے وقف ہے اس پر احکام وقف جاری ہوں گے یہ تہائی حصہ یا اس کا جز رحیم بخش وعبدالشکور کو ہرگز ہرگز بذریعہ وراثت نہیں مل سکتا اور باقی دو تہائی ان دونوں وارثوں کی ملک ہے انہیں اس پر ہر طرح کا اختیار حاصل ہے۔ اور وقف نامہ کے مقرر شدہ متولیان سے جن کی خیانت اور خود غرضی ظاہر ہوجائے وہ تولیت سے معزول ہوگئے باقی اپنے حال پر متولی رہے اور واقف کو متولی کے معزول کرنے کا حق حاصل ہے اور اگر کسی اور کا نام واقف یا اہل بستی زائد کریں تو وہ متولی ہوجائے گا لیکن یہ سب متولیان شرکت سے کام کریں گے کوئی متولی تنہا اپنی رائے سے تصرف نہیں کرسکتا۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

﴿۳۵﴾

باب صلوۃ الجنائز

مسئلہ (۵۱۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے اپنے آپ کو بطور خودکشی کے مارڈالا تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے یا نہیں؟ اور مسلم شریف کی حدیث میں جو آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایسے شخص کی نماز پڑھنے سے انکار فرمادیا تو یہ آپ کا انکار فرمانا کس بنا پر تھا؟ بینوا توجروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بلاشبہ ایسے شخص کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ چنانچہ درمختار میں ہے "من قتل نفسه ولو عمدا یغسل ویصلی علیه وبه یفتی وان کان اعظم وزرا من قتل غیره" یعنی جس شخص نے اپنے آپ کو عمداً قتل کیا تو اس کو غسل دیا جائے اور اس کی نماز پڑھی جائے اسی پر علماء نے فتوی دیا اگر چہ وہ دوسرے کے قتل کرنے سے زیادہ گناہ ہے۔ اور مسلم شریف کی حدیث کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کیا گیا جس نے خودکشی کی تھی تو آپ نے اس پر نماز پڑھنے سے انکار کردیا۔

اولا: اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ اس پر کسی نے نماز ہی نہ پڑھی ہو۔

ثانیا: ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نماز نہ پڑھنا زجر وتوبیخ کے لئے ہو، جیسے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مقروض پر نماز پڑھنے سے انکار فرمایا تھا۔ تو کیا صرف اتنی وجہ سے مقروض کے جنازہ کی نماز بھی نہ پڑھی جائیگی، بلکہ حقیقتاً حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے افعال بے شمار فوائد پر مبنی ہوتے تھے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۲۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

قبر پر اذان دینا کیسا ہے اور اگر کوئی شخص قبر اذان دینے کو برا سمجھے منع کرے اس کے لئے کیا حکم ہے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

میت کو قبر میں اتارنے کے بعد قبر پر اذان کہنا یقیناً جائز ہے اذان سے میت کے لئے سات فائدے ہیں جو احادیث سے ثابت ہیں۔

(۱) میت اذان کی وجہ سے شیطان کے شر سے محفوظ رہیگا۔

(۲) کلمہ اللہ اکبر کہنے کی وجہ سے میت عذاب نار سے مامون رہے گا۔

(۳) میت کو کلمات اذان سے منکر نکیر کے سوالات کے جوابات یاد آجائینگے۔

(۴) اذان میں ذکر اللہ ہونے کے باعث میت عذاب قبر سے نجات پائیگا۔

(۵) اذان میں ذکر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہونے کی وجہ سے میت پر نزول رحمت ہوگی۔

(۶) میت کو اس تنگ وتاریک گڑھے میں سخت وحشت اور گھبراہٹ ہوتی ہے اذان کی بدولت دفع وحشت ہوگی اطمینان خاطر ہوگا۔

(۷) میت قبر میں غمگین وپریشان ہوتی ہے اذان کے سبب سے غم وپریشانی دفع ہوگی اور سرور وفرحت حاصل ہوگا اسی لئے بعض علمائے کرام نے اذان علی القبر کو مستحب فرمایا چنانچہ شامی میں مستحبات اذان کی شمار میں لکھا۔ وعند انزال المیت القبر۔

یعنی میت کے قبر میں اتارنے کے وقت اذان کہنا مستحب ہے۔ اور بعض علماء نے اسے سنت فرمایا ہے۔ اب جو شخص اس کو برا کہتا ہے وہ ایک مستحب وسنت کو برا کہتا ہے اور میت کو احادیث کے ثابت شدہ منافع سے محروم رکھتا ہے اور محض اپنی ناقص فہم سے جائز کو ناجائز قرار دیتا ہے ایسے شخص کو توبہ واستغفار کرنی چاہیئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۲۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

جس مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ہوتی ہو اس جگہ نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟۔ برائے مہربانی ان سوالوں کے جواب معتبر کتابوں کے حوالہ کے ساتھ اور مہر کے ساتھ اور دوسرے علمائے کے دستخط کے ساتھ روانہ فرمائیں آپ کی بہت بڑی مہربانی ہوگی۔

المستفتی دستخط میمن اللہ رکھا حاجی سلیمان چوکسی جامع مسجد کے پاس بمقام راج پیرا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مطلقا مکروہ تحریمی ہے خواہ میت مسجد کے اندر ہو یا باہر خواہ نمازی مسجد میں ہوں یا باہر خود حدیث شریف میں ہے۔

من صلی علی میت فی المسجد فلاصلوۃ له ۔ رواہ ابن ابی شیبہ وفی روایۃ احمد وابی داؤد فلا شیئ له وفی روایۃ ابن ماجہ فلیس له شیئ ۔ (شامی ج ا ص ۶۲)

یعنی جس نے میت پر مسجد میں نماز پڑھی تو اس کی نماز ہی نہیں دوسری روایت میں ہے کہ اسے کچھ اجر نہیں۔

تنویر الابصار ودر مختار میں ہے:

وکرهت تحریما وقیل تنزیها (فی مسجد جماعة هو) ای المیت (فیه) وحده او مع القوم (واختلف فی (الخارجة) عن المسجد وحده او مع القوم (والمختار الكراهة) مطلقا۔ (در مختار ج ا ص ۶۱۹)

شامی میں ہے: ان الحدیث مؤید للقول المختار من اطلاق الکراهة الذی هو ظاهر الروایة کما قدمناه فاغتنم هذا التحریر الفرید ۔ (شامی ص ۶۲)

مولوی خرم علی غایۃ الاوطار ترجمہ در مختار میں لکھتے ہیں:

حدیث مذکور مؤید قول مختار کی ہے کہ نماز (جنازہ) مسجد کے اندر ہر صورت میں مکروہ ہے“۔

(غایۃ الاوطار ج ا ص ۴۱۶)

اس حدیث اور فقہ کی عبارات سے صاف طور پر ثابت ہوگیا کہ مسجد میں نماز جنازہ مطلق مکروہ

تحریمی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفر لہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۲۱)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین شرع متین اس مسئلہ میں

(۱) کہ زید کی زوجہ کے شکم سے بچہ مردہ پیدا ہوا یعنی پیدا ہونے پر نہ تو رویا اور نہ اس میں زندگی کے کوئی آثار سانس وغیرہ نہیں پائے گئے اب زید مذکور کے اس بچہ کی نماز جنازہ پڑھی جائے یا نہیں اور اس کو قبرستان میں دفن کیا جاوے تو کس طرح یا کیا صورت اختیار کی جائے استدعاء ہے کہ اس مسئلہ کے جواب میں قرآن وحدیث کا ثبوت ضرور دیا جاوے۔ بینوا توجروا

(۲) ہمارے قصبہ کے اندر مرض ہیضہ وبائی صورت میں پھیل رہا ہے جس کے دفعیہ کے واسطے ہم لوگوں نے رات کے وقت اپنے اپنے گھروں کے اندر باآواز بلند اذانیں دیں جس پر زید نے اعتراض کیا اور کہا کہ یہ بالکل ناجائز ہے۔ گھر گھر مسجد بنالی ہے ہم لوگوں نے ایک جلوس بھی مرتب کیا جس میں نعرۂ تکبیر نعرۂ رسالت نعرۂ غوثیہ لگاتے ہوئے اور صلوۃ وسلام بحضور سید الانام ﷺ پڑھتے ہوئے گلی کوچوں میں گشت کیا لہٰذا درخواست ہے کہ مذکورۂ بالا جملہ مسائل کا جواب مفصل عنایت فرمایا جائے کہ شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے اور جو شخص ان کاموں سے منع کرے اس کیلئے کیا حکم ہے بینوا توجروا

المستفتی، ڈاکٹر تحسین بریلوی ضلع بریلی

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) جو بچہ شکم مادر ہی سے مردہ پیدا ہوا ہو۔ یہاں تک کہ بعد پیدائش نہ وہ رویا نہ اس میں آثار زندگی سے کوئی اثر پایا گیا تو اس کی ہرگز نماز جنازہ نہ پڑھی جائیگی۔ ابن ماجہ، نسائی شریف، بہ روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ حدیث مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ” اذا استهل الصبی صلی علیه وورث ،،، بیہقی شریف، دارقطنی، حاکم کی حدیثوں میں مروی ہے ” اذا استهل الصبی صلی علیه وورث واذا لم یستهل لم یصل علیه ولا یورث “ ان احادیث کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ نبی کریم

علیہ الصلاۃ والتسلیم نے فرمایا: کہ جب بچہ نہ رویا تو نماز جنازہ نہ پڑھی جائے اور اس کو وارث نہ بنایا جائے تو جس نے اس حدیث کے خلاف کیا اور مردہ بچہ کی نماز جنازہ پڑھ لی تو وہ حکم حدیث شریف سے کتنا بے خبر اور جاہل قرار پایا بلکہ اس کا اپنے آپ کو اہل حدیث کہنا ہی غلط ثابت ہوا ان کو چاہیے کہ وہ بالاعلان اپنی غلطی کی بناء پر توبہ کرے ورنہ اپنے فعل کے ثبوت میں کوئی حدیث پیش کرے باقی رہا اس کا قبرستان میں دفن کرنا تو یہ صحیح ہے کہ وہ جز مسلم ہے لہذا مسلمانوں کے قبرستان میں ہی دفن ہوگا اس کیلئے کسی دلیل کی حاجت نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) طبرانی کی حدیث شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی " اذا اذن فی قرية امنها الله من عذابه ذالك اليوم " یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب کسی آبادی میں اذان کہی جائے تو اللہ اس آبادی کو اس دن امن میں رکھے گا۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ آبادی کو عذاب الٰہی سے بچانے کے لئے اذان کا کہنا بہترین ذریعۂ امن ہے۔ اور وبائی امراض عذاب الٰہی میں داخل ہیں۔

بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ کی حدیث میں وارد ہے " الطاعون بقية رجز او عذاب ارسل على طائفة من بنى اسرائيل فاذا وقع بارض وانتم بها فلا تخرجوا منها فراراً منه "

تو وبائی امراض سے امن کے لئے روزانہ اذان کہنا خود حدیث ہی سے ثابت ہوگیا۔ تو یہ مدعیان اہل حدیث خود حدیث سے کتنے بے خبر اور جاہل نکلے کہ حدیث کے خلاف کہہ دیا۔ پھر مزید جہالت ملاحظہ ہو کہ جہاں اذان ہو وہ مسجد ہو جاتی ہے۔ ان نادانوں کو یہ بھی خبر نہیں کی اذان کا خود مسجد میں کہنا تو مکروہ ہے۔ احادیث میں ہے قرون ثلثہ میں اذان دروازہ مسجد پر ہوتی تھی اور اذان جمعہ مقام زوراء پر ہوتی۔ تو کیا دروازہ مسجد اور زوراء شرعاً مسجد تھے۔

نیز حدیث شریف میں ہے " من ولدله ولد فاذن فى اذنه اليمنى واقام فى اذنه اليسرى لم يضره ام الصبيان " ۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بچہ ہونے کے بعد اس کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی جائے تو اس کو مرض ام الصبیان کا ضرر نہ ہوگا۔ تو اذان کا دافع مرض ہونا بھی ثابت ہوا اور یہ بھی ثابت ہوا کہ جس گھر میں بچہ پیدا ہوا ہے وہاں جا کر اذان واقامت کہی جائے گی۔ تو ان جہال اہل حدیث کے نزدیک تو ہر ایسا گھر مسجد ہو جائیگا۔ پھر ان کی یہ نادانی بھی دیکھئے کہ گلی کوچوں میں جلوس کا گشت کرنا اور اس میں درود شریف کا پڑھنا نعرۂ رسالت ونعرۂ غوثیت کا لگانا سبب نزول رحمت ہے۔

حدیث شریف میں ہے " عند ذكر الصالحين تتنزل الرحمة "

تو کون نہیں جانتا ہے کہ درود شریف اور نعرۂ رسالت میں نبی الصالحین حضور علیہ السلام کا ذکر ہے اور نعرۂ غوثیت میں مرجع الصالحین حضور غوث پاک کا ذکر ہے اور ان کے ذکر کو حدیث نے سبب نزول رحمت قرار دیا تو جہاں رحمت کا نزول ہوگا وہاں سے عذاب دفع ہوگا اور وبائی امراض سے حفاظت وامن حاصل ہوگا بالجملہ۔ وبائی امراض کے دفع کرنے کے لئے اذان کا گھر گھر کہنا گلی کوچوں میں ایسے جلوس کا گشت کرنا احادیث ہی سے ثابت کردیا گیا۔ غیر مقلدین ناجائز وممنوع ہونے پر کوئی صریح حدیث پیش نہیں کرسکتے بلکہ ان کا ان چیزوں کو ناجائز محض کہنا اپنی ناقص عقل سے ہے۔ شرم نہیں آتی کہ احادیث کی کھلی ہوئی مخالفت کرتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو اہل حدیث بھی کہتے ہیں اپنی ناقص رائے پر عمل کرتے ہیں اور براہ فریب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم حدیث پر عامل ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ ان کو ہدایت کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۱۰ صفر المظفر ۱۳۷۶ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۲۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
حاجی صاحبان حج سے فارغ ہوکر اپنے ساتھ ایک سادہ چادر جس پر قرآن کریم کی آیات نقشی ہوتی ہیں لاتے ہیں وہ چادر میت کے اوپر ڈال کر قبرستان لے جاتے ہیں۔ نماز جنازہ پڑھتے وقت اس چادر کو ہٹا دینا چاہیے کہ نہیں؟۔

المستفتی تفضل حسین فرخ آباد

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

میت کے جنازے پر آیات کی لکھی ہوئی جو چادر ڈالی جاتی ہے اس کا بوقت نماز جنازہ ہٹا دینا ضروری نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۲۳)

حضرت اقدس مفتی اعظم صاحب قبلہ سنبھل سلام مسنون۔ مزاج گرامی۔

معروض ہو کہ مندرجہ ذیل مسائل کا جواب براہ کرم جلد ہی عنایت فرمائیں عین احسان ہوگا

(۱) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ ہوئی یا نہیں؟۔ ہوئی تو کس نے پڑھائی نماز جنازہ جو تمام مسلمانوں کی ہوا کرتی ہے ویسی ہوئی یا اور طرح سے ہوئی؟ یہ مسئلہ عرصہ سے جھگڑے کا باعث بنا ہوا ہے شک رفع فرمائیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

حضور نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کے نماز جنازہ ہونے اور نہ ہونے میں مختلف اقوال ہیں، ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ حضور کی نماز جنازہ نہیں ہوئی فرشتے جن انس کے گروہ آتے اور درود وسلام عرض کرتے اور دعا کر کے واپس ہو جاتے۔ لیکن صحیح قول جس پر جمہور اہل سنت ہیں یہی ہے کہ حضور کی نماز جنازہ جیسے آج ہوتی ہے پڑھی گئی، گروہ کے گروہ اور تنہا متفرق طور پر الگ آتے اور نماز جنازہ پڑھتے۔ مگر اس پر سب علماء بلا اختلاف متفق ہیں کہ نماز جنازہ کا نہ تو کوئی امام بنا نہ جماعت ہوئی کما حققہ العلامہ الزرقانی فی شرح المواہب والعلامۃ علی قاری فی شرح الشفا والمحقق الدھلوی فی ما ثبت من السنۃ و اشعۃ اللمعات۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۲۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں کہ

(۱) کیا حضور پر نور ﷺ کی نماز جنازہ پڑھی گئی یا نہ پڑھی گئی یا صرف درود وسلام ہی پڑھا گیا۔

میزان شعرانی جلد اول صفحہ ۴۸۹ مسئلہ بارہویں میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنھم نے حضور پر نور ﷺ پر نماز پڑھی ہے۔

ترجمہ ابن ماجہ کی پانچویں کتاب ابواب الجنائز صفحہ ۴۳۷ حدیث نمبر ۱۶۴۹ بروایت ابن عباس رضی اللہ شمائل ترمذی عربی باب ماجاء فی وفات رسول اللہ ﷺ قال: یا صاحب رسول اللہ ﷺ

قبض رسول اللہ ﷺ قال نعم فعلموا ان قد صدق قالوا یا صاحب رسول اللہ ﷺ اتصل علی رسول اللہ ﷺ قال نعم و کیف قال یدخل قوم فیکبرون و یدعون و یصلون ثم یخرجون ثم یدخل قوم فیکبرون و یصلون و یدعون ثم یخرجون حتی یدخلو الناس

اور متعدد حدیث مشکوۃ وغیرہ میں موجود ہے۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ نماز جنازہ بموجب حوالہ بالا بغیر امامت ہوئی اور دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ حضور پر صرف درود وسلام ہی پڑھا گیا نماز نہیں ہوئی اور جو یہ کہے حضور ﷺ کی نماز جنازہ ہوئی وہ کافر ہے اس سے سلام جائز نہیں اس کو توبہ لازم ہے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

حضور علیہ السلام کی وفات پر بالفعل کوئی امام المسلمین اور امیر متعین نہیں تھا ہر مسلمان مستقل ولی تھا مسلمانوں نے نماز جنازہ فرداً فرداً بھی اور ایک ایک قوم نے جمع ہو کر بھی متفرق بہت سی نمازیں پڑھیں جیسا کہ آپ حدیثوں میں دیکھ رہے ہیں۔

فیکبرون ویدعون ویصلون ثم یخرجون۔ سے نماز جنازہ ہی مراد ہے نہ محض درود وسلام پڑھنا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) حضور نبی کریم کی نماز جنازہ کا مسئلہ مختلف مسائل سے ہے اس میں علماء سلف وخلف کے دو قول ہیں ایک جماعت اہل حق کا یہ قول ہے کہ حضور علیہ السلام کی نماز جنازہ نہیں ہوئی بلکہ فرشتے جن وانس تنہا یا گروہ کے گروہ حاضر ہوتے اور درود وسلام پیش کرتے پھر دعاء کر کے واپس ہوتے علامہ زرقانی شرح مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں:

ذهب اليه جماعة انه لم يصل عليه الصلوة المعتادة وانما كان الناس يا تون فيدعون۔

(زرقانی مصری جلد ۸ صفحہ ۹۴)

سیرۃ حلبی میں ہے:

ذكر انه دخل عليه ابو بكر وعمر ومعهما نفر من المهاجرين والانصار بقدر ما يسع البيت فقال السلام عليك ايها النبي ورحمته وبركاته وسلم والمهاجرون والانصار

کما سلم ابو بکر وعمر رضی اللہ عنهم ثم صفوا صفو فا لا یؤمهم احد وکانا ابو بکر وعمر فی الصف الاول الذی حیال رسول اللہ ﷺ فقالا اللهم انا نشهد انه بلغ ما انزل الیه ونصح لا متہ (الی اخر الدعاء) فیقول الناس آمین امین وهذا یدل علی المراد بالصلاۃ علیه ﷺ الدعاء لا الصلاۃ علی الجنازۃ المعروفۃ عندهم ۔

(سیرۃ حلبی مصری جلد ۳ ۳۹٤)

لیکن اس میں وہ صحیح قول جو جمہور کا قول ہے یہی ہے کہ آپ کے جنازہ کی نماز اسی طرح ہوئی جس طرح کہ پڑھی جاتی ہے۔ تنہا تنہا شخصوں نے بھی پڑھی اور گروہ گروہ نے بھی پڑھی لیکن اس نماز کی نہ باقاعدہ جماعت ہوئی، نہ کسی نے اس کی امامت کی۔ اور اس بات پر تو سب متفق ہیں کسی کا اختلاف نہیں کہ کسی نے حضور کے جنازہ کی نماز کی امامت ہرگز ہرگز نہیں کی۔ زرقانی میں ہے:

الصحیح الذی علیه الجمهور ان الصلوۃ علی النبی ﷺ کانت صلاۃ حقیقۃ لا مجرد الدعاء نعم لا خلاف انه لم یؤمهم احد علیه کما مر لقول علی هو امامکم حیا و میتا فلا یقوم علیه احد الحدیث رواه ابن سعد واخرج الترمذی ان الناس قالوا لابی بکر اتصل علی رسو ل اللہ ﷺ قال نعم قالوا وکیف نصلی قال یدخل قوم فیکبرون ویصلون ویدعون ثم یدخل قوم فیصلون فیکبرون ویدعون فرادی۔

(ملخصا زرقانی جلد ۸ صفحہ ۲۹۴)

خصائص کبریٰ میں ہے:

اخرج ابن اسحاق والبیهقی عن ابن عباس قال :لما مات رسول اللہ و ادخل الرجال فصلوا علیه بغیر امام ارسالا حتی فرغوا ثم ادخل النساء فصلین علیه ثم ادخل الصبیان فصلوا علیه ثم ادخل العبید فصلوا علیه ارسالا لم یؤمهم علی رسول اللہ احد

(خصائص جلد ۲ صفحہ ۴۸٦)

علامہ علی قاری شرح شفا شریف میں اقوال نماز جنازہ نقل کرنے کے بعد خلاصہ تحقیق اس طرح لکھتے ہیں۔

اقول الاظهر انهم صلوا علیه فی محله وما کان یسع ذلک المحل اماما لقومه کله فصلوا فرادی لادراک فضله وتکرار الصلوۃ علیه من خصوصیات حکمه هذا ومن زعم ان

المراد بالصلوۃ هنا دعاء فقد عدل عن الحقیقۃ من غیر قرینۃ صارفۃ۔

(شرح شفا مصری جلد ۱ صفحہ ۷۵۴)

سیرۃ حلبی میں ہے:

کانت صلاتهم علیه ﷺ کصلاتهم علی غیره ای بتکبیرات اربع لا مجرد الدعا من غیر تکبیرات (وفیه ایضا) والصحیح الذی علیه الجمهور انهم صلوا علیه اراد فکان یدخل علیه فوج یصلون فرادی ثم یخرجون ثم یدخل فوج اخر فیصلون کذلک

(سیرۃ حلبی جلد ۳ صفحہ ۴۰۴)

اسی سیرۃ حلبی میں ہے:

والصحیح ان هذا الدعاء کان ضمن الصلاۃ المعروفۃ التی باربع تکبیرات فقد جاء ان ابا بکر رضی اللہ عنه دخل علیه ﷺ فکبر اربع تکبیرات ثم دخل عمر رضی اللہ عنه فکبر اربعا ثم دخل عثمان رضی اللہ عنه فکبر اربعا ثم طلحۃ بن عبیداللہ والزبیر بن العوام رضی اللہ عنهما ثم تتابع الناس ارسالا یکبرون علیه و قال ابن کثیر رحمه اللہ وهذا الامر ای صلاتهم علیه فرادی من غیر امام یؤمهم لجمع علیه

(سیرۃ حلبی جلد ۳ صفحہ ۳۹۴)

حضرت شیخ محقق عبدالحق محدث دہلوی نے ماثبت من السنۃ میں فرمایا:

روی عن محمد انه صلی علی النبی بغیرامام فی روایۃ فرادیٰ لا یؤمهم احد یدخل المسلمون زمرا فیصلون علیه و یخرجون ۔ (ماثبت من السنۃ ص ۱۴۰)

یہی شیخ مدارج النبوۃ میں فرماتے ہیں:

''اما نماز گذاردن بر آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم بجماعت نبود وجماعۃ می در آمدند بروے ونماز گذاردند بے جماعت و بیرون می آمدند ومی گذاردند۔ ہمچنانکہ ترتیب صفوف است در جماعت وامامت نہ کرد بر جنازہ شریف رسول خدا ﷺ ہیچ یکے از امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ منقول است کہ فرمودہ در جنازہ رسول اللہ ہیچ کس امامت نہ کرد زیرا کہ آں حضرت علیہ السلام در حیات وممات امام شماست وایں از خواص آنحضرت علیہ السلام کہ نماز ہا متعدد کردند وتنہا تنہا گذاردند ودر روایت آمدہ اول کسے کہ نماز گذارد بروے اہل بیت وے بود علی وعباس وبنو ہاشم پس ازاں در آمدند مہاجرین بعد ازاں انصار پس تر می آمدند ومردم

فوج فوج ونمازمی گذاردند۔ (مدرج النبوۃ صفحہ ۵۶۶ جلد۲)

توان عبارات سے روز روشن کی طرح ثابت ہوگیا کہ بنابر قول صحیح کے حضور نبی کریم ﷺ کی نماز جنازہ حسب دستور چار تکبیروں کے ساتھ حضرات اہل بیت کرام وصحابہ عظام مہاجرین وانصار زنان ومردان نے تنہا تنہا بھی ادا کی اور گروہ کے گروہ نے بھی پڑھی۔ لیکن اس نماز جنازہ کی نہ جماعت ہوئی نہ کسی نے اس کی امامت کی۔ بالجملہ منکرین نماز جنازہ بھی علمائے سلف اور اہل حق کی ایک جماعت ہی ہے جن کا یہ قول نہ غلط ہے نہ باطل اور ان کے مقابلہ میں قائلین نماز جنازہ جمہور سلف وخلف ہیں۔ ان کا قول بہ نسبت ان کے قول کے زیادہ صحیح اور معتمد ہے تو جو قائلین نماز جنازہ کو اپنی جہالت سے کافر کہتا ہے اس پر خود ہی توبہ لازم ہے اور وہ خود ہی اسلام کا اہل نہیں رہا۔

اب باقی رہے مجیب مدرسہ امینیہ دہلی کے اول جواب میں یہ الفاظ ''حضور علیہ السلام کی وفات پر بالفعل کوئی امام المسلمین اور امیر المؤمنین متعین نہیں تھا'' غلط اور تصریحات کتب کے خلاف ہیں۔

چنانچہ سیرۃ حلبی میں اسی بحث میں صاف طور پر لکھا ہے:

قال ابن كثير وهذا الامراى صلاتهم عليه ﷺ فرادى من غير امام يؤمهم مجمع عليه و يقال لان المسلمين لم يكن لهم حينئذ امام لانهم لم يشرعوا فى تجهيز عليه الصلاة والسلام الا بعد تمام البيعة لابى بكر رضى الله عنه لانه لما تحقق موته ﷺ اجتمع غالب المهاجرين على ابى بكر الحديث۔

تو ظاہر ہوگیا کہ حضور کی نماز جنازہ سے پہلے پہلے حضرت ابوبکر کی بیعت تمام ہو چکی تھی تو بوقت نماز جنازہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے امیر وامام متعین ہو چکے تھے۔ تو اس مجیب کے قول کا بطلان اور اس کی جہالت آشکار ہوگئی۔ پھر اس مجیب نے آخر جواب میں یہ کہا ''اور جو لوگ کہتے ہیں کہ نماز نہیں ہوئی۔ اور جو یہ کہے کہ نماز جنازہ ہوئی وہ کافر ہے'' مجیب نے ان دونوں کے لئے یہ حکم دیا ''بالکل جاہل ناواقف ہیں'' تو آخر الذکر کے لئے تو یہ حکم صحیح ہے لیکن اول الذکر کے لئے یہ حکم دینا یعنی جو لوگ کہتے ہیں کہ نماز نہیں ہوئی وہ بالکل جاہل ناواقف ہیں مجیب کی کس قدر جرأت ودلیری ہے کہ ہم نے ابتدائے جواب میں عبارات سے علماء سلف وخلف کا یہ قول پیش کر دیا ہے کہ حضور علیہ السلام کی نماز جنازہ نہیں ہوئی۔ تو اس جاہل مجیب نے ان سب علماء سلف وخلف کو ناواقف اور بالکل جاہل بنا ڈالا۔ لہذا یہ اس مجیب کے خود سخت ناواقف اور بالکل جاہل ہونے کی روشن دلیل ہے۔ مولی تعالی اس کو قبول حق کی

توفیق دے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۲۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
بعالی خدمت فیض درجت محبوب ملت حضرت مولینا مولوی رئیس المفتین الحاج الشاہ محمد اجمل صاحب قبلہ مفتی ہند دامت برکاتہم القدسیہ۔ بعد سلام مسنون معروض۔

کہ حضور پر نور حی قیوم ﷺ کی نماز جنازہ کس نے پڑھی اور کس نے پڑھائی؟ اگر نماز جنازہ نہ پڑھی گئی اور نہ پڑھائی گی اور صرف درود وسلام عرض کیا گیا تین روز تک، تو ایسی حالت میں ایک پیش امام جو اس بات کا قائل ہے کہ نماز جنازہ پڑھی گئی، اس شخص نے ایسا بیان کر کے سرور عالم ﷺ پر اتہام لگایا یا نہیں؟ اور آپ کے خصائص کبری میں تنقیص کی یا نہیں؟ اگر کی تو پھر ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا اہل سنت والجماعت کو جائز ہے یا مکروہ اور ایسے ہی قاضی سے نکاح پڑھانا جو خود بدعقیدہ ہے جائز ہے یا نہیں؟۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حضور نے حرمین شریفین میں جا کر ایک نجدی غیر مقلد سے اس مسئلہ پر بحث وتمحیص بصورت مناظرہ فرمائی اور شکست فاش دی، اس مناظرہ کے دلائل بھی جو آپ نے وہاں پیش فرمائے تھے ارقام فرمائیں نیز اور دلائل کتب شرعیہ مستندہ سے ثابت فرمائیں کہ نماز جنازہ پڑھی گئی یا نہیں؟ فتوی کا جواب تفصیل سے عنایت فرمائیں کیونکہ جناب کا تفصیل سے جواب دینا مشہور ہے۔ بینوا توجروا

آپ کا خادم العلماء والمشائخ محمد ظہور الدین گاؤ قصاباں ٹونک راجستھان

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

الحمد للہ وکفی والصلوۃ والسلام علی حبیبہ المصطفی وعلی آلہ وصحبہ وحزبہ وعلی کل من اجتبی

امابعد: سوال کے جواب سے پہلے فریقین کا بنیادی اختلاف جس کا ذکر سوال میں تو نہیں ہے لیکن سوال کے ساتھ جو واقعات کا خط آیا ہے اس میں صراحۃ وہ مذکور ہے تو اس بنیادی اختلاف کا حل کر

دینا اس مسئلہ مجوزہ کے حل کے لئے ضروری ہے۔ لہٰذا ہم پہلے بنیادی اختلاف یعنی مسئلہ حیات النبی ﷺ پر دلائل قائم کرتے ہیں۔

دلیل اول: خود اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا ط بل احیاء عند ربھم یرزقون۔

(سورہ آل عمران)

اور جو اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے گئے ہرگز انہیں مردہ نہ خیال کرنا بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں روزی پاتے ہیں۔

اس آیۃ کریمہ سے ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ شہدائے کرام کو موت کے بعد ہی حیات عطا فرما دیتا ہے یہاں تک کہ ان پر رزق پیش کیا جاتا ہے تو شہداء کے لئے حیات کا اثبات تو نص قرآنی سے ثابت ہو گیا۔ اور ہمارے نبی ﷺ بلاشبہ شہید ہوئے۔

چنانچہ بخاری شریف میں حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

کان النبی ﷺ یقول فی مرضہ الذی مات فیہ یا عائشۃ ما ازال اجد الم الطعام الذی اکلت بخیبر فھذا اوان وجدت انقطاع ابھری من ذالک السم۔

(بخاری مصطفائی جلد ۲ صفحہ ۶۳۷)

یعنی نبی کریم ﷺ اپنے اس مرض میں جس میں آپ نے وفات پائی فرماتے تھے اے عائشہ میں اس کھانے کی تکلیف جس کو میں نے خیبر میں کھایا ہمیشہ پاتا رہا پس اس وقت تو میں اس زہر سے اپنی رگ دل کے کٹ جانے کا اثر پاتا ہوں۔

علامہ سبکی شفاء السقام میں اس حدیث شریف سے اس طرح استدلال فرماتے ہیں:

ان النبی ﷺ شہید فانہ ﷺ لما سم بخیبر واکل من الشاۃ المسمومۃ وکان ذالک سما قاتلا من ساعتہ مات منہ بشر بن البراء رضی اللہ عنہ وبقی النبی ﷺ وذالک معجزۃ فی حقہ صار الم السم یتعاھدہ الی ان مات بہ ﷺ فی مرضہ الذی مات فیہ ما زالت اکلۃ خیبر تعاونی حتی کان الا ن کان قطعت ابھری قال العلماء فجمع اللہ لہ بذالک بین النبوۃ والشہادۃ "

(شفاء السقام صفحہ ۱۲۱)

بیشک نبی ﷺ شہید ہیں، کہ جب خیبر میں حضور کو زہر دیا گیا اور آپ نے زہر آلود بکری کا کچھ گوشت کھایا اور وہ ایسا سم قاتل تھا کہ اس سے اسی وقت حضرت بشر بن براء رضی اللہ عنہ کی موت ہوئی اور نبی ﷺ باقی رہے اور یہ آپ کے لئے معجزہ تھا کہ زہر کی تکلیف یہاں تک سہتے رہے کہ جس مرض میں وفات پائی اسی زہر سے موت واقع ہوئی خیبر کے لقمہ کا اثر ہمیشہ عود کرتا رہا یہاں تک کہ اس وقت میری رگ دل کو کاٹ دیا۔ علماء نے فرمایا: اسی بنا پر اللہ نے حضور کیلئے نبوت اور شہادت کو جمع فرما دیا۔

علامہ قسطلانی مواہب لدنیہ میں اور علامہ زرقانی اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

واذا ثبت بشھادۃ قولہ تعالیٰ: ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم یرزقون، حیاۃ الشھداء ثبت للنبی ﷺ بطریق الاولی، لانہ فوقھم درجات قال السیوطی: وقل نبی الا وقد جمع مع النبوۃ وصف الشھادۃ فیدخلون فی عموم الآیۃ۔

(زرقانی مصری جلد ۸ صفحہ ۳۱۲)

اللہ تعالیٰ کے اس قول (اور جو اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے گئے ہرگز انہیں مردہ نہ خیال کرنا بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں روزی پاتے ہیں) کی شہادت سے شہداء کی حیات ثابت ہوئی تو نبی ﷺ کے لئے بطریق اولیٰ ثابت ہوئی اس لئے کہ وہ ان سے درجوں بلند ہیں۔ علامہ سیوطی نے فرمایا کہ فقط نبی تو کم ہوئے ورنہ نبوت کے ساتھ وصف شہادت جمع کر دیا گیا تو وہ انبیاء آیت کے عموم میں داخل ہو جائیں گے۔

علامہ قاضی عیاض شفا شریف میں اور علامہ علی قاری اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

(وکان المسلمون) ای الصحابۃ والتابعون (لیرون) ای لیعتقدون (ان رسول اللہ ﷺ مات شہیدا)

(شرح شفا مصری جلد ۱ صفحہ ۶۲۲)

صحابہ وتابعین یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ بیشک رسول اللہ ﷺ کی شہید ہو کر موت واقع ہوئی۔ ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ ہمارے نبی ﷺ شہید ہوئے۔ اور جب آپ کا شہید ہونا حدیث بخاری اور اقوال صحابہ وتابعین وعلماء متقدمین ومتاخرین سے ثابت ہو چکا تو آیت مذکورہ سے آپ کے لئے حیات ثابت ہوئی لہٰذا حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا حیات النبی ہونا نہ فقط قرآن بلکہ احادیث سے بھی ثابت ہوا۔

بحث اول: شہداء کے جسم گلتے سڑتے نہیں ہیں۔

چنانچہ علامہ امام سبکی شفاء السقام میں فرماتے ہیں:

"ذکر القرطبی ان اجساد الشهداء لا تبلی ۔ (شفاء السقام صفحہ ۱۴۵)

امام قرطبی نے ذکر کیا کہ بیشک شہداء کے اجسام گلتے سڑتے نہیں۔

علامہ شیخ احمد تفسیر صاوی میں تحریر فرماتے ہیں:

ولا تاکل الارض اجساد الشهداء ۔ (صاوی مصری جلد ا صفحہ ۲۶۴)

زمین شہداء کے اجسام کو نہیں کھاتی ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ شہداء کے اجسام گلتے سڑتے نہیں، زمین ان کے جسموں کو کھاتی نہیں۔ علامہ امام سبکی نے اسی سلسلہ میں چند شہداء صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واقعات احادیث سے اسی شفاء السقام میں نقل کئے ہیں:

وقد صح عن جابر ان اباه وعمرابن الجموع رضی الله عنهم وهما ممن استشهد باحد ودفنا فی قبر واحد، حفر السیل قبر هما فوجدا لم يتغيرا وكان احدهما قد جرح موضع يده فوضع على جرحه فدفن وهو كذلك فاميطت يده عن جرحه ثم ارسلت فرجعت كما كانت وكان بين ذلك وبين احدست واربعون سنة ولما اجرى معاوية رضى الله تعالىٰ عنه العين اللتى استنبتها بالمدينة وذالك بعد احد بنحو من خمسين سنة ونقل الموتىٰ اصابت المسمار قدم حمزة رضى الله عنه فسال منه الدم ووجد عبدالله بن حرام كانما دفن بالامس وروى كافة اهل المدينة ان جدار قبر النبی ﷺ لما انهدم فی ایام الولید بدت لهم قدم عمر بن الخطاب رضى الله عنه وكان قتل شهيدا۔

(شفاء السقام صفحہ ۱۴۵)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بروایت صحیح مروی ہے کہ ان کے والد اور عمر بن جموع رضی اللہ عنھم ان صحابہ سے ہیں جو احد میں شہید ہوئے اور یہ دونوں ایک ہی قبر میں دفن کئے گئے پانی کے بہاؤ نے ان کی قبر کو کھول دیا تو ان کے جسم ایسے پائے گئے جن میں کسی طرح کا تغیر نہ ہوا تھا۔ اور ان کا ایک ہاتھ زخمی ہوا تھا اور اس نے اپنا ہاتھ زخم پر رکھ لیا تھا تو ان کو اسی طرح دفن کر دیا گیا تھا اب ان کا ہاتھ ان کے زخم سے علیحدہ کیا گیا۔ پھر اس کو جب چھوڑ دیا تو ہاتھ اپنے پہلے حال کی طرف لوٹ گیا اور اس واقعہ کے اور جنگ احد کے درمیان ۴۶ سال کی مدت گذری اور جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے لئے پانی کی نہر کھدوائی جو جنگ احد کے پچاس سال کے بعد شروع ہوئی اور مردوں کو منتقل کیا اسی

میں یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قدم پر پھاوڑا لگ گیا تو اس سے خون بہنے لگا اور عبداللہ بن حرام کو ایسا پایا گیا کہ انہیں کل ہی دفن کیا گیا ہے اور تمام اہل مدینہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے روضہ کی دیوار زمانہ ولید میں منہدم ہوگئی تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قدم ظاہر ہوگیا اور وہ شہید ہوئے تھے تو ان احادیث سے یہ ثابت ہوگیا کہ شہداء کے اجسام گلتے سڑتے نہیں اور زمین ان کے اجسام کو کھاتی نہیں۔ تو شہداء کی حیات جب ثابت ہوگئی اور ہمارے نبی ﷺ کا شہید ہونا پہلے ثابت ہو چکا لہٰذا مسئلہ حیات النبی کا ثبوت اس سے ظاہر ہوگیا۔

بحث دوم: حضرات انبیائے کرام کے اجسام بعد وفات نہ گلتے سڑتے ہیں نہ انہیں زمین کھا سکتی ہے۔ تو ان کے لئے حیات ثابت ہے۔

علامہ سیوطی نے شیخ الشافعیہ ابومنصور بغدادی کا یہ قول نقل کیا: "ان الانبياء لا يبلون ولا تاكل الارض منهم شيئا" (انباء الاذکیا صفحہ ۸)

بیشک انبیاء گلتے سڑتے نہیں اور نہ زمین ان کا کچھ کھا سکے۔

امام بیہقی کتاب الاعتقاد میں فرماتے ہیں:

الانبياء بعد ما قبضوا ردت اليهم ارواحهم فهم احياء عند ربهم كالشهداء۔

(انباء الاذکیا صفحہ ۷)

انبیاء کی روحیں قبض ہو جانے کے بعد پھر اجسام کی طرف واپس کر دی جاتی ہیں تو وہ شہداء کی طرح اپنے رب کے پاس زندہ ہیں۔ نیز حیات انبیاء علیہم السلام پر بکثرت احادیث دلالت کرتی ہیں۔

ابوداؤد، نسائی، دارمی، بیہقی میں مروی ہے:

ان الله حرم على الارض اجساد الانبياء" (مشکوۃ شریف صفحہ ۱۲۰)

بیشک اللہ نے زمین پر انبیاء کے جسموں کو حرام کر دیا ہے۔

ابن ماجہ میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

ان الله حرم على الارض ان تاكل اجساد الانبياء فنبی الله حی یرزق "

(مشکوۃ صفحہ ۱۲۱)

اللہ نے زمین پر انبیاء کے جسموں کا کھانا حرام کر دیا ہے تو اللہ کا نبی زندہ ہے رزق دیا جاتا ہے۔

ابو یعلی نے اپنی "مسند" میں اور ابن عدی نے "کامل" میں اور بیہقی نے "کتاب حیاۃ الانبیاء"

میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون " (جامع صغیر جلد ا صفحہ ۱۰۳)

انبیاء زندہ ہیں قبروں میں اپنی نماز پڑھتے ہیں۔

ابونعیم نے حلیہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

مررت بقبرہ موسیٰ علیہ السلام وھو قائم یصلی فیہ ۔

(انباء الاذکیاء للسیوطی صفحہ ۳)

میں موسیٰ علیہ السلام کی قبر پر گذرا تو وہ اس میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔

ابونعیم دلائل النبوۃ میں حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے راوی:

قال لقد رأیتنی (لیالی الحرۃ) وما فی مسجد رسول اللہ ﷺ غیری وما یاتی وقت صلاۃ الا و سمعت الاذان من القبر۔ (انباء الاذکیاء صفحہ ۳)

انہوں نے فرمایا: میں نے زمانہ حرہ میں دیکھا اور مسجد نبوی میں میرے سوا اور کوئی نہ تھا کہ نماز کا جو وقت آتا تو میں قبر شریف سے اذان کی آواز سنتا۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں، ان کے جسموں کو نہ زمین کھا سکتی ہے نہ وہ گلتے سڑتے ہیں۔ تو ہمارے نبی تو نہ فقط نبی بلکہ نبی الانبیاء ہیں تو ان کے حیات النبی ہونے میں کسی شبہ وشک کو راہ نہیں۔

بحث سوم: ہمارے نبی ﷺ میں نبوۃ وشہادت دونوں باتیں جمع ہیں۔

چنانچہ علامہ سبکی شفاء السقام میں فرماتے ہیں:

فجمع اللہ بذالک بین النبوۃ والشھادۃ " (شفاء السقام صفحہ ۱۴۱)

تو حضور کے لئے اسی بنا پر اللہ نے نبوت اور شہادت کو جمع فرما دیا۔

حضرت احمد اور ابویعلی اور طبرانی اور حاکم مستدرک میں بیہقی دلائل النبوۃ میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے راوی جس میں یہ الفاظ بھی ہیں " ان اللہ اتخذہ نبیا واتخذہ شھیدا ۔

(انباء الاذکیاء صفحہ ۶)

بیشک اللہ نے حضور علیہ السلام کو نبی اور شہید بنایا۔ تو جب ہمارے نبی ﷺ کے لئے نبوت اور شہادت دونوں فضل ثابت ہوئے تو ان کی حیات بنابر شہادت نص قرآنی سے ثابت ہو گئی۔ اور حضور اکرم

ﷺ کی حیات بنابر نبوت احادیث کثیرۃ متواترہ سے ثابت۔

چنانچہ یہی علامہ سیوطی اس میں فرماتے ہیں:

فاقول حیاۃ النبی ﷺ فی قبرہ ھو وسائر الانبیاء معلومۃ عندنا حتما قطعیا لما قام عندنا من الادلۃ فی ذالک وتواترت بہ الاخبار الدالۃ علی ذالک۔

پس میں کہتا ہوں کہ نبی ﷺ کی قبر میں حیات اور تمام انبیاء کی ہمارے نزدیک قطعی حتمی طور پر معلوم ہے کہ اس میں دلیلیں قائم ہو چکیں اور اس پر دلالت کرنے والی خبریں بہ تواتر ثابت ہو چکیں۔

علامہ قسطلانی اپنی کتاب مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں:

ولا شک ان حیاۃ الانبیاء علیھم السلام ثابتۃ معلومۃ مستمرۃ ونبینا ﷺ افضلھم واذا کان کذالک فینبغی ان تکون حیاتہ اکمل واتم من حیاۃ سائرھم

(شرح الزرقانی جلد ۸ صفحہ ۳۰۹)

اور بیشک بلا شبہ انبیاء علیہم السلام کی حیات مستمر اور معلوم اور ثابت ہے اور ہمارے نبی تو افضل الانبیاء ہیں۔

اور جب یہ حقیقت ہے تو حضور کی حیات ان تمام انبیاء کی حیات سے تمام تر اور کامل تر ثابت ہو گی۔ علامہ علی قاری شرح شفا شریف میں تحریر فرماتے ہیں:

فمن المعتقد المعتمد انہ ﷺ حی فی قبرہ کسائر الانبیاء فی قبورھم وھم احیاء عند ربھم وان لارواحھم تعلقا بالعالم العلوی والسفلی کما کانوا فی العالم الدنیوی۔

(شرح شفا جلد ۲ صفحہ ۱۲۶)

اور معتمد عقیدہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ اپنی قبر میں زندہ ہیں جیسا کہ تمام انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں تو انبیاء اپنے رب کے حضور زندہ ہیں ان کی روحوں کا تعلق عالم علوی وسفلی سے اسی طرح ہے جس طرح دنیوی حال میں تھا۔ تو حضور نبی کریم ﷺ کا حیات النبی ہونا قرآن کریم سے بھی ثابت۔ کثرت احادیث سے بھی ثابت۔ اقوال سلف وتصریحات خلف سے بھی ثابت لہٰذا اب حیات النبی کا منکر کوئی مسلمان تو ہو نہیں سکتا۔ وللہ الحمد والمنۃ

بحث چہارم: حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے جو یہ حیات ثابت کی گئی ہے اس سے صرف حیاۃ ارواح مراد نہیں کہ روح کو موت نہیں بلکہ وہ زندہ رہتی ہے۔

چنانچہ علامہ سبکی شفاء السقام میں فرماتے ہیں: " والروح باقیۃ لم تمت ۔

(شفاء السقام صفحہ ۱۲۲)

اور روح باقی رہتی ہے وہ مرتی نہیں۔

تو اب اس حیات سے مراد روح مع جسم کی حیات ہے اور ایسی حیات سوائے شہداء کے اور مؤمنین کے لئے ثابت نہیں ۔ چنانچہ حضرت علامہ سیوطی شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور میں فرماتے ہیں۔

الفرق بین حیاۃ الشہداء وغیرہم من المؤمنین الذین ارواحہم فی الجنۃ من وجہین احدہما ان ارواح الشہداء تخلق لہا اجساد فان الشہداء بذلوا اجسادہم للقتل فی سبیل اللہ فعوضوا عنہا بہذہ الاجساد فی البرزخ والثانی انہم یرزقون من الجنۃ وغیرہم لم یثبت فی حقہ مثل ذالک ۔ ملخصا۔ (شرح الصدور صفحہ ۱۰۶/۱۰۷)

شہداء کی حیات اور ان کے سوا ان مؤمنین کی حیات میں فرق جن کی روحیں جنت میں ہیں دو وجہ پر ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ شہداء کی روحوں کے لئے اجسام پیدا کر دیئے جاتے ہیں اس بنا پر کہ شہداء نے اللہ کے راستہ میں قتل کے لئے اپنے جسموں کو پیش کر دیا تو برزخ میں انہیں ان جسموں کے عوض دوسرے اجسام عطا فرمائے گئے دوسری وجہ یہ ہے کہ شہداء کو جنت میں رزق دیا جاتا ہے۔ اور غیر شہداء کے حق میں یہ خصوصیت ثابت نہیں۔ تو اگر شہداء اور مؤمنین کی حیات میں ایسا بین فرق نہ ہوتا تو قرآن کریم اور احادیث ان کی حیات کو اس خصوصیت کے ساتھ ہرگز ذکر نہ کرتیں۔ لہٰذا شہداء کے لئے حیات روح مع جسم کے ثابت ہوگئی جس کے ثبوت بحث اول میں کافی گذرے۔ اور یہی جمہور کا قول ہے۔

چنانچہ علامہ سبکی شفاء السقام میں فرماتے ہیں:

ان الشہداء احیاء حقیقۃ وہو قول جمہور العلماء ۔

(شفاء السقام صفحہ ۱۲۲)

بے شک شہداء حقیقۃً زندہ ہیں اور یہی جمہور علماء کا قول ہے۔

اب باقی رہی حیات انبیاء علیہم السلام تو اس حیات سے بھی روح مع جسم کی حیات مراد ہے۔ اور حیات انبیاء حیات شہداء سے بدرجہا کامل ترین و افضل ترین ہے۔

علامہ سبکی شفاء السقام میں فرماتے ہیں:

حیاۃ الشہداء اکمل واعلیٰ فہذا النوع من الحیاۃ والرزق لا یحصل لمن لیس فی رتبتہم اما حیاۃ الانبیاء اعلیٰ واکمل واتم من الجمیع لانہا للروح والجسد علی الدوام علی ما کان فی الدنیا علی ما تقدم من جماعۃ من العلماء۔

(شفاء السقام صفحہ ۱۵۴)

شہداء کی حیاۃ اکمل اور اعلیٰ ہے اور ایسی حیات اور رزق اس کے لئے حاصل نہیں جو ان کا ہم رتبہ نہیں لیکن انبیاء کی حیات سب سے اعلیٰ اور اکمل اور تمام تر ہے اس لئے کہ ان کے لئے جیسی کہ دنیا میں روح و جسم کے لئے حیات حاصل تھی وہ ہمیشہ تک حاصل ہے جیسا کہ جماعت علماء کا قول گذرا۔

شیخ الاسلام علامہ سمہودی وفاء الوفا میں فرماتے ہیں:

ولا شک فی حیاتہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد وفاتہ وکذا سائر الانبیاء علیہم الصلاۃ والسلام احیاء فی قبورہم حیاۃ اکمل من حیاۃ الشہداء التی اخبر اللہ تعالیٰ بہا فی کتابہ العزیز ونبینا ﷺ سید الشہداء۔ (وفاء الوفا مصری جلد ۲ صفحہ ۴۰۵)

اور حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد حیاۃ میں کوئی شک نہیں۔ اسی طرح تمام انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں ان کی حیاۃ شہداء کی اس حیاۃ سے کامل تر ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں خبر دی ہے اور ہمارے نبی ﷺ کی وفات کے بعد حیاۃ میں کوئی شک نہیں۔ اسی طرح تمام انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں ان کی حیاۃ شہداء کی اس حیاۃ سے کامل تر ہے جسکی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں خبر دی ہے اور ہمارے نبی ﷺ تو شہداء کے سردار ہیں۔ اسی میں ہے۔

واما ادلۃ حیاۃ الانبیاء فمقتضاہا حیاۃ الابدان کحالۃ الدنیا مع الاستغناء عن الغذاء ومع قوۃ النفوذ فی العالم ۔ (وفاء الوفا مصری جلد ۲ صفحہ ۴۰۷)

لیکن حیاۃ انبیاء کی دلیلیں تو ان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ دنیا کے حال کی طرح اجسام انبیاء کو حیات حاصل ہے باوجود اس کے کہ وہ غذا سے مستغنی ہیں اور انہیں عالم میں نفوذ کی قوت حاصل ہے۔ حضرت شیخ محقق شاہ عبد الحق محدث دہلوی مدارج النبوۃ میں فرماتے ہیں:

" بدانکہ حیاۃ انبیاء صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہم اجمعین متفق علیہ است میان علماء ملت و ہیچ کس خلاف نیست دراں کامل تر وقوی تر از وجود حیات شہداء و مقتولین فی سبیل اللہ کہ آں معنوی اخروی است عند اللہ و حیاۃ انبیاء حیات حسی دنیاوی است" (مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۲۷۵)

حق سبحانہ حرام گردانیدہ است برز میں کہ بخورد اجساد انبیاء علیہم السلام واز ینا معلوم میشود کہ حیات انبیاء حیات حسی دنیاوی است نہ مجرد لقائے ارواح چنانچہ شہداء راہم دراجوف طیورے اندازند"

(صفحہ ۵۷۶)

جانو کہ انبیاء علیہم السلام کی حیات کا مسئلہ علماء ملت میں ایسا متفق علیہ ہے کہ اس میں پانچ شخص بھی مخالف نہیں۔ ان کی حیات شہداء اور مقتولین فی سبیل اللہ کی حیات سے بہت کامل اور زائد قوی ہے کہ حیات شہداء تو عنداللہ معنوی اخروی ہے اور حیات انبیاء حسی و دنیوی حیات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء علیہم السلام کے جسموں کا کھانا حرام کر دیا ہے تو اسی سے معلوم ہو گیا کہ انبیاء کی حیات حسی و دنیوی حیات ہے، نہ فقط روحوں کی ملاقات جیسا کہ ارواح شہداء پرندوں کے جوف میں داخل ہو جاتی ہیں۔

ان کثیر عبارات سے آفتاب سے زائد روشن طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ شہداء کی حیات سے بھی اعلیٰ واقویٰ اور تمام تر داکمل تر انبیاء علیہم السلام کی حیات حسی دنیوی حقیقی حیات ہے ان کی ارواح و اجسام کو دنیا میں جیسی حیات حاصل تھی اسی طرح ان کی وفات کے بعد ان کی ارواح ان کے اجسام میں واپس کر دی جاتی ہیں۔ تو ان کے اجسام کو نہ مٹی کھاتی ہے نہ وہ گلتے سڑتے ہیں۔ لہٰذا انبیا کرام اپنے اجسام کے ساتھ اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور عالم میں تصرف کرتے ہیں۔ الحاصل اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ اہل سنت وجماعت کا متفقہ عقیدہ یہی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے لئے حسی دنیوی حقیقی حیات قرآن کریم اور احادیث اور اقوال سلف وخلف سے ثابت ہے۔ اس پر کافی دلائل پیش کر دیئے گئے لیکن اس مسئلہ میں وہابیہ دیو بندیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ فرقہ حیات النبی ہی کا قائل نہیں ان کے نزدیک اجسام انبیاء کو مٹی کھا لیتی ہے اور وہ گلتے سڑتے ہیں تو اس گمراہ فرقہ نے ہماری پیش کردہ آیت کریمہ اور احادیث اور تمام اقوال سلف وخلف کو ٹھکرا دیا اور ان کے خلاف اپنا ناپاک عقیدہ گڑھا۔ چنانچہ اس فرقہ کے پیشوا امام الوہابیہ مولوی اسمٰعیل دہلوی نے تقویۃ میں صاف صاف لکھ دیا اور محض اپنی دیدہ دلیری سے اس کو حدیث بنا کر اس طرح پیش کیا کہ گویا حضور کریم ﷺ نے یہ فرمایا:

"یعنی میں بھی ایک دن مر کر مٹی میں ملنے والا ہوں"

(تقویۃ الایمان مطبوعہ مرکنٹائل دہلی صفحہ ۶۹)

اس عبارت میں امام الوہابیہ نے اپنا صاف طور پر یہ عقیدہ بتا دیا کہ نبی مر کر مٹی میں مل جانا ہے یعنی نبی کے جسم کو زمین کھا لیتی ہے اور اسکا جسم گلتا سڑتا ہے۔ تو اس میں حیات النبی کا صاف انکار نہیں ہے؟

…وادر کیا ہے۔

اب باقی رہا حضور نبی کریم ﷺ کی نماز جنازہ کا مسئلہ تو اہل سنت میں یہ مسئلہ خود مختلف فیہ ہے اہل سنت کی ایک جماعت علماء تو یہ فرماتی ہے کہ حضور کی نماز جنازہ نہیں ہوئی فرشتے جن۔ انس حجرہ شریف میں حاضر ہوئے اور درود و سلام پڑھ کر دعا کر کے واپس ہو جاتے۔

چنانچہ علامہ زرقانی شرح مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں:

ذهب اليه جماعة انه لم يصل عليه الصلوة المعتادة وانما كان الناس ياتون فيدعون۔ (زرقانی مصری جلد ۸ صفحہ ۹۴)

ایک جماعت اس طرف گئی کہ حضور کی نماز جنازہ معروف نہیں پڑھی گئی سوا اس بات کے کہ لوگ حاضر ہوتے اور دعا کرتے سیرۃ حلبی میں ہے:

وذكر انه دخل عليه ﷺ ابو بكر وعمر ومعهما نفر من المهاجرين والانصار بقدر مايسع البيت فقالا السلام عليك ايها النبي ورحمة الله وبركاته وسلم المهاجرون والانصار كما سلم ابو بكر وعمر رضى الله عنهم ثم صفوا صفو فالايؤ مهم احد وكان ابو بكر وعمر فى الصف الاول الذى حيال رسول الله فقال:االلهم انانشهد انه قد بلغ ما انزل اليه ونصح لا مته وجاهد فى سبيل الله حتى اعز الله دينه وتمت كلمته (الى آخر الدعا) فيقول آمين آمين وهذا يدل على المراد بالصلوة عليه ﷺ الدعاء لاالصلاة على الجنازة المعروفة عندهم۔ (سیرۃ حلبی مصری جلد ۳ صفحہ ۳۹۴)

اور مذکور ہے کہ حضور ﷺ کے حجرہ میں حضرت ابو بکر اور عمر اور ان کے ساتھ مہاجرین وانصار کا ایک گروہ داخل ہوا بمقدار اور گنجائش حجرہ شریف کے تو حضرت ابو بکر وعمر نے عرض کیا تم پر سلام ہو اے نبی اور اللہ کی رحمت و برکتیں اور مہاجرین وانصار نے بھی انہیں کی طرح سلام پیش کیا۔ پھر انہوں نے صفیں بنالیں اور کوئی ان کا امام نہیں تھا اور ابو بکر وعمر پہلی صف میں حضور رسول اللہ ﷺ کے مقابل تھے انہوں نے یہ دعا کرنی شروع کی اے اللہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بیشک حضور ﷺ نے تبلیغ فرمادی جو ان کی طرف نازل ہوا اور اپنی امت کو نصیحت فرمائی اور اللہ کے راستہ میں جہاد کیا یہاں تک کہ اللہ نے اپنے دین کو عزت دی اور اس کے کلمہ کو تمام کیا۔ (اخیر دعا تک) لوگوں نے آمین آمین کہی تو یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ صلاۃ سے مراد حضور کے سامنے دعا کرنا ہے نہ وہ نماز جنازہ جو لوگوں میں معروف ہے۔ لیکن

اہل سنت کے جمہور علماء کا قول معتمد وصحیح یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی نماز جنازہ اسی طرح ہوئی جس طرح وہ ہوا کرتی ہے۔ مگر اس نماز جنازہ کی نہ تو باقاعدہ جماعت ہوئی نہ اس کی کسی نے امامت کی۔

چنانچہ علامہ زرقانی شرح مواہب میں فرماتے ہیں:

الصحیح الذی علیه الجمهور ان الصلاة علی النبی کانت صلاة حقیقة لامجرد الدعاء نعم لا بخلاف انه لم یؤمهم احد علیه ملخصا

(زرقانی مصری جلد۸ صفحہ۲۹۴)

وہ صحیح قول جس پر جمہور ہیں کہ نبی ﷺ کی صلاۃ حقیقۃ نماز ہی تھی وہ فقط دعا نہ تھی ہاں اس بات میں تو خلاف ہی نہیں ہے کہ اس نماز کی کسی نے امامت نہیں کی۔ علامہ علی قاری شرح شفا شریف میں اقوال نماز جنازہ نقل کرکے خلاصہ تحقیق اس طرح لکھتے ہیں۔

اقول الا ظهر انهم صلوا علیه فی محله وما کان یسع ذالك المحل اما مالقومه کله فصلوا فرادی لا دراك فضله وتکرار الصلوة علیه من خصوصیات حکمه هذا ومن زعم ان المراد بالصلاة هنا الدعا فقدعدل عن الحقیقة من غیر قرینة صارفة۔

(شرح شفا مصری جلد ا صفحہ ۷۵۴)

میں کہتا ہوں کہ ظاہر تو قول یہ ہے کہ لوگوں نے حجرہ حضور میں نماز جنازہ پڑھی اور وہ حجرہ تمام قوم کی امامت کا گنجائش نہیں رکھتا تھا تو لوگوں نے تنہا تنہا نماز جنازہ پڑھی کہ فضل کا پانا اور نماز جنازہ کا بار بار ہونا یہ حضور علیہ السلام کے خصوصی احکام سے ہے۔ اور جس شخص نے یہ خیال کیا کہ یہاں صلاۃ سے مراد دعا ہے تو اس نے بلا کسی قرینہ صارفہ کے حقیقی معنی سے عدول کیا۔ علامہ علی حلبی سیرۃ حلبی میں فرماتے ہیں

کانت صلاتهم علیه کصلاتهم علی غیر ای بتکبیرات اربع لامجرد الدعاء من غیر تکبیرات (وفیه ایضا) والصحیح الذی علیه الجمهور انهم صلوا علیه فراد فکان یدخل علیه فوج اخر فیصلون کذالك۔

(سیرۃ حلبی مصری جلد۳ صفحہ۳۰۴)

اور حضور اکرم ﷺ کی نماز جنازہ ایسی ہی تھی جیسی دوسرے کی نماز جنازہ ہوتی ہے یعنی چار تکبیروں کے ساتھ نہ بغیر تکبیروں کے فقط دعا کرنا اور وہ صحیح قول جس پر جمہور علماء ہیں کہ لوگوں نے حضور کی نماز جنازہ تنہا تنہا پڑھی۔ تو ایک گروہ حجرہ میں داخل ہوتا اور تنہا نماز پڑھتے پھر وہ باہر آجاتے پھر دوسری جماعت اندر آتی اور وہ اسی طرح نماز پڑھ لیتی۔

(وفیه ایضاً) والصحیح ان هذا الدعا کان ضمن الصلاة اربع تکبیرات فقد جاء ان ابا بکر رضی الله تعالیٰ عنه دخل علیه الصلوة والسلام فکبر اربع تکبیرات ثم دخل عمر رضی الله عنه فکبر اربعا ثم دخل عثمان رضی الله عنه فکبر اربعا ثم طلحة ابن عبید الله والزبیر بن العوام رضی الله عنهم ثم تتابع الناس ارسالا یکبرون علیه وقال ابن کثیر رحمه الله وهذا الامرای صلاتهم علیه فرادی من غیر امام یؤمهم مجمع علیه۔

(سیرۃ حلبی مصری جلد۳ صفحہ۳۹۲)

اور صحیح قول یہ ہے کہ یہ دعا اس نماز کے ضمن میں تھی جو چار تکبیروں کے ساتھ معروف ہے اور وارد ہوا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کے حجرہ میں داخل ہوئے اور انہوں نے چار تکبیریں کہیں۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ داخل ہوئے اور انہوں نے چار تکبیریں کہیں۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ داخل ہوئے اور انہوں نے چار تکبیریں کہیں۔ پھر حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور زبیر بن العوام رضی اللہ عنہم داخل ہوئے۔ پھر لوگوں کا بھیجنا پے در پے جاری رہا تو وہ بھی تکبیریں کہتے۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ باتیں یعنی لوگوں کا بغیر امام کے حضور ﷺ کی نماز جنازہ کا تنہا تنہا پڑھنا متفق علیہ اجماعی مسئلہ ہے۔

حضرت شیخ محقق عبد الحق محدث دہلوی ماثبت من السنۃ میں فرماتے ہیں:

روی عن محمد انه صلی علی النبی بغیر امام وفی روایة فرادی لا یؤمهم احد یدخل المسلمون زمرا فیصلون علیه ویخرجون۔

(ماثبت من السنۃ صفحہ۱۲۰)

حضرت امام محمد سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کی نماز جنازہ بغیر امام کے پڑھی گئی اور ایک روایت میں ہے تنہا تنہا ہوئی کسی نے ان کی امامت نہیں کی مسلمانوں کے متفرق گروہ داخل ہوئے اور نماز پڑھتے اور حجرہ سے باہر آجاتے۔

یہی شیخ محقق مدارج النبوۃ میں فرماتے ہیں:

''اما نماز گزاردن بر آنحضرت ﷺ بجماعت نہ بود جماعۃ می درآمدند بروے ونماز گزاردند بے جماعت وبیرون می آمدند پس جماعت دیگری درآمدند ومی گزاردند ہمچنانکہ ترتیب صفوف است در جماعت وامامت نہ کرد بر جنازہ شریف رسول خدا وہیچ یکے۔ از امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ منقول است

کہ فرمودہ در جنازہ رسول ﷺ ہیچ کس امامت نہ کرد زیرا کہ آنحضرت علیہ السلام در حیات و ممات امام شماست و ایں از خواص آنحضرت علیہ السلام کہ نماز متعدد کردند و تنہا تنہا گذاردند و روایتے آمدہ اول کسے کہ نماز گذارد بروے اہل بیت وے بود۔ علی و عباس و بنو ہاشم پس ازاں در آمدند مہاجران بعد ازاں انصار پس تری در آمدند مردم فوج فوج و نمازی گذاردند۔ (مدارج النبوۃ کشوری جلد۲ صفحہ ۵۶۶)

لیکن آنحضرت ﷺ کی نماز جنازہ جماعت کے ساتھ نہیں ہوئی، ایک گروہ آتا اور بے جماعت کے نماز ان پر پڑھتا اور حجرہ سے باہر آجاتا پھر دوسرا گروہ آتا اور نماز پڑھتا رسول خدا ﷺ کے جنازہ پر کسی نے نہ امامت کی نہ جماعت کی صفوں کی ترتیب دی جیسا کہ صفوں کی ترتیب کا قاعدہ ہے ۔حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے جنازہ پر کسی نے اس لئے امامت نہیں کی کہ حضور اس حیات میں اور بعد وفات کے تمہارے امام ہیں اور آنحضرت ﷺ کے یہ خصوصیات سے ہے کہ آپ کی لوگوں نے بار بار نماز پڑھی اور تنہا تنہا سب نے ادا کی۔ اور ایک روایت میں آیا کہ حضور کی سب سے پہلے نماز پڑھنے والے آپ کے اہل بیت حضرت علی اور عباس اور بنی ہاشم تھے۔ ان کے بعد مہاجرین آئے۔ ان کے بعد انصار۔ اس کے بعد لوگ گروہ گروہ آتے اور نماز جنازہ پڑھتے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ بنا بر قول صحیح کے اور مسلک جمہور علماء اہل سنت کے حضور اکرم ﷺ کے جنازے پر نماز ہوئی، لیکن اس بات پر سب کا بلا اختلاف کے اتفاق و اجماع ہے کہ کسی نے اس نماز جنازہ کی امامت نہیں کی۔

الحاصل قائلین نماز جنازہ اگر ادھر جمہور علماء اہل سنت ہیں تو منکرین نماز جنازہ کا شمار بھی علمائے حق اور اہل سنت میں ہوتا ہے، یہ تو اس مسئلہ کی تحقیق تھی۔

اب باقی رہا سوال کے پیش کردہ امام کا قول تو اگر وہ امام بدعقیدہ وہابی دیوبندی وغیرہ نہیں ہے بلکہ خوش عقیدہ اہل سنت و جماعت ہے اور نماز جنازہ کا قائل بنا بر قول صحیح جمہور علماء کے اتباع میں کہتا ہے تو وہ امام نہ مورد الزام ہے نہ تنقیص کنندۂ رسول علیہ السلام ہے۔ لہٰذا اس کے پیچھے نماز پڑھنا بھی جائز ہے اور اس سے نکاح پڑھوانا بھی درست ہے۔

اور اگر وہ امام مذکور بدعقیدہ وہابی، دیوبندی، مودودی وغیرہ ہے جو ان اکابر علماء دیوبند کو مسلمان جانتا ہے جن کی شائع شدہ کتابوں کی کفری عبارات پر علماء حرمین شریفین۔ عرب و عجم۔ ہند و سند وغیرہ

نے فتاوی تکفیر یہ صادر فرمائے ہیں۔ نیز وہ امام اپنا پیشوا صاحب تقویۃ الایمان مولوی اسمٰعیل دہلوی کو مانتا ہے اور ان کے اتباع میں وہ حیات النبی کا ہی قائل نہیں اور یہ مانتا ہے کہ اجسام انبیاء کرام گلتے سڑتے ہیں ان کو زمیں کھالیتی ہے پھر تو اس نماز جنازہ کا قائل ہونا حضور ﷺ کے میت اور مردہ ہونے کی تائید میں ہو سکتا ہے تو پھر تو اس امام کا بدعقیدہ اور مخالف اہل سنت و جماعت ہونا ظاہر ہے تو اس صورت میں یہ امام ضرور مورد الزام بنا اور اپنی وہابیت کی بنا پر یقیناً تنقیص کنندۂ رسول علیہ السلام ثابت ہوا لہٰذا اہل سنت کو ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز و حرام ہے اور ایسے شخص سے نکاح پڑھوانا بھی ناجائز ہے۔

میں نے مدینہ طیبہ میں غیر مقلدین کے زبردست مناظر حافظ محمد پنجابی سے اسی مسئلہ حیات النبی پر مناظرہ کیا تھا۔ میں نے یہی دلائل اس کے سامنے پیش کئے تھے جو اوپر مسئلہ حیات انبیاء علیہم السلام میں مذکور ہوئے۔ بحمدہ تعالیٰ وہ مناظر ان کے جوابات سے عاجز و قاصر رہا، اس مناظرہ میں ہندوستان، پاکستان، حرمین، مصر، شام وغیرہ مقامات کے کافی علماء کرام شریک تھے، دو دن تک یہ مناظرہ ہوتا رہا، دوسرے دن اس غیر مقلد مناظر کو شکست فاش ہوئی، باطل کا منہ کالا ہوا، اور حق کا بول بالا ہوا۔ کشمیر کے وزیر مالیات جناب سرور وزیر محمد صاحب اور پاکستان کے افسر ملک عبدالرشید صاحب اس مناظرہ کے بانی تھے۔ انہوں نے فیصلہ میرے حق میں فتح و کامیابی کا دیا اور نذرانے پیش کئے۔ غیر مقلد مناظر نہایت ذلت کے ساتھ مناظرہ سے بھاگا۔ پھر مدینہ طیبہ میں چند فتح کے جلسہ ہوئے، مولیٰ تعالیٰ نے وہاں وہ عزت دی جو وہم و خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ اس وقت میں بیمار ہو کر اٹھا ہوں، کمزور ہوں، زائد محنت نہیں کر سکتا، اس لئے یہ مسئلہ زیادہ مفصل طور پر نہ لکھ سکا۔ لیکن پھر بھی منصف کے لئے نہایت وافی و کافی ہے، مولیٰ تعالیٰ مخالف و معاند کو حق قبول کرنے کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

۲۵ر ذی الحجہ ۷۶ ۱۳ھ

کتبہ : الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۲۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں کہ جزامی کی نماز جنازہ ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

جزامی جب مسلمان ہے تو اس کی نماز جنازہ اہل اسلام پر ضروری ہے کہ حدیث شریف میں ہے: "صلوا علی کل بر وفاجر" یعنی نماز جنازہ ہر ایک نیک وبد پر پڑھو۔ اور جزام منجملہ اور بیماریوں کے ایک بیماری ہے تو جس طرح اور بیماروں کی نماز جنازہ فرض کفایہ ہے اسی طرح جزامی کی نماز جنازہ ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۲۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں کہ
جزامی کو کفن دفن کیا جائے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اسی طرح جزامی کو کفن دینا اور دفن کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ بحیثیت مسلم حقوق مسلمین کا حقدار ہے" کماھو فی کتب الفقہ۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۲۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں کہ
جزامی کو شریعت وحدیث جدا کرتی ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جزامی سے عوام ضعیف اعتقاد والے اجتناب وپرہیز کر سکتے ہیں اور اہل صدق ویقین متوکلین اس سے کسی طرح کا اجتناب وپرہیز نہیں کرتے، یہاں تک کہ حدیث شریف میں ہے:

ان رسول اللہ ﷺ اخذ بید مجزوم فوضعها معه فی القصعة وقال کل ثقة باللہ

وتوکلا علیہ۔ (مشکوۃ شریف: ص ۳۹۲)

یعنی حضور اکرم ﷺ نے جزامی کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے ساتھ کھانے کے پیالے میں رکھ دیا اور حکم دیا کہ کھا میں تو اپنے خدا پر اعتقاد وتوکل کرتا ہوں۔

اس حدیث شریف سے ظاہر ہو گیا کہ جزامی سے جب ساتھ کھانے میں بھی پرہیز نہیں کیا گیا تو پھر اور کس چیز میں پرہیز کیا جائے گا۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۲۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں کہ
جزامی کو سلام وکلام اور اس سے ہم کلام ہونا صحیح ہے یا نہیں؟۔

الجواب

جزامی سے سلام وکلام میں پرہیز کرنے کی کسی کو اجازت نہیں کہ وہ بحیثیت مسلم تمام حقوق مسلمین کا حقدار ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب ۱۲ ربیع الآخر ۷۱ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل



باب تلقین المیت وسوالات النکیرین

مسئلہ (۵۳۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ
بعد دفن کے میت کو تلقین کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو اس کا کیا طریقہ ہے؟ اس کا جواب احادیث وکتب فقہ سے تحریر فرمایئے!۔

اس سوال کے جواب میں ایک مولوی صاحب یہ جواب لکھتے ہیں کہ فتاوی عالمگیری میں ہے" ویستحب اذا دفن المیت ان یجلسوا ساعۃ عند القبر بعد الفراغ بقدر ما ینحر جزرو یقسم لحمہا یتلون القرآن ویدعون للمیت کذا فی الجوہرۃ النیرۃ" یعنی میت کے دفن کرنے کے بعد مستحب ہے کہ کچھ لوگ ایک ساعت قبر کے پاس بیٹھے رہیں اندازاً اتنی دیر کہ جس میں ایک اونٹ ذبح کیا جائے اور اس کا گوشت تقسیم کر دیا جائے اور یہ لوگ قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہیں اور میت کے لئے دعائے مغفرت وغیرہ کرتے رہیں۔ کتبہ سعید احمد اسرائیلی

دوسرے مولوی صاحب اس کے جواب میں یوں لکھتے ہیں کہ حالت نزع میں قبل غرغرہ کے تلقین بالشہادتین کرنا بالاجماع مستحب ہے، اور تلقین بعد الموت کو بعضے علمائے متاخرین نے جائز کہا ہے، لیکن ظاہر الروایۃ میں تلقین کرنے کو نا جائز کہا ہے۔ اور ظاہر الروایۃ کے مقابلہ میں بعض علمائے متاخرین کے قول کا بقاعدۂ رسم المفتی کچھ اعتبار نہیں، وہ قول ضعیف ہے اور قول ضعیف پر عمل نا جائز۔

عالمگیری صفحہ ۱۰۰ جلد اول " واما التلقین بعد الموت فلا تلقن عندنا فی ظاہر الروایۃ کذا فی العینی شرح ہدایہ ومعراج الدرایہ۔

درمختار۔ ولا یلقن بعد تلحیدہ ۔

شامی۔ فولہ ولا یلقن بعد تلحیدہ ذکر فی المعراج انہ ظاہر الروایۃ "

اور برہان الدین حلبی نے کبیری میں اس قول کو لفظ "قیل" کے ساتھ بیان کیا ہے جو ضعف پر دال ہے" وہو ہذا واما التلقین بعد الدفن فقیل یفعل لحقیقۃ ما روینا ۔ وقیل یومر بہ ولا ینہی

عنہ کذا ذکر ابن الہمام "
اور جمہور علماء نے حدیث تلقین کو معنی مجاز پر محمول کیا ہے۔ یعنی قریب موت کے تلقین کی جائے اور یہی مذہب جمہور ہے۔

کبیری" والذی علیہ الجمہور ان المراد من الحدیث مجازۃ کما ذکرنا " اور صاحب ہدایہ نے بھی اس حدیث کو اسی معنی پر محمول کیا ہے "ولقن الشہادتین لقولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم: لقنوا موتاکم شہادۃ ان لا الہ الا اللہ۔ والمرا دالذی قرب عن الموت ۔ اور اہل متون اور اکثر شراح نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے اور قول جمہور کے مقابلہ میں اس قول کا کچھ اعتبار نہیں" لقولہ علیہ السلام: وعلیکم بالجماعۃ والعامۃ رواہ احمد عن معاذبن جبل۔
(مشکوۃ المصابیح)

اس تلقین کا ثبوت کسی حدیث سے نہیں اور اس کا التزام بدعت سے خالی نہیں اور بدعت کے موجد کے بارے میں یہ فرمایا گیا ہے:
عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت: قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم :من احدث فی امرنا ہذا ما لیس منہ فہو رد متفق علیہ " (مشکوۃ) واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب وعندنا ام الکتاب ۔ حررہ کریم محشر غفرلہ درس اول اشرع سنبھل مورخہ ۱۴؍شعبان المعظم ۱۳۴۵ھ

اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ یہ دونوں جواب صحیح ہیں یا نہیں؟ اگر غلط ہیں تو اس کا صحیح جواب کیا ہے؟ اس مسئلہ کا جواب مفصل طریقہ سے نہایت مدلل تحریر کیا جائے۔ بینوا وتوجروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

تلقین بعد الدفن جائز ہے، علماء اس کے فرض یا واجب یا سنت ہونے کے مدعی نہیں، ہاں اس کی اباحت کے ضرور قائل ہیں اور مدعی اباحت کو کسی دلیل کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اظہار حق مقصود ہے اس وجہ سے چند تائیدات پیش کی جاتی ہیں۔ منصف کے لئے ان شاء اللہ یہی بہت کافی ہیں۔

حدیث : حیات الموات میں طبرانی معجم کبیر وکتاب الدعا وکتاب الاحکام وکتاب اتباع الاموات وکتاب الشافی وصایۃ العلماء عند الموت وکتاب ذکر الموت وغیرہا سے ناقل ہیں، ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

اذا مات احد من اخوانكم فسويتم التراب عليه فليقم احد كم على راس قبره ثم ليقل: يا فلان ابن فلانة! فانه يسمعه ولا يجيب ثم يقول :يا فلان بن فلانة! فانه يستوى قاعدا ثم يقول: يا فلان بن فلانة! فانه يقول: ارشد نا رحمك الله ولكن لا تشعرون فليقل: اذ كر ما خرجت عليه من الدنيا شهادة ان لا اله الا الله وان محمدا عبده ورسوله وانك رضيت بالله ربا وبالاسلام دينا وبمحمد نبيا وبالقرآن اماما فان منكر او نكير ايا خذ كل واحد منهما بيد صاحبه ويقول انطلق بنا ما نقعد عند من لقن حجته الخ ۔

یعنی جب تمہارا کوئی مسلمان بھائی مرے اور اس کی قبر پر مٹی برابر کر چکو تو تم میں کوئی اس کے سرھانے کھڑا ہو اور فلاں ابن فلاں کہہ کر پکارے، کہ بیشک وہ سنے گا اور جواب نہ دے گا۔ ہمیں ارشاد کر اللہ تجھ پر رحم کرے۔ مگر تمہیں اس کے جواب کی خبر نہیں ہوتی، اس وقت کہے یاد کر وہ بات جس پر تو دنیا سے نکلا تھا۔ گواہی اس کی کہ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اور یہ کہ تو نے پسند کیا اللہ تعالیٰ کو پروردگار اور اسلام کو دین اور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نبی اور قرآن کو پیشوا۔ منکر نکیر ہر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کہیں گے چلو ہم کیا بیٹھیں اس کے پاس جسے لوگ اس کی حجت سکھا چکے۔

تنبیہ: امام ابن صلاح وغیرہ محدثین اس حدیث کی نسبت فرماتے ہیں:

اعتضد بشواهد وبعمل اهل الشام قديما۔

یعنی اسے دو وجہ سے قوت ہے۔ ایک حدیثیں اس کی تائید کرنے والی۔ دوسرے زمانہ سلف سے علمائے شام اس پر عمل کرتے آئے (اس کو علامہ ابن امیر الحاج نے حلیہ میں نقل کیا)

علامہ ابن حجر مکی کی شرح مشکوۃ میں ہے:

اعتضد بشواهد يرتقى بها الى درجة الحسن۔

یعنی یہ حدیث بوجہ شواہد کے درجہ حسن تک ترقی کر گئی۔

اثر: جو باعتبار راویوں کے اور دو کو شامل ہیں اسی میں سنن امام سعید بن منصور (جو امام مالک کے شاگرد اور امام احمد کے استاذ ہیں) سے ناقل ہیں کہ راشد بن سعد و ضمرہ بن حبیب و حکم بن عمیر سے راوی ان سب نے فرمایا:

اذا سوى على الميت قبره وانصرف الناس عنه كان يستحب ان يقال للميت عند

قبره يا فلان قل لا اله الا الله ثلث مرات يا فلان قل ربي الله وديني الاسلام ونبيي محمد صلى الله تعالىٰ عليه وسلم "

یعنی جب میت پر مٹی دے کر قبر درست کر کے پھر اور لوگ واپس جائیں تو مستحب سمجھا جاتا تھا کہ مردے سے اس کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر کہا جائے اے فلاں کہہ لا الہ الا اللہ تین بار۔ اے فلاں کہہ میرا رب اللہ ہے اور میرا دین اسلام اور میرے نبی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔

درمختار میں ہے:

يكفي قوله يا فلان ابن فلان ! اذكر ما كنت عليه وقل رضيت بالله ربا وبالاسلام دينا وبمحمد نبيا قيل يا رسول الله فان لم يعرف اسمه قال ينسب الى آدم وحواء

غایۃ الاوطار میں اسی فرقہ وہابیہ کے پیشوا مولوی محمد احسن نانوتوی اس عبارت کا ترجمہ لکھتے ہیں:

اور کافی ہے یہ کہنا تلقین کرنے والے کا اس طرح کہ تلقین کرنے والا اس طرح کہے: اے فلاں اے فلاں کے بیٹے! یاد کر ان باتوں کو جن پر تو تھا یعنی اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان کو یاد کر۔ اور جب فرشتے سوال کریں تو یوں کہنا کہ میں راضی ہوں اس سے کہ اللہ میرا رب اور اسلام میرا دین اور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نبی ہیں۔ کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم! اگر مردے کا نام معلوم نہ ہو۔ آپ نے فرمایا کہ منسوب کیا جائے آدم اور حوا علیہما السلام کی طرف یعنی اگر مرد ہو تو یوں کہنا چاہئے اے آدم کے بیٹے اور عورت ہو تو یوں کہے اے حوا کی بیٹی۔

اسی درمختار میں جوہرہ نیرہ سے ناقل ہیں: انه مشروع عند اهل السنة

یہی مولوی محمد احسن اس کا ترجمہ لکھتے ہیں:

تلقین مشروع ہے اہل سنت کے نزدیک۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ مردہ کو قبر میں زندہ کرتا ہے۔ چنانچہ احادیث میں وارد ہے ایسے ہی طحطاوی میں ہے۔

اسی درمختار میں ہے: ان فعل لا ينهى عنه

مولانا مذکور اس کا ترجمہ لکھتے ہیں۔ اگر کوئی تلقین کرے تو منع نہ کیا جائے کیونکہ حدیث میں آیا ہے لقنوا موتاکم۔ یعنی تلقین کروا اپنے مردوں کو۔

تو بعض محققین نے اس حدیث میں معنی حقیقی مراد لے کر تلقین بعد موت کی جائز رکھی ہے

غایۃ الاوطار میں ہے: یہی مولوی محمد احسن نانوتوی لکھتے ہیں: فتح القدیر میں بعد کلام طویل کے

کہا کہ تلقین بعد دفن سے کچھ ضرر نہیں بلکہ اس سے فائدہ ہے کہ مردوں کو ذکر سے انس ہوتا ہے چنانچہ آثار میں وارد ہے۔

نور الایضاح مطبوعہ دیوبند میں ہے: تلقینه فی القبر مشروع ۔

یعنی مردہ کو قبر میں تلقین کرنا مشروع ہے:۔

بنایہ شرح ہدایہ میں ہے: کیف لا یفعل وقد روی عنه علیه الصلوة والسلام انه امر بالتلقین بعد الدفن۔

یعنی تلقین کیونکر نہ کی جائے گی حالانکہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی ہوا حضور نے بعد دفن تلقین کا حکم دیا۔

بنایہ میں ہے کہ امام شمس الائمہ حلوائی نے فرمایا: لا یومر به ولا ینهی عنه۔

یعنی نہ تلقین کا حکم دیں نہ اس سے منع کریں۔

حلیہ میں اسے نقل کر کے فرمایا: ظاهره انه یباح۔

یعنی اس قول سے ظاہر اباحت ہے۔

صاحب عباب فرماتے ہیں: انی سمعت استاذی قاضی خان یحکی عن الامام ظهیر الدین انه لقن بعض الائمة واوصانی بتلقینه فلقنته فیجوز۔

یعنی میں نے اپنے استاذ قاضی خاں کو سنا کہ امام اجل ظہیر الدین کبیر مرغینانی سے حکایت فرماتے تھے کہ بعض ائمہ نے تلقین فرمائی اور مجھے اپنی تلقین کرنے کی وصیت کی کہ میں نے انھیں تلقین کی پس جواز ہوا۔ اسی کو شارح نقایہ اور صاحب حقائق نے نقل کیا۔ مضمرات میں ہے۔

نحن نعمل بهما عند الموت وعند الدفن۔

یعنی ہم دونوں تلقینوں پر عمل کرتے ہیں۔ وقت نزع بھی اور وقت دفن بھی۔ اس کو نقل کیا عالمگیری نے۔

علامہ طحطاوی حاشیہ درمختار میں "کتاب التجنیس والمزید" سے ناقل ہیں۔

التلقین بعد الموت فعله بعض مشائخنا۔

یعنی ہمارے بعض مشائخ نے موت کے بعد تلقین فرمائی۔

جامع الرموز میں جواہر سے منقول: سئل القاضی مجد الکرمانی عنه قال ماراٰه

المسلمون حسنا فهو عند الله حسن وروی فی ذالك حدیثین۔

یعنی قاضی مجد کرمانی سے در بارہ تلقین سوال ہوا۔ فرمایا: جو بات مسلمان اچھی سمجھیں خدا کے نزدیک بھی اچھی ہے۔ اور اس بارے میں دو حدیثیں روایت کیں۔

طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح میں علامہ حلبی سے منقول ہے؛

کیف لا یفعل مع انه لاضرر فیه بل فیه نفع للمیت

یعنی تلقین کیونکر نہ کی جائیگی حالانکہ اس میں کوئی نقصان نہیں بلکہ میت کے لئے فائدہ ہے۔

کشف الغطا میں ہے: بالجملہ بمقتضائے مذہب اہل سنت و جماعت تلقین مناسب۔

پھر امام صفار کا ارشاد۔ سزاوار آنست کہ تلقین کردہ شود میت بر مذہب امام اعظم وہر کہ تلقین نمی کند نمی گویند بآن پس او بر مذہب اعتزال است کہ گویند کہ میت جماد محض است وروح در قبر معاد نمی شود۔

یعنی مذہب اہل سنت و جماعت کے اعتبار سے تلقین مناسب ہے اور بنا بر مذہب امام اعظم ابوحنیفہ کے لائق ہے کہ مردہ تلقین کیا جائے اور جو تلقین کو نہیں کہتا اور نہیں کرتا ہے وہ بنا بر مذہب معتزلہ ہے کہ معتزلہ کا یہ خیال ہے کہ مردہ بالکل پتھر ہے اور قبر میں روح لوٹائی نہیں جاتی۔

امام حاکم شہید نے **کافی** اور امام خبازی نے **خبازیہ** میں امام زاہد صفار سے نقل کیا۔

ان هذا (ای منع التلقین) علی مذهب المعتزله لان الاحیاء بعد الموت عندهم مستحیل اما عنداهل السنة فالحدیث ای لقنوا موتاکم لا اله الا الله محمول علی حقیقة لان اللّٰه تعالیٰ یحییه علی ما جاء ت به الاثار وقد روی عنه علیه الصلوة والسلام انه امره بالتلقین بعد الدفن۔

یعنی بیشک یہ یعنی تلقین کا منع کرنا مذہب معتزلہ پر ہے۔ اس لئے کہ بعد موت کے ان کے نزدیک زندہ ہونا محال ہے۔ لیکن مذہب اہل سنت کے نزدیک پس یہ حدیث یعنی تلقین کرو اپنے مردوں کو لا الہ الا اللہ کے ساتھ اپنی حقیقت پر حمل کی گئی ہے اور بیشک حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے تلقین کرنے کا بعد دفن کے حکم فرمایا۔ نقل کیا اس کو شامی میں معراج الدرایہ سے۔

بالآخر حوالے لو تو بہت سے نقل کئے جاتے۔ لیکن طوالت کے سبب سے اتنے ہی پر اکتفا کیا گیا اور واقعی منصف کے لئے یہی کافی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہونا موقع کے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جن جن علمائے کرام نے اس مسئلہ کی صراحت فرمائی ہے ان کے اسمائے گرامی شمار کرائے جائیں۔

(۱) تمام علماء کے سردار تمام مخلوق کے آقا سید عالم نور مجسم فخر نبی آدم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

(۲) حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ صحابی (۳) راشد ابن سعد تابعی (۴) ضمرہ بن حبیب تابعی (۵) حکیم بن عمر تابعی (۶) امام سعید بن منصور محدث (۷) امام احمد (۸) امام نقاد الحدیث ضیائی مقدسی (۹) امام بن حجر عسقلانی (۱۰) امام شمس الائمہ سخاوی (۱۱) امام ابوبکر ابن العربی (۱۲) علامہ ابن حجر مکی (۱۳) محمد طاہر احمد آبادی صاحب مجمع بحار الانوار (۱۴) ابن مندہ (۱۵) ابراہیم حربی (۱۶) ابوبکر غلام الظلال (۱۷) ابن رہبرہ (۱۸) ابن شاہین (۱۹) امام ابن صلاح (۲۰) علامہ امیر الحاج (۲۱) امام سیوطی (۲۲) امام زاہد صفار (۲۳) امام حاکم شہید (۲۴) امام خبازی (۲۵) ابن عابدین شامی صاحب ردالمحتار (۲۶) صاحب معراج الدرایہ (۲۷) محمد علاء الدین حصکفی صاحب درمختار (۲۸) امام ابوبکر بن محمد بن علی صاحب جوہرہ نیرہ (۲۹) شمس الائمہ حلوائی (۳۰) صاحب بنایہ (۳۱) صاحب عباب (۳۲) امام ظہیر الدین صاحب شرح نقایہ (۳۴) محمد بن محمد صاحب حقائق (۳۵) یوسف بن عمر صاحب مضمرات (۳۶) علامہ حسن بن عمار شرنبلالی صاحب نور الایضاح (۳۷) علامہ طحطاوی (۳۸) امام شیخ الاسلام علی بن ابی بکر برہان الدین فرغانی صاحب التجنیس (۳۹) قاضی مجد کرمانی صاحب جامع الرموز (۴۰) علامہ حلبی (۴۱) فاضل شیخ الاسلام دہلوی صاحب کشف الغطار رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

یہ ان علمائے کرام کے اسمائے گرامی ہیں جن کے اقوال میرے پیش نظر ہیں۔ اتنی تصریحات کے ہوتے ہوئے اب کسی شخص کو بھی گفتگو کی گنجائش باقی نہیں رہی اور جوابات مندرجہ فی السوال کے رد وابطال کی بھی اصلا ضرورت نہ رہی لیکن مزید بران سرسری نظر ڈال کر اول جوابات کی حقیقت سے آگاہ کر دیا جاتا ہے۔

اقول وباللہ التوفیق: مولوی سعید احمد صاحب مجیب اول نے تو اپنے جواب میں تلقین بعد الدفن کا جواب ہی نہیں دیا۔ نہ معلوم مولوی صاحب ایسے ہی سوال سے غیر متعلق جواب دیا کرتے ہیں، یا سوال ہی کو نہ سمجھے، یا سوال تو سمجھے مگر اس کا جواب دینا دشوار سمجھا، یا ان کو اپنے مقصد کے موافق تصریحات نہ مل سکیں، یا ان کا اظہار غیر مناسب سمجھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جواب سے پہلوتہی اختیار کی۔ لہذا ان کی تحریر سے تلقین بعد دفن کا کوئی حکم ہی نہیں معلوم ہوا باوجودیکہ جس عبارت کو عالمگیری سے نقل کر کے لائے اس کے متصل تلقین کی بحث موجود تھی جیسا کہ ہم نے اس کو پیش کر دیا۔ الغرض مولوی صاحب کا فتوی تلقین بعد الدفن کو ناجائز و بدعت ثابت نہیں کرتا ہے۔

مجیب دوم مولوی کریم بخش صاحب کے کل فتوے کا رد ہی مختصر طریقہ سے پیش کیا جاتا ہے۔

لہذا وہ کہتے ہیں:

حالت نزع میں قبل غرغرہ کے تلقین بالشہادتین کرنا بالاجماع مستحب ہے۔

اس عبارت میں مجیب نے جو فرمایا وہ اپنے محل پر بالکل درست ہے لیکن یہ اجماع تلقین بعد الدفن پر کیا اثر ڈال سکتا ہے۔ ہاں جب تلقین نہ کرکے ثبوت کا حصر لقنوا موتاکم الحدیث کے ساتھ ثابت کردیں تو کچھ ان کے مقصد کے لئے مفید بن جائے گی۔ یعنی تلقین بعد الدفن کا اس حدیث کے سوا کسی دوسری حدیث یا کسی قول صحابی وتابعی سے فقہاء نے جواز مستنبط نہیں کیا اور حدیث مذکور کے حقیقی معنی لینے پر کوئی تائید کسی دوسری حدیث یا قول صحابی سے نہیں ملتی ہے۔ مجیب صاحب اس مقدمہ کے لئے عرق ریزی کریں اور جب یہ امر بھی ثابت نہ کرسکیں تو پھر باقی تقریر لا حاصل ٹھہرتی ہے۔ پھر کہتے ہیں۔

اور تلقین بعد الموت کو بعضے علمائے متاخرین نے جائز کہا ہے۔

افسوس کہ مجیب صاحب نے نہ اس کے لئے کوئی عبارت پیش کی نہ ان علمائے متاخرین کے اسمائے گرامی ظاہر کئے کہ وہ فلاں طبقہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اپنی بات کی پچ کرتے ہوئے چلے جارہے ہیں۔ باوجودیکہ علمائے متاخرین ہی کیا بلکہ متقدمین بلکہ خود امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بلکہ تابعین اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے اقوال ہم سے سن چکے۔ کہ ۲۲ کتب فقہ سے اس کا جواز اور ۴۵ رفقہائے عظام اس کے قائل ہیں۔ پھر اس پر مجیب کے یہ الفاظ۔

بعضے علمائے متاخرین نے جائز کہا ہے۔

کہاں تک صحیح ہیں۔ دیکھو اسے کہتے ہیں دن کو رات بنانا۔ پھر لکھتے ہیں:

لیکن ظاہر الروایت میں تلقین کرنے کو ناجائز کہا ہے اور ظاہر الروایت کے مقابلہ میں بعض علمائے متاخرین کے قول کا بقاعدہ رسم المفتی کچھ اعتبار نہیں وہ قول ضعیف ہے اور قول ضعیف پر عمل ناجائز

اتنا تو صحیح ہے کہ مسئلہ میں اختلاف ہے لیکن مختلف فیہ کے لئے یہ کلیہ نہیں۔ چنانچہ بعضے وہ مسائل ہیں کہ ظاہر الروایت میں صراحۃ موجود لیکن علمائے متاخرین نے اس کا خلاف کیا اور فتوی ظاہر الروایت کے ہوتے ہوئے قول متاخرین پر دیا گیا۔ جن میں اجرت علی تعلیم القرآن تو بہت ہی زیادہ مشہور ہے رہی تلقین بعد الدفن تو اس میں متاخرین ہی کیا بلکہ متقدمین کے اقوال بلکہ کشف الغطا سے خود امام صاحب کا مذہب سن چکے۔ لہذا یہ قاعدہ اس پر کس طرح منطبق ہوا؟ علاوہ بریں ذرا پہلے اپنے عمائدین

کے کلام تو ملاحظہ کیجئے۔ چنانچہ مولوی محمد احسن نانوتوی کے اقوال ہم نے متعدد مقامات سے نقل کئے کہ انھوں نے غایۃ الاوطار میں تلقین بعد الدفن پر نہایت محققانہ تقریر کے بعد اس کو جائز رکھا اور آپ کے بڑے پیشوا مولوی رشید احمد گنگوہی نے تو آپ کی اس ساری عمارت کا قلع قمع ہی کر دیا۔

فتاوی رشیدیہ جلد اول کے صفحہ ۳۷ میں ہے۔

سوال: سماع موتی ثابت ہے یا نہیں؟ درصورت جواز یا عدم جواز قول راجح کیا ہے اور تلقین بعد دفن ثابت ہے یا نہیں فقط۔

الجواب: یہ مسئلہ عہد صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مختلف فیہا ہے۔ اس کا فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ تلقین کرنا بعد دفن کے اس پر ہی مبنی ہے جس پر عمل کرے درست ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

مجیب صاحب نہایت ہی حیرتناک بات ہے کہ جب آپ کے ایسے سرگروہ ہی اس کا فیصلہ اور راجح قول نہ بتا سکے اور آخر انھیں کہنا ہی پڑا کہ جس پر عمل کرے درست ہے۔ تو جناب کیا ان سے علم وفضل میں زیادہ ہیں اور کیا ان کو اس قاعدہ کی خبر نہیں تھی اور کیا ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ جواز تلقین بعض متاخرین کا قول ہے۔ اور ظاہر الروایت کے مقابلہ میں بعض علماء متاخرین کے قول کا بقاعدہ رسم المفتی کچھ اعتبار نہیں وہ قول ضعیف ہے اور قول ضعیف پر عمل ناجائز۔ تو نہایت ہی تعجب ہے کہ آپ تو عمل ناجائز کہیں اور آپ کے قبلہ وکعبہ درست بتائیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ خودغرضی ایسی ہی ان کہی کہلوا دیتی ہے۔ پھر اپنے مدعی پر ثبوت پیش کرتے ہیں۔

عالمگیری صفحہ ۱۰۰ جلد اول: واما التلقين بعد الموت فلا تلقن عندنا في ظاهر الرواية كذا في العيني شرح هدايه ومعراج الدرايه۔

اولاً: اس عبارت میں نفی اباحت کی ہونا یقینی نہیں۔ چونکہ اباحت کی اکثر کتب فقہ میں نہایت شدومد کے ساتھ تصریح ہے۔

ثانیاً: اسی عالمگیری میں اسی عبارت کے متصل مضمرات سے منقول ہے۔

ونحن نعمل بهما عندالموت وعند الدفن كذا في المضمرات۔

یعنی ہم دونوں پر عمل کرتے ہیں موت کے وقت بھی اور دفن کے وقت بھی۔

ثالثاً: آپ کی شان سے یہ بہت بعید ہے کہ جو عبارت آپ کے مدعی کے موافق ملی اس کو آپ

نے نقل کر دیا اور جو آپ کے مقصد کے خلاف تھی اس سے آپ نے چشم پوشی کر لی۔ مجیب صاحب کیا اسی کو دیانت کہتے ہیں؟ اور کیا مذہب کے مفتی کے یہی شان ہونی چاہئے اور ایک منصف آپ کے متعلق کیا رائے قائم کریگا؟ پھر اتنے ہی پر اکتفا نہیں اس سے زیادہ اور دیانت ملاحظہ ہو۔

درمختار: ولا يلقن بعد تلحيده۔

اولاً: یہ عبارت درمختار کی نہیں بلکہ تنویر الابصار کی ہے۔

ثانیاً: اپنی خود مطلبی سے اس کی تفصیل کو چھوڑ دیا مسئلہ کی پوری عبارت یہ ہے۔

ولا يلقن بعد تلحيده وان فعل لا ينهى عنه۔

یعنی بعد دفن کے تلقین نہ کی جائے اور اگر کی جائے تو روکا نہ جائے۔ لہٰذا ایک تھوڑی عقل والا بھی جان لے گا کہ ایسی قطع وبرید کاٹ چھانٹ آخر کوئی مجبوری کرا رہی ہے۔ اور واقعی زبان کی پاسداری اپنی بات کی پچ برابر ایسی ہی ذلیل باتوں تک پہنچا دیتی ہے۔

پھر کہتے ہیں:

شامی: في قوله ولا يلقن بعد تلحيده ذكر في المعراج انه ظاهر الرواية۔

اولاً: عبارت شامی میں بھی اپنی ایسی ہی دیانت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ چنانچہ شامی کی کئی عبارتیں جواز تلقین میں نقل ہوئیں۔

ثانیاً: ظاہر الروایت کی روایت کا چند کتابوں سے نقل کرنا جواز تلقین مذکور کو باطل نہیں کر دے گا۔

ثالثاً: جب صاحب معراج نے منع تلقین کو مذہب معتزلہ اور تلقین کو مذہب اہل سنت ٹھہرا کر حدیث "لقنوا امواتاکم" کو حقیقت پر محمول کیا۔ اور نیز یہ روایت کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تلقین بعد الدفن کا حکم فرمایا پیش کی۔ جس کو اسی شامی نے نقل کیا تو پھر یہ معراج آپ کو کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔

رابعاً: شامی میں جب ایسی تصریحات بھی موجود ہیں تو ان کو چھوڑتے ہوئے اپنے مقصد کے چند الفاظ اٹھا لینا مجیب کی کتنی بڑی صداقت اور راست گوئی کی دلیل ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی ناحق کے درپے ہوتا ہے تو اس کو اسی طرح کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں اور وہ ایسے ہی عبارتوں میں کتر بیونت کرنے کے لئے مضطر ہو جاتا ہے۔ پھر مجیب کی مایوسی یہاں تک پہنچتی ہے کہ نہایت سنبھل سنبھل کر لکھتے ہیں۔

اور برہان الدین حلبی نے کبیری میں اس قول کو لفظ قیل کے ساتھ بیان کیا ہے جو ضعف پر دال

ہے" وھو ھذا واما التلقین بعدالدفن فقیل یفعل لحقیقة ما روینا وقیل یومر بہ ولا ینھی عنہ
کذا ذکرہ ابن الھمام۔

اولا: یہ قاعدہ مجیب ہی کے لئے وبال جان بن جائے گا کہ جب لفظ قیـــل ضعف پر دال ہے تو
آپ کا مزعومہ مذہب جمہور یہ بھی اسی قاعدہ سے ضعیف ہوگا۔ چنانچہ دیوبند کی مطبوعہ نور الایضاح میں ہے

وتلقینہ فی القبر مشروع وقیل لا یلقن۔

ملاحظہ ہو کہ لفظ قیـل سے جناب ہی کے مذہب کو بیان کیا گیا اور لفظ قیـل ضعف پر دال تھا لہذا
جناب کا مذہب ضعیف انہی کی زبان سے ہوگیا۔ اب مجیب صاحب کہیے اقبالی ڈگری ہوئی یا نہیں۔

ثانیا: جب دیگر کتب فقہ میں اس کو بغیر قیل بھی بیان کیا ہے تو کیا فقط کبیری کا لفظ قیل سے بیان
کرنا اس کو ضعیف کردے گا۔

ثالثا: آپ ہی کے پیشوا مولوی محمد احسن نانوتوی غایۃ الاوطار میں لکھتے ہیں:

فتح القدیر میں بعد کلام طویل کے کہا کہ تلقین بعد الدفن سے کچھ ضرر نہیں۔ بلکہ اس سے فائدہ
ہے کہ مردوں کو ذکر سے انس ہوتا ہے چنانچہ آثار میں وارد ہے۔

تو کیا انھوں نے ابن ہمام کے کلام کو نہیں سمجھا۔ پھر مجیب لکھتے ہیں۔

اور جمہور علماء نے حدیث تلقین کو معنی مجازی پر محمول کیا ہے۔ یعنی قریب موت کے تلقین کی جائے
اور یہی مذہب جمہور ہے۔

کبیری: والذی علیہ الجمھور ان المراد من الحدیث مجازہ کما ذکر۔

اولا عبارت میں قطع و برید کردینا تو جناب کا قدیمی شیوہ ہے۔

چنانچہ اسی کبیری کی پوری عبارت پیش کرتا ہوں۔

والذی علیہ الجمھور ان المراد من الحدیث مجازہ کما ذکرنا حتی من استحب
التلقین بعدا لموت لم یستدل بہ الاعلیٰ تلقینہ عند الاحتضار مع انھم قائلون بجواز الجمع
بین الحقیقة والمجاز۔

یعنی وہ جس پر جمہور ہیں کہ تحقیق حدیث سے مراد معنی مجازی ہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا۔ اور
جس نے تلقین بعد الموت کو مستحب جانا وہ اس سے دلیل نہیں لایا مگر قبل الموت پر۔ باجودیکہ جمع بین
الحقیقة والمجاز کے جواز کے قائل ہیں۔

ثانیا: جمہور کا حدیث کے معنی مجازی کو متعین کرلینا تلقین بعد الدفن کو تو باطل نہیں کرتا اس لئے کہ
تلقین مذکور کو مستحب کہنے والے اس حدیث کو کب استدلال میں پیش کرتے ہیں باجودیکہ اگر پیش کرتے
تو کوئی استحالہ بھی لازم نہیں آتا۔

ثالثا: جب تلقین قبل الموت پر جمہور کا اتفاق کرنا تلقین بعد الدفن کو ناجائز کردیتا ہے پھر فقہاء کی (
جن میں ہر طبقہ کے افراد ہیں) تلقین بعد الدفن کی اباحت پر تصریحات کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔

رابعا: آپ کی اس پیش کردہ کبیری میں اسی عبارت کے متصل یہ تصریح ہے۔

وانما لا ینھی عن التلقین بعد الدفن لا ضرر فیہ بل فیہ نفع فان المیت یستانس
بالذکر علی ما ورد فی الآثار۔

یعنی تلقین بعد الدفن سے منع نہ کیا جائے کہ اس میں کوئی نقصان نہیں بلکہ اس میں نفع ہے کہ مردہ کو
ذکر سے انس ہوتا ہے چنانچہ آثار میں وارد ہے۔

تو کیا آپ کے قطع و برید کرنے سے یا مسئلہ کو چھپانے سے حق مسئلہ کا اظہار نہیں ہوگا اور پھر بعد
اظہار کے ہر ذی عقل جناب کے متعلق کیا رائے قائم کرے گا۔ پھر مجیب یہی مضمون ہدایہ سے نقل کرتے
ہیں۔

اور صاحب ہدایہ نے بھی اس حدیث کو اسی معنی پر محمول کیا ہے" ولقن الشھادتین لقولہ صلی
اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم لقنو موتاکم شھادة ان لا الہ الا اللّٰہ والمراد الذی قرب عن الموت
"اور اہل متون اور اکثر شراح نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

صاحب ہدایہ نے جب ہدایہ میں تلقین بعد الدفن کی بحث ہی نہیں کی تو ان کا کلام آپ کے لئے
کچھ مفید نہیں ہوسکتا۔ اور صرف حدیث مذکور کے معنی مجازی نقل کرنا ہمارے مسئلہ تلقین پر کچھ اثر نہیں ڈال
سکتا۔ اور پھر ان کا تصریح نہ کرنا اسی امر کی بھی دلیل نہیں ہوسکتی کہ وہ اس کے قائل نہیں تھے۔ لہذا ان کا
کلام یا دیگر اہل متون وشراح کا قول ہمارے خلاف نہیں۔ جبکہ ابھی تقریر بالا سے ظاہر ہوچکا تو اب مجیب
کا یہ نتیجہ نکالنا

اور قول جمہور کے مقابلہ میں اس قول کا کچھ اعتبار نہیں "لقولہ علیہ السلام وعلیکم
بالجماعہ والعامہ رواہ احمد عن معاذبن جبل" (مشکوۃ المصابیح)۔

کیسی اپنی خود مطلبی کی دلیل ہے۔

اولا: اگر یہ حدیث تلقین بعد الدفن کے ثبوت میں پیش کی جائے تو اس میں کیا نقصان ہے باوجودیکہ جمع بین الحقیقۃ والمجاز کا قول موجود ہے۔ جیسا کہ ابھی کبیری سے سن چکے۔

ثانیا: اسی کبیری سے معلوم ہوا کہ تلقین مذکور کے مجوزین اس حدیث کو استدلال میں ہی جب پیش نہیں کرتے تو پھر مقابلہ کیسے ہوا۔

ثالثا: جواز جمع بین الحقیقۃ والمجاز کی صورت میں کیا ایک قول ایسا غیر معتبر ہوسکتا ہے کہ وہ اس حدیث کا مصداق ہو جائے۔

رابعا: جب (۴۰) فقہائے عظام اس کی اباحت کے قائل ہوں تو اس حدیث کا چسپاں کرنا معصیت ہے یا نہیں؟ پھر مجیب کی مزید بے باکی ملاحظہ ہو۔

اس تلقین کا ثبوت کسی حدیث سے نہیں۔

اولا: کبیری سے معلوم ہوا کہ مجوزین تلقین اس کا ثبوت احادیث سے پیش کرتے ہیں اور مصنف کے لئے علی ما ورد فی الآثار کے الفاظ ہی بہت کافی ہیں۔

ثانیا: معراج الدرایہ میں کتنی صریح حدیث موجود ہے۔

انہ امر بالتلقین بعد الدفن۔

ونیز بنایہ ودرمختار وطبرانی ومعجم کبیر سے کچھ پیش کی گئیں۔

ثالثا: جو حدیث آپ کو باوجود تتبع اور تلاش کے نہ ملے تو کیا اس کی مطلقا نفی ہوسکتی ہے۔

رابعا: کیا عدم ذکر عدم کو مستلزم ہے۔ لیکن جب ہٹ دھرمی پر کمر باندھی تو پھر حق گوئی سے کیا تعلق۔ آخر میں تو مجیب نے اپنا اصلی مقصد ہی ظاہر کر دیا۔

اور اس کا التزام بدعت سے خالی نہیں اور بدعت کے موجد کے بارے میں یہ فرمایا گیا:

عن عائشۃ رضی اللہ عنہ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد متفق علیہ۔ واللہ اعلم بالصواب وعندنا ام الکتاب۔

اولا: کیا ہر مستحب کو مستحب جان کر دواما کرنا بدعت ہے؟۔

ثانیا: بدعت کی جامع مانع کیا تعریف ہے؟۔

ثالثا: ہم نے سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی احادیث سے اس کا ثبوت پیش کیا اور صحابہ اور

فقہاء کے اقوال بھی نقل کئے تو کیا نعوذ باللہ حضور بدعتی ہوئے؟ تو حدیث کا لفظ "مـن" حضور کو بھی شامل ہے؟ اور کیا یہ صحابہ اور فقہا بھی بدعتی ٹھہریں گے؟ اگر ہیں تو جب انھوں نے یہ احداث کیا تو انکے مقلدین اوران کے مسائل کو صحیح جاننے والے کس حکم کے مستحق ہوں گے۔

الحاصل مجھ کو فقط یہ ظاہر کرنا منظور تھا کہ ایسے ہی نام کے علماء نے شریعت میں اپنی خود غرضی سے طرح طرح کے فرقے پیدا کر دیئے۔ عبارتوں میں قطع وبرید کر کے حلال کو حرام کر دیا۔ اس مختصر سی تنقید میں مجیب صاحب پر تیس سوالات جو حقیقۃ اعتراضات ہیں پیش کئے گئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۳۱)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین حسب ذیل مسئلہ میں

میت کو قبر میں دفن کرنے کے بعد اذان دینا جائز ہے کہ نہیں اکثر لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کیا یہ معترض وہابی تو نہیں؟ صفر حسین ہزاری باغ۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بعض فقہاء نے تو میت کے دفن کے بعد اذان کہنے کو سنت کہا ہے اور بعض نے مستحب بتایا ہے چنانچہ ردالمحتار نے مستحب اذانوں میں اس کو شمار کیا ہے "عند انزال المیت القبر" یعنی میت کو قبر میں اتارنے کے وقت اذان کہنا مستحب ہے تو اس کے جواز میں کیا کلام ہے وہابی اس کو محض اپنی ناقص رائے اور عقل سے ناجائز کہتا ہے اور اس کے عدم جواز کے ثبوت میں کوئی صریح دلیل پیش نہیں کرسکتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۳۲)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین حسب ذیل مسئلہ میں۔ بینوا توجروا

(۱) بہارشریعت حصہ چہارم صفحہ ۱۶۲ مسئلہ دفن کے بعد قبر کے پاس اتنی دیر تک ٹھہرنا مستحب ہے جتنی دیر میں اونٹ ذبح کر کے گوشت تقسیم کر دیا جائے کہ ان کے رہنے سے میت کو انس ہوگا اور اتنی دیر تک تلاوت قرآن اور میت کے لئے دعاؤ استغفار کریں اور یہ دعا کریں کہ سوال نکرین کے جواب میں ثابت قدم رہے (جوہرہ وغیرہ) کتاب الاذکار میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ صفحہ ۱۴۷ میں تحریر فرماتے ہیں
" ویستحب ان یقعد عندہ بعد الفراغ ساعۃ قدر ما ینحر جزورو تقسم لحمھا ویشتغل القاعدون بتلاوۃ القرآن والدعاء للمیت والوعظ وحکایات اھل الجنۃ واحوال الصالحین"
اس میں اس میں غرض یہ ہے کہ قبرستان میں میت کو قبر میں رکھنے کے بعد جب تک قبر کی مٹی درست نہ ہو جاوے ہمراہی جنازہ کے سب لوگ ٹھہرے رہتے ہیں۔ اسی وقفہ میں اگر ذکر خیر البشر سرکار دو عالم ﷺ وصالحین دعاء میت عوام سے پڑھادی جاوے اور بعد واپسی عوام کے کچھ دیر تک خاص چند آدمی ذکر قرآن پاک قبر کے پاس پڑھ دیں اور اذان وتلقین کر دیں تو مطابق سنت مستحب کے ہوگا یا نہیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اس وقفہ میں عوام سے تلاوت بعض سور قرآن واذکار کا پڑھوانا اور لوگوں کی واپسی کے بعد خواص کا تلاوت واذکار میں مشغول رہنا اور اذان وتلقین کرنا بلاشبہ مستحب ہے اور ان امور سے میت کو انس اور کثیر منافع حاصل ہوتے ہیں۔ والتحقیق فی فتاونا الاجملیہ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۴۳)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر اذان کہنے کا حکم ہے یا نہیں۔ کیونکہ یہاں پر بہت آدمی منع کرتے ہیں اللہ رحم فرما کر مفصل جواب عنایت ہو۔ اس پر آپ کی مہر ہونا ضروری ہے۔
المستفتی عظمت خاں ونور خاں شیوا الا پوسٹ ولینگر وایا میانہ گجرات

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بعض فقہاء نے قبر میں میت کو اتارتے وقت اذان کہنے کو سنت قرار دیا ہے۔ علامہ ابن حجر نے اسکی سنیت میں کلام فرمایا ہے۔ ردالمحتار میں ہے: "قیل وعند انزال المیت القبور قیاسا علی اول خروجہ للدنیا ولکن ردہ ابن حجر فی شرح العباب۔ (ردالمحتار مصری ۲۲۹ ج ۲)
علماء کرام کا یہ اختلاف تو اس اذان قبر کے سنت ہونے نہ ہونے میں تھا۔ اب باقی رہا اذان قبر کا جائز ہونا تو اس میں فقہاء کرام کا کوئی اختلاف نظر سے نہیں گزرا۔ تو بعد دفن میت قبر پر اذان کہنا یقیناً جائز قرار پایا کہ شریعت سے اسکی ممانعت کی کوئی دلیل صریح ثابت نہیں ہوئی۔ پھر جو اسکو منع کرتا ہے وہ اسکی ممانعت پر کوئی صریح دلیل شرعی قائم کرے، ورنہ شرع پر افتراء کرنے سے باز آئے۔ احادیث پر نظر کرنے کے بعد اس اذان سے میت کے لئے چند منافع مستفاد ہوتے ہیں۔
(۱) اذان کی وجہ سے شر شیطان سے پناہ حاصل ہوگی۔
(۲) تکبیر اذان کی بدولت عذاب نار سے امان پائیگا۔
(۳) اذان سے جوابات سوالات منکر نکیر یاد آجائیں گے۔
(۴) ذکر اذان کے باعث عذاب قبر سے نجات پائیگا۔
(۵) اذان میں ذکر رسول اللہ ﷺ کی برکت سے نزول رحمت ہوگی۔
(۶) اذان کی بدولت دفع وحشت قبر ہوگا۔
(۷) اذان کے سبب سے زوال غم اور حصول سرور وفرحت حاصل ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۱۰ شوال المکرم ۱۳۷۱ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۴۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین دامت برکاتہم القدسیہ مسائل ہذا میں کہ
(۱) قبر میں بوقت سوال وجواب نکیرین کے جناب آقائے دو عالم احمد مجتبیٰ شافع روز جزا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جلوہ افروز ہوتے ہیں یہ صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو کس ثبوت سے اور کیا آپ صرف مسلمان ہی کی قبر میں جلوہ افروز ہوتے ہیں یا سب کی قبر میں؟ قبر خواہ مرتد ومشرک رافضی قادیانی وہابی دیوبندی وغیرہ کی ہو۔ کیا حکم شرعی ہے اور کافروں کو جب مرگھٹ پر جلا دیا جاتا ہے تو ان سے بھی نکیرین

سوال و جواب ان کے مرگھٹ پر جا کر کرتے ہیں یا نہیں؟ کیا نکیرین کے سوال و جواب صرف مسلم ہی سے ہوتا ہے یا ہر شخص سے خواہ وہ کافر ہو یا مرتد۔ مشرک ہو یا رافضی، قادیانی ہو یا وہابی دیوبندی وغیرہ ہوں اور جو لوگ جلائے جاتے ہیں ان سے بھی نکیرین سوال و جواب کرتے ہیں یا نہیں؟ اور حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بوقت سوال جواب نکیرین کافروں کے مرگھٹ پر بھی جلوہ افروز ہوتے ہیں یا نہیں کیا حکم ہے؟۔ بینوا توجروا۔

(۲) بوقت سوال نکیرین قبر میں شیطان پہنچ جاتا ہے اور صاحب قبر کو بہکاتا ہے۔ یہ صحیح ہے یا غلط؟۔ اگر صحیح ہے تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ جہاں اللہ کے محبوب کا نزول ہوتا ہے وہاں شیطان دور بھاگتا ہے۔ لہٰذا جب حضور علیہ الصلاۃ والسلام قبر میں جلوہ افروز ہوتے ہیں تو شیطان کا گذر کس طرح ممکن ہوجاتا ہے اور پھر آپ کی موجودگی میں وہ صاحب قبر کی بہکاتا بھی ہے یہ کس طرح ممکن ہے کیا حکم شرعی ہے؟۔ بینوا توجروا۔

المستفتی فقیر محمد عمران قادری رضوی مصطفوی غفرلہ ربہ محلہ منیر خاں پیلی بھیت شریف

۳ر محرم الحرام ۱۳۷۳ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) قبر میں سوالات نکیرین میں سے 'ما کنت تقول فی ھذا الرجل' کے وقت خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا تشریف لانا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔

علامہ سیوطی شرح الصدور میں حضرت شیخ الاسلام ابن حجر کا قول نقل فرماتے ہیں:

سئل ھل یکشف لہ حتی یری النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فاجاب انہ لم یرد فی حدیث و انما ادعاہ بعض من لا یحتج بہ لغیر مستند سوی قولہ فی ھذا الرجل ولا حجۃ فیہ لان الاشارۃ الی الحاضر فی الذھن۔ (شرح الصدور ص/۶۰)

سوال کیا گیا کہ میت کیلئے پردۂ حجاب اٹھا دیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھ لیتا ہے تو جواب دیا کہ کسی حدیث میں تو یہ وارد نہیں ہوا۔ اس کا بعض ایسے علماء نے دعویٰ کیا ہے جن کو حجت میں نہیں لایا جاتا ہے ان کی دلیل سوائے قول فی ہذا الرجل اور کچھ نہیں اور اس میں کوئی حجت نہیں اس لئے کہ اشارہ فی الذہن کی طرف ہے۔

اور شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات ترجمہ مشکوۃ میں اس کلمۂ حدیث کے تحت میں فرماتے ہیں:

واشارت بہذا با آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یا از جہت شہرت امر وحضور اوست دراذہان ما اگرچہ غائب ست یا باحضار ذات شریف وے درعیاں بایں طریق کہ درقبر مثالے از حضرت وے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم می ساختہ باشند۔ (اشعۃ اللمعات ج ۱/ ص ۱۱۵)

ہذا کا اشارہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف یا اس بات کی شہرت ہونے اور ہمارے ذہنوں میں ان کے حاضر ہونے کی بنا پر ہے اگرچہ وہ غائب ہیں یا ان کی ذات شریف کے ظاہر میں اس طریق پر حاضر کردینے کی بنا پر ہے کہ قبر میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مثال لیکر حاضر ہوتے ہیں۔

ان عبارات سے واضح ہوگیا کہ سوالات نکیرین کے لفظ ھذا کا اشارہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف یا تو ان کے حاضر فی الذہن ہونے کی جہت سے ہے یا قبر میں آپ کی مثال کے حاضر ہونے کی بنا ہے۔ تو حضور کی صورت مثالی کا کی قبر میں سوال نکیرین کے وقت جلوہ افروز ہونا بھی صحیح ثابت ہوا گیا۔

اب باقی رہا یہ امر کہ قبر میں سوالات نکیرین صرف مسلم ہی سے ہوتے ہیں یا کافروں و مرتدوں سے بھی تو علامہ سیوطی نے شرح الصدور میں حضرت ابن عبدالبر کا قول نقل فرمایا ہے:

قال ابن عبد البر لا یکون السوال الا لمومن او منافق کان منسوبا الی دین الاسلام بظاھر الشھادۃ بخلاف الکافر فانہ لا یسئل۔ (ص ۵۹)

ابن عبدالبر نے فرمایا کہ سوال قبر یا تو مومن ہی سے ہوتا ہے یا اس منافق سے ہوتا ہے جو اپنے آپ کو کلمہ شہادت پڑھ کر دین اسلام کی طرف نسبت کرتا ہے بخلاف کافر کے کہ اس سے سوال نہ کیا جائے گا۔

علامہ ابن حجر فتاوی حدیثیہ میں فرماتے ہیں:

وجزم الترمذی الحکیم بان المعلن بکفرہ لا یسئل ووافقہ ابن عبد البر ورواہ بعض کبار التابعین۔ (فتاوی حدثیہ مصری ص ۷)

امام حکیم ترمذی نے اس بات پر جزم کیا کہ کفر کو باعلان کرنے والے سے سوال نہ کیا جائے گا ان کی ابن عبدالبر نے موافقت کی ہے اور اس کی بعض کبار تابعین نے روایت کی ہے۔

ان عبارات سے یہ ظاہر ہوگیا کہ قبر میں سوالات نکیرین یا تو مسلمانوں سے ہوتے ہیں یا مدعی اسلام منافق سے اور کافر مردے سے یہ سوالات نہیں کئے جاتے تو پھر مرگھٹ پر سوالات کرنے اور وہاں حضور کے جلوہ افروز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں جو مسلم یا منافق جلا دیا جائے یا اس کو جانور کھاجائے اس سے نکیرین کے سوالات ہونگے۔

فتاویٰ حدیثیہ میں ہے: و سوال الملکین یعم کل میت و لو جنینا و غیر مقبور کحریق و غریق و اکیل سبع کما جزم به جماعة من الائمة ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) یہ بھی صحیح ہے کہ بوقت سوالات نکیرین میت کو شیطان نظر آتا ہے اور صاحب قبر کو بہکانے کی سعی کرتا ہے۔

شرح الصدور میں ہے: عن سفیان الثوری قال اذا سئل المیت من ربك ترآی له الشیطان فی صورة فیشیر الی نفسه انی انا ربك ۔

اور یہ بھی صحیح بخاری شریف کی حدیث ہے کہ نکیرین کے سوالات میں تیسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ ماکنت تقول فی ھذا الرجل ۔ تو اس حدیث میں ہذا کا مشارالیہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف ہے اور اشارہ حاضر کی طرف کیا جاتا ہے تو قبر میں میت کو مشاہدہ جمال انور کا شرف حاصل ہوا۔ اور آپ کی صورت مثالیہ کی جلوہ افروزی ثابت ہوئی۔

اب باقی رہا یہ امر کہ حضور کی جلوہ افروزی کے باوجود وہاں شیطان کا آنا اور میت کو بہکانا کس طرح ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں رحمۃ العالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رحمت کا ہر دو کو صدقہ ملا۔ شیطان کو تو یہ ہے کہ وہ قبر میں اس وقت آکر بہکانے کی جرأت کرتا ہے۔ اور میت پر یہ رحمت خاص ہے کہ وہ اس کے فریب سے محفوظ رہتا ہے بہکتا نہیں۔ یعنی اس مشاہدہ جمال پاک نے دشمن کے فریب دینے اور بہکانے کے وقت میت کی یہ مشکل کشائی فرمائی کہ ایسے سخت مخالف کو خائب و نامراد واپس کردیا اور اس کے لئے راہ نجات روشن فرمادی۔

چنانچہ حضرت شیخ محقق نے اشعۃ اللمعات میں ان کلمات حدیث کی شرح میں ایسا لطیف اشارہ فرمایا:

واشارت بہذا یا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یا از جہت شہرت امر وحضور اوست در اذہان ما اگر چہ غائب ست یا حضار ذات شریف وے درعیاں بایں طریق کہ در قبر مثالی از حضرت وے صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم حاضر می ساختہ باشند تا بمشاہدہ جمال جاں افروزی او عقیدہ اشکالی کہ درکار افتادہ کشادہ شود وظلمت فراق بنور لقائے دلکشائے او روشن گردد۔

لہٰذا یہ حضور علیہ السلام کی رحمت عامہ کا صدقہ ہے کہ شیطان کا اس وقت قبر میں گذر ہوگیا اور وہ صاحب قبر کو بہکانے کی سعی کرنے لگا ورنہ اس آقائے کریم کے صدقہ میں ان کے غلاموں کی ایسی ہیبت ہے کہ شیطان ان کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ ان کے راستہ پر بھی چل نہیں سکتا۔ چنانچہ حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق صحاح ستہ میں یہ احادیث مروی ہیں:

قال علیه السلام ان الشیطان لیخاف منك یا عمر (وفی روایة) انی لا نظر الی شیاطین الجن و الانس قد فروا من عمر (و فی روایة) یا ابن الخطاب و الذی نفسی بیده ما لقیك شیطان سالکا فجا قط الا سلك فجا غیر فجك اخرجها المشکوٰة ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) نکیرین قبر میں چھوٹے بچوں سے سوالات نہیں کرتے۔

شرح الصدور میں ہے: الانبیاء و اطفال المومنین لیس علیهم حساب ولا عذاب القبر و لا سوال منکر و نکیر ۔

علامہ سیوطی بشری الکئیب میں فرماتے ہیں: قد وردت الاحادیث و نصوص العلماء باستثناء جماعة من السوال منهم الشهداء والصدیقون والمطیعون و کذالك الاطفال فی ارجح الاقوال ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۱۵ ربیع الآخر شریف ۱۳۷۱ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل



باب حرمۃ القبور

مسئلہ (۵۳۵)

از حسن پور محلہ لال باغ ضلع مراد آباد جناب غلام نبی خاں صاحب رضوی

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

کتاب مستطاب ''رکن الدین'' میں حضرت مولانا شاہ رکن الدین صاحب نقشبندی مجددی الوری بحوالہ عالمگیری لکھتے ہیں۔ کہ مردوں کی ہڈیاں گلنے سڑنے پر قبر سے نکال کر اس پر مکان بھی بنا سکتے ہیں اور کھیتی بھی کر سکتے ہیں۔ اور قریب قریب اس کے موافق ''فلاح دارین'' میں بھی لکھا ہے کہ چار سال گذرنے پر نشان قبر مٹنے پر کھیتی بھی کر سکتے ہیں اور مکان بھی بنا سکتے ہیں۔ کیا ایسی صورت میں وہابیہ نجدیہ دیو بندیہ خذلہم اللہ تعالیٰ کو موقع نہ ملے گا؟ جو نعوذ باللہ اولیاء کرام کو بھی مردہ جانتے ہیں اور ان کے مزارات طیبہ کی تعظیم کو شرک وکفر قرار دیتے ہیں کہ وہ مزارات طیبہ کو بھی شہید کر کے وہاں پر مکان بنا دیں، یا کھیتی کرا دیں۔ چنانچہ مقامات مقدسہ میں ابن سعود نجدی ملعون خزلہم اللہ تعالیٰ ایسا کر چکا اور کر رہا ہے۔ برائے عنایت وکرم جواب شافی وکافی بحوالہ کتب عنایت فرمائیں۔ والسلام

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسلمان کی عزت جس طرح زندگی میں ہے اسی طرح بعد موت کے ہے۔

چنانچہ محقق علی الاطلاق فتح القدیر میں فرماتے ہیں۔ ''الاتفاق علی ان حرمۃ المسلم میتا کحرمتہ حیا'' پھر مسلمان کو جس چیز سے حیات میں ایذا پہنچتی ہے بعد موت بھی اس سے ایذا پہنچتی ہے۔

چنانچہ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اذی المؤمن فی موتہ کاذاہ فی حیاتہ۔

یعنی مسلمان مردہ کو ایذا دینا ایسا ہے جیسے زندہ کو۔

شیخ محقق دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ''اشعۃ اللمعات'' میں فرماتے ہیں:

ازینجا مستفاد میگردد کہ میت متالم میگردد بتمام آنچہ متالم میگردد بداں حی ولازم ایں است کہ متلذذ گردد بتمام آنچہ متلذذ می شود بداں زندہ۔

لہذا سوال کا جواب تو یہیں سے معلوم ہو گیا کہ مردہ کی ہڈیوں کو قبر سے نکالنے اور وہاں کھیتی کرنے یا کوئی مکان بنانے میں کیا اس کو ایذا نہیں ہوگی؟ ضرور ہوگی۔ اور پھر اس کی اہانت بھی ہوگی اور یہ ممنوع ہے۔ جیسا کہ ان عبارتوں سے واضح ہو چکا۔ لیکن مزید براں اب میں ایک حوالہ اسی عالمگیری کا پیش کرتا ہوں جس کے متعلق سوال کیا گیا ہے:

سئل القاضی الامام شمس الائمۃ محمود الاوزجندی فی المقبرۃ اذا اندرست ولم یبق فیہا اثر الموتی لا العظم ولا غیرہ ہل یجوز زرعہا واستغلالہا قال لا ولہا حکم المقبرۃ۔

یعنی قاضی امام شمس الائمہ محمود اوزجندی سے ایسے مقبرہ کے بارے میں سوال ہوا کہ جب نہ قبروں کا نشان باقی رہا ہو، اور نہ ہڈی وغیرہ ہو تو کیا اس میں کھیتی اور غلہ حاصل کر سکتے ہیں؟ فرمایا: نہیں۔ اور اس کے لئے مقبرہ کا حکم ہے۔ اس عبارت میں تو مسئلہ کی خاص صورت کا ہی حکم بیان کر دیا گیا۔ اور پھر ہڈیاں نکلوا کر کھیتی یا مکان بنوانا تو بڑی چیز ہے احادیث کریمہ اور کتب فقہیہ میں تو یہاں تک احتیاطیں ہم کو تعلیم کی ہیں کہ قبر پر تکیہ لگانا، جوتا پہن کر چلنا، قبرستان میں پرانے راستہ کو چھوڑ کر نئے راستہ پر گذرنا، قبر پر پاؤں رکھنا، اس کے پاس سونا، قبر کی تر گھاس یا درخت کو کاٹنا، قبر پر بیٹھنا، تمام ممنوع وناجائز ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی کے اعزہ اور اقربا کی قبریں ایسی جگہ ہیں کہ ان تک پہنچنے کے لئے چند مسلمانوں کی قبروں کو کودنا پڑے گا۔ تو اس شخص کو وہاں پہنچ کر فاتحہ پڑھنا مکروہ ہے۔ بلکہ وہ باہر ہی سے فاتحہ پڑھے الحاصل اب اگر اس میں کھیتی کی جائے گی یا مکان بنایا جائے گا، تو اس میں چلنا پھرنا بیٹھنا لیٹنا قبور کو پاؤں سے روندنا ان پر پاخانہ پیشاب کرنا سب کچھ ہی ہوگا اور کوئی دقیقہ بے حیائی اور اموات مسلمین کی ایذا رسانی کا باقی نہ رہے گا۔ اور قاضی خاں میں تو یہاں تک مرقوم ہے۔

مقبرۃ قدیمۃ بمحلۃ لم یبق فیہا آثار المقبرۃ ہل یباح لاہل المحلۃ الانتفاع بہا قال ابو النصر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لا یباح۔

یعنی کسی محلہ میں کوئی پرانا مقبرہ ہے جس میں قبروں کے نشان باقی نہیں رہے ہیں تو آیا اہل محلہ اس سے نفع حاصل کر سکتے ہیں؟ ابوالنصر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ مباح نہیں ہے۔ اور یہی فتاوی ظہیریہ وخزانۃ المفتین وغیرہ میں ہے۔ ہدایہ میں ہے:

فی غایة القبح ان یقبری فیه الموتی سنة ویزرع سنة۔

یعنی یہ بہت ہی قبیح ہے کہ کسی جگہ ایک سال قبر بنالیا کریں اور ایک سال کھیتی کرلیا کریں۔

بالجملہ اگر فقہ کی عبارات اسی طرح پیش کی جائیں تو جواب میں بہت طول ہو جائے لیکن اب یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ عالمگیری کی عبارت مندرجہ فی السوال کے متعلق سائل کے شکوک رفع کروں۔ وباللہ التوفیق۔

مسائل شرع میں ذرا سی صورت بدل جانے سے ایک ناجائز جائز، اور جائز ناجائز ہو جاتا ہے۔ مثلاً شراب کی حرمت قطعی ہے لیکن عندالضرورت کہ ایک شخص کی شدت تشنگی سے جان لبوں پر آ گئی ہے اور وہاں شراب کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے تو اس کے لئے شریعت بقدر ضرورت شراب حلال کر دیتی ہے۔ لہذا ضرورت شریعت میں ایک بہت بڑا عذر ہے۔ اسی لئے ایک قبر میں دوسرے مردہ کا دفن جائز رکھا اور اگر ضرورت نہ ہو تو یہ حرام ہے۔

چنانچہ تاتارخانیہ میں ہے: اذاصارت المیت ترابا فی القبر یکره دفن غیره فی قبره لان الحرمة باقیه۔

کبیری میں یہ قید صراحۃ موجود ہے: الاعند الضرورة بان لم یو جد مکان سواء۔

اور یہی مضمون مولانا رکن الدین صاحب دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

ایک وقت میں بلاضرورت ناجائز ہے اور ضرورت کے وقت جائز ہے۔

اب رہا کھیتی یا مکان بنانا اور اس کا صحیح محل یہ ہے کہ کسی کی ملک میں کوئی میت دفن کر دیا گیا تو جب وہ بالکل خاک ہو جائے مالک کو روا ہے کہ وہاں کھیتی کرلے یا گھر بنائے یا کچھ اور کرے۔

چنانچہ درمختار میں ہے: لا یخرج منه بعد اهالة التراب الالحق ادمی کان تکون الارض مغصوبة او اخذت بشفعة یخیر المالک بین اخراجه ومساواته بالارض کما جاز زرعه والبناء علیه اذا بلی وصارا ترابا۔

یعنی مردہ قبر سے مٹی ہو جانے کے بعد بھی نہ نکالا جائے۔ ہاں کسی آدمی کے حق یا زمین کے

مغصوب ہونے یا شفعہ کے اعتبار سے مالک کو اس کے نکالنے اور زمین کو برابر کرنے کا اختیار ہے۔ جیسا کہ اس کے لئے جب وہ مٹی ہو جائے تو کھیتی کرنے اور مکان بنانا جائز ہے۔

اب آپ کو نہایت واضح طریقہ سے معلوم ہو گیا کہ عالمگیری کا وہ حکم اس وقت میں ہے جب دوسرے کی زمین میں میت دفن کر دیا گیا۔ تو یہ حق شریعت نے اس کو مالک ہونے کے اعتبار سے دیا ہے نہ اس لئے کہ مسلمانوں کی قبروں پر ہر کوئی شخص کھیتی کر سکے، یا مکان بنا سکے۔ یہ بات ابتدا میں پیش کر دی گئی۔

اب رہا اولیاء کرام کے ساتھ ایسا فعل تو یہ بھی اسی سے معلوم ہو گیا کہ جب عوام مومنین کی قبور کو مٹی ہونے سے قبل تغیر نہیں کر سکتے تو ان کے اجسام تو ویسے ہی محفوظ رہتے ہیں۔ لہذا ان کے لئے تو کوئی صورت ہی متصور نہیں۔ صدہا کتب اور واقعات اس کے شاہد ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (٥٣٦)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ

میت کو لکڑی کا پٹاؤ دیا جائے یا پتھر کا پٹاؤ بھی دے سکتے ہیں یا نہیں اور جس طرح اینٹ لگانے کی ممانعت بنائی جاتی ہے اسی طرح پتھر کی تو ممانعت نہیں ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

میت کیلئے پختہ اینٹ یا لکڑی کا پٹاؤ اگر محض بغرض استحکام دیا جائے تو مکروہ ہے۔

جوہرہ نیرہ میں ہے: ویکره الآجر الخشب لانهما لا حکام البناء وهو لا یلیق بالمیت لان القبر موضع البلی فعلی هذا تکره الاحجار۔

اور اگر اس غرض سے نہیں تو عندالحاجت جو دستیاب ہو اس کا پٹاؤ کیا جا سکتا ہے پختہ اینٹ کو بعض نے اس بنا پر مکروہ کہا ہے کہ اس کو آگ پہنچ چکی ہے تو اس کا قریب میت ہونا مناسب نہیں۔

ہدایہ میں ہے: ثم بالآجر اثر النار فیکره تفاولا "

اور پتھر میں کوئی اثر نار نہیں تو پتھر اینٹ کی طرح نہیں واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۳۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) قبر پر بیٹھنا۔ چلنا، قبر کا تکیہ لگا کر بیٹھنا کیسا ہے قبر کو پیٹھ کرنا کیسا ہے؟۔

(۲) مزار شریف پر فاتحہ پڑھنا کس جگہ کھڑے ہوکر اور کس طرح چاہئے؟۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ صاحب مزار کا رخ قبلہ کو ہے فاتحہ صاحب مزار کے سینہ کے مقابل صاحب مزار کے رخ کی طرف اپنا منھ کر کے اور قبلہ کو پیٹھ کر کے فاتحہ پڑھنا چاہئے کیونکہ اس کا یعنی صاحب مزار کا رخ قبلہ کو ہے اور اگر اس کے پیٹھ کی طرف اس کے الٹے ہاتھ کو کھڑے ہوکر فاتحہ پڑھے گا یا سرہانے یا پائینتا نے صاحب مزار کے کھڑے ہوکر فاتحہ پڑھے گا۔ تو اس صورت میں صاحب مزار کو فاتحہ پڑھنے والے کی طرف اپنا منھ کرنا ہوگا جس سے صاحب مزار کو تکلیف منھ پھیرنے کی ہوگی۔ اس لئے سیدھی طرف قبلہ کو پیٹھ کر کے فاتحہ پڑھے اور کسی طرف کھڑے ہوکر فاتحہ نہ پڑھے کیا شخص مذکور کا قول صحیح ہے یا نہیں؟۔

(۳) قبر میں طاق کھدوانا اور اس میں عہد نامہ یا شجرہ شریف اور اس شخص کا نام جس کی قبر تیار کی گئی ہے لکھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) بلا حاجت قبر پر بیٹھنا یا چلنا یا اس کا تکیہ لگانا مکروہ ہے۔

عالمگیری میں ہے: یکرہ ان یبنی علی القبر او یقعد او ینام او یوطأ علیہ۔

اور آداب زیارت سے قبر کی طرف منھ کرنا ہے۔

اشعۃ اللمعات میں ہے: واز جملۂ آداب زیارت ست روئے بجانب قبر۔

اور خاص کر کسی بزرگ یا عالم دین کی قبر کی طرف پیٹھ کرنا بے ادبی اور فیوض سے محرومی کا باعث ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) مزار پر فاتحہ پڑھتے وقت قبر کی طرف منھ کر کے اور قبلہ کی جانب پشت کر کے کھڑا ہونا اور میت کے چہرہ کے مقابل کھڑا ہوا جائے۔

اشعۃ اللمعات میں ہے: واز جملۂ آداب زیارت ست کہ روئے بجانب قبر و پشت بجانب قبلہ

مقابل روئے میت بایستند۔

باقی شخص مذکور کا قول صحیح ہے۔ چنانچہ ردالمحتار جلد اول میں بحث زیارت قبور میں اس کی تصریح موجود ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) عہد نامہ کو میت کے کفن یا پیشانی پر لکھنے سے اس کی مغفرت ہو جانے کی امید کی تصریح در مختار میں ہے: کتب علی جبهة المیت او عمامته او کفنه عهد نامه یرجی ان یغفر الله للمیت۔

تو بعض اکابر نے بخوف ان کلمات کے نجاست میں ملوث ہونے یا اندیشہ اہانت کی بنا پر یہ حل تجویز فرمایا کہ قبر میں طاق کھدوا کر اس میں عہد نامہ یا شجرہ رکھ دیا جائے تو اس میں ان اندیشوں سے بھی حفاظت ہو جائے اور میت کو ان کلمات اور سند صالحین سے امداد بھی حاصل ہو جائے۔ لہٰذا طاق قبر میں عہد نامہ یا شجرہ رکھنے میں کونسا ممنوع شرعی لازم آتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۳۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

قبر کے تختے گل سڑ کر کل یا چند دو ایک نکل گئے نیچے دھنس گئے ہوں تو نئے دوسرے تختے ڈال کر قبر کی درستی کرنا جائز ہے یا نہیں؟۔ المستفتی محمد عرفان پیلی بھیت۔

الجواب

قبر کے تختے اگر گل سڑ جائیں تو ان تختوں کو اکھاڑ کر نئے تختے ڈال کر قبر درست کرانا ممنوع ہے بلکہ اس میں جہاں نشیب ہو یا سوراخ ہو جائے تو اسکو مٹی سے بند کر دینا چاہئے۔

طحطاوی میں ہے: ولا یباح نبشه بعد الدفن اصلا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۱۵ صفر المظفر

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

****

مسئلہ (۵۳۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں۔ سوال کا جواب مدلل او مفصل دیجئے گا؟۔

زید کے پاس انتخاب صحاح ستہ کتاب ہے جس کا ترجمہ اردو میں ہے اس کے صفحہ ۸۶ پر احکام قبر میں دو حدیثیں ہیں۔ جن کے ترجمہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے، کہ سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مزارات کو پختہ بنوانے کو اور فقیر بنکر مزارات پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ اولیا عظام کے مزارات پختہ بنے ہوئے ہیں اور انکی قبروں پر لوگ مجاور بنے بیٹھے ہے۔ زید کا کہنا ہے کہ میں نے بہت سے علماء سے اس کا مطلب دریافت کیا، مگر میری تسکین نہ ہوئی اور نہ کافی جواب ملا۔ حدیث کا ترجمہ نقل کرتا ہوں جواب سے آگاہ کیجئے گا۔

حدیث۔ وعن ابی الهیاج الاسدی قال قال علی الا ابعثك علی مابعثنی علیه رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم ان لاتدع تمثا لا الا طمسته ولا قبر امشرفا الا سویته رواہ مُسلم۔

ابوالھیاج نے فرمایا حضرت علی نے کہا میں تمہیں اس کام کو انجام دینے کے بھیج رہا ہوں جسے انجام دینے کے لئے سرکار نامدار نے مجھے بھیجا تھا وہ کام یہ ہے کہ تم کوئی تصویر بغیر مٹائے اور کوئی اونچی قبر بغیر نیچی کئے ہوئے نہ چھوڑو۔ (مسلم شریف)

حدیث۔ عن جابر قال نهی رسو ل الله ﷺ ان یجصص القبر وان یبنی وان یقعد علیه رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضور سید عالم ﷺ نے قبر کو گچ کرنے اور اس پر عمارت بنانے اور اس پر فقیر ہو کر بیٹھنے سے منع فرمایا۔

المستفتی محمد یونس رضا خاں مدرس مدرسہ تعلیم القرآن بلند پور۔ فرخ آباد

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

اس کتاب کا ترجمہ کسی بدمذہب وہابی نے کیا ہے کہ اس نے ترجمہ میں تصرف کیا ہے۔ چنانچہ پہلی حدیث کے الفاظ ولا قبرامشرفا الا سویته کا یہ غلط ترجمہ کیا کہ تم کوئی اونچی قبر کو نیچی کئے ہوئے نہ چھوڑو حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ تھا کہ تو کسی اونچی قبر کو بغیر برابر کئے ہوئے نہ چھوڑنا۔ تو اس نے تسویہ کے معنی بجائے برابر کرنے کے نیچا کرنا اپنی طرف سے گڑھا ہے۔ اور اس تصرف کے لئے مجبوری یہ لاحق ہوئی کہ قبر مسلم کو زمین کی برابر کرنا خلاف سنت ہے۔ تو اس نے قبر کو برابر کرنے کے بجائے نیچا لکھ دیا۔ اور ظاہر ہے کہ جب قبر کی اونچائی کو نیچا کیا جائے گا، تو وہ پھر زمین سے بلند ہی ہوگی، اور جب وہ زمین سے کچھ بلند ہی رہی تو تسویہ کے معنی کب متحقق ہوئے کہ وہ زمین کے برابر نہیں ہوئی، اور مقصود حدیث تصویر اور قبر کا بالکل میٹ دینا تھا، اسی اہم مقصد کیلئے انکو بھیجا تھا۔ علاوہ بریں وہابیہ کی بے ایمانی یہ ہے کہ حدیث کا زمانہ نہیں بتایا اور نہ یہ ظاہر کیا کہ وہ کس کی قبریں تھیں۔

ترمذی شریف میں اسی حدیث کے بین السطور میں ہے۔ بعثه النبی فی اسواق مکة ومقابرها عام الفتح۔ یعنی حضور نبی کریم نے انہیں فتح مکہ کے سال بازاری قبروں کے لئے بھیجا تھا۔ تو اب ہر مسلمان غور کرسکتا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے وہاں مسلمانوں کی قبریں کہاں تھیں۔ تو اب ظاہر ہوگیا کہ قبور مشرکین تھیں انکو برابر کرنے اور میٹنے کیلئے انہیں بھیجا تھا۔ تو اب وہابیہ کا تصرف دیکھو کہ حدیث قبور مشرکین کے میٹنے کے لئے تھی ان بیدینوں نے قبور مسلمین اور مزار اولیا پر چسپاں کردیا۔ نیز اس حدیث میں نہ قبر کو پختہ کرنے کی ممانعت ہے نہ اسکے مجاور بننے کی حرمت کا ذکر ہے۔

دوسری حدیث کا تصرف دیکھو کہ الفاظ یہ تھے۔ ان یقعد علیه۔ جس کا یہ غلط ترجمہ کیا اور اس پر فقیر ہو کر بیٹھنے سے منع فرمایا، باوجود کہ صحیح ترجمہ یہ تھا قبر پر بیٹھنے سے منع فرمایا کہ قبر پر چڑھ کر بیٹھنے سے یقیناً قبر کی بے حرمتی ہے، اس کی ممانعت فرمائی ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ قعود کے معنی بیٹھنے کے ہیں، اس میں ''فقیر ہوکر'' کا کلمہ اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے۔ اس جاہل نے یہ کلمہ بڑھا کر مضمون حدیث ہی کو بدل دیا اور مضمون لازم ہوگیا کہ قبر پر فقیر ہو کر بیٹھنا ممنوع ہے اور بغیر فقیر ہو کر بیٹھنا ممنوع نہیں۔ حالانکہ قبر پر ہر حال میں بیٹھنا ممنوع ہے۔ اور پھر یہ بھی تو نتیجہ نکلا کہ اگر فقیر ہو کر قبر پر تو نہ بیٹھا، بلکہ اس کے قریب بیٹھا تو یہ ممنوع نہ ہوا۔ وہابیہ نے حدیث میں تصرف بھی کیا اس کا ترجمہ بھی غلط کیا لیکن مدعا پھر بھی حاصل نہ ہوا۔ لہذا ان ہر دو حدیث سے مزارات اولیا کرام کے پختہ بنوانے اور انکے مجاور بننے کی ممانعت پر استدلال کرنا غلط ثابت ہوا۔ پھر اگر ان احادیث سے یہ امور ناجائز ہوتے تو محدثین وفقہاء کرام انکو ہرگز ہرگز جائز نہ لکھتے۔ اس حدیث اول ہی کی شرح میں علامہ محمد طاہر مجمع البحار میں فرماتے ہیں

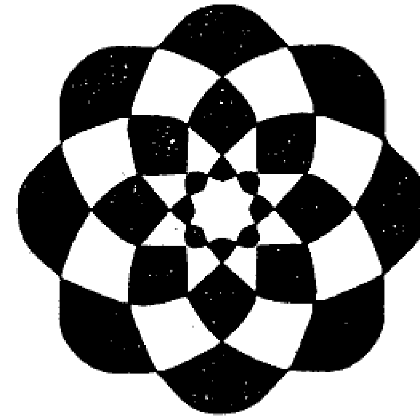
قد اباح السلف ان یبنی علی قبور المشائخ و العلماء المشاهیر لیزورهم الناس و یستریحون بالجلوس فیه (مجمع البحار ۔ ج۲ ص ۱۸۷)

یعنی سلف نے مشائخ اور مشہور علماء کی قبروں پر تعمیر مکان کو جائز رکھا ہے تا کہ زیارت کرنے والے آئیں اور اس میں بیٹھ کر آرام پائیں۔

درمختار میں ہے: ولا یجصص للنهی عنه ولا یطین ولا یرفع علیه بناء وقیل لا باس به وهو المختار۔ (شامی ۔ ج۱ ص ۶۲۷)

اسی طرح طحطاوی میں ہے۔ ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ قول مختار کی بنا پر قبر پر گچ کرنے، اس پر عمارت بنانے میں شرع میں کوئی حرج نہیں ہے، تو اگر یہ امور حدیث میں ممنوع ہوتے تو ہمارے سلف ہرگز ہرگز جائز نہیں لکھتے۔ تو وہابیہ کا ان احادیث سے استدلال کرنا غلط و باطل ہے۔ اور تصریحات مذہب کے خلاف ہے۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل





باب الصدقات للمیت

مسئلہ (۵۴۰)

ماقولکم یاساداۃ العلماء رحمکم اللہ تعالیٰ مندرجہ ذیل مسائل میں میت کو دفن کرنے کے بعد روپیہ پیسہ لوجہ اللہ خیرات کرنا کیسا ہے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

میت کے لئے لوجہ اللہ خیرات کرنے کے مستحب اور مندوب ہونے کا حکم قرآن کریم سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: واذا حضر القسمة اولو القربیٰ والیتمی والمساکین فارزقوهم منه وقولوا لهم قولا معروفا۔ (سورہ نساء)

اور بانٹتے وقت اگر رشتے دار اور یتیم اور مسکین آجائیں تو اس میں سے انہیں بھی کچھ دو اور ان کو اچھی بات کہو۔

علامہ ابو البرکات نسفی تفسیر مدارک میں اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

واذا حضر القسمة لترکة اولو القربیٰ ممن لا یرث والیتمی والمساکین من الاجانب فارزقوهم فاعطوهم منه مماترك الوالدان والاقربون وهو امر ندب وهو باق لم ینسخ۔ (مدارک مصری ج۱ ص ۱۶۲)

اور ترکہ کی تقسیم کے وقت اگر غیر وارث رشتہ دار اور اجنبی یتیم اور مسکین آجاویں تو انہیں ماں باپ اور اقارب کے ترکہ سے کچھ دو، یہ دینا مستحب کام ہے اور یہ حکم باقی ہے جو منسوخ نہیں ہوا۔

علامہ ناصر السنۃ علاء الدین بغدادی تفسیر خازن میں اس آیت کریمہ کے تحت میں فرماتے ہیں:

القول الثانی ان هذا الامر ندب واستحباب لا علی سبیل الفرض والایجاب وهذا القول هو الاصح الذی علیه العمل الیوم۔ (خازن مصری ص ۴۰۴ ج۱)

دوسرا قول یہ ہے کہ غیر وارث رشتہ داروں اور اجنبی یتیموں اور مسکینوں کو دینا مندوب و مستحب

ہے فرض وواجب نہیں ہے یہ قول ایسا صحیح ہے جو آج بھی معمول ہے۔

علامہ احمد جیون تفسیر احمدی میں اسی آیۃ کریمہ کے تحت فرماتے ہیں:

المـآل ان اللّٰہ تعالیٰ امرنا باعطاء شئ من الترکۃ بغیر الورثۃ فھو اما ان یکون تطیبا بقلوبھم او تصدقا علیھم فحینئذ یکون ذلک ندبا باقیا علی حالہ ۔

(احمدی مطبوعہ دہلی۔ج ا ص ۱۳۵)

اور مآل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں غیر وارثوں کے لئے ترکہ سے کچھ دینے کا حکم فرمایا پس یہ یا تو ان کے دل خوش کرنے کے لئے ہے یا ان پر صدقہ کرنا تو یہ دینا مستحب ہوا اور اپنے حال پر باقی رہا۔

اس آیت کریمہ اور اس کی تفاسیر سے یہ ثابت ہو گیا کہ ترکہ سے غیر وارث رشتہ داروں اور اجنبی یتیموں مسکینوں کی تقسیم ترکہ سے پہلے کچھ صدقہ اور خیرات دینا مستحب ہے ان تفاسیر نے اس آیت کریمہ کو غیر منسوخ قرار دیا اور اسی کو صحیح قول اور معمول امت بتایا۔ تفسیر خازن نے کہا ہے کہ حضرت امام زہری اور امام نخعی حضرت مجاہد، حضرت سعید بن جبیر، حضرت عطاء، حضرت امام شعبی، حضرت ابو العالیہ، حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی قول ہے، اور سید المفسرین حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے۔

آیت کریمہ کے بعد اب کسی حدیث کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن مزید اطمینان کے لئے احادیث بھی پیش کردوں۔

طبرانی میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ان الصدقۃ لتطفئی عن اھلھا حر القبور۔ (شرح الصدور مصری ص ۱۲۸)

بیشک صدقہ مردوں سے قبر کی حرارت کو دور کر دیتا ہے۔

طبرانی اوسط میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے سرکار رسالت میں عرض کی: یـا رسول اللّٰہ توفیت امی ولم توص ولم تصدق فھل ینفعھا ان تصدقت عنھا قال نعم ولو بکراع شاۃٍ محرق ۔ (شرح الصدور مصری ص ۱۲۹)

یا رسول اللہ! میری والدہ وفات پا گئیں اور انہوں نے نہ صدقہ کی وصیت کی نہ خود صدقہ دیا اگر میں ان کی طرف سے دوں تو کیا انہیں نفع دیگا فرمایا ہاں نفع دیگا اگرچہ بکری کے جلے ہوئے پائے ہی دیں۔

طبرانی نے اوسط میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

مـا مـن اھـل میت یموت منھم میت فیصدقون بعد موتہ الا اھدا ھالہ جبرئیل علی طبـق من نور ثم یقف علی شفیر القبر فیقول یاصاحب القبر العمیق ھذہ ھدیۃ اھلھا اھداھا الیک اھلک فاقبلھا فتدخل علیہ فیفرج بھا یستبشر ویحزن جیرانہ الذین لا یھدی بھم شئ ۔

(شرح الصدور مصری ۱۲۹)

اہل میت سے جو اپنی میت کی جانب سے اس کے مرنے کے بعد صدقہ کریں تو جبریل امین نور کے طبق میں وہ ہدیہ لیجاتے ہیں اور کنارہ قبر پر کھڑے ہو کر فرماتے ہیں کہ اے گہرے گڑھے والے یہ ہدیہ ہے جسے تیرے اہل نے تیری طرف بھیجا ہے تو اسے قبول کر تو وہ اس پر داخل ہوتا ہے اور اس کے وہ پڑوسی جن کی طرف کوئی چیز نہیں بھیجی گئی رنجیدہ ہوتے ہیں۔

احادیث سے بھی یہ ثابت ہو گیا کہ میت کے لئے صدقات جائز ہیں اور اس کے لئے بہت نافع ہیں اور باعث فرح وسرور ہیں یہ حکم بکثرت آیات واحادیث سے ثابت ہے اور اہل سنت وجماعت کا اتفاقی واجماعی مسئلہ ہے۔ عقائد کی مشہور کتاب شرح فقہ اکبر میں ہے:

عـنـد اھـل السنۃ ان للانسان ان یجعل ثواب عملہ صلوۃ او صوما او حجا او صدقۃ او غیرھا۔ (شرح فقہ اکبر مصری ۱۱۸)

اہل سنت کے نزدیک انسان اپنے عمل۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ صدقہ وغیرہ کا ثواب اپنے غیر کو پہنچا سکتا ہے۔ بحر الرائق وبدائع میں ہے:

مـن صـام او صـلـی او تصدق وجعل ثوابہ لغیرہ من الاموات والاحیاء جاز ویصل ثوابھا الیھم عند اھل السنۃ والجماعۃ ۔ (شامی مصری ج ا ص ۶۳۱)

جس نے روزہ رکھا یا نماز پڑھی یا صدقہ دیا اور اس کا ثواب اپنے مردوں اور زندوں کو پہنچائے تو جائز ہے اور ان اعمال کا ثواب اہلسنت والجماعت کے نزدیک انہیں پہونچتا ہے۔

علامہ حسن شرنبلالی مراقی الفلاح شرح نور الایضاح میں علامہ زیلعی سے ناقل ہیں:

فـلـلانسان ان یـجـعـل ثـواب عملہ لغیرہ عند اھل السنۃ والجماعۃ صلوۃ کان او صوما او حجا او صدقۃ او قرأۃ للقرآن او الاذکار او غیر ذلک من انواع البر ویصل ذلک الی المیت وینفعہ۔ (طحطاوی مصری ص ۳۶۳) ۔

انسان اپنے عمل کا ثواب اپنے غیر کے لئے اہل سنت و جماعت کے نزدیک پہنچا سکتا ہے اب وہ عمل نماز ہو یا روزہ حج ہو یا صدقہ قرآن کی تلاوت ہو یا اذکار یا اس کے سوا اور نیکیوں کے اقسام وہ میت کی طرف پہنچتا ہے اور اس کو نفع دیتا ہے۔

بالجملہ آیات واحادیث اور کتب عقائد وفقہ سے ثابت ہو گیا کہ میت کے لئے صدقہ وخیرات بوجہ اللہ دینا نہ فقط جائز بلکہ مستحب ہے اور یہ صحابہ اور تابعین۔ ائمہ ومجتہدین۔ فقہا ومحدثین، عامۃ المسلمین اہل سنت وجماعت کا معمول ہے اور اموات کے لئے یہ بہت نافع اور باعث فرح وسرور ہے اور جو اس کا مخالف ومنکر ہے وہ آیات واحادیث کا انکار کرتا ہے مذہب اہل سنت وجماعت کے اتفاقی مسئلہ کی مخالفت کرتا ہے اور اموات کے ساتھ دشمنی وعداوت کرتا ہے اور مسلمانوں کو ایک نیک کام سے روکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۴۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ
اگر صدقہ اور خیرات اس طور پر تقسیم کیا جائے کہ علماء کو زیادہ دیں اور طالب علموں کو اس سے کم اور ملازموں کو اس سے کم اور فقراء ومساکین کو اس سے کم تو اس طور کی تقسیم جائز ہے یا نہیں۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

اس طرح کی تقسیم میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ہر صاحب حاجت کو اس کی منزلت ملحوظ رکھتے ہوئے دینا ہے حدیث شریف میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: انزلوا الناس منازلهم۔ (مشکوۃ شریف ص ۴۲۴)

لوگوں کا ان کی منزلتوں کے اعتبار سے اکرام کرو۔

جب منزلت کا لحاظ ثابت ہوا تو دینی منزلت ضرور دنیوی منزلت سے افضل ہے اور دینی منزلت میں بھی فرق مراتب ہیں صورت مسئلہ میں یہ ظاہر بات ہے کہ فقراء ومساکین سے ملانے افضل ہیں۔ اور ملانوں سے طالب علم افضل ہیں اور طلباء سے علماء افضل ہیں چنانچہ علما کی افضلیت کے متعلق تو خاص اسی

مسئلہ تصدق میں تصریح موجود ہے۔

طحطاوی میں معراج اور قہستانی سے ناقل ہیں:

التصدق على العالم الفقير افضل من الجاهل الفقير۔

(طحطاوی علی مراقی الفلاح مصری ص ۴۱۹)

عالم فقیر پر صدقہ کرنا جاہل فقیر پر صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

اس عبارت سے جاہل فقراء ومساکین پر عالم کی افضلیت تو صراحۃ ثابت ہو گئی۔ اب باقی رہے طلبہ اور ملانے ان پر بھی عالم کا فضل ضمنا ثابت ہوا کہ یہ دونوں بھی بہ نسبت عالم کے جاہل کے حکم میں ہیں اب باقی رہے طلبہ تو یہ مصارف صدقات کی ساتویں قسم فی سبیل اللہ میں داخل ہیں درمختار میں فی سبیل اللہ کی تفسیر نقل کی: (وفي سبيل الله وهو منقطع الغزاة) وقيل الحاج وقيل طلبة العلم۔

(شامی مصری ج ۲ ص ۶۳)

فی سبیل اللہ میں وہ لشکری محتاج ہیں کہ جہاد میں جانا چاہتا ہے اور سامان حرب پاس نہ ہو اور بعض نے کہا وہ جو حج کرنا چاہتا ہے اور خرچ نہ رکھتا ہو اور بعض نے کہا کہ طالب علم ہیں۔

ردالمحتار میں شرنبلالی سے ناقل ہیں: فالتفسير بطالب وجيه خصوصا۔

(شامی مصری ج ۲ ص ۶۳)

فی سبیل اللہ کی تفسیر طالب علم کے ساتھ کرنا خصوصاً بہت وجیہ ہے۔

اور قرآن کریم نے مصارف کو بایں ترتیب بیان فرمایا ہے:

انما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم وفي الرقاب والغارمين وفي سبيل الله وابن السبيل فريضة من الله۔ (سورہ توبہ ع ۷ ج ۱)

صدقہ تو انہیں لوگوں کے ہیں (۱) محتاج۔ (۲) اور نرے نادار۔ (۳) اور جو اسے تحصیل کر کے لائیں۔ (۴) اور جن کے دلوں کو اسلام سے الفت دی جائے۔ (۵) اور گردنیں چھڑانے میں (۶) اور قرض داروں کو۔ (۷) اور اللہ کی راہ میں۔ (۸) اور مسافر کو۔ یہ اللہ کی طرف سے فریضہ ہے۔

علامہ ابوالبرکات نسفی تفسیر مدارک میں اس آیت کریمہ کے تحت میں فرماتے ہیں:

وعدل عن اللام الى في في الاربعة الاخيرة للايذان انهم ارسخ في استحقاق التصدق عليهم ممن سبق ذكره لان في للوعاء فيه على انهم احقاء بان توضع فيهم

الصدقات ويجعلوا مظنتلها وتكرير في في قوله في سبيل الله وابن السبيل فيه فضل وترجيح لهذان على الرقاب والغارمين ۔ (مدارک ص ۱۰۱ ج ۲)

آخر کے چاروں مصارف میں بجائے معرف بلام کے حرف فی لایا گیا تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ پہلے چاروں مصارف سے یہ اخیر کے چاروں صدقہ کے حق دار ہونے میں زیادہ راسخ ہیں کیونکہ فی ظرفیہ کے لئے ہے پس متنبہ کیا گیا کہ اخیر کے چار مصارف صدقہ دیئے جانے کے زیادہ حقدار ہیں اور انہیں اس کے لئے راجح قرار دیا جائے اور فی سبیل اللہ اور ابن سبیل میں لفظ فی دوبارہ لانے میں ان دونوں کی مکاتب اور مدیون پر فضیلت اور ترجیح کی طرف اشارہ ہے۔

اس عبارت سے ثابت ہوا کہ آخر کے چاروں مصارف یعنی مکاتب، مدیون، فی سبیل اللہ، مسافر، صدقہ کے لئے پہلی چاروں اقسام یعنی فقراء، مساکین، عاملین، مؤلف قلوب پر افضل اور زیادہ حق دار ہیں اور آخر کے چاروں مصارف میں فی سبیل اللہ۔ اور مسافر کو صدقہ کے لئے مکاتب اور مدیوں پر زیادہ ترجیح اور فضیلت ہے۔

اور یہ امر ثابت ہو چکا کہ طلبا فی سبیل اللہ میں داخل ہیں تو طلباء کو فقراء و مساکین پر فضیلت حاصل ہوئی پھر طلباء کی ملانوں پر فضیلت بہت ظاہر ہے کہ طلباء کسب علم میں مشغول ہیں۔

شامی میں ہے: لاشتغاله من الكسب بالعلم ۔

لہذا ان ملانوں سے افضل ہوئے۔ اب باقی رہے ملانے تو یہ بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہیں۔

چنانچہ علامہ شامی ہدایہ سے ناقل ہیں:

في سبيل الله جميع القرب فيدخل فيه كل من سعى في طاعة الله وسبيل الخيرات اذا كان محتاجا۔ (شامی ج ۲ ص ۶۳)

فی سبیل اللہ سے تمام نیک کام مراد ہیں تو اس میں ہر وہ شخص جو طاعت الٰہی اور راہ خیرات میں کوشش کرے داخل بشرطیکہ صاحب حاجت ہو۔

اسی عبارت کے اعتبار سے ملانے بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہوئے کہ وہ بھی طاعت الٰہی میں ساعی ہوتے ہیں۔ لہذا ان کی فضیلت بھی تقریر بالا سے فقراء و مساکین پر ثابت ہوتی۔

حاصل جواب یہ ہے کہ صدقہ میں اگر ایسا فرق کر دیا جائے کہ علما کو زیادہ دیں اور طلبا کو اس سے کم اور ملانوں کو اس سے کم اور فقراء و مساکین کو اس سے کم تو اس میں کوئی ممانعت شرعی لازم نہیں آتی۔

جیسا کہ تحقیق بالا سے ثابت ہوا جو اسے ناجائز کہے کسی دلیل سے ثابت کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۴۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ
تونگر کو مردہ کا صدقہ یا خیرات لینا جائز ہے یا نہیں:۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

صدقات واجبہ زکوۃ وفطرہ وغیرہ تو اغنیا اور تونگروں کو لینا ممنوع ہے ترمذی شریف وابوداؤد شریف دارمی شریف میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: لا يحل الصدقة لغني ۔ (مشکوۃ شریف ص ۱۶۱)

صدقہ مالدار کے لئے حلال نہیں۔

اور مردے کے لئے صدقہ وخیرات کیا جاتا ہے ظاہر یہ ہے کہ وہ صدقہ واجبہ نہیں بلکہ صدقہ نافلہ میں داخل ہے اور صدقہ نفل تونگر اور غنی کے لئے ممنوع نہیں اب چاہے وہ غنی ہو یا غیر عالم چنانچہ۔

جوہر نیرہ میں ہے: ولو دفع الى الغني صدقة التطوع جاز له اخذها۔
(جوہر نیرہ مطبوعہ مجتبائی دہلی ص ۱۳۲)

اگر مالدار کو صدقہ نفل دیا جائے تو اسے لینا جائز بھی ہے۔

لہذا ثابت ہو گیا کہ مردے کے لئے جو صدقہ وخیرات کی جاتی ہے وہ تونگر عالم کو لینی جائز ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۴۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ

مردے کی خیرات ہر شخص لے سکتا ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جب یہ ثابت ہو چکا کہ مردے کے لئے جو صدقات کئے جاتے ہیں وہ صدقہ نافلہ ہیں اور صدقہ نافلہ فقیر وغنی ہر ایک کے لئے جائز ہے۔ البتہ اولی یہ ہے کہ فقیر کو دیں اور اغنیاء اس کو نہ لیں۔

ردالمحتار میں ہے: صرح فی الذخیرۃ بان فی التصدق علی الغنی نوع قربۃ دون قربۃ الفقیر۔ (ردالمحتار مصری ص ۳۶۸)

ذخیرہ میں تصریح کی کہ مالدار پر صدقہ کرنا ثواب کا کام ہے مگر فقیر پر صدقہ کرنے کے ثواب سے کم۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی فتاوی عزیزیہ میں خاص فاتحہ کے متعلق فرماتے ہیں:

گر فاتحہ بنام بزرگی دادہ شد بس اغنیارا ہم خوردن ازاں جائز است۔ از فتاوی عزیزیہ ص ۴۱

اگر کسی بزرگ کے نام پر فاتحہ دی گئی تو مالداروں کو بھی اس میں سے کھانا جائز ہے۔

لہذا مردے کی خیرات اور صدقات ہر ایک کے لئے جائز ہے غنی کے لئے بھی ہے مگر غنی کے لئے اولی یہ ہے کہ وہ اس سے اجتناب و پرہیز کرے لیکن غنی کے دینے میں بھی ثواب ہوتا ہے۔ اگرچہ فقیر کے دینے سے کم ہوتا ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۴۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ میت کی تجہیز وتکفین کے بعد فقط اتنی رقم اور سامان ہے کہ جس سے اس کی اہلیہ اور یتیم بچوں کی گذر اوقات ہو سکتی ہے اگر اس میں کم از کم بقدر حیثیت خیرات کی جائے جب بھی محتاج الی غیر ہم ہونے کا خوف ہے تو ایسی حالت میں اس کے مال متروکہ سے اس کے لئے صدقہ خیرات کریں یا کھانا کھلائیں یہ جائز ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

سوال اول کے جواب میں آیت کریمہ اور اس کی تفاسیر سے یہ ثابت ہو چکا کہ ترکہ کی تقسیم سے پہلے غیر وارث رشتہ داروں یتیموں۔ مسکینوں کو مال میت سے کچھ بطور صدقہ اور خیرات کے دنیا مستحب ہے زمانہ صحابہ میں اس پر عمل رہا ہے۔

محدثین نے اس پر عمل کیا چنانچہ حضرت محمد بن سیرین سے مروی ہے جس کو علامہ محی السنۃ امام بغوی نے تفسیر معالم التنزیل آیت مذکورہ کے تحت میں نقل کیا: روی محمد بن سیرین ان عبیدۃ السلمانی قسم اموال الیتام فامر بشاۃ فذبحت فصنع طعاما لاجل ہذہ الایۃ وقال لولا ہذہ الایۃ لکان ہذا من مالی۔ (حاشیہ خازن مصری ج ۱ ص ۴۰۴)

حضرت امام سیرین سے مروی ہے کہ حضرت عبیدہ سلمانی نے یتیموں کا مال تقسیم کرتے ہوئے ایک بکری کے ذبح کرنے کا حکم فرمایا اور فقراء کے لئے کھانا تیار ہوا بموجب اس آیت کریمہ کے اور فرمایا کہ اگر یہ آیت نہ ہوتی تو یہ میرے مال سے ہوتا۔

بالجملہ تجہیز وتکفین کے بعد اور تقسیم ترکہ سے قبل میت کے مال سے صدقات وخیرات کرنے کا استحباب آیت کریمہ سے ثابت ہوا۔ اور صحابہ کرام اور محدثین عظام کے عمل سے ثابت ہوا البتہ اس صدقہ وخیرات کی کوئی مقدار ثابت نہیں تو جتنا اس وقت مناسب حال ہو۔ اسی قدر فقراء ومساکین کو دیں یا کھانا کھلائیں۔ ہاں اگر بعض وارث نابالغ ہیں یا مال متروکہ قلیل ہو یا بعض وارث اس وقت موجود نہ ہوں اور ان کی اجازت نہ ہو تو ان صورتوں میں ترکہ سے صدقہ وخیرات ممنوع ہے۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے آیت مذکورہ کی تفسیر میں ہے:

عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کان المال کثیرا یرضخ لہم وان کان قلیلا اعتذر الیہم۔ (تفسیر احمدی مطبوعہ جید پریس دہلی ص ۱۳)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ اگر مال زاید ہو تو فقرا کو کچھ دیا جائے اور اگر قلیل ہو تو ان سے عذر کر دیا جائے۔

علامہ ناظر الشریعۃ علی بغدادی تفسیر خازن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت نقل فرماتے ہیں:

قال ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ان کان الورثۃ کبارا رضخوالہم وان کان الورثۃ صغاراً اعتذر الیہم فیقول الولی او الوصی انی لااملک ہذا المال وانما ہو للصغار

ولو كان لي منه شئ لاعطيكم وان يكبروا فسيعرفوا حقكم هذا هو القول المعروف ۔

(خازن مصری ج ا ص ۴۰۴)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اگر وارث بالغ ہوں تو فقراء کو کچھ دیں اور اگر وارث نابالغ ہوں تو ان سے عذر کر دیا جائے اور ولی یا وصی یہ کہے میں اس مال کا مالک نہیں یہ تو نابالغوں کا مال ہے اگر مجھے اس میں کچھ اختیار ہوتا تو میں تمہیں ضرور دیتا یہ بالغ ہو کر عنقریب تمہارا حق پہچان لینگے یہی وہ لفظ ہیں جن کو آیت میں قول معروف فرمایا۔

ردالمحتار حاشیہ درمختار میں ہے:

ان كانت الورثة فقراء ولا يستغنون بما يرثون فالترك اولىٰ لما فيه من الصدقة على القريب وقد قال عليه الصلاة والسلام افضل الصدقة على ذى الرحم الكاشح ولان فيه رعاية حق الفقراء والقرابة جميعا۔

(ردالمحتار ج ۵ ص ۴۳۱)

اگر وارث فقراء ہیں اور اپنے ترکہ کے حصوں سے مستغنی نہیں ہوں گے تو فقراء کو نہ دینا بہتر ہے کہ اس میں بھی رشتہ دار پر صدقہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ افضل صدقہ ذی حاجت رشتہ دار کو دینا ہے اور اس لئے کہ رشتہ دار کو دینے میں فقر اور قرابت دونوں کے حقوق کی رعایت ہے۔

البتہ بالغ ورثہ اپنے اپنے حصہ سے یا اپنی طرف سے اپنے مال سے میت کے لئے جس قدر چاہیں صدقہ اور خیرات کر سکتے ہیں۔

شامی میں ہے: اذا جاز بعض الورثة جاز عليه بقدر حقه ۔

(شامی ج ۵ ص ۴۳۰)

وذكرت فيما قبل مفصلا واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۴۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ
بروز سوم تہلیل اور قرآن کریم کے ختم کے بعد سب شرکاء کا سوم کو اگر میت کی طرف سے بطور

خیرات لوجہ اللہ پیسے دیئے جائیں یا کچھ اور دیا جائے تو یہ فعل جائز ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

بروز سوم قرآن مجید اور کلمہ شریف میت کے لئے پڑھنا باعث اجر جزیل ہے میت کے لئے قرآن مجید کا پڑھنا تو اجماع امت سے ثابت ہے کہ بلا انکار ہمیشہ سے اہل اسلام ہر زمانہ میں اموات کے لئے قرآن کریم کی تلاوت کرتے رہے۔ چنانچہ حضرت علامۃ الدہر جلال الدین سیوطی شرح الصدور میں فرماتے ہیں۔

ان المسلمين مازالوا في كل عصر يجتمعون ويقرؤن لموتاهم من غير نكير فكان ذلك اجماعا۔

(شرح الصدور مصری ۱۳۰)

مسلمان ہمیشہ سے ہر زمانے میں بلا کسی انکار کے اپنے مردوں کے لئے جمع ہوتے اور قرآن کریم پڑھتے تو یہ اجماع ہو گیا۔

اسی طرح کلمہ شریف کا میت کے لئے پڑھنا سنت اجر جلیل اور باعث ثواب جزیل ہے۔ چنانچہ امام ابوالقاسم جیلی نے دیباج میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

اخبرني جبريل ان لا اله الا الله انس للمسلم عند موته وفي قبره وحين يخرج من قبره ۔

(شرح الصدور ص ۷۸)

مجھے جبریل امیں نے خبر دی کہ لا اله الا الله محمد رسول الله مسلمان کے لئے اس کی موت کے وقت اور اسکی قبر میں اور جس وقت وہ قبر سے اٹھیگا انس ہوگا۔

علامہ علی قاری علیہ رحمۃ الباری شرح شفاء شریف میں فرماتے ہیں:

حكي عن العارف بالله محي الدين بن عربي رحمة الله تعالىٰ عليه انه قال بلغني عن النبي صلى الله تعالىٰ عليه وسلم انه من قال لا اله الا الله سبعين الف مرة غفر وكنت ذكرت هذا العدد وما عينته لاحد حتى اجتمعت في ضيافة مع شباب مشتهر باالمكاشفة فبكي اثناء اكله فسألته عن حالة فقال ارى امي وابي يعذبان فقلت في نفسي وهبت ثواب التهليل الحليل لميت هذا الرجل الجميل فضحك فسألته فقال ارتفع عنهما العذاب

فعرفت صحة الحدیث بکشفه وصحة کشفه بثبوت الحدیث واصله۔

(شرح شفاء ج۲ص۳۹۹)

حضرت عارف باللہ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا مجھ تک نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث پہنچی کہ حضور نے فرمایا کہ جس نے کلمہ شریف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ستر ہزار بار پڑھا تو اس کی مغفرت کردی جائے گی۔ میں نے اتنی مقدار کلمہ شریف پڑھا اور کسی خاص شخص کو نہیں بخشا یہاں تک کہ میں ایک دعوت میں اس نوجوان کے ساتھ جمع ہوا جو مکاشفہ میں مشہور تھا وہ کھاتے کھاتے رونے لگا۔ میں نے اس سے اس کا حال دریافت کیا اس نے جواب دیا کہ اپنے ماں باپ کو عذاب میں دیکھ رہا ہوں تو میں نے اپنے دل ہی دل میں اس کلمہ شریف کا ثواب اس نیک جوان کے ماں باپ کو بخشدیا تو وہ نوجوان ہنسنے لگا میں نے اس سے اس کا سبب دریافت کیا اس نوجوان نے کہا کہ دونوں سے عذاب اٹھ گیا پس میں نے اس حدیث کی صحت کو اس کے کشف سے پہچانا اور اس کے کشف کی صحت کو حدیث کے ثبوت واصل سے جانا۔

بالجملہ قرآن کریم اور کلمہ شریف میت کے لئے نہایت ہی نافع چیز ہے اسی لئے بروز سوم یہ اہل اسلام کا معمول قرار پایا۔ باقی رہا اہل اسلام میت کا قرآن وکلمہ خوان کو کچھ دینا تو اگر دینے والا بغرض اجرت دے اور لینے والا بھی بخیال اجرت لے رہا ہے تو نہ ایسی اجرت جائز نہ میت کو اس سے ثواب پہنچے اور لینے دینے والا دونوں گنہگار۔

چنانچہ علامہ شامی عینی شرح ہدایہ سے ناقل ہیں:

ویمنع القاری للدنیا والاخذ والمعطی آثمان فالحاصل ان ماشاع فی زماننا من قرأة الاجزاء بالاجره لایجوز۔ (ردالمحتار ج۵ص۳۶)

قرآن خواں کو بغرض دنیا قرآن پڑھنا ممنوع ہے لینے والا اور دینے والا دونوں گنہگار ہیں حاصل کلام یہ ہے کہ ہمارے زمانہ میں جو پاروں کا اجرت پر پڑھنا رائج ہے یہ جائز نہیں۔

اسی میں حضرت شیخ الاسلام امام تقی الدین کا قول منقول ہے:

ولایصح الاستیجار علی القرأة واهدائها الی المیت لانه لم ینقل عن احد من الائمة الاذن فی ذلک وقد قال العلماء ان القاری اذا قرأ لاجل المال فلا ثواب له فای شئ یهدیه الی المیت وانما یصل الی المیت العمل الصالح والاستجار علی مجرد التلاوة لم

یقل به احد من الائمة وانما تنازعوا فی الاستیجار علی التعلیم۔ (ردالمحتار مصری ج۵ص۳۷)

قرآن پڑھنے پر اجرت لینا اور اسے میت کو ہدیہ کرنا صحیح نہیں کیونکہ اس میں ائمہ سے کسی امام سے بھی اجازت منقول نہیں اور فقہاء نے فرمایا کہ جب قرآن خواں نے مال کے لئے پڑھا تو اسے ثواب نہیں ملا پس وہ میت کی طرف کس چیز کا ہدیہ کرتا ہے اور میت کو صرف نیک عمل پہنچتا ہے اور صرف قرآن پڑھنے پر اجر لینا اس کا ائمہ میں سے کوئی قائل نہیں اور ائمہ کا اختلاف تعلیم قرآن پر اجرت لینے کے متعلق ہے۔

یہ حکم تو اس صورت میں ہے جب ان میں اجرت طے ہوجائے اور دام ٹھہر جائیں اور اگر نہ اس میں اجرت طے ہوئی اور نہ کوئی گفتگو آئی لیکن وہاں کے عرف ورواج میں دینے والا اسی نیت سے دیتا ہے اور پڑھنے والا اسی نیت سے پڑھتا ہے اور بعد ختم دینے لینے کا دستور ہے تو اس صورت کا بھی بعینہ وہی حکم ہے جو صورت اول مذکور ہوئی۔ فقہائے کرام کا مشہور قاعدہ ہے۔ المعروف کالمشروط۔

(شامی ج۵ص۳۶)

اور اگر پڑھنے والا بہ نیت ثواب پڑھتا ہے اور اہل میت لوجہ اللہ بطور صدقہ دیتے ہیں تو یہ صورت جائز ہے اس میں نہ دینے والے کے لئے کوئی قباحت نہ لینے والے کو ممانعت اور میت کے لئے باعث اجر وثواب ہے۔

علامہ ابراہیم حلبی کبیری میں فتاوی بزازیہ سے ناقل ہیں:

وان اتخذوا طعاما للفقراء کان حسنا۔ (کبیری مطبوعہ لکھنؤ ص ۵۶۵)

اگر اہل میت فقراء کے لئے کھانا تیار کریں تو بہتر ہے۔

بالجملہ صورت مسئولہ کا مختصر الفاظ میں یہ جواب ہے کہ شرکاء سوم کو بلالحاظ اجرت مشروط ومعروف کے بطور خیرات لوجہ اللہ کھانا کھلانا یا پیسے دینا یا کچھ اور چیز دینا جائز ودرست ہے نہ اس میں اہل میت پر کچھ مواخذہ نہ شرکاء سوم پر کچھ معاقبہ نہ اس میں شان مواجرہ نہ میت کے لئے اہداء ثواب میں کچھ مضائقہ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۴۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ

دام ٹھرا کر چند شخصوں کو قرآن خوانی کے لئے مقرر کرنا چاروں روز برابر اجرت طے کر کے قبر پر اس طرح پڑھوانا کہ کوئی شخص رات میں پڑھے کوئی دن میں پڑھے یہ شرعا جائز ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم علی رسوله الکریم

قبر پر قرآن کریم دام ٹھرا کر پڑھنا اور پڑھوانا ناجائز ہے جیسا کہ جواب سابق میں گذرا۔

نیز شامی میں ہے کہ علامہ خیرالدین رملی نے حاشیہ بحر میں فرمایا ہے:

اقول المفتی بہ جواز الاخذ استحسانا علی تعلیم القران لا علی القراۃ المجردۃ کما صرح بہ فی التاتارخانیۃ حیث قال لا معنی لھذہ الوصیۃ ولصلۃ القاری بقراتہ وھی بدعۃ ولم یفعلھا احد من الخلفاء وقد ذکرنا مسئلۃ تعلیم القرآن علی استحسان اہ تعنی للضرورۃ ولا ضرورۃ فی الاستیجار علی القراۃ علی القبر۔ (ردالمحتار مصری ج۵ ص۳۶)

میں کہتا ہوں کہ مفتی بہ قول تعلیم قرآن پر اجرت لینے کا جواز واستحسان ہے صرف قرآن پڑھنے پر اجرت لینا جائز نہیں جیسے کہ تاتارخانیہ میں اس کی تصریح کی فرمایا کہ قرآن پڑھنے کی وصیت اور قرآن خواں کی تلاوت پر اجرت کے کوئی معنی نہیں اس لئے کہ یہ دینا بمنزلہ اجرت کے ہیں کہ اس میں اجارہ باطل ہے اور یہ بدعت ہے اس کو خلفاء میں سے کسی نے نہیں کیا اور ہم نے جو مسئلہ تعلیم قرآن کی اجرت واستحسان کا ذکر کیا تو وہ ضرورت کے لئے ہے اور قبر پر قرآن پڑھنے کی اجرت میں کوئی ضرورت نہیں۔

ردالمحتار حاشیہ درمختار میں ہے:

انما اجازوہ فی محل الضرورۃ کالاستیجار لتعلیم القرآن او الفقہ او الاذان او الامامۃ خشیۃ التعطیل لقلۃ رغبۃ الناس فی الخیر ولاضرورہ فی استیجار شخص یقرء علی القبر او غیرہ اہ رحمتی اقول ھذا ھو الصواب وقد اخطاء فی مسئلۃ جماعۃ ظنا منھم ان المفتی بہ عندالمتاخرین جواز الاستیجار علی جمیع الطاعات ۔ (ردالمحتار ص۴۵۷)

نیکیوں پر اجرت کی جو فقہاء نے اجازت دی ہے وہ صرف محل ضرورت میں ہے جیسے تعلیم قرآن یا فقہ یا اذان یا امامت کی اجرت لینا یہ بخوف معطل ہونے کے ہے کہ لوگوں کو جس کی طرف رغبت کم ہے قبر یا غیر قبر کسی شخص کے پڑھنے پر اجرت لینے میں کوئی ضرورت نہیں (رحمتی)

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی قول درست ہے اور اس مسئلہ میں ایک جماعت نے اس گمان پر خطا کی

ہے کہ متاخرین کے نزدیک مفتی بہ قول تمام نیکیوں پر اجرت لینے کا جواز ہے۔

باقی اس کی ایک یہ صورت ہوسکتی ہے کہ حفاظ کو اپنے کاموں کے لئے ملازم رکھے اور ایک وقت انسے یہ کام بھی لے لے۔ کما لایخفی لمن یطالع کتب الفقہ ۔

بلا اجرت مشروط ومعروف کے قرآن مجید کا پڑھنا جائز ہے صحابہ کرام کے عمل سے ثابت ہے۔

چنانچہ خاتم المحققین حضرت علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شرح الصدور میں جامع خلال سے روایت نقل فرمائی ہے:

عن الشعبی قال کانت الانصار اذامات لھم المیت اختلفوا الی قبرہ یقرؤن لہ القرآن (شرح الصدور ص۱۳۰)

امام شعبی سے مروی ہے کہ انصار میں سے جب کوئی مرجاتا تو اس کی قبر کی طرف جاتے اور اس کے لئے قرآن کریم پڑھتے۔

علامہ حسن شرنبلالی نورالایضاح میں فرماتے ہیں: لایکرہ الجلوس للقرأۃ علی القبر فی المختار۔ (نورالایضاح ص۶۶)

مذہب مختار میں قبر پر قرآن پڑھنے کے لئے بیٹھنا مکروہ نہیں۔

علامہ ابراہیم غنیۃ المستملی میں فرماتے ہیں:

واختلفوا فی اجلاس القارئین لیقروا عندالقبر والمختار عدم الکراھۃ۔ (غنیۃ لکھنو ص۵۶۴)

قبر پر قرآن پڑھنے کے لئے قرآن خواں کے بٹھانے میں فقہاء نے اختلاف کیا ہے اور مذہب مختار عدم کراہت ہے۔

علامہ محمد علاءالدین حصکفی درمختار میں فرماتے ہیں:

لایکرہ الدفن لیلا ولا اجلاس القارئین عند القبر ھو المختار۔

(شامی ج۱ ص۶۳۳)

میت کا رات میں دفن کرنا اور اس کی قبر کے پاس قرآن پڑھنے والوں کا بٹھانا مذہب مختار میں مکروہ نہیں۔

حاصل جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کا قبر پر پڑھنا یا پڑھوانا ممنوع نہیں یہ تو ایسا ہے جو صحابہ کرام

رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا معمول ہے ہاں ممنوع اس نیک کام پر اجرت طے کرنا ہے اور دوام ٹھہرانا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۴۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ
تعین ماہ بغرض جلسہ میلاد شریف یوم سوم وغیرہ بغرض ایصال ثواب موتے قولاً یا فعلاً رسول اللہ یا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے باسناد صحیحہ سے ثابت ہے یا نہیں؟۔ اگر ثابت ہے تو حوالہ کتب مع صفحہ کے تحریر فرمائیے، اور اگر ثابت نہیں تو بدعت ہے یا نہیں؟۔ اگر بدعت ہے تو مرتکب بدعت کا کیا حکم ہے؟ اور اگر بدعت نہیں تو بدعت کی شرعا کیا تعریف ہے؟ مقصود مسائل جواب مختصر ہے۔
بینوا توجروا

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

وہابیہ نے میلاد شریف فاتحہ سوم عرس وگیارہویں شریف وغیرہ امور مستحبہ کے انکار میں جس قدر کوششیں کی ہیں اتنی کسی حرام ومکروہ بلکہ کسی شعار کفریہ کے لئے بھی نہیں کیں۔ لیکن ان کی انتہائی کوششیں ان امور کے استحباب کو نہ میٹ سکیں اور ان کو ناجائز وحرام نہ کرسکیں۔ ہمیشہ اہلسنت نے ان کی فریب کاریوں کا پردہ فاش کیا اور ان کے لغو اور بیہودہ اعتراضات کے ایسے دندان شکن جوابات دیئے جنہیں آج تک وہابیہ کو ایک حرف لکھنے کی جرات نہ ہوسکی۔ چنانچہ خود میری کتاب سبیل الرشاد میں اور میلاد شریف فاتحہ۔ سوم۔ عرس۔ گیارھویں شریف۔ کے جواز واستحباب پر بکثرت دلائل اور منکرین کے کلمات کے مسکت جوابات طبع ہوچکے ہیں اور یہ کتاب ہزاروں کی تعداد میں ہندوستان کے ہر ایک گوشہ گوشہ میں موجود ہے مگر کسی وہابی نے آج تک اس کے جواب کی ہمت نہ کی میلاد شریف کی اصل۔ یعنی واقعات پیدائش کے مسائل معجزات مسلمانوں کی مجلس میں بیان کرنا خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہے۔

عن واثلة قال رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم: ان الله اصطفى من ولد ابراهيم اسمعيل واصطفىٰ من ولد اسمعيل بنو كنانه واصطفىٰ من بني كنانة قريشا واصطفىٰ من قريش بني هاشم واصطفاني من بني هاشم ۔
(شرح شفاء وترمذی ومسلم ص ۱۹۸)

حضرت واثلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیم (علیہ السلام) سے اسمعیل (علیہ السلام) کو منتخب کیا اور اولاد اسمعیل (علیہ السلام) سے بنی کنانہ کو منتخب کیا اور بنی کنانہ سے قریش کو منتخب کیا اور قریش سے بنی ہاشم کو منتخب کیا اور بنی ہاشم سے مجھے منتخب فرمایا۔

وعن العباس انه جاء الى النبي صلى الله تعالىٰ عليه وسلم فكانه سمع شيئا فقام النبي صلى الله تعالىٰ عليه وسلم فقال من انا فقالوا انت رسول الله قال انا محمد بن عبدالله بن عبدالمطلب ان الله خلق الخلق فجعلني في خيرهم ثم جعلهم فرقتين فجعلني في خيرهم فرقة ثم جعلهم قبائل فجعلني في خيرهم قبيلة ثم جعلهم بيوتا فجعلني في خيرهم بيتا فانا خيرهم نفسا وخيرهم بيتا ۔　(رواہ الترمذی، مشکوۃ شریف ص ۵۱۳)

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے نسب شریف پر اعتراض سنا تھا تو حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ممبر پر قیام کیا اور فرمایا میں کون ہوں صحابہ نے عرض کیا آپ رسول اللہ ہیں۔ فرمایا میں ابن عبداللہ بن عبدالمطلب ہوں اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی پیدائش کی اور مجھے خیر الخلق کیا پھر ان کے دو گروہ کئے تو مجھے ان کے بہتر فرقہ میں پیدا کیا پھر انہیں قبیلہ قبیلہ کیا تو مجھے ان کے بہتر قبیلہ میں مخلوق کیا۔ پھر اس کو خاندان کیا تو مجھے ان کے بہتر خاندان میں کیا پس میں باعتبار ذات کے بہترین بنی آدم ہوں اور باعتبار خاندان کے خیر البشر ہوں۔

اسی طرح سوم وفاتحہ کی اصل یعنی ایصال ثواب بھی خود حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول وفعل سے ثابت ہے چنانچہ طبرانی اوسط میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ انہوں نے سرکار رسالت میں عرض کیا!

يارسول الله توفيت امي ولم توص ولم تصدق فهل ينفعها ان تصدقت عنها قال

نعم ولو بکراع شاۃ محرق۔ (شرح الصدور مصری ص۱۲۹)

یارسول اللہ میری والدہ وفات پاگئیں، انہوں نے نہ صدقہ کی وصیت کی نہ خود صدقہ دیا۔ اگر میں ان کی طرف سے صدقہ دوں تو کیا انہیں نفع دیگا؟ فرمایا: ہاں نفع دیگا اگرچہ بکری کے جلے ہوئے پائے ہی ہوں۔

طبرانی نے اوسط میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے سنا۔

مامن اھل میت یموت منھم میت فیتصدقون عنه بعد موته علی احداھا له جبرئیل علی طبق من نور ثم یقف علی شفیر القبر فیقول یاصاحب القبر العمیق ھذہ ھدیة اھداھا الیك اھلك فاقبلھا فتدخل علیه فیفرح بھاویستبشر ویحزن جیرانه الذین لایھدی الیه شیئا۔

(شرح الصدور مصری ۱۲۹)

اہل میت سے جو اپنی میت کی جانب سے اس کے مرنے کے بعد صدقہ کریں تو جبریل امیں نور کے طبق میں وہ ہدیہ لے جاتے ہیں اور کنارہ قبر پر کھڑے ہوکر فرماتے ہیں اے گہرے گڑھے والے یہ ہدیہ ہے جسے تیرے اہل نے تیری طرف بھیجا ہے تو اسے قبول کر تو وہ اس پر داخل ہوتا ہے پس وہ اس کی وجہ سے خوش ہوتا ہے اور بشارت حاصل کرتا ہے اور اس کے وہ پڑوسی جن کی طرف کوئی چیز نہیں بھیجی گئی رنجیدہ ہوتے ہیں۔

اب باقی رہی میلاد شریف وسوم فاتحہ کی قیودات وتخصیصات وتعینات واہتمامات وہ اسی طرح ہیں جس طرح مدرسہ کی اصل یعنی تعلیم حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول وفعل سے ثابت ہے اور مدرسے کے تعینات وتخصیصات۔ قیودات واہتمامات یعنی تعلیم کے لئے مخصوص کتابیں مقرر کرنا فلسفہ ومنطق اور معانی وغیرہ کا داخل کرنا درجہ بندیاں کرنا۔ ہر درجہ کے لئے مستقل استاد مقرر کرنا۔ ہر کتاب کے لئے گھنٹے مقرر کرنا۔ جمعہ عیدین رمضان المبارک کے ایام کو تعطیل کے لئے مقرر کرنا۔ ماہ شعبان کو امتحان کے لئے مقرر کرنا۔ خاص نصاب ختم ہونے پر سند دینا۔ دستار بندی کرنا۔ اور تقسیم اسناد دستار بندی کے لئے جلسہ کی تاریخیں مقرر کرنا۔ اشتہار چھاپنا۔ بذریعہ خطوط تداعی کرنا۔ مخصوص علماء کو بلانا۔ بلائے ہوئے علماء کو کرائے دینا جلسوں کے لئے پروگرام معین کرنا۔ بہت سے ہاتھوں سے طلبا کے سروں پر دستار باندھنا۔ جلسے گاہ کو مزین کرنا۔ اس میں روشنی کرنا۔ شامیانے لگانا مدرسے کے لئے مخصوص عمارت بنانا۔

دارالحدیث اور دارالاقامہ کے لئے علیحدہ عمارت مخصوص کرنا۔ دینی تعلیم پر مدرسین کو معین تنخواہ دینا۔ بخاری شریف کے ختم پر مٹھائی تقسیم کرنا۔ یہ ساری باتیں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول وفعل سے ثابت نہیں تو میلاد شریف اور سوم وغیرہ کے منکرین مدرسہ کی ان تخصیصات وقیودات تعینات واہتمامات کی بنا پر کیا مدرسہ کو بدعت گمراہی قرار دیں گے اور بانیان مدرسہ پر مرتکب بدعت اور گمراہ وبیدین ہونے کے فتوی صادر کریں گے اگر نہ کہیں گے تو مدرسے کی ساری تخصیصات وتعینات قیودات واہتمامات کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول وفعل سے باسناد صحیحہ ثابت کریں لیکن انشاء اللہ تعالیٰ وہ قیامت تک ثابت نہیں کرسکیں گے تو کس منہ سے میلاد شریف کے تعینات وتخصیصات پر اعتراضات کرتے ہیں اور عوام مسلمیں کو مغالطہ وفریب دیتے ہیں اب میں وہابیہ کے لئے خود ان کے امام الطائفہ مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کا فتوی پیش کرتا ہوں چنانچہ فتاوی رشیدیہ حصہ اول ص۱۰۴ پر ہے۔

سوال پچیسواں: صوفیائے کرام کے یہاں جو اکثر اشغال اور اذکار مثل رگ کیماس کا پکڑنا کرنا اور ذکر ارہ اور حلقہ پر قبور نہیں بلکہ ویسے ہی اور حبس دم وغیرہ جو قرون ثلثہ سے ثابت نہیں بدعت ہے یا نہیں؟۔

جواب: اشغال صوفیہ بطور معالجہ کے ہیں سب کی اصل نصوص سے ثابت ہے جیسا اصل علاج ثابت ہے مگر شربت بنفشہ حدیث صریح سے ثابت نہیں ایسا ہی سب اذکار کی اصل ثابت ہے جیسا توپ بندوق کی اصل ثابت ہے اگرچہ اس وقت نہ تھی سو یہ بدعت نہیں ہاں ان ہیئات کو سنت ضروری خاصہ جاننا بدعت ہے اور اس کو علماء نے بدعت لکھا ہے۔

گنگوہی صاحب نے اس جواب میں نہایت واضح الفاظ میں فرمایا کہ اشغال صوفیہ ان تخصیصات وتعینات کے ساتھ قرون ثلثہ میں نہیں تھے مگر چونکہ ان کی اصل نصوص سے ثابت ہورہی ہے تو ان کو محض ان تخصیصات وقیودات کی بنا پر بدعت مان کر انہیں بدعت سے خارج کرکے اس قاعدہ کو اور واضح کردیا لہذا اسی طرح میلاد شریف سوم وغیرہ کی اصلیں چونکہ نصوص سے ثابت ہیں تو محض تخصیصات وتعینات کی بنا پر میلاد شریف وسوم وغیرہ کو باقرار گنگوہی صاحب کے بدعت نہیں کہہ سکتے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۴۸)

کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین نسبت مسائل کے حوالہ جات قرآن واحادیث سے جواب عنایت فرمایا جائے

بعض اضلاع میں میت کو دفن کرتے وقت قبر میں قل ھو اللہ پڑھ کر دم کر کے مٹی مردے کے سرہانے ڈالتے ہیں اور بعد دفن اذان پڑھتے ہیں کیا شرعا یہ دونوں جائز ہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

یہ دونوں فعل جائز ہیں۔قل ھو اللہ شریف پڑھ کر میت کے لئے ایصال ثواب کرتے ہیں اور اس پر مٹی کو گواہ بنا دیتے ہیں کوئی محذور شرعی لازم نہیں آیا لہٰذا اس کے ناجائز ہونیکی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی اور اذان سے میت کو چند فائدے ہوتے ہیں کہ شیطان جب قبر میں اگر مردوں کو دھوکہ دیتا ہے تو اذان کی وجہ سے اس کو شر شیطان سے پناہ حاصل ہوجاتی ہے اور نیز اذان کی وجہ سے دفع وحشت قبر سے ہوجاتی ہے ونیز اذان کی وجہ زوال غم وحصول سرور فرحت حاصل ہوگئی جب احادیث سے مستفاد ہے تو اذان علی القبر کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی لہٰذا یہ دونوں امور جائز وموجب اجر وثواب ہیں۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ، المتوسل بالنبی المرسل العبد الارذل محمد اول بن المفتی مولینا الحاج محمد اجمل
نائب مفتی اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل یکم جمادی الاخرہ ۱۳۷۷ھ

ھذا الجوب صحیح محمد اجمل غفر اللہ عز وجل سنبھل

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۴۹)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں

عرض یہ ہے کہ میت کے وارث قرآن مجید کا واسطے کفارہ گناہوں کے کراتے ہیں ورا اور کچھ رقم نقد اور گندم وغیرہ ایک تھیلی میں ڈال کر اور ساتھ لیکر میت کے کفارہ میں دیتے ہیں اور اس کے گناہ فرض واجب وغیرہ دینے والے کو سناتے ہیں اور وسیلہ قرآن پاک کا کر کے دیتے ہیں اور بعض لوگ صرف رقم حد یہ کر کے دیتے ہیں۔بعض لوگ صرف کلام پاک ہی کفارہ میں دیتے ہیں تو چند علماء اس کو ناجائز اور

بدعت کہتے ہیں اور علم فقہ کے مسائل کو نہیں مانتے اور یہ کہتے ہیں کہ علم فقہ کیا چیز ہے ہم اس کو نہیں مانتے آیا یہ علم فقہ قابل اعتبار ہے یا نہیں اس پر عمل کرنا کیسا ہے اور یہ اسقاط کا طریقہ کہاں سے شروع ہوا ہے اور اسقاط کرنے کا ثبوت قرآن حدیث سے ہے یا نہیں مفصل تحریر فرما دیں اس عبارت میں اگر کوئی غلطی ہو تو معاف فرما کر اصلاح فرمائی جائے۔

السائل عمر الدین جی لوہار پورہ ناگور مارواڑ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اسقاط کا یہ طریقہ بالکل ناکافی اور بے اصل ہے تو قرآن وحدیث سے کیسے ثابت ہوسکتا ہے اس کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین سے ناواقف اور جاہل لوگوں نے محض اپنی منفعت اور غرض حاصل کرنے کے لئے اپنے دل سے گڑھ لیا ہے دیندار آدمی کم از کم اتنا جانتا ہے کہ ہر روزے ہر وقت کی نماز کے بدلے میں ساڑھے تین سیر جو یا پونے دو سیر گندم یا آٹا یا ان کی قیمت میت کی طرف سے اگر ادا کی جائے تو صرف اس کی نمازوں کا فریضہ ذمہ سے ساقط ہوجاتا ہے۔چہ جائیکہ اس کے عمر بھر کے فرائض وواجبات صرف کلام پاک کے دینے یا رقم دیدینے سے ادا ہوسکتی ہے لہٰذا ثابت ہوگیا کہ یہ طریقہ اسقاط بالکل جاہلانہ طریقہ ہے۔

علم فقہ شریعت کے فروعی وتفصیلی احکام ومسائل کے جاننے کا نام ہے جو قرآن وحدیث اور اجماع وقیاس چاروں دلائل شرع میں سے کسی ایک دلیل سے ثابت ہوتے ہیں۔تو علم فقہ کا انکار کرنا اور نہ ماننا گویا قرآن وحدیث کا انکار کرنا اور نہ ماننا ہے۔العیاذ باللہ تعالیٰ۔واللہ تعالیٰ اعلم

۱۴ محرم الحرام ۱۳۷۸ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۵۰)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

(۱) قرآن پاک کی تلاوت بغیر فہم معانی موجب اجر وثواب ہے یا نہیں؟۔اگر ہے تو کیا کسی امام نے ائمہ حنفیہ میں سے اس کی صراحت کسی اپنی کتاب میں کی ہے؟ یا کسی فقیہ حنفی نے؟ کونسی

کتاب میں کس باب میں؟۔

(۲) زید نے اپنی تمام عمر میں کسی عمل خیر کا ثواب کسی میت کو نہیں بخشا اور نہ تلاوت کا، درود شریف ہمیشہ پڑھتا ہے اور میتوں کے لئے سلام اور دعائے استغفار کرتا ہے۔ تو کیا زید گنہگار ہے؟ اور بروز قیامت اس سے مواخذاہ ہوگا؟۔

(۳) کسی عمل خیر کا ثواب عامل کے بخشد ینے سے غیر عامل کو ملجا تا ہے اور اور وہ غیر عامل اس ثواب کا مستحق ہوجا تا ہے؟ اس کی صراحت امام ابوحنیفہ یا امام ابویوسف یا امام محمد یا امام زفر نے اپنی کسی کتاب میں کی ہے یا نہیں؟ اگر کی ہے تو کس کتاب میں، کونسے باب میں؟ سوال صرف ائمہ کی کتاب کا ہے، جوابات صرف ائمہ وفقہا حنفیہ کے اقوال سے دیا جائے۔ بینوا توجروا یوم الحساب بارک اللہ لنا ولکم فی الدنیا والآخرہ۔

المستفتی حکیم محمد ایوب بقلم خود محلہ دیپا سرائے بلدہ سنبھل۔ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ ضلع مرادآباد

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

شریعت کے وہ مشہور مسائل جو ہر مسلم کی نوک زبان پر ہیں جنہیں گاؤں کے رہنے والے ناخواندہ لوگ بھی خوب جانتے ہیں لیکن سائل کو باوجود ادعاء علم کے آج ان مسائل میں شک وتردد واقع ہو رہا ہے، نہیں نہیں بلکہ ان کی مخالفت اور انکار کرنے کا ان کو ہیضہ ہوگیا ہے، لطف یہ ہے کہ سائل ان مسائل میں صرف سائل ہی نہیں ہے بلکہ مدعی ہے اور اپنے دلائل رکھتا ہے مگر چونکہ اپنے استدلال کی کمزوریاں وہ خوب اچھی طرح جانتا ہے اسلئے وہ مدعی کی شکل میں نہیں آسکا اور سائل کی صورت میں پیش ہوا۔

پھر اگر سوالات ہی کرنے تھے تو ان کے لئے سوالات ہی کا انداز اختیار کیا جاتا اور مذہب کی معتبر مستند کتابوں کی عبارت کا مطالبہ ہوتا۔ اور اس میں یہ پابندی نہ ہوتی کہ سوال صرف ائمہ کی کتاب کا ہے۔ لیکن جب سائل نے اپنی حد سے تجاوز کر کے اپنی مناظرانہ شان کا بھی اظہار کیا تو ہمیں بھی مجبورا اسی میدان کو اختیار کرنا پڑا۔ اور ابتدائے جوابات میں مناظرانہ شان کو پیش کرنا ضروری ہوگیا۔

لہذا سائل پہلے تو یہ بتائے کہ علم عقائد اور علم فقہ کا ایک ہی موضوع ہے یا ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ موضوع ہے؟۔

اگر ایک ہی موضوع ہے تو یہ دو علم کیوں کہلاتے ہیں؟۔

اور وہ ایک موضوع کیا ہے؟۔

اور اگر ہر ایک کا موضوع علیحدہ ہے تو کیا فقہ کے مسائل کا کتب عقائد سے اور عقائد کے مسائل کا کتب فقہ سے مطالبہ جہل یا فریب نہیں؟۔

نیز یہ بھی بتائے کہ عقائد وفقہ کے ایک ہی ائمہ ہیں یا ہر ایک کے علیحدہ علیحدہ؟۔

اگر ایک ہی ہیں تو وہ کون کون ہیں اور اگر ہر ایک کے علیحدہ ہیں تو فقہ کے کس قدر ہیں اور ان کے کیا کیا اسماء ہیں؟۔

اور عقائد کے کتنے ہیں اور ان کے کیا کیا نام ہیں؟۔

اور یہ بھی ظاہر کیجئے کہ ائمہ عقائد وائمہ فقہ کے اختلافوں کا کیا معیار ہے؟۔

اور بصورت اختلاف کس امام کے قول کو اختیار کیا جائے اور صواب کو خطا سے کس طرح ممتاز کیا جائے؟۔

اور صراحت قول امام کی کیا حد ہے؟۔

اور یہ بھی صاف طور پر واضح کردیجئے کہ آپ کے سوالات فقہ کے تحت داخل ہیں یا نہیں؟۔

اگر آپ کہیں نہیں تو ان کے لئے ائمہ حنفیہ اور کتب فقہ حنفی سے نقول طلب کرنا آپ کا دجل وفریب یا جہل ونادانی ہوگا یا نہیں؟۔

اور اگر آپ کہیں کہ ہیں تو اس کو ثابت کیجئے؟۔

اور ائمہ حنفیہ اور کتب حنفیہ سے اپنے دعوی کی تائید میں عبارات پیش کیجئے۔ نیز آپ کا ایک مطالبہ تو یہ ہے کہ سوال صرف ائمہ کی کتاب کا ہو، دوسرا اس کے بعد یہ ہے کہ جوابات صرف ائمہ وفقہاء حنفیہ کے اقوال سے کیا جائے۔ ان دونوں عبارتوں کو ملا کر دریافت طلب امور یہ ہیں کہ جب سوال صرف ائمہ کی کتاب کا ہے تو جواب میں ائمہ کا قول بلا ان کی کتاب کے کیسے مطالبہ پورا کردیگا، اور جس کتاب میں وہ قول ائمہ ہو تو کیا وہ کتاب ائمہ کی کتاب کا افادہ کریگی۔ اسی طرح جب سوال ائمہ کی کتاب کا ہے تو فقہائے حنفیہ کا قول کیا قول ائمہ ہوجائیگا اور فقہائے حنفیہ کے اقوال کی کتاب کیا ائمہ کی کتاب ہوجائیگی تو آپ اپنی ان عبارات کا مفہوم بیان کیجئے، پھر ثبوت کیلئے اقوال ائمہ اور فقہائے حنفیہ پر حصر کردینا کس بنا پر ہے؟۔ کیا قرآن وحدیث اور اقوال مفسرین ومحدثین اور اقوال سلف وخلف آپ کے نزدیک قابل

استدلال وجحت نہیں ؟ ۔اگر ہیں تو ان کو کس لئے ذکر نہیں کیا؟ ۔ اس کی معقول وجہ پیش کیجئے ۔علاوہ برین بلا کسی آیت وحدیث کے صرف ائمہ اور فقہائے حنفیہ کے اقوال کیا آپ کے نزدیک قابل عمل اور لائق اتباع ہیں؟ ۔اگر ہیں تو جو اسے شرک کہے تو آپ اسے گمراہ جانتے ہیں یا نہیں؟ ۔

یہ چند استفسار تو سوالات کی بنیادی ساخت پر ہیں ۔اب اپنے سوالات کے جوابات سنئے ۔

جواب سوال اول

اس سوال میں بھی چند باتیں قابل استفسار ہیں

(۱) تلاوت قرآن کی جامع مانع تعریف کیا ہے؟ ۔

(۲) تلاوت قرآن کے ثواب کے لئے فہم معنی کا ضروری ہونا کس معتبر ومستند کتاب سے ثابت ہے؟ ۔

(۳) احادیث میں جو تلاوت پر ثواب کا ترتب بیان کیا گیا ہے اس پر فہم معنی کی زیادتی کس نص سے ثابت ہے؟ ۔

(۴) ائمہ حنفیہ کے نزدیک مطلق کو اپنے اطلاق پر رکھا جاتا ہے یا نہیں؟ ۔

(۵) ایسے عوام جو معنی نہ سمجھتے ہوں کیا انہیں تلاوت قرآن کرنا عبث وبیکار ہے؟ ۔

(۶) ایسے عوام کو قرآن کریم کا سیکھنا سکھانا کیا حکم رکھتا ہے؟ ۔

(۷) قرآن کریم کے فہم معنی کیلئے کس قدر علوم سے واقف ہونا ضروری ہے؟ ۔

(۸) تلاوت قرآن کے ثواب مرتب ہونے کیلئے معنی کا کس حد تک حاصل ہونا ضروری ہے۔

یہ چند امور تو وہ ہیں جن کا حل کرنا بذمہ سائل ہے۔

اب رہا سوال کا اصل جواب وہ اس تفصیل سے ظاہر ہے۔

اقول: قرآن کریم کا فقط دیکھنا بھی موجب اجر وثواب ہے۔ چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی اتقان فی علوم القرآن میں فرماتے ہیں:

(مسئلہ) القرأة في المصحف افضل من القرأة من حفظه لا ن النظر فيه عبادة مطلوبة وقال النووی هكذا قال اصحابنا والسلف ايضا ولم ارفيه خلا فا۔

(اتقان مصری ص ۱۰۸ ج ۱)

پھر علامہ موصوف نے اس کی تائید میں چند احادیث نقل فرمائیں:

اخرجه الطبراني والبيهقي في الشعب من حديث اوس الثقفي مر فوعا ۔قرأة الرجل في غير المصحف الف درجة وقرأته في المصحف تضاعف الفى درجة واخرجه ابو عبيد بسند صحيح فضل قرأة القران نظرا على ما يقرؤه ظاهرا كفضل الفريضة على النافلة واخرج بسند حسن عن ابن مسعود مو قوفا اديموا النظر في المصحف ۔

اسی طرح قرآن کریم کا چھونا اور اٹھانا بھی موجب اجر وثواب ہے۔

چنانچہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں حدیث حضرت اوس کے ان الفاظ وقرأته في المصحف تضاعف على ذالك الى الفى درجة ۔کے تحت میں فرماتے ہیں۔

وثواب خواندن در مصحف زیادہ کردہ میشود بر ثواب خواندن از بر تا دو ہزار درجہ از جہت زیارت کردن مصحف ومساس کردن وبرداشتن آن وبہ تحقیق وارد شدہ است کہ نظر کردن در مصحف عبادت ست

(اشعۃ اللمعات ص ۱۴۱ ج ۲)

لہذا جب قرآن کریم کا صرف دیکھنا ۔چھونا ۔اٹھانا موجب اجر وثواب ہے تو اس کی تلاوت کیونکر موجب اجر وثواب نہ ہوگی۔

علامہ جلال الدین سیوطی اتقان فی علوم القرآن میں تلاوت قرآن کو بہ ترتیل پڑھنے کے استحباب کے بیان میں فرماتے ہیں:

ويستحب للاعجمي الذی لا يفهم معنا ه ۔(اتقان ص ۱۰۶ ج ۱)

اس عبارت میں صاف تصریح ہے کہ جو عجمی معنی نہ سمجھتا ہو اس کے لئے بھی قرآن بہ ترتیل پڑھنا مستحب ہے اور جب فعل مستحب ہوا تو اسپر اجر وثواب کیونکر نہیں ملے گا۔ لہذا تلاوت کے موجب اجر وثواب ہونے کے لئے فہم معنی کی قید سائل نے کہاں سے زائد کی؟ ۔خود احادیث میں فہم معنی کی قید نہیں۔

چنانچہ خاتم المحدثین علامہ شہاب الدین ابن حجر فتاوی حدیثیہ میں اس مسئلہ کی مبسوط بحث میں یہ احادیث نقل فرماتے ہیں۔

قال افضل العبادة قرأة القرآن (رواه ابن قانع) قال افضل عبادة التی تلاوة القرآن رواه البيهقي و روى السنجرى والحطيب انه ﷺ قال اقرأو القرآن فانكم توجرون عليه۔ اما انی لا اقول الٓمّ حرف ولكن الف عشر ولا م عشر و ميم عشر فثلاث ثلثون (رواه الترمذي والحاكم وغير هما) فتاوى حديثيه مصرى ص ۴۲)

اورعلامہ جلال الدین سیوطی اتقان میں یہ احادیث نقل فرماتے ہیں:

اخرج احمد من حدیث معاذبن انس من قرأالقرآن فی سبیل اللہ کتب مع الصدیقین والشھداء والصالحین وحسن اولئك رفیقا۔

واخرج الطبرانی فی الاوسط من حدیث ابی ہریرہ ما من رجل یعلم ولدہ القران الا توج یوم القیامۃ بتاج فی الجنۃ ۔

واخرج الشیخان من حدیث عثمان خیرکم وفی روایۃ افضلکم من تعلم القرآن وعلمہ۔

و روی الترمذی من حدیث ابن مسعود من قرأ حرفا من کتاب اللہ فلہ بہ حسنۃ بعشر امثالھا۔

و اخرج مسلم من حدیث ابی امامۃ اقرؤاالقران فانہ یاتی یوم القیامۃ شفیعا لاصحابہ۔

و اخرج من حدیث انس نوروا منازلکم بالصلاۃ وقرأۃ القرآن۔

بخیال اختصار یہ دس احدیث نقل کیں۔ان میں کہیں فہم معنی کی قید مذکور نہیں۔تو کیا سائل محض اپنی رائے ناقص سے احادیث میں فہم معنی کی قید زائد کرتا ہے اور نصوص مطلقہ کو مقید کرتا ہے اور شریعت میں اپنی عقل سے مداخلت کرنا ہے۔

سائل حضرات محدثین کی کمال احتیاط کو ہی کو دیکھ کر سبق حاصل کرے کہ مشکوۃ شریف کے کتاب العلم میں یہ حدیث منقول ہے۔

من حفظ علی امتی اربعین حدیثا فی امر دینھا بعثہ فقیھا و کنت لہ یوم القیامۃ شافعا و شھیدا۔

علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں اس کے متعلق محدثین کا کلام نقل فرماتے ہیں۔

گفتند کہ مرادومقصود رسانیدن چہل حدیث ست بایشاں اگر چہ یادنداشتہ باشدومعانی آن نفہمیدہ۔

(اشعۃ اللمعات ص۱۷۳ج۱)

اب سائل آنکھیں کھول کر دیکھے کہ محدثین تو چالیس احادیث پہونچانے والے کے اجر وثواب

کیلئے نہ حفظ کی قید لگاتے ہیں نہ فہم معنی کی قید کا اضافہ کرتے ہیں۔اور سائل کی یہ جرأت ودلیری اور یہ شرمناک زیادتی کہ قرآن کریم کی تلاوت کے اجر وثواب کو فہم معنی کی قید محض اپنی رائے ناقص سے لگا کر اجر وثواب کا دائرہ محدود کرتا ہے، اگر فی الواقع یہ سوال لاعلمی کی بنا پر ہے تو یہ جواب بہت کافی ووافی ہے اور سائل کے لئے محدثین کا یہ طرز عمل زبردست سبق ہے۔واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم ۔واللہ تعالی اعلم بالصواب ۔

جواب دوم وسوم

زید نے جو اپنی تمام عمر میں کسی عمل خیر کا ثواب کسی میت کو نہیں بخشا تو سائل یہ ظاہر کرے کہ زید کا یہ فعل کس بنا پر ہے آیا اس لئے کہ زید کا عقیدہ ہی یہ ہے کہ غیر کے عمل کا ثواب میت کو پہنچتا ہی نہیں؟۔

یا اس لئے کہ زید یہ خیال کرتا ہے کہ عامل اپنے عمل خیر کا ثواب دوسرے کو دینے کا اختیار نہیں رکھتا؟۔

یا اس لئے کہ زید کے زعم میں یہ ہے کہ عامل اگر اپنے عمل خیر کا ثواب دوسرے کو بخشے گا تو خود عامل اس ثواب سے محروم ہوجاتا ہے؟۔

یا اس لئے کہ زید کے وہم میں صاحب عمل اگر کسی کو اپنے عمل کا ثواب بخشے تو خود اس کے ثواب میں کمی ہوجاتی ہے اور ثواب تقسیم ہوجائگا؟۔

یا اس لئے کہ زید اپنے گمان میں اپنے اعمال کو قابل ثواب ہی نہیں جانتا۔

بالجملہ سائل یہ بتائے کہ زید کس وجہ سے یہ فعل نہیں کرتا تا کہ جواب میں اسی پہلو پر کافی روشنی ڈالدی جائے۔پھر سائل اسی سوال میں یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ زید امیتوں کیلئے سلام اور دعائے استغفار کرتا ہے تو کیا یہ چیزیں عمل خیر ہیں یا نہیں؟۔اگر ہیں تو میت کیلئے انہیں کس لئے کرتا ہے اور ان کی کیا بنا ہے۔

الحاصل جب زید کے عمل کا سوال ہے تو سائل کے ذمہ اس کے عمل کی بنا اور نیت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اعمال کا دارومدار نیات پر ہے۔حدیث شریف میں وارد ہے۔انما الاعمال بالنیات تو جب سائل کا سوال اتنے استفسارات اوراحتمالات کو شامل ہے تو سائل کو اگر واقعی جواب کی جستجو ہے تو وہ ان کے احتمالات میں سے کوئی پہلو مقرر کرے انشاء اللہ کافی ووافی تحقیقی جواب دیا جائگا۔علاوہ بریں خود اسی سوال دوم کا ایک پہلو سوال سوم بھی ہے تو یہ جواب دونوں کو مشتمل ہے۔لہذا جواب سوال سوم کو

بتفصیل بیان کرتے ہیں اور یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ غیر عامل کو یقیناً عامل کے عمل خیر کا ثواب پہونچتا ہے ۔یہ بات نہ فقط اقوال فقہائے عظام سے بلکہ ائمہ وصحابہ کرام سے بلکہ خیر الانام سے بلکہ خود آیات سے ثابت ہے ۔لہذا بخوف طوالت اس وقت چند دلائل پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ مولی تعالی سائل کو قبول حق کی توفیق دے اور اس مسئلہ کی حقانیت کو خوب واضح اور روشن کردے۔

آیت۔ وصل علیهم ان صلوٰتك سكن لهم والله سميع عليم ۔

(سورہ توبہ ع ١٣ ج ١٢)

یعنی آپ ان کے حق میں دعائے خیر کریں بیشک تمہاری دعا ان کے دلوں کا چین ہے اور اللہ تعالی سنتا جانتا ہے۔

تفسیر معالم وتفسیر خازن میں ہے: ای ادع لهم واستغفر لهم لا ن الصلاة فى اللغة الدعا ء (سكن لهم) ای ان دعا ئك رحمة لهم۔ (خازن ص ١١٨ ج ٣)

تفسیر مدرک میں ہے:(وصل عليهم واعطف عليهم بـا لدعا ء لهم وترحم (ان صلـواتك سكن لهم) يسكنو ن اليه وتطمئن قلو بهم با ن الله قد تاب عليم (والله سميع عليم) لدعائك۔ (مدارک ص ١١٠ ج ٢)

تفسیر صاوی علی الجلالین میں ہے:

وردفى الحديث حيا تى خير لكم ومما تى خير لكم تعرض على اعما لكم فى الصبا ح وفى المساء فا ن وجدت خير احمد ت الله وان وجدت سوء ااستغفر ت لكم فدعاء رسول الله حاصل فى حيا ته وبعد موته ولا عبرة بمن ضل وزا غ عن الحق وخالف فى ذالك۔ (صاوی ص ١٤ ج ٢)

آیت۔ واستغفر لذنبك وللمو منين والمو منا ت ۔

(سورہ محمد ع ٢ ج ٢٦)

یعنی اے محبوب آپ اپنے خاصوں اور عام مسلمان مرد اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگو۔

تفسیر معالم وتفسیر خازن وتفسیر صاوی سب میں یہی مضمون مختلف الفاظ میں ہے۔

معنى الآية استغفر لذنيك ای لذنو ب اهل بيتك وللمو منين والمو منا ت يعنى من غير اهل بيته وهذااكرام الله عزوجل لهذه الامة حيث امر نبيه ﷺ ان يستغفر لذنوبهم وهو

الشفيع المـحاب فيهم (وفيها ايضا)قيل الخطاب له والمراد به الامة وعلى هذا القول يجب الآية استغفار الانسان لجميع المؤمنين ۔

(معالم وخازن ص ١٥١ ج ٦ وجمل ص ١٤٨ ج ا وصاوی ص ٧٦ ج ٤)

آیت۔رب اغفرلى ولو الدى ولمن دخل بيتى مو منا وللمو منين وللمو منٰت

(سورہ نوح ع ٢ ج ٢٩)

یعنی اے میرے رب مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور اسے جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں ہے اور سب مسلمان مردوں اور سب مسلماں عورتوں کو۔

تفسیر معالم ص ١٣١ وتفسیر خازن ص ١٣١ ج ٧ وتفسیر جمل ص ٤١٥ ج ٤ میں ہے:

هذا ادعاء عام فى كل مو من آمن بالله وصدق الرسول وانما بدأ بنفسه لا نها اولى بـا لتخصيص والتقديم ثم ثنى با لمتصلين به لا نهم احق بد عائه من غير هم ثم عمم جميع المو منين والمو منت ليكو ن ابلغ فى الدعاء فهو دعاء عام لكل مو من ومو منة فى سائر الامم ۔

آیت۔ربنا اغفرلى ولوالدى وللمو منين يو م يقوم الحساب ۔

(سورہ ابراہیم ع ا ج ١٣)

اے ہمارے رب مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور سب مسلمانوں کو جس دن حساب قائم ہوگا۔

تفسیر خازن ص ٤٣ ج ٤ وتفسیر جمل ص ٥٣ ج ٢ وتفسیر صاوی ص ٢٤٣ ج ٢ میں ہے:

هذا دعاء للمو منين با لمغفرة والله تعالے لا يرددعاء خليله ابراهيم ففيه بشارة عظيمة لجميع المو منين با لمغفرة ۔

آیت۔الذين يحملو ن العرش ومن حوله يسبحون بحمد ربهم ويو منون به ويستغفرون للذين امنو ربنا وسعت كل شى رحمة وعلما فاغفر للذين تا بوا واتبعوا سبيلك وقهم عذاب الجهنم۔

(سورہ مومن ۔ع ا ج ٢٤)

یعنی جو فرشتے عرش اٹھاتے ہیں اور جو اس کے گرد ہیں اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اس کی پا

کی بولتے ہیں اور اس پر ایمان لاتے اور مسلمانوں کی مغفرت مانگتے ہیں اے ہمارے رب تیری رحمت وعلم میں ہر چیز کی سمائی تو انہیں بخش دے جنہوں نے توبہ کی اور تیری راہ پر چلے اور انہیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔

تفسیر خازن ص ۷۵ ج ۶ وتفسیر جمل ص ۶ ج ۴ وتفسیر صاوی ص ۴ ج ۴ میں ہے:

ای یسالون اللہ تعالی المغفرۃ لھم (وفیھا ایضا) اذا دخل المومن الجنۃ قال این ابی واین امی واین ولدی واین زوجتی فیقال انھم لم یعملوا عملک فیقول انی کنت اعمل لی ولھم فیقال ادخلوھم الجنۃ فاذا اجتمع باھلہ فی الجنۃ کان اکمل سرورہ ولذتہ۔

آیت۔ والملئکۃ یسبحون بحمد ربھم ویستغفرون لمن فی الارض
(سورہ شوری ع ۱ ج ۲۵)

یعنی فرشتے اپنے رب کی تعریف کیساتھ پاکی بولتے ہیں اور زمین والوں کیلئے معافی مانگتے ہیں

تفسیر خازن ص ۲۵ ر ج ۵ میں ہے:

ای من المومنین دون الکفار لان الکافر لا یستحق ان تستغفر لہ الملائکۃ۔

تفسیر جمل ص ۵۲ ج ۴ میں ہے:

ای یشفعون لمن فی الارض من المومنین فالمراد بالاستغفار الشفاعۃ۔

آیت۔ وقل رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا۔ (بنی اسرائیل ع ۳ ج ۱۵)

یعنی اور عرض کر کہ میرے رب تو ان دونوں پر رحم کر جیسا کہ ان دونوں نے مجھے چھٹپن میں پالا

تفسیر خازن ص ۱۲۴ میں ہے:

ای ادع لھما ان یرحمھما برحمتہ الباقیۃ واراد بہ اذا کانا مسلمین۔

تفسیر مدارک ص ۲۴۰ ج ۲ میں ہے:

ولا تکتف برحمتک علیھما التی لا بقاء لھا وادع اللہ تعالی یرحمھما رحمۃ الباقیۃ واجعلہ ذلک جزاء رحمتھما علیک فی صغرک وتربیتھما لک والمراد غیرہ علیہ الاسلام۔

تفسیر جمل ص ۶۴۴ ج ۲، وتفسیر صاوی ص ۲۹۳ ج ۲ میں ہے:

ادع لھما بالرحمۃ ولوفی کل یوم ولیلۃ خمس مرات۔

آیت۔ والذین جاؤا من بعدھم یقولون ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان۔
(سورہ حشر ع ۱ ج ۲۸)

یعنی اور وہ جو ان کے بعد آئے عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں بخش دے اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے۔

تفسیر خازن ص ۵۴ ج ۱ میں ہے:

اخبر انھم یدعون لانفسھم بالمغفرۃ ولاخوانھم الذین سبقوھم بالایمان۔

تفسیر روح البیان میں ہے:

وفی الآیات دلیل علی ان الترحم والاستغفار واجب علی المومنین الآخرین للسابقین منھم لاسیما لآبائھم ومعلمیھم امور الدین۔

تفسیر جمل وتفسیر صاوی میں ہے:

(قولہ الذین سبقونا بالایمان) ای بالموت علیہ فینبغی لکل واحد من القائلین بھذا القول ان یقصد بمن سبقہ من انتقل قبلہ من زمنہ الی عصر النبی ﷺ فیدخل جمیع من تقدمہ من المسلمین لاخصوص المھاجرین والانصار۔
(جمل ص ۳۱۷ ج ۴ وصاوی ص ۱۶۲ ج ۴)

آیت۔ والذین آمنوا واتبعتھم ذریتھم بایمان الحقنا بھم ذریتھم وما التناھم من عملھم من شیء۔
(سورہ طور ع ۱ ج ۲۷)

یعنی اور وہ جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ پیروی کی ہم نے ان کی اولاد ان سے ملادی اور ان کے عمل میں انہیں کوئی کمی نہ دی۔

تفسیر مدارک میں ہے:

(الحقنا بھم ذریتھم) ای تلحق الاولاد بایمانھم واعمالھم درجات الآباء وان قصرت اعمال الذریۃ عن اعمال الآباء۔ (مدارک ص ۱۴۵ ج ۴)

تفسیر معالم ص ۲۰۸ ج ۶ وتفسیر خازن ص ۲۰۸ ج ۴) میں ہے:

الحقتابھم ذریتھم یعنی المومنین فی الجنۃ بدرجات ابائھم ان لم یبلغوا باعمالھم

درجات آبائهم تكرمة لا بائهم لتقر بذلك اعينهم (ما التنا هم من عملهم من شئ)وما نقصنا الآباء من اعما لهم شيئا۔

تفسیر جمل ص ۲۴۶ ج ۴ ۔ وتفسیر صاوی ص ۱۱۱ ج ۴ میں ہے:

والمعنى ان المو من اذا كا ن عمله اكثر الحق به من دونه فى العمل ابنا كا ن او ابا ويلحق بالذرية من النسب الذرية بالسبب وهو المحبة فان حصل مع المحبة تعليم علم اوعمل كان احق بالحوق كا لتلا مذة فا نهم يلحقون باشيا خهم واشيا خ الاشيا خ يلحقون بالاشيا خ ان كا نوا دونهم فى العمل والاصل فى ذلك قوله ﷺ اذادخل اهل الجنة الجنة سال احدهم عن ابويه عن زوجته وولده فيقال انهم لم يدركوا ما ادركت فيقول يا رب انى عملت لى ولهم فيو مر بالحاقهم به ۔ وقوله لا يزاد فى عمل الاولا د اى لم نا خذ من عمل الاباء شئ نجعله للاولاد فيستحقون به هذاالاكرام بل عمل الآباء باق لهم بتما مه والحاق الذرية بهم بمحض الفضل والكرم ۔

آیت ۔ والذين صبروا ابتغاء وجه ربهم واقاموا الصلوٰة وانفقوا مما رزقناهم سرا وعلانية ويدرؤن بالحسنة السيئة اولئك لهم عقبى الدار جنت عدن يدخلونها ومن صلح من ابائهم وازواجهم وذريتهم۔ (سورہ رعد ع ۳ ج ۱۳)

یعنی اور وہ جنھوں نے صبر کیا اپنے رب کی رضا چاہنے کو اور نماز قائم رکھی اور ہمارے دئے ہوئے سے ہماری راہ میں چھپے اور ظاہر کچھ خرچ کیا اور برائی کے بدلے بھلائی کر کے ٹالتے ہیں انہیں کیلئے پچھلے گھر کا نفع ہے بسنے کے باغ جن میں وہ داخل ہونگے اور جو لائق ہوں ان کے باپ دادا اور بیوی اور اولا دمیں۔

تفسیر خازن میں ہے:

والصحيح ما قاله ابن عباس لا ن الله تعالى جعل ثواب المطيع سروره بما يراه فى اهله حيث بشره بدخول الجنة مع هؤ لاء فدل على انهم يدخلونها كرامة للمطيع العامل الآتى بالاعمال الصالحة ولو كان دخولهم الجنة باعمالهم الصالحة لم يكن ذلك كرامة للمطيع لا فائدة فى الوعد به اذ كل من كا ن صالحا فى عمله فهو يدخل الجنة۔

(خازن ص ۱۶ ج ۴)

تفسیر جلالین ص ۱۴۴ میں ہے:

(من صلح) امن (من ابائهم وازواجهم وذرياتهم) وان لم يعملوا بعملهم يكونون فى درجاتهم تكرمة لهم ۔

تفسیر جمل ص ۵۰۴ ج ۴ ، وتفسیر صاوی ص ۲۳۰ ج ۴ میں ہے:

(قوله من آبائهم) اى اصولهم وان علوا ذكورا واناثا (قوله وازواجهم) اى اللاتى متن فى عصمتهم (قوله وذرياتهم) اى فروعهم وان سفلوا (قوله وان لم يعملوا) اى الآباء والا زواج والذريات (قوله تكرمة لهم) اى لا ن الله جعل من ثواب المطيع سروره بما يراه فى اهله ولو كا ن دخولهم الجنة باعمالهم الصالحة لم تكن فى ذالك كرامة للمطيع اذ كل من كا ن صالحا فى عمله فله الدرجا ت العلية استقلا لا ۔

بالجملہ ان دس آیات اور ان کی ۳۶ تفاسیر سے روز روشن کے طرح ثابت ہو گیا کہ غیر عامل کو عامل کے عمل خیر کا ثواب پہنچتا ہے اور بروز قیامت آباء کو اولاد کے اعمال کا ثواب اور اولاد کو آباء کے اعمال کا ثواب اور زوجات کو شوہروں کے اعمال کا ثواب دیا جائے گا اور عاملوں کے ثواب میں کچھ کمی نہ ہوگی۔ اور مسلمانوں کو اپنے لئے اور اپنے سے پہلے تمام مسلمانوں کے لئے اور خاص کر اپنے مسلمان ماں باپ کیلئے دعائے رحمت واستغفار کرنے کا حکم ہے۔ فرشتے اور حاملان عرش ایمان والوں کیلئے استغفار کرتے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے مسلمانوں کیلئے استغفار فرمائی۔ سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنے والدین اور مومنین اور مومنات کیلئے دعائے مغفرت کی۔ خود حضور سید عالم ﷺ کو مومن مردوں اور عورتوں کیلئے دعائے رحمت اور مغفرت کرنے کا حکم اللہ تعالی نے دیا۔ تو اب ان قرآنی شہادتوں کے ہوتے ہوئے کیا کسی مسلمان کو کچھ تردد وشک باقی رہ سکتا ہے۔ حاشا للہ۔

اب چند احادیث بھی سنئے اور یہ وہ احادیث ہیں جن کو حضرت خاتم المحدثین علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور میں نقل فرمایا۔

حدیث (۱) ۔ عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: ما لميت فى قبره الا شبه الغريق المتغوث ينتظر دعوة من اب اوام اوولد او صديق ثقة فاذا لحقته كا ن احب اليه من الدنيا وما فيها وان الله عزوجل ليدخل على اهل القبور من دعاء اهل الدنيا امثال الجبال وان هدية الاحياء الى الاموات الاستغفار لهم وصدقة عليهم (رواه الديلمى والبيهقى فى

شعب الایمان)

حدیث(۲) عن ابی ہریرۃ قال :قال رسول اللہ ﷺ اذامات الانسان انقطع عملہ الا من ثلث صدقۃ جاریۃ او علم ینتفع بہ اوولد صالح یدعولہ (رواہ البخاری فی الادب ومسلم) (جامع الصغیر ص۳۹ ج۱)

حدیث(۳) عن ابی ہریرۃ قال :قال رسول اللہ ﷺ: ان مما یلحق المومن من حسناتہ بعد موتہ علما نشرہ او ولدا صالحا ترکہ او مصحفا ورثہ او مسجدا بناہ او بیتا لابن السبیل بناہ او نہرا اجراہ او صدقۃ اخرجہا من مالہ فی صحتہ تلحقہ بعد موتہ (رواہ ابن ماجہ وابن حزیمہ) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث(۴) عن ابی ہریرۃ قال:قال رسول اللہ ﷺ :ان اللہ یرفع درجۃ للعبد الصالح فی الجنۃ فیقول یا رب انیّٰ لی ہذہ؟ فیقول باستغفار ولدک لک ۔(رواہ الطبرانی فی الاوسط والبیہقی فی مسندہ ولفظہ بدعاء ولدک لک (اخرجہ البخاری فی الادب موقوفا) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث(۵) عن انس عن النبی ﷺ :امتی مرحومۃ تدخل قبورہا بذنوبہا وتخرج من قبورہا لا ذنوب علیہا یمحص عنہا باستغفار المومنین لہا ۔(رواہ الطبرانی فی الاوسط) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث(۶) عن انس ان رسول اللہ ﷺ قال: من دخل المقابرۃ فقرأ سورۃ یٰس خفف اللہ عنہم وکان لہ بعدد من فیہا حسنات ۔(رواہ عبد العزیز صاحب الخلال بسندہ) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث(۷) عن الحجاج ابن دینار قال: قال رسول اللہ ﷺ ان من البر بعد البران تصلی عنہما مع صلوتک وان تصوم عنہما مع صیامک وان تصدق عنہما مع صدقتک (رواہ ابن ابی شیبہ) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث(۸) عن ام المؤمنین الصدیقۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قالت: قال رسول اللہ ﷺ :من مات وعلیہ صیام صام عنہ ولیہ (رواہ البخاری ومسلم) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث(۹) عن عقبۃ ابن عامر ان امرأۃ جاءت الی رسول اللہ ﷺ فقالت: احج عن امی وقد ماتت قال ارأیت لو کان علی امک دین فقضیتہ الیس کان مقبولا منک قالت :بلیٰ۔ فامر ان تحج۔(رواہ الطبرانی) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث(۱۰) عن سعد بن عبادۃ قال: یا رسول اللہ ان امی ماتت فای الصدقۃ افضل؟ قال؟ الماء، فحفر بیرا وقال ہذہ لام سعد (رواہ احمد والترمذی وابو داؤد والنسائی وابن ماجہ ۔ (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث(۱۱) عن عطاء وزید بن اسلم قال: جاء رجل الی النبی ﷺ فقال: یا رسول اللہ! اعتق عن ابی وقد مات قال نعم (رواہ ابن ابی شیبہ) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث(۱۲) عن عمرو بن العاص انہ قال: یا رسول اللہ! ان العاص اوصی ان یعتق عنہ مائۃ نسمۃ فاعتق ہشام منہا خمسین قال لا انما یتصدق ویحج ویعتق عن المسلم لو کان مسلما بلغہ (رواہ ابن حبان) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث(۱۳) عن ام المؤمنین الصدیقۃ رضی اللہ عنہا ان رجلا قال للنبی ﷺ ان امی افتلتت نفسہا واظنہا لو تکلمت تصدقت فہل لہا اجر ان تصدقت عنہا قال: نعم۔ (رواہ البخاری) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث(۱۴) عن ابن عباس ان سعد بن عبادۃ توفیت امہ وہو غائب عنہا فقال یا رسول اللہ ان امی توفیت وانا غائب عنہا اینفعہا شیء ان تصدقت بہ عنہا؟ قال :نعم۔ قال فانی اشہدک علی ان حائطی المخراف صدقۃ علیہا (رواہ البخاری) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث(۱۵) عن ابی قتادۃ قال: سمعت النبی ﷺ یقول :خیر ما یخلف المرء بعد موتہ ولد صالح یدعولہ وصدقۃ تجری یبلغہ اجرہا وعلم یعمل بہ من بعدہ (رواہ الطبرانی فی الصغیر) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث(۱۶) عن عقبۃ بن عامر قال:قال رسول اللہ ﷺ :ان الصدقۃ لتطفی عن اہلہا حر القبور (رواہ الطبرانی) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث (۱۷) عن سعد بن عبادة قال :قلت یا رسول اللہ! تو فیت امی ولم تو صہ ولم تتصد ق فھل ینفعھا ان تصدقت؟ قال :نعم ولو بکراع شاة محرق (رواہ الطبرانی)
(شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث (۱۸) عن ابن عمر قال:قال رسول اللہ ﷺ: اذاتصد ق احدکم بصدقة تطوعا فیجعلھا عن ابو یہ فیکو ن لھما اجر ھا ولا ینتقص من اجرہ شیئا (رواہ الطبرانی)
(شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث (۱۹) عن انس سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: ما من اھل یمو ت منھم میت فلیتصد ق عنہ بعد مو تہ الا اھداھا لہ جبرئیل علی طبق من نو رثم یقف علی شفیر القبر فیقول یا صاحب القبر العمیق ھذہ ھدیة اھداھا الیک اھلک فاقبلھا فتدخل علیہ فیفرح بھا و یستبشرویحزن جیر انہ الذین لا یھدی الیھم شیئ۔ (رواہ الطبرانی فی الاو سط)
(شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث (۲۰) عن جا بر قال: شھدت مع رسول اللہ ﷺ الا ضحی فی المصلی فلما قضا خطبتہ نزل من منبر ہ واتیٰ بکبش فذبحہ رسول اللہ ﷺ بیدیہ وقال بسم اللہ اللہ اکبر ھذا عنی وعمن لم یضح من امتی (رواہ ابو داؤ دوالترمذی)
(شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

بخوف طوالت اسوقت صرف ۲۰/ احادیث پیش کی گئیں جن سے آفتاب کی طرح ثابت ہو گیا کہ غیر عامل کو عامل کے عمل خیر کا ثواب پہنچتا ہے اوراس سے عامل کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور زندوں کا ہدیہ اموات کیلئے استغفار ودعاء اور تمام انواع صدقات وخیرات ہیں اور میت اپنے ماں باپ اعزاء اقارب دوست احباب سے ان امور کا منتظر رہتا ہے ۔اور یہ تمام امور خیر اس کے لئے سبب مغفرت اور باعث رفع درجات ہوتے ہیں۔

الحاصل دوسرے کو عمل کا ثواب پہنچانا خود شارع علیہ الصلوۃ والسلام کے نہ صرف قول سے بلکہ فعل سے بھی ثابت ہے ۔اب صحابہ کرام کے قول اور فعل بھی ملاحظہ ہوں۔

اثر (۱)۔ عن ابن مسعود قال: اربع یعطھن الرجل بعد مو تہ ثوابھا ما لہ اذاکان فیہ قبل ذلک مطیعا والولد الصالح یدعولہ بعد مو تہ والسنة الحسنة یسنھا الرجل فیعمل بھا

بعد مو تہ والما نہ اذا شفعو ا للرجل شفعوا فیہ۔ (رواہ الدارمی فی المسند)

اثر (۲)۔ عن عبد الرحمن ابن العلاء بن الحلاج عن ابیہ قال: قال لی ابی الحلاج ابو خالد یا بنی اذا انا مت فالحد نی واذا وضعتنی فی لحدی فقل بسم اللہ وعلی ملة رسول اللہ ثم سن علی التراب سنا ثم اقرأ عند راسی بفاتحة البقرة وخاتمتھا فانی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ذلک (رواہ الطبرانی فی المعجم الکبیر واسنا دہ صحیح)

اثر (۳)۔ عن الشعبی قال: کا نت الانصار اذامات لھم المیت اختلفو الی قبرہ یقرؤن القرآن (رواہ ابن لا ل فی الجامع)

اثر (۴) عن ابی اما مة البا ھلی قال: اقروٗا القرآن فانہ یاتی یو م القیمة شفیعا لا صحابہ ثم یسبح ویدعوبا لرحمة والمغفرة لنفسہ وللمو منین (رواہ مسلم)

اثر (۵)۔ عن ا بی جعفر ان الحسن والحسین رضی اللہ تعالی عنھما کانا یعتقان عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بعد مو تہ (رواہ ابن ابی شیبہ)

اثر (۶)۔ عن القاسم بن محمد ان عائشة رضی اللہ عنھا اعتقت عن اخیھا عبد الرحمن رقیقا من عبا دہ ترجوان ینفعہ بذلک بعد مو تہ (رواہ ابن سعد)

اثر (۷) عن علی رضی اللہ عنہ انہ کا ن یضحی کبشین احدھما عن النبی ﷺ والآ خر عن نفسہ فقیل لہ فقال امر نی یعنی النبی ﷺ فلا ادعہ ابدا (رواہ الترمذی)

بخیال اختصار سات آثار حضرات صحابہ کرام کے منقول ہوئے جن سے واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ غیر عامل کو عمل خیر کا ثواب پہنچتا ہے ۔اب تابعین کرام وائمہ سلف وخلف کے بھی چند اقوال اور دیکھ لیجئے۔

(۱) عن سفیا ن قال: کا ن یقال الا موات احوج الی الدعاء من الاحیاء الی الطعام والشراب ۔(رواہ ابن ابی الدنیا)

(۲) عن بعض السلف قال رأیت اخالی فی النو م بعد مو تہ فقلت اتصل الیک دعاء الاحیا ء قال ای واللہ بترخرف مثل النو ر ثم نلبسہ (رواہ ابن ابی الدنیا)

(۳) عن عمر بن جریر قال : اذا دعا العبد لا خیہ المیت اتاہ بھا الی قبر ہ ملک فقال یا صاحب القبر الغریب ھذہ ھدیة من اخ لک علیک شفیق (رواہ ابن ابی الدنیا)

(٤) عن ابی قلابة قال اقبلت مبن الشام الی البصرة فنزلت الخندق فتطهرت وصليت ركعتين بالليل ثم وضعت راسی علی قبر فنمت ثم انتبهت فاذاانابصاحب القبر يشتكی ويقول لقدآذيتنی منذ الليلة ثم قال انكم لا تعلمو ن ونحن نعلم ولا نقدر علی العمل ان الركعتين اللتين ركعتهما خيرمن الدنيا وما فيها ثم قال سل جزی الله اهل الدنيا خيرا فاقرأ هم منی السلام فانه يدخل علينا من دعائهم نو ر مثل الجبا ل (رواه ابی الدنيا)

(٥) حدثنا العباس بن يعقوب بن صالح الانباری سمعت ابی يقول رای بعض الصالحين ابا ه فی النو م فقال له يا بنی لم قطعتم هديتكم عنا قال ياابت وهل تعرف الاموات هدية الاحيا ء قال يا بنی لولا الاحياء لهلكت الاموات ۔(رواه ابن رجب)

(٦) عن مالك بن دينا ر قال دخلت المقبرة ليلة الجمعة فاذابنو ر مشرق فيها فقلت لا اله الاالله نری ان الله عزوجل قد غفرلا هل القبور فاذا انا بها تف يهتف من البعد وهو يقول يا مالك بن دينا ر هذه هدية المو منين الی اخوانهم من اهل المقابر قلت بالذی انطقك الااخبرتنی ما هو قال رجل من المو منين قام فی هذاه الليلة فاسبغ الوضوء وصل ركعتين واقرء فيهما فاتحة الكتاب وقل يا ايها الكفرون وقل هوالله احد وقل اللهم انی قد وهبت ثوابها لاهل المقابر من المو منين فادخل الله علينا الضيا ء والنو ر والفسحة والسرور فی المشرق والمغرب قال مالك: فلم ازل اقرأها فی كل جمعة فرأيت النبی ﷺ فی منامی يقول لی يا مالك قد غفر الله لك بعد دالنو ر الذی اهديته الی ا متی ولك ثواب ذلك ثم قال لی وبنی الله بيتا لك فی الجنة فی قصر يقال له المنيف قلت ماالمنيف قال المطل علی اهل الجنة (رواه البخاری فی تاريخه)

(٧) عن بشاربن غالب قال رأيت رابعة فی النو م وكنت كثير الدعاء لها فقالت لی يا بشار هدايا ك تاتيناعلی اطبا ق من نو رمحمد بمنا ديل الحرير قلت وكيف ذلك قالت هكذادعا ء المو منين الاحيا ء اذادعواللمو تی فاستجيب لهم جعل ذلك الدعاء علی اطباق النو ر ثم خمر بمنا ديل الحيرير ثم اتی الذی دعی له من المو تی فقيل هذه هدية فلا ن عليك (رواه ابن ابی الدنيا)

(٨) عن سلمة بن عبيد قال: قال حما د المكی خرجت ليلة الی مقابر مكة

فوضعت راسی علی قبر فنمت فرأيت اهل المقا بر حلقة حلقة فقلت قامت القيا مة قالو الا ولكن رجل من اخواننا قرأقل هو الله احد وجعل ثوابها لنافنحن نقسمة مند سنة (رواه القاضی ابو بكر بن عبد الباقی الانصاری فی مشيخته)

(٩) عن طاؤ س قال ان المو تی يفتنو ن فی قبورهم سبعا فكا نو ايستحبو ن ان يطعم عنهم بتلك الايام (رواه احمد فی الذهد وابو نعيم فی الحلية)

(١٠) عن احمد بن حنبل قال: اذادخلتم المقابر فاقرؤابفاتحة الكتاب والمعوذتين وقل هو الله احد واجعلواذلك لاهل المقابر فانه يصل اليهم۔

بسبب اپنی عدیم الفرصتی کے اس وقت تابعین وائمہ سلف وخلف کے صرف دس اقوال پیش کئے گئے جن سے صریح طور پر ثابت ہوگیا کہ غیر عامل کو عامل کے عمل خیر کا ثواب پہنچتا ہے ل۔

ہذا جب یہ مسئلہ قرآن عظیم واحادیث نبی کریم اور اقوال صحابہ کرام وتصریحات ائمہ عظام سے ثابت ہو چکا تو اب اس میں کسی کو مجال دمزدن وجائے سخن باقی نہ رہی۔ لیکن دلائل شرع سے ایک دلیل اجماع امت بھی ہے تو اتمام حجت کیلئے اس کی بھی چند نقول اور پیش کردی جائیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی شرح الصدور میں فرماتے ہیں:

(١١) ان المسلمين ما زالوا فی كل عصر يجمتعو ن ويقرؤ ن لمو تاهم من غير نكير فكا ن ذلك اجما عا ۔

یہی علامہ اسی میں فرماتے ہیں:

وقد نقل غير واحد الاجماع علی ان الدعاء ينفع الميت۔ (ص ۱۲۷)

عقائد کی مشہور کتاب شرح عقائد میں ہے۔ وفی دعاء الاحيا ء للاموات او صدقتهم ای صدقة الاحياء عنهم ای عن الاموات نفع لهم ای للاموات۔ (ص ۲۴۰)

عقائد کی مشہور کتاب شرح فقہ اکبر میں ہے:

عند اهل السنة ان للانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره صلوة او صوما اوحجا او صدقة او غير ها۔ (شرح فقہ اکبر مصری ص ۱۱۸)

علامہ دمشقی "رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمۃ" میں فرماتے ہیں:

واجمعوا علی ان الاستغفار والصدقة والحج والعتق تنفع الميت ويصل اليه ثوابه۔

(رحمۃ الامۃ مصری ص۱۰۲)

اسی رحمۃ الامہ میں ہے:

ومذھب اھل السنۃ ان للانسان ان یجعل ثواب عملہ لغیرہ۔

مواہب لدنیہ میں شیخ شمس الدین عسقلانی کا قول نقل فرماتے ہیں:

ان وصول ثواب القرأۃ الی المیت من قریب او اجنبی ھو الصحیح کما تنفعہ الصدقۃ والدعاء والاستغفار بالاجماع۔ (مواہب مصری ص۴۳۲ ج۱)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں:

ومستحب است کہ تصدق کردہ شود از میت بعد از رفتن او از عالم تا ہفت روز وتصدق از میت نفع میکند اورا بے خلاف میان اہل علم وارد شدہ است دراں احادیث صحیحہ خصوصا۔

(اشعۃ اللمعات ص۷۱۷ ج۱)

قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی تذکرۃ الموتی میں فرماتے ہیں:

حافظ شمس الدین ابن عبدالواحد گفتہ از قدیم در ہر شہر مسلمانان جمع می شوند و برائے اموات قرآن میخوانند پس اجماع شدہ۔ (تذکرۃ الموتی ص۳۶)

حضرت علامہ اسمٰعیل حقی تفسیر روح البیان میں شیخ تقی الدین ابوالعباس کا قول نقل فرماتے ہیں:

من اعتقدان الانسان لا ینتفع الا بعملہ فقد خرق الاجماع۔

ان عبارات سے نہایت صریح طور پر ثابت ہوگیا کہ عامل کے عمل کا ثواب غیر عامل کو پہنچنے پر امت کا اجماع ہو چکا۔ بالجملہ جب اس مسئلہ پر شریعت کے اصول۔ آیات۔ احادیث اور اجماع امت کے کافی دلائل منقول ہوئے اور صحابہ وتابعین اور ائمہ سلف وخلف کی تصریحات پیش ہو چکیں اور آفتاب سے زیادہ روشن طور پر یہ مسئلہ ثابت ہو چکا کہ عامل کے عمل کا ثواب غیر عامل کو پہنچتا ہے تو اس مسئلہ میں اب کوئی مسلمان تو شک یا شبہ کرہی نہیں سکتا۔ اب رہے مخالفین ومنکرین انہیں بھی اس کی حقانیت میں تردد وتامل کی گنجائش باقی نہیں ہے لیکن ہمیں سائل کی بیجا ضد اور ہٹ کا پورا کرنا بھی ضروری ہے اسی لئے چند فقہاء حنفیہ کے اقوال بھی پیش کئے جاتے ہیں۔

ہدایہ ص۱۰۷ میں ہے:

ان الانسان لہ ان یجعل ثواب عملہ لغیرہ صلوۃ او صوما او صدقۃ او غیرھا عند

اھل السنۃ والجماعۃ۔ (ہدایہ مجتبائی ص۲۷۶ ج۱)

مراقی الفلاح میں علامہ زیلعی سے ناقل ہیں:

فللانسان ان یجعل ثواب عملہ لغیرہ عند اھل السنۃ والجماعۃ صلوۃ کان او صوما او حجا او صدقۃ او قراءۃ القرآن او الاذکار او غیر ذلک من انواع البر ویصل ذلک الی المیت وینفعہ قالہ الزیلعی فی باب الحج عن الغیر۔ (طحطاوی ص۳۶۳)

بدایہ و بحر الرائق میں ہے:

من صام او صلی او تصدق وجعل ثوابہ لغیرہ من الاموات والاحیاء جاز ویصل ثوابھا الیھم عند اھل السنۃ والجماعۃ۔ (ردالمحتار مصری ص۶۳۱ ج۱)

درمختار میں ہے:

الاصل ان کل من اتی بعبادۃ ما لہ جعل ثوابھا لغیرہ وان نواھا عند الفعل لنفسہ لظاھر الادلۃ۔ (حاشیہ ردالمحتار مصری ص۲۴۲ ج۲)

فتاوی سراجیہ میں ہے:

من حج عن غیرہ بغیر امرہ وجعل ثوابہ لہ یصل الثواب الی ذلک الغیر۔

(حاشیہ فتاوی خانیہ مصطفائی ص۱۹۵ ج۱)

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

فللانسان ان یجعل ثواب عملہ لغیرہ عند اھل السنۃ والجماعۃ سواء کان المجعول لہ حیا او میتا من غیر ان ینقص من اجرہ شیء۔ (طحطاوی ص۳۶۳)

عینی شرح کنز الدقائق میں ہے:

ان للانسان ان یجعل ثواب عملہ لغیرہ صلوۃ کان او صوما او حجا او صدقۃ او قرأۃ القرآن او قرأۃ ذکر الی غیر ذلک من جمیع انواع البر وکل ذلک یصل الی المیت وینفعہ عند اھل السنۃ والجماعۃ۔ (عینی مصری ص۱۱۱ ج۱)

علامہ شامی تتارخانیہ سے اور تتارخانیہ محیط سے ناقل ہیں:

الافضل لمن یتصدق نفلا ان ینوی لجمیع المومنین والمومنات لانھا تصل الیھم ولا ینقص من اجرہ شیء۔ (ردالمحتار ص۷۴۳)

سائل بچشم انصاف دیکھے کہ فقہ کی ان دس کتابوں میں کیسی صاف تصریحات موجود ہیں کہ مذہب اہل سنت میں عامل اپنے عمل کا ثواب غیر عامل کو پہنچا سکتا ہے اور غیر عامل تک وہ ثواب پہنچتا بھی ہے اور اس کے لئے نافع بھی ہوتا ہے اب چاہے وہ غیر عامل زندہ ہو یا مردہ پھر عامل کے اس ایصال ثواب سے اس کے اجر میں بھی کچھ کمی نہیں ہوتی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ غیر کو اپنے عمل کا ثواب پہنچانا اب چاہے وہ عمل نماز ہو یا روزہ۔ حج ہو یا صدقہ تلاوت قرآن ہو یا ذکر کلمہ شریف اور صدقات میں نقد دینا ہو یا غلہ عطا کرنا۔ کھلانا ہو یا شیرینی تقسیم کرنا۔ چھوارے دینا ہو یا چنے بانٹنا۔ شربت کی سبیل لگانا ہو یا پانی پلانا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی نیک کام کوئی عمل خیر ہو کوئی نوع بر ہو اسکا ایصال ثواب کرنا ایسا بہتر اور افضل واعلیٰ عمل ہے کہ اس کو آیات قرآنی واحادیث نبوی ثابت کرتی ہیں اور اس کے جواز پر امت کا اجماع منعقد ہو چکا۔ اور بکثرت صحابہ کرام وتابعین عظام وائمہ علماء وسلف وخلف تمام کے اقوال واعمال اس کے شاہد ہیں۔ اسوقت بخوف طوالت اور بوجہ قلت فرصت کے ہمنے صرف (۱۱۷) کتابوں کی عبارات پیش کیں، اور اگر جامعیت کا لحاظ کیا جائے تو صدہا بلکہ ہزارہا اور عبارات پیش کی جاسکتی ہیں اور ایک مبسوط رسالہ تیار ہوسکتا ہے۔

بالجملہ اس ایصال ثواب میں مخالف ومنکر کو بحث کرنے کی کیا ہمت ہوسکتی ہے اور اس کے جواز بلکہ استحباب میں کیا کسی کو اعتراض وکلام کرنے کی جرأت ہوسکتی ہے۔ اس کے پاس نہ کوئی آیت ہے نہ حدیث، نہ کوئی قول ائمہ ہے نہ خلف وسلف کی تصریح۔ منکر صرف اپنے زعم باطل اور رائے ناقص اور محض کم عقلی ونافہمی کی بنا پر غلط تاویلات کرتا ہے اور عوام کو مغالطہ اور فریب میں ڈالتا ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ مولی تعالی اس کو قبول حق کی توفیق عطا کرے اور اس کے قلب میں انصاف پسندی کی لہر پیدا کرے اور بیدینی کی خطرناک راہوں سے بچائے اور باطل کی حمایت وپاسداری سے محفوظ رکھے۔ واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۵۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسائل ذیل میں۔

(۱) بغرض ایصال ثواب جو روپیہ نقد یا کھانا یا شیرینی یا کپڑا دیا جائے وہ صدقہ ہے یا نہیں؟۔

(۲) یہ کہ اگر وہ صدقہ ہے تو اس کا استعمال کرنا یا کھانا پینا امراء یا صاحب ثروت لوگوں کو جائز ہے یا نہیں؟۔

(۳) یہ جانتے ہوئے کہ مذکورہ بالا اشیاء بغرض ایصال ثواب دی جارہی ہیں کوئی امیر یا صاحب ثروت لے یا کھائے یا استعمال کرے تو وہ گناہ گار ہے یا نہیں؟۔ اور اگر ہے تو یہ گناہ کبیرہ ہے یا صغیرہ؟۔

(۴) جو کھانا شیرینی یا کپڑا یا نقد روپیہ بغرض ایصال ثواب دیا جائے اس پر فاتحہ دینی ضروری ہے یا نہیں؟ اور اس کے مستحق امیر ہیں یا غریب؟۔

(۵) اگر فاتحہ دینا ضروری ہے تو فاتحہ دینے کا طریقہ مسنون کیا ہے۔

(۶) نذر ونیاز بزرگوں کی بعض برآمد کار اور بعض از راہ نزدیکی حاصل کرنے ان بزرگ سے کرتے ہیں ایسی نذر ونیاز جائز ہے یا نہیں؟۔ اور کھانا اسکا روا ہے یا ناروا۔ مہربانی فرما کر ہر سوال کا جواب نمبروار تحریر فرما کر اور کتب معتبرہ اور فقہ کی رو سے عنایت فرمادیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) صدقہ کی تعریف المغرب میں ہے: الصدقة العطية التي بها يبتغي مثوبة من الله تعالى۔

جامع العلوم میں ہے: الصدقة تمليك العين بلا عوض ابتغاء لوجه الله تعالى۔

ان عبارات کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ صدقہ اس عطیہ کو کہتے ہیں جس میں بغیر عوض کے تملیک عین ہو اور لوجہ اللہ دے کر ثواب مطلوب ہو۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ایصال ثواب کے لئے جو نقد یا کھانا یا کپڑا دیا جاتا ہے۔ تو وہ بلا عوض تملیک عین ہے اور لوجہ اللہ ایسا عطیہ ہے جس سے ثواب مطلوب ہے۔ لہذا ان چیزوں پر صدقہ کی تعریف صادق آگئی۔ بلاشبہ یہ چیزیں صدقہ ثابت ہونگی۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۲۔۳) جب ان چیزوں کا صدقہ ہونا ثابت ہو گیا۔ اور یہ امر طے شدہ ہے کہ یہ صدقات مفروضہ یا واجبہ تو نہیں ہو سکتے۔ لہذا ان صدقات کا نافلہ ہونا قرار پایا۔ اور صدقہ نافلہ بلاشبہ اغنیاء اور مالداروں کو بھی لینا اور کھانا جائز ہے۔

چنانچہ جوہرہ نیرہ شرح قدوری میں ہے۔ لو دفع الى الغنى صدقة التطوع جاز له اخذها

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی فتاوی عزیزیہ میں فرماتے ہیں: اگر فاتحہ بنام

بزرگے دادہ شدہ پس اغنیاء راہم خوردن جائز است۔ (فتاوی عزیزیہ ص ۴۱)

ان دونوں عبارات سے ثابت ہو گیا کہ اغنیاء کو صدقہ نافلہ کا لینا اور کھانا جائز ہے۔ اور شاہ صاحب نے تو خاص فاتحہ کے کھانے کو اغنیاء کے لئے جائز بتایا ہے۔ اور جب یہ اغنیاء کیلئے جائز ہے تو اس کے لئے گناہ کس طرح ہو سکتا ہے اور ان کے لینے یا کھانے پر اغنیاء گناہ گار کیونکر ہو سکتے ہیں۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۴) جس کھانے یا شیرنی کو بغرض ایصال ثواب دیا جائے اس پر قل فاتحہ پنج آیات کا پڑھنا ان چند امور پر مشتمل ہے:

(۱) اس میں جمع بین العبادتین ہے۔ (۲) قبولیت دعاء کی بھی امید ہے۔ (۳) مزید اجر و ثواب کا بھی موجب ہے۔ (۴) وہ شئی متبرک بھی ہو جاتی ہے۔

چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی فتاوی عزیزیہ میں اپنی مجلس شہادت حسین کی تفصیل ذکر کرتے ہوئے یہ بھی فرماتے ہیں:۔

بعد از اں ختم قرآن مجید و پنج آیت خواندہ بر ماحضر فاتحہ نمودہ می آید۔ (فتاوی عزیزیہ۔ ص ۱۱۱)

یہی شاہ صاحب اسی فتاوی کے ص ۷۵۔ پر فرماتے ہیں:

طعامیکہ ثواب آں نیاز حضرات امامین نمایند بر آں فاتحہ وقل و درود خوانند تبرک میشود خوردن او بسیار خوب است۔

اب باقی رہا یہ امر کہ اسکا مستحق کون ہے، اس کے متعلق مولوی اشرف علی تھانوی کا مطبوعہ فتوی موجود ہے جو فتاوی امدادیہ حصہ اول کے ص ۱۶۳۔ پر ہے۔

سوال۔ رواج اس ملک کا یہ ہے کہ ثواب رسانی مردہ کے لئے وارثین اپنی اپنی ہمت کے موافق طعام پختہ کھلاتے ہیں اور روپیہ پیسہ وغیرہ صدقہ کرتے ہیں۔ تو اب اس طعام پختہ و روپیہ وغیرہ کے مستحق کون ہیں؟۔ فقیر، غریب، مسکین وغیرہ غریب و غربا۔ تو انگر سود خور بے نمازی کی دعوت کھلانا کیسا ہے؟۔

الجواب۔ یہ صدقہ نافلہ ہے ہر ایک کیلئے جائز ہے لیکن زیادہ اولی مساکین کے لئے ہے۔

لہذا جب اس نمبر میں اس قدر فتوے خود مانعین کے مطبوعہ موجود ہیں، جو اس میں مزید حوالوں کی حاجت نہیں واللہ تعالی اعلم۔

(۵) فاتحہ دینے کا طریقہ یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ آیۃ الکرسی کم از کم تین تین بار سورۃ اخلاص اول و آخر ۳۔۳ بار درود پڑھا جائے اس کے بعد ہر دو ہاتھ اٹھا کر کہیں کہ الہی میرے اس پڑھنے پر اور ان چیزوں پر جو ثواب مجھے عطا ہوا اسے میری طرف سے تمام انبیاء کرام اور خاص کر سید الانبیاء علیہ السلام اور تمام مشائخ و اولیائے کرام اور علماء کرام اور میرے فلاں فلاں عزیز و احباب اور سب مسلمانوں مرد و عورت جو گذرے یا ہیں یا ہونگے سب کو پہونچا۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۶) مسلمان جو بزرگوں کیلئے نذر و نیاز کرتے ہیں نہ اس نذر سے انکا تقرب بہ نیت عبادت مقصود ہوتا ہے۔ بلکہ یہ نذر تو حقیقۃ اللہ تعالی کیلئے ہوتی ہے اور اس کا ثواب کسی بزرگ کی روح کو پہونچاتے ہیں اور جس چیز کی نذر کی ہے اس کو ان بزرگ کے خدام و متوسلین پر خرچ کرتے ہیں تو بلا شبہ ایسی نذر جائز ہے۔ فقہ کی مشہور کتاب ردالمحتار میں ہے:

ان قال یا اللہ انی نذرت لك ان شفيت مريضي اورددت غائبي او قضيت حاجتي لاطعم الفقراء الذين بباب السيدة نفيسة اوالفقراء الذين بباب الشافعي اوالامام ليث او اشتري حصيرا لمساجدهم او زيتا لوقودها او دراهم لمن يقوم لسائرها الى غير ذلك يكون فيه تقع للفقراء والنذر لله عزوجل وذكر الشيخ انما هو محل لصرف النذر لمستحقيه القائمين لرباطه او مسجده او جامعه فيجوز بهذا الاعتبار۔

(ردالمحتار مصری جلد دوم۔ ص ۱۳۱)

اگر یہ کہا کہ اے اللہ میں نے تیری نذر کی اگر تو میرے مریض کو تندرست کر دے۔ یا تو میری گمشدہ چیز کو واپس کر دے۔ یا تو میری حاجت کو پورا کر دے۔ تو ان فقراء کو کھانا کھلاؤں گا جو سیدہ نفیسہ یا امام شافعی یا امام لیث علیہ الرحمۃ کے آستانوں پر رہتے ہیں۔ یا انہی بزرگوں کی مساجد کے لئے بوریا یا ان کی جلانے کے لئے تیل خریدوں گا۔ یا اس کو روپے دوں گا جو ان مساجد کی خدمت کرے۔ یا اس کے سوا اور چیزیں۔ تو اس میں نفع فقراء کے لئے ہے اور نذر اللہ تعالی کیلئے ہے۔ اور ان بزرگوں کا ذکر صرف اس لئے ہے کہ وہ مسجد و خانقاہوں کے مستحقین پر نذر کے خرچ کرنے کا محل ہے تو یہ نذر جائز ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فتاوی عزیزیہ میں فرماتے ہیں:

حقیقت ایں نذر آنست کہ اہداء ثواب طعام و انفاق و بذل حال بروح میت کہ امریست مسنون و از روئے حدیث صحیح ثابت ست۔ مثل ما ورد في الصحيحين من حال ام سعد وبيره۔ ایں نذر

مستلزم میشود۔ پس حاصل ایں نذر آنست کہ اں نسبت مثلا اہدائے ثواب ھذا النذر الی روح فلاں۔ وذکر ولی برائے تعیین عمل منذور ست، نہ برائے مصرف۔ ومصرف ایشاں متوسلان آں ولی می باشند از اقارب وخدمہ وہم طریقاں وامثال ذٰلک ہمیں ست مقصود نذر کنندگان بلاشبہ۔ وحکمہ انہ صحیح یجب الوفاء بہ لانہ قربۃ معتبرۃ فی الشرع۔ (فتاوی عزیزیہ)

اس نذر کی حقیقت کھانے اور مال خرچ کرنیکا ثواب میت کی روح کو پہنچانا ہے اور یہ امر مسنون ہے اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے جیسا کہ صحیح بخاری ومسلم میں حضرت ام سعد وغیرہ کی حدیث میں وارد ہے۔ یہ نذر لازم ہو جاتی ہے تو اس نذر کا حاصل طعام وغیرہ کی ایک مقدار کا ثواب کسی بزرگ کی روح کو پہنچانا ہے اور ولی کا ذکر عمل منذور کی تعیین کیلئے ہے نہ مصرف کیلئے۔ اور مصرف اس نذر کرنے والوں کے نزدیک اسی ولی کے اقارب خدام اور ان کے طریقے والے اور متوسلین ہیں اور بلاشبہ نذر کرنے والوں کا یہی مقصود ہے اور اس نذر کا حکم یہ ہے کہ یہ نذر صحیح ہے اس کی وفا واجب ہے۔ اس لئے کہ یہ شریعت میں قربت معتبرہ ہے۔

ان عبارات سے آفتاب کی طرح ثابت ہوگیا کہ مسلمان جو بزرگوں کیلئے نذریں اور نیازیں کر کے ان کا ایصال ثواب ان کی ارواح کو کرتے ہیں وہ بلاشبہ جائز ودرست ہیں اور احادیث وفقہ سے ثابت ہیں۔ اور جب اس نذر ونیاز کا کرنا ثابت ہوا تو اسکا کھانا کیسے ناجائز وناروا ہوسکتا ہے واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۵۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ
بنگال میں یہ رواج ہے کہ جب کوئی شخص انتقال کر جاتا ہے تو اس کے متعلقین علماء اور مشائخ کو اور غریب لوگوں کو اور فقیروں کو میت کی طرف سے روپیہ پیسہ صدقہ کر دیتے ہیں (میت کو دفن کرنے سے پہلے یا بعد میں) لہذا اس طرح روپیہ پیسہ صدقہ کرنے کو دیوبندی شیطانوں نے حرام قرار دیا اور ایسا ہی فتوی دیدیا ہے اس کے متعلق شرع شریف میں کیا حکم ہے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

میت کی طرف سے روپیہ پیسہ وغیرہ صدقہ کرنا بلاشبہ جائز بلکہ مستحب ہے۔ اللہ تعالی خود قرآن کریم میں فرماتا ہے:

واذا حضر القسمة اولو القربى واليتمى والمساكين فارزقوهم منه وقولوا لهم قولا معروفا۔ (سورۃ النساء ع ۱ ج ۴)

جب بانٹتے وقت رشتہ دار اور اجنبی یتیم ومسکین آجایں تو انہیں بھی کچھ دو اور ان کو اچھی بات کہو۔

علامہ ابوالبرکات نسفی تفسیر مدارک وحقائق التاویل میں اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہیں:

واذ حضر القسمة اى قسمة التركة (اولو القربى) ممن لا يرث (واليتمى والمساكين) من الاجانب (فارزقوهم) فاعطوهم (منه) مما ترك الوالدان والاقربون وهو امر ندب وهو باق لم ينسخ۔ (مدارک مصری ص ۱۶۲ ج ۱)

اور تقسیم ترکہ کے وقت غیر وارث رشتہ دار اور اجنبی یتیم ومساکن آجائیں تو انہیں ماں باپ اور اقارب کے ترکہ سے کچھ دو یہ دینا مستحب کام ہے اور حکم باقی ہے جو منسوخ نہیں ہوا۔

علامہ احمد جیون تفسیر احمدی میں اسی آیت کریمہ کے تحت میں فرماتے ہیں:

المال ان الله تعالى امرنا باعطاء شئى من التركة لغير الورثة فهو اما ان يكون تطييبا لقلوبهم او تصدقا عليهم فحينئذ يكون ذلك ندبا باقيا على حاله۔

(تفسیر احمدی ص ۸۷ ج ۲)

نتیجہ بحث یہ ہے کہ اللہ تعالی نے ہمیں غیر وارثوں کیلئے ترکہ کے کچھ دینے کا حکم فرمایا۔ پس یہ دینا یا تو ان کے دل خوش کرنیکے لئے ہے۔ یا ان پر صدقہ کرنے کے لئے ہے۔ تو یہ دینا مستحب ہوگیا اور اسی حال پر باقی رہا۔

حضرت حجۃ الاسلام امام ابوبکر رازی تفسیر احکام القرآن میں اس آیت کریمہ کے تحت میں اقوال مختلفہ نقل کرنے کے بعد آخر میں فرماتے ہیں:

وهذا كله يوجب ان يكون اعطاء هؤلاء الحاضرين عند القسمة استحبابا لا ايجابا۔ (تفسیر احکام القرآن مصری ص ۸۷ ج ۲)

یہ کل بحث ثابت کرتی ہے کہ تقسیم ترکہ کیوقت ان حاضرین غیر وراث رشتہ داروں اوراجنبی تیموں مسکینوں کو دینا مستحب ہو،واجب نہو۔

علامہ ناصر السنہ علاؤ الدین بغدادی تفسیر خازن میں وعلامہ محی السنہ حسین فراوبغوی تفسیر معالم التنزیل میں تحت آیت فرماتے ہیں:

القول الثانی ان هذا الا مر ندب واستحبا ب لا علی سبیل الفرض ۔ والا یجا ب وهذ االقول هو الاصح الذی علیه العمل الیوم (وفی معالم) هو اولی الا قاویل ۔

(خازن ومعلم مصری ص ۴۰۴ ج۱)

دوسرا قول یہ ہے کہ غیر وارث رشتہ دار اور اجنبی یتیم ومسکین کو دینا مندوب ومستحب ہے،فرض وواجب نہیں۔یہی قول ایسا صحیح تر ہے جس پر آج بھی عمل ہے اور تفسیر معالم میں ہے کہ یہی قول بہترین اقوال ہے۔

اس آیت اور اس کی تفاسیر سے ثابت ہوگیا کہ میت کیلئے کچھ صدقہ وخیرات کرنا مستحب ہے یہاں تک کہ میت کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل کچھ اس سے دیا جائے۔آیۂ کریمہ کے بعد کسی حدیث کے پیش کرنے کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن مزید اطمینان کیلئے چند احادیث نقل کی جاتی ہیں۔

بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

ان رجلا قال للنبی ﷺ ان امی افتلتت نفسا واظنها لو تکلمت تصدقت فهل لها اجران تصدقت عنها قال نعم ۔

(بخاری مصطفائی ص ۱۸۲ ج۶ ۔کتاب الجنا ئز با ب مو ت الفجأۃ

(وفی روایة)نعم تصدق عنها ۔ (ص ۳۸۶ ۔ج۱۰۱)

ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا میری ماں اچانک انتقال ہوگئیں اور ان کے متعلق میں گمان کرتا ہوں کہ اگر وہ بات چیت کرتیں تو صدقہ کرتیں۔یا صدقہ کی وصیت کرتیں۔تو کیا انہیں ثواب ملے گا اگر میں انکی طرف سے صدقہ کروں؟۔حضور نے فرمایا کہ ہاں انہیں ثواب پہونچے گا۔تو ان کی طرف سے صدقہ کردے۔

اسی بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

ان سعدبن عبادة تو فیت وهو غایب عنها فقال یا رسول الله صلی الله تعالی علیه

وسلم ان امی توفیت وانا غائب عنها ۔أ ینفعها شئ ان تصدقت به عنها؟ ۔قال نعم ۔قال فانی اشهد ك ان حائطی المخراف صدقة علیها ۔

(بخاری مصطفائی ص ۳۸۶ ج۱۱) کتاب الوصایاباب الاشهاد)

سعد ابن عبادہ کی والدہ فوت ہوگئیں اور وہ غائب تھے۔تو انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ میری والدہ فوت ہوگئیں اور میں ان کے پاس موجود نہ تھا۔اگر میں ان کی طرف سے کچھ صدقہ کروں تو کیا وہ انہیں نفع دیگا؟۔حضور نے فرمایا: ہاں۔تو انھوں نے کہا: میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میرا باغ مخراف ان کے لئے صدقہ ہے۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

ان رجلا اتی النبی ﷺ فقال یارسول الله !ان امی افتلتت نفسها ولم تو ص واظنها لو تکلمت تصدقت اولها اجران تصدقت عنها قال نعم۔(مسلم شریف مجتبائی دہلی ص ۳۲۴ ج۱)

بیشک نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ !میری والدہ اچانک فوت ہوگئیں اور انہوں نے وصیت نہیں کی اور میں انہیں یہ گمان کرتا ہوں کہ اگر وہ کلام کر تیں تو صدقہ کرتیں۔اب میں اگر ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا ان کیلئے ثواب ہے؟ حضور نے فرمایا: کہ ہاں ہے۔

طبرانی اور بیہقی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

قال رسول الله ﷺ اذا تصدق احد کم بصدقة تطوع فلیجعلها عن ابو یه فیکو ن لهما اجر ها ولا ینتقص من اجره شئ۔

(شرح الصدور مصری ص ۱۲۹ وطحطاوی علی مراقی ص ۳۶۳)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم میں کوئی شخص صدقہ نفل دے تو اسے اپنے ماں باپ کی طرف سے دے تو وہ صدقہ ان دونوں کیلئے باعث ثواب ہے۔اور خود اس کے ثواب میں کچھ کمی نہو گی۔

ان احادیث سے ثابت ہوگیا کہ میت کیلئے صدقات وخیرات کرنا حکم رسول ﷺ سے ثابت اور صدقہ کا ثواب میت کو پہونچتا ہے اور صدقہ کا میت کیلئے نافع ہونا بکثرت احادیث سے ثابت ہے "کما فصلنا فی فتاونا الاجملیه ۔

علاوہ ازیں یہ اہلسنت کا اجماعی واتفاقی مسئلہ ہے بخوف طوالت اس وقت چند عبارات پیش کی

جاتی ہیں۔

شرح فقہ اکبر میں ہے:

عند اهل السنة ان للانسان ان یجعل ثواب عمله لغیره صلوة او صوما او حجا او صدقة او غیرها۔ (شرح فقہ اکبر مصری۔ص ۱۱۸۔)

اہل سنت کے نزدیک انسان اپنے عمل نماز و روزہ حج وصدقہ وغیرہ کا ثواب اپنے غیر کو پہونچا سکتا ہے۔

حضرت امام نووی شرح مسلم شریف میں فرماتے ہیں:

ان الصدقة عن المیت تنفع المیت ویصل ثوابها وهو کذلك باجماع العلماء وقد اجمعوا علی وصول الدعاء وقضاء الدین بالنصوص الواردة فی الجمیع۔ (مسلم شریف مع شرح مجتبائی دہلی ص ۳۲۴ ج ۱)

بیشک میت کی طرف صدقہ کرنا اس کو نفع پہونچاتا ہے۔ اور اس کا ثواب اسے ملتا ہے۔ یہ بات اسی طرح اجماع علماء سے ثابت ہے۔ اور ایسے ہی دعا اور ادائے قرض کے پہونچنے پر علماء نے اجماع کیا کہ ان سب میں نصوص وارد ہیں۔

علامہ ابن عابدین بحر الرائق وبدائع سے ناقل ہیں:

من صام اوصلی او تصدق وجعل ثوابها لغیره من الاموات والاحیاء جاز ویصل ثوابها الیهم عند اهل السنة والجماعة۔ (ردالمحتار مصری ص ۱۳۱ ج ۱)

جس نے روزہ رکھا یا نماز پڑھی یا صدقہ دیا اور اسکا ثواب اپنے غیر مردوں یا زندوں کو پہونچائے تو جائز ہے اور ان اعمال کا ثواب اہل سنت و جماعت کے نزدیک انہیں پہونچتا ہے۔

علامہ حسن شرنبلالی مراقی الفلاح میں قول علامہ زیلعی ناقل ہیں:

فللانسان ان یجعل ثواب عمله لغیره عند اهل السنة والجماعة صلوة کان او صوما او حجا او صدقة او قرأة القرآن او الاذکار او غیر ذلك من انواع البر ویصل ذلك الی المیت۔ (طحطاوی مصری ص ۳۶۳۔ ج ۱)

اہل سنت کے نزدیک انسان اپنے عمل کا ثواب اپنے غیر کو پہنچا سکتا ہے۔ اب وہ عمل نماز ہو یا روزہ۔ حج ہو یا صدقہ۔ یا تلاوت قرآن یا اذکار ہوں۔ یا اسکے سوا اور نیکیوں کے اقسام ہوں۔ یہ سب

میت کو پہنچتے ہیں اور نفع دیتے ہیں۔

بالجملہ یہ آیت کریمہ اور احادیث صحیحہ اور کتب عقائد وفقہ سے ثابت ہوگیا کہ میت کیلئے روپیہ پیسہ وغیرہ سے صدقہ کرنا نہ فقط جائز بلکہ مندوب و مستحب ہے اور اس کے لئے نفع مند۔ اور سبب خوبی آخرت ہے اور اس صدقہ کا ثبوت انہیں کتاب وسنت اور اجماع امت سے ظاہر ہو چکا تو یہ بات ناقابل انکار ہے۔ کہ صدقات کے مصارف فقراء ومساکین بھی ہیں۔ علماء ومشائخ بھی اگر ضرورت مند ہیں تو اس کا دینا بہ نسبت جاہل فقراء کے زیادہ بہتر ہے۔

علامہ طحطاوی معراج اور قہستانی سے ناقل ہیں:

الصدقة علی العالم الفقیر افضل من الجاهل الفقیر۔ (طحطاوی مصری علی مراقی ص ۴۱۹)

جاہل فقیر کو صدقہ دینے سے عالم فقیر کو صدقہ دینا زیادہ بہتر ہے۔ اور اگر وہ علماء مشائخ مالدار وغنی ہیں جب بھی جائز ہے کہ میت کیلئے جو صدقات کئے جاتے ہیں یہ صدقہ نافلہ ہیں اور صدقہ نافلہ غنی ومالدار کیلئے بھی جائز ہے۔

جوہرہ نیرہ میں ہے:

ولو دفع الی الغنی صدقة التطوع جاز له اخذها (از جوہرہ نیرہ شرح قدوری ص ۱۳۲)

اور اگر مالدار کو صدقہ نفل دیا گیا تو اسے لینا جائز ہے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ میت کی طرف سے جو روپیہ پیسہ وغیر بطور صدقہ غریبوں فقیروں اور علماء ومشائخ کو دیا جاتا ہے وہ بلا شبہ جائز ہے۔ دیوبندیوں نے اگر اس کے حرام ہونے کا فتوی دیا تو قرآن کریم اور احادیث کی مخالفت کی۔ اجماع کے خلاف فتوی دیا۔ کتب عقائد وفقہ کی تصریحات کے مقابل غلط حکم لکھا۔ لہذا انکا یہ فتوی غلط وباطل ہے اس کو ہرگز ہرگز نہ مانا جائے۔ مولی تعالی انہیں ہدایت فرمائے واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۵۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

زید کے انتقال کے بعد اس کے دو بچے اور ایک بیوی باقی رہے۔ تو اس طرح سے روپیہ پیسہ

صدقہ کرنا میت کیلئے جائز ہے یا نہیں؟۔ اور اسکے جواز کی کیا صورت ہے کیا اسکی بیوی اور بچے اس طریقہ سے صدقہ کر سکتے ہیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

میت کیلئے بالغ ورثہ یا غیر وارث اجنبی لوگ اپنے مال سے جس قدر چاہیں صدقہ کر سکتے ہیں۔

علامہ ابن عابدین کتاب خانیہ سے اور وہ محیط سے ناقل ہیں:

الافضل لمن يتصدق نفلا ان ينوی لجميع المومنين والمومنات لانها تصل اليهم ولا ينقص من اجره شئی وهو مذهب اهل السنة والجماعة۔

(ردالمحتار مصری ص ۶۳۱ ج ۱)

جو شخص صدقہ نفل کرے تو اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ تمام مسلمان مرد و عورتوں کی نیت سے کرے اس لئے کہ وہ انہیں پہونچتا ہے اور اس کے ثواب میں کچھ کمی نہیں ہوتی۔ یہی اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے۔

مواہب لدنیہ میں ہے

ان وصول ثواب القرآن الی الميت من قريب او اجنبی هو الصحيح كما تنفعه الصدقة والدعاء والاستغفار بالاجماع۔ (مواہب لدنیہ مصری ص ۴۳۲ ج ۱)

صحیح قول یہ ہے کہ رشتہ داروں اور اجنبی کی طرف سے میت کو تلاوت کا ثواب پہونچایا جائے جیسے میت کو صدقہ اور دعائے استغفار باجماع نفع دیتے ہیں۔

یہی علامہ قسطلانی امام رافعی و امام نووی کا قول نقل فرماتے ہیں:

يستوی فی الصدقة والدعاء الوارث والاجنبی۔

(مواہب۔ ج ۱)

صدقہ اور دعا میں رشتہ دار و اجنبی دونوں برابر ہیں۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ اہلسنت و جماعت کا یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ میت کے لئے صدقات و اعمال صالحہ کا ایصال ثواب ورثہ اور اجانب سب کی طرف سے بلا شبہ جائز و درست ہے اور انہیں یہ ثواب پہونچتا ہے۔

اب باقی رہا یہ امر کہ خود میت کے ترکہ سے بھی اسے ایصال ثواب کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟۔ تو اس میں اصح قول یہ ہے کہ اگر ورثہ بالغ ہوں اور کل ورثہ موجود ہوں اور سب اس ترکہ سے صدقہ کرنے کی اجازت دیں تو بلا شک جائز ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

وفی كل موضع يحتاج الی الاجازة انما يجوز اذا كان المجيز من الاجازة نحو ما اذا اجازه وهو بالغ عاقل صحيح۔ (فتاوی عالمگیر مجیدی کانپور ص ۲۲۳)

ہر اس مقام میں جس میں اجازت کی حاجت ہو تو جائز ہے جب کہ اجازت دینے والا اجازت کا اہل ہو۔ جیسے کسی شی کی اجازت دی اور اجازت دینے والا عاقل بالغ ہے تو صحیح ہے۔

حضرت امام برہان الدین مرغینانی ہدایہ میں فرماتے ہیں:

ان الامتناع لحقهم فتجوز باجازتهم ولو اجاز بعض ورد بعض تجوز علی المجيز بقدر حصته لولايته عليه وبطل فی حق الراد۔ (ہدایہ ص ۳۵۸ ج ۴)

بیشک منع کرنا حق ورثہ کیوجہ سے ہے تو ان کی اجازت سے جائز ہے اور اگر بعض ورثہ نے اجازت دی اور بعض نے انکار کیا تو اجازت دینے والے کے مقدار حصہ میں جائز ہے کہ وہ اپنے حصہ کا مالک ہے۔ اور انکار کرنے والے کے حق میں باطل ہے۔

اور اگر ورثہ بالغ ہیں لیکن بعض نے ترکہ سے صدقہ کرنیکی اجازت دی اور بعض نے اجازت نہیں دی تو جن بعض نے اجازت دی ان کے حصہ سے ہدیہ کرنا بھی بلا شبہ جائز ہے۔

عالمگیری میں ہے:

ولو اجاز البعض ورد البعض يجوز علی المجيز بقدر حصته وبطل فی حق غيره۔

(عالمگیری ص ۲۲۳ ج ۴)

اگر بعض ورثہ نے اجازت دی اور بعض نے انکار کیا تو اجازت دینے والے کے حصے کی مقدار نیز جائز ہے اور دوسرے کے حق میں باطل ہے۔

علامہ ابن عابدین ردالمحتار میں علامہ سائحانی سے اور علامہ مقدسی سے ناقل ہیں:

اذا اجاز بعض الورثة جاز عليه بقدر حصته۔ (ردالمحتار مصری ص ۴۳۰)

جب بعض ورثہ نے اجازت دی تو اس کے حصہ کی مقدار میں اس پر تصرف جائز ہے۔

اور اگر بعض ورثہ بالغ تو ہیں لیکن موجود نہیں بلکہ غائب ہیں۔ یا نابالغ صغیر ہیں، تو پھر ترکہ سے صدقہ کرنا جائز نہیں۔

حجۃ الاسلام امام ابوبکر رازی احکام القرآن میں فرماتے ہیں:

ان حضر بعض الورثة وفيهم غائب او صغير انه يعطى الحاضر نصيبه من الميراث ويمسك نصيب الغائب والصغير۔ (احکام القرآن جلد دوم ص ۸۶)

اگر بعض ورثہ موجود ہیں اور ورثہ میں بعض غائب یا نابالغ ہیں تو موجود ترکہ سے اپنے حصے کو دے سکتا ہے۔ اور غائب و نابالغ کے حصے کو نہ دیگا۔

عالمگیری میں ہے:

ان اتخذ طعاما للفقراء كان حسنا اذا كانت الورثة بالغين فان كان في الورثة صغير لم يتخذوا ذلك من التركة۔ (عالمگیری جلد دوم ص ۱۰۶)

اگر فقراء کے لئے کھانا پکوایا تو حسن ہے۔ جب کے ورثہ بالغ ہوں اور اگر ورثہ نابالغ ہوں تو کھانا نہ تیار کرائیں یہ حکم جب ہے کہ ترکہ سے کھانا تیار کرایا جائے اس تفصیل کے بعد صورت مسئولہ میں ترکہ زید کے وارث اگر یہی دو بچے اور ایک بی بی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ دو بچے نابالغ ہونگے تو ان کے حصوں سے میت کے لئے صدقہ نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ جب بالغ وارث ہوں اور وہ ترکہ میں اپنے حصہ سے یا اپنے اور مال سے میت کے لئے صدقہ کریں تو اس کو ناجائز وحرام کون کہہ سکتا ہے۔ دیوبندی اکثر غلط مسائل بتا کر عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔ مولی تعالی انہیں عقل وفہم عطا فرمائے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۵۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

بنگال میں محفل میلاد وتقاریر کی مجالس میں بآواز بلند سرکار دوعالم نور مجسم حبیب کبریا ﷺ پر درود وسلام پڑھا جاتا ہے۔ اس طریقے سے بآواز بلند پڑھنے کو فتوی حدیثیہ اور تفسیر روح البیان میں جائز لکھا ہے۔ لیکن دیوبندی ملعونوں نے اس کو بدعت وناجائز قرار دیا ہے۔ اس کے واسطے کیا حکم ہے؟۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

حضور نبی کریم ﷺ پر درود وسلام پڑھنے کا حکم قرآن کریم میں خود اللہ تعالی دیتا ہے۔ اور اس کو خود اپنا فعل اور فرشتوں کا فعل ظاہر فرماتا ہے۔

ان الله وملئكته يصلون على النبي يا يها الذين امنوا صلوا عليه وسلموا تسليما۔ (سورہ احزاب ع ۷ ح ۲۲)

بیشک اللہ اور اس کے فرشتے اس نبی پر درود وسلام بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم بھی ان پر درود وسلام بھیجو۔ اور خوب سلام بھیجو۔

آیت کریمہ کے تحت علامہ سلیمان جمل الفتوحات الالہیہ حاشیہ تفسیر جلالین میں فرماتے ہیں۔

هذه الآية دليل على وجوب الصلوة والسلام عليه مطلق۔ (جمل جلد سوم ص ۴۵۴)

یہ آیت مطلقا درود وسلام کے واجب ہونے پر دلیل ہے۔

تحت آیت کریمہ علامہ عارف باللہ شیخ احمد صاوی مالکی صاوی حاشیہ جلالین میں فرماتے ہیں:

اعلم ان العلماء اتفقوا على وجوب الصلاة والسلام على النبي ﷺ ثم اختلفوا في تعين الوجوب فعند مالك تجب الصلاة والسلام في العمر مرة وعند الشافعي تجب في التشهد الاخير من كل فرض وعن غيرهما تجب في كل مجلس مرة وقيل تجب عند ذكره وقيل تجب في الاكثار منها من غير تقييد بعدد فالصلوة على النبي ﷺ امرها عظيم وفضلها جسيم وهي من افضل الطاعات واجل القربات۔ (صاوی مصری ص ۲۳۸ ج ۳)

جانو کہ علماء نے حضور نبی کریم ﷺ پر درود وسلام کے واجب ہونے پر اتفاق کیا ہے۔ پھر انہوں نے تعیین واجب میں اختلاف کیا۔ تو امام مالک کے نزدیک درود وسلام عمر میں ایک بار واجب ہے۔ اور امام شافعی کے نزدیک ہر فرض کے اخیر تشہد میں واجب ہے۔ اور ان کے سوا اور علماء کے نزدیک ہر مجلس میں ایک مرتبہ واجب ہے۔ اور بعض نے کہا کہ حضور ﷺ کے ذکر کے وقت واجب ہے۔ اور بعض نے کہا کہ بغیر قید عدد کے اس کی کثرت کرنا واجب ہے۔ پس حضور پر درود بھیجنا بڑا امر اور زبردست فضل ہے۔ اور وہ بہتر طاعتوں اور اعلی قربتوں میں سے ہے۔

حجۃ الاسلام ابوبکر رازی احکام القرآن میں اس آیت کے تحت میں فرماتے ہیں:

قد تضمن الامر بالصلاة على النبي ﷺ وظاهره يقتضي الوجوب وهو فرض عندنا۔
(احکام القرآن مصری ص۴۵٦ ج۳)

حضور نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجنے کے امر پر مشتمل ہے۔اسکا ظاہر وجوب کا تقاضا کرتا ہے۔اور وہ ہمارے نزدیک فرض ہے۔

علامہ ابوالبرکات عبداللہ نسفی تفسیر مدارک التنزیل وحقائق التاویل میں فرماتے ہیں:

صلوا عليه۔ اى قولوا اللهم صل على محمد او صلى الله على محمد۔ وسلموا تسليما ۔ اى قولوا اللهم سلم على محمد ۔ثم هى واجبة مرة عند الطحطاوى وكلما ذكر اسمه عند الكرخى وهو الاحتياط وعليه الجمهور۔ (ملخصا تفسیر مالک مصری ص۲۳۹ ج۳)

(تم نبی پر درود بھیجو) یعنی تم کہو اے اللہ تو حضور محمد ﷺ پر درود بھیج ۔یا اللہ حضرت محمد ﷺ پر درود بھیج ۔اور تم خوب سلام بھیجو۔یعنی کہو اے اللہ تو حضرت محمد ﷺ پر سلام بھیج ۔پھر درود وسلام امام طحاوی کے نزدیک ایک مرتبہ واجب ہے۔اور امام کرخی کے نزدیک جب حضور ﷺ کا نام ذکر کیا جائے اور احتیاط اسی میں ہے اور اسی پر جمہور ہیں۔

حضرت شیخ احمد ملاجیون نے تفسیر احمدی میں قول امام کرخی کو مفتے بہ کہا اور اسی پر اجماع کو نقل کیا۔

واجمعوا على ان الاخير هو الاحتياط عليه الجمهور۔ (احمدی ص۳۴۹ ج۲)

علماء نے اجماع کیا ہے کہ اخیر قول (یعنی قول امام کرخی) احتیاطی قول ہے اور اسی پر جمہور ہیں۔

اس آیت کریمہ اور اس کی تفاسیر سے ثابت ہو گیا کہ حضور اکرم ﷺ پر درود وسلام پڑھنا واجب ہے یہ اتفاقی اجماعی مسئلہ ہے۔اتنی بات میں علماء مختلف نہیں۔اور علما کا جو اختلاف منقول ہے وہ درود وسلام کے وقت اور عدد میں ہے اور ان اقوال میں امام کرخی کے قول میں بہت احتیاط ہے۔یہی جمہور کا مسلک ہے۔اسی پر علماء کا اتفاق ہوا۔اور وہ یہ ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ کا نام نامی ذکر کیا جائے یا سنا جائے تو درود وسلام پڑھا جائے۔محافل میلاد شریف ومجالس وعظ میں چونکہ بکثرت نام نامی ذکر کیا جاتا ہے اور سنا جاتا ہے تو ان میں درود وسلام کو بکثرت ہی پڑھا جائے گا۔اور درود شریف کو ہر مجلس میں پڑھنے اور ذکر شریف پر ہر مرتبہ پڑھنے اور اس کی کثرت کرنے کا حکم احادیث میں ہے۔

بخاری ومسلم میں حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قلنا يا رسول الله كيف الصلوة عليكم اهل البيت فان الله قد علمنا كيف نسلم

عليك قال: قولوا اللهم صلى على محمد وعلى آل محمد كما صليت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم انك حميد مجيد الحديث ۔ (مشکوۃ شریف ۔ص۸٦)

ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! اے اہل بیت نبوت ہم تم پر درود کس طرح بھیجیں کہ اللہ نے ہمیں آپ پر سلام بھیجنے کی کیفیت تعلیم کی۔فرمایا: تم یوں کہو اللھم صل على محمد ۔الخ ۔اے اللہ حضرت محمد اور ان کی آل پر درود بھیج جیسا کہ تو نے حضرت ابراہیم اور ان کی آل پر درود بھیجا، بیشک تو حمد کیلئے ہے اور بزرگی والا ہے۔

صحیح مسلم شریف حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے۔

قال رسول الله ﷺ :من صلى على واحدة صلى الله تعالىٰ عليه عشرا۔
(مشکوۃ شریف ص۸٦)

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا تو اللہ تعالی اس پر دس بار رحمت بھیجے گا۔

ترمذی شریف میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے کہ۔

قال رسول الله ﷺ اولى الناس بى يوم القيمة اكثرهم على صلوة۔
(مشکوۃ شریف ص۸٦)

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: روز قیامت مجھ سے قریب تر لوگوں کا ان میں مجھ پر زیادہ درود پڑھنے والا ہوگا۔

ترمذی شریف میں حضرت ابن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال قلت يا رسول الله! انى اكثر الصلوة عليك فكم اجعل لك من صلوتى فقال ماشئت قلت الربع، قال ما شئت ۔ فان زدت فهو خير لك۔ قلت النصف، قال ما شئت فان زدت فهو خير لك، قلت ما فالثلثين ، قال ما شئت فان زدت فهو خير لك ۔قلت اجعل لك صلوتى كلها قال اذا يكفى همك ويكفرلك ذنبك۔
(مشکوۃ ص۸٦)

حضرت ابن کعب رضی اللہ تعالی عنہ نے کہا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں آپ پر بکثرت درود بھیجنا چاہتا ہوں ۔تو آپ پر درود بھیجنے کیلئے کتنا وقت مقرر کروں؟ حضور نے فرمایا جس قدر چاہے۔ میں

نے عرض کیا: چوتھائی تو فرمایا جتنا چاہے۔ اگر چوتھائی سے زائد وقت صرف کرے تو وہ تیرے لئے اور بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا: دوتہائی وقت فرمایا: جتنا چاہے اور اگر اس پر اور زیادہ کرے تو وہ تیرے لئے اور بہتر ہے۔ میں عرض کیا: کہ میں آپ پر درود بھیجنے کیلئے اپنے تمام اوقات دعا صرف کردوں۔ فرمایا: جب تو تیرے مقدر دینی ودنیوی کو کافی ہے۔ اور تیرے ظاہر و باطن گناہوں کو میٹ دیگا۔

ترمذی شریف میں حضرت مولیٰ علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال رسول اللہ ﷺ البخیل الذی من ذکر ت عندہ فلم یصل علیّ۔

(مشکوۃ شریف ص ۸۷)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سخت بخیل وہ ہے جسکے سامنے میرا ذکر کیا جائے تو وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔

ترمذی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال رسول اللہ ﷺ رغم انف رجل ذکر عندہ فلم یصل علی الحدیث۔

(مشکوۃ ص ۸۶)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ذلیل وہلاک ہو وہ شخص جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے پس وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔

ابن [illegible] نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی:

من ذکر ت عندہ فلم یصل علی فقد شقی ۔(جامع صغیر مصری ص ۱۵۴ ج ۲)

جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے وہ مجھ پر درود نہ بھیجے تو وہ بد بخت ہوگیا۔

طبرانی میں حضرت ابن عباس اور حضرت انس اور حضرت عبد اللہ بن حارث اور کعب ابن عجرہ اور مالک ابن حویرث رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اور بزار نے حضرت جابر اور حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عمار سے روایت کی۔

ان النبی ﷺ صعد المنبر فقال آمین، ثم صعد درجۃ فقال آمین، ثم صعد درجۃ فقال آمین، فسالہ معاذ عن ذلک فقال ان جبرائیل أتانی فقال یا محمد من سمیت بین یدیہ فلم یصل علیک فمات فدخل النار فابعدہ اللہ تعالی ۔ قل آمین فقلت آمین ۔الخ۔

(شفا قاضی عیاض وشرح لعلی القاری مصری ص ۱۳۹ ج ۲)

بیشک نبی اکرم ﷺ منبر پر رونق افروز ہوئے اور فرمایا آمین۔ پھر ایک سیڑھی پر چڑھے اور فرمایا

آمین۔ اور سیڑھی پر چڑھے اور فرمایا آمین۔ تو حضرت معاذ نے آمین کہنے کا سبب دریافت کیا تو حضور نے فرمایا کہ جبریل نے میرے پاس آکر کہا کہ اے محمد ﷺ جس کے سامنے آپ کا نام ذکر کیا جائے اور وہ آپ پر درود نہ پڑھے پھر وہ مرجائے تو وہ جہنم میں داخل ہوگا اور اللہ تعالی اس کو اپنی رحمت سے دور رکھے گا۔ آپ آمین کہیں تو میں نے آمین کہا۔

ترمذی شریف وابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ وابوسعید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

ما جلس قوم مجلسا لم یذکروا اللہ تعالی فیہ ولم یصلوا علی نبیہم الا کان علیہم ترۃ فان شاء عذبہم وان شاء غفر لہم۔

(جامع صغیر مصری ص ۱۲۲ ج ۱۔ شرح شفا ۱۴۱ ج ۲)

کوئی قوم کسی محفل میں بیٹھے اور اس میں ذکر الٰہی نہ کرے اور اپنے نبی کریم ﷺ پر درود نہ پڑھے تو نقصان وخسارہ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے گا تو اسے عذاب دیگا اور چاہے گا تو اس کی مغفرت کریگا

ابوداؤد طیالسی اور ضیاء مقدسی حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی اور بیہقی میں بھی انہیں سے روایت کی ہے:

ما اجتمع قوم ثم تفرقوا عن غیر ذکر اللہ وصلاۃ علی النبی ﷺ قاموا عن انتن من جیفۃ۔ (جامع صغیر مصری ص ۱۱۹ ج ۲ شرح شفا مصری ص ۱۴۱ ج ۲)

ایک قوم کسی مجلس میں جمع ہوئی پھر وہ بغیر ذکر الٰہی اور بغیر نبی کریم ﷺ پر درود پڑھے مجلس سے جدا ہوئی وہ گویا بہت بدبودار مردار سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ان احادیث سے ثابت ہوگیا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے بھی درود وسلام پڑھنے کا حکم دیا۔ اور انہیں وصول رحمت الٰہی کا سبب ٹھہرایا اور اپنے قرب کا وسیلہ ٹھیرایا اور ان کی کثرت کو حصول مقاصد کیلئے کافی بتایا۔ اور کفارہ ذنوب کیلئے بہترین ذریعہ ٹھہرایا اور بوقت ذکر صلاۃ وسلام نہ پڑھنے والے کو بخیل کہا اور ذلیل وبدبخت فرمایا اور جسکی نظر میں درود کی قدر ومنزلت نہو وہ رحمت حق سے بعید اور مستحق عذاب شدید قرار پایا۔ اور جس مجلس میں ذکر الٰہی اور درود شریف نہ پڑھا جائے اس کو ناقص اور قابل ملامت قرار دیا اور ان اہل مجلس کو خاسر و بدبودار مردار کے پاس سے کھڑا ہونیوالا ٹھہرایا ۔

بالجملہ آیۃ کریمہ اور تفاسیر واحادیث سے یہ ثابت ہوا کہ مجالس وعظ ومیلاد شریف میں جب

جس قدر نبی کریم ﷺ کا نام نامی اور ذکر پاک کیا جاتا ہے توان مجالس کے حقوق وآداب میں یہ ہیں کہ ان میں بکثرت درود وسلام کا ورد رکھا جائے۔ ذاکرین وسامعین سب اس میں مشغول رہیں کہ اہل مجلس بخل وذلت اور نقصان وشقاوت کے وبال سے بچیں اور رحمت الٰہی قرب رسالت پناہی کی نعمت کے حقدار بنیں اور عفو معاصی وحصول مقاصد کی دولت سے سرفراز ہوجائیں۔ اسی بناء پر ذاکر وواعظ اہل مجلس کو درود وسلام کی بکثرت بار بار ترغیب دیتا ہے۔

چنانچہ الاشباہ والنظائر میں ہے:

العالم اذاقال فی المجلس صلوا علی النبی فا نہ یثاب علی ذلک ۔

(الاشباہ والنظائر مع شرح حموی ص ۳۹)

جب عالم نے مجلس میں کہا تم نبی ﷺ پر درود بھیجو تو اسے اس حکم کرنے پر ثواب دیا جائیگا۔

الحاصل آیت کریمہ اور اس کی تفاسیر اور کثیر احادیث سے مجالس میں درود پڑھنے کی کس قدر اہمیت ثابت ہوئی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ وعظ ومیلاد شریف کی محافل بھی مجالس ہی ہیں تو ان میں بھی درود وسلام پڑھنا انہیں نصوص سے ثابت ہوا۔ اور فقہ کی کتاب الاشباہ والنظائر سے تو یہ بھی ثابت ہو گیا کہ مجلس میں عالم وذاکر درود شریف کا حکم بھی دے سکتا ہے۔ تو اب دیوبندی ناجائز وبدعت کس چیز کو قرار دیتا ہے۔ اگر اس کو ناجائز وبدعت کہتا ہے تو کیا اس کے نزدیک ناجائز وبدعت وہ ہے جس کا قرآن وحدیث نے حکم دیا ہے۔ مولی تعالی انہیں قبول حق کی توفیق دے۔

اور اگر یہ کہے کہ مجلس میں درود وسلام کی کثرت کو ناجائز وبدعت نہیں کہتا بلکہ اس کے بلند آواز سے پڑھنے کو بدعت وناجائز کہتا ہوں تو اسکا یہ قول بھی غلط وباطل ہے کہ احادیث میں قرآن واذکار کا بلند آواز سے پڑھنا مروی ہے۔

ابوداؤد شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

کانت قرأة النبی ﷺ باللیل یر فع طورا ویخفض طورا۔ (ابوداؤد شریف ص ۱۹۴ ج ۱)

حضور نبی کریم ﷺ رات میں قرآت کبھی بلند آواز سے پڑھتے۔ کبھی پست آواز سے پڑھتے یعنی نماز تہجد میں)

ترمذی شریف میں حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

ان النبی ﷺ قال لا بی بکر مررت بك وانت تقرأوانت تخفض من صوتك فقال

انی اسمعت من نا جیت قال ارفع قلیلا وقال لعمر مررت بك وانت تقرأ وانت ترفع صوتك ،فقال انی او قظ الوسنا ن واطرد الشیطان قال اخفض قلیلا۔

(ترمذی ص ۶۹ ج ۱)

بیشک نبی ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: میں تمہارے قریب ہوکر گذرا، اور تم پست آواز سے قرأت کررہے تھے۔ عرض کیا: میں جس سے مناجات کررہا تھا اسی کو سنا رہا تھا فرمایا: تم کچھ بلند آواز سے پڑھو، حضور نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: میں تمہارے پاس سے گذرا اور تم بلند آواز سے قرأت کررہے تھے، عرض کیا: میں سونے والوں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا۔ فرمایا: تم کچھ پست آواز کرو۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

کان رسول اللہ ﷺ اذا سلم من صلوته یقول بصوته الاعلیٰ :لا اله الا الله وحده لا شیك له ،له الملك وله الحمد وهو علی كل شئ قدیر الحدیث۔ (مشکوۃ شریف ص ۸۸)

حضور نبی کریم ﷺ جب اپنی نماز کا سلام کرتے تھے تو بلند آواز سے یہ فرماتے تھے **لا الـٰه الا الله وحده لا شریک له الخ۔**

اسی مسلم شریف میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے روایت کی۔

ان رفع الصوت بالذکر حین ینصرف النا س من المکتوبة کا ن علی عهد النبی ﷺ وقال ابن عبا س کنت اعلم اذاانصرفوا بذلك اذا سمعته۔

(مسلم شریف مع نووی ص ۲۱۷)

زمانہ حضور نبی کریم ﷺ میں جب لوگ اپنی نماز فرض سے فارغ ہوتے تو بلند آواز سے ذکر کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جب میں ذکر کی آواز سن لیتا تو جان لیتا تھا کہ لوگ نماز سے فارغ ہوچکے (یعنی ذکر کی آواز سے جماعت فرض کا ختم ہونا معلوم ہوجاتا)

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ تنہا نماز پڑھنے والے کو بھی بلند آواز سے قرآت کرنا چاہیے خود حضور ﷺ نے بلند آواز سے قرأت پڑھی۔ اسی طرح نماز سے فراغت کے بعد حضور نبی کریم ﷺ بلند آواز سے ذکر پڑھتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ زمانہ اقدس میں جب میں بلند آواز سے ذکر سن لیتا تو سمجھ لیتا کہ لوگ جماعت سے فارغ ہو گئے۔

علامہ شیخ احمد طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح میں اسی حدیث مسلم شریف نقل فرما کر لکھتے ہیں:

ویستفاد من الحدیث الاخیر جواز رفع الصوت بالذکر والتکبیر عقیب المکتوبات بل من السلف من قال باستحبابہ۔ (طحطاوی مصری ص ۱۸۱۔)

فرضوں کے بعد ذکر وتکبیر کے بلند آواز سے پڑھنے کا جواز حدیث اخیر سے مستفاد ہوا بلکہ سلف میں سے بعض نے اسکا مستحب ہونا بیان فرمایا۔

علامہ سید احمد حموی شرح الاشباہ والنظائر میں عبدالوہاب شعرانی کی کتاب بیان ذکر الذاکر للمذکور سے ناقل ہیں:

اجمع العلماء سلفا وخلفا علی استحباب ذکر اللہ تعالی جماعۃ فی المساجد وغیرہ من غیر نکیر الاان یشوش جھرھم بالذکر علی نائم اومصل او قاری کما ھو مقرر فی کتب الفقہ۔ (حموی کشوری ص ۵۶۰)

علماء سلف وخلف نے مسجد وغیر مسجد میں جمع ہوکر ذکر اللہ کے بجہر مستحب ہونے پر بلاخلاف اجماع کیا۔ ہاں جب انکا بآواز بلند ذکر کرنا سونیوالے یا نماز پڑھنے والے یا قرأت کرنے والے کیلئے خلل انداز ہو جیسا کہ کتب فقہ میں موجود ہے۔

علامہ ابن عابدین ردالمحتار میں فتاوی بزازیہ سے ناقل ہیں:

امارفع الصوت بالذکر فجائز کما فی الاذان والخطبۃ والجمعہ والحج۔ (درالمختار ص ۲۶۳ ج ۵۔)

ذکر کا باآوز بلند کرنا جائز ہے جیسے اذان وخطبہ وجمعہ وحج میں۔

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ ذکر کا بلند آواز سے کرنا نہ فقط جائز بلکہ سلف وخلف کے علماء نے بلاخلاف اس امر پر اجماع کیا ہے کہ مساجد وغیر مساجد میں ذکر کا بلند آواز سے کرنا مستحب ہے۔ ہاں اگر سونے والے یا نماز پڑھنے والے یا قرات کرنیوالے کیلئے مخل ہو تو پست آواز سے کیا جائے۔

اب باقی رہی یہ بحث کہ ذکر جہر افضل ہے یا ذکر خفی۔ تو اسکا فیصلہ شیخ الاسلام علامہ خیرالدین رملی نے اس طرح فرمایا۔

فتاوی خیریہ میں ہے:

وھنالک احادیث اقتضت طلب الاسرار والجمع بینھما بان ذلک تختلف با

ختلاف الاشخاص والاحوال کما جمع بین الاحادیث الطالبۃ للجھر بالقرأۃ والطالبۃ للاسرار بھا ولا یعارض ذلک خیرالذکر الخفی لانہ حیث خیف الریا او تاذی المصلین او النیام والجھر ذکر بعض اھل العلم انہ افضل حیث خلامما ذکر لانہ اکثر عملا ولتعدی فائدتہ الی السامعین ویوقظ قلب الذاکر فیجمع ھمہ الی الفکر ویصرف سمعہ الیہ ویطرد النوم ویزید النشاط۔

(خیریہ مصری ص ۱۸۱ ج ۲)

اور یہاں ایسی احادیث بھی ہیں جو پست آواز کا مطالبہ کرتی ہیں اور ہر دو قسم کی احادیث میں توافق یہ ہے کہ حکم شخصوں اور حالتوں کے اختلاف سے مختلف ہو جاتا ہے جس طرح کے قرأت کی بلند آواز سے طلب کرنے والی اور پست آواز سے طلب کرنے والی حدیثوں میں توافق کیا جاتا ہے۔ اس کا معارضہ نہ کیا جائے۔ یا نمازیوں یا سونے والوں کو اذیت دے۔ اور جس جگہ یہ باتیں نہ ہوں تو بعض اہل علم نے فرمایا کہ وہاں بلند آواز سے ذکر کرنا افضل ہے کہ اس میں یہ کثیر اعمال ہیں کہ اس کا فائدہ سامعین تک پہونچتا ہے اور قلب ذاکر کو بیدار رکھتا ہے اور اس کی توجہ فکر کو جمع رکھتا ہے اور نیند کو دور کرتا ہے اور نشاط کو زائد کرتا ہے۔

علامہ ابن حجر مکی کے فتاوی حدیثیہ میں ہے:

بعضھم یختار الجھر لدفع الوسواس الردیۃ والکیفیات النفسانیۃ ولایقاظ الغافلۃ واظھار الاعمال الکاملۃ۔ (حدیثیہ مصری ص ۵۶)

بعض نے بلند آواز کی وسوسوں اور نفسانی کیفیتوں کے دفع کرنے کے لئے اور غافل قلبوں کے بیدار کرنے اور کامل عملوں کے ظاہر کرنے کے لئے اولی قرار دیا۔

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ خلاصہ تحقیق یہ ہے۔ جب بلند آواز سے ذکر کرنے میں ریا کا خوف اور نمازیوں اور سونے والوں کو تشویش نہ ہو تو ذکر خفی سے ذکر جلی ہی افضل ہے کہ اس میں کثیر منافع ہیں اور اس ذکر جلی کا فائدہ تمام سامعین کو پہونچتا ہے۔ اور ذاکر کے قلب کو بیدار کرتا ہے۔ اس کی فکر کو منتشر نہیں ہونے دیتا۔ سماعت کو اپنی طرف متوجہ رکھتا ہے۔ نیند کو دور کرتا ہے۔ خوشی کو زائد کرتا ہے۔ ردی وسوسوں اور نفسانی کیفیتوں کو دفع کرتا ہے۔ غافل قلبوں کو جگاتا ہے۔ کامل عملوں کو ظاہر کرتا ہے۔ لہذا ان وجوہ کی بنا پر بلند آواز سے ذکر کرنا افضل ثابت ہوا۔

اب یہ امر اور باقی رہتا ہے کہ مجمع میں بھی بلند آواز سے ذکر کیا جائے یا نہیں۔ تو حضرت شیخ الاسلام علامہ خیر الدین رملی نے یہ فتوی دیا۔

فتاوی خیریہ میں ہے:

والذکر فی الملاء لا یکون الاعن جھر وکذا حلق الذکر وطواف الملائکۃ بھا وما وردفیھا من الاحادیث فان ذلک انما یکون فی الجھر بالذکر۔

(خیریہ مصری ص ۱۸۱ ج ۲)

مجمع میں تو ذکر بلند آواز سے ہی ہو۔ اسی طرح ذکر کے حلقے اور ملئکہ کا جو طواف احادیث میں وارد ہوا تو وہ بلند آواز ہی کے ذکر پر ہوتا ہے۔

علامہ ابن عابدین نے ردالمحتار میں اور سید احمد حموی نے شرح الاشباہ میں حجۃ الاسلام امام غزالی کا یہ قول نقل کیا:

قد تبیہ الامام الغزالی ذکر الانسان وحدہ وذکر الجماعۃ باذان المنفرد واذان الجماعۃ کما قال فکما ان اصوات المؤذنین جماعۃ تقطع جرم الھواء اکثر من صوت المؤذن الواحد کذالک ذکر الجماعۃ علی قلب واحد اکثر تاثیرا فی رفع الحجب الکثیفۃ من ذکر شخص واحد۔ (ردالمحتار مصری ص ۲۶۳ ج ۵ (حموی ص ۵۶۰)

امام غزالی نے ایک شخص کے ذکر کرنے اور جماعت کے ذکر کرنے کی تشبیہ ایک شخص کی اذان اور جماعت کی اذان سے دی۔ فرمایا جبکہ چند اذان کہنے والوں میں آوازیں ایک موذن کی آواز سے جرم ہوا کو زیادہ قطع کرتی ہیں۔ اسی طرح جماعت کا ذکر کرنا ایک شخص کے ذکر کرنے سے زیادہ قلب کے کثیف حجابات اٹھانے میں مؤثر ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ مجمع میں تو بلند آواز ہی سے ذکر کیا جائے۔ اور ایک شخص کے ذکر سے جماعت کا بلند آواز سے ذکر کرنا قلب کے کثیف حجابات کے رفع کے لئے زیادہ مؤثر ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ درود وسلام بھی منجملہ اذکار کے ایک ذکر ہی ہے۔ تو جب ذکر کا بلند آواز سے کرنا جائز و مستحب قرار پایا اور یہ خفی سے افضل ثابت ہوا۔ اور مجمع میں بلند آواز ہی سے ذکر کرنا تصریح سے ظاہر ہوا تو درود وسلام کا بھی بلند آواز ہی سے پڑھنا جائز و مستحب ٹھہرا۔ اور اس کا بلند آواز سے پڑھنا

افضل قرار پایا۔ اور اس کو مجمع میں تو بلند ہی آواز سے پڑھا جائے۔ تو اب دیوبندی مجالس وعظ ومحافل میلاد شریف میں درود وسلام کے بلند آواز سے پڑھنے کو ان تصریحات کے مقابلہ میں کس دلیل سے ناجائز و بدعت کہتا ہے۔ کیا دیوبندیوں کے نزدیک بدعت وناجائز وہ ہے جو احادیث سے جائز ثابت ہو جس کو سلف وخلف افضل قرار دیں۔ جس کے استحباب پر فقہاء اجماع منعقد کریں۔ جس کے علماء اکثر منافع وفوائد شمار کرائیں۔ مولی تعالی ان کو قلب سلیم وفہم مستقیم عطا فرمائے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۵۵)

بنگال میں رواج ہے کہ سال میں ایک مرتبہ یا کئی مرتبہ مولویوں وغیرہ کو قبرستان میں لیجا کر مردہ کے واسطے ایصال ثواب کیا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد ان کو کھانا بھی کھلایا جاتا ہے اور روپیہ پیسہ بھی صدقہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح ایصال ثواب کرنا۔ مولویوں وغیرہ کو کھانا کھلانا اور صدقہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟۔ دیوبندی حضرات اس کو بھی ناجائز بتلاتے ہیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

قبرستان میں جانے کا حکم اور زیارت قبور کی ترغیب خود کثیر احادیث میں وارد ہے۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال رسول اللہ ﷺ نھیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا (الحدیث)۔

(مشکوۃ شریف ص ۱۵۴)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے تمہیں پہلے زیارت قبور سے منع کیا تھا پس اب تم زیارت قبور کیا کرو۔

سنن ابن ماجہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

ان رسول اللہ ﷺ قال کنت نھیتکم عن زیارۃ القبر فزوروھا فانھا تزھد فی الدنیا وتذکر الاخرہ۔

(مشکوۃ ص ۱۵۴)

بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے تمہیں پہلے زیارت قبور سے منع کیا تھا پس اب تم

زیارت قبور کرو کہ وہ دنیا میں زہد پیدا کرتی ہیں اور آخرت کو یاد دلاتی ہیں۔

بیہقی شریف میں حضرت ابن نعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

قال رسو ل الله ﷺ من زار قبر ابو یه او احدهما فی کل جمعة غفر له و کتب برا۔

(مشکوۃ شریف۔ص۱۵۴)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اپنے ہر دو ماں باپ یا ایک کی قبر کی زیارت کرے ہر جمعہ کو تو اس کی مغفرت کردی جائیگی اور ماں باپ کو رضامند کرنے والا لکھا جائیگا۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

کان رسول ﷺ کلما کا ن لیلتها من رسو له ﷺ یخرج من آخر الیل الی البقیع فیقول السلام علیکم دار قوم مومنین و اتا کم ما تو عدون غدا و انا انشاء الله بکم لا حقون اللهم اغفرها لا هل بقیع الغرقد (مسلم مع نووی ص۳۱۳ ج۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جب حضور ﷺ کی میری رات ہوتی تو آخر رات میں بقیع تشریف لیجاتے تو فرماتے السلام علیکم دار قوم مو منین تمہیں جو وعدہ کیا گیا تھا کل کیلئے وہ مل گیا اگر اللہ چاہے گا تو ہم تمہارے ساتھ لاحق ہونیوالے ہیں۔ اے اللہ تو اہل بقیع غرقد کی مغفرت فرما۔

مسلم شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک طویل حدیث مروی ہے جس میں حضور علیہ السلام کے بقیع شریف جانے کا واقعہ ہے اور وہ ان کی مقررہ شب تھی، حضور نے اپنی جانیکی وجہ یہ بیان فرمائی۔

فان جبرئیل علیه السلام اتانی حین رأیت فنادانی فا خفاه منك فا جبته فا خفیته منك ولم یكن یدخل علیك وقد وضعت ثیابك وظننت ان قد رقدت فكرهت ان او قظك وخشیت ان تستوحشی فقال ان ربك یا مرك ان تاتی اهل البقیع فتستغفر لهم قالت قلت كیف اقول لهم یا رسول الله صلی الله تعالی علیه وسلم، قال قولی السلام علیكم علی اهل الدیا ر من المو منین۔ الحدیث (مسلم۔ص۳۱۴ ج۱)

بیشک جبرئیل علیہ السلام میرے پاس آئے جس وقت تو نے اے عائشہ دیکھا تھا تو انہوں نے تجھے پکارا۔ پس میں نے اس کو تم سے چھپایا اور اس کی اجابت کی تو اس نے اس کو تم سے پوشیدہ رکھا اور

چونکہ تو اپنے کپڑے اتار چکی تھی اسلئے تمہارے پاس نہیں آئے اور میں نے خیال کیا کہ تم سوگئی ہو۔ تو میں نے تمہارا جگانا مناسب نہیں جانا اور تمہاری وحشت کا خوف کیا۔ پس جبرئیل نے کہا کہ آپکا رب آپکو حکم دیتا ہے کہ آپ اہل بقیع کے نزدیک تشریف لیجائیں اور ان کیلئے مغفرت طلب کریں۔ حضرت عائشہ نے عرض کیا کہ میں اہل قبور سے کیا کہوں فرمایا: تم یہ کہو اے اہل دیار مومنین تم پر سلام ہو۔

جامع ترمذی شریف میں انہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

قالت فقدت رسو ل الله ﷺ لیلة فخرجت فا ذا هو بالبیقیع فقال اکنت تخافین ان یحیف الله علیك ورسوله قلت یا رسول الله ظننت انك اتیت بعض نسائك فقال ان الله تبارك وتعالی نزل لیلة النصف من شعبا ن الی سماء الدنیا فغفر لا كثر من عدد شعر غنم كلب۔ (ترمذی شریف مجیدی۔ص۱۰۴ ج۱)

حضرت عائشہ نے فرمایا ایک رات میں نے رسول اللہ ﷺ کو نہ پایا تو میں نکلی تو حضور بقیع میں تشریف فرما ہیں۔ حضور نے فرمایا کیا تو یہ خوف کرتی تھی کہ اللہ کے رسول تجھ پر ظلم کرینگے؟۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے یہ خیال کیا کہ کسی دوسری بی بی کے پاس تشریف لے گئے۔ فرمایا بیشک اللہ تبارک وتعالیٰ شعبان کی پندرہویں شب میں پہلے آسمان کی طرف نزول فرماتا ہے تو قبیلہ کلب کی بکریو ں کے بالوں کی مقدار سے زائد لوگوں کی مغفرت فرماتا ہے۔

خاتم المحدثین حضرت جلال الدین سیوطی نے شرح الصدور میں بیہقی کی روایت ذکر کی:

کان النبی ﷺ یزور شهدا ا حدفی کل حول واذا بلغ الشعب رفع صوته فیقول سلام علیکم بما صبر تم فنعم عقبی الدار ثم ابو بکر رضی الله عنه کل حول یفعل مثل ذلك ثم عمربن الخطا ب ثم عثما ن رضی الله عنهما وکا نت فا طمة بنت رسول الله ﷺ تا تیهم وتد عو وکا ن سعد بن ابی وقاص یسلم علیهم ثم یقبل علی اصحابه فیقول الا تسلمون علی قوم یردو ن علیکم السلام۔ (شرح الصدور۔ص۸۷۔)

حضور اکرم ﷺ ہر سال میں شہداء احد کی قبور کی زیارت کرتے تھے اور جب شعب میں پہونچتے تو بلند آواز سے فرماتے تمہارے اوپر سلام ہو تمہارے صبر کرنے کے عوض تو یہ پچھلا گھر کیا اچھا ہے۔ پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہر سال ایسا ہی کرتے۔ پھر حضرت فاروق اعظم پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضور علیہ السلام کی صاحبزادی حضرت فاطمہ قبور شہداء کی زیارت کرتیں اور دعاء مانگتی تھیں اور حضرت

سعد بن ابی وقاص بھی قبور شہداء پر سلام کہتے پھر اپنے ہمراہیوں کی طرف متوجہ ہو کر فرماتے تم ایسی قوم پر سلام کیوں نہیں کرتے جو تمہیں سلام کا جواب دیں۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ حضور ﷺ نے قبرستان میں جانیکا حکم کیا اور زیارت قبور کے فوائد ذکر فرمائے کہ یہ زیارت دنیا میں زہد پیدا کرتی ہے اور آخرت کو یاد دلاتی ہے اور ہر جمعہ کو ماں باپ کی قبور پر جانیکی ترغیب دی۔ اور خود حضور علیہ السلام مدینہ کے قبرستان بقیع شریف میں تشریف لیجاتے اور اہل قبر کو سلام کرتے ان کیلئے دعاء مغفرت فرماتے۔ ہر سال شہداء احد کی زیارت قبر کیلئے تشریف لیجاتے خلفاء راشدین سالانہ احد میں تشریف لیجاتے اور صحابہ کرام بھی مزارات شہداء پر حاضر ہوتے اور دوسروں کو زیارت قبور کی ترغیب دیتے بلکہ اس زیارت قبور کی ترغیب کے لئے حضرت جبرئیل امین نازل ہوئے اور اللہ تعالی نے اسکا حکم دیا۔ لہذا قبرستان میں جانا حدیث قولی و فعلی دونوں سے مسنون ثابت ہو۔ لہذا اگر تنہا جائے جب سنت ہے اور دوسروں کو رغبت دیکر اپنے ساتھ لیجائے جب بھی سنت ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا فعل گزرا کہ وہ قبرستان جانے کیلئے اپنے اصحاب کو ترغیب دیتے تھے۔

اب باقی رہی یہ بات کہ قبرستان میں پہونچ کر کیا کرے تو اتنا تو ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ وہاں دعا کرنا سلام کرنا مسنون ہے۔ اب رہا ایصال ثواب کرنا تو کبھی تو ایصال ثواب قرآن کریم پڑھکر کیا جاتا ہے اور یہ بھی حدیث شریف سے ثابت ہے۔

چنانچہ ابوالقاسم اپنے فوائد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

قال رسول اللہ ﷺ من دخل المقابر ثم قرأ فاتحه الكتاب وقل هو الله احد والهكم التكاثر ثم قال اللهم انى قد جعلت ثواب ما قرأت من كلامك لا هل المقابر من المو منين والمو منات كانو اشفعاء له الى الله تعالى۔ (شرح الصدور مصری ص ۱۳۰)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص قبرستان میں داخل ہو پھر سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص اور سورہ تکاثر پڑھے پھر کہے اے اللہ میں نے جو تیرے کلام پاک کی قرأت کی اسکا ثواب قبرستان کے سب مسلمان مرد عورت کو پہونچا تو اموات اس کے لئے اللہ تعالی کے حضور شفیع ہونگے۔

اس حدیث سے ثابت ہو گیا کہ خود حضور علیہ السلام نے ثواب قرأت قرآن کے ایصال کا حکم دیا۔ صحابہ کرام بھی قرآن پڑھکر ایصال ثواب کیا کرتے تھے۔

اخرج الخلال فی الجامع عن الشعبی قال كانت الانصار اذا مات لهم الميت اختلفوا الى قبره يقرؤن له القران۔

(شرح الصدور ص۱۳۰)

خلال نے جامع میں امام شعبی سے روایت کی کہ انصار میں جب کسی شخص کا انتقال ہو جاتا تو وہ قبر کی طرف جاتے اور اس کے لئے قرآن پڑھتے تھے۔

بلکہ قرأت قرآن اموات کا ایصال ثواب کرنا اہل اسلام کا اجماعی مسئلہ ہے۔

چنانچہ شرح الصدور میں ہے:

ان المسلمين ما زالوا فی كل عصر يجتمعون ويقرؤن لمو تا هم من غير نكير فكان ذلك اجماعا۔ (شرح الصدور ص۱۳۰)

بیشک مسلمان ہر زمانہ میں جمع ہوتے رہے اور اپنے میت کیلئے بغیر کسی اختلاف کے قرأت کرتے رہے تو یہ اجماع ہو گیا۔

فتاوی عالمگیری میں ذخیرہ سے ناقل ہیں:

يستحب عند زيارة القبور قرأة سورة الاخلاص سبع مرات فانه بلغنى ان من قراها سبع مرات ان كا ن ذلك غير مغفور له يغفرله وان كان مغفوراله اغفرلهذا القاری ووهب ثوابه للميت۔ (عالمگیری مجید کانپوری ص۱۰۹ ج۴)

بالجملہ قرآن کریم کی قرأت کا ایصال ثواب کرنا حضور نبی کریم ﷺ کے حکم سے بھی ثابت ہوا۔ اور صحابہ کرام کے فعل سے بھی ثابت ہوا۔ اور اجماع مسلمین سے بھی ثابت ہوا۔ اور فقہ کی کتاب سے بھی ثابت ہوا۔ لہذا اب اسکا کوئی مسلمان تو انکار کرنہیں سکتا۔

اب باقی رہا صدقات سے کھانا کھلا کر ایصال ثواب کرنا تو یہ بھی احادیث سے ثابت ہے۔

ابوداؤد و نسائی میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال يا رسول الله ان ام سعد ماتت فای الصدقه افضل قال الماء فحفر بيرا قال هذه لا م سعد۔ (مشکوۃ شریف ص۱۶۹)

حضرت سعد نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ام سعد کا انتقال ہو گیا تو کونسا صدقہ افضل ہے حضور نے فرمایا پانی۔ تو کنواں کھودا گیا فرمایا: کنوں ام سعد کیلئے ہے۔

طبرانی میں حضرت عقبہ ابن عامر رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے:

قال رسول اللہ ﷺ ان الصدقة لتطفی عن اهل القبور :

(جامع صغیر مصری ص ۶۹ صرح صدور ص ۱۴۸)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بیشک صدقہ اہل قبور سے اس کی حرارت کو بجھا دیتا ہے۔

طبرانی نے اوسط میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے:

یقول رسول اللہ ﷺ مامن اهل میت یموت منهم میت فیصد قون عنه بعد مو ته الااهداها لهجبرئیل علی طبق من نو ر ثم یقف علی شفیر القبر فیقول یا صاحب القبر العمیق هذه هدیة اهدا ها الیك اهلك فاقبلها فتدخل علیه فیفرح بها یستبشر ویحزن جیر انه الذی ن لا یهدی لهم شئی ۔

(شرح الصدور ص ۱۲۹)

رسول اللہ ﷺ فرماتے: اہل بیت جن میں کوئی شخص مرجائے اور وہ اس کے مرنے کے بعد اس کی طرف صدقہ کرے تو جبرئیل اس میت کیلئے اس صدقہ کو نور کے طبق میں لیجاتے ہیں اور کنارہ قبر پر کھڑے ہوکر کہتے ہیں کہ عمیق قبر والے یہ وہ سب یہ ہے کہ جس کو تیرے اہل نے تیری طرف بھیجا ہے پس میت پر داخل ہوتا ہے اور میت اس سے فرحت وسرور حاصل کرتا ہے اور اس کے وہ پڑوسی جن کو کچھ نہیں آیا ہے وہ رنجیدہ ہوتے ہیں ۔

علامہ زرقانی شرح مواہب لدنیہ میں حدیث کے جملہ افضل الصدقه الماء کے تحت میں فرماتے ہیں:

هذا فی موضع یقل فیه الماء ویکثر العطش والافسقی الماء علی الانهار القنی لایکو ن افضل من اطعام الطعام عند الحاجة۔

(زرقانی مصری ص ۴۵۰ ج ۵)

پانی کا افضل صدقہ ہونا اس مقام میں ہے جہاں پانی کی قلت ہو اور پیاس کی زیادہ خواہش ہو ورنہ نہروں اور ذخائر پر پانی پلانا بوقت ضرورت کھانا کھلانے سے افضل نہ ہوگا۔

ان احادیث سے ثابت ہوگیا کہ اموات کو ایصال ثواب صدقات سے بھی کیا جاتا ہے۔ اور صدقات کا ثواب میت کو پہونچتا ہے۔ اور اس سے اس کو فرحت وسرور حاصل ہوتا ہے۔ اور کھانا کھلانا افضل صدقات میں سے ہے اسی بنا پر علماء کا اس پر اجماع ہوا۔

علاقہ قسطلانی مواہب میں اور علامہ زرقانی اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

وذکر الشیخ شمس الدین ابن قطان العسقلا نی ان وصول ثواب القران الی المیت من قریب او اجنبی هو الصحیح مع النیة وهو المعتمد عند متاخر الشافعیة کما تنفع الصدقة عنه والدعاء والاستغفارله بالاجماع المؤید بصریح کثیر من الاحادیث ۔

(زرقانی مصری ص ۷۰ ج ۵)

شیخ شمس الدین ابن قطان عسقلانی نے ذکر کیا کہ رشتہ دار یا اجنبی کا سنت کیساتھ میت کے لئے قرآت کا ثواب پہونچانا متاخرین شافعیہ کے نزدیک صحیح ومعتمد ہے جیسے کہ میت کے طرف سے صدقہ کرنا اور اس کے لئے دعاء واستغفار کرنا اس کو نفع پہونچاتا ہے اور یہ اس اجماع سے ثابت ہے جسکی تائید کثیر احادیث کی صراحت کرتی ہے۔

علامہ شیخ محمد دمشقی رحمۃ الامہ فی اختلاف الائمہ میں فرماتے ہیں:

اجمعوا علی ان الاستغفار والدعاء والصدقه والحج والعتق تنفع المیت ویصل الیه ثوابه ۔

(رحمۃ الامہ مصری ص ۱۰۲ ج ۱)

علماء نے اس پر اجماع کیا کہ استغفار اور دعاء اور صدقہ اور حج اور غلام آزاد کرنا میت کو نفع دیتا ہے اور انکا ثواب اسے پہونچتا ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں:

ومستحب است کہ تصدق کردہ شود از میت بعد از رفتن او از عالم تا ہفت روز وتصدق از میت نفع میکند اورا بے خلاف بیان اہل علم وواردشدہ است دراں احادیث صحیح خصوصا۔

(اشعۃ اللمعات کشوری)

اور مستحب ہے کہ میت کیلئے اس کے اس عالم سے جانے کے بعد سے سات روز تک صدقہ کیا جائے اور اہل علم اس میں مختلف نہیں کہ میت کیلئے صدقہ کرنا اسے نفع دیتا ہے اس کے ثبوت میں خاص طور پر صحیح حدیثیں وارد ہوئیں۔

امام احمد نے زہد میں اور ابو نعیم نے حلیہ میں حضرت طاوس رضی اللہ عنہ سے راویت کی:

ان المو تی یفتنو ن فی قبورهم سبعا فکانوا یستحبون ان یطعم منهم بتلك الایام ۔

(صحیح بہاری ص ۱۵۹ ج ۲)

بیشک مردے اپنے قبروں میں سات روز تک آزمائش کئے جاتے ہیں تو لوگ ان دنوں میں مردو
ں کیلئے کھانا کھلانا مستحب جانتے تھے۔

ان عبا رات سے ثابت ہوگیا کہ میت کیلئے ایصال ثواب صدقات سے کرنے پر اجماع ہوا۔
اہل علم میں کوئی اسکا مخالف نہیں اور کثیر احادث صحیحہ اس کی تائید کرتی ہے اور کھانا کھلانا بھی صدقات ہی
میں داخل ہے بلکہ زرقانی کی عبارت سے ثابت ہوا کہ کھانا کھلانا افضل صدقہ ہے۔ اس بنا پر مسلمان ہفتہ
بھر تک میت کی طرف سے کھانا کھلاتے ہیں۔

الحاصل میت کیلئے ایصال ثواب جس طرح تلاوت قرآن کریم کرنا مسنون و جائز ہے اسی طرح
صدقات اور کھانا کھلا کر ایصال ثواب کرنا بھی بلاشبہ جائز بلکہ مسنون ہے۔ دیو بندی اس کو ناجائز کہہ کر
دین پر افترا کرتا ہے اور فعل مسنون کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ اور محض اپنی رائے ناقص سے حلال کو حرام
ٹھراتا ہے۔ مولی تعالی انہیں ہدایت کرے۔ واللہ تعالی علم بالصواب ۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئله (۵۵۶)

بنگال میں تقریر کیلئے عالموں کو دعوت دیجاتی ہے اور صاحب دعوت کے طرف سے عالموں
و فاضلوں کو نذرانہ بھی پیش کیا جاتا ہے اور کھانا بھی کھلایا جاتا ہے اور یہ بھی رواج ہے کہ ختم قرآن کے بعد
قاریوں کو روپیہ پیسہ صدقہ کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ سے نہ تو دینے والا اس کو اجرت سمجھتا ہے اور نہ لینے والا
بلکہ اس کو صدقہ خیال کیا جاتا ہے۔ دیو بندی اس کو ناجائز اور حرام قرار دیتے ہیں اور حرام۔ ہ شامی میں ختم
قرآن کے بعد ۴۱ درم لینا جائز لکھا ہے اور الاشباہ والنظائر میں مطلق طاعت میں جائز قرار دیا ہے جواب
مع الدلیل مرحمت فرمایا جائے۔ بینوا توجروا۔ احقر سید الخیر نعیمی اسلام آباد۔

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

عالموں کو بعد تقریر نذرانہ دینا اور کھانا کھلانا اسی طرح قاریوں کو ختم قران کریم پر روپیہ پیسہ صدقہ
کرنا جب اسطرح پر ہے کہ دینے والا اس کو اجرت سمجھ کر نہ دیتا ہے اور نہ لینے والا اس کو اجرت جان کر لیتا
ہے تو وہاں کے عرف و رواج میں دینے والا بہ نیت اجرت دیا کرتا ہے نہ لینے والا بخیال اجرت لیا کرتا ہے

بلکہ ہر دو صدقہ لیتے دیتے ہیں تو یہ بلاشبہ جائز ہے۔

بخاری شریف و مسلم شریف میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالی عنہ سے یہ حدیث مروی ہے

یقول کان رسول الله ﷺ یعطینی العطاء فا قول اعطه افقر الیه منی فقال رسول
الله ﷺ خذوا واذاجاء ك من هذا المال وانت غیر مشرف ولا سائل فخذوه وما لا فلا
تتبعه نفسك ۔ (بخاری مصری ص ۱۹۸ ج ۴)

حضرت عمر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مجھ کو عطیہ دیتے تھے تو میں عرض کرتا کہ اس کو ایسے شخص
کو دیجئے جو مجھ سے زیادہ محتاج ہو تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو لے اور تیرے پاس اس مال میں
سے جو آئے اور تو اسکا جمع کرنیوالا اور سوال کرنے والا نہ ہو تو اس کو لے۔ اور جو اس طرح کا نہ ہو تو اس
کے لئے اپنے دل میں خواہش نہ کر۔

مسلم شریف میں حضرت ابن ساعدی رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے

قال استعملنی عمر بن الخطاب علی الصد قة فلما فرغت عنها وادیتها الیه امر لی
بعمالة فقلت له انما عملت لله اجری علی الله فقال خذ ما اعطیت فانی عملت علی عهد
رسول الله ﷺ او سلم فعملنی فقلت مثل قولك فقال لی رسو ل الله ﷺ اذا اعطیت شیئا
من غیر ان تسال فکل تصدق ۔ قال سالم فمن اجل ذلك کان ابن عمر لا یسا ل احداشیأ
ولا یرد شیئا اعطیه ۔ (مسلم شریف مع نوری ص ۳۳۴ ج ۱)

حضرت ابن ساعدی نے کہا کہ حضرت عمر بن خطاب نے مجھے صدقہ وصول کرنے کیلئے عامل بنایا
پس جب میں اس سے فارغ ہوگیا اور اس صدقہ کو انہیں دیدیا تو حضرت عمر نے میرے لئے اجرت عمل
دینے کا حکم فرمایا، تو میں نے ان سے عرض کیا کہ میں نے تو اللہ ہی کیلئے کام کیا ہے۔ میرا اجر تو اللہ ہی پر
ہے تو حضرت عمر نے فرمایا تجھے جو دیا جاتا ہے لے، میں بھی زمانہ اقدس میں یہ کام کیا کرتا تھا تو حضور نے
مجھے اجرت عمل دی پس میں نے بھی تیری بات کہی تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب تجھے کوئی چیز بغیر
سوال کے دیجائے پس تو کھا اور صدقہ کر۔ حضرت سالم نے کہا اسی وجہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما
کسی سے بھی خرچ کی بابت سوال نہیں کیا کرتے تھے۔ اور جو چیز انہیں دیجاتی تو اسے رد نہیں کرتے تھے

مسند امام احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

من اتاه الله من هذا المال شيا من غير ان يسأل فليقبله فانما هو رزقا قدر الله اليه
(جامع صغیر مصری ص ۱۳۹ ج ۱)

اللہ جسے کچھ اس مال سے بغیر سوال کے دے تو وہ اس کو قبول ہی کر لے کہ وہ رزق ہے جس کو اللہ نے اسکی طرف بھیجا۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ جو مال بلا طلب اور بغیر طمع کے ملے تو اس کو لے لیا جائے۔ اور اس کو رد نہ کیا جائے کہ وہ رزق ہے جو اللہ تعالی نے اسے دیا ہے۔ اب اس کو خود بھی کھا سکتا ہے اور صدقہ بھی کر سکتا ہے۔

بالجملہ جب دینے والا اور لینے والے دونو ں کا قصد عوض اجرت نہیں تو پھر اسے جواز میں کیا کلام ہے بلکہ اس صورت میں در حقیقت عالم وعظ کہہ کر اور قاری قرآن کریم پڑھکر لوگوں میں صدقہ کرتے ہیں کہ حدیث شریف میں ہے:

من الصدقة ان تعلم الرجل العلم رواه الحسن مرسلا۔
(جامع صغیر ص ۱۳۸)

صدقہ سے ہے کہ تو ایک شخص کو علم سکھائے۔
مسلم شریف میں حضرت ابوذر رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے:

ان ناسا من اصحاب النبي ﷺ قالوا للنبي ﷺ يا رسول الله ذهب اهل الدثور بالاجور يصلون كما نصلي ويصومون كما نصوم ويتصدقون بفضول اموالهم قال اوليس قد جعل الله لكم ما تصدقون به ان بكل تسبيح صدقة وكل تكبير صدقة وكل تحميد صدقه وكل تهليل صدقة وامر بالمعروف صدقة ونهي عن منكر صدقة (وفي رواية والكلمة الطيبة صدقة۔ (مسلم مع نووی ص ۳۲۴ ج ۱)

حضور نبی کریم ﷺ سے بعض صحابہ کرام نے عرض کیا اے رسول ﷺ مالدار زیادہ ثوابوں کے حقدار ہوئے کہ جس طرح ہم نماز پڑھتے وہ بھی نماز پڑھتے ہیں۔ جیسے ہم روزہ رکھتے ہیں وہ بھی روزے رکھتے ہیں۔ نیز وہ اپنے زائد مالوں سے صدقہ کرتے ہیں۔ تو حضور نے فرمایا کہ اللہ نے تمہارے لئے ایسی چیزیں نہ کیں جن سے تم بھی تصدق کرو۔ بیشک ہر تسبیح پر صدقہ ہے اور ہر تکبیر پر صدقہ ہے اور ہر حمد کرنا صدقہ ہے اور ہر بار لا الہ الا اللہ پڑھنا صدقہ ہے اور نیکی کا حکم کرنا صدقہ ہے۔ ہر گناہ سے منع

کرنا صدقہ ہے۔ پاکیزہ کلمہ صدقہ ہے۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ عالم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور تعلیم علم کیساتھ صدقہ کرتا ہے۔ اسی طرح قاری قرآن کریم پڑھکر اور تسبیح وتحمید اور کلمہ طیبہ سے صدقہ کرتا ہے۔ تو اب اس کے جواب میں از روئے مروت سامعین کو خاص کر داعی کو بھی ان پر صدقہ کرنا چاہیے کہ احسان کا بدلہ احسان ہے۔

چنانچہ حضرت شیخ الاسلام والمسلمین علامہ خیر الدین رملی استاذ صاحب در مختار نے فتوی دیا۔
سوال وجواب دونوں نقل کئے جاتے ہیں:

(سئل) فی رجل علم صغیرا القرآن ولم یشترط له ابوه اجرة هل یقضی له بالاجرة ام لا لعدم تسمیتها (اجاب) لا یقض له بالاجرة حیث لم تنعقد بشروطها ولکن مجازاة الاحسان من غیر شرط مروة والله تعالی اعلم۔ (خیریہ مصری ص ۱۱۰ ج ۲)

ایک شخص کے متعلق سوال کیا گیا جس نے بچے کو قرآن کی تعلیم دی اور اس کے والد نے اس سے اجرت شرط نہیں کیا تو کیا اسکے لئے اجرت کا حکم دیا جائیگا۔ یا طے نہ ہونیکی بنا پر نہیں۔ علامہ نے جواب دیا کہ ایسے عقد نہ ہونے کی بنا پر اجرت کا حکم نہ دیا جائیگا لیکن از روئے مروت بغیر شرط کے بھی احسان کا بدلہ احسان تو ہے یعنی اس کو بطور احسان دے۔

لہذا ثابت ہو گیا کہ اس مخصوص صورت میں عالم وقاری کو بطور صدقہ دینا بلا شبہ جائز ہے بلکہ بہ نسبت جاہل کے عالم کو صدقہ دینا افضل ہے۔

طحطاوی میں ہے:

التصدق علی العالم الفقیر افضل من الجاهل الفقیر۔ (طحطاوی مصری ص ۴۱۹)

عالم فقیر پر صدقہ کرنا جاہل فقیر سے افضل ہے۔ فقہاء کرام نے یہ تصریح کی کہ صدقہ ایسے شخص کو نہ دے جو اس کو کسی گناہ میں صرف کرے یا فضول باتوں اور اسراف میں خرچ کرے بلکہ نیک آدمی نمازی کو دے۔

طحطاوی میں ہے:

لا ینبغی دفعها لمن علم انه ینفقها فی اسرف او معیثة وقال ابو حفص الکبیر انه لا یصرفها لمن لا یصلی الا احیانا وان اجزأه۔ (طحطاوی ص ۴۱۹)

جس کو یہ جانتا ہے کہ یہ صدقہ کو گناہ یا اسراف میں صرف کریگا تو اسے صدقہ دینا مناسب نہیں ابو حفص کبیر نے فرمایا کہ صدقہ اسے نہ دیا جائے جو نماز کا پابند نہیں کبھی پڑھ لیتا ہو اور اگر دیدیا تو ادا ہو جائے گا۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ عالم وقاری اکثر بیشتر دیندار و نیک ہوتے ہیں نماز کے پابند ہوتے ہیں کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں تو ان کو صدقہ دینا بلاشبہ افضل و بہتر ہے۔ اگر دیوبندی اس کو ناجائز وحرام کہتے ہیں تو ان کے قول کا باطل وغلط ہونا ظاہر ہے۔

اب باقی رہا سائل کا اور الاشباہ والنظائر کی عبارت کی طرف اشارہ کرنا تو تحقیق مقام یہ ہے کہ متاخرین کے نزدیک معلم قرآن وتعلیم فقہ وامامت واذان واقامت ووعظ کی اجرت لینا جائز اور یہی مفتی بہ قول ہے۔

چنانچہ علامہ ابن عابدین نے ردالمحتار میں ان اقوال کو جمع فرمایا اور متون کے اقوال صرف اس لئے نقل کئے کہ فتوے کیلئے متون ہی وضع کئے گئے ہیں:

قال فی الهدایه وبعض مشائخنا رحمهم الله تعالی استحسنوا الاستیجار علی تعلیم القرآن الیوم لظهور التوانی فی الامور الدینیه ففی الامتناع تضیع حفظ القرآن وعلیه الفتوی اه وقد اقتصر علی استثناء تعلیم القرآن ایضا فی متن الکنز ومتن مواهب الرحمٰن وکثیر من الکتب وزاد فی مختصر الوقایة ومتن الاصلاح تعلیم الفقه وزاد فی متن المجمع الامامة ومثله فی متن الملتقی ودر را لبحار وزاد بعضهم الاذان والاقامه والوعظ ۔(درمختار جلد ٥ صفحہ ٣٢)

ہدایہ میں کہا کہ ہمارے بعض مشائخ نے اب تعلیم قرآن پر اجرت لینے کو اچھا جانا کہ دینی امور میں سستی ظاہر ہے تو منع کرنے میں حفاظت قرآن کو ضائع کرنا ہے۔ اس پر فتوی ہے اور متن کنز اور مواہب الرحمٰن اور کئی کتب میں صرف تعلیم قرآن کا استثناء کیا۔ اور مختصر وقایہ اور اصلاح میں تعلیم فقہ کو اور زائد کیا اور متن مجمع اور ملتقی اور درر البحار میں امامت کو اور زیادہ کیا اور بعض فقہاء نے اذان واقامت اور وعظ کا اور اضافہ کیا۔

شیخ محقق ابن نجیم نے الاشباہ والنظائر میں فرمایا:

افتی المتقدمون بان العبادات لاتصح الاجارة علیها کالامامة والاذان وتعلیم

القرآن والفقه لکن المعتمد ما افتی به المتاخرون من الجواز ۔

(الاشباہ والنظائر مع حموی کشوری۔ ص ٥٦۔ ج ١)

متقدمین نے فتوی دیا کہ ان عبارتوں میں اجرت صحیح نہیں جیسے امامت اذان، تعلیم قرآن، تعلیم فقہ، لیکن متاخرین نے ان کے جواز پر فتوی دیا اور یہ قول مفتی بہ ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ تعلیم قرآن وتعلیم فقہ وامامت واذان واقامت ووعظ پر اجرت لینا جائز ہے اور یہی قول معتمد و مفتی بہ ہے۔ اب رہا قرأت وتلاوت قرآن پر اجرت لینا یہ جائز نہیں۔

حضرت علامہ خیر الدین رملی حاشیہ بحر میں فرماتے ہیں:

المفتی به جواز الاخذ استحسانا علی تعلیم القرآن لاعلی القراة المجردة ۔

(ردالمحتار مصری ص ٦٧ ج ٥)

مفتی بہ استحسانا اجرت لینے کا جواز صرف تعلیم قرآن پر ہے نہ فقط تلاوت قرآن پر۔

علامہ عینی نے شرح ہدایہ میں فرمایا:

ویمنع القاری للدنیا والآخذ والمعطی آثمان فالحاصل ان ما شاع فی زماننا من قرأة الاجزاء بالاجرة لا یجوز ۔

(درمختار مصری ص ٣٦ ج ٥)

حصول دنیا کے لئے پڑھنے والوں کو منع کیا جائے لینے والا اور دینے والا دونوں گنہگار ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ ہمارے زمانہ میں جو سپاروں کو باجرت پڑھنا شائع ہو گیا ہے یہ جائز نہیں۔

شیخ الاسلام تقی الدین نے فرمایا:

ولا یصح الاستیجار علی القرأة واهدائها الی المیت لانه لم ینقل عن احد من الائمة الاذن فی ذلك وقد قال العلماء ان القاری اذاقرأ لاجل المال فلا ثواب له فای شئ یهدیه الی المیت وانما یصل الی المیت العمل الصالح والاستیجار علی مجرد التلاوة فلم یقل به احد من الائمة وانما تنازعوا فی الاستیجار علی التعلیم ۔

(ردالمحتار مصری ص ٣٧ ج ٥)

اجرت پر پڑھنا اور اسکا ثواب میت کو پہونچانا صحیح نہیں اسلئے کہ اس کی اجازت ائمہ میں سے کسی سے منقول نہیں۔ علماء نے فرمایا کہ جب پڑھنے والا مال کیلئے پڑھتا ہے تو اس کو ثواب نہیں ملتا، پھر وہ میت

کو کس چیز کا ہدیہ کرتا ہے کہ میت کو تو صرف عمل صالح پہونچتا ہے۔ اور صرف تلاوت قرآن پر اجرت لینے کو ائمہ میں سے کسی نے حکم نہیں دیا۔ انہوں نے تو صرف تعلیم پر اجرت لینے میں اختلاف کیا ہے۔

صاحب ردالمحتار رحمتی سے ناقل ہیں:

ما اجازوہ انما اجازوہ فی محل الضرورۃ کالاستیجار لتعلیم القرآن او الفقہ او الاذان اوالامامۃ خشیۃ التعطیل لقلۃ رغبۃ الناس فی الخیر ولا ضرورۃ فی استیجار شخص یقرأ علی القبر او غیرہ۔ (ردالمحتار مصری ص ۴۵۷ ج)

اجرت پر پڑھانا اور اسکا ثواب میت کو پہونچانا صحیح نہیں، اس لئے کہ اس کی اجازت ائمہ میں کسی سے منقول نہیں علماء نے فرمایا کہ جب پڑھنے والا مال کیلئے پڑھتا ہے تو اس کو ثواب نہیں ملتا پھر وہ میت کو کس چیز کا ہدیہ کرتا ہے کہ میت کو تو صرف عمل صالح پہونچتا ہے اور صرف تلاوت قرآن پر اجرت لینے کو ائمہ میں سے کسی نے حکم نہیں دیا انہوں نے تو صرف تعلیم پر اجرت لینے میں اختلاف کیا ہے۔

علامہ ابن عابدین ردالمحتار میں فرماتے ہیں:

والذی افتی بہ المتاخرون جوازا لاستیجار علی تعلیم القرآن لا علی تلاوتہ۔ (ردالمحتار مصری ص ۴۵۷ ج ۵)

متاخرین نے جو فتوی دیا ہے وہ تعلیم قرآن پر اجرت لینے کے جواز پر ہے نہ کہ تلاوت قرآن پر اجرت لینے کے جواز پر۔

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ تلاوت قرآن کریم پر اجرت لینا جس طرح متقدمین کے نزدیک ناجائز ہے اسی طرح متاخرین کے نزدیک بھی ناجائز ہے۔ دینے والا اور لینے والا دونوں گنہگار ہیں۔ اور نہ اجرت سے پڑھوا کر ایصال ثواب ہوسکتا ہے کہ جب پڑھنے والے نے روپیہ پیسہ لیا تو اس کو ثواب کیا ملا اور جب اسے ثواب ہی نہیں ملا تو وہ ایصال ثواب کس طرح کر سکتا ہے۔

اسی طرح جہاں کے عرف ورواج میں دینے والا بہ نیت اجرت دیتا ہے اور لینے والا بخیال اجرت پڑھتا ہے اگرچہ ان میں کچھ طے نہ ہوا ہو لیکن وہاں کے عرف میں بعد ختم اس طرح دینے کا دستور ہے تو یہ بھی ناجائز ہے۔ کہ فقہاء کا مشہور قاعدہ ہے۔ المعروف کالمشروط۔

علامہ ابن عابدین ردالمحتار میں فرماتے ہیں:

ولو لا الاجرۃ ما قرأ احد فی هذا الزمان بل جعلوا القرآن العظیم مکسبا ووسیلۃ

الی جمع الدنیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (درالمختار ص ۴۷ ج ۵)

اگر اجرت نہو تو اس زمانہ میں کوئی شخص کسی کیلئے نہ پڑھے بلکہ انھوں نے قرآن کریم کو دنیا جمع کرنے کیلئے وسیلہ اور کسب پھر الیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب باقی رہا سائل کا یہ قول کہ۔ شامی میں ختم قرآن کے بعد۔ ۴۱ درم لینا جائز لکھا۔ غالبا سائل نے اس سے شامی کے اس عبارت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لا یجوز الاستیجار علی الختم باقل من خمسۃ واربعین درھما۔ (شامی مصری ص ۴۷ ج ۵)

ختم قرآن پر ۴۵ درہم سے کم اجرت لینا جائز نہیں۔

لہذا یہ مسئلہ جواز اجرت تعلیم قران کی بنا پر ہے کہ اس سے کم مقدار عظمت قرآن کے مناسب نہیں۔ اسی لئے علامہ شامی اس عبارت کے بعد یہ تحریر فرماتے ہیں:

فخارج عما اتفق علیہ اھل المذھب قاطبۃ۔

اسکا مطلب یہ ہے کہ اہل مذہب نے تلاوت قرآن کریم کی اجرت کے ناجائز ہونے پر اتفاق کیا ہے تو یہ مسئلہ اس بنا پر نہیں ہے بلکہ اسی اجرت تعلیم قرآن کی بنا پر ہے۔ لہذا اس عبارت سے تلاوت قرآن کریم کی اجرت کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔

پھر سائل نے کہا: اور الاشباہ والنظائر میں مطلق طاعت میں جائز قرار دیا ہے۔ غالبا یہ اس عبارت کی طرف اشارہ ہے جو اسی کے جواب میں اشباہ سے نقل کی گئی ہے۔ اس میں اگرچہ بظاہر مطلقا عبارات کو لیا ہے لیکن جب اس کے الف لام کو عہد کا قرار دیا جائے تو یہ انہیں خاص عبارات کیلئے ہے جن کی تصریح متاخرین سے ثابت ہے، جن کو اسی عبارت میں بہ تصریح ذکر کیا گیا کہ وہ امامت واذان واقامت وتعلیم قرآن وفقہ ہے ورنہ اسکا جواب ردالمحتار میں مذکور ہے۔

وقد اخطأ فی هذه المسئلۃ جماعۃ ظنا منھم ان المفتی بہ عند المتاخرین جواز الاستیجار علی جمیع الطاعات مع ان الذی افتی بہ المتاخرون انما ھو التعلیم والاذان والامامۃ وصرح المصنف فی المنح فی کتاب الاجارات وصاحب الھدایۃ وعامۃ الشراح واصحاب الفتاوی بتعلیل ذلک بالضرورۃ وخشیۃ الضیاع کما مر ولو جاز علی کل طاعۃ لجاز علی الصوم والصلوۃ والحج مع انہ باطل بالاجمع۔

(ردالمحتار مصری ص ۴۵۷ ج ۵)

اس مسئلہ میں ایک جماعت نے اس گمان سے خطا کی کہ متاخرین کے نزدیک اجرت کا جواز تمام طاعتوں کے لئے ہے باوجودیکہ متاخرین نے جوفتوی دیا ہے وہ صرف تعلیم اور اذان واقامت ہی کے لئے ہے اور مصنف منح نے کتاب الاجارات میں اور صاحب ہدایہ اور تمام شارحین اور اصحاب فتاوی نے اس کی علت ضرورت اور ضائع ہونیکا خوف بیان کیا جیسا کہ پہلے ذکر کر دیا۔ اور اگر اجرت ہر طاعت پر جائز ہوتی تو روزے نماز اور حج پر بھی جائز ہوتی باوجودیکہ باتفاق باطل ہے۔

یہی علامہ ابن عابدین شامی اسی ردالمحتار کے کتاب الاجارات میں فرماتے ہیں:

وقد اتفقت كلماتهم جميعا في الشروح والفتاوى على التعليل بالضرورة وهي خشية ضياع القرآن كما في الهداية وقد نقلت لك ما في مشاهير متون المذهب الموضوعة للفتوىٰ فلا حاجة الى نقل ما في الشروح والفتاوى وقد اتفقت كلماتهم جميعا على التصريح باصل المذهب من عدم الجواز ثم استثنوا بعده ما علمته فهذا دليل قاطع وبرهان ساطع على ان المفتى به ليس هو جواز لاستيجار على كل طاعة بل على ماذكروه فقط مما فيه ضرورة ظاهرة تبيح الخروج عن اصل المذهب ۔ (ردالمحتار جلد ۵ ص ۳۶)

شرحوں اور فتاووں میں سب ہی اقوال اس بات پر متفق ہوئے کہ علت ضروری ہے اور وہ قرآن کے ضائع ہونے کا خوف ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے اور اس نے تیرے لئے مذہب کے ان مشہور متون کی عبارت نقل کیں جو فتوے کے لئے موضوع ہیں تو اب شرحوں اور فتاووں کی عبارات کے نقل کرنے کی حاجت نہیں اور سب کے اقوال اس تصریح پر متفق ہوئے کہ اصل مذہب عدم جواز ہے پھر متاخرین نے اس کے بعد صرف ان طاعتوں کا استثناء کیا جن کو تو نے جان لیا کہ تو یہ ہر طاعت پر اجرت جائز نہ ہونے کی مفتی بہ قول پر یقینی دلیل اور روشن برہان ہے بلکہ صرف ان طاعتوں پر ہو جن کی متاخرین نے تصریح کی جن میں یعنی ظاہر ضرورت ہے جس اصل مذہب کے خروج کو مباح کردیا

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ مطلق عبادات اور تمام طاعات پر متاخرین نے جواز اجرت کا فتوی نہیں دیا ورنہ نماز۔ روزے۔ حج۔ وغیرہ میں بھی اجرت جائز ہوجاتی بلکہ متاخرین نے اذان و اقامت وامامت وتعلیم قرآن وتعلیم فقہ ووعظ پر جواز کا فتوی دیا۔ اور ان میں علت ضرورت اور خوف تضیع

قرآن بیان کیا۔ لہذا تلاوت قرآن پر اجرت کے جائز ہونے کیلئے متاخرین کا فتوی ہی نہیں کہ اس میں یہ علت ہی نہیں پائی جاتی تو اس کی اجرت کس طرح جائز ہوسکتی ہے اور یہ عبارت الاشباہ والنظائر میں موجود ہے تو یہ دلیل نہیں بن سکتی۔

خلاصہ جواب یہ ہے کہ تلاوت قرآن کریم پر اجرت لینا اور دینا بالکل ناجائز ہے اسی طرح جس مقام کے عرف میں اس پر لیا دیا جاتا ہے تو حسب دستور تلاوت پر لینا اور دینا بھی ناجائز ہے۔ ہاں جہاں نہ ایسا عرف ورواج ہو نہ دینے والا اور نہ لینے والا بہ نیت اجرت لیتے دیتے ہوں تو وہ وہاں صدقہ وصلہ ہے اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔ دیوبندی اگر اس کو بھی اجرت قرار دیکر ناجائز وحرام کہتا ہے تو یہ اس کی جہالت ولاعلمی ہے اور فقہ سے ناواقفی کی پوری دلیل ہے۔ مولی تعالی انہیں قبول حق کی توفیق دے۔

واللہ تعالی اعلم بالصواب۔ والیہ المرجع والمآب بعون الملک الوھاب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۵۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کہ ایک شخص کوڑھ کے مرض میں مرگیا۔ اس کے گھر والوں نے چاہا کہ محلہ یا پڑوس کے کچھ لوگ جمع ہوکر میرے لڑکے کو باقاعدہ غسل دیں اور پہلے کچھ نعت حضور کی شان میں پڑھواؤں تاکہ میت کو ثواب ہو، اور پھر دفن کریں۔ بعد دفن کرنے کے باقاعدہ (سویم) فاتحہ ہو۔ اور چہلم کی فاتحہ ہو۔ لیکن اس کے مرنے کی خبر سنکر محلہ اور پڑوس کے لوگ ایک بھی نہیں گیا، اس نے بہت کوشش کی تو لوگوں نے جواب دیا کہ ہم اس میت میں نہیں جائیں گے۔ کیونکہ تمہارا لڑکا کوڑھی ہوکر مرا ہے۔ لہذا کوڑھی کو غسل وکفن ونماز جنازہ ودفن کرنا علماؤں نے منع کیا ہے۔

یہ الفاظ محلہ والوں کے صحیح ہیں؟ اس کو غسل وکفن ونماز جنازہ ودفن وسویم چہلم وغیرہ ہونا چاہئے یا نہیں اور اس کو جو کوڑھ کے مرض میں حیات ہو نماز جمعہ میں جماعت میں شامل کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور وہ ہر نماز میں شریک ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر کوئی شریک کرنے سے انکار کرے تو انکار کرنے والے کا کیا حکم ہے؟۔

صاف صاف لکھئے اور اگر کوئی بات جناب کی طرف ہو تو لکھ دیجئے۔ فقط بینوا وتوجروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جزامی سے مسلمین متوکلین اہل صدق ویقین تو کسی طرح کا پرہیز واجتناب نہیں کیا کرتے یہاں تک کہ حدیث شریف میں ہے جو ابن ماجہ شریف میں حضرت جابر رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے۔

"ان رسول اللہ ﷺ اخذ بید مجزوم فو صعها معه فی القصعة وقال کل ثقة باللہ وتوکلا علیه" (مشکوۃ شریف ص ۳۹۲)

حضور ﷺ نے جزامی کا ہاتھ پکڑ کر کھانے کے پیالے میں رکھ دیا اور حکم دیا کہ کھا میں تو اپنے خدا پر اعتماد وتوکل رکھتا ہوں۔

اس حدیث شریف سے ظاہر ہو گیا کہ جزامی سے جب ایک ہی پیالے میں ساتھ کھانا کھانے تک میں بھی پرہیز نہیں کیا تو پھر اور کس چیز میں پرہیز ہوگا۔ ہاں ضعیف اعتقاد والے عوام اس سے عدم توکل کی بنا پر پرہیز کر سکتے ہیں۔ لیکن احکام شریعہ میں جزامی سے پرہیز نہیں کیا جائے گا۔ اور حقوق مسلمین مثلا سلام کلام کرنے میں اور مرنے کے بعد غسل وکفن میں۔ نماز جنازہ میں۔ دفن میں۔ پھر سویم چہلم۔ فاتحہ وغیرہ ایصال ثواب میں وہ دیگر مسلمانوں کی طرح حق دار ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ جزام بھی منجملہ اور بیماریوں کے ایک بیماری ہے تو جس طرح اور بیماریوں میں میت کا غسل، نماز جنازہ۔ دفن۔ سوم۔ فاتحہ وغیرہ کرنا اپنے اوپر حق جانتے ہیں اسی طرح مسلمانوں کو اسے بھی اپنے اوپر حق جاننا چاہئے۔ اس کی ممانعت کوئی عالم دین تو کر نہیں کر سکتا۔ لہذا یہ محلہ والے اپنی لاعلمی سے ان چیزوں کا انکار کر کے گنہگار ہوئے اور حق کے ترک کرنے والے قرار پائے۔ اور اس میت کے گھر والوں کو اذیت وتکلیف دینے والے ٹھہرے۔ انہیں چاہئے کہ اب علم ہونے کے بعد کم از کم اس کے ورثہ سے اپنی غلطی کی معافی طلب کریں۔ اب باقی رہا جزامی کا جمعہ وجماعت میں شریک کرنا، یہ نمازیوں کی خوشنودی پر موقوف ہے اس میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

کتاب الزکوۃ



باب نصاب الزکوۃ

مسئلہ (۵۵۸)

کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین نسبت مسائل کے، حوالہ جات قرآن واحادیث سے جواب عنایت فرمایا جائے

زید ۱۹۵۰ء میں صاحب زکوۃ ہوا اور اسی سال اس نے پانچسو روپے کی زکوۃ ادا کی ۱۹۵۱ء میں وقت زکوۃ وہی پانچسو روپیہ اس کے پاس ہے اور سال بھر کے عرصہ میں آمدنی سے کچھ حصہ فاضل بچت نہیں ہوئی۔ کیا ۱۹۵۱ء میں پھر زید کو پھر اسی رقم پانچسو پر زکوۃ ادا کرنا ہوگی جس کی زکوۃ وہ ۱۹۵۰ء میں ادا کر چکا ہے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صورت مسئولہ میں بذمہ زید اس رقم پر جب سال گذر جائیگا زکوۃ دینا فرض ہو جائیگی چاہے اس کو تجارت میں اس رقم پر کچھ فائدہ حاصل ہوا یا نہ ہو جیسا کہ فتاوی عالمگیری میں ہے۔

" تجب علی الفور عند تمام الحول " (جلد ۱ صفحہ ۸۷)

یعنی سال کے گذر جانے پر زکوۃ فورا ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے تو بیشک زید پر ۱۹۵۱ء میں بھی پھر اسی رقم پر زکوۃ کا ادا کرنا فرض ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۵۹)

کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین نسبت مسائل کے حوالہ جات قرآن واحادیث سے جواب عنایت فرمایا جائے۔

(۱) زیورات جن کی زکوۃ ایک سال ادا کر دی گئی ہے کیا ان کی زکوۃ ہر سال ادا کرنا لازمی ہے؟۔

(۲) زید کے پاس ایک ہزار روپیہ ہے جس کی زکوۃ اس نے ادا کی اور وہ ان میں اس رقم کا آدھا حصہ یعنی پانچسو تجارت کے لئے کسی دوسرے شخص کو شریک تجارت کر کے دیدیا چار ماہ بعد ایام زکوۃ زید کے پاس پھر ایک ہزار روپیہ آ گیا اب زید کو کس رقم پر زکوۃ ادا کرنی چاہیئے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) زیورات کی زکوۃ ہر سال دینا فرض ہے جیسا کہ فتاوی عالمگیری میں:

تجب فی کل مائتی درہم خمسة دراهم وفی کل عشرين مثقال ذهب نصف مثقال مضروبا کان اولم یکن مصوغا او غیر مصوغ حلیا کان للرجال اوالنساء تبرا کان او سبیکة کذا فی الخلاصة۔ (ص ۱۹۱ ج ۱)

زکوۃ دینا واجب ہے ہر دوسو درہم میں پانچ درہم ہر بیس مثقال سونے میں آدھا مثقال ٹھپے والا ہو یا نہ ہو گھڑے ہوئے یا نہ ہو زیور ہوں واسطے مردوں کے یا واسطے عورتوں کے ہوں سلاخیں ہوں یا اینٹیں لہذا زیورات پر ہر سال گزرنے پر زکوۃ فرض ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم

(۲) زید کو دونوں رقموں پر زکوۃ دینا فرض ہے ان پانچسو پر بھی جو زید کے پاس رکھے ہیں اور ان پانچ سو پر بھی جو تجارت میں لگے ہوئے ہیں اور ان پانچ سو پر جس قدر منافع ہوا اس منافع پر بھی لہذا زکوۃ اس کل رقم کی دی جائے گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۶۰)

کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین نسبت مسائل کے حوالہ جات قرآن واحادیث سے جواب عنایت فرمایا جائے

زید نے حج کے لئے کچھ زاد راہ جمع کر کے رکھا اور اس رقم کو کسی کام میں نہیں لیتا صرف حج کے لئے رکھی ہوئی ہے مگر حج کے لئے روانہ نہیں ہو سکا گو ارادہ کرتا رہا زمانہ روک لیتی ہے کیا ایسی رقم پر زکوۃ ادا کرنا چاہیئے؟۔ بینوا توجروا

المستفتی محمد عبدالغنی صدیقی وکیل ڈیڈوالا راجستھان

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صورت مسئولہ میں اس رقم پر بھی سال کے گذر جانے پر زکوۃ واجب ہو جائیگی یہ رقم اب چاہے کسی کام کے لئے رکھی ہو بہر کیف اس رقم پر بھی زکوۃ ادا کرنا واجب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ، المتوسل بالنبی المرسل العبد الارذل محمد اول بن المفتی مولینا الحاج محمد اجمل
نائب مفتی اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل یکم جمادی الاخرہ ۱۳۷۷ھ

هذه الاجوبة كلها صحيحة محمد اجمل غفرالله عز و جل فی بلده سنبهل

مسئلہ (۵۶۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
ایک شخص کے پاس صرف نوٹ ہوں جو آجکل رائج ہیں، یا صرف ریزگاری ہو، چاندی سونا کا سکہ ہو تو بقدر نصاب ہونے پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟۔ زید کہتا ہے کہ صرف نوٹ میں یا ریزگاری میں زکوۃ واجب نہیں ہے۔ زید کا قول صحیح ہے یا نہیں؟۔ مفصل جواب دیا جائے۔
المستفتی۔ مولوی عبدالسلام از محلّہ شرئے ترین از بلدہ سنبھل ضلع مرادآباد۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

شریعت میں مال کی یہ تعریف ہے کہ جسکی طرف طبیعت کا میلان ہو اور وہ حاجت کے وقت کیلئے اٹھار کھنے کے قابل ہو اور مصالح ومنافع کیلئے اسے جمع کر کے محفوظ رکھیں اور باختیار خود اس میں تصرف کریں اور وہ قیمت والا ہو۔

چنانچہ ردالمحتار میں ہے: المال ما يميل اليه الطبع ويمكن ادخاره لوقت الحاجة۔

اسی میں تلویح سے ناقل ہیں: المال ما من شانه ان يدخر للانتفاع وقت الحاجت والتقويم يستلزم المالية۔

اسی میں بحر سے اور وہ حاوی قدسی سے ناقل ہیں: المال اسم لغير الآدمي خلق لمصالح الآدمي وامكن احرازه والتصرف فيه على وجه الاختيار۔ (ردالمحتار مصری ص۳ ج۴)

تو نوٹ۔ پیسے۔ اکنی۔ دوانی۔ چونی۔ اٹھنی۔ جب چاندی سونے کی نہ ہوں تو بھی ان سب پر مال کی یہی تعریف صادق آرہی ہے کہ لوگوں کی طبیعت ان کی طرف میل کرتی ہے اور انھیں وقت کیلئے اٹھا یا جاتا ہے اور انہیں مصالح ومنافع کے لئے جمع کر کے محفوظ کیا جاتا ہے اور باختیار خود ان میں تصرف کرتے ہیں اور یہ قیمت والی چیزیں ہیں۔ لہذا نوٹ۔ پیسے وغیرہ بحکم شرعی یقیناً حتماً جزماً بلاشبہ مال قرار پائے، اس میں نہ کسی طرح کا شک واشتباہ۔ نہ کچھ تردد وتامل کو راہ۔ اور جو اس کا منکر ہو وہ جہل وحمق کا مخزن اور عقل وفہم کا دشمن ہے۔ اور جب نوٹ پیسے وغیرہ کا مال ہونا آفتاب سے زیادہ روشن ہے تو یہ ظاہر ہے کہ مالیت خود زکوۃ کے فرض ہونے کا سبب ہے جب نصاب کی مقدار کو پہنچ جائے۔

ردالمحتار میں ہے: السبب هو المال لانها وجبت شكر النعمة المال ولذا تضاف اليه ويقال زكوة المال۔ (ردالمحتار مصری ص۴ ج۲)

تو نوٹ وغیرہ ریزگاری میں زکوۃ اپنی شرطوں کے ساتھ واجب، بلکہ ان میں نیت تجارت کی بھی حاجت نہیں کہ یہ ثمن اصطلاحی ہیں اور ثمن اصطلاحی جب تک وہ رائج ہے اس میں بلانیت تجارت زکوۃ واجب ہے۔

چنانچہ فتاوی سراجیہ میں اس کی صاف طور پر تصریح موجود ہے:

الزكوة في الفلوس الرائجة كما في دراهمنا اليوم لا تجب مالم يكن قيمتها مائتی درهم من الدراهم التي تغلب النقرة فيهاعلى الغش او عشرين مثقالامن الذهب ولا يشترط فيها التجارة اذا كان النصاب كاملا فيما بين طرفي الحول فنقصانه فيما بين ذلك لا يضر وان عاد الي شئ قليل۔ (فتاوے سراجیہ کشوری ص۲۴)

ردالمحتار میں شرنبلالیہ سے ناقل ہیں: الفلوس ان كانت اثمانا رائجا ۔ اور فلوس میں بلانیت تجارت بھی جب تک یہ رائج ہیں زکوۃ یقیناً واجب ہے۔ اور زید کا قول غلط ہے اور ان عبارات کے خلاف ہے بلکہ مقاصد اسلام کے خلاف ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۶۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

زید کے پاس دس بیگہ نہری زمین بعوض کرایہ ہے جو سالانہ کرایہ ادا کیا جاتا ہے اگر اس میں کاشت کی جاتی ہے تو بھی کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے اگر نہ کی جائے تب بھی کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ کاشت کاری بیلوں سے کرائی جاتی ہے۔ اگر پانی دیا جائے تو پانی کا معاوضہ دیا جاتا ہے پانی نہیں لیا جائے تو بھی معاوضہ دیا جاتا ہے۔ زمین کاشت سے بیکار ہوچکی ہے پیداوار میں نہت کمی ہوگئی ہے۔ زید نے امسال اس زمین میں مبلغ دوسو روپے کی کھاد ڈلوا کر زمین تیار کروائی گئی اور اس میں کاشت کروائی گئی کاشت کاری میں تمام کام کرایا پر ہوا ہے۔ فضل خدا سے اس زمین میں پیداوار دوچند ہوگئی۔ کیا زید اس تمام خرچہ کو وضع کرکے ابتدائی پیداوار سے زکوۃ ادا کرے یا پیداوار دوچند کی کاشت کے خرچہ کو وضع کرکے زکوۃ ادا کرے؟۔ اس کا مفصل حالات بحوالہ کتب حدیث وفقہ سے تحریر فرمائیں فقط نور محمد۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

زمین کی زکوۃ سے عشر مراد ہوتا ہے تو اگر زید کی یہ زمین عشری ہے اور اس میں ایسی چیز کی کاشت ہے جس سے مقصود منافع حاصل کرنا ہے تو اگر اس کی آبپاشی چرسے یا ڈول سے یا بہ قیمت کی گئی ہے تو اس میں سے بغیر مصارف کاشت وضع کئے کل پیداوار کا بیسواں حصہ دینا واجب ہے۔ اور اگر آبپاشی ایسی نہ ہو بلکہ بارش سے یا بلا قیمت نہر اور نالے سے اس کو سیراب کیا گیا تو بغیر مصارف کاشت وضع کئے ہوئے اس کی کل پیداوار کا دسواں حصہ دینا واجب ہے، عالمگیری میں ہے: ولا تحسب اجرۃ العمال ونفقۃ البقر وکراء الانہار واجرۃ الحافظ وغیر ذلک فیجب اخراج الواجب من جمیع ما خرجتہ الارض عشر او نصفا کذا فی البحر الرائق۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۶۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) کم از کم کتنے روپیہ پر قربانی، صدقہ فطر، زکوۃ، واجب ہے؟۔

(۲) زید نے بکر سے کہا کہ تم نے رمضان المبارک کے روزہ نہیں رکھے ہیں تم کو صدقہ فطر نہیں دینا چاہیے۔ کیا زید کا یہ قول صحیح ہے؟۔

(۳) میاں بیوی نے روزے نہیں رکھے، کیا بیوی کو اپنے نابالغ بچوں کی طرف سے صدقہ فطر ادا کرنا ہوگا یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

سال بھر میں حوائج اصلیہ واخراجات ضروریہ سے جب کم از کم ساڑھے باون تولہ چاندی بچ جائیں، تو صاحب نصاب ہوگا۔ اس پر زکوۃ واجب ہے، اور صدقہ فطر قربانی بھی واجب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

زید کا قول باطل ہے، بکر جب صاحب نصاب ہے، اگرچہ اس نے روزہ رمضان نہ رکھے ہوں لیکن اس پر صدقہ فطر واجب ہے، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

شوہر جب صاحب نصاب ہوا اگرچہ اس نے روزے رمضان کے نہ رکھے ہوں، تو صدقہ فطر نابالغ بچوں کا اسی پر واجب ہے، نہ ان کی ماں پر۔ واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۶۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

فطرہ ماہ رمضان کے بعد ہی واجب ہوتا ہے اور شاید اس عید کا نام اسی وجہ سے عید الفطر ہے۔ تو یہ فطرہ ماہ رمضان میں سب خورد وکلاں پر کیوں واجب ہے جب کہ اطفال نے روزے نہیں رکھے ہیں۔ اور اگر روزوں پر فطرہ نہیں ہے تو ماہ رمضان کے بعد ہی فطرہ کیوں واجب ہوتا ہے اس میں کیا حکم شریعت ہے۔

ح۔م۔ اشرفی ۲۵ر اکتوبر

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بلاشبہ عید الفطر کا نام اسی بنا پر ہے کہ اس میں فطرہ ادا کیا جاتا ہے۔ فطرہ عید کے دن بعد صبح صادق کے واجب ہوجاتا ہے اور ان لوگوں پر واجب ہے جو صاحب نصاب ہوں ان پر اپنی طرف

سے اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے واجب ہے ہر خورد و کلاں پر واجب نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

الله أكبر



باب مصارف الزکوۃ

مسئلہ (۵۶۵)

کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین نسبت مسئلہ ذیل کے، حوالہ جات قرآن واحادیث سے جواب عنایت فرمایا جائے۔

زید صاحب زکوۃ ہے اور اس کا حقیقی بھائی بکر مقروض ہے، کیا زید اپنے بھائی بکر کا قرضہ اپنی زکوۃ سے ادا کر سکتا ہے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

زید کا بھائی بکر جب صاحب نصاب نہ ہو تو زید اپنے بھائی بکر کو زکوۃ دے سکتا ہے بلکہ ایسی ضرورت کے وقت اس کو زکوۃ کا دینا افضل ہے، جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

والافضل فی الزکوۃ والفطر والنذور الصرف اولا الی الاخوۃ والاخوات ثم الی اولادھم ثم الی الاعمام والعمات ثم الی اولادھم ثم الی الاخوال والخالات ثم الی اولادھم ثم الی ذوی الارحام ثم الی الجیران ثم الی اھل حرفتہ ثم الی اھل مصرہ او قریتہ۔
(جلد اصفحہ ۹۷)

زکوۃ اور صدقہ فطر اور نذر کا افضل ترین مصرف بھائی پھر ذوی الارحام پھر پڑوسیوں پر پھر اپنے ہم پیشوں پر پھر اپنے اہل شہر یا اہل قریہ پر خرچ کرنا افضل اور بہتر ہے، تو زید اپنی زکوۃ اپنے بھائی کو دیدے اور وہ اپنا قرضہ اس سے ادا کر دے خود زید اس کے قرضہ کو اپنے زکاتی مال سے ادا نہ کرے کہ تملیک اسی شکل میں پائی جائیگی کہ بکر کو اس رقم کا مالک بنا دے۔ اور ادائے زکوۃ کے لئے تملیک کا پایا جانا ضروری شرط ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ، المتوسل بالنبی المرسل العبد الارذل محمد اول بن المفتی مولینا الحاج محمد اجمل نائب مفتی اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل یکم جمادی الاخرہ ۱۳۷۷ھ الجواب صحیح محمد اجمل غفراللہ عزوجل فی بلدہ سنبھل

مسئلہ (۵۶۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

زید نے مال زکوۃ کی رقم اکھٹی بذریعہ چندہ وصول کی۔ نیت زید کی یہ ہے کہ اس رقم کو شرعی حیلہ کرکے اس سے مدرسہ یا مسجد بنائی جائے۔ چندہ مذکورہ حیلہ کے لئے کیا زید بکر کو انتخاب کرکے یہ ظاہر کر سکتا ہے کہ تم کو یہ رقم دی جاتی ہے اس رقم میں اتنا روپیہ تم اپنے اپنے صرف کے لئے لے لینا باقی ماندہ رقم مجھکو واپس اللہ کے نام کر دینا۔ کیا زید بکر سے یہ اقرار کرا سکتا ہے یا نہیں؟۔ یہ رقم اس طرح واپس لینا جائز ہے یا نہیں؟۔ اس کا مفصل احوال بکتب حدیث وفقہ کہ تحریر فرمائیں۔ فقط۔ عثمان غنی۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

رقم زکوۃ بعد حیلہ شرعی کے مدرسہ میں صرف کی جاسکتی ہے۔ عالمگیری میں ہے: وکذلک من علیہ الزکوۃ لو اراد صرفھا الی بناء المسجد او القنطرۃ لا یجوز فان اراد الحیلۃ فالحیلۃ ان یتصدق بہ المتولی علی الفقراء ثم الفقراء یدفعونہ الی المتولی ثم المتولی یصرف الی ذلک۔

لیکن حیلہ میں یہ طے کرنا یا یہ اقرار کرا لینا کہ اتنا روپیہ اپنے صرف میں کر لے اور باقی اللہ کے نام پر واپس کر دے ہرگز ہرگز نہیں چاہئے اور نہ اس طرح اس رقم کو واپس کیا جائے بلکہ علاوہ متولی کے کوئی شخص اس کو سمجھا دے اور متولی اس پر بہ نیت تملیک تصدق کرے اور وہ فقیر اس رقم کے کل یا جز کو اپنی طرف سے متولی کو مسجد یا مدرسہ کے کسی کام میں صرف کرنے کے لئے دیدے جب وہ متولی اس کو مسجد یا مدرسہ میں صرف کرسکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۶۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان شرع عظام دامت برکاتھم النور مسائل حسب ذیل کی بابت

(۱) زکوۃ کے روپے سے دینی کتابیں خرید کر کسی مدرسہ میں دی جائیں، کہ طلبہ پڑھیں اس سے

زکوۃ ادا ہو جائے گی؟۔

(۲) زکوۃ کی رقم یکمشت ادا کی جائے یا وقتاً فوقتاً تھوڑی تھوڑی جمعہ کو دے دی جائے۔ مثلاً محرم الحرام میں زکوۃ نکالی اور ربیع الآخر یا اس سے بعد تک یا پہلے تھوڑی تھوڑی ہر جمعہ کو فقیروں کو دے دی جائے یا علاوہ جمعہ کے اور دنوں میں بھی دے دی جائے۔ زکوۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) زکوۃ کی رقم سے کتابیں خرید کر بطور تملیک طلبہ کو دینے سے تو زکوۃ ادا ہو جائے گی۔ اور اگر ان کو مدرسہ میں وقف کر دیا گیا تو زکوۃ ادا نہیں ہوتی کہ اس میں تملیک ہی متحقق نہیں ہوئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) بہتر ہے کہ ساری زکوۃ کی رقم حساب کر کے اپنے مال سے جدا کر کے علیحدہ رکھدی جائے پھر اختیار ہے کہ اس کو یکمشت ادا کر دیا جائے یا متفرق طور پر مختلف اوقات وایام میں تھوڑی تھوڑی ادا کرتے رہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۶۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ان مسائل میں کہ

(۱) حیلہ شرعیہ کے ساتھ صدقہ فطر کو دینی مدارس میں صرف کر سکتے ہیں کہ نہیں۔ اور حیلہ کرنا کس حدیث سے ثابت ہے۔ لك صدقة ولنا هدية۔ سے ثابت ہوتا ہے کہ نہیں؟۔

(۲) صدقہ فطر تو عید کے دن صبح صادق کے بعد واجب ہوتا ہے، تو اگر کسی نے قبل وجوب ادا کر دیا تو ادا ہوا کہ نہیں۔ مثلاً رمضان ہی میں ادا کر دے۔ فطرہ ادا کرنا قبل نماز عید مسنون ہے۔ لیکن اگر کسی نے بعد نماز عید یا دو چار دن کے بعد ادا کیا تو صحیح ہوا کہ نہیں۔ حدیث میں جو یہ فرمایا گیا کہ جب تک فطرہ ادا نہیں کیا جاتا اسکے نماز وروزے آسمان وزمین کے درمیان معلق رہتے ہیں تو جب تک ادا نہ کیا معلق ہی رہیں گے تو اگر کسی نے مدرسہ کو دے دیا اور جب تک اس کا حیلہ نہ ہوا معلق ہی رہے گا یا ادا کرنے والے کے نماز روزے آسمان پر چلے جائیں گے؟۔

(۳) دور حاضر میں جب کہ لوگ دینی باتوں اور دینی مدارس کی امداد سے بالکل یا اکثر الگ تھلگ رہنے لگے ہیں ایسے وقت میں مدارس کا اجراء اور کوشش سے مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کر کے، زکوۃ اور فطرہ کو حیلہ کر کے اس کام میں صرف کرنا فقیروں اور رشتہ داروں کو دینے سے افضل ہوگا۔ کہ نہیں، جو لوگ دینی مدارس میں ایک پیسہ بھی دینا گوارہ نہیں کرتے اور فطرہ اور زکوۃ تو کچھ دے بھی دیتے ہیں۔ دینی مدارس میں ضرورتا ہندی و انگریزی کی تعلیم دلانا تا کہ بچے لکھنے پڑھنے کے قابل ہو جائیں اپنی ضرورت میں کسی کے محتاج نہ رہیں۔ مسلمانوں کے بچے انگریزی اسکولوں میں نہ جائیں، اور جو وہاں خباثت ہوتی ہے۔ اس سے بچانے کی غرض ہو تو بہتر ہے کہ نہیں۔ جبکہ اسی زکوۃ اور فطرہ ہی کو حیلہ کر کے، مدرسین کی تنخواہ میں دیا جاتا ہو۔ ایک مدرسہ ایسا ہے جس میں صرف یا اکثر مالداروں کے بچے پڑھتے ہیں اس مدرسہ میں فطرہ اور زکوۃ کا روپیہ حیلہ کر کے لگایا جا سکتا ہے کہ نہیں۔

(۴) اور حیلہ قرآن و حدیث کے موافق کرنے کا طریقہ کیا ہے اور اعلان کرنا کہ فطرہ اور زکوۃ مدرسہ میں دو اس اعلان پر جس کی بنتی ہوئی اس نے لا کر دیا اور جس کی مرضی نہیں ہوئی اس نے نہیں دیا جس طرح آجکل تمام مدارس دینیہ کے لئے اشتہار کے ذریعہ اعلان کیا جاتا ہے۔ خطوط لکھے جاتے ہیں ان سے کہا جاتا ہے، کہ فطرہ اور زکوۃ سے مدارس کی امداد کرو تو یہ اعلان جائز ہے کہ نہیں۔ اب اس صورت میں جس نے لا کر مدارس کو دیا تو جائز ہوا کہ نہیں اور دینے والے کا فطرہ اور زکوۃ ادا ہوا کہ نہیں اور اعلان تو اسی واسطے ہوتا کہ لوگ اس طرف متوجہ ہوں۔ سوالات مذکورہ کے جوابات بڑی تفصیل سے درکار ہیں۔ حیلہ کی تعریف کیا ہے؟۔

محمد عالم اعظمی پالی مارواڑ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) بلا شک حیلہ شرعیہ کے بعد مال زکوۃ، صدقہ فطر کو دینی مدارس میں صرف کرنا جائز ہے۔

درمختار میں ہے۔ و قدمنا ان الحیلۃ ان یتصدق علی الفقراء ثم یا مر بفعل ھذہ الاشیاء ای الصرف الی کل مالا تملیک فیہ کمسجد و مدرسہ و قنطرۃ۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: و کذالک من علیہ الزکوۃ لو اراد صرفھا الی بناء المسجد او القنطرۃ لا یجوز فان اراد الحیلۃ ففی الحیلۃ ان یتصدق بہ المتولی علی الفقراء ثم الفقراء یدفعون الی المتولی ثم المتولی یصرف الی ذالک کذافی الذخیرہ۔

الاشباہ والنظائر میں ہے: والحیلۃ فی التکفین بھا التصدق بھا علی فقیر ثم ھو یکفن فیکون الثواب لھما و کذا فی تعمیر المساجد۔

حموی شرح الاشباہ والنظائر میں ہے: (قولہ والحیلۃ فی التکفین بھا ای الزکوۃ و المراد الذی وجب تملیکہ لاداء فرض الزکوۃ قولہ فیکون الثواب لھما لہ ثواب الصدقۃ وللفقیر ثواب التکفین و کذالک جمیع ابواب البر التی لہ یتاتی التملیک فیھا کعمارۃ المساجد و بناء القناطیر والرباطات۔ (حموی کشوری)

اب باقی رہا یہ امر کہ حیلہ کا جواز کس نص سے ثابت ہے تو خود قرآن کریم میں ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام۔ نے اپنے زمانہ مرض میں اپنی بیوی کے بسبب ان کے دیر میں آنے پر سو ضربیں مارنے کی قسم کھائی تھی۔ پھر جب اچھے ہو گئے تو اللہ تعالی نے ان کی قسم پوری کرنے کے لئے یہ حیلہ تعلیم فر جس کو قرآن کریم میں نقل فرمایا:

و خذ بیدك ضغثا فاضرب بہ و لا تحنث۔ (سورہ ص۔ رکوع ۳)

اور فرمایا کہ اپنے ہاتھ میں جھاڑو لے کر اس سے مار دے اور قسم نہ توڑے۔

حضرت حجۃ الاسلام امام ابوبکر رازی تفسیر احکام القرآن میں تحت آیہ کریمہ فرماتے ہیں،

و فیھا دلیل علی جواز الحیلۃ فی التوصل الی ما یجوز فعلہ و دفع المکروہ بھا عن نفسہ و عن غیرہ لان اللہ تعالی امرہ بضربھا بالضغث لیخرج بہ من الیمین ولا یصل الیھا کثیر ضرر۔ (احکام القرآن ج۔۳ ص۲۷۳)

آیت میں حیلہ کے جائز ہونے پر دلیل ہے کہ وہ حیلہ اپنے نفس سے اور غیر کی طرف سے دفع مکروہ اور جواز فعل کی طرف ذریعہ ہے اس لئے کہ اللہ تعالی نے حضرت ایوب کو جھاڑو لیکر اپنی بیوی کے مارنے کا حکم فرمایا تا کہ وہ اس کے سبب قسم پوری کرے اور اسکو زیادہ ضرر نہ پڑے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے۔ اس آیت کریمہ سے جواز حیلہ پر اس طرح استدلال فرمایا گیا:

وھذا تعلیم المخرج لا یوب النبی علیہ و علی نبینا الصلوۃ والسلام عمن یمینہ التی حلف لیضربن امرأتہ مائۃ عود و عامۃ المشائخ علی ان حکمھا لیس بمنسوخ وھو الصحیح من المذھب کذا فی الذخیرۃ۔ (فتاوی عالمگیری، ج۴ ص۳۷۶)

یہ حضرت ایوب علی نبینا علیہ الصلوۃ والسلام کو انکی اس قسم سے خلاصی کی تعلیم ہے کہ انہوں نے اپنی

بیوی کی سو لکڑی مارنے کی قسم کھائی تھی۔ تو عام مشائخ کا یہی قول ہے۔ کہ آیت کا حکم منسوخ نہیں ہے۔ اور یہی صحیح حدیث ہے۔ اسی طرح ذخیرہ میں ہے۔

اس آیہ کریمہ اور اس کی تفسیر سے ثابت ہوگیا کہ حیلہ جائز ہے اور اسکا جواز قرآن کریم سے ثابت ہے۔ اسی طرح اس حیلہ کا جواز حدیث شریف سے بھی ثابت ہے۔ بخاری شریف میں ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم استعمل رجلا علی خیبر فجاءہ بتمر جنیب فقال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آکل تمر خیبر ھکذا قال لا واللہ یارسول اللہ ۔انا لناخذ الصاع من ھذا بالصاعین، والصاعین بالثلاثۃ، فقال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لا تفعل ۔بع الجمع بالدراھم تم ابتع بالدراھم جنیبا۔

(بخاری، ج ا۔ص ۲۹۳)

بے شک رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک شخص کو خیبر پر عامل بنایا تو وہ دربار رسالت میں جنیب نامی کھجور لیکر حاضر ہوئے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خیبر کی ہر کھجور ایسی ہی ہوتی ہے۔ عرض کیا نہیں یا رسول اللہ۔ ہم یہ کھجور ایک صاع دو صاع دیکر لیتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ایسا مت کرنا، اپنی کھجوروں کو درہم سے بیچنا، پھر ان درہموں سے یہ جنیب کھجور خریدنا۔

و فی مسلم ویلک اربیت اذا اردت ذلک فبع تمرک بسلعۃ ثم اشتر بسلعتک ای تمر شئت ۔ (مسلم شریف، ج ۲ص ۴۷)

مسلم شریف میں ہے، تیرے لئے خرابی ہو، تو نے سود لے لیا۔ جب تو ایسا ارادہ کرے تو اپنی کھجور کو سامان سے بیچنا، پھر اپنے اس سامان سے جو کھجور چاہے خرید لینا۔

تو اس حدیث شریف سے حیلہ کا جواز ثابت ہوگیا۔ لہٰذا حیلہ کا جواز قرآن وحدیث سے ثابت ہو گیا۔ لہٰذا اب کوئی مسلمان اس کے خلاف نہ کہہ سکتا ہے نہ اس کے جواب میں تامل کر سکتا ہے۔ اب رہی سائل کی پیش کردہ حدیث کے یہ الفاظ (لك صدقة ولنا هدية)۔

تو اس سے تبدیل ملک کا تبدیل حکم پر استدلال کیا ہے۔ علامہ نووی شرح مسلم میں اس کی شرح میں فرماتے ہیں: ان الصدقۃ اذا قبضھا المتصدق علیہ زال عنھا وصف الصدقۃ وحلت لکل احد ممن کانت الصدقۃ حرمت علیھم۔ (شرح مسلم ص ۳۴۵)

بے شک صدقہ جب اس پر صدقہ لینے والے کا قبضہ ہوگیا، تو پھر اس سے صدقہ کا وصف زائل ہو جاتا ہے، اور اب وہ ہر اس شخص کے لئے حلال ہوگیا جس پر پہلے حرام تھا۔

تو اس حدیث کے کلمات سے جواز حیلہ پر استدلال نہیں کیا جاتا ہے بلکہ استدلال اس حدیث سے کیا گیا ہے، جس کو ہم نے پیش کیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۴) صدقہ فطر یوم عید الفطر میں صبح صادق سے واجب ہو جاتا ہے۔ تو جس نے قبل وجوب رمضان المبارک ہی میں دے دیا تو اس کا ادا کرنا درست ہوگیا۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: وان قدموھا علی یوم الفطر جاز۔

اور فطرہ کا قبل نماز عید ادا کرنا مستحب ہے۔

اسی عالمگیری میں ہے۔ والمستحب للناس ان یخرجوا الفطرۃ بعد طلوع الفجر یوم الفطر قبل الخروج الی المصلی،

پھر جس نے بعد نماز عید یا دو چار دن کے بعد یا دو چار ماہ کے بعد ادا کیا تو وہ صدقہ فطر ادا ہی ہوگا کہ اس کے ادا کا وقت تمام عمر ہے۔

اسی عالمگیری میں ہے: و اما وقت ادائھا فجمیع العمر عند عامۃ مشائخنا رحمھم اللہ، اسی لئے صدقہ فطرہ بغیر ادا کئے ذمہ سے ساقط ہی نہیں ہوگا۔ اسی عالمگیری میں ہے وان اخروہ عن یوم الفطر لم تسقط وکان علیھم اخراجھا کذا فی الھدایۃ ۔ اور جب اس نے کسی مدرسہ کے متولی کو دے دیا، تو اس نے تو ادا ہی کر دیا تو پھر تعلیق صوم وصلوۃ کی وعید اس سے متعلق نہیں ہو سکتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۳) فی الواقع دور حاضر میں دینی مدارس کس میرسی کے احوال میں ہیں۔ تو بغرض اعانت دین واحیاء علم۔ زکوۃ وصدقہ فطرہ کا بعد حیلہ شرعیہ کے دینی مدارس میں دینا اور امور میں دینے سے افضل ہونا چاہیے کہ عالمگیری میں ہے: التصدق علی الفقیر العالم افضل عن التصدق علی الجاھل الفقیر ۔ اس عبارت سے ثابت ہوگیا کہ اعانت علم سبب افضلیت ہے۔ اب باقی رہا ہندی انگریزی، کے وہ مدارس جن میں صرف زبان کی تعلیم مقصود ہو، اور ان میں وہ کتابیں نہ پڑھائی جاتی ہوں، جن میں خلاف شرع اور مخرب اخلاق مضامین ہوں، اور انکو محض اس غرض کے حصول کے لئے جاری رکھنا ہے، کہ مسلمان بچے غلط تعلیم وخلاف شرع مضامین سے بچ جائیں تو ایسے مدارس میں زکوۃ وصدقہ فطر کو حیلہ کرنے کے

بعد تنخواہ مدرسین میں دینا جائز ہے۔ پھر چاہے ان مدارس میں مالداروں کے بچے تعلیم پاتے ہوں یا غربا وفقرا کے۔ عبارات جواب نمبر ایک میں منقول ہوئیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۴) حیلہ کا جواب قرآن وحدیث سے جواب نمبر ایک میں پیش کر دیا گیا۔ نیز اس کا طریقہ بھی گزر چکا کہ مال زکوۃ وصدقہ فطرا سی بنا پر اس فقیر کو مال کے دینے کا ثواب ملے گا۔ کہ وہ اپنا مملوکہ مال بغیر عوض کے اعانت وحمایت علم میں دیتا ہے۔ اور زکوۃ وفطرہ دینے والے کو ایک ثواب تو صدقہ دینے کا ملے گا، اور دوسرا ثواب اس فقیر کے اعانت علم دین میں دینے کا سبب ہونے کا۔ کہ یہ اگر اس فقر کو نہ دیتا تو وہ فقیر امداد علم دین میں کہاں سے دیتا، تو یہ اس کے دینے کا سبب بنا اور حدیث شریف میں وارد ہے: الدال علی الخیر کفا علہ۔ تو اس زکوۃ وفطرہ دینے والے کو نہ فقط ایک ثواب، بلکہ دوگنہ ثواب ملنے کی قوی امید ہے۔

بالجملہ مال زکوۃ وفطرہ کا بعد حیلہ شرعی کے مدارس دینیہ میں دینا بلا شبہ جائز ودرست ہے۔ بلکہ مدارس میں اخراجات طلبہ کی امداد ہے۔ جس میں زکوۃ فطرہ بغیر حیلہ کے بھی جائز ہے۔ کہ یہ طلبہ مصارف زکوۃ وفطرہ کا بہترین مصرف ہیں۔

درمختار میں ہے: ان طالب العلم یجوز لہ اخذا لزکوۃ و لو غنیا اذا فرغ نفسه لا فادة العلم و استفادته لعجزه عن الکسب۔ پھر جب زکوۃ وفطرہ کی مدارس کی بعض مدات میں بغیر حیلہ کے اور بعض میں حیلہ کے بعد دینا جائز ثابت ہوا تو ان کے لئے اعلان یا اشتہار دینا اور امداد کی ترغیب اور اپیل کرنا کس طرح ناجائز ہوسکتا ہے۔ الاشباہ والنظائر میں حیلہ کی یہ تعریف لکھی ہے۔ وھی تقلیب الفکر حتی یھتدی الی المقصود۔ یعنی حیلہ فکر کا گردش کرنا ہے یہاں تک کہ وہ مقصود تک راہ پاجائے۔ اسی بنا پر حیلہ کی دو قسم ہیں۔ تو ہر وہ حیلہ جو غیر کا حق باطل کرنے یا حق غیر میں شبہ پیدا کرنے یا باطل کو آراستہ کرنے کے لئے کیا جائے وہ ناجائز یا مکروہ تحریمی ہے۔ اور ہر وہ حیلہ جو حرام سے خلاصی کے لئے یا حلال کا ذریعہ بنانے کے لئے کیا جائے، وہ جائز ومستحسن ہے۔

اسی الاشباہ اور فتاوی عالمگیری میں ہے: فنقول مذهب علمائنا ان کل حیلة یحتال بها الرجل لا بطال حق الغیر او لا دخال شبهة فیه او لتمویه باطل فهی مکروهة تحریما و کل حیلة یحتال بها الرجل لیتخلص بها عن حرام او لیتوصل بها الی حلال فهی حسنة۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۶۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) ہمارے پاس دو قسم کی زمین ہے ایک ایسی ہے کہ ہم مالک ہیں جس کو ہم بیع وہبہ سب کچھ کر سکتے ہیں صرف اس کا محصول گورنمنٹ کو دینا پڑتا ہے۔ اس میں عشر واجب ہے یا نہیں۔ دوسری زمین ایسی ہے کہ ہم کسی پارسی بنئے سے سالانہ رقم دیکر جس کو پٹکا کہتے جوتنے بونے کے لئے لے لیتے ہیں اس کو محصول خود پارسی بنیا حکومت کو ادا کرتا ہے ہم فقط سالانہ مقرر کردہ رقم بنئے کو دیتے ہیں اس میں عشر واجب یا نہیں۔

(۲) ۵۰ من اناج پیدا ہوتا ہے اور ۶۰-۷۰ من خرچ ہوتا ہے تو اس میں عشر واجب ہے یا نہیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) جو زمین اپنی مملوکہ ہے اور خود اپنی کاشت میں ہو اور وہ بارش کے پانی سے پرورش ہوا ہو تو بلاشبہ اس کی پیداوار میں عشر واجب ہے۔

لان النماء له مع ملكه فكان اولى بالايجاب عليه كما صرح به الشامی۔

اور گورنمنٹ کے محصول کے ادا کرنے سے عشر شرعی ادا نہیں ہوتا۔ اور جو زمین مسلم کی مملوکہ نہیں بلکہ کافر کی ہے اور مسلمان نے اس کو بطور اجارہ لیکر کاشت کی تو وہ عشری زمین تو ہے نہیں کہ کافر کی مملوکہ تو وہ جب قابل زراعت ہے اسکے مالک پر خراج واجب ہے مسلم کاشتکار پر نہ عشر واجب نہ خراج۔

ردالمحتار میں ہے: والحاصل انه یجب الخراج علی الموجر والمعیران بقیت الارض صالحة لزراعه۔

تو مسلم پر قسم اول کی زمین میں یقیناً عشر واجب ہے اور قسم دوم میں نہ عشر واجب نہ خراج۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) عشر پیداوار پر ہوتا ہے اس کے وجوب کے لئے نہ تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس میں مصارف

زراعت کس قدر ہوتے ہیں نہ یہ محفوظ رکھا جاتا ہے کہ خراج کتنا ہے بلکہ اس میں نہ سال گذرنے کی شرط ہے نہ اس چیز کے باقی رہنے کی شرط ہے نہ اس میں نصاب کی شرط ہے یہاں تک کہ ایک صاع میں بلکہ نصف صاع بھی پیداوار ہو تو اس میں عشر واجب ہے۔

ردالمحتار میں ہے: فیجب فیما دون النصاب بشرط ان یبلغ صاعا وقیل نصفه وفی الخضروات التی لاتبقی وھذا قول الامام وھو الصحیح۔

تو ۵۰ من اناج کی پیداوار ہو تو بہت ہے۔ لہذا اگر یہ ۵۰ من بارش سے پیدا ہوئے تو اس میں عشر یعنی ۵ من اناج واجب ہے اور اگر آب پاشی سے پیدا ہوئے تو نصف عشر یعنی اڈھائی من اناج واجب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبه: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۷۰)

خدمت حضرت فیض درجت محبوب ملت حضرت مولانا مولوی رئیس المفتیین الحاج الشاہ محمد اجمل صاحب قبلہ مفتی ہند دامت برکاتہم بعد سلام مسنون

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ان مسائل میں

(۱) اگر امام مسجد مالک نصاب نہ ہو تو اس کو فطرہ لینا جائز ہے یا نہیں؟۔

(۲) اگر امام مسجد قرضدار ہو اور وہ اگر اپنے قرض کے لئے فطرہ لے تو دینا جائز ہے یا نہیں؟۔

(۳) اگر امام مسجد قرضدار ہو اور آدمی اس کو دینا نہ چاہیں اور دوسرے شہر سے کسی امام مسجد کو بلا کر اس کو دینا چاہیں تو یہ امام مسجد کی حق تلفی ہے یا نہیں۔ بینوا توجروا

مرسلہ نظام الدین الرضوی الحامدی غفرلہ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) امام اگر سید یا مالک نصاب ہے تو اس کو زکوۃ اور صدقہ فطر کا لینا جائز نہیں۔ ہاں جب وہ سادات سے نہ ہو اور مالک نصاب بھی نہ ہو تو وہ زکوۃ اور فطرہ لے سکتا ہے اگر یہ زکوۃ اور فطرہ امامت کے عوض اور اجرت میں نہ ہو اسی بنا پر جن مقامات میں امامت کی تنخواہ نہیں ہوتی اور بجائے تنخواہ کے ان کو

سال بھر میں زکوۃ وصدقہ فطرہ دیا جاتا ہے۔ یا امامت کی تنخواہ تو مقرر ہے لیکن وہ اس قدر قلیل ہے کہ اس سے امام کی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں تو اس کی کمی کے پورا کرنے کے لئے وہ لوگ امام کو زکوۃ وصدقہ وفطرہ دیدیا کرتے ہیں۔ یا وہاں کے عرف ورواج میں امام کو زکوۃ وصدقہ فطر امامت کے عوض واجرت سمجھ کر دیا جاتا ہے۔ تو ایسے مقامات میں امام اگر چہ غیر سید ہو اور مالک نصاب نہ ہو اس کو زکوۃ وصدقہ فطر جائز نہیں۔

(۲) جب امام غیر سید ہو اور قرضدار ہو تو اس کے قرض ادا کرنے کے لئے صدقہ فطر دینا اس صورت میں تو جائز ہے جو اوپر کی تفصیل کے اعتبار سے کسی طرح امامت کی اجرت عوض میں نہ ہو اور اگر صدقہ فطر کا دینے والا امامت کی اجرت سمجھکر دیتا ہے تو ہرگز جائز نہیں۔

(۳) امام مسجد کا بلحاظ عوض امامت اہل مسجد پر زکوۃ وصدقہ فطر میں شرعا کوئی حق نہیں۔ ہاں جب امامت کی اجرت کا کوئی شائبہ بھی نہ ہو اور دوسرے شہر کے امام سے کوئی رشتہ نہ ہو۔ یا وہ زیادہ حاجتمند اور پرہیزگار نہ ہو تو اپنے امام مسجد کے مقابلہ میں دوسرے شہر اور غیر کو دینے میں اس کی حق تلفی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۳۰ رشوال المکرم ۱۳۷۸ھ

کتبه: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۷۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
ضلع کمروپ میں انجمن کمیٹی نے ایک مدرسہ بنانے کے لئے ارادہ کیا ہے لیکن مجبوری کیوجہ سے صدقہ فطر اور قربانی اور زکوۃ کے پیسہ کو جمع کیا ہے اور مدرسہ بنانے کو پوری امید ہے، لیکن ایک مولوی صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ مدرسہ بنانے سے پہلے اس میں صدقہ فطر اور قربانی اور زکوۃ کا پیسہ جمع کرنا حرام اور ناجائز ہے تو پھر اسے جمع کرنے کا شریعت میں کیا حکم ہے جائز ہے یا نہیں؟۔ دلیل کے ساتھ بیان فرمادیں۔ عریض الدین مدرسہ اسکول علی کاش کمروپ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صدقۂ فطر۔ قربانی۔ زکوۃ کا پیسہ جمع کرنا حرام وناجائز نہیں، ہاں مدرسہ میں صرف کرنے سے

پہلے اس رقم کا حلالہ کرنا ضروری ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۷۹ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

اللہ اکبر

کتاب الصوم

الجواب

﴿۴۳﴾

باب رویت الہلال

مسئلہ (۵۷۲)

قبلہ جناب مولوی صاحب.......... دام اقبالہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گذارش احوال آنکہ ایک خط آپ کے پاس روانہ کیا گیا پچھتم تھوک سے جس میں شاید ہی ہمارے متعلق باتیں لکھی ہونگی اور جہاں تک خیال ہے کہ عید کی نماز کے بابت لکھا ہوگا۔لہذا یہ مسئلہ ہے کہ میں نے چاند نہیں دیکھا اور نہ ہمارے پاس کوئی شرعی ثبوت ملا۔ایک داڑھی منڈھے نے لکھنو میں دیکھا ہوگا اس نے آکر کے کہا سب لوگوں نے اس کی بات پر یقین کرلیا تو جمعرات کے دن عید منائی۔مجھ سے کہا گیا کہ آپ عید کی نماز پڑھا دیجئے میں نے ان کا رد کیا کہ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں آیا اور نہ ہم نے چاند دیکھا اس لئے میں مجبور ہوں۔اس حالت میں نماز پڑھنا چاہئے یا نہیں۔لہذا میں آپ کے پاس خط روانہ کرتا ہوں جلد از جلد جواب سے مطلع کرے گا۔اور اسی خط کی پشت پر جواب روانہ کردیجئے گا اور داڑھی منڈے کی گواہی بشریعت مانی جاتی ہے یا نہیں یہ بھی لکھئے گا تا کہ سب کو معلوم ہوجائے بس یہی قصہ ہے اور قبلہ مولوی خلیل احمد صاحب بجنوری بھی موجود تھے اس دن انہوں نے عید کی نماز جمعہ کو پڑھی تھی قریباً سو آدمی تھے جمعہ کے دن نماز پڑھنے والے تھے۔میں نے صرف اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے نماز نہیں پڑھائی کہ کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہم سے پوچھے کہ تم نے چاند نہیں دیکھا کوئی شرعی ثبوت نہیں پہونچا تم نے نماز کیوں پڑھائی تو کیا جواب دیتے اس وجہ سے نماز نہیں پڑھائی اس پرچہ کی پشت پر فتویٰ دیجئے گا با قاعدہ مہر یا دستخط آپ کے موجود ہوں۔

از گنج ڈونڈوارہ طرف پیش امام پچھتم تھوک بتاریخ ۷ اگست ۱۳۵۶ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جب آپ کے قصبہ میں چاند نہیں دیکھا گیا نہ باہر سے کوئی شرعی طور پر بطریق موجب کوئی

ثبوت رویت ہلال کا مل سکا تو آپ کے اہل قصبہ پر تیس کے چاند کے حساب سے جمعہ کے دن ہی نماز عید کا پڑھنا ضروری تھا اس بنا پر آپ کا جمعہ کو نماز عید پڑھانا بالکل صحیح اور موافق شرع ہے۔اور ان احوال کے ماتحت جن لوگوں نے زبردستی بلا ثبوت شرعی کے جمعرات کو نماز عید پڑھی ان کی ہرگز ہرگز نماز عید نہیں ہوئی۔اور بلا شک داڑھی منڈانے والا فاسق ہے شرعاً اس کی گواہی وخبر غیر معتبر ونا مقبول ہے۔

طحطاوی میں ہے: لا یقبل خبر الفاسق اتفاقا وفی البحر قول الفاسق فی الدیانات التی یمکن تلقیھا من العدول غیر مقبول کالھلال وروایۃ الاخبار ولو تعدو کفاسقین فاکثر۔ (طحطاوی مصری صفحہ ۳۸)

اس عبارت سے ثابت ہوگیا کہ رویت ہلال میں فاسق کا قول مقبول نہیں اگرچہ فاسق دو یا ان سے زائد۔حضرت مولینا خلیل احمد صاحب نے بالکل حکم شرع کے موافق عمل کیا۔اہل قصبہ کو بھی ایسا ہی کرنا تھا میں نے جو وہاں کے لئے فتویٰ لکھا اس کو بعینہ نقل کر کے روانہ کیا جاتا ہے اس فتوے میں بھی یہی حکم ہے جیسا کہ آپ کو اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوجائیگا۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

۱۹ محرم الحرام ۱۳۷۶ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۷۳)

کیا فرماتے ہیں علماء دین مندرجہ ذیل مسائل میں ہر ایک سوال کا جواب مع حوالہ وحدیث وفقہ بیان کریں۔

(۱) ڈاک سے آئے ہوئے خط کی خبر اور ریڈیو ٹیلی ویژن فون ٹیلی گراف۔تار وغیرہ کی خبریں قابل اعتبار ہیں یا نہیں؟۔

(۳) عینی شہادت کے کیا معنی ہیں اور کن شرائط سے اسے قابل قبول کیا جا سکتا ہے؟۔

(۴) شہادت علی الشہادت کے کیا معنی ہیں اس کو جائز قرار دینے کے لئے کیا کیا شرائط ہیں؟۔

(۵) خط القاضی الی القاضی کے کیا معنی ہیں اور کن شرائط سے اسے قابل اعتبار سمجھا جا سکتا ہے؟

(۶) ایک جگہ کے قاضی کا دوسری جگہ کے قاضی کے علاوہ کسی غیر کے نام دستخط ومہر والا خط دوسری جگہ کا قاضی قبول کرسکتا ہے یا نہیں؟۔

(۷) کسی کی گواہی یا خط کو قبول کرنے کا قاضی کو اختیار ہے یا نہیں؟۔

(۸) ایک جگہ سے دوسری جگہ کی خبر کے لئے کتنے میل کا فاصلہ ہونا ضروری ہے یا شرعاً اس کی کوئی حد ہے یا نہیں؟۔

(۹) قاضی کے اعلان کے خلاف عید وغیرہ تہوار منانا جائز ہے یا نہیں؟۔

(۱۰) اجماع کے کیا معنیٰ ہیں۔عوام کا اتفاق یا صرف علماء کا اتفاق۔اور اجماع کے خلاف کرنے والوں کے لئے شرعا کیا حکم ہے؟۔

(۱۱) زمانہ حال میں جب کہ اسلامی حکومت نہیں ہے قاضی بننے کے لئے کون شخص مستحق ہے؟۔

(۱۲) یہ آج کے نکاح خوانی موروثی قاضی جن میں اکثر تو شرعی مسائل سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔اگر یہ اپنا نائب کسی عالم دین کو بنا کر شرعی مسائل میں ان کے فیصلہ پر عمل کر کے اعلان کر سکتا ہے یا نہیں؟۔

(۱۳) اسی طرح وہ اپنے نائب اور قضاۃ کمیٹی بنا کر ان کے فیصلہ پر اعلان کر سکتا ہے یا نہیں؟۔

المستفتی ،امین الدین سراج الدین سگرام پور سورت گجرات۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) رویت ہلال کے متعلق احادیث میں یہ آیا ہے، مسلم شریف میں ہے:

قال رسول اللہ ﷺ اذا رأیتم الھلال فصوموا واذا رأیتموہ فافطروا فان غم علیکم فصوموا ثلثین یوماً (وفی روایۃ) فان غم علیکم فاکملو العدۃ ثلاثین یوماً (وفی روایۃ) فان غم علیکم فاتموا ثلاثین (وفی روایۃ) فان غم علیکم الشھر فعدوا ثلاثین (وفی روایۃ) فان غم علیکم فعدوا ثلاثین ثم افطروا (وفی روایۃ) فان غم علیکم فانھا لیست تغمیٰ علیکم العدۃ رواھا البیھقی فی السنن الکبریٰ

ان احادیث کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب تم چاند دیکھ لو تو روزے رکھو اور جب تم اس کو دیکھو تو افطار کرو۔تو اگر چاند تم پر پوشیدہ ہو جائے تو تیس دن تک روزہ رکھو۔

(ایک روایت میں ہے) اگر چاند تم پر پوشیدہ ہو جائے تو تیس دن کی مقدار کو کامل کرو۔

(ایک روایت میں ہے) اگر چاند تم پر پوشیدہ ہو جائے تو تیس کو تمام کرو۔

(ایک روایت میں ہے) اگر چاند تم پر پوشیدہ ہو جائے تو تیس گن لو پھر افطار کرو۔

(ایک روایت میں ہے) اگر چاند تم پر پوشیدہ ہو جائے تو بیشک تم پر مقدار تو پوشیدہ نہیں ہے۔

ان احادیث میں انتیس تاریخ میں چاند پوشیدہ ہو جانے کی صورت میں بھی حکم فرمایا کہ تیس دن کے روزے پورے کرلو۔اور اس کا حکم مختلف الفاظ وعبارت میں فرمایا۔لیکن کسی حدیث میں یہ نہ فرمایا کہ اگر تمہارے شہر میں انتیس تاریخ کو چاند نہیں دیکھا ہے تو اسکی تحقیقات کے لئے کسی دوسرے شہر کو جاؤ تو رویت ہلال ہی کی تحقیق کرنے کے لئے اپنے شہر سے دوسرے شہر کو سفر کر کے جانا اب تک کسی حدیث میں تو دستیاب نہیں ہوا۔پھر قرون ثلٰثہ کا بھی کوئی ایسا واقعہ نہیں مل سکا جس میں یہ ہوتا کہ حضرات خلفاء نے محض چاند کی تحقیق کے لئے کسی کو اپنے شہر سے دوسرے شہر کو روانہ کیا ہو۔تو احادیث پر غور کرنے اور قرون ثلٰثہ کے عمل کو دیکھنے بلکہ کتب فقہ پر نظر کرنے سے اس امر کا ثبوت نہیں ملتا کہ دور سلف میں فقط رویت ہلال ہی کی تحقیق کرنے کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف سفر کیا گیا ہو۔تو محض اسی غرض کے لئے اس قدر اہتمام کرنا فقط اسی مقصد کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کرنا نہ واجب ثابت ہو نہ سنت ومستحب۔بلکہ یہ تصریح محدثین انتیس کو رویت ہلال بطریق موجب ثابت نہ ہونے کی صورت میں تیس دن کی مقدار کا کامل کرنا واجب ہے علامہ نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

حاصلہ ان الاعتبار بالھلال فقد یکون تاماثلثین وقد یکون ناقصا تسعا وعشرین وقد لا یری الھلال فیجب اکمال العدد ثلثین۔

تو جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ رویت ہلال کی تحقیق کرنے کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر جانا ضروری ہے تو وہ کوئی دلیل شرعی پیش کرے۔اب باقی رہا یہ امر کہ اس تحقیق کے لئے جانے والوں کے قابل اعتبار ہونے کے لئے کتنے شرائط چاہئیں تو اس کا تفصیلی بیان یہ ہے

(۱) دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کا ہونا۔

(۲) ان کا عاقل وبالغ ہونا۔

(۳) ان کا مسلمان ہونا۔

(۴) ان کا عادل ہونا یعنی وہ کبیرہ گناہ نہ کرتے ہوں اور صغیرہ پر اصرار نہ کرتے ہوں۔

(۵) بینا ہونا۔

(۶) بولنے والا ہونا۔

(۷) دوسرے شہر میں بغرض تہادت علی الشہادت گئے ہوں تو شاہدان اصل کے نام ولدیت نہ باپ بلکہ دادا کے ناموں کا یاد ہونا۔

(۸) شاہدان اصل کے اعلام عقل وبلوغ اور عدالت سے خوب واقف ہونا۔

(۹) شاہدان اصل کا ان شاہدان فرع کو گواہ بنانا اور تحمیل شہادت کرنا۔

(۱۰) خود شاہدان اصل کی اس شہر میں حاضری کا دشوار ہونا۔

(۱۱) شاہدان فرع سے ہر ایک کا یہ گواہی دینا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ فلاں بن فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں بن فلاں نے سال فلاں ماہ فلاں دن فلاں کی شام کو انتیس کا چاند دیکھا اور ہر ایک نے ہمیں اپنی اپنی گواہی پر گواہ کیا۔

(۱۲) اگر دوسرے شہر میں خط قاضی یا مفتی حاصل کرنے کے لئے جائیں تو اس شہر کے قاضی یا مفتی سے شہادت رویت ہلال کا خط لکھنا۔

(۱۳) اس خط میں وہ قاضی یا مفتی اپنا نام ولدیت، پتہ لکھے پھر مکتوب الیہ قاضی یا مفتی کے نام ۔ولدیت ۔ پتہ کر لکھ کر یہ تحریر کرے کہ میرے سامنے فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں نے فلاں سال فلاں ماہ کا چاند فلاں دن کی شام کو دیکھنے کی شہادتیں دیں میں نے شاہدین کے تزکیہ وعدالت کے بعد ثبوت رویت ہلال کا حکم دیا۔

(۱۴) اس خط کا ان شاہدان عادل کو سنانا۔

(۱۵) خط کو لفافہ میں بند کرنا۔

(۱۶) اس کو سربمہر کرنا۔

(۱۷) اس قاضی یا مفتی کا اس خط کو مجلس قضا یا افتا میں ان گواہوں کو سونپنا۔

(۱۸) ان گواہوں کا سربمہر خط کو باحتیاط اپنے قاضی یا مفتی شہر کے پاس لانا۔

(۱۹) اس سربمہر خط کو مجلس قضا یا افتاء میں دینا۔

(۲۰) یہ شہادت دینا کہ آپ کہ نام فلاں بن فلاں قاضی یا مفتی فلاں شہر کا خط ہے اس نے اس خط کو ہمیں سنایا اور اسپر ہمیں گواہ بنایا اور مجلس قضاء یا افتاء میں ہمارے سامنے اس کو لفافہ میں بند کیا اور سربمہر کیا اور ہم کو سونپا۔ یہ اسی کا خط ہے۔ اسی کا مضمون ہے ہم ان امور کی گواہی دیتے ہیں۔

(۲۱) بوقت ادائے شہادت یہ کہنا کہ میں شہادت یا گواہی دیتا ہوں۔

(۲۲) ادائے شہادت کیے لئے مجلس قضاء یا افتاء کا ہونا۔

(۲۳) گواہان کی عدالت کی تحقیق وتزکیہ کرنا۔ لہٰذا جو لوگ رویت ہلال کی تحقیق کرنے کے لئے دوسرے شہر میں جائیں تو ان کے قابل اعتبار ہونے اور ان کی شہادتوں کے معتبر ہونے کے لئے یہ شرائط ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) خط اور لفافہ جو ڈاک سے آئیں ان کی خبر نا قابل اعتبار اور غیر مقبول ہے۔ چنانچہ ہدایہ۔ الاشباہ والنظائر۔ درمختار۔ ردالمحتار۔ مجمع الانہر۔ عینی۔ فتاوے قاضی خاں۔ عالمگیری وغیرہ میں ہے " الخط یشبه الخط فلا یعمل به"۔ ریڈیو۔ ٹیلی فون۔ تار کی خبریں بھی نا قابل اعتبار ہیں۔

ہدایہ میں ہے: ولو سمع من وراء الحجاب لا یجوز له ان یشهد لوفسر للقاضی لایقبله لان النغمة تشبه النغمة فلم یحصل العلم۔

اور ان کے تفصیلی جواب میرے رسالہ "اجمل المقال" میں ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) عینی شہادت کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ شاہد نے اسکو خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہو۔ تو وہ بوقت ادائے شہادت یہ کہہ سکے کہ میں نے اسکو خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے لہٰذا عینی شہادت کے قابل قبول ہونے کے لئے یہ شرائط ضروری ہیں۔

(۱) ہر شاہد کا بوقت ادائے شہادت یہ کہنا کہ میں گواہی دیتا ہوں۔

(۲) شہادت کے لئے مجلس قضاء یا افتاء کا ہونا۔

(۳) گواہوں کا دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا۔

(۴) ان کا عاقل وبالغ ہونا۔

(۵) ان کا مسلمان ہونا۔

(۶) بینا ہونا۔

(۷) اپنی آنکھ سے خود دیکھنا۔

(۸) بولنے والا ہونا۔

(۹) عادل ہونا۔

(۱۰) شہادت رویت ہلال میں سال کا نام لینا۔

(۱۱) اور ماہ کا نام لینا۔

(۱۲) اور دن کا نام لینا۔

(۱۳) وقت رویت کا بتانا۔

(۱۴) مقام رویت کا نام لینا یہ سب عینی شہادت کے شرائط ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۴) شہادت علی الشہادت کے یہ معنی ہیں کہ اس نے خود تو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا ہے۔ لیکن ان کے سامنے دو دیکھنے والوں نے گواہی دی۔ اور انہوں نے ان کو اپنی شہادت پر گواہ بنایا۔ تو اصل دیکھنے والے شاہدان اصل کہلاتے ہیں۔ اور ان گواہان فرع شہادت کو شہادۃ علی الشہادۃ کہتے ہیں۔ لہذا شہادۃ علی الشہادۃ کے یہ شرائط ہیں۔

(۱) گواہان فرع کو بوقت ادائے شہادت یہ کہنا کہ میں گواہی دیتا ہوں۔

(۲) شہادت کے لئے مجلس قضاء یا افتاء کا ہونا۔

(۳) ان گواہوں کا دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا۔

(۴) ان کا مسلمان ہونا۔

(۵) ان کا عاقل و بالغ ہونا۔

(۶) عادل ہونا۔

(۷) بولنے والا ہونا۔

(۸) گواہان اصل کے نام۔ ولدیت کا یاد ہونا۔

(۹) گواہان اصل کے اسلام و عقل و بلوغ و عدالت سے واقف ہونا۔

(۱۰) گواہان اصل کا ان گواہان فرع کو گواہ بنانا۔

(۱۱) یہاں ان گواہان اصل کی حاضری کا دشوار ہونا۔

(۱۲) گواہان فرع سے ہر ایک کا اسطرح گواہی دینا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ فلاں بن فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں نے فلاں سال فلاں ماہ فلاں دن کی شام کو انتیس کا دیکھا اور ہر ایک نے مجھے اپنی اپنی گواہی پر گواہ کیا۔ تو شہادت علی الشہادۃ کے یہ شرائط ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۵) خط القاضی الی القاضی اس طرح ہوتا ہے۔ اس نے ثبوت ہلال کا حکم دیا پھر اس قاضی یا مفتی نے ایک خط لکھا جس میں اپنا نام و پتہ لکھ کر دوسرے شہر کے قاضی یا مفتی کے نام۔ ولدیت پتہ لکھ کر یہ تحریر کیا کہ میرے سامنے فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں نے فلاں سال فلاں ماہ کے چاند فلاں کی

شام کو دیکھنے کی شہادتیں دیں میں نے ان شہادتوں کو لیکر شاہدین کے تزکیہ کے بعد انتیس کے چاند کا حکم دیا۔ اس خط کو دو گواہان عدل کو سنا کر ان کے سامنے ہی لفافہ میں بند کر دیا۔ پھر لفافہ کو سر بمہر کیا۔ اور ان کو اس خط پر گواہ بنا کر دیا۔ پھر یہ گواہ اسے سر بمہر خط دیں کہ آپ کے نام یہ فلاں بن فلاں قاضی یا مفتی فلاں شہر کا خط ہے۔ اس نے ہمیں اس خط کو سنایا اور اس پر ہمیں گواہ کیا اور ہمارے سامنے اس خط کو لفافہ میں بند کیا اور سر بمہر کیا۔ یہ اسی کا خط ہے۔ اس کا مضمون اسی کا ہے ہم ان امور پر گواہی دیتے ہیں لہذا اس خط کے قابل اعتبار ہونے کے لئے یہ شرائط ہیں۔

(۱) گواہان کا دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا۔

(۲) ان کا مسلمان ہونا۔

(۳) ان کا عاقل و بالغ ہونا۔

(۴) ان کا عادل ہونا۔

(۵) ان کا بینا ہونا۔

(۶) ان کا بولنے والا ہونا۔

(۷) گواہان کا مضمون خط خود سننا۔

(۸) ان کے سامنے خط کا لفافہ میں بند ہونا۔

(۹) لفافہ کا سر بمہر ہونا۔

(۱۰) ان گواہان کا خط پر گواہ ہونا۔

(۱۱) گواہوں کا اس خط کو مجلس افتا یا قضاء میں دینا۔

(۱۲) گواہان کا باحتیاط اس خط کو دوسرے شہر کے قاضی یا مفتی کے پاس لانا۔

(۱۳) اس سر بمہر خط کو اس مفتی یا قاضی کی مجلس افتاء یا قضا میں دینا۔

(۱۴) شہادت دینا کہ آپ کے نام یہ فلاں بن فلاں قاضی یا مفتی فلاں شہر کا خط ہے۔ اس نے ہمیں اس کو سنایا اور اس پر ہمیں گواہ کیا اور ہمارے سامنے اس کو لفافہ میں بند کیا اور لفافہ کو سر بمہر کیا۔ یہ اسی کا خط ہے۔ اور یہ اسی کا مضمون ہے۔ ہم ان امور پر گواہی دیتے ہیں۔

(۱۵) اس قاضی یا مفتی کا اس خط کو پڑھ کر گواہان کی عدالت و تزکیہ کے بعد اپنے شہر کے لئے حکم دینا۔ یہ سب شرائط خط قاضی الی القاضی کے معتبر و مقبول ہونے کے لئے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۶) شریعت نے خط القاضی الی القاضی کو معتبر رکھا ہے اور خط کسی غیر قاضی یا مفتی کے نام ہو تو جب قاضی یا مفتی مکتوب الیہ نہیں ہے۔ تو اس کو قبول بھی نہیں کر سکتا۔ درمختار میں ہے:

لو جعل الخطاب للمکتوب الیه لیس لنائبه ان یقبله ۔

ردالمحتار میں ہے: قوله لنائبه ان یقبله لانه قد کتب الی غیر ہ ولو جعل الخطاب الی النائب وسماہ باسمه لیس للمنیب ان یقبله لانه لایقبل الکتاب الا المکتوب الیه۔

تو جب قاضی یا مفتی اس خط کا مکتوب الیہ ہی نہیں تو وہ خط اس قاضی یا مفتی کیلئے نا قابل قبول ہے ۔واللہ تعالیٰ اعلم

(۷) اگر شہادت اور خط قاضی کے تمام شرائط موجود ہوں ۔ جب تو اس شہادت اور خط قاضی کا قبول کرنا اور اس پر حکم دینا ضروری ہے۔

درمختار میں ہے: حکمها (ای الشهادة) وجوب الحکم علی القاضی لموجبها بعد التزکیة۔

عالمگیری میں ہے:۔ انما یقبله (ای الخط) القاضی المکتوب الیه عند وجود شرائط ۔اور ان کے جب شرائط ہی میں کمی اور خامی باقی ہو تو قاضی کو ان کے قبول کر لینے کا اختیار حاصل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۸) جب ایک جگہ سے دوسری جگہ طریق موجب خبر پہونچ جائے تو اس کے معتبر ومقبول ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ خبر بطریق موجب ہو شرعاً اس کیلئے میل مقدار متعین ۔نہ کوئی حد مقرر ۔یہاں تک کہ اہل مغرب کی رویت پر اہل مشرق کو عمل کرنا واجب ہے۔

مجمع الانہر میں ہے: لو رأی اهل المغرب هلال رمضان یجب برویتهم علی اهل المشرق اذا ثبت عندهم بطریق موجب۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(مجمع الانہر مصری جلد ا صفحہ ۱۳۸)

(۹) قاضی کے اعلان وحکم کا اتباع ضروری ہے اور اس کی مخالفت ممنوع ہے بخاری ومسلم شریف کی حدیث شریف میں ہے" من یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعص الامیر فقد عصانی "تو خلاف حکم واعلان قاضی کے عید وغیرہ منانا ممنوع ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۱۰) شرعا اجماع کے یہ معنیٰ ہیں کہ مجتہدین اور علماء امت کا ایک زمانہ میں کسی حکم شرعی پر اتفاق

کر لینا۔

چنانچہ توضیح ومسلم الثبوت وغیرہ میں ہے" الاجماع هو اتفاق المجتهدین من امة محمد ﷺ فی عصر علی حکم شرع " اب رہے عوام تو وہ ان امور شرعیہ میں تو اجماع میں داخل ہیں جن میں رائے کی طرف احتیاج نہیں اور جن میں رائے کی طرف احتیاج ہے تو ان میں ان کا اجماع میں کوئی دخل نہیں۔

توضیح میں ہے: اما عامة الناس ففیما لا یحتاج الی الرائی کنقل القرآن وامهات الشرائع داخلون فی الاجماع کالمجتیهدین وفیما یحتاج لا عبرة لهم "

اور مخالف اجماع شرعا کافر ہے۔

توضیح میں ہے" لیس المراد انه لو لم یوافق العوام لم ینعقد الاجماع حتی لا یکفر منکر الاجماع بل لا یمکن لاحد من الخواص والعام المخالفة حتی لو خالف احد یکفر "مسلم الثبوت میں ہے" انکار حکم الاجماع القطعی کفر عند اکثر الحنفیة "۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۱۱) جن مقامات میں اسلامی حکومت نہیں ۔وہاں مسلمان اپنے مذہبی امور کے لئے کسی مسلمان عاقل بالغ دیندار صاحب سمع وبصر کو قاضی بنا لیں ۔بہتر یہ ہے کہ وہ صاحب فتویٰ ہو جو احکام شرع کو کتاب اللہ اور احادیث وکتب عقائد وفقہ سے خود نکال سکے تو یہ قاضی جمعہ وعید وغیرہ امور کو بھی قائم کرے ۔اور لوگوں کو دینی امور میں صحیح رہنمائی کرے۔

ردالمحتار میں ہے: فی بعض بلاد المسلمین غلب علیهم الکفار کقرطبة الا ن یجب علی المسلمین ان یتفقوا علی واحد منهم یجعلونه والیافیولی قاضیا ویکون هو الذی یقضی بینهم وکذا ینصبو اماما یصلی بهم الجمعة۔ (ردالمحتار مصری جلد ۴ صفحہ ۳۴۱)

عالمگیری میں ہے:۔ینبغی للقاضی ان یقضیٰ بما فی کتاب الله وان لم یجد فی کتاب الله تعالیٰ یقضیٰ بما جاء عن رسول الله ﷺ ویجب ان یعلم المتواتر والمشهور وماکان من اخبار الاحاد ویجب ان یعلم مراتب الرواة وان کانت حادثة لم یردفیها سنة رسول الله علیه الصلاة والسلام یقضیٰ فیها بما اجتمع علیه الصحابة رضی الله عنهم فان کان شیء لم یات فیه من الصحابة قول وکان فیه اجماع التابعین قضی به وان لم یجی

شیء من ذالك فان كان من اهل الاجتهاد اجتهاد برايه فيه ثم يقضي به برايه و ان لم يكن من اهل الاجتهاد يستفتي في ذالك فيا خذ بفتوى المفتي ولا يقضي بغير علم ملخصاً ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

اگر ان نکاح خواں قاضیوں میں کوئی قاضی عالم دین ہو لیکن اس کا اپنے شہر پر اقتدار ہو اور اکثر اہل شہر اس کی بات مانتے ہوں تو وہ کسی مفتی دین سے فتوے حاصل کر کے اس فتوے کے موافق اعلان کر سکتا ہے عالمگیری میں ہے "لو قلد جاهل وقضى هذا الجاهل بفتوى غيره يجوز"۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

ظاہر ہے کہ یہ وہ قاضی شرع تو ہے نہیں جس کا مقرر کرنا بادشاہ اسلام کا کام ہے بلکہ یہ نام کے قاضی اکثر خاندانی ہوتے ہیں اور بعض مقامات میں ایسے قاضی بھی ہیں جن کو اہل شہر نے قاضی مقرر کرلیا ہے تو ان قاضیوں کے وہ اختیارات نہیں جو قاضی شہر کے اختیارات ہوتے ہیں۔

عالمگیری میں ہے " اذا اجتمع اهل بلدة على رجل و جعلوه قاضيا يقضي فيما بينهم لا يصير قاضيا " تو جب ہمارے اس وقت کے قاضی حقیقۃً وہ قاضی ہی نہیں تو ان کو اپنا نائب بنانے اور قضاۃ وہلال کمیٹیاں بنانے کا کوئی حق حاصل نہیں ۔ کیونکہ جب بادشاہ کا بنایا ہوا قاضی بلا اجازت بادشاہ اسلام کے خود اپنا نائب کسی کو مقرر نہیں کرسکتا۔

چنانچہ عالمگیری میں ہے:۔ السلطان اذا قال الرجل جعلتك قاضيا ليس له ان يستخلف الا اذن له في ذالك صريحا او دلالة " درمختار میں ہے " ولا يستخلف قاضي نائبا الا اذا فوض اليه صريحا او دلالة " تو اہل شہر کا بنایا ہوا قاضی یا خاندانی قاضی خود کسی کو اپنا نائب یا خلیفہ کس طرح بنا سکتا ہے علاوہ بریں ان قضاۃ وہلال کمیٹیوں میں کس قدر غلطیاں ہے:

(۱) قاضی و نائب قاضی کیلئے مسلمان صحیح العقیدہ ہونا شرط ہے عالمگیری میں ہے " ولا تصح ولاية القاضي حتى يجتمع في المولىٰ شرائط الشهادة من الاسلام والتكليف والحرية الــــخ" یہاں تک کہ پنچ اور ثالث کے لئے بھی وہی شراط ہیں جو قضاۃ کیلئے ہیں ردالمحتار میں ہے " واماالحكم فشرطه اهلية القضاء " اور مرتد ہوجانے سے تو قاضی اپنے منصب قضا ہی سے خود معزول ہوجاتا ہے عالمگیری میں ہے۔" اربع خصال اذا حصلت بالقاضي صار معزولا ذهاب البصر وذهاب السمع و ذهاب العقل والردة " تو مرتدین نہ مسلمانوں کے قاضی ہوسکتے ہیں نہ نائب

قاضی نہ حکم ہوسکتے ہیں نہ پنچ۔ ان کا فیصلہ و حکم مسلمانوں کے لئے صحیح نہیں ردالمحتار میں ہے " لم يصح قضائه على المسلم حال كفره " ۔ اور ان قضاۃ و حلال کمیٹیوں میں گمراہ اہل ضلال بلکہ مرتدین بھی رکن و ممبر ہوتے ہیں تو ایسے نااہلوں کو قاضی یا نائب قاضی بنانا ان کی سب سے پہلی شرعی غلطی ہے:

(۲) فساق کو قاضی یا نائب قاضی بنانا احتیاط قضا کے خلاف ہے۔ عالمگیری میں ہے " لا ينبغي ان يقلد الفاسق كذافي البدائع '' ۔ اور ان قضاۃ و ہلال کمیٹیوں میں فاسق بھی رکن و ممبر ہوتے ہیں تو فاسقوں کا قاضی یا نائب قاضی بنانا ان کی دوسری شرع غلطی ہے:

(۳) قاضی و نائب قاضی عالم احکام دین کو بنایا جائے فتاویٰ قاضی خاں میں ہے " ومع اهلية الشهادة لا بد ان يكون عالما ورعا الخ " تو جاہلوں ناواقفوں کو قاضی یا نائب قاضی بنانا ان کی تیسری شرعی غلطی ہے:

(۴) مرتدین کی شہادت شرعاً غیر معتبر و نامقبول ہے۔

صاحب درمختار کی شرح ملتقیٰ میں ہے" كل من كفر (اى اهل الهواء) كالمجسمة والخوارج و غلاة الروافض و القائلين بخلق القرآن لاتقبل شهادتهم "

(شرح ملتقیٰ مصری جلد ۲ صفحہ ۲۰۰)

اس عبارت سے ثابت ہوگیا کہ فرق مدعیان اسلام میں رافضیوں، خارجیوں ، وہابیوں ،قادیانیوں غیر مقلدوں وغیرہ مرتدین کی شہادت شرعاً غیر مقبول ہے اور یہ قضاۃ وہلال کمیٹیاں ان مرتدین کی شہادتوں کو مقبول و معتبر قرار دیکر حکم صادر کر دیتی ہیں تو ان کی یہ چوتھی شرعی غلطی ہے۔

(۵) فاسقوں کی شہادت بھی شرعا غیر مقبول و نامعتبر ہے۔

ہدایہ میں ہے " وتشترط العدالة لان قول الفاسق في الديانات غير مقبول" ۔

اس عبارت سے ثابت ہوگیا کہ فاسقوں کی شہادت شرعاً غیر معتبر و نامقبول ہے اور یہ قضاۃ وہلال کمیٹیاں فاسقوں کی شہادتوں کو معتبر و مقبول ٹھہرا کر حکم صادر کر دیا کرتی ہیں تو ان کی یہ پانچویں شرعی غلطی ہے:

(۶) مستور الحال جس کے عدالت و فسق کا حکم معلوم نہ ہو اس کی شہادت بھی علاوہ ہلال رمضان کے اور چاندوں میں غیر مقبول ہے۔

صاحب درمختار شرح ملتقیٰ میں فرماتے ہیں" وقيل في هلال الفطر و ذى الحجه و بقية الا

شہر التسعة شہادة حرین او حرا و حرتین بشرط العدالہ ولفظ الشہادة"

(شرح ملتقی جلد۲صفحہ۲۳۶)

ترجمہ عیدالفطراور ذی الحجہ اور بقیہ نوماہ کے چاند میں "دو آزاد مردوں یا ایک آزاد مرد اور دو عورتوں کی شہادۃ بشرط عدالت اور لفظ اشہد کے قبول کی جائیگی اس عبارت سے ثابت ہوگیا کہ سوائے ہلال رمضان کے اور عیدالفطر وعیدالاضحیٰ وغیرہ تمام شہور کے چاندوں کے لئے گواہوں کا عادل ہونا شرط ہے۔تو مستور الحال کے بلاتزکیہ وتحقیق احوال کے اس کی شہادت کب معتبر قرار پائی اوران قضاۃ وہلال کمیٹیوں کا ایسے مستور الحال کے بلاتزکیہ وتحقیق احوال کے اس کی شہادت کو معتبر قرار دیکر حکم صادر کردینا ان کی چھٹی شرعی غلطی ہے:

(۷) ان قضاۃ وہلال کمیٹیوں میں بوقت ادائے عینی شہادت اس کے علاوہ (۱۴) شرائط جو سوال نمبر۳ کے جواب میں مذکور ہوئے ملحوظ نہیں رکھا جاتا تو شرعاً وہ عینی شہادت ادا ہی نہیں ہوئی اور جب وہ ادانہیں ہوتی تو اس پر حکم کس طرح صحیح ہوجاتا ہے تو یہ ان کمیٹیوں کی ساتویں شرعی غلطی ہے:

(۸) اسی طرح ان کمیٹیوں میں کبھی دوسرے شہر سے شہادت علی الشہادۃ حاصل کی جاتی ہے تو شہادت علی الشہادۃ کے وہ (۱۴) شرائط جو سوال نمبر۴ کے جواب میں مذکور ہوئے پورے طور پر نہیں پائے جائے تو شرعاً وہ شہادت علی الشہادۃ ہی روانہیں ہوتی اور جب وہ ادا نہیں ہوتی تو اس پر حکم کا صادر کرنا کب صحیح ہوا تو ان کمیٹیوں کی یہ شرعی آٹھویں غلطی ہے:

(۹) کبھی ان کمیٹیوں میں دوسرے شہر سے خط قاضی حاصل کرتے ہیں لیکن خط قاضی کے وہ (۱۵) شرائط جو سوال نمبر۵ کے جواب میں لکھے گئے۔وہ علی وجہ الکمال ادانہیں کئے جاتے تو شرعاً وہ خط قاضی رویت ہلال کے لئے حجت نہیں ثابت ہوا تو ان قضاۃ وہلال کمیٹیوں میں اس خط کو زبردستی حجت قرار دیکر اس پر حکم صادر کردینا کس قدر غلط حکم بن جاتا ہے۔تو ان کمیٹیوں کی یہ نویں شرعی غلطی ہے۔

(۱۰) شرعاً رکن شہادت یہ کہنا ہے کہ میں شہادت دیتا ہوں جو عربی کے لفظ اشہد کا ترجمہ اگر بوقت ادائے شہادت یہ الفاظ نہ کہے گئے تو وہ شہادت غیر مقبول ہے۔قدوری میں ہے" فـان لـم یـذکـر الشاھد لفظة الشھادة وقال اعلم اویتقین لم تقبل شھادة "۔اوران قضاۃ وہلال کمیٹیوں میں ان الفاظ کا کہنا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔تو جس شہادت میں یہ الفاظ ادا نہ ہوئے ہوں تو ان کمیٹیوں کا ایسی شہادت کو قابل قبول سمجھنا ان کی دسویں شرعی غلطی ہے:

(۱۱) شریعت میں حکم وفیصلہ قول وفیصلہ صحیح اور مسلک صواب پر ہوگا آرا کی کثرت وقلت کا اصل لحاظ نہیں۔چنانچہ اگرا کثر آرا غلط بات ناحق امر پر متفق ہوجائیں اور صرف ایک رائے صحیح وحق وصواب پر ہوتو کثرت رائے پر ہرگز ہرگز حکم وفیصلہ نہ دیا جائیگا بلکہ ایسی غلط کثرت آرا کے مقابلہ میں اس شخص واحد کے قول پر حکم وفیصلہ کیا جائیگا جو راہ حق وصواب پر ہے تو ایسی کثرت آرا جو غلطی اور ناحق اور خلاف شرع بات پر ہو وہ شرعاً غیر معتبر اور نامقبول ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے" وکـذالك لا یعتبر کثرۃ العدد فالواحد قد یوفق للصواب ما لا توفق له الجماعة ینبغی ان یکون هذا قول ابی حنیفة رحمه الله "۔

اوران قضاۃ وہلال کمیٹیوں میں حکم وفیصلہ قول صحیح وراہ صواب پر نہیں ہوتا بلکہ وہ دنیا کے غلط اصول یعنی کثرت آرا پر حکم وفیصلہ کردیا جاتا ہے اگر چہ قلت آرا طریق صحیح وراہ صواب ہی پر ہو۔تو ان کمیٹیوں کا ایسی غلط بنیاد پر حکم دیدینا ان کی گیارہویں شرعی غلطی ہے:

(۱۲) شرعاً فقہاء وعلماء کرام اہل رائے ہیں۔اور عوام جو فقہ سے بے خبر۔احکام دین سے ناآشنا ہیں وہ اپنے امور میں اہل الرائے ہی نہیں ہیں۔جیسا جواب سوال نمبر۱۰ میں عبارات سے ثابت ہو چکا ہے۔تو ایک عالم فقیہ کے مقابلہ میں عوام کی کثرت آراء دینی امور میں نہ حجت شرعی ہے نہ معتبر ومقبول ہے۔ تو ایسے عوام کی کثرت آراء پر حکم وفیصلہ کس قدر غلط وباطل ہوگا۔ان قضاۃ وہلال کمیٹیوں میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر عالم فقیہ عوام کی کثرت آراء پر بمقابلہ ایک عالم فقیہ کی رائے کے فیصلہ دیدیا جاتا ہے یعنی اہل رائے کے مقابلہ میں غیر اہل رائے کی کثرت پر حکم کردیا جاتا ہے۔تو ان کمیٹیوں کی یہ بارہویں شرعی غلطی ہے:

(۱۳) جب اہل الرائے فقہاء وعلماء کرام میں اختلاف واقع ہوتو ان میں سے جس کا قول حق سے زیادہ قریب ہوتو قاضی اس اصح قول پر حکم دے گا یہ اس صورت میں ہے جب قاضی مجتہد ہوگا اور اگر قاضی مجتہد نہیں ہے تو اس کے نزدیک ان میں جو زیادہ فقیہ اور متقی ہو اس کے قول پر حکم دے۔

فتاوے عالمگیری میں ہے:

وان اختـلـفـوا ایضا فیما بینهم نظر الی اقرب الاقوال عنده من الحق اذا کان من اهـل الاجتهـاد وان لم یکن القاضی من اهل الاجتهاد وفی هذه الصورة قدو قع الاختلاف بین اهل الفقه اخذ بقول من هوافقه واورع عنه" (عالمگیری جلد۳صفحہ۱۴۴)

اس عبارت سے ثابت ہوگیا کہ حق سے قریب تر قول پر یا زیادہ فقیہ ومفتی کی رائے پر بصورت اختلاف حکم کیا جائے گا۔ اور کثرت آرا پر فیصلہ نہ کیا جائے گا۔ اور یہ قضاۃ وہلال کمیٹیاں ایسے اختلاف علما کی صورت میں نہ حق سے قریب تر قول پر حکم کرتی ہیں نہ زیادہ فقیہ ومفتی کی رائے پر فیصلہ کرتی ہیں بلکہ ان کے خلاف کثرت آرا پر فیصلہ کرتی ہیں تو ان کی یہ تیرھویں شرعی غلطی ہے:

(۱۴) جب ایک شہر کے قاضی یا مفتی کا فیصلہ دوسرے شہر میں بطریق موجب نہیں پہونچا تو وہ دوسرے شہر کے لئے حجت شرعی نہیں ہے جیسے سوال نمبر ۸ کے جواب میں عبارت مجمع الانہر مذکور ہوئی اور قضاۃ وہلال کمیٹیاں اس فیصلہ کو اگر چہ بطریق موجب نہیں پہونچا ہو اس دوسرے شہر کیلئے بھی حجت جانتی ہیں اسی بنا پر اپنے فیصلہ کو اخبار میں طبع کرا دیتی ہے تو یہ ان کمیٹیوں کی چودھویں شرعی غلطی ہے:

(۱۵) ریڈیو، تار، ٹیلی فون، وائرلیس، سے جو ہلال کمیٹی کا فیصلہ دیگر شہروں کو بھیجا جاتا ہے وہ بطریق موجب نہیں جیسا کہ جواب سوال نمبر ۲ سے ظاہر ہے۔ پھر ہلال کمیٹی کا اس فیصلہ کا نشر واعلان کرنا ظاہر ہے کہ اسی لئے ہے کہ اور شہروں کے لوگ بھی ہلال کمیٹی کے اس فیصلہ پر عمل کریں تو ان کمیٹیوں کا دیگر مقامات کے لئے اس فیصلہ کو جو بطریق موجب نہیں پہونچا قابل عمل ٹھہرانا ان کی پندرہویں شرعی غلطی ہے۔

الحاصل جب ان قضاۃ وہلال کمیٹیوں میں اس قدر صریح شرعی غلطیاں موجود ہیں تو ان کا فیصلہ وحکم کس قدر غلط وباطل ہوگا۔ تو ایسے غلط فیصلہ کا قاضی یا مفتی شہر شرعاً کس طرح اعلان کرسکتا ہے۔ اور اگر غلطی سے کسی مقام کے مفتی یا قاضی نے اسی غلط فیصلہ کی بنا پر اعلان بھی کردیا تو وہ کب قابل عمل قرار پاسکتا ہے۔ مولیٰ تعالیٰ قبول حق کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۵ صفر المظفر ۱۳۷۶ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۷۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ
آج یعنی ۳۰ شعبان المعظم ۱۳۷۶ھ کو ایک شخص اپنے کام سے کچھا گیا، وہاں سے آکر اس نے کہا کہ کچھا میں سب کے روزے ہیں اور سونیری گاؤں میں بھی ایک متشرع شخص کا روزہ ہے۔ اس خبر پر یہاں گاؤں والوں نے بھی روزے رکھ لئے، کچھ دیر کے بعد اسی شخص سے پھر پوچھا، ایک دوسرے شخص

نے کہ کچھا میں چاند دیکھ کر روزہ رکھا گیا یا کسی خبر پر تو؟ اس نے کہا کہ وہاں ریڈیو سے خبر آئی تھی، دوسرے شخص نے اپنا روزہ توڑ ڈالا، وہ اس لئے کہ کچھا میں دکھائی دینے کی شہادت نہیں ہے، ریڈیو کے ذریعہ چاند کی خبر سن کر روزہ رکھا اور وہ شرع شریف میں غیر معتبر ہے۔ ایک اور دوسرے گاؤں سے بھی یہی خبر ملی کہ وہاں سب کے روزے ہیں۔ لیکن چاند دیکھنے کی کوئی شہادت نہیں، اس صورت حال میں دوسرے شخص کے روزہ توڑنے سے کچھ اور لوگوں نے روزے توڑ دیئے اور کچھ نے اس لئے نہیں توڑے کہ کچھا والوں نے روزے رکھے ہیں، اس لئے ہم بھی رکھ رہے ہیں، میں یہ عرض کرنا بھول گیا کہ جن لوگوں نے یہاں روزے رکھے وہ دن کے دس گیارہ بجے کے درمیان نیت کر کے رکھے، جن میں کچھ چائے پی چکے تھے، کچھ کھانا کھا چکے تھے، اور کچھ محض پانی ہی پی چکے تھے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ جنہون نے روزے توڑے وہ گنہگار ہوئے یا نہیں؟ اور جنہوں نے روزے نہیں توڑے خواہ نفلی ہو یا فرضی یا کیسا بھی نہیں مگر توڑنے والوں کو نہیں توڑنا چاہئے تھے۔ تو اب کیا شرع کا حکم ہے؟۔

۱۳ اپریل ۱۹۵۷ء از نوگواں تحصیل کچھا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

یہ تو بالکل صحیح اور حق ہے کہ ریڈیو کی خبر شرعاً معتبر اور حجت نہیں، نہ تو اس کی بنا پر روزہ کا حکم دیا جائیگا نہ عید کی جائیگی۔

روزہ کی فرضیت رویت ہلال کے متحقق ہوجانے پر ہے پھر جب وہاں رویت ہلال ہی نہیں نہ دوسرے مقام کی شہادت شرعی گذری تو شرعاً روزہ ہی فرض نہ ہوا اب رہی خبر کی خبر چاہے وہ ریڈیو ہی کی ہو تو اس سے شرعاً نہ رویت ہلال ثابت ہوسکتا ہے نہ اس پر روزہ اور عید ہوسکتی ہے۔ لہٰذا جن لوگوں کو بالیقین یہ معلوم ہوگیا کہ کچھا میں نہ تو رویت ہلال ہوئی نہ کوئی شہادت باہر سے آئی تو انہیں شرعاً روزہ توڑ ہی دینا تھا کہ یہ یوم شک میں تھا اور یوم شک روزہ رکھنا مکروہ ہے تو ان کا تو روزہ کا توڑنا موافق شرع ہوا۔ اور جنہوں نے اس بات کے معلوم ہوجانے کے بعد بھی روزہ نہیں توڑا انہوں نے غلطی کی اور فعل مکروہ کے مرتکب ہوئے پھر ان کا نہ تو فرض روزہ ہوا کہ شرعاً ان کے حق میں رمضان کی رویت ہلال ہی ثابت نہیں ہوئی اور نہ ان کا نفل روزہ ہوا جو باعث اجر وثواب ہے کہ یوم شک کا روزہ رکھنا ہی مکروہ ہے۔

اور پھر جب ان میں سے کسی نے صبح چائے پی لی کسی نے کھانا کھالیا کسی نے پانی پی لیا ہے تو اس کے بعد

شرعاً روزہ کی نیت ہی نہیں ہوسکتی ہے۔ اور یہ روزہ ہی کب قرار پایا۔ مولی تعالیٰ مسلمانوں میں وہ جذبہ پیدا کردے جس سے وہ احکام شرع سے واقف ہوں اور ان کی جہالت کو دور فرمادے اور انہیں مسائل دین سیکھنے کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۱۷ رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۷۵)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

۲۹ رشعبان یوم دوشنبہ کو بیکانیر میں مطلع ابر آلودہ ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہیں آیا لیکن نو بجے دہلی اور پاکستان کے ریڈیو والوں نے چند جگہ چاند ہونا بتلایا اور دہلی کے جامع مسجد کے امام نے بھی ان شہادتوں کو منظور فرما کر یکم رمضان منگل کو قرار دیکر روزہ کا اعلان ریڈیو پر کرادیا آیا یہ ریڈیو تار ٹیلیفون کی شہادت قابل تسلیم ہے اور باوجودیکہ عینی شہادت نہ ہونے کے ریڈیو کی تواتر کی خبروں پر عمل کر کے ۲۷ رمضان یعنی شب قدر ۲۷ یکشنبہ کی رات کو قرار دیدی جائے اور ریڈیو کی خبروں سے ہم پر قضا روزہ واجب ہوگی یا نہیں صاف صاف بیان فرمائیں عنداللہ ماجور ہونگے۔ بینوا وتوجروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جب بیکانیر میں ۲۹ رشعبان بروز پیر مطلع ابر آلود تھا جس کی بنا پر رویت ہلال نہ ہوسکی تو دوسرے مقامات سے رویت ماہ رمضان کی جب کوئی دیندار متشرع شاہد عدل آکر شہادت دے اگرچہ وہ شخص واحد ہی ہو تو بلاشبہ اس کی شہادت لیکر ۲۷ تاریخ اور شب قدر کی شب یکشنبہ اور یکشنبہ کے اعلان کیا جاسکتا ہے اور اسی کے ساتھ ایک روزہ کی قضا کا بھی اعلان کردیا جائے اور جن لوگوں نے اس یوم شک تیسویں شعبان منگل کو محض ریڈیو کی خبر کی بنا پر بالیقین رمضان ہی کا روزہ رکھا ہے تو وہ مرتکب مکروہ تحریمی کے ہوئے درمختار میں ہے " ولو جزم ان یکون عن رمضان کرہ تحریما " اور سخت گنہگار بھی ہوئے کہ یوم شک میں روزہ رکھنے کی ممانعت احادیث میں وارد ہے چنانچہ بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی، بیہقی، وغیر کتب حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: " لا تقدموا رمضان بصوم یوم او یومین الا رجل کان یصوم صوما فلیصمہ " تم

رمضان کے ایک دن یا دو دن پہلے روزہ سے سبقت نہ کرو ہاں ان ایام میں نفلی روزہ کا عادی ہو تو وہ بہ نیت نفل روزہ رکھ سکتا ہے۔

ترمذی، ابوداؤد، بیہقی میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے " من صام یوم الشک فقد عصی ابا القاسم ﷺ " جس نے یوم شک کا روزہ رکھا تو بیشک اس نے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نافرمانی کی۔

بیہقی شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: " ان النبی ﷺ نهی عن صیام قبل رمضان یوم ولاالاضحی والفطر وایام التشریق ثلاثۃ ایام بعد یوم النحر "

بیشک نبی ﷺ نے اتنے روزوں سے منع فرمایا رمضان سے ایک دن پہلا عید الاضحیٰ عید الفطر عید اضحیٰ کے بعد تین دن ایام تشریق کے۔

اسی بیہقی شریف میں حضرت عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ان علیاً وعمر رضی اللہ عنہما کانا ینهیان عن صوم الیوم الذی شک فیہ من رمضان " بے شک حضرت علی وعمر رضی اللہ عنہما رمضان کے یوم شک کے روزہ سے منع فرمایا کرتے تھے۔

ان احادیث سے ثابت ہوگیا کہ جنہوں نے تیسویں شعبان یوم شک منگل کا روزہ رکھا وہ گنہگار بھی ہوئے کہ اس دن کا روزہ ممنوع تھا اور اگر بہ نیت رمضان رکھا ہے تو مرتکب مکروہ تحریمی بھی ہوئے تو اگرچہ ان پر روزہ کی قضا واجب نہ ہو لیکن احتیاط اور تقوی کا بھی مقتضی ہے کہ انہیں روزہ کی قضا کرلینی چاہئے کہ وہ روزہ مکروہ تحریمی قرار پایا ہے۔

اور رویت ہلال رمضان کا کوئی شاہد عدل متشرع دستیاب نہ ہوسکے تو پھر اہل بیکانیر کے لئے شب قدر اور ۲۷ تاریخ دوشنبہ اور اس کی شب یہ ہی ہے اور اگر انتیس روزے ان کے پورے ہوجاتے ہیں تو ان پر ایک روزہ کی قضا بھی واجب نہیں ہاں اس صورت میں اگر ان کے ۲۸ روزے ہوکر چاند کی رویت ہوجائے جب بھی ان کو ایک روزہ کی قضا کرنی ہوگی۔

بلاشک ریڈیو کی خبر سے نہ شرعاً رویت ہلال ثابت ہوسکتی ہے نہ اس کے اعلان پر عید کی جاسکتی ہے نہ روزہ کی فرضیت کا حکم دیا جاسکتا ہے ریڈیو کی خبر کو طریق موجب اور حجت شرعی مان لینا وہ حقیقی بدعت ضلالہ ہے جس کی اصل قرآن وحدیث سے ثابت نہیں کی جاسکتی اور جو اس کے اعلان وخبر کو طریق موجب اور حجت شرعی مانتے ہیں وہ بدعتی اور اہل بدعت ہیں مولی تعالیٰ اہل اسلام کو احکام شرع پر عمل کر

نے کی توفیق دے۔اور اندھی تقلید سے محفوظ رکھے۔ واللہ تعالیٰ بالصواب۔ ٥ رمضان المبارک ١٣٧٦ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (٥٧٦)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

(١) ثبوت رویت ہلال کے لئے شرعاً طریق موجب کتنی صورتیں ہیں؟

(٢) کتاب قاضی الی القاضی میں جب تمام شرائط پائے جائیں تو وہ شرعاً طریق موجب ہے یا نہیں؟

(٣) جس شہر میں قاضی شرع یا ایسا مفتی دین موجود ہو جس کے فتووں پر لوگ عمل کرتے ہوں وہ شرعی طور پر رویت ہلال کا حکم دے اس کے حکم کی مخالفت بلا دلیل شرعی کے درست ہے یا نہیں؟

(٤) جو لوگ کسی شہر کے مفتی نہ ہوں اور ان کو مسائل شرع پر عبور بھی نہ ہو ان کو اس شہر کے مفتی کے حکم کے مقابلہ میں اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

(٥) خبر استفاضہ کی شرعاً کتنی صورتیں ہیں خبر استفاضہ طریق موجب وحجت شرعی ہے یا نہیں؟

(٦) خبر استفاضہ شہادت شرعی سے افضل اور قوی تر ہے یا نہیں اور تواتر ویقین کا فائدہ دیتا ہے یا نہیں؟

(٧) مفتی شہر کے شرعی حکم سے جب اس شہر میں نماز عید ہو چکی تو ان مساجد اور عید گاہ میں دوسرے دن نماز عید پڑھنا مکروہ ہے یا نہیں اور شرع اس کی اجازت دیتی ہے یا نہیں؟

(٨) بلا دلیل شرعی کے لوگوں کو پہلے دن کی نماز اور قربانی روکنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

(٩) حکایت اور افواہ اور اخبار اور خبر استفاضہ میں کیا فرق ہے ہر ایک کی مکمل تعریف بھی کیجئے؟

(١٠) جو خبر استفاضہ کو خبر استفادہ لکھے وہ اصطلاح شرع سے جاہل ہے یا نہیں۔ ہر سوال کا جواب مکمل ومدلل بحوالہ کتب دیگر حکم شرع سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی منشی عبد الوحید ساکن محلہ دیپا سرائے سنبھل ٢٩ جون ١٩٥٨ء

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(١) شرعاً ثبوت رویت ہلال کے لئے طریق موجب کی چھ صورتیں ہیں۔ دو صورتیں شہادت علی الرویۃ کی اور دو صورتیں شہادت علی القضاء کی اور دو صورتیں استفاضہ کی جنکی مکمل تفصیل مع حوالہ کتب کے میرے رسالہ اجمل المقال میں موجود ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(٢) جب کتاب القاضی الی القاضی کے تمام شرائط پائے جائیں تو وہ شرعاً ثبوت ہلال کے لئے یقیناً طریق موجب اور بالاجماع حجت شرعیہ ہے فتاوی عالمگیری جلد ٣ صفحہ ٢٧١ میں ہے "یجب ان یعلم ان کتاب القاضی الی القاضی صار حجۃ شرعا فی المعاملات ولکن جعلناہ حجۃ بالاجماع ولکن انما یقبلہ القاضی المکتوب الیہ عند وجود شرائطہ ملخصا" واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(٣، ٤) غیر اسلامی شہروں میں جب قاضی شرع نہ ہو تو ہر شہر کے مسلمانوں پر ضروری ہے کہ وہ اپنے شرعی امور خصوصاً جمعہ وعیدین کی اقامت کے لئے ایک عالم دین کو قاضی والی یا مفتی شرع مقرر کر لیں ردالمحتار میں ہے " واما بلاد علیہا ولاۃ کفار فیجوز للمسلمین اقامۃ الجمع والعیاد ویصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین " (ردالمحتار جلد ٤ صفحہ ٣٢١) اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ جس شہر میں قاضی یا مفتی شرع ہو تو جمعہ وعیدین کا قائم کرنا اس کے ذمہ پر ہے اور یہ حکم اپنی جگہ ثابت ہو چکا کہ حکم قاضی کا ماننا لوگوں پر لازم ہے اور اس کی مخالفت حکم شرع کی مخالفت ہے فتاوی عالمگیری میں ہے " قضاء القاضی ملزم فی حق الناس کافۃ توضیحہ ان القاضی یقضی بامر الشرع وما یصیر مضافا الی الشرع فھو منزلۃ النص فلایترك ذلك بالرائی کما لا یترك النص بالاجتھاد

(فتاوی عالمگیری جلد ٣ صفحہ ١٦١)

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ قاضی یا مفتی شہر کے حکم کی مخالفت درست نہیں اور خصوصاً ایسے لوگ جو نہ مفتی ہوں نہ مسائل شرع پر عبور رکھتے ہوں ان کا قاضی یا مفتی شہر کے حکم کا مقابلہ کرنا گویا حکم شرع ونص کا مقابلہ کرنا ہے۔ پھر بلا دلیل شرعی کے محض اپنی رائے خاص سے حکم قاضی یا مفتی کے خلاف کر نا اہل اسلام میں تفریق کرنا ہے اور اپنی دلیری ظاہر کرتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(٥، ٦) شرعاً خبر استفاضہ کی دو صورتیں ہیں پہلی صورت یہ ہے کہ کسی دوسرے شہر سے متعدد جماعتیں آئیں اور وہ بالاتفاق یہ بیان کریں کہ فلاں شہر میں ہمارے سامنے عام طور پر لوگوں نے بیان کیا کہ ہم نے اپنی آنکھ سے چاند دیکھا ہے چنانچہ درمختار میں ہے " نعم لو استفاض الخبر فی البلدۃ

الاخری لزمهم علی الصحیح من المذهب " (ردالمحتار جلد۲ صفحہ۹۷) دوسری صورت یہ ہے کہ جس شہر میں قاضی یا مفتی شرع موجود ہو تو اس شہر سے متعدد جماعتیں آئیں اور وہ بالاتفاق یہ کہیں کہ فلاں شہر میں فلاں دن عید ہوگئی یا فلاں ماہ کی رویت ہلال ثابت ہوچکی۔ چنانچہ ردالمحتار میں ہے:

" فی الذخیرة قال شمس الائمة الحلوانی الصحیح من مذهب اصحابنا ان الخبر اذا استفاض وتحقق فیما بین اهل البلدة الاخریٰ یلزمهم حکم هذه البلدة اه ومثله فی الشرنبلالیة عن المغنی قلت وجه الاستدراك ان هذه الاستفاضة لیس فیها شهادة علی قضاء قاض ولا علی شهادة لکن لما کانت بمنزلة الخبرا لمتواتر وقد ثبت بها ان اهل تلك البلدة صامو ایوم کذا لزم العمل بها لان البلدة لا تخلو عن الحاکم شرعی عادة فلا بد من ان یکون صومهم مبنیا علی حکم حاکمهم الشرعی فکانت تلك الاستفاضة بمعنی نقل الحکم المذکور وهی اقوی من الشهادة " (وفیه ایضاً) قال الرحمتی معنی الاستفاضة ان تاتی من تلك البلدة جماعات متعدد دون کل منهم یخبر عن اهل تلك البلدة انهم صاموا عن رویة " (ردالمحتار جلد۲ صفحہ۹۷)

تو خبر استفاضہ کی یہ دوصورتیں ہیں جو ثبوت رویت ہلال کے لئے طریق موجب اور حجت شرعیہ ہیں۔ پھر یہ خبر استفاضہ شرعا شہادت شرعی سے افضل اور قوی تر ہے اور تواتر اور یقین کا فائدہ دیتا ہے جیسا کہ عبارت مذکور سے ثابت ہوگیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۷) جب ذ الحجہ کو قاضی شرع یا مفتی شہر کے حکم سے نماز عید ہوچکی تو دوسرے دن کسی کو نماز عید پڑھنے کی شرعا اجازت نہیں۔

عالمگیری میں ہے " والامام لو صلاها مع الجماعة وفاتت بعض الناس لا یقضیها من فاتته خرج الوقت او لم یخرج " (عالمگیری جلد۱ صفحہ۷۸)

اب باقی رہا نماز عید کا ان مساجد وعیدگاہ میں پڑھنا جن میں یوم اول نماز عید پڑھی جاچکی ہے تو شرعا ان میں دوسری بار نماز عید قائم کرنا نامشروع وبدعت ہے بلکہ کسی قرن میں بھی کسی مسجد میں دوبار نماز جمعہ نہیں پڑھی گئی تو جب ایک مسجد میں جمعہ کی تکرار جماعت نہیں ہوئی تو ایک مسجد میں نماز عید کی تکرار کس طرح ہوسکتی ہے کہ جمعہ وعید کے ایک ہی شرائط ہیں۔

چنانچہ ردالمحتار میں ہے " مناسبته للجمعة ظاهرة وهو انهما یودیان بجمع عظیم

ویجهر فیهما بالقرائة ویشترط لاحدهما ما یشترط لا خر "

(ردالمحتار جلد۱ صفحہ۵۷۹)

خاص کر جہالت ونادانی کہ دوسرے دن امام کا اسی محراب ومنبر پر ہیئت اولیٰ کے ساتھ دوبارہ جماعت پڑھی جانے کی کسی طرح شرع اجازت نہیں دی جاسکتی یہاں تک کہ فقہاء کرام نے پنجوقتہ نماز کی جماعت ایک ہی مسجد میں ہیئت اولیٰ پر قائم کرنے کو مکروہ تحریمی لکھا ہے۔

ردالمحتار میں ہے " عن ابی یوسف انه اذالم تکن الجماعة علی الهیئة الاولیٰ لا تکره وهو الصحیح وبالعدول عن المحراب تختلف الهیئة "

بالجملہ جن مساجد وعیدگاہ میں پہلے دن حکم شرعی کی بنا پر نماز عید کی جماعت ادا کی جاچکی، ان میں دوسرے دن ہیئت اولیٰ پر نماز عید کی جماعت کا قائم کرنا نہ فقط مکروہ بلکہ ممنوع وبدعت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۸) ایام عید کے پہلے دن لوگوں کو بلا دلیل شرعی کے نماز وقربانی سے روکنا ظاہر ہے کہ گناہ عظیم ہے اور دینی مسائل میں خودرائی ہے اور مسلمانوں کی نمازوں کو مکروہ کرنا ہے اور انہیں فضیلت قربانی سے محروم کرنا ہے جو کسی مسلمان کے لئے کسی طرح لائق وروا نہیں۔ پھر ایسے شخص کو کسی مسلمان کو نماز وقربانی سے شرعا روکنے کا حق کیسے حاصل ہوسکتا ہے بلکہ بلا عذر شرعی کے دوسرے دن عید اضحیٰ کی نماز پڑھنا خلاف سنت ومکروہ واسائت ہے۔

چنانچہ فتاوی عالمگیری میں ہے " حتی لو اخروها الی ثلثة ایام من غیر عذر اجازت الصلوة وقد اسائو " واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۹) حکایت کسی واقعہ کا بلاتحقیق کے بغیر لحاظ ثبوت شرعی کے صرف بیان کرنا خود صدق وکذب کا محتمل ہوتا ہے اگرچہ اس کی اصل واقعی طور پر موجود ہو۔ اور افواہ وہ ہے جس کی واقعی طور پر کوئی اصل نہ ہو بلکہ وہ لوگوں میں شائع ومشہور ہوجائے۔ اور خبر وہ ہے جو صدق وکذب دونوں پر مشتمل ہوا اگرچہ اس کی اصل کا واقع میں وجود ہو۔ اور خبر استفاضہ متعدد جماعتوں کی وہ متواتر خبریں جن کے جھوٹ پر متفق ہو جانے کو عقل جائز نہ رکھے۔ جیسا کہ نمبر ۵، ۶ میں شامی کی عبارت میں مذکور ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۱۰) جو خبر استفاضہ کو خبر استفادہ لکھے ظاہر ہے کہ وہ اصطلاح شرع سے جاہل ہے کتب فقہ سے ناواقف ہے۔ احکام دینیہ سے لاعلم ہے تو پھر اس کا اس لاعلمی وناواقفی کی بنا پر جو بھی حکم ہوگا وہ خلاف شرع

اورغلط ہےاوروہ حدیث "افتوا بغیر علم "کا مصداق قرار پاکرسخت گنہگاراورجری فی الدین ہوگا۔
واللہ تعالی اعلم بالصواب۔۱۳ ذی الحجہ ۷۷؁ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبدمحمداجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۷۷)

کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
بتاریخ ۲۹ رشعبان المعظم کو بوجہ ابر کے چاندنظر نہیں آیا بعدکو معلوم ہوا کہ پاکستان ڈیڈیو نے بوقت ۸/۳۰۔میں اعلان کیا کہ چاند کراچی اورلاہوراورڈہاکہ میں دیکھا گیا،اس کے بعد انڈیا ریڈیو نے ۹/۱۵۔میں اعلان کیا کہ لکھنو کے مولانا قطب الدین صاحب فرنگی محل نے اور بڑودہ کے امام مولانا فخرالدین صاحب نے چاند ہونے کا اعلان کیا،اس پر روزہ رکھا گیا ۔آیا کہ روزہ ماہ رمضان کے روزہ میں شمار کیا گیا یا مکروہ تحریمی میں۔علاوہ بریں اس اعلان پر مسلمانان ٹیٹی اگڑھ نے بکثرت روزہ رکھا تھا لیکن تین شخصوں نے اس روزہ کو حرام قرار دیکر لوگوں سے افطار کرادیا۔اس روزہ کی قضاء شرعا لازم ہے یا نہیں؟اوران تین شخصوں کے لئے شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے والسلام۔امیرالحق پائے گڑھ۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

۲۹ شعبان بروز دوشنبہ کو جہاں بوجہ ابر کے رویت ہلال نہیں ہوئی اور کسی شہر سے ایسی خبر موصول ہوئی جو بہ تواتر ہو،یا بطرق موجب ہو،یا وہاں کی شہادت گزرے تو ان پر بھی وہی حکم لازم ہے۔
شامی میں ذخیرہ سے ناقل" الصحیح من مذهب اصحابنا ان الخبر اذا استفاض وتحقق فيما بين اهل البلدالاخرى يلزمهم حكم هذا البلدة"
اورمجھے تو دوشنبہ کی رویت بشہادت شرعی ثابت ہوئی تو سہ شنبہ کاروزہ ضروری ہوا۔"
فیلزم اهل المشرق برؤية اهل المغرب اذاثبت عند هم رؤية اولئك بطريق موجب"
توجن لوگوں نے شنبہ کاروزہ رکھ لیا ان کے ذمہ پر کچھ مطالبہ نہیں۔اورجنہوں نے نہیں رکھا یا رکھ کرافطار کرلیا ان پر اس روزہ کی قضاء واجب۔اورجن لوگوں نے افطار کرادیا اگر اس بنا پر کہ دوشنبہ کی بنا محض ریڈیو کی خبر پر ہے اور ریڈیو یا تار کی خبروں سے شرعی رویت ثابت نہیں ہوتی تو انکا یہ فعل شرعا حسن

محمود ہے،اوروہ مثاب وماجور ہوئے،اوراگرانکا یہ فعل شہادت شرعی گزر جانے یا رویت بطرق موجب ثابت ہوجانے کے بعد عمل نہیں آیا تو ان کی یہ جرأت ودلیری قابل ملامت اور لائق مذمت ہے اور وہ لوگ سخت مجرم وگنہگار ہوئے؛واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبدمحمداجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۷۸)

کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ ذیل میں کہ
ریڈیو،تار،خط،ٹیلیفون کو چاند دیکھنے کے لئے کیوں ناجائز قرار دیا؟آخر دوسرے کام بھی ان کے ذریعہ دن رات ہوتے رہتے ہیں ان پر کیون اعتبار کیا جاتا ہے۔اس کی نفی کی کیا دلیل ہے؟اوراگر ریڈیو وغیرہ کی خبر پر عمل کیا جائے تو کیا نقص واقع ہوتا ہے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ایک مقام کی رویت ھلال دوسرے مقام کے لئے صرف شہادت علی الرویت یا شہادت علی القضایا استفاضہ سے ثابت ہوسکتی ہے جوعندالفقہاء معتبر ومقبول اورطریق موجب ہے۔اوران کے علاوہ تار۔ٹیلیفون۔لاؤڈسپیکر۔ریڈیو۔وائرلیس۔خط۔افواہ۔اخباری خبریں۔جنتریاں۔قیاسات۔نہ شہادت کا افادہ کریں نہ استفاضہ کا بلکہ ان سے صرف خبروحکایت حاصل ہوتی جو شرعاً بھی غیر معتبر نامقبول ہے اور قانوناً بھی اس سے شہادت ثابت نہیں ہوتی ہے،ورنہ کچہریوں میں انہیں آلات کے ذریعہ سے دوسرے شہروں سے شہادت حاصل کرلی جاتی اور بلا شاہد کے حاضر کئے ہوئے انہیں آلات پر اعتماد کرکے کسی مقدمے کی ڈگری کردی جاتی۔لھذاان آلات کی خبروں کا شرعا قانونا کسی طرح اعتبار نہیں۔میں نے اس مبحث میں ایک مبسوط ومفصل رسالہ لکھ دیا ہے جس میں ایک ایک کی پوری پوری بحث اوراس میں بکثرت عبارات منقول ہیں اس کی طرف رجوع کیا جائے۔واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبدمحمداجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۷۹)

کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

بذریعہ اخبار ۲۹ رذی القعدہ یوم جمعہ کورویت ہلال کی خبر پاکرمتولی جامع مسجد ٹاٹ شاہ نے قبل نماز جمعہ اعلان کیا اور تمام مسلمانوں کے مشورہ سے متفقہ طور پر طے کیا کہ مفتی صاحب فیض آباد قصبہ ٹانڈہ جاکر چاند کی تحقیق فرمائیں، چنانچہ امام صاحب تشریف لے گئے اور مفتی صاحب ٹانڈہ ضلع فیض آباد سے ملکر ۲۹ ذیقعدہ یوم جمعہ کورویت ہلال کے متعلق تحریر حاصل کی اور چاند دیکھنے والوں سے مزید خود شہادت لی اور فیض آباد آکرفتوی دے دیا کہ عید دوشنبہ کو ہے اور اعلان کرادیا اب دریافت طلب یہ ہے۔

(۱) مفتی صاحب کا بغرض تحقیق رویت ہلال جانا از روئے شریعت جائز ہے یا ممنوع؟۔

(۲) کیا مفتی کے ساتھ ایک شاہد کا ہونا ضروری تھا اور مفتی کے حیثیت مثل شاہد کے تھی اس لئے دوسرے شاہد کی ضرورت تھی؟۔

(۳) جبکہ مفتی صاحب اپنے شہر کے مفتی ہیں اور شہر میں نہ کوئی دوسرا مفتی ہے نہ عالم۔ اگر ہے تو بدعقیدہ غیر متشرع اور مفتی صاحب کو دوسرے مفتی یا قاضی کے سامنے شہادت نہیں دینی تھی۔ بلکہ ثبوت شرعی لیکر خودفتوی دینا تھا ایسی صورت میں بھی شاہد کی ضرورت تھی، تو مفتی اور شاہد کیا عوام کے سامنے شہادت دیکرفتوی حاصل کرتے؟۔

(۴) مفتی کے لئے کیا شرائط ہیں اور مفتی کیسے بنتا ہے؟ کیا ہر عالم صاحب سند جو مسائل فقہ سے واقفیت رکھتا ہو مفتی ہوسکتا ہے؟۔

(۵) کچھ لوگوں نے ایک انجمن قائم کی ہے جس کا نصب العین یہ ہے کہ کسی کو برا نہ کہو۔ اس کا نام سیرۃ النبی رکھا ہے۔ اسکا صدر ایک ایسے مولوی کو بنایا ہے جو وہابیوں دیوبندیوں کے عقائد کفریہ سے واقف ہونے کے باوجود کہتا ہے میں ان لوگوں کو کافر نہیں کہہ سکتا۔ میرے اساتذہ ان لوگوں کو مسلمان مانتے ہیں۔ میں بھی ان کی اتباع میں دیوبندی مولویوں کو مسلمان ہی کہوں گا۔ بلکہ اس مولوی کے اساتذہ اشرفعلی تھانوی کے انتقال پر جلسہ فاتحہ وتعزیت منعقد کیا اس کے لئے ایصال ثواب کیا اس کے دینی خدمتوں کی تعریف کی اور کہا کہ اگر چہ اب مولوی اشرفعلی ہم میں موجود نہیں مگر ان کی تصنیفات اب بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ صدر مذکور دیوبندیوں سے میل جول رکھتا ہے بلکہ ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہے۔ ان سے مسائل شرعیہ دریافت کرتا ہے۔ اس انجمن کے ممبران شریعت کے پابند نہیں ہیں۔ خود

صدر انجمن باوجود مولوی ہونے کے حد شرعی سے کم داڑھی چھوٹی چھوٹی کتراتا ہے۔ نماز کا پابند نہیں ہے۔ بحکم شریعت مطہرہ انجمن مذکور میں شریک ہونا ممبر بننا اس کی امداد کرنا چندہ دینا کیسا ہے؟۔

المستفتی۔ سید التجا حسین عرف لڈن فیض آباد

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) ہمارے ملک میں مفتی شہر قاضی شرع کی طرح ہے۔ کما حققنا فی فتاونا۔ تو خود مفتی شہر کا دوسرے شہر میں بغرض تحقیق رویت ہلال جانا خلاف منصب اور غیر مناسب اور ممنوع ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: ان فی زماننا القاضی لایذھب بنفسہ۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۲) یہ مفتی صاحب دوسرے مقام پر پہنچ کر یا تو وہاں کے مفتی سے گفتگو کر کے محض رویت ہلال کی خبر لیکر واپس ہوں گے تو خبر سے یہاں کے لئے رویت ہلال نہیں ہوتی۔

ردالمحتار میں ہے: اذا اخبر ان اہل بلدۃ کذا راوہ لانہ حکایۃ (فما ثبتت الرویۃ بطریق موجب)

اور اگر وہاں کے مفتی کی تحریر لے کر آئے تو ظاہر ہے کہ اس تحریر میں شرائط کتاب القاضی الی القاضی مفقود ہیں۔

اس تحریر سے یہاں کیلئے رویت ثابت نہ ہوگی۔ ھدایہ میں ہے:

و لا یقبل الکتاب الا بشہادۃ رجلین او رجل و امرتین لان الکتاب یشبہ الکتاب فلا یثبت الا بحجۃ تامۃ و ھذا لانہ ملزم فلا بد من الحجۃ ۔

یا شاہدین سے شہادت کی تکمیل وتوکیل کے بعد یہ مفتی بہ شاہد علی الشاہد قرار پائے تو پھر دوسرے شاہد کی ضرورت اور باقی رہے گی اور نصاب شہادت پورا نہیں ہوا۔

لہٰذا اس صورت میں بھی رویت ثابت نہیں ہوئی۔ ردالمحتار میں ہے:

و شرط للفطر مع العلۃ و العدالۃ نصاب الشہادۃ و لفظ اشہد و ھلال الاضحی و بقیۃ الاشہر التسعۃ کالفطر علی المذھب ۔

مختصرا تو ان ہر سہ صور میں رویت ہلال ثابت نہ ہوسکی واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۳) جب صرف قاضی یا مفتی ہی نے خود چاند دیکھا تو یہ نہ عیدگاہ نماز کیلئے جاسکتا ہے اور نہ

لوگوں کو حکم دے سکتا ہے۔

عالمگیری میں ہے: و لو رای الامام و حدہ او القاضی و حدہ ھلال شوال لا یخرج الی المصلیٰ و لا یامر الناس بالخروج ولا لفطر لا سرا و لا جھرا کذا فی السراج ۔

تو جب خود مفتی چاند دیکھ کر بھی رویت ہلال کا حکم نہیں کر سکتا تو صورت مسئولہ میں کس طرح رویت کا حکم دے سکتا ہے۔ بلکہ مفتی صاحب کیلئے مناسب یہ تھا کہ خود تو تشریف نہ لیجاتے اور دو شاہدین عادلین کو وہاں بھیجتے جو وہاں کے مفتی صاحب سے کتاب القاضی الی القاضی حاصل کرتے اور اس تحریر کو یہاں کے مفتی صاحب کے سامنے پیش کر کے اس پر شہادت دیتے۔ یا اصل شاہدوں سے شہادت کی تکمیل وتوکیل کے بعد شاہد علی الشاہد بلکہ یہاں آکر ان مفتی صاحب کے روبرو شہادت دیتے پھر یہ مفتی صاحب رویت ھلال کا حکم دیتے۔ کما فصلناہ فی رسالتنا اجمل المقال لعلاف رویۃ الھلال۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۴) مفتی کے شرائط وآداب ردالمختار، عالمگیری، فتاویٰ سراجیہ وغیرہا میں یہ ہیں۔ مسلمان ہونا، بالغ ہونا، عاقل ہونا، عادل ہونا، عالم ہونا، مذہب امام کا حافظ ہونا، اپنے اہل زمانہ سے واقف ہونا، اصول وقواعد امام سے واقف ہونا، اقوال فقہا پر مطلع ہونا، بیدار مغز وہوشیار ہونا، بردبار ہونا، خلیق ہونا، خندہ رو ہونا، نرم مزاج ہونا، بوقت فتویٰ سخت غضبناک یا غمگین ومسرور نہ ہونا، فتاویٰ پر اجرت نہ لینا، اگر اپنی خطا پر مطلع ہوجائے تو رجوع کر لینا، جواب میں بلاوجہ تساہل نہ کرنا، خوش لباس ہونا، راہ میں چلتے ہوئے فتویٰ نہ دینا، مستفتیان میں اغنیا کو فقراء پر ترجیح نہ دینا، فتویٰ کی عزت کرنا، جواب کے آخر میں واللہ تعالیٰ اعلم لکھنا، اور فتویٰ کا کلام بلا سمجھے نہیں آتا، محض سند حاصل کر لینے یا مسائل سے واقفیت پیدا کر لینے سے مفتی نہیں ہوجاتا اور نہ فاسق مفتی ہوسکتا، اور نہ اس کے فتوے پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

درمختار میں ہے: و الفاسق لا یصلح مفتیا ۔

ردالمختار میں ہے: و الحاصل انہ لا یعتمد علی فتوی المفتی الفاسق مطلقا ۔

تو پھر مرتد وضال بدرجہ اولیٰ نہ مفتی ہوسکتا ہے نہ اس کا فتویٰ قابل اعتماد ہوسکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۵) اگر اس انجمن کا یہ ناپاک نصب العین ہے تو یہ نہایت گمراہ کن اور سخت کفریہ انجمن ہے اور

پھر اس پر مزید فریب یہ ہے کہ اسکا نام سیرۃ النبی رکھا ہے۔ اگر اس گمراہی وضلالت کا نام سیرت ہے تو نہ یہ قرآن کریم کے نازل ہونے کا کوئی فائدہ باقی رہا اور نہ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کارآمد رہی۔ کہ قرآن کریم اسی لئے نازل ہوا ہے کہ کفر واسلام میں فرق کرے۔ حق وباطل میں امتیاز پیدا کرے۔ حرام وحلال میں تمیز سکھائے، مسلمان وکافر کے فرق کو بتائے، نیک وبد کی معرفت کرائے، نبی کریم ﷺ کی بعثت شریفہ اسی کی تکمیل کیلئے ہے۔ حضور کی سیرت وخلق بالکل قران کریم کے موافق ہے۔

قرآن کریم فرماتا ہے: ما کان اللہ لیذر المومنین علی ما انتم علیہ حتی یمیز الخبیث من الطیب ۔ (سورہ آل عمران ۷۔ ع ۱۸)

اللہ مسلمانوں کو اس حال پر چھوڑنے کا نہیں جس پر تم ہو جب تک جدا نہ کردے گندے خبیث کو طیب ستھرے سے۔

یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی۔ تو آیت میں منافق کو خبیث فرمایا جو بظاہر کلمہ گو تھے اور نماز پڑھتے تھے اور جہاد کرتے تھے اور مومن کو طیب پاک فرمایا اور مومن وگمراہ میں امتیاز کرنا خلق الٰہی ثابت ہوا۔

اور حدیث شریف میں ہے: تخلقوا باخلاق اللہ ۔ اور حضور نبی کریم ﷺ جو کہ خلق الٰہی پر پیدا کئے گئے ہیں، چنانچہ حضور نے گمراہوں کو اتنا ممتاز فرمایا۔

حدیث میں ہے: الخوارج کلاب اھل النار ۔

دوسری حدیث میں ہے: اترعون عن ذکر الفاجر ان تذکروہ متی یعرفہ الناس فاذکروہ یعرفہ الناس ۔

یعنی کیا فاجر کو برا کہنے سے پرہیز کرتے ہو۔ لوگ اسے کب پہچانیں گے، فاجر کی برائی کا ذکر کرو۔

تو یہ سیرت النبی ہے کہ فاسق وفاجر کو برا کہا جائے اور یہ انجمن والے فاسق کا تو ذکر کیا گمراہ مرتد کو برا کہنے سے پرہیز کرتے ہیں تو یہ سیرۃ النبی ﷺ کے کتنے شدید دشمن اور مخالف ٹھہرے۔ پھر لوگوں کو محض فریب دینے کیلئے اس انجمن کا نام سیرۃ النبی رکھتے ہیں، اور یہ اس انجمن میں مکر وکید اور دجل وفریب ہونا بھی چاہئے کہ جب اس کا صدر وہ ہے جو عقائد کفریہ کو ایمان جانتا ہے۔ مرتدین کو مسلمان کہتا ہے۔ گمراہ کن کتابوں کے مشعل ہدایت بتاتا ہے۔ بدینیوں سے میل جول رکھتا ہے، ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہے۔ انہیں عالم دین اعتقاد کرتا ہے۔ تو یہ ضرور پکا وہابی دیوبندی ہے۔ اور مولوی اپنے آپ کو کہلواتا ہے

اوراس نے یہ مسئلہ نہ دیکھا کہ الرضا بالکفر کفر ۔

لہٰذا اہل سنت و جماعت کا اس انجمن میں شریک ہونا، اس کا ممبر بننا، اسمیں چندہ دینا، اس کی کسی طرح کی امداد کرنا بلاشک اعانت علی المعصیت ہے اور حرام وممنوع ہے کہ حدیث شریف میں ہے: ایاکم و ایاھم لا یضلونکم و لا یفتنونکم ۔ اور دوسری حدیث میں ہے: و لا تجالسوھم ۔ یعنی تم ایسے گمراہوں سے بچو۔ انہیں اپنے آپ سے بچاؤ کہ کہیں تمہیں گمراہ نہ کردیں اور فتنہ میں نہ ڈالدیں، انکے ساتھ نہ بیٹھو۔ یہ تمام احادیث سیوطی کی جامع صغیر میں ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۔

کتبہ ۷ر جمادی الاخریٰ ۱۳۷۲ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۸۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں
عیدالفطر کے چاند کی خبر ریڈیو سے جائز ہے یا نہیں بدلیل بیان فرمائیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

عیدالفطر کے لئے انتیس کا چاند رویت یا شہادت شرعی کی صور یا استفاضہ کی صور یعنی کل چھ طریق سے ثابت ہوتا ہے ان طریق کے علاوہ بیس طریق اور ہیں۔ حکایت۔ خبر۔ اخبار۔ جنتری۔ خط۔ تار۔ ریڈیو۔ ٹیلیفون۔ وائرلیس۔ لاؤڈاسپیکر۔ ٹیلی ویژن۔ وقیاس وغیرہ سے ہرگز رویت ہلال ثابت نہیں ہوسکتا ہے۔ اس کی پوری تفصیل معہ دلائل وحوالجات کے میرے مطبوعہ رسالہ ''اجمل المقال لعارف رویۃ ہلال'' میں ہے جس کو تفصیلی بیان دیکھنا ہو وہ اس رسالہ کا مطالعہ کرکے دلائل پر مطلع ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۸۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں کہ

ہمارے شہر میں شعبان المعظم کی ۲۹ رتاریخ کو آسمان ابرآلود ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہیں آیا ۔لیکن دہلی۔ پٹنہ۔ الہ آباد۔ حیدرآباد۔ وغیرہ کے ریڈیو اسٹیشنوں سے وہاں سے چاند دیکھائی دینے کی خبر نشر کی گئی جسے یہاں بذریعہ ریڈیو سنا گیا۔ ہمارے صوبہ اڑیسہ اور کلکتہ وغیرہ سے کوئی خبر رویت ہلال نہیں ملی ۔

(۱) ایسی حالت میں اسی رات کو تراویح پڑھنا اور اسکی صبح کو روزہ رکھنا کیسا ہے۔

(۲) یہ روزہ شعبان کی نفل روزے کی نیت سے رکھا گیا تو کیسا ہے؟۔

(۳) اور رمضان المبارک کی نیت سے روزہ رکھنا کیسا ہے؟۔

(۴) صورت مذکورہ بالا میں رمضان المبارک کی نیت سے روزہ رکھنے والا کیسا ہے؟۔

(۵) اور نفل کی نیت سے روزہ رکھنے والا کیسا ہے؟۔

(۶) کچھ لوگوں نے ۔۲۹ رشعبان کو ریڈیو کی خبر تسلیم کر کے اسی رات میں تراویح پڑھنا اور دن کو روزہ رکھنا یہ درست ہے یا نہیں؟ ایسے لوگوں کو کیا کہا جائے ۔

(۷) کچھ لوگ اعلان کرتے ہیں کہ چاند نظر نہیں آیا۔ اور نہ چاند کی شہادت ہی ہوئی ۔صرف ریڈیو کی خبر پر شریعت مطہرہ نے عمل کرنے کو منع فرمایا ہے۔ اس لئے دوسرے روز تراویح پڑھا اور صبح روزہ رکھا یہ درست ہے یا نہیں؟۔

(۸) ایک شہر کا یہ دستور عرصہ سے تھا۔ کہ جب کسی وجہ سے چاند نہیں دکھائی دیا لوگ تار یا ریڈیو کی خبر سے رمضان شریف کی تراویح اور عید کی نماز ادا کیا کرتے تھے۔ اور اس دور میں جس قدر علمائے کرام بھی تشریف لائے کسی نے اس کو نہیں روکا۔ اور نہ کسی نے اسکے خلاف کوئی آواز اٹھائی۔ اب ایک جماعت ہے کہ چاند خود اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر یا عین شہادت بغیر رمضان یا عید نہیں مناتی۔ لہٰذا اس جماعت کا یہ فعل درست ہے؟۔ یا جو لوگ ریڈیو وغیرہ کی خبر پر رمضان یا عید مناتے ہیں یہ درست ہے؟۔
اسی وجہ سے ایک مرتبہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں ایک روز عید منائی گئی ۔ اور اس شہر میں دوسرے روز منائی گئی۔ یعنی پورے تیس روزے کے بعد نماز عید ادا کی گئی، اس سے بعض لوگوں میں ایک ہیجان برپا ہے۔ کہ چاند ہم نہ دیکھیں تو کیا۔ قریب قریب سارے ہندوستان مین ایک دن عید منائی جارہی ہے لیکن ریڈیو کی بات نہ تسلیم کرنے پر ہم لوگ دوسرے دن عید منائیں یہ کہاں تک درست ہے۔

لہذا جب اکثر شہروں میں عید منائی جارہی ہے اور ہمیں ریڈیو سے صحیح خبر مل رہی ہے تو ہم کو بھی ریڈیو کی خبر صحیح تسلیم کر کے سب بھائیوں کے ساتھ ایک ہی تاریخ میں عید کی خوشی منانا چاہیے یا نہیں؟۔
اور ایسے لوگ جو ریڈیو کی خبر کو تسلیم کرتے ہیں اور دوسروں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ بھی اس خبر کو مان لیں ایسے لوگوں کے لئے شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟۔

(۹) جو لوگ صرف چاند کی رویت یا عین شہادت کے بغیر رمضان یا عید نہیں مناتے ایسے لوگوں کے لئے شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟۔ جواب بحوالہ کتب ونقل عبارت مرحمت فرمائیں فقط والسلام۔

محمد عبد المنان میاں جی کٹک موکا۔ ۶ رمئی ۵۵ء

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) جب وہاں ۲۹ رشعبان کو نہ خود چاند دیکھا گیا نہ بطریقہ موجب کوئی شرعی شہادت دستیاب ہوئی تو انہیں شعبان کے ۳۰ ردن پورے کرنے تھے۔ حدیث شریف میں ہے "فان غم علیکم فاقدروا له ثلثين۔

نہ ۳۰ رشعبان کو روزہ رکھا جاتا ہے نہ اسکی شب میں نماز تراویح پڑھی جائے۔ اور ریڈیو کی خبر کی بنا یہ دونوں کام کرنے غلط اور خلاف شرع ہوئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب:۔

(۲) ایسے یوم شک ۳۰ رشعبان کو بہ نیت نفل روزہ رکھنا عوام کو مکروہ ہے ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۳) جب شرعا رویت ہلال ہی ثابت نہیں ہوسکی تو رمضان کی نیت سے روزہ رکھنا مکروہ وممنوع ہے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۴۔۵) صورت مذکورہ میں بہ نیت فرض رمضان اور بہ نیت نفل روزہ رکھنے والا خطا کار اور مرتکب مکروہ تحریمی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۶) محض ریڈیو کی خبر پر تراویح وروزہ رکھنا نادرست اور ایسے لوگ دین سے بے خبر ہیں واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۷) جن لوگوں نے ریڈیو کی خبر کو معتبر نہیں جانا اور ۳۰ شعبان کو نہ روزہ رکھا نہ اسکی شب میں تراویح پڑھی تو انکا یہ فعل درست ہوا شرع کے موافق ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۸) جو لوگ ریڈیو، تار، ٹیلیفون، خط وغیرہ کی خبروں پر رمضان وعید کرلیا کرتے ہیں وہ خلاف شرع کیا کرتے ہیں، اور وہ جو رویت ہلال یا اسکی شرعی شہادت بطریقہ موجب پر رمضان وعید کا حکم دیتے ہیں وہ شریعت کے موافق کرتے ہیں، شہری رواج اگر خلاف شرع جاری ہوجائے وہ ہرگز ماننے کے قابل نہیں، اور جو لوگ ریڈیو کی خبر پر خود بھی عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی مجبور کرتے ہیں وہ خلاف شرع کرنے پر بہت جری ودلیر ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ ان کی حالت زار پر رحم فرمائے ان کی بات ہرگز ہرگز نہ مانی جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۹) ایسے لوگ شریعت مطہرہ کے ماننے والے احکام خداوندی کا اتباع کرنے والے ہیں، اس دور میں یہ بہت قابل قدر اور لائق پیروی ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۸۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین در بارۂ اس مسئلہ کے کہ
ہماری مسجد میں ایک پیش امام صاحب مبلغ ۲۰ روپیہ ماہوار ہیں اور فصل پر ان کے لئے غلہ بھی کر دیا جاتا ہے جو وہ بخوبی اپنے گھر کی گذر کر لیتے ہیں، ہمارے یہاں قصبہ میں اور ارد گرد بہت سی جگہ نماز عید الاضحیٰ جمعرات کو ہوئی، اور ہم سب قصبہ والوں نے نماز عید الاضحیٰ جمعرات کو پڑھی لیکن صرف ہمارے محلے کے پیش امام صاحب اور چند لوگوں نے جو بہت کم تعداد میں تھے، نماز عید الاضحیٰ بروز جمعہ کو پڑھنے کو کہا، لیکن ہم نے اکثریت زیادہ ہونے اور دوسرے بڑے بڑے شہروں میں نماز عید الاضحیٰ جمعرات کو ہونے کے باعث نماز عید الاضحیٰ دوسرے پیش امام صاحب کو بلا کر جمعرات کو پڑھی اور قربانیاں بھی کیں، جب ہم نے پیش امام صاحب سے نماز عید الاضحیٰ پڑھانے کو کہا تھا تو انہوں نے جواب دیا کہ نماز عید الاضحیٰ جمعہ کی ہے جمعرات کی نہیں ہے، اس لئے جمعرات کو نماز عید الاضحیٰ پڑھانا جائز نہیں۔ اور انہوں نے چند محلّہ کے آدمیوں کی نماز عید الاضحیٰ جمعہ کو پڑھائی، لہذا ایسی صورت میں ان پیش امام صاحب کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں، ۔ جواب سے مطلع کیجئے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

امام مسجد مذکور نے اگر نماز عید الاضحیٰ بروز جمعرات پڑھنے سے اس بنا پر انکار کیا کہ خود قصبہ میں تو انتیس کو رویت ہلال نہ ہوئی ہو اور باہر سے بھی کوئی خبر بطرق موجب شرعی نہ ملی ہو تو عام طور پر اس وقت جو ذرائع خبر ہیں جیسے کسی شہر کی رویت ہلال کی خبر بطور افواہ کے ہو، یا شہرت کے ہو۔ یا اخبار سے وہ خبر ہو۔ یا بذریعہ خط، اور لفافہ کے ہو۔ یا ٹیلی گرام سے ہو، یا ٹیلی فون سے ہو، یا ریڈیو سے ہو، یا وائرلیس سے ہو۔ یا لاؤڈ سپیکر سے ہو یا ٹیلی ویزن سے ہو یا جنتریوں یا قیاسات یا اختراعات کی بنا پر ہو تو یہ تمام ذرائع شرعاً معتبر نہیں تو اس بنا پر امام کا جمعرات کے دن نماز عید الاضحیٰ پڑھانے سے انکار کرنا اور اسکو ناجائز کہنا بالکل صحیح اور موافق شرع کے ہے۔ اور اگر قصبہ میں انتیس کو روہت ہلال ہوگئی تھی۔ چاند کے دیکھنے والے دو شاہدان عدل گواہی دیں۔ یا خود شاہدین نہ ہوں تو دو شاہد علی الشاہد گواہی دیں۔ یا وقت حکم قاضی کے دو گواہان شرعی گواہی دیں۔ یا خط قاضی مع شرائط و گواہان کے آئے۔ یا بطور استفاضہ یعنی کسی شہر سے متعدد جماعتیں آئیں اور بالاتفاق یک زبان یہ کہیں کہ فلاں شہر میں فلاں دن رویت ہلال ہوئی ہے۔ عام طور پر لوگوں کا بیان ہے کہ ہم نے ابھی آنکھ سے چاند دیکھا ہے۔ تو یہ پانچ صورتیں ہیں جن سے دوسرے شہر کی رویت ثابت ہو جاتی ہے۔ تو اگر قصبہ میں ان پانچ صورتوں میں سے کوئی صورت متحقق ہوگئی تھی شرعاً رویت ہلال کا ثبوت پایا گیا تھا اس کے باوجود امام مذکور کا جمعرات کو نماز عید الاضحیٰ پڑھانے سے انکار کرنا غلط تھا اگرچہ نماز عید ۱۱ ذی الحجہ کو بھی پڑھی جاسکتی ہے مگر ۱۰ کو پڑھنا افضل ہے۔ بہر صورت یہ امام جمعہ کے دن نماز عید الاضحیٰ پڑھکر کسی ایسے جرم شرعی کا مرتکب نہیں ہوا جس کی بنا پر اس کے پیچھے نماز پڑھنا درست نہیں ہو جائے۔ لہذا اس امام کے پیچھے نماز ہرگز ترک نہ کی جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۸۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

دہلی میں دہلی کے علماء، روسا کی خواہش پر ایک رویت ہلال کمیٹی تقریباً پچاس سال قبل اس لئے بنی تھی کہ وہ متفقہ طور پر ماہ صیام اور عیدین کے چاند کے متعلق فیصلے کرے چنانچہ یہ کمیٹی ہمیشہ ہر طبقہ کے مشاہیر علماء کرام کی شرکت و اتفاق کے ساتھ فیصلہ کرتی رہی۔ اس سال بدقسمتی سے چند علماء نے علیحدہ ایک نئی کمیٹی بنالی اور ٹیلیفون کی خبر پر چاند ہونے کا فیصلہ کر دیا جس کو قدیم کمیٹی کے صدر اور دیگر علماء نے

نہیں مانا اور عدم رویت کا حکم دیدیا۔ اس پر جدید کمیٹی والوں نے نہایت درجہ مخالفت کی جس سے مسلمانوں میں سخت اختلاف واقع ہو گیا۔ جدید کمیٹی والوں کا اسی پر اصرار ہے کہ اب ریڈیو اور ٹیلیفون کی خبر پر اثبات رویت ہلال ہوا کرے گا اب سوال یہ ہے کہ کیا ان آلات کی خبریں معتبر ہو گئیں۔ آج سے تقریباً تیس پینتس سال قبل ایک رسالہ مسمی التلغراف شائع ہوا تھا اس میں بڑے بڑے علماء (جن میں مولینا مفتی کفایت اللہ صاحب بھی شامل ہیں) نے تار اور خطوط کے غیر معتبر ہونے پر فتوی دیا ہے اور مفتی صاحب ہمیشہ آخیر عمر تک قدیم کمیٹی سے وابستہ رہے۔ اور دنیاوی عدالت والے بھی ان آلات (ریڈیو ٹیلیفون تار) کو غیر معتبر مانتے ہیں اور شہادت کے لئے شاہد کی حاضری ضروری جانتے ہیں تو کیا شرعی شہادت کا معیار دنیاوی شہادت کے معیار سے کم ہے۔ اگرچہ خبریں معتبر ہیں تو اس کو دلائل سے ثابت کیا جائے اور اگر غیر معتبر ہیں تو بتلایا جائے کہ اس صورت میں مسلمانوں کا کیا فرض ہے۔ نئی کمیٹی کے کہنے پر چلیں یا بدستور قدیم پرانے علماء کے فتووں پر عمل کریں۔ بینوا توجروا۔

محمد معین۔ ۲۱۵۶ ریڈ سٹون پلاٹنگ روڈ گران دھلی

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

شریعت نے اثبات رویت ہلال کے لئے صرف چھ طرق موجب معتبر قرار دیئے ہیں۔

پہلا: شہادت علی الرویۃ۔

دوسرا: شہادت علی الشہادۃ۔

تیسرا: شہادت علی القضا۔

چوتھا: شہادت علی خط القاضی۔ تو یہ چاروں صورتیں تو شہادت کے تحت میں داخل ہیں۔ تو ان میں رکن شہادت۔ محل شہادت۔ شرائط شہادت۔ شرائط شاہدان کا لحاظ عموماً ضروری ہے اور خصوصاً ادائے شہادت کے لئے مجلس قضا میں شاہدان کا قاضی کے سامنے حاضر ہونا اور شہادت علی الشہادت کی تحمیل و توکیل کا ہونا اور شہادت علی القضاء میں شاہدان کا مجلس قضا میں بوقت قضا موجود ہونا۔ اور شہادت علی خط القاضی میں قاضی کاتب کا مجلس قضا ہی میں شاہدین کو خط سونپنا۔ اور پہلے انہیں خط پڑھ کر سنانا۔ پھر ان کے سامنے اس خط کو لفافہ میں رکھ کر سربمہر کرنا اور مکتوب الیہ قاضی کا اس خط کو مجلس قضا میں سربمہر دیکھ کر لینا اور شاہدین کا اس طرح شہادت ادا کرنا کہ یہ فلاں بن فلاں قاضی کا خط آپ کے نام ہے ہم نے اس کو

سنا ہمیں اس پر گواہ کیا ہمارے سامنے اس کو لفافہ میں بند کیا اور سر بمہر کیا۔ اس کا یہ مضمون ہے، ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ آلات تار۔ ٹیلیفون۔ لاؤڈ اسپیکر۔ ریڈیو۔ وائرلیس۔ ٹیلیویژن ان چاروں طرق موجب کی اہلیت نہیں رکھتے کہ ان میں نہ تحمل شہادت کی صلاحیت، نہ شرائط شاہدین کی قابلیت۔ تو ان چاروں طرق موجب میں ان آلات کی نا اہلیت ایسی نمایاں ہے جس کو نہ فقط تعلیم یافتہ شخص بلکہ ناخواندہ بھی تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہے۔

پانچواں: طریق موجب یہ ہے کہ کسی شہر سے جماعت کثیرہ پے درپے آئے اور وہ سب باتفاق بیان کریں کہ فلاں شہر میں ہمارے سامنے عام طور پر لوگ بیان کرتے تھے کہ ہم نے چاند دیکھا ہے۔

چھٹا: طریق موجب یہ ہے کہ جس شہر میں قاضی یا مفتی شرع ہو جس کے حکم یا فتوے پر احکام روزہ عیدین نافذ ہوتے ہیں تو اس شہر کی متعدد جماعتیں آئیں اور وہ باتفاق یک زبان یہ کہیں کہ فلاں شہر میں فلاں ماہ کے فلاں دن رویت ہوئی ہے اسی بنا پر فلاں دن پہلا روزہ تھا یا فلاں دن عید کی گئی تو یہ دونوں از قسم شہادت نہیں بلکہ از قسم اخبار ہیں اور خبر بھی وہ ہے جو حد تواتر تک پہونچ گئی ہے کہ اس شہر سے چند جماعتیں آئیں اور انہوں نے باتفاق یہ بیان کیا کہ وہاں رویت ہوئی تو یہ دونوں خبریں خبر استفاضہ کہلاتی ہے جو خبر متواتر کے حکم میں ہے اور یقین کا فائدہ کرتی ہے اور شہادت سے قوی تر ہے اور ظاہر ہے کہ ان آلات سے جس شہر سے جو خبر آتی ہو۔ وہ واحد کے حکم میں ہے اور خبر بھی ایسی جس کے صدق کا ظن غالب تک حاصل نہیں ہوتا کہ تار ٹیلیفون ریڈیو میں کوئی شرعی طور پر ذمہ داری کا اہتمام نہیں۔ آئے دن ان میں خلاف واقعہ اور جھوٹی خبریں آتی رہتی ہیں پھر اگر مثلا ریڈیو سے چند مقامات کے اسٹیشنوں کی خبر متفق ہو جائے تو وہ ظن غالب اور تواتر کا افادہ نہیں کرتی۔

اولا: ریڈیو میں اس قدر خامیاں ہیں کہ وہ اس کی نشر کے شرعا غیر معتبر ہونے کے لئے بہت کافی ہیں۔

ثانیا: ریڈیو سے اگر چہ کسی جماعت علماء کا فیصلہ ہو جب اس کو ایک شخص نشر کرے تو وہ ایک مقام کی خبر واحد ہی تو ہوگی۔

ثالثا: جب اختلاف مطالع کا قول لیا جائے تو چند مقامات کی خبروں کا اتفاق دوسرے مقامات کے لئے کیسے تواتر کا افادہ کریگا۔

رابعا: دو چار مقامات کا اتفاق حد تواتر تک کب پہونچتا ہے تو چند مقامات کی خبر کا اتفاق خبر استفاضہ نہیں جو خبر متواتر کے حکم میں ہو جائے۔

بالجملہ جب ان آلات سے نہ چاروں طرق شہادت متحقق ہو سکے نہ ہر دو طرق خبر استفاضہ قرار پاسکے تو اثبات رویت ہلال کے لئے جو شرعا چھ طرق موجب تھے وہ ان آلات سے حاصل نہ ہو سکے۔ ہاں ان آلات سے اتنی خبر معلوم ہو جاتی ہے کہ فلاں شہر میں چاند دیکھا ہے تو یہ صرف ایک خبر اور حکایت ہے اور شرعا ایسی خبر و حکایت دوسرے شہر میں رویت ہلال ثابت کرنے کے لئے معتبر نہیں۔

ردالمحتار اور طحطاوی میں ہے: اذا اخبر ان اهل بلد كذا راؤه لانه حكاية ۔

تو جب ایک مسلمان عاقل بالغ عادل کی ایسی خبر و حکایت دوسرے شہر کے لئے رویت ہلال ثابت نہیں کرتی تو ان نو ایجاد آلات کی مجہول در مجہول خبر دوسرے شہر کے لئے رویت ہلال کس طرح ثابت کر سکتی ہے۔

الحاصل یہ آلات کسی دلیل شرعی سے ثابت نہ ہو سکے اور جب یہ خود دلیل شرعی نہ ہوئے تو ان سے خلاف اصل دوسرا مہینہ شرعا ثابت نہیں ہو سکتا۔

ہدایہ میں ہے: ان الاصل بقاء الشهر فلا ينقل عنه الا بدليل۔

کون نہیں جانتا ہے کہ جب انتیسویں کو رویت ہلال نہیں ہوئی تو تیسویں تاریخ کو ماہ رواں کا موجود ہونا اصل و قطعی ہے تو جب تک اس کے خلاف دوسرے مہینہ کا ثابت کرنا خلاف اصل بلا دلیل کے ہوا۔ تو ماہ رواں کا باقی ہونا قطعی قرار پایا۔

ہاں ایک بات اور باقی رہی کہ بعض اپنی کم علمی کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ ان آلات سے نہ شہادت کا اثبات ہوتا ہے نہ خبر کو دلیل بنایا جاتا ہے بلکہ ان آلات سے شہادت کا اعلان کیا جاتا ہے۔ تو اس فریب کا ازالہ یوں ہے۔

اولاً: ریڈیو میں جس شہادت کا اعلان کیا جاتا ہے وہ شہادت خود قابل اطمینان اور لائق اعتماد ہو یہی تو محل کلام ہے کہ ہر عالم رکن محل شرائط شہادت پر پورے طور پر واقف نہیں ہوتا۔ اور اگر اس سے بھی قطع نظر کیجئے تو بوقت ادائے شہادت کے الفاظ شہادت کو ملحوظ نہیں رکھا۔ شرائط شاہد کا لحاظ نہیں کرتا کہ ان کی بدعقیدگی اور فسق و بدعملی کا تزکیہ کرتا۔ اور ایک عام بلا یہ ہے کہ ہلال رمضان کے علاوہ اور مہینوں میں مستور الحال کی شہادت پر رویت ہلال کا حکم دیدیتا ہے۔ تو جس شہادت میں اتنی غلطیاں خامیاں بکثرت

ہوتی ہوں تو شہادت شرعا کس طرح معتبر ہوسکتی ہے۔ پھر جب وہ شہادت اور اس کا حکم شرعا غیر معتبر تو اس کا ریڈیو پر اعلان کیسے معتبر اور قابل اطمینان ہوسکتا ہے۔

ثانیاً: اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ علماء نے چاند کی باقاعدہ شہادت لیکر چاند ہونے کا حکم کردیا اور ایک مسلم معتمد متعین ہوکر اس فیصلہ وحکم کی خبر ریڈیو پر نشر کرتا ہے تو یہ اسی طرح ہوا کہ قاضی نے چاند کی باقاعدہ شہادت لیکر چاند ہونے کا حکم دیا اور ایک معتمد مسلمان کو قاصد بنا کر دوسرے شہر میں بھیجا اور اس قاصد نے دوسرے شہر میں قاضی کے حکم کی خبر دی تو اس قاصد کی خبر شرعا معتبر نہیں نہ اس خبر سے دوسرے شہر میں رویت ہلال ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ فتح القدیر میں ہے: الفرق بين رسول القاضى وبين كتابه حيث يقبل رسوله فلان غاية رسوله ان تكون نفسه وقدمنا انه نوى لو ذكر ما فى كتابه لذلك القاضى بنفسه لايقبل وكان القياس فى كتابه كذلك الا انه اجيز باجماع التابعين على خلاف القياس فاقتصر عليه۔ (فتح القدیر کشوری ج۳ ص۲۶۶)

تو جب دوسرے شہر میں قاصد قاضی کی خبر شرعا معتبر نہیں اور اس سے رویت ہلال ثابت نہیں ہوتی تو اس حکم علماء کی ریڈیو پر نشر کرنے والے قاصد کی خبر کس طرح شرعا معتبر ہوگئی اور اس خبر سے دوسرے مقامات کے لئے رویت ہلال کی کیسے تائید ہوگئی۔

ثالثاً: عبارت فتح القدیر سے ثابت ہوگیا کہ قاضی کا اپنے حدود حکومت کے باہر کسی دوسرے مقامات پر جاکر یہ کہنا کہ میں نے فلاں ماہ کی شہادت لیکر ثبوت ہلال کا حکم دیا۔ اس دوسرے مقامات کے لئے معتبر اور مقبول نہیں تو ان علماء کے حکم کا ریڈیو پر کسی مسلم معتمد شخص کے واسطہ سے نشر کرنا یا خود مفتی کا ریڈیو پر آکر کہنا دوسرے مقامات پر رویت ہلال ثابت کرنے کے لئے کس دلیل شرعی سے معتبر ومقبول ہے۔

رابعاً: اسی عبارت سے ظاہر ہوگیا کہ جب ایک علاقہ کے قاضی کے اعلان وخبر رویت ہلال پر اس کے ماتحت علاقوں ومقاموں کے سوا کسی دوسرے علاقہ کے قاضی کے حدود میں عمل کرنا ضروری نہیں تو ایک مقام کے مفتی کے اعلان وخبر حکم رویت ہلال پر کسی دوسرے مقام کے مفتی کے حدود میں عمل کرنا وہ بھی نہ دس بیس شہر بلکہ تمام ہندوستان کے شہروں قصبوں بلکہ تمام پاکستان کے شہروں قصبوں میں کس دلیل سے ضروری قرار دیا۔

خامساً: مکہ مکرمہ میں چاند کی باقاعدہ شہادت لیکر چاند ہونے کا حکم کیا جاتا ہے اور حکومت نجد کے ذریعہ سے معتمد طور پر ریڈیو پر اس حکم کو نشر کیا جاتا ہے تو مکہ مکرمہ کے ریڈیو کا نشر کیا ہوا اعلان کیوں قابل عمل نہیں۔ ہندوستان وپاکستان میں اس اعلان پر عید اضحیٰ کیوں نہیں ہوتی۔ حالانکہ بقول مفتی بہ اختلاف مطالع غیر معتبر ہے۔

سادساً: ریڈیو کی آواز کی معرفت کو مقید قرار دینا شریعت کی مخالفت ہے اکثر کتب فقہ میں یہ تصریح موجود ہے النغمة تشبه النغمة تو کسی کی آواز کی معرفت تعین شخص کے لئے دلیل شرعی نہیں۔

سابعاً: جن شرائط نے ریڈیو کی خبر کو معتبر قرار دیا اگر وہی شرائط تار کے لئے ضروری قرار دیدیئے جائیں تو تار کی خبر رویت ہلال کے لئے کیوں معتبر نہیں۔

ثامناً: قرون ثلثہ میں ایک مقام کی رویت کے صرف اعلان اور خبر پر کسی دور کے مقامات پر اگر عمل کیا گیا ہو تو معتبر ومستند کتاب سے ثابت کیا جائے۔

تاسعاً: جو شرائط کتاب القاضی الی القاضی کے ہیں ظاہر ہے کہ ریڈیو کی خبر میں وہ شرائط موجود نہیں ہے تو ریڈیو کی خبر کس بنا پر خلاف قیاس معتبر ہے۔

عاشراً: صرف ایک مقام کے ریڈیو سے رویت ہلال کا اعلان ہوا اور اکثر اسٹیشنوں سے یہ اعلان ہو کہ یہاں باوجود مطلع صاف ہونے کے رویت ہلال نہیں ہوئی تو اگر ایک مقام کے رویت کے اعلان کو غیر معتبر قرار دیا جاتا ہے تو کیوں جب وہاں علماء باقاعدہ شہادت لیکر حکم رویت کا کرتے ہیں اور معتمد مسلمان نے ریڈیو پر جاکر اس حکم کو نشر کیا ہے بعدہ اگر اس ایک کو معتبر قرار دیا جاتا ہے تو اکثر اسٹیشنوں کا اعلان کس بنا پر نامعتبر ہوگا۔

حاصل بحث یہ ہے کہ ان آلات کے اعلان اور خبر سے رویت ہلال کا ثابت کرنا احکام شرع کے خلاف ہے اور محض اپنی ناقص رائے پر عمل کرنا ہے اور اپنی عقل سے شرع میں دخل دینا ہے اور بحکم حدیث من احدث فى امرنا هذا ماليس منه فهورد۔ کے بدعت اور محدث فی الدین ہے تو اسکے ماننے والے اہل بدعت قرار پائے تو اہل اسلام ان کے قول پر ہرگز ہرگز عمل نہ کریں بلکہ ہر اس کمیٹی کے کہنے پر نہ چلیں جو ان آلات کی خبر پر رویت ہلال ثابت کرے یا جو شرائط شہادت کو مدنظر نہ رکھے یا جو شرائط شاہدین خصوصا ان کے اعتقاد وعملی احوال کا بغیر تزکیہ کئے ہوئے رویت ہلال کا حکم دیدے۔ یا جو بدعقیدہ وبدعمل گواہان کو شہادت کا اہل سمجھ کر اور معتبر

قرار دیکر رویت ہلال ثابت کردے لہذا ایسی کمیٹی کو فیصلہ کرنا شرعا نادرست وحرام ہے جس کو اس اجمالی فتوے کی تفصیل اور ہر چیز پر عبارات دیکھنے کا شوق ہو وہ ہمارے رسالہ ''اجمل المقال لعارف رؤیۃ الہلال'' کا مطالعہ کرے خصوصا طبع دوم کا جس میں ضروری ابحاث اور تحقیقات جدیدہ پیش کی گئیں ہیں۔ اور ہلال کمیٹیوں کی شرعی حیثیت اور ان کی شرمناک غلطیاں دکھائی گئیں ہیں اور یہ طبع اول سے تقریبا ڈیوڑھا ہوگیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۵/ ذیقعدہ ۱۳۷۸

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

رسالہ اجمل المقال لعارف رویۃ الہلال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی جعل للقمر بروجا ومنازلا۔ والصلاۃ والسلام علی من رجع الشمس علی اشارتہ عاجلا۔ وشق القمر باصبعہ اذا صار کاملا۔ وعلیٰ الہ وصحبہ الذین ہم بدور لمن یکون لدینہ مستکملا وعلی الائمۃ والفقہاء الذین ہم نجوم لمن یکون فی الحوادث سائلا۔ وعلی کل من کان الی الدین مائلا۔

امابعد۔ آج اگر مسلمان اپنے دین کو جانتے۔ مذہب کو مانتے۔ عقائد سے واقف ہوتے مسائل سے آگاہ ہوتے۔ دینی تعلیم کا ذوق رکھتے۔ اعمال کا شوق رکھتے مدارس اسلامیہ کو عروج پر پہنچاتے۔ علمائے حق کی خدمت میں بکثرت آتے جاتے۔ توان میں نہ کوئی نیا مذہب ایجاد ہوتا نہ کوئی سلف وخلف کی مخالفت کی جرأت کرتا۔ نہ کوئی مغربی تعلیم کے اثر سے اس قدر دلیر ہوجاتا کہ مسائل دین میں محض اپنی رائے ناقص سے دخل دینے لگتا۔ اور جائز کو ناجائز اور حرام کو حلال ٹھہرالیتا۔ اس وقت یہ جو کچھ مذہب سے آزادی اور دین سے بیزاری پھیلتی چلی جارہی ہے اور ہر جگہ فرقہ بندی اور اختلافات کا سیلاب امنڈتا جارہا ہے۔ یہ سب دین سے ناواقفی اور مذہب سے بے رغبتی کا ثمرہ ہے۔ یہ ایک بلائے عام ہے کہ احکام دین کو نہ خود جانتے ہیں۔ نہ جاننے والوں سے دریافت کرتے ہیں۔ جو اپنے خیال خام اور زعم ناقص میں آجاتا ہے۔ اسی کو حکم شریعت اور مسئلہ دین قرار دیدیتے ہیں۔ یہی ایک رویت ہلال کا مسئلہ ہے۔ اس میں ہر شخص آزاد ہے۔ ہر ایک کی نئی ایجاد ہے۔ خصوصاً عید کے چاند میں ہر کس وناکس اپنے آپ کو مفتی دین اور قاضی شرع سمجھتا ہے۔ اور ہر نامقبول اور نااہل کی خبر پر ثبوت ہلال کا قطعی طور پر حکم دیدیتا ہے۔ باجودیکہ عوام کا تو ذکر ہی کیا بعض خواص کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ وہ نہ شہادت کی صحیح تعریف جانیں۔ نہ تحمل واداکے فرق پہنچانیں۔ نہ انہیں شہادت کے رکن کا علم۔ نہ انہیں نفس شہادت کے شرائط پر اطلاع۔ نہ مشہود بہ کے شرائط کا پتہ۔ نہ انہیں یہ معلوم کہ کن کن شاہدوں کی شہادت معتبر ہے۔ اور کن کن گواہوں کی گواہی نامعتبر ہے۔ نہ انہیں یہ امتیاز حاصل ہے کہ احکام شرع کی بنا یقینیات پر ہے۔ یا ظنیات پر ہے۔ حتی کہ ان کی لاعلمی ہی نہیں بلکہ ان کی دلیری اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ رویت ہلال کے متعلق ادھر تو عوام نے

کچھ ایسے من گڑھت قواعد اور قیاسات بنالئے ہیں جن کی دین میں کوئی اصل نہیں ۔ادھر مغربی ایجادات کے متوالوں نے تار ۔ٹیلی فون ۔لاؤڈ اسپیکر ریڈیو، وائرلیس ،ٹیلیویژن وغیرہ کی خبروں کو رویت ہلال کے لئے مان لیا ہے۔جن کی خبر شرعا غیر مقبول و نامعتبر ہے

بلکہ تعجب ہے کہ چند نام کے مولویوں نے فساق فجار کی نہ صرف شہادتوں بلکہ ان کی حکایات وخبروں پر عید کا حکم دیدینا شروع کردیا ہے۔ یہ ان کی انتہائی جہالت اور لاعلمی ہے اور ان کا فاسق کی شہادت کو معتبر جاننا اور اس پر حکم دیدینا سراسر باطل اور بالکل غلط حکم ہے۔

میرے چند اہل علم احباب کا اصرار تھا کہ اس مسئلہ میں کوئی جامع اور مفصل اور نہایت مدلل رسالہ لکھدیا جائے ۔لیکن میں اپنی عدیم الفرصتی کا عذر کرتا رہا۔اب ریاست جودھپور سے مولوی اشفاق حسین صاحب سلمہ نے چند سوالات بغرض جوابات بھیجے اور بہت زیادہ اصرار کیا کہ ان سوالات کے جوابات میں ایک مبسوط اور جامع رسالہ لکھدیا جائے تا کہ اس کو طبع کرادیا جائے ۔اور اس کا فائدہ عام ہو۔

لہذا میں نے باوجود اپنی عدیم الفرصتی کے چند ضروری امور اس رسالہ میں جمع کردیے ہیں۔اور ان کے سوالات کے جوابات ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس مسئلہ سے متعلق اور جتنے ضروری امور تھے ان سب کو جمع کردیا ہے۔تاکہ اس موضوع میں کسی مزید سوال کی ضرورت ہی پیش نہ آئے اسی بنا پر اس رسالہ کا تاریخی نام ''اجمل المقال لعارف رویۃ الہلال'' رکھدیا ہے۔

اس مسئلہ میں میرے مرشد شریعت وطریقت ۔مجدد دین وملت ۔امام اہل سنت ۔اعلی حضرت مولانا مولوی مفتی الحاج الشاہ احمد رضا خانصاحب قدس سرہ کے دو رسالے میری نظر سے گذرے ایک کا نام ''ازکی الاہلال بابطال ما احدث الناس امر الہلال'' نصف جز کا اور دوسرا ''طرق اثبات ہلال'' جز کا ہے ۔ان میں اس مسئلہ کی نہایت کافی اور بہت نفیس تحقیق ہے لیکن ان میں ان جدید آلات کا حکم اور شرائط شہادت اور اوصاف شاہدین وغیرہ چند ضروری بحثوں کا بیان نہیں تھا۔اگر چہ اہل علم وفہم کے لئے ان میں سب کچھ مذکور تھا اور حقیقت یہ ہے کہ یہ رسالے جن سوالات کے جواب میں ہیں ان میں ان چیزوں کا ذکر ہی نہ تھا۔اور ہو بھی کیسے سکتا تھا۔کہ اس زمانہ میں ان میں کے اکثر وجود ہی میں نہیں آئے تھے۔

لہذا ضرورت لاحق ہوئی کہ ان جدید آلات کے بھی مکمل ومفصل احکام لکھدیے جائیں۔اس رسالے میں میں نے اپنے مرشد برحق کے ہر دو رسالوں کے اقتباسات بھی درج کیے ہیں۔اور عربی

عبارات کو مع قید صفحہ ومطبع کے اس لئے لکھا ہے کہ جو صاحب اصل عبارات کا مطالعہ کرنا چاہیں ۔ وہ بآسانی دیکھ سکیں ۔اور عوام کے لئے ان عبارات کا اردو میں سامنے ترجمہ کردیا۔تا کہ یہ لوگ بھی کلام فقہا پر مطلع ہوجائیں۔مسئلہ کے اظہار سے پہلے چند مقدمات پیش کئے گئے تا کہ ان کے مطالعہ کے بعد یہ مسئلہ کماحقہ سمجھ میں آجائے ۔اور ان کے محفوظ کرلینے کے بعد پھر کوئی ذی فہم اس قسم کی غلطیوں میں مبتلا نہ ہوسکے وباللہ التوفیق۔

خادم المسلمین محمد اجمل غفرلہ سنی حنفی قادری سنبھلی

سوالات

حضرت فقیہ معظم ،وحید الزماں ،مفتی ہند، جناب مولانا مولوی الحاج الشاہ محمد اجمل صاحب دام ظلہ العالی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی ۔عرض خدمت والا میں یہ ہے کہ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام صورت ذیل میں کہ

دور حاضر کی نوایجادات میں ریڈیو، ٹیلیویزن ،ٹیلیفون ،لاؤڈ اسپیکر، وائرلیس وغیرہ ایسی ایجادات ہوئی ہیں جن کے ذریعہ اعلان کرنے میں ایک قسم کی سہولت پیدا ہوگئی ہے جس سے اعلان وخبر دینے میں پہلے کافی وقت صرف ہوتا تھا،اب چند منٹ بلکہ سکنڈ میں وہ کام ہوجاتا ہے،آج جو کچھ بھی ان ایجادات سے دنیوی بلکہ بعض موقع پر دینی اعلان ہوتا ہے اس کو صحیح جانتے ہوئے اس پر عمل کرتے ہیں اور حکومت کا تو سارا نظام ہی اسی پر ہے۔اس لئے امور ذیل دریافت طلب ہیں۔

امر اول ۔حاکم شرع بعد شہادت رویت ہلال کے ریڈیو ۔ٹیلیویزن وغیرہ سے عید وغیرہ کے لئے اعلان کرائے تو کیا اس اعلان پر عمل کرتے ہوئے عید وغیرہ کرسکتے ہیں یا نہیں۔

امر دوم ۔حاکم شرع بعد شہادت رویت ہلال کے اپنے نائب کو بذریعہ ٹیلیفون یا وائرلیس کے حکم دے کہ میں نے رویت ہلال کی شہادت لے لی ہے تم اعلان کرادو کہ کل مثلا عید وغیرہ ہوگی ۔تو کیا نائب ایسے موقع پر اس کام کے لئے ایسے آلہ کے ذریعہ سے اپنے حاکم اعلیٰ کے حکم پر عمل کرسکتا ہے یا نہیں ۔جب کہ وہ اس کی آواز کو بھی پہچانتا ہو اور اس اعلان پر عید مناسکتے ہیں یا نہیں۔

امر سوم ۔کیا ہر شہر کے لئے علیحدہ علیحدہ شہادت کی ضرورت ہے یا ایک جگہ کی شہادت سے چند جگہ عید مناسکتے ہیں جبکہ اعلان ہر جگہ شرعی قوانین کے تحت میں ہو۔

امر چہارم ۔نماز وخطبہ وغیرہ میں برائے رسانیدن صوت تکبیر امام کے قریب لاؤڈ اسپیکر

لگا سکتے ہیں یا نہیں۔ جب کہ اس سے صرف آواز کا مقتدیوں تک پہنچانا منظور ہو جیسا کہ مجالس خیر میں کرتے ہیں۔

امر پنجم۔ ٹیلی ویژن ایک ایسا نو ایجاد آلہ ہے جس کے اندر متکلم کا پورا نقشہ یہاں تک کہ اس کی پوری نقل وحرکت ایسی معلوم ہوتی ہے جیسا کہ وہ یہاں پر ہی کلام کررہا ہے۔ درس وتدریس وغیرہ کا کام بھی اس سے لیا جاتا ہے۔ لہذا اگر ٹیلیویزن سے شہادت ہلال وغیرہ یا اعلان عید وغیرہ شرعی قوانین کے تحت میں کرایا جائے تو اس اعلان یا شہادت پر عمل کرتے ہوئے عید منا سکتے ہیں یا نہیں۔ جب کہ شاہد کے اندر شرعی نقطۂ نظر سے کوئی نقص نہ ہو۔ اگر اس صورت میں بھی شہادت یا اعلان قابل قبول نہ ہو تو پھر شہادت کی شرعی نقطۂ نظر سے کیا تعریف ہے؟۔

امر ششم۔ آیا ایجادات مذکورہ کے ذریعہ جو بھی اعلان ہو وہ شرعا قابل قبول ہے یا نہیں اور بعض میں ہے تو تخصیص کی کیا وجہ ہے؟۔

نوٹ:۔ ٹیلیگرام کے اندر تو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس میں ہاں، کا، نا اور نا، کا، ہاں ہو جاتا ہے۔ مگر آلات مذکورہ میں تو اس قسم کا شک وشبہ ہی نہیں اس میں تو متکلم جو کچھ بھی کہے گا وہی صاف آواز آئے گی۔ بلکہ اس کو دوسرے طریقے سے یوں سمجھا جائے کہ دور تک آواز پہنچانے اور پھیلانے کے آلے ہیں۔ اور صوت جو ایک معین جگہ پر تھی اس کو بہت سی جگہ پر پھیلا دیا یعنی متکلم جس وقت اپنی آواز کو نکالتا ہے تو اس کی آواز کو بذریعہ مشین کے ہوا کی لہر میں پہنچایا جاتا ہے جو لہر کہ ایک سکنڈ میں دنیا کے تین چکر لگاتی ہے۔ لہذا جب شرعی قوانین کے تحت میں ریڈیو، ٹیلیویزن وغیرہ سے اعلان کرایا جائے تو ایسے اعلان وغیرہ کو کیوں نہ معتبر مان لیا جائے۔ نیز بسا اوقات اعلان کرنے میں۔ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال کرتے ہیں اور پھر اس کو ہر طرح سے صحیح جان کر عمل کرتے ہیں تو اس طرح حاکم شرع اپنے انتظام سے ریڈیو وغیرہ سے اعلان کرائے تو اس کو بھی معتبر جان کر عمل کرنا چاہیئے۔ اِس میں اور اُس میں تخصیص کیوں کی جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ لاؤڈ اسپیکر میں ایک معین جگہ تک آواز جاتی ہے۔ اور اس میں ایک وقت میں بہت سی جگہ پہنچ جاتی ہے۔ جواب معہ دلائل کے مرحمت فرمایا جائے۔ بینوا توجروا الی یوم القیامۃ۔

المستفتی عبد المصطفی محمد اشفاق حسین نعیمی اجملی مراد آبادی

مدرس مدرسہ اسلامیہ حنفیہ محلہ خیرادیان جودھپور ۱۹؍ اگست ۱۹۵۰ء

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جوابات سے قبل چند مقدمات پیش کئے جاتے ہیں جن سے جوابات کا سمجھنا آسان ہو جائے۔

مقدمہ اولی۔ احکام شریعت کے ثبوت کے لئے تین حجتیں ہیں۔ علامہ خیر الدین رملی کے فتاوی خیریہ میں ہے۔

حجج الشرع الشریف ثلاث البینۃ والاقرار والنکول۔ خیریہ مصری ج ۱ ص ۲۰۴ شرع شریف کی حجتیں تین ہیں بینہ اور اقرار اور نکول (یعنی مدعی علیہ کا قاضی کے حلف لینے کے بعد انکار یا سکوت کرنا)۔

علامہ محقق شیخ ابن نجیم الاشباہ والنظائر میں فرماتے ہیں: القاضی لا یقضی الا بالحجۃ وھی البینۃ او الاقرار او النکول۔ (الاشباہ معہ حموی کشوری۔ ص ۳۰۱)

قاضی حجت ہی پر حکم دے۔ اور حجت بینہ اور اقرار اور نکول ہے۔

فقیہ النفس حضرت امام قاضی خاں کے فتاوی قاضی خاں میں ہے:

ان القاضی انما یقضی بالحجۃ والحجۃ ھی البینۃ او الاقرار واما الصك لا یصلح حجۃ لان الخط یشبه الخط۔ (فتاوی قاضی خاں مصطفائی ص ۳۴۷)

بیشک قاضی تو حجت ہی پر حکم دیگا اور حجت بینہ اور اقرار ہے لیکن چک تو وہ حجت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی کہ خط خط کے مشابہہ ہو جاتا ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ قاضی کے لئے احکام شرع طے کرنے کے لئے تین حجتیں ہیں۔ ایک اقرار۔ دوسری نکول۔ تیسری بینہ۔

اقرار۔ یعنی کسی دوسرے کا حق اپنے ذمہ پر ثابت کر لینا۔ لہذا جب مقر عاقل بالغ ہو اور بلا جبر واکراہ کے اقرار کرتا ہو تو جس چیز کا مقر نے اقرار کیا ہے قاضی اسی پر حکم دیگا اور وہ مقر پر لازم ہو جائے گی۔

نکول۔ یعنی مجلس قضا میں مدعی علیہ کا بلا کسی وجہ کے قاضی کے تین مرتبہ حلف پیش کرنے پر حلف سے انکار کرنا یا سکوت کرنا۔ تو قاضی مدعی علیہ کے اس انکار یا سکوت پر حکم کردیگا اور اس کے خلاف مدعی

کے حق میں فیصلہ کردیگا۔

بینہ۔یعنی شہادت اور گواہوں سے دعوے کو ثابت کرنا حقوق عباد میں ان تینوں کی ترتیب یہ ہے کہ ہدایہ میں ہے۔

اذا صحت الدعوی سأل القاضی المدعی علیه عنها لینکشف وجه الحکم فان اعترف قضی علیه بها لان الاقرار موجب بنفسه فیامره بالخروج عنه وان انکر سأل المدعی البینة وان احضرها قضی بها وان عجز عن ذلك وطلب یمین خصمه استحلفه علیها واذانکل المدعی علیه عن الیمین قضی علیه بالنکول والزمه ماادعی علیه ملخصا۔ہدایہ مطبوعہ رشیدیہ ج۳ص۱۸۶و۱۸۷

جب دعوی صحیح ہوجائے تو قاضی اس کے متعلق مدعی علیہ سے سوال کرے تاکہ حکم کی وجہ ظاہر ہوجائے پھر اگر وہ اعتراف کرے تو قاضی اس دعوے کی اس پر ڈگری کردے کہ اقرار خود حکم کا سبب ہے تو قاضی اسے اس سے خارج ہونے کا حکم کرے اور اگر مدعی علیہ انکار کرے تو قاضی مدعی سے بینہ طلب کرے اگر وہ بینہ پیش کردیے تو اس پر حکم دیدے اور اگر مدعی بینہ سے عاجز ہو تو مدعی علیہ سے اس پر قسم پیش کرے اور جب مدعی علیہ قسم سے انکار کرے تو قاضی اس انکار پر حکم دے اور جو دعوے ہو اس کو لازم کردے۔

تو قاضی انہیں تین حجتوں کی بناء پر حکم کیا کرتا ہے۔ہاں حقوق اللہ میں زیادہ بینہ پر حکم ہوتا ہے۔
تینوں میں فرق یہ ہے کہ اقرار ونکول قاصرہ ہیں کہ اقرار مقر کے لئے اور نکول منکر کے لئے تو حجت ہے لیکن یہ دونوں اوروں کے لئے نہ موجب نہ ملزم۔علامہ برہان الدین مرغینانی اقرار کے متعلق فرماتے ہیں۔

ہدایہ میں ہے:وهو "الاقرار" حجة قاصرة لقصور ولایة المقرعن غیره فیقتصر علیه
(ہدایہ مطبوعہ رشیدیہ ج۳ص۲۱۵)

اقرار حجت قاصرہ ہے کہ مقر کی اپنے غیر پر قاصر ولایت ہے تو اقرار کا حکم صرف مقر ہی کے حق میں ہے۔علامہ ابن عابدین نکول کے متعلق ردالمحتار میں فرماتے ہیں:

النکول اقرار وهو حجة قاصرة بخلاف البینة۔(ردالمحتار ج۴ص۴۴۲)
نکول بھی اقرار ہے اور حجت قاصرہ ہے بخلاف بینہ کے"کہ وہ حجت تامہ ہے"۔

تو اقرار ونکول ہر دو کا حجت قاصرہ ہونا ثابت ہوا۔پھر نکول بھی حقیقۃً اقرار ہی ہے۔
ہدایہ میں ہے:النکول اقرار لانه یدل علی کونه کاذبا فی الانکار فکان اقرارا او بدلا عنه۔ (ہدایہ مطبوعہ رشیدیہ ج۳ص۱۸۸)

نکول اس لئے اقرار ہے کہ وہ انکار میں اس کے کاذب ہونے پر دلالت کرتا ہے تو نکول یا تو اقرار ہوا یا اس کا بدل۔

اسی بناء پر امام فقیہ النفس نے شرع کی حجتیں دو قرار دی ہیں۔کہ نکول بھی اقرار ہی ہے۔لہذا حجت کاملہ ان تینوں حجتوں میں صرف بینہ ہے۔تو احکام شرع اکثر وبیشتر اسی بینہ سے ثابت کئے جاتے ہیں۔اور قاضی بھی زیادہ فیصلے اسی بینہ پر صادر کرتا ہے۔بالجملہ احکام شریعت کے ثابت ہونے کی صرف یہی تین حجتیں ہیں۔اب ان کے سوا کسی اور چیز کو محض اپنی رائے سے حجت قرار دینا غلط اور باطل ہے۔اور دین میں تصرف کرنا ہے۔

مقدمہ ثانیہ۔مقدمہ اولی میں یہ چیز ثابت ہو چکی کہ اکثر احکام شرع کی بنا اسی بینہ اور شہادت پر ہے۔تو شہادت کے رکن وشرائط کا سمجھنا بھی نہایت ضروری ہوا۔لہذا رکن شہادت لفظ اشهد ہے۔فتاوی عالمگیری میں ہے:اما رکنها فلفظ اشهد بمعنی الخبر دون القسم۔
(عالمگیری مجیدی کانپور ج۳ص۲۰۲)

شہادت کا رکن لفظ اشہد ہے یعنی میں شہادت دیتا ہوں جو خبر کے معنی میں ہے نہ کہ قسم کے معنی میں۔حضرت امام اجل ابوالحسن قدوری مختصر قدوری میں فرماتے ہیں:فان لم یذکر الشاهد لفظ الشهادة وقال اعلم او اتیقن لم تقبل شهادته۔ (قدوری مجیدی ص۲۷۷)

اگر گواہ نے شہادت کا لفظ ذکر نہیں کیا اور یہ کہا کہ میں جانتا ہوں یا یقین کرتا ہوں تو اس کی شہادت مقبول نہیں۔

محل شہادت۔یعنی شہادت کا محل اور مکان قاضی کی مجلس ہے۔

علامہ ابن عابدین ردالمحتار میں فرماتے ہیں:قوله شرائط مکانها واحدای مجلس القضاء۔
(ردالمحتار مصری ج۴ص۳۸۵)

شہادت کے مکان کی شرط صرف ایک مجلس قضا ہے۔

لہذا قاضی کی مجلس شہادت کے ادا کرنے کے لئے شرط ہے۔اسی طرح مفتی شہر کی مجلس افتا

شہادت ادا کرنے کے لئے شرط ہے۔

تحمل شہادت۔ یعنی گواہ بننے کے لئے تین شرطیں ہیں ۔(۱) عاقل ہونا۔(۲) بینا ہونا، (۳) جس چیز کی گواہی دیجائے گی اس کا معائنہ کرنا۔

درمختار میں ہے: شرائط التحمل ثلثة العقل الكامل وقت التحمل والبصر ومعاينة المشهود به ۔ (ردالمحتار مصری ج۴ ص۳۸۵)

تحمل شہادت کی تین شرطیں ہیں۔ بوقت تحمل عقل کامل ہونا۔ بینا ہونا۔ جس کی گواہی دی جائے اس کا معائنہ کرنا۔

شرائط شہادت۔ یعنی نفس شہادت کے لئے تین شرائط ہیں۔(۱) دعوی کا ہونا۔(۲) اور جن چیزوں پر مرد بھی مطلع ہوتے ہیں ان میں دو مرد یا ایک مرد دو عورتوں کے عدد کا ملحوظ رکھنا۔(۳) ہر دو گواہوں کا بیان میں متفق ہونا۔

عالمگیری میں اور ردالمحتار میں ہے: منها مايرجع الى نفس الشهادة وهى الدعوى والعدد فى الشهادة فيما يطلع عليه الرجال واتفاق الشاهدين ملخصا۔

(عالمگیری مجیدی ج۳ ص۲۰۲ و کذا فی الشامی)

شرائط شہادت سے جو نفس شہادت کی طرف راجع ہوں۔ وہ دعوی کا ہونا۔ جس پر مرد مطلع ہو سکیں۔ شہادت میں عدد کا ملحوظ ہونا۔ ہر دو گواہوں کا متفق ہونا۔

شرائط مشہود بہ۔ یعنی جس کے ساتھ شہادت دی جائے گی۔ اس کی سات شرطیں ہیں۔

ردالمحتار میں ہے: الاسلام ان كان المشهود عليه مسلما والذكورة فى الشهادة فى الحد والقصاص وتقدم الدعوى فيما كان من حقوق العباد وموافقتها للدعوى وقيام الرائحة فى الشهادة على شرب الخمر ولم يكن سكران لالبعد مسافة والاصالة فى الشهادة فى الحدود والقصاص وتعذر حضور الاصل فى الشهادة على الشهادة كذا فى البحر۔

(ردالمحتار مصری ج۴ ص۳۸۵)

جس کے خلاف شہادت ہو اگر وہ مسلمان ہے تو اس کا مسلمان ہونا حدود وقصاص کی شہادت میں مرد ہونا حقوق عباد میں جس کی شہادت دینا چاہتا ہے اس سے پہلے دعوی ہو جانا شہادت کا دعوی کے موافق ہونا شراب پینے کی شہادت میں جب وہ بیہوش نہ ہوا اور دور کی مسافت نہ ہو تو بو کا موجود

ہونا۔ حدود وقصاص کی شہادت علی الشہادۃ میں گواہان اصل کا شہادت دینا۔ شہادت علی الشہادت میں گواہان اصل کی حاضری کا دشوار ہونا۔

شرائط شاہدین۔ یعنی ادائے شہادت میں گواہوں کے لئے دس شرائط ہیں۔

ردالمحتار میں ہے: فهى الحرية والبصر والنطق والعدالة لكن هى شرط وجوب القبول على القاضى لاشرط جوازه وان لا يكون محدودا فى قذف وان لايجر الشاهد الى نفسه مغنما ولايدفع عن نفسه مغرما فلاتقبل شهادة الفرع لاصله وعكسه واحد الزوجين للاخر وان لا يكون خصما فلاتقبل شهادة الوصى لليتيم والوكيل لموكله وان يكون عالما بالمشهود به وقت الاداء ذاكرا له۔ (ردالمحتار مصری ج۴ ص۳۸۵)

شرائط شاہدین یہ ہیں۔ آزاد ہونا۔ بینا ہونا۔ بولنے والا ہونا۔ عادل ہونا۔ لیکن یہ شرائط وجوب قبول علی القاضی کے ہیں۔ نہ کہ جواز کے شرائط۔ اور اس کا تہمت کی حد مارا ہوا نہ ہونا۔ اور گواہ میں اپنے لئے کوئی نفع یا اپنے اوپر سے دفع ضرر مقصود نہ ہونا۔ تو فرع کی شہادت اصل کے لئے اور اصل کی فرع کے لئے اور زن وشوہر میں ایک کی دوسرے کے لئے مقبول نہیں۔ اور گواہ کا فریق مقدمہ نہ ہونا۔ پھر وصی کی شہادت یتیم کے لئے اور وکیل کی موکل کے لئے مقبول نہیں اور جس چیز کی شہادت دیتا ہو بوقت ادا اس کو جاننا اور اس کا یاد ہونا۔

حکم شہادت۔ قاضی کے لئے گواہوں کی عدالت ثابت ہونے اور تزکیہ ہو جانے کے بعد اس کے موافق حکم کرنا واجب ہے۔

درمختار میں ہے: حكمها وجوب الحكم على القاضى بموجبها بعد التزكية۔

(ردالمحتار مصری ج۴ ص۳۸۵)

شہادت کا حکم یہ ہے کہ قاضی پر تزکیہ کے بعد اس شہادت کے موافق حکم کا واجب ہونا۔

ادائے شہادت۔ حقوق اللہ میں بلاطلب مدعی کے بھی گواہی دینا واجب ہے۔

درمختار میں ہے: ويجب الاداء بلاطلب الشهادة فى حقوق الله تعالىٰ۔

(ردالمحتار مصری ج۴ ص۳۸۶)

حقوق اللہ میں بلاطلب مدعی کے گواہی دینا واجب ہے۔

اب باقی رہے شہادت کے اقسام ان کی تفاصیل کتب فقہ میں ہے لیکن گواہوں کا عادل ہونا تمام

اقسام میں شرط ہے۔

عینی شرح کنز الدقائق میں ہے: شرط للکل ایضا (العدالة) لانها هی المعینة للصدق قال الله تعالیٰ واشهد واذوی عدل منکم وقال الله تعالیٰ ممن ترضون من الشهداء والعدل هو المرضی وهی شرط لزوم العمل بالشهادة ۔ (عینی مصری ج۲ص۷۸)

تمام اقسام شہادت کے لئے عدالت شرط ہے کہ یہی صداقت کے لئے معین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم میں سے دو صاحب، عدل گواہی دیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: گواہوں میں سے ہوں کہ جو تمہارے پسندیدہ ہوں۔ اور عدالت ہی وصف پسندیدہ ہے تو یہی عدالت شہادت پرلزوم عمل کے لئے شرط ہے۔

اس عبارت سے ثابت ہوگیا کہ شہادت کے لئے عدالت کا شرط ہونا قرآن کریم کی آیات سے ثابت ہے۔ اب فرمان خداوندی کے ہوتے ہوئے کسی اور دلیل کی حاجت ہی نہیں باقی رہتی۔ اور عدالت سے مراد فقہائے کرام کی یہ ہے۔

ردالمحتار میں ہے: قال فی الذخیرة واحسن ماقیل فی تفسیر العدالة ان یکون مجتنبا للکبائر ولایکون مصرا علی الصغائر ویکون صلاحه اکثر من فساده وصوابه اکثر من خطئه ۔ (ردالمحتار مصری ج۴ص۳۸۷)

ذخیرہ میں کہا اور عدالت کی تفسیر میں بہترین قول یہ ہے کہ عادل کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرنے والا ہو اور صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرتا ہو اور اس کی صلاح فساد سے زائد ہو اور اس کا صواب خطا سے اکثر ہو۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: واحسن ماقیل فی تفسیر العدل مانقل عن ابی یوسف رحمه الله ان العدل فی الشهادة ان یکون مجتنبا عن الکبائر ولایکون مصرا علی الصغائر ویکون صلاحه اکثر من فساده وصوابه اکثر من خطائه کذا فی النهایة۔

(عالمگیری مجیدی ص۲۰۲)

اور عدل کی تفسیر میں عمدہ ترین وہ قول ہے جو حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے کہ شہادت میں عادل ہونا یہ ہے۔ کہ وہ کبیرہ گناہوں سے مجتنب ہو اور صغیرہ گناہوں پر مصر نہ ہو۔ اور اس کی صلاح اس کے فساد سے زیادہ ہو اور اس کا صواب اس کی خطا سے اکثر ہو اسی طرح نہایہ میں ہے۔

لہذا اب شہادت میں گواہ کے عادل ہونے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرتا ہو اور صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرتا ہو۔ اس کا صلاح وصواب اس کے فساد وخطا سے زائد ہو۔

الحاصل جب شہادت کا مکان اور اس کا رکن اور اس کے تمام چوبیس شرائط پائے جائیں تو وہ شہادت حجت ہوتی ہے اور اس پر حکم مرتب ہوتا ہے۔

مقدمہ ثالثہ۔ ہلال سے مہینہ کی ابتدائی تاریخوں کا چاند مراد ہوتا ہے۔ اور اکثر اہل لغت کے نزدیک ابتدائی دوراتوں کے چاند کو ہلال کہتے ہیں۔

چنانچہ تفسیر احکام القرآن میں ہے: قال الزجاج الاکثر یسمونه هلالا لابن لیلتین ۔

(تفسیر احکام القرآن مصری ج۱ص۲۹۹)

زجاج نے کہا کہ اکثر اہل عرب دوراتوں کے چاند کا نام ہلال رکھتے ہیں۔

رویت ہلال یعنی نیا چاند دیکھنے کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے مہینہ کی طول مدت کے لئے ابتدائے حد مقرر فرمایا۔

چنانچہ مسلم شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے۔

ان رسول الله ﷺ امده للرویة فهو للیلة رایتموه (وفی روایة) ان الله قد امده لرویته فان اغمی علیکم فاکملوا العدة۔ (مسلم شریف معہ نووی مطبوعہ مجتبائی دہلی ج۱ص۳۴۸)

بیشک رسول اکرم ﷺ نے رویت کو مہینہ کی مدت قرار دیا تو وہ ہلال اسی رات کا ہے جس میں تم نے اسے دیکھا (اور ایک روایت میں یہ ہے) کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے چاند دیکھنے کو مدت ماہ کی درازی کی حد ٹھہرایا تو اگر تم پر مہینہ پوشیدہ ہوجائے تو عدت یعنی تیس دن پورے کرو۔

لہذا چاند کا دیکھنا بھی احکام شرع سے ایک حکم قرار پایا۔ بلکہ یہ تو وہ اہم حکم ہے۔ جس کا حکم قرآن کریم میں ہے:

یسئلونك عن الاهلة ط قل هی مواقیت للناس والحج ۔ (سورہ بقرہ ع۲۴ ج۲)

تم سے نئے چاند کو پوچھتے ہیں۔ تم فرمادو وہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں اور حج کے لئے۔

حضرت حجۃ الاسلام امام ابوبکر رازی تفسیر احکام القرآن میں آیۃ کریمہ کے تحت فرماتے ہیں:

تعلق الحکم فیه برویة الاهلة ولما کانت هذه عبادة تلزم الکافة۔

(احکام القرآن مصری ج۱ص۲۳۶)

اس میں حکم رویت ہلال پر معلق کیا اور جب رویت ہلال عبادت ثابت ہوئی تو یہ سب کے لئے لازم ہوئی۔

نیز اسی احکام القرآن میں ہے: والناس مامورون لطلب الهلال۔

(احکام القرآن مصری ج ا ص ۲۳۷)

لوگ ہلال کے طلب کرنے کے لئے مامور ہیں۔

بخاری شریف و مسلم شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے۔

قال رسول الله ﷺ لاتصوموا حتى تروا الهلال ولاتفطروا حتى تروه فان غم عليكم فاقدروا له۔

(مشکوۃ شریف مجیدی ص ۱۷۴)

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا تم روزہ مت رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو۔ اور افطار مت کرو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو پھر اگر مہینہ تم پر پوشیدہ ہو جائے تو اس کا اندازہ کرو یعنی تیس دن شمار کرلو۔

اس آیت و تفسیر اور حدیث شریف سے رویت ہلال کا حکم شرع اور عبادت ہونا ثابت ہوا تو اس کے اثبات کے لئے وہی چیز حجت قرار پائے گی۔ جس کو شریعت نے حجت ٹھہرایا۔ لہذا رویت ہلال کا اثبات حجت بینہ سے ہوگا۔ اور جب اس کا اثبات بینہ سے قرار پایا تو شہادت کا رکن اور چوبیس شرائط کا لحاظ اس رویت ہلال کے ثبوت میں ضروری ہوگا۔

اب رہی خبر و حکایت وغیرہ وہ شرعی حجت نہیں جن سے رویت ہلال کا اثبات نہیں ہوسکتا۔ ہاں جو خبر حد استفاضہ تک پہنچ جائے تو پھر وہ خبر متواتر کے حکم میں ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ رویت ہلال کا اثبات شہادت شرعی سے ہوگا۔ یا استفاضہ سے۔ خبر وافواہ سے نہیں ہوسکتا۔

مقدمہ رابعہ۔ رویت ہلال رمضان کے اثبات کے لئے نہ شہادت کی حاجت نہ استفاضہ کی ضرورت نہ اس میں مجلس قضا شرط نہ حکم حاکم شرط۔ نہ اس کے لئے دو مرد یا ایک مرد دو عورتوں کا شہادت دینا ضروری نہ یہ کہنا ضروری کہ میں گواہی دیتا ہوں۔ بلکہ جب مطلع پر ابر یا غبار ہو تو ایک مسلمان عاقل بالغ عادل ہو۔ یا مستور مرد ہو یا عورت۔ آزاد ہو یا غلام۔ اس کا یہ کہہ دینا کافی ہے۔ میں نے اپنی آنکھ سے اس رمضان کا چاند فلاں دن دیکھا۔

علامہ علاء الدین حصکفی درمختار میں فرماتے ہیں:

وقبل بلا دعوى وبلا لفظ اشهد وبلا حكم ومجلس قضاء لانه خبر لا شهادة للصوم مع علة كغيم وغبار خبر عدل او مستور لافاسق ولو كان العدل قنا او انثى او محدود قذف تاب۔ ملخصا۔

(ردالمحتار مصری ج ۲ ص ۹۳)

اور بغیر دعوی کے اور بلا لفظ اشہد کے اور بلا حکم اور مجلس قضا کے بحالت ابر وغبار روزہ کے لئے ایک عادل یا مستور کی خبر قبول کرلی جائے گی۔ اگر چہ وہ عادل غلام ہو یا عورت ہو۔ یا تہمت کی حد لگا ہوا توبہ کر چکا ہو۔ اس لئے کہ یہ خبر ہے نہ کہ شہادت ہے۔ ہاں وہ خبر دینے والا فاسق نہ ہو۔

بلکہ ہلال رمضان میں مطلع صاف ہونے کی صورت میں اگر بیرون شہر یا شہر کے کسی بلند مقام سے چاند دیکھنا بیان کیا جاتا ہے۔ تو ایک عادل یا مستور ہی کا قول معتبر ہے۔ اور اگر بیرون شہر یا بلند مقام کی رویت نہیں بتائی جاتی۔ اور لوگ چاند دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ تو دو عادل یا مستور کا قول کافی ہے۔ ورنہ ایسی جماعت عظیمہ ہونی چاہئے۔ جو اپنی آنکھ سے چاند دیکھنے کی خبر دیں اور جن کے بیان پر غلبہ ظن حاصل ہو جائے۔ اور عقل اتنے لوگوں کا غلطی پر متفق ہونا محال جانے۔

درمختار میں ہے:

وقبل بلاعلة جمع عظيم يقع العلم الشرعي وهو غلبة الظن بخبرهم وهو مفوض الى راى الامام من غير تقدير بعدد على المذهب وعن الامام انه يكتفى بشاهد واختاره في البحر وصحح في الاقضية الاكتفاء بواحد ان جاء من خارج البلد او كان على مكان مرتفع واختاره ظهير الدين۔

(ردالمحتار مصری ج ۲ ص ۹۵)

اور بلا ابر وغبار کے ایسی بڑی جماعت کی شہادت قبول کی جائے گی۔ جس کی خبر سے علم شرعی اور ظن غالب واقع ہو۔ اور مذہب صحیح پر بغیر مقدار کسی عدد کے جماعت کا تعین امام کی رائے پر موقوف ہے۔ اور حضرت امام اعظم سے مروی ہے کہ دو گواہ کافی ہیں۔ اور بحر میں اسی کو مختار ٹھہرایا۔ اور اقضیہ میں تصحیح کی ایک بھی کافی ہے۔ اگر بیرون شہر سے آئے۔ یا کسی بلند مقام کو بتائے اسی کو ظہیر الدین نے مختار قرار دیا۔

بخلاف اور تمام چاندوں کے لئے کہ اگر مطلع پر ابر وغبار ہے تو ان کے لئے مجلس قضا بھی شرط ہے اور حکم حاکم بھی۔ اور نصاب شہادت دو مرد یا ایک مرد دو عورتوں کا ہونا بھی شرط ہے۔ اور ان کا عادل و آزاد ہونا بھی اور یہ بھی شرط ہے کہ وہ گواہ وقت شہادت یہ کہیں میں گواہی دیتا ہوں۔ اور مطلع صاف ہے تو جب تک اس قدر لوگ شہادت نہ دیں۔ جن کے لئے عقل محال جانے کہ اتنے لوگ جھوٹ پر جمع نہیں

ہوسکتے۔

درمختار میں ہے:

وشرط للفطر مع العلة والعدالة نصاب الشهادة ولفظ اشهد ولو كانوا ببلدة لاحاكم فيها صاموا بقول ثقة وافطروا باخبار عدلين مع العلة للضرورة وقبل بلاعلة جمع عظيم يقع العلم الشرعي وهو غلبة الظن بخبرهم وهلال الاضحى وبقية الاشهر التسعة كالفطر على المذهب مختصرا۔ (ملخصا از ردالمحتار مصری ص۹۴،۹۵،۹۸)

اور ہلال فطر کے لئے بحالت ابروغبار مع عدالت کے شہادت کا نصاب اور یہ کہنا کہ میں گواہی دیتاہوں شرط ہے۔اوراگر کسی ایسے شہر میں ہوں جس میں کوئی حاکم نہ ہوتو ثقہ کے قول پر روزہ رکھیں۔اور بحالت ابروغبار ضرورۃً دوعادل کے خبر دینے پر افطار کرلیں۔اور بغیر ابروغبار کے ایسی بڑی جماعت کی شہادت قبول کرلی جائے گی جن کی خبر سے علم شرعی اور ظن غالب حاصل ہوجائے اور ہلال اضحیٰ اور باقی نو ماہ کا ہلال مذہب صحیح پر مثل ہلالی فطر کے ہے۔

بالجملہ رمضان المبارک کے علاوہ عیدالفطر وعیداضحیٰ وغیرہ ہرماہ کی رویت ہلال کا اثبات شہادت کے ان تمام شرائط کے ساتھ ہوگا۔جن کا مفصل ذکر مقدمۂ ثانیہ میں مذکور ہوا۔

مقدمہ خامسہ۔شرعاً مہینہ ۲۹ انتیس دن کا بھی ہوتا ہے۔اورتیس ۳۰ دن کا بھی ہوتا ہے چنانچہ حدیث شریف میں ہے جس کو بخاری ومسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:انا امة امية لانكتب ولانحسب الشهر هكذا وهكذا يعنى مرة تسعاوعشرين ومرة ثلثين۔ (بخاری شریف مصطفائی ج۱ص۲۵۶)

ہم یعنی عرب امی گروہ ہیں کہ ہم حساب وکتاب نہیں جانتے ہیں مہینہ ایسے اورایسے یعنی کبھی ماہ انتیس دن کا ہوتا ہے کبھی تیس دن کا ہوتا ہے۔

تو اگر انتیس کو چاند کی رویت شہادت یا استفاضہ سے ثبوت کو پہنچ جائے تو مہینہ انتیس کا ہوگا اور اگر ان میں سے کسی چیز سے ثبوت نہ ہوسکے تو مہینہ یقیناً تیس کا ہوگا۔

مسلم شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا۔

فان اغمى عليكم فاقدروا له ثلثين۔ (مسلم شریف مجتبائی ج۱ص۳۴۷)

اگر ماہ تم پر ابر کی وجہ سے پوشیدہ ہوجائے تو مہینہ تیس دن شمار کرلو۔

علامہ نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

حاصله ان الاعتبار بالهلال فقد يكون تاما ثلثين وقد يكون ناقصا تسعا وعشرين وقد لايرى الهلال فيجب اكمال العدد ثلاثين۔ (مسلم شریف مجتبائی مع نووی ج۲ص۳۴۷)

حاصل اس کا یہ ہے کہ اعتبار ہلال پر ہے تو کبھی رویت ہلال پورے تیس دن میں ہوتی ہے اور کبھی کم میں انتیس دن میں ہوجاتی ہے اور کبھی ہلال کی رویت ہی نہیں ہوتی تو پھر تیس کے عدد کا مکمل کرنا واجب ہے۔

لہذا یہ نتیجہ حاصل ہوا کہ اگر انتیس کو رویت ہلال کسی شرعی طریق سے ثابت ہوجائے جب تو مہینہ انتیس کا قرار پائے گا ورنہ تیس دن کا پورا کرنا واجب ہے تو تیسویں دن مطلع کے صاف ہونے یا اس پر ابروغبار ہونے کا کوئی فرق نہیں ہے۔کہ قمری مہینہ تیس دن سے زائد کا ہونہیں سکتا۔ہاں اس میں ایک ایسی صورت نکل سکتی ہے کہ رمضان شریف کا چاند ایک شخص کی شہادت پر مان لیا گیا تھا۔اب اس کے حساب سے تیس دن پورے ہوجائیں۔اور تیسویں دن مطلع بالکل صاف ہو اور ہلال عید کسی کو نظر نہیں آتا تو اگلے دن روزہ رکھا جائے گا۔اور اس پہلی گواہی کو غلط قرار دیا جائے گا۔اور روزے اکتیس ہوجائیں گے۔

صاحب درمختار شرح ملتقی میں فرماتے ہیں:ولو صاموا ثلثين يوما ولم يروه اى هلال الفطر حل الفطر ان صاموا بشهادة اثنين عدلين وان كان الصوم بشهادة واحد لايحل(اى لهم الفطر)۔ (درالمنتقی شرح ملتقی مصری ج۱ ص ۲۳۷)

اگر لوگوں نے تیس دن روزے رکھ لئے اور عید کا چاند انہیں نہ دکھا تو فطر جب حلال ہے کہ انہوں نے دوعادلوں کی گواہی پر روزے رکھے ہوں،اور ایک کی گواہی پر روزہ شروع کیا ہوتو فطر حلال نہیں۔

اب باقی رہا انتیسویں تاریخ کو چاند دیکھنا تو شعبان ورمضان اور ذیقعدہ کی انتیسویں کو واجب ہے لیکن اس سے مراد واجب کفایہ ہے۔

چنانچہ مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں فرماتے ہیں:

ويجب على الناس وجوب كفاية التماس الهلال فى التاسع والعشرين من شعبان ومن رمضان وكذا ذوالقعدة لان الشهر قديكون تسعا وعشرين وكذا يجب على الحاكم

ان یامر الناس ولا اعتبار باختلاف المطالع حتی قالوا لورای اهل المغرب هلال رمضان یجب برویتهم علی اهل المشرق اذا ثبت عندهم بطریق موجب ۔

(مجمع الانہر مصری ج ۱ ص ۲۳۸)

اورلوگوں پر شعبان ورمضان اوراسی طرح ذیقعدہ کی انتیسویں کو چاند دیکھنا واجب کفایہ ہے۔ اس لئے کہ مہینہ کبھی انتیس دن کا بھی ہوتا ہے اور حاکم پر بھی یہ واجب ہے کہ لوگوں کو چاند دیکھنے کا حکم دے۔ اور جب کسی جگہ رویت ثابت ہوجائے تو سب جگہ کے لوگوں کے لئے لازم ہے۔ کہ اختلاف مطالع معتبر نہیں یہاں تک کہ فقہائے کرام نے فرمایا کہ اگر اہل مغرب نے رمضان کا چاند دیکھا تو ان کی رویت پر اہل مشرق کا عمل واجب ہے جب انہیں بطریق موجب ثابت ہوجائے۔

اس عبارت سے یہ ثابت ہو گیا کہ انتیس کو چاند دیکھا جائے ۔ اور جب کسی ایک جگہ رویت ثابت ہوجائے تو وہ تمام شہروں اور مواضعات کے لئے کافی ہے۔ لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ انہیں رویت ہلال کا ثبوت بطریق موجب پہنچ جائے۔ ورنہ انہیں تیس دن کا پورا کرنا ضروری ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ مقدمات تو ختم ہوگئے۔

اب اس بات کا سمجھنا ضروری ہے کہ فقہا طریق موجب کسے کہتے ہیں اور طریق موجب کن کن صور میں پایا جاتا ہے اور اخبار وحکایات سے طریق موجب کا حصول ہوجاتا ہے۔ یا نہیں۔

علامہ طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح میں فرماتے ہیں:

قوله (لزم سائر الناس) فی سائر اقطار الدنیا اذا ثبت عندهم الرویة بطریق موجب کان یتحمل اثنان الشهادة او یشهدا علی حکم القاضی او یستفیض الخبر بخلاف ما اذا اخبر ان اهل بلدة کذا رأوه لانه حکایة۔ (طحطاوی مصری ۳۸۲)

تمام لوگوں کو تمام اقطار دنیا میں لازم ہے جب ان کے پاس رویت کا ثبوت بطریق موجب پہنچ جائے جیسے دو شخص شہادت کے حامل بنیں۔ یا دو شخص حکم قاضی پر گواہی دیں یا خبر مستفیض ہو بخلاف اس صورت کے جب کہ یہ خبر سنائی کہ فلاں شہر کے لوگوں نے چاند دیکھا ہے کہ یہ حکایت ہے۔

علامہ عبدالرحمن شیخ زادہ مجمع الانہر میں فرماتے ہیں:

اذا ثبت عندهم بطریق موجب کما لو شهدوا عند قاض لم یر اهل بلده علی ان قاضی بلد کذا شهد عنده شاهدان برویة الهلال فی لیلة کذا وقضی القاضی بشهادتهما

جاز لهذا القاضی ان یقضی بشهادتهما لان قضاء القاضی حجة وقد شهدا به قال الحلوانی الصحیح من مذهب اصحابنا ان الخبر اذا استفاض فی بلدة اخری وتحقق یلزمهم حکم تلك البلدة ۔ (مجمع الانہر مصری ج ۱ ص ۲۳۹)

جب ان کے پاس ثبوت رویت بطریق موجب پہنچے جیسے اس قاضی کے پاس جس کے شہر میں چاند نہ دیکھا یہ شہادت گذری کہ فلاں شہر کے قاضی کے پاس دو گواہوں نے فلاں شب میں رویت ہلال کی شہادت دی اور اس قاضی نے ان کی شہادت پر حکم نافذ کیا تو اس قاضی کو بھی ان کی شہادت پر حکم دیدینا جائز ہے اس لئے کہ قاضی کا حکم حجت ہے اور انہوں نے اس کی گواہی دی اور امام حلوانی نے فرمایا کہ ہمارے فقہا کا صحیح مذہب یہ ہے کہ خبر جب دوسرے شہر میں مستفیض ہوجائے اور ثابت ہوجائے تو اس شہر کا حکم ان پر بھی لازم ہوجاتا ہے۔

ردالمحتار حاشیہ درمختار میں ہے:

قوله بطریق موجب کان یتحمل اثنان الشهادة او یشهدا علی حکم القاضی او یستفیض الخبر بخلافها اذا اخبرا ان اهل بلدة کذا رأوه لانه حکایة ۔

(ردالمحتار مصری ج ۲ ص ۹۹)

بطریق موجب جیسے دو شخص شہادت کے حامل بنیں۔ یا قاضی کے حکم پر گواہی دیں۔ یا خبر بطور استفاضہ پہنچے۔ بخلاف اس کے جب کہ خبر سنائی کہ فلاں شہر کے لوگوں نے چاند دیکھا ہے کیونکہ یہ حکایت ہے۔

ان عبارات سے رویت ہلال کے ثبوت کے تین طریقے معلوم ہوئے جن کو فقہاء نے طریق موجب قرار دیا ہے ایک شہادت علی الرویۃ۔ دوسرے شہادت علی القضا۔ تیسرے استفاضہ۔ اب ہر ایک کا مفصل ذکر کیا جاتا ہے۔

شہادت علی الرویۃ

شہادت علی الرویۃ کی دو صورتیں ہیں۔

پہلی یہ ہے کہ صرف رمضان مبارک کے چاند کے لئے ایک مسلمان عاقل بالغ عادل یا مستور کا یہ کہدینا کافی ہے کہ میں نے اپنی آنکھ سے اس رمضان کا چاند فلاں دن دیکھا۔ اور عید الفطر وعید الضحیٰ اور باقی نو ماہ کے چاند کے لئے دو مسلمان عاقل بالغ عادل مردوں یا ایک مرد دو عورتوں کا قاضی کی مجلس یا مفتی

شہر کی مجلس میں یہ کہہ دینا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ ہم نے اس سال کے فلاں ماہ کا چاند فلاں دن کی شام کو دیکھا۔

علامہ ابوالبرکات نسفی کنز الدقائق میں فرماتے ہیں:

وقیل بعلة خبر عدل ولو قنا او انثی لرمضان وحرین او حرو حرتین للفطر و الاضحی کالفطر۔ الا فجمع عظیم لها و (کنز الدقائق مجتبائی ص ۶۱)

اور ہلال رمضان کے لئے ایک عادل کی خبر اگر چہ وہ غلام یا عورت ہو اور ہلال فطر کے لئے دو آزاد مردوں یا ایک مرد دو عورتوں کی گواہی بحالت ابر وغبار قبول کی جائے ورنہ ہر دو کے لئے بڑی جماعت درکار اور ہلال اضحیٰ کا حکم مثل ہلال فطر کے ہے۔

علامہ حلبی ملتقی الابحر میں فرماتے ہیں:

وقبل فی هلال رمضان خبر عدل ولو عبدا او انثی او محدودا فی قذف تاب ولا یشترط لفظ الشهادة وفی هلال الفطر وذی الحجه شهادة حرین او حر وحرتین بشرط العدالة ولفظ الشهادة۔ (مجمع الانهر ج ۱ ص ۲۳۵)

اور ہلال رمضان میں ایک عادل کی خبر مقبول ہے اگر چہ وہ غلام یا عورت یا تہمت میں حد لگا ہوا ہو اور توبہ کر چکا ہو اور اس میں لفظ شہادت بھی شرط نہیں۔ اور ہلال فطر وذی الحجہ میں دو آزاد مردوں یا ایک مرد دو عورتوں کی شہادت بشرط عدالت اور لفظ شہادت کے مقبول ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ان دو شخصوں نے خود تو چاند نہیں دیکھا ہے لیکن ان کے سامنے چاند کے دیکھنے والے دو شخصوں نے گواہی دی اور انہیں اپنی گواہی پر گواہ کیا۔ لہذا یہ دونوں گواہان فرع اگر اس طرح گواہی دیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ فلاں بن فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں بن فلاں نے ماہ فلاں اور سال فلاں اور دن فلاں کی شام کو انتیس کا چاند دیکھا اور ہر ایک نے ہمیں اپنی اپنی گواہی پر گواہ کیا۔ تو حقیقۃً ان گواہان فرع نے گواہان اصل کی گواہی کی گواہی دی۔ نہ کہ خود رویت ہلال کی گواہی دی لیکن اس سے بھی ثبوت ہلال بطریق موجب ثابت ہوتا ہے۔

تنویر الابصار ودر مختار میں ہے:

الشهادة علی الشهادة هی مقبولة وان کثرت استحسانا فی کل حق علی الصحیح الا فی حد وقود بشرط تعذر حضور الاصل بموت اومرض او سفر واکتفی الثانی

واستحسنه غیر واحد وفی القهستانی والسراجية وعليه الفتوی واقره المصنف اوکون المرأة مخدرة لاتخالط الرجال وان خرجت لحاجة وحمام عند الشهادة عند القاضی قید للکل وبشرط شهادة عدد نصاب ولو رجلا وامرأتین عن کل اصل ولو امرأة لا تغایر فرعی هذا وذلك وكيفيتها ان يقول الاصل مخاطبا للفرع ولو ابنه اشهد علی شهادتی انی اشهد بکذا ویقول الفرع اشهدان فلانا اشهدنی علی شهادته بکذا وقال لی اشهد علی شهادتی بذلك مختصرا۔ (ردالمحتار مصری ج ۴ ص ۴۰۹)

صحیح مذہب میں استحسانا ہر حق میں شہادۃ علی الشہادۃ اگر چہ طبقات فروع میں بکثرت ہو جائے مقبول ہے۔ لیکن حد وقضا میں مقبول نہیں۔ اور شرط یہ ہے کہ گواہان اصل کا موت یا بیماری یا سفر کی وجہ سے حاضر ہو جانا متعذر ہو جائے۔ اور امام ابو یوسف نے ان کی غیر حاضری کے لئے اتنی بات کافی قرار دی کہ انہیں اپنے اہل میں رات کو پہنچنا متعذر ہو۔ اسی قول کو فقہاء نے اچھا جانا اور قہستانی اور سراجیہ میں ہے کہ اسی قول پر فتوی ہے اور مصنف نے بھی اسی کو قرار رکھا یا اصل کے حضور کو تعذر یوں ہے کہ ایسی پردہ نشین عورت ہے۔ جو مردوں سے مخالطت نہیں کرتی ہو اگر چہ حاجت وحمام کے لئے نکلتی ہو یہ تعذر قاضی کے سامنے بوقت ادائے شہادت ہو یہ قید سب اعذار کے لئے ہے۔ بشرط نصاب شہادت کے اگر چہ ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔ ہر اصل کی شہادت سے اگر وہ عورت ہو نہ غیر ہونا اس اصل وفرع کا اور اس کی فروع کا اور شہادت علی الشہادۃ کا طریقہ یہ ہے کہ اصل فرع سے مخاطب ہو کر کہے اگر چہ وہ اس کا بیٹا ہو کہ تو میری اس شہادت پر شاہد ہو کہ میں ایسی شہادت دیتا ہوں۔ اور فرع کہے کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ فلاں شخص نے مجھ کو اپنی اس شہادت پر شاہد بنایا اور اس نے مجھ سے کہا کہ تو میری اس شہادت پر شاہد ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

وینبغی ان یذکر الفرع اسم الشاهد الاصل واسم ابیه وجده حتی لو ترك ذلك فالقاضی لایقبل شهادتهما کذا فی الذخیرة۔ (عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۲۳۴)

اور لائق ہے کہ فرع اصل گواہ کا نام اور اس کے باپ دادا کا نام ذکر کرے یہاں تک کہ اگر اس نے یہ ذکر نہ کیا تو قاضی ان ہر دو شاہدوں کی شہادت قبول نہ کرے۔

شہادت علی القضا

شہادت علی القضا کی بھی دو صورتیں ہیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ کسی اسلامی شہر میں قاضی شرع کے سامنے رویت ہلال کی گواہیاں گذریں اور قاضی نے رویت ہلال کا حکم دیا اور دار القضا میں قاضی کے حکم کے وقت دو عادل موجود تھے۔ انہوں نے دوسرے شہر میں قاضی کے سامنے اگر قاضی نہ ہو تو مفتی شہر کے سامنے حاضر ہو کر کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں ہمارے سامنے فلاں شہر کے فلاں حاکم کے سامنے فلاں دن کی شام کو فلاں چاند کے دیکھنے کی شہادتیں دیں۔ اور اس حاکم نے ان گواہیوں کی بنا پر ثبوت ہلال کا حکم دیا۔ تو اس شہر کے قاضی یا مفتی ان شہادتوں کی بنا پر اپنے اس شہر میں بھی ثبوت ہلال کا حکم کر سکتا ہے۔

مجمع الانہر میں ہے:

قالوا لو رأى اهل المغرب هلال رمضان يجب برويتهم على اهل المشرق اذا ثبت عندهم بطريق موجب كمالوشهد وا عند قاض لم يراهل بلده على ان قاضى بلد كذا شهد عنده شاهدان بروية الهلال فى ليلة كذا وقضى القاضى بشهادتهما جاز لهذا القاضى ان يقضى بشهادتهما لان قضاء القاضى حجة وقد شهدا به ـ

(مجمع الانہر مصری ج ۱ ص ۲۳۹)

فقہا نے فرمایا اگر اہل مغرب نے رمضان کا چاند دیکھا تو ان کی رویت پر اہل مشرق کو عمل واجب ہے جب کہ انہیں بطریق موجب ثابت ہو جائے جس طرح اس قاضی کے پاس جس کے شہر میں چاند نہیں دیکھا یہ شہادت گذری کہ فلاں شہر کے قاضی کے پاس دو گواہوں نے فلاں شب میں رویت ہلال کی شہادت دی اور اس قاضی نے ان کی شہادت پر حکم نافذ کیا تو اس قاضی کو بھی ان کی شہادت پر حکم دیدینا جائز ہے اس لئے کہ قاضی کا حکم حجت ہے اور انہوں نے اسکی گواہی دی۔

لہذا یہ شہادت حقیقۃً شہادت علی القضا ہوئی اس سے بھی ثبوت ہلال بطریق موجب ثابت ہوتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی اسلامی شہر کے قاضی شرع کے سامنے رویت ہلال کی شہادتیں گذریں اور اس نے ثبوت ہلال کا حکم دیا پھر اس قاضی نے اپنا نام و پتہ لکھ کر دوسرے شہر کے قاضی کے نام و پتہ کو لکھا اور یہ خط تحریر کیا کہ میرے سامنے فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں نے فلاں دن فلاں شام

کو فلاں ماہ کے چاند دیکھنے کی شہادتیں گذریں جن کی بنا پر میں نے ثبوت ہلال کا حکم دیا۔ اور یہ خط دو عادلوں کو سنا کر خط کو لفافہ میں بند کرے اور ان کے سامنے ہی سر بمہر کر دے اور انہیں اس خط پر گواہ بنا کر ان سے کہے کہ میرا یہ خط فلاں شہر کے قاضی کے نام ہے وہ ہر دو عادل اس سر بمہر خط کو باحتیاط اس قاضی کے پاس لائیں اور اسے مجلس قضا میں سر بمہر ہی دیں اور یہ شہادت ادا کریں کہ آپ کے نام فلاں قاضی کا خط ہے اس نے ہمیں اس خط کو سنایا اور اس پر ہمیں گواہ کیا۔ اور ہمارے سامنے اس کو لفافہ میں بند کیا اور سر بمہر کیا یہ خط اسی کا ہے اور اس کا یہ مضمون ہے ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔

درمختار میں ہے:

القاضى يكتب الى القاضى بحكمه وان لم يحكم كتب الشهادة ليحكم المكتوب اليه بها على رايه وقرأ الكتاب عليهم بمافيه وختم عندهم وسلم اليهم بعد كتابة عنوانه وهو ان يكتب فيه اسمه واسم المكتوب اليه وشهرتهما واكتفى الثانى بان يشهدهم انه كتابه وعليه الفتوى مختصرا۔

(ردالمحتار مصری ج ۴ ص ۳۶۶)

قاضی دوسرے قاضی کی طرف اپنا حکم لکھے اور اگر حکم نہیں دیا تھا تو شہادت لکھے تا کہ مکتوب الیہ قاضی اس گواہی پر اپنی رائے سے حکم کرے۔ اور کاتب قاضی ان گواہوں کے سامنے وہ مکتوب پڑھے یا انہیں اس کے مضمون سے مطلع کرے اور اپنی مہر لگائے اور اس پر سرنامہ یعنی اپنا نام اور مکتوم الیہ کا نام اور مشہور خطابات لکھنے کے بعد گواہوں کو سپرد کرے۔ اور امام ابو یوسف نے اس قدر کافی قرار دیا کہ وہ قاضی گواہوں کو اس پر شاہد بنائے کہ وہ اسی کا مکتوب ہے اور اس پر فتوی ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

يحب ان يعلم ان كتاب القاضى الى القاضى صار حجة شرعا في المعاملات لكن انما يقبله القاضى المكتوب اليه عند وجود شرائطه ومن جملة الشرائط البينة۔

(فتاوی عالمگیری مجیدی کانپور ج ۳ ص ۱۷۲)

یہ جاننا واجب ہے کہ قاضی کا مکتوب دوسرے قاضی کی طرف معاملات میں شرعا حجت ہے لیکن مکتوب الیہ قاضی اس کو جب قبول کرے جب کہ اس کے تمام شرائط پائے جائیں اور اس کے منجملہ شرائط کے بینہ ہے۔

لہذا یہ شہادت حقیقۃً شہادت بر خط قاضی ہے تو اس سے بھی ثبوت ہلال بطریق موجب ثابت

ہوتا ہے۔

استفاضہ

استفاضہ کی بھی دوصورتیں ہیں۔

ایک صورت یہ ہے کہ کسی شہر سے جماعت کثیرہ آئے اور وہ لوگ سب باتفاق بیان کریں کہ فلاں شہر میں ہمارے سامنے عام طور پر لوگ بیان کرتے تھے کہ ہم نے اپنی آنکھ سے چاند دیکھا ہے۔

مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں ہے:

قال الحلوانی الصحیح من مذهب اصحابنا ان الخبر اذا استفاض فی بلدة اخری وتحقق یلزمهم حکم تلك البلدة۔ (مجمع الانہر مصری ج۱ص۲۳۹)

حلوانی نے فرمایا ہمارے اصحاب کا صحیح مذہب یہ ہے کہ خبر جب دوسرے شہر میں حد استفاضہ تک پہنچ جائے اور متحقق ہوجائے تو ان اہل شہر پر بھی اس شہر کا حکم لازم ہے۔

درمختار میں ہے: نعم لو استفاض الخبر فی البلدة الاخری لزمهم علی الصحیح من المذهب مجتبی وغیره۔ (ردالمحتار مصری ج۲ص۹۷)

ہاں اگر دوسرے شہر میں خبر مستفیض ہوجائے تو بنا بر صحیح مذہب کے ان اہل شہر پر بھی حکم لازم ہے۔یہی مجتبی وغیرہ میں ہے۔

یہی استفاضہ ہے کہ اس میں نہ خود اپنی رویت کی شہادت ہے۔نہ شہادۃ علی الشہادۃ ہے۔نہ شہادت علی قضاء القاضی ہے۔نہ شہادت علی کتاب القاضی ہے۔بلکہ اس میں جماعتوں کا تواتر جماعت کے تواتر سے رویت ہلال کا ناقل ہے تو رویت فی نفسہا حجت شرعیہ ہے۔اور تواتر قائم مقام شہادت کے۔بلکہ یہ شہادت سے قوی تر ہے تو رویت ہلال اس سے بہ یقین ثابت ہوگئی۔لہذا خبر استفاضہ سے بھی رویت ہلال بطریق موجب ثابت ہوسکتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جس اسلامی شہر میں قاضی شرع ہو اور وہ خود عالم ہو یا کسی معتمد عالم دین کے فتوی کا ملازم ہو یا جہاں ایسا قاضی نہ ہو تو ایسا محقق مفتی دین ہو جس کے فتوے ہی پر احکام روزہ وعیدین نافذ ہوتے ہوں تو اس شہر سے متعدد جماعتیں آئیں اور وہ باتفاق ایک زبان یہ کہیں کہ فلاں شہر میں فلاں دن فلاں ماہ کی رویت ہوئی اور اسی کی بنا پر فلاں دن پہلا روزہ ہوا یا فلاں دن عید کی گئی۔

ردالمحتار میں ہے:

فی الذخیرة قال الشمس الائمة الحلوانی الصحیح من مذهب اصحابنا ان الخبر اذا استفاض وتحقق فیما بین اهل البلدة الاخری یلزمهم حکم هذه البلدة اه ومثله فی الشرنبلالیة عن المغنی قلت ووجه الاستدراك ان هذه الاستفاضة لیس فیها شهادة علی قضاء قاض ولا علی شهادة لکن لما کانت بمنزلة الخبر المتواتر وقد ثبت بها ان اهل تلك البلدة صاموا یوم کذا لزم العمل بها لان البلدة لاتخلوعن حاکم شرعی عادة فلابد من ان یکون صومهم مبنیا علی حکم حاکمهم الشرعی فکانت تلك الاستفاضة بمعنی نقل الحکم المذکور وهی اقوی من الشهادة (وفیه ایضا) قال الرحمتی معنی الاستفاضة ان تاتی من تلك البلدة جماعات متعددون کل منهم یخبر عن اهل تلك البلدة انهم صاموا عن رویة۔ (ردالمحتار مصری ج۲ص۹۷)

ذخیرہ میں ہے کہ شمس الائمہ حلوانی نے فرمایا کہ ہمارے اصحاب کا صحیح مذہب یہ ہے کہ خبر جب مستفیض ہوجائے اور متحقق ہوجائے کسی دوسرے اہل شہر میں تو ان پر اس شہر کا حکم لازم ہے اور یہی حکم شرنبلالی میں مغنی سے منقول ہے۔میں نے کہا کہ استدراک کی وجہ یہ ہے کہ اس استفاضہ میں نہ تو قضا کے قاضی پر ثبوت ہے نہ شہادت علی الشہادت ہے۔لیکن جب استفاضہ بمنزلہ خبر متواتر کے ہے تو اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ اس شہر کے لوگوں نے فلاں دن روزہ رکھا تو اس سے اس لئے عمل لازم ہوا کہ شہر حاکم شرع کے حکم پر مبنی ہوگا تو یہ استفاضہ حکم مذکور کے نقل کی مانند ہوگیا اور وہ شہادت سے زیادہ قوی ہے۔

رحمتی نے استفاضہ کے معنی یہ بیان کئے کہ اس شہر سے چند جماعتیں آئیں اور ان میں سے ہر ایک اس شہر والوں کی یہ خبر دے کہ ان لوگوں نے چاند دیکھ کر روزے رکھے۔

اس عبارت سے ثابت ہوگیا کہ خبر استفاضہ خبر متواتر کے حکم میں ہے جو یقین کا افادہ کرتی ہے کہ اس سے قضائے قاضی کا ثبوت بتواتر ثابت ہوتا ہے جو حجت شرعیہ ہے۔لہذا استفاضہ سے بھی ثبوت ہلال بطریق موجب ثابت ہوتا ہے۔

بالجملہ طریق موجب کی یہ چھ صورتیں ہیں جن سے انتیس (۲۹) کا چاند دوسرے شہر کی رویت سے ثابت کیا جاسکتا ہے ان کے علاوہ جو طریقے عوام میں رائج ہیں یا سوالات جن پر مشتمل ہے ان کا تفصیلی بیان یہ ہے۔

شہادت فاسق

فاسق وہ شخص ہے جو کبیرہ گناہ کرتا ہو یا صغیرہ گناہ پر اصرار کرتا ہو۔

علامہ ابن عابدین ردالمحتار میں بحر سے ناقل ہیں:

الفاسق من فعل كبيرة او اصر على صغيرة ۔ (ردالمحتار مصری ج۴ ص۳۹۹)

فاسق وہ ہے جو کبیرہ گناہ کرے یا صغیرہ گناہ پر اصرار کرے۔

تو اگر وہ فاسق کہیں سے آ کر انتیس کے رویت ہلال کی شہادت دیں کہ فلاں شہر میں فلاں وفلاں شخصوں نے چاند دیکھا اور انہوں نے ہمیں شاہد بنایا۔ یا ہمارے سامنے دارالقضا میں شہادتیں گذریں اور قاضی شہر نے اس پر حکم دیا۔ یا خود یہ شہادتیں دیں کہ ہم نے فلاں دن انتیس کا چاند دیکھا ہے تو ان کی یہ سب شہادتیں غیر معتبر ہیں۔

ہدایہ میں ہے: وتشترط العدالة لان قول الفاسق فی الدیانات غیر مقبول۔

(ہدایہ اولین مطبوعہ یوسفی لکھنو ص۱۹۷)

شہادت کے لئے عدالت شرط ہے کیونکہ فاسق کا قول دیانات میں مقبول نہیں۔

علامہ طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح میں فرماتے ہیں:

وفی الدرایة لایقبل خبر الفاسق اتفاقا وفی البحر قول الفاسق فی الدیانات التی یمکن تلقیها من العدول غیر مقبول کالهلال ورواية الاخبار ولو تعدد کفاسقین فاكثر۔

(طحطاوی مصری ص۳۸۰)

درایہ میں ہے کہ فاسق کی خبر بالاتفاق مقبول نہیں۔ اور بحرالرائق میں ہے کہ فاسق کا قول ان دیانتوں میں جو عادلوں سے بھی معلوم ہو سکیں مقبول نہیں جیسے رویت ہلال اور روایت اخبار اگرچہ متعدد ہو جائیں جیسے دو فاسق ہوں بلکہ زیادہ۔

لہذا جب فاسق کی شہادت غیر مقبول ہے تو یہ طریق موجب میں داخل نہیں تو اس کی شہادت سے رویت ہلال ثابت نہیں ہو سکتا۔

شہادت مستور

مستور وہ شخص ہے جو مجہول الحال ہو کہ اس کی عدالت وفسق کا اظہار نہ ہوتا ہو۔

مراقی الفلاح میں ہے: هو مجهول الحال لم یظهر له فسق ولاعدالة۔

(طحطاوی ص۳۸۰)

مستور وہ مجہول الحال ہے جس کی عدالت وفسق ظاہر نہ ہو۔

تو مستور کی شہادت صرف رمضان مبارک کے چاند میں جب مطلع پر ابر وغبار ہو شرعا معتبر ہے۔

درمختار میں ہے: قیل للصوم مع علة کغیم وغبار خبر عدل او مستور علی ماصححه البزازی علی خلاف ظاهر الروایة لا فاسق اتفاقا۔ (ردالمحتار مصری ج۲ ص۹۳)

ابر وغبار کے ساتھ روزہ کے لئے ایک عادل یا مستور کی خبر قبول کر لی جائے گی۔ بزازی نے ظاہر الروایت کے خلاف اس کی تصحیح کی فاسق کی خبر بالاتفاق مقبول نہیں۔

اور رمضان مبارک کے سوا اور باقی چاندوں میں مستور کی شہادت نامقبول وغیر معتبر ہے۔

درمختار وردالمحتار میں ہے: قوله وهلال الاضحی وبقية الاشهر التسعة كالفطر فلایقبل فيها الاشهادة رجلين او رجل وامرأتين عدول احرار غير محدودين كما فی سائر الاحکام۔ (ردالمحتار ج۲ ص۹۸)

اضحیٰ اور بقیہ نو ماہ کا ہلال ہلال فطر کی طرح ہے کہ ان میں دو مرد یا ایک مرد دو عورتوں عادلوں آزاد غیر محدودوں کی شہادت ہی مقبول ہوگی۔ جیسا کہ تمام احکام میں ہے۔

صاحب درمختار شرح ملتقی میں فرماتے ہیں: وقبل فی هلال الفطر وذی الحجة وبقية الاشهر التسعة شهادة حرين وحر وحرتين بشرط العدالة ولفظ الشهادة۔

(درالمنتقی مصری ج۱ ص۲۳۶)

عیدالفطر اور ذی الحجہ اور بقیہ نو ماہ کے چاند میں دو آزاد مردوں یا ایک آزاد مرد دو عورتوں کی شہادت بشرط عدالت اور لفظ شہادت کے قبول کی جائے گی۔

ان عبارات سے رمضان کے عیدالفطر وعیداضحیٰ وغیرہ تمام چاندوں کے لئے شاہدین کا عادل ہونا شرط ثابت ہوا تو ان میں مستور کی شہادت غیر معتبر قرار پائی اور طریق موجب نہیں ٹھہری لہذا اس کی شہادت سے عیدین وغیرہ کی رویت ہلال ثابت نہیں ہو سکتی۔

شہادت کافر ومرتد

مرتد وہ شخص ہے جو دین اسلام سے پھر جائے اور ایمان لانے کے بعد کوئی کلمہ کفر زبان پر جاری

کرے۔ درمختار میں ہے:

المرتد لغة الراجع مطلقا وشرعا الراجع عن دين الاسلام وركنها اجراء كلمة الكفر على اللسان بعد الايمان۔ (ردالمحتار ج۳ ص۲۹۱)

لغت میں مرتد کے معنی مطلق رجوع کرنے والے کے ہیں اور شرع میں دین اسلام سے رجوع کرنے والے کے ہیں اور اس کا رکن ایمان کے بعد زبان پر کفری کلمہ جاری کرنا ہے۔

اور کافر ومرتد کی شہادت نامقبول وغیر معتبر ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

لاتقبل شهادة الكافر على المسلم واما شهادة المرتد والمرتدة فقد اختلف المشائخ فيها فقال بعضهم تقبل على الكفار وقال بعضهم تقبل على مرتد مثله والاصح انها لاتقبل على كل حال هكذا في المحيط مختصراً۔

(عالمگیری مجیدی ج۳ ص۲۳۱)

مسلمان پر کافر کی شہادت مقبول نہیں۔ لیکن مرتد مرد یا عورت کی شہادت اس میں مشائخ نے اختلاف کیا۔ بعض نے کہا کہ کافر کی گواہی کفار پر مقبول ہے۔ اور بعض نے فرمایا اپنے جیسے مرتد پر مقبول ہے اور صحیح مذہب یہ ہے کہ وہ کسی حال میں مقبول نہیں اسی طرح محیط میں ہے۔

اس عبارت سے ثابت ہوگیا کہ کافر ومرتد کی شہادت غیر مقبول ہے۔ تو اب مدعیان اسلام میں جو فرقے حد کفر تک پہونچ گئے اور علماء حرمین شریفین وشام وہند نے جن کے ارتداد پر فتوے دیدیئے ان کی شہادت بھی کسی طرح مقبول نہیں ہوسکتی جیسے غالی، رافضی۔ قادیانی۔ چکڑالوی وغیرہ۔

چنانچہ صاحب درمختار ملتقی میں فرماتے ہیں۔

كل من كفر منهم (اى من اهل الاهواء) كالمجسمة والخوارج وغلاة الروافض والقائلين بخلق القران ولاتقبل شهادتهم۔ درالمنتقی مصری ج۲ ص۲۰۰

اہل اہواء سے جو کافر ہوگیا جیسے فرقہ مجسمہ اور خارجی اور غالی رافضی۔ اور خلق قرآن کے قائل، ان کی شہادت مقبول نہیں۔

لہذا کافر ومرتد کی شہادت جب طریق موجب سے نہیں تو ان کی شہادت سے بھی رویت ہلال

ثابت نہیں ہوسکتا۔

شہادت نساء

فقط ایک عورت عادلہ کی شہادت رمضان مبارک کے چاند میں ابر وغبار کی حالت میں معتبر ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

ان كان بالسماء علة فشهادة الواحد على هلال رمضان مقبولة اذا كان عدلا مسلما عاقلا بالغا حرا كان او عبدا ذكرا كان او انثى۔

(عالمگیری مجیدی ج۱ ص۱۰۱)

اگر آسمان پر ابر وغبار ہو تو رمضان کے چاند میں ایک کی شہادت مقبول ہے جب وہ مسلمان عاقل بالغ عادل ہو آزاد ہو غلام مرد ہو یا عورت۔

لیکن ہلال رمضان کے علاوہ اور چاندوں میں بلا مرد کے صرف عورتوں کی شہادت نامقبول وغیر معتبر ہے۔ ہدایہ میں ہے: ولاتقبل شهادة الاربع منهن وحدهن۔ (ہدایہ جلد۳ ص۱۳۹)

صرف چار عورتوں کی گواہی مقبول نہیں۔

درمختار میں ہے: ولاتقبل شهادة اربع بلا رجل۔ (ردالمحتار ج۴ ص۳۸۷)

بغیر مرد کے چار عورتوں کی شہادت مقبول نہیں۔

لہذا صرف ایک عورت کی شہادت سے ہلال رمضان تو ثابت ہوسکتا ہے اور عیدین کا اور باقی مہینوں کا چند صرف عورتوں کی شہادت سے ثابت نہیں ہوسکتا بلکہ اگر دو عورتیں ہوں تو ان کے ساتھ ایک مرد کا ہونا ضروری ہے۔

شہادت علی الشہادت

شاہدین فرع کو اگر شاہدین اصل نے اپنی گواہی پر گواہ نہیں بنایا ہے تو شاہدین فرع کی شہادت بھی غیر معتبر ہے۔ اگر چہ انہوں نے ان کی شہادت کو اپنے کان ہی سے سنا ہو۔

درمختار میں ہے: (قوله وكيفيتها ان يقول الاصل مخاطبه للفرع ولو ابنه بحر اشهد على شهادتي اني اشهد بكذا) قيد بقوله اشهد لانه بدونه لايسعه ان يشهد على شهادته وان سمعها منه لانه كالنائب عنه فلا بد من التحميل والتوكيل۔

(ردالمحتار ج ۴ ص ۴۱۰)

شہادت علی الشہادۃ کا طریقہ یہ ہے کہ گواہان اصل گواہان فرع کو مخاطب بنا کر یہ کہیں اگر چہ وہ اس کا بیٹا ہو کہ تو میری شہادت پر شاہد بن کہ میں ایسی شہادت دیتا ہوں۔تو شاہدین کی قید اس لئے ہے کہ بغیر اس کے شاہد فرع شاہد اصل کی شہادت پر شہادت نہیں دے سکتا اگر چہ اس نے اس شہادت کو اس سے سنا ہو کیونکہ یہ اس کے نائب کی طرح ہے تو تحمیل وتوکیل ضروری ہے۔

بلکہ شاہدین فرع کو ادا شہادت کے وقت شاہدین اصل کی شہادت کے ذکر کے ساتھ تحمیل کا ذکر ضروری ہے۔عالمگیری میں ہے:

یقول شاهد الفرع عندالاداء اشهد ان فلانا قال لی اشهد علی شهادتی بذلك لانه لابد من شهادته و ذکره شهادة الاصل و ذکره التحمیل۔(عالمگیری ج ۳ ص ۲۳۴)

شاہد فرع ادائے شہادت کے وقت کہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ مجھ سے فلاں نے کہا کہ میری شہادت پر تو گواہ ہو اس لئے کہ اس کی شہادت اور اس کا شہادت کا ذکر کرنا اور تحمیل کا ذکر ضروری ہے۔

لہذا قاضی یا مفتی کے سامنے شاہدین فرع نے شاہدین اصل کی رویت ہلال کی شہادت کا صرف سننا بیان کیا اور یہ ذکر نہیں کیا کہ شاہدین اصل نے ہمیں اپنی شہادت پر گواہ بنایا اور ہم سے یہ کہا کہ تم میری گواہی پر گواہ ہو جاؤ تو ان شاہدین فرع کی نہ یہ شہادت معتبر نہ یہ طریق موجب میں داخل۔لہذا ایسی شہادت علی الشہادت سے رویت ہلال ثابت نہیں ہو سکتی۔

شہادت علی القضا

کسی شہر سے دو شخصوں نے آکر قاضی یا مفتی کے سامنے یہ کہا کہ فلاں شہر میں قاضی کے روبرو رویت ہلال کی گواہیاں گذریں اور اس قاضی نے ان کی شہادت پر رویت ہلال کا حکم دیا لیکن ہم اس وقت مجلس قضا میں موجود نہ تھے تو ان کی یہ شہادت بھی غیر معتبر اور نا مقبول ہے۔

درمختار میں ہے:نعم الشهادة بقضاء القاضی صحیحة وان لم یشهدهما القاضی علیه وقیده ابو یوسف بمجلس القضاء وهو الاحوط ذکره فی الخلاصة۔

(ردالمحتار مصری ج ۴ ص ۳۹۰)

ہاں حکم قاضی کی شہادت صحیح ہے اگر چہ قاضی نے ان گواہان کو اس پر شاہد نہ بنایا ہو حضرت امام ابو یوسف نے ان گواہوں کے مجلس قضا میں موجود ہونے کی قید لگائی۔یہی مفتی بہ قول ہے۔اس کو خلاصہ میں

ذکر کیا۔

لہذا اگر ان شاہدوں نے رویت ہلال کی اس شہر کے قاضی یا مفتی کے سامنے ایسی شہادت علی القضا گذاری اور خود اپنا مجلس قضا میں نہ ہونا بھی بیان کیا تو ان شاہدوں کی یہ شہادت غیر معتبر ہے نہ یہ طریق موجب نہ ایسی شہادت علی القضا سے رویت ہلال ثابت ہو سکتی ہے۔

شہادت علی کتاب القاضی

اگر یہاں کے قاضی کی مجلس میں ایک اسلامی شہر کے قاضی کا خط لیکر دو شاہد آئے اور انہوں نے یہ کہا کہ ہمیں یہ خط فلاں شہر کے فلاں بن فلاں قاضی نے ہمارے مکان پر سپرد کیا۔یا اپنی مجلس قضا میں نہیں سونپا۔یا اس پر ہمارے سامنے مہر نہیں لگائی۔یا اس کو ہمیں پڑھکر نہیں سنایا۔یا اس قاضی نے بلا شہود کے یہ خط ڈاک وغیرہ کے ذریعہ روانہ کیا۔یا ان شاہدوں کا عادل ہونا اس قاضی کو ظاہر نہ ہو سکا۔تو نہ وہ خط قاضی معتبر نہ ان شاہدوں کی شہادت مقبول۔

ردالمحتار میں ہے: لاشهادة بلاعلم المشهود به (فیه ایضا) فی الذخیرة وانما قال عندهم لانه لابد ان یشهدوا عنده ان الختم بحضرتهم (فیه ایضا) قوله سلم الکتاب الیهم ای فی مجلس یصح حکمه فیه فلو سلم فی غیر ذلك المجلس لم یصح (فیه ایضا) ان شهدوا انه کتاب فلان القاضی سلمه الینا فی مجلس حکمه وقرأه علینا وختمه ففتحه القاضی وقرأه اذا ثبتت عدالتهم بان کان یعرفهم بها او وجد فی الکتاب عدالتهم او سأل من یعرفهم من الثقات فزکوا واما قبل ظهور عدالتهم فلایحکم به۔

(ردالمحتار ج ۴ ص ۳۶۶)

بغیر مشہود بہ کے جانے ہوئے شہادت کا دینا صحیح نہیں۔ذخیرہ میں ہے کہ یہ بات ضروری ہے کہ وہ گواہان قاضی کے سامنے یہ گواہی دیں کہ مہر ان کی موجودگی میں لگائی گئی۔اور قاضی ان گواہوں کو وہ خط ایسی مجلس میں سونپے جس میں حکم دینا صحیح ہو تو اگر اس نے غیر مجلس قضا میں سونپا تو صحیح نہیں۔اور اگر گواہان نے شہادت دی کہ یہ خط فلاں قاضی کا ہے۔اس نے ہمیں اپنی مجلس قضا میں اس کو سونپا۔اور اس کو ہمیں پڑھ کر سنایا اور اس پر مہر لگائی تو یہ قاضی اس کو کھولے اور پڑھے جب ان گواہان کی عدالت ثابت ہو جائے بایں طور کہ یا تو ان کی عدالت کو خود جانتا ہو یا خط میں ان کی عدالت موجود ہو۔یا جاننے والے ثقہ سے ان کو دریافت کرے تو وہ ان کا تزکیہ بیان کریں لیکن ان کی عدالت کے ظاہر ہونے سے پہلے پس اس خط پر

حکم نہ دے۔

ہدایہ اخیرین میں ہے: ولا يقبل الكتاب الا بشهادة رجلين او رجل وامرأتين لان الكتاب يشبه الكتاب فلايثبت الا بحجة تامة وهذا لانه ملزم فلابد من الحجة۔

(ہدایہ اخرین مطبوعہ رشیدیہ ج۳ ص۱۲۲)

خط دو مرد یا ایک مرد دو عورتوں ہی کی شہادت پر قبول کیا جائے گا کیونکہ خط خط کے مشابہ ہوتا ہے۔ تو بغیر دلیل تام کے ثابت نہیں ہوسکتا۔ اور یہ اس لئے کہ وہ خط لازم کرنے والا ہے تو حجت ضروری ہے۔

لہذا قاضی کے ایسے خط اور شاہدوں کی شہادت سے بھی رویت ہلال ثابت نہیں ہوسکتی کہ یہ طریق موجب نہیں۔

حکایت

کسی شہر سے چند لوگ آئے اور انہوں نے یہ کہا کہ فلاں شہر میں تو انتیس (۲۹) کا چاند فلاں ماہ کا فلاں دن دو شخصوں نے دیکھا ہے اور ہم نے یہ بھی سنا ہے۔ کہ قاضی شہر یا مفتی شہر نے لوگوں کو روزہ رکھنے کا حکم بھی دیا ہے۔ انہوں نے نہ خود چاند دیکھا نہ دیکھنے والوں نے ان کے سامنے گواہی دی۔ تو ان کی یہ خبر صرف حکایت ہوئی جو طریق موجب نہیں تو ایسی حکایت سے رویت ہلال ثابت نہیں ہوتی۔

ردالمحتار میں ہے: لو شهدوا برؤية غيرهم وان قاضي تلك المصر امر الناس بصوم رمضان لانه حكاية لفعل القاضي ايضا وليس حجة۔ (ردالمحتار مصری ج۲ ص۹۷)

اگر گواہان نے دوسرے لوگوں کی رویت کی گواہی دی۔ اور اس شہر کے قاضی نے لوگوں کو رمضان کے روزے کا حکم دیا تو یہ حجت نہیں اس لئے کہ یہ فعل قاضی کی حکایت ہے۔

مجمع الانہر میں ہے: لو شهد ان اهل بلدة كذا رأوا الهلال قبلكم بيوم وهذا يوم الثلثين فلم يرالهلال فی تلك الليلة والسماء مصحية فلايباح الفطر غدا ولايترك التراويح لان هذه الجماعة لم يشهد وابالروية ولا على شهادة غيرهم وانما حكم روية غيرهم۔

(مجمع الانہر مصری ج۱ ص۲۳۹ عالمگیری مجیدی ج۱ ص۱۰۲)

اگر گواہان نے شہادت دی کہ فلاں شہر والوں نے تم سے ایک دن پہلے چاند دیکھا اور وہ دوشنبہ کا دن ہے اور اس رات میں چاند نہیں دیکھا گیا کہ آسمان ابر و غبار آلود ہے تو کل کو روزہ نہ رکھنا مباح نہیں

اور تراویح ترک نہ کریں اس لئے کہ ان گواہوں نے نہ خود اپنی رویت کی شہادت دی نہ اپنے غیر کی شہادت کی بلکہ انہوں نے دوسروں کی حکایت کی۔

افواہ

شہر میں یہ خبر اڑی کہ انتیس کا چاند ہوگیا لیکن جس سے دریافت کیا جاتا ہے تو وہ یہی کہتا ہے کہ میں نے سنا ہے لوگوں میں ذکر ہو رہا ہے اور دیکھنے والے کا پتہ نہیں چلتا نہ وہاں کوئی ایسا قاضی یا مفتی ہے جس کے پاس شہادت گذاریں۔ یا مفتی تو ہے لیکن عوام ایسے نااہل وخودسر ہیں جو اس کی طرف رجوع نہیں کرتے بلکہ یہ عوام جب چاہتے ہیں عید ٹھہرا لیتے ہیں اور محض افواہ کی بنا پر ہی نقارہ بجانے لگتے ہیں یا بندوقیں اور پٹاخے چھوڑنے شروع کردیتے ہیں تو ایسی افواہ سے اور ایسے نقارہ بجانے یا بندوقیں چھوڑنے سے رویت ہلال ثابت نہیں ہوتی۔

علامہ ابن عابدین شامی میں فرماتے ہیں:

مجرد الشيوع من غير علم بمن اشاعه كما قد تشيع اخبار يتحدث بهاسائر اهل البلدة ولايعلم من اشاعها كما ورد ان فی آخر الزمان يجلس الشيطان بين الجماعة فيتكلم بالكلمة فيتحدثون بها ويقولون لاندری من قالها فمثل هذا لا ينبغی فضلا عن ان يثبت به حكم۔ (ردالمحتار مصری ج۲ ص۹۷)

اشاعت کرنے والے کے بغیر جانے ہوئے کسی بات کا محض مشہور ہوجانا جیسے بعض خبریں ایسی شائع ہوجاتی ہیں جس کو تمام اہل شہر بیان کرتے ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ انہیں کس نے شائع کیا جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا کہ آخر زمانہ میں شیطان لوگوں میں بیٹھے گا اور ایک بات کہے گا تو لوگ اس کو بیان کریں گے اور کہیں گے کہ ہم نہیں جانتے کہ اس کو کس نے کہا۔ تو ایسی خبر سننے کے لائق نہیں چہ جائیکہ اس سے کوئی حکم ثابت ہو۔

اور اگر ایسی افواہ کو سنکر کچھ لوگ دوسرے کسی شہر میں پہونچکر خبر دیں کہ فلاں شہر میں یہ شہرت تھی کہ انتیس کا چاند ہوگیا تو یہ ہرگز ہرگز استفاضہ نہیں کہلایا جاسکتا کہ ایسی افواہ اور بازاری خبر سے رویت ہلال ثابت نہیں ہوسکتی نہ یہ استفاضہ کہلایا جاسکتا ہے۔

ردالمحتار میں ہے:

ان اهل تلك البلدة رأوا الهلال وصاموا الا انها لاتفيد اليقين فلذا لم تقبل الا اذا كانت

علی الحکم او علی شہادۃ غیرھم لتکون شہادۃ معتبرۃ والا فھی مجرد اخبار بخلاف الاستفاضۃ فانھا تفید الیقین فلاینافی ماقبلہ۔

(ردالمحتار مصری ج۲ص۹۷)

اس اہل شہر نے چاند دیکھکر روزہ رکھا تو یہ خبر یقین کا فائدہ نہ دیتی تو اس بنا پر قبول نہیں کی جائے گی۔ ہاں جب وہ شہادت حکم یا غیر کی شہادت پر ہو تو معتبر شہادت ہوگی ورنہ وہ فقط خبر ہے بخلاف استفاضہ کے کہ وہ تو یقین کا فائدہ کرتا ہے تو ماقبل کا منافی نہ ہوا۔

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے

قولہ لزم سائر الناس فی سائر اقطار الدنیا اذا ثبتت عندھم الرویۃ بطریق موجب کان یتحمل اثنان الشہادۃ او یشھدا علی حکم القاضی اویستفیض الخبر بخلاف ما اذا اخبران اھل بلدۃ کذا رأوہ لانہ حکایۃ۔ (طحطاوی مصری ص۳۸۲)

تمام لوگوں کو تمام اقطار دنیا میں لازم ہے جب ان کے پاس رویت کا ثبوت بطریق موجب پہنچ جائے جیسے دو شخص شہادت کے حامل بنیں یا دو شخص حکم قاضی پر شہادت دیں، یا خبر مستفیض ہو بخلاف جبکہ یہ خبر سنائی کہ فلاں شہر کے لوگوں نے چاند دیکھا ہے کہ یہ حکایت ہے۔

لہذا نہ ایسی افواہ طریق موجب نہ اس سے رویت ہلال ثابت ہوسکے۔

اخباری خبر

اخبار میں کسی ماہ کی انتیس کے اعتبار سے تاریخیں لکھدینا یا صاف طور پر یہی لکھنا کہ ہمارے شہر میں یا فلاں شہر میں فلاں ماہ کا چاند انتیس کا ہوا۔ تو اخباروں کی بے اعتباری اور گپوں سے قطع نظر بھی کرلی جائے۔ اور اس کو مطابق واقع کے صحیح بھی فرض کرلیا جائے تو اس کو زائد سے زائد خبر کا مرتبہ حاصل ہوا۔ جس کا غیر معتبر ہونا اوپر کی عبارات سے ثابت ہوچکا۔

ردالمحتار میں ہے: فانھم لم یشھدوا بالرویۃ ولاعلی شہادۃ غیرھم وانما حکوا رویۃ غیرھم (وفیہ ایضا) اذا اخبر ان اھل بلدۃ کذا رؤاہ لانہ حکایۃ۔

(ردالمحتار مصری ج۲ص۹۶وج۲ ص۹۹)

کہ گواہوں نے نہ تو خود اپنی رویت کی شہادت دی نہ غیر کی شہادت پر گواہی دی بلکہ انہوں نے اپنے غیر کی رویت کی حکایت کی۔ اور جب یہ خبر دی کہ فلاں شہر والوں نے چاند دیکھا تو یہ حکایت ہے۔

لہذا اخبار کی خبر نہ طریق موجب نہ اس سے رویت ہلال ثابت ہوسکے۔

خطوط ولفافے

اگر کسی شہر سے خط آیا اور اس میں انتیس کے رویت ہلال کی خبر ہو چاہے کاتب کی طرز عبارت کی شناخت کرتا ہو اور اس کے رسم الخط کو پہچانتا ہو۔ لیکن فقہاء کرام نے امور شرعیہ میں خط کا اعتبار نہیں کیا۔

ہدایہ میں ہے: الخط یشبہ الخط فلم یحصل العلم۔

(ہدایہ مطبوعہ رشیدیہ ج۳ص۴۲)

خط خط کے مشابہ ہوتا ہے تو اس سے یقین حاصل نہیں ہوتا۔

الاشباہ والنظائر میں ہے: لایعتمد علی الخط ولا یعمل بہ۔

(الاشباہ والنظائر مع شرح حموی کشوری ص۳۰۵)

خط پر نہ اعتماد کیا جائے نہ اس پر عمل کیا جائے۔

درمختار میں ہے: لایعمل بالخط۔ (ردالمحتار مصری ج۴ص۳۶۷)

خط پر عمل نہ کیا جائے۔

مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں ہے: الخط یشبہ الخط۔ (مجمع الانہر مصری ج۲ص۱۹۲)

خط خط کے مشابہ ہوتا ہے۔

ردالمحتار میں ہے: لایقضی القاضی بذالک عندالمنازعۃ لان الخط مایزور ویفتعل۔

(ردالمحتار مصری ج۴ص۳۶۷)

قاضی بوقت منازعت خط پر فیصلہ نہ کرے اس لئے کہ خط ان میں سے ہے جو بنایا جاسکتا ہے اور گڑھا جاسکتا ہے۔ عینی شرح کنز میں ہے: ان الخط یشبہ الخط فلایلزم حجۃ لانہ یحتمل التزویر۔ (عینی مصری ج۲ص۸۰)

خط خط کے مشابہ ہوجاتا ہے تو حجت ملزمہ نہیں ہوا کیونکہ وہ تزویر کا احتمال رکھتا ہے۔

فتاوی قاضی خاں میں ہے: القاضی انما یقضی بالحجۃ والحجۃ ھی البینۃ او الاقرار اما صلک لایصلح حجۃ لان الخط یشبہ الخط۔

(قاضی خاں مصطفائی ج۴ص۳۲۷)

قاضی تو حجت پر حکم دے اور حجت وہ بینہ یا اقرار ہے لیکن چک وہ حجت ہونے کے لائق نہیں اس

لئے کہ خط خط کے مشابہ ہوتا ہے۔

فتاوی خیریہ میں ہے: والخط لایعتمد علیہ و لایعمل بہ ۔ (خیریہ مصری ج ۲ ص ۱۹)

اور خط پر نہ اعتماد کیا جائے نہ اس پر عمل کیا جائے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: الکتاب قد یفتعل و یزور والخط یشبہ الخط والخاتم یشبہ الخاتم۔ (فتاوی عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۱۷۲)

خط کبھی بنالیا جاتا ہے اور گڑھ لیا جاتا ہے۔ اور خط خط کے مشابہ ہوجاتا ہے۔ اور مہر مہر کے مشابہ ہوجاتی ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ خط نہ قابل اعتبار نہ لائق عمل نہ اس پر حکم دینا جائز اس لئے کہ خط خط کے مشابہ ہوجاتا ہے اور بن سکتا ہے اور ایک خط کا رسم دوسرے سے ملایا جاسکتا ہے۔ لہذا جس چیز میں مشابہ بنجائے اور تزویر کی قابلیت ہو اس پر شرعی احکام کی بنا کس طرح رکھی جاسکتی ہے۔ ابھی شہادت علی کتاب القاضی میں ہدایہ سے عبارت منقول ہوئی کہ حاکم کا دستخطی خط جو اس نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہو اور اس پر حکومت کی مہر بھی لگی ہوئی ہو تو وہ بلا دو گواہوں کی شہادت کے مقبول نہیں۔ لہذا یہ ڈاک کے ذریعہ سے آئے ہوئے خطوط ولفافے کس طرح قابل اعتبار اور لائق عمل ہوسکتے ہیں تو ان خطوط لفافوں سے ہرگز ہرگز رویت ہلال ثابت نہیں ہوسکتی۔

ٹیلی گرام تار

جب خط کا غیر معتبر ہونا اور نا قابل عمل ہونا ثابت ہوچکا تو تار کا تو یہ حال زار ہے۔

(۱) تار دینے کے لئے معزز لوگ خود تار گھر نہیں جاتے ہیں بلکہ تار دینے کے لئے کسی شخص کو بھیجدیتے ہیں تو پہلا واسطہ تو یہ شخص ہوا۔

(۲) تار کے لئے فارم کی حاجت ہوتی ہے۔ اس میں مضمون انگریزی میں لکھا جاتا ہے تو اگر اس کو انگریزی نہیں آتی ہے تو کسی انگریزی داں کی ضرورت ہے تو یہ انگریزی کا لکھنے والا دوسرا واسطہ ہوا۔

(۳) اس فارم کو تار بابو کو دیا تو یہ تار بابو تیسرا واسطہ ہوا۔

(۴) تار بابو نے تار کے کھٹکوں سے جن کے اطوار مختلفہ کو انہوں نے اپنی اصطلاح میں علامت حروف قرار دے رکھا ہے اس سے اشاروں اشاروں میں عبارت بنائی اور وہ جدا ہوگیا۔

(۵) یہاں کے تار بابو نے ان کھٹکوں پر غور کرکے اپنی فہم کے موافق اسکی عبارت بنا کر ایک پرچہ پر انگریزی میں لکھدیا تو یہ چوتھا واسطہ ہوا۔

(۶) پھر وہ کاغذ کا پرچہ کسی ہرکارہ کو دیا گیا وہ اس کو پہنچا کر چلتا بنا یہ پانچواں واسطہ ہوا۔

(۷) پھر اگر یہ شخص انگریزی داں نہیں ہے تو ایک مترجم کی حاجت پیش آئی تو یہ چھٹا واسطہ ہوا۔

(۸) پھر ترجمہ کے لئے اکثر بڑے لوگ مترجم کے پاس کسی شخص کو بھیجدیتے ہیں تو یہ شخص ساتواں واسطہ ہوا۔

تو جس کے مضمون پر مطلع ہونے کے لئے اس قدر واسطے ہوں جن کی عدالت تک کا علم نہ ہو بلکہ بعض کا تو نام تک معلوم نہیں ہوتا اور اگر اس سے بھی قطع نظر کرلیجئے تو ان میں بعض کے مسلمان ہونے کا بھی پتہ نہیں ہوتا کہ تار بابو اور ہرکارے کافر بھی ہوتے ہیں۔ غرض یہ سلسلہ سند کیا عجیب ہے کہ اس میں مجہول بھی ہیں نامقبول بھی ہیں نااہل بھی ہیں پھر اس کو بھی جانے دیدیجئے تو تار میں بھیجنے والے کا جو نام لکھا ہے اس کا کیا ثبوت ہے کہ واقعی اس کا بھیجا ہوا ہے۔ پھر اگر اس سے بھی قطع نظر کیجائے تو خود تار کے دینے والوں اور لینے والوں اور پڑھنے والوں سے اکثر غلطیاں ہوتی ہی رہتی ہیں جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تو آخر اس تار کی کونسی بات قابل اعتبار اور لائق اعتماد ہے اور اگر فرض کرلیجئے کہ تار بالکل صحیح طور پر پہونچ گیا تو یہ تار زائد سے زائد خبر کا افادہ کرے گا نہ کہ شہادت واستفاضہ کا اور خبر کا غیر معتبر ہونا اوپر کی کثیر عبارات سے ثابت ہوچکا۔ لہذا تار کے ایسے احوال کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پر احکام شرع کی بنا کس طرح ممکن ہوسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تار نہ ملزم ہے نہ طریق موجب تو اس سے رویت ہلال کس طرح ثابت ہوسکتی ہے۔

ٹیلی فون

ٹیلی فون میں اگرچہ تار کی سی قباحتیں جہالتیں اور مجہول وسائط تو نہیں لیکن اس پر بولنے والا مجہول ہے اگرچہ وہ اپنا نام وولدیت اور پتہ بھی بتادے کہ اس کا شرعی طور پر کوئی ثبوت نہیں کہ واقعی یہ وہی شخص معروف ہے پھر اگر یہ کہا جائے کہ اس کی آواز سے اس کی صحیح معرفت ہوجاتی۔ تو شریعت مطہرہ نے اس چیز کو معتبر نہیں قرار دیا۔

ہدایہ میں ہے: ولو سمع من وراء الحجاب لایجوز لہ ان یشھد ولو فسر القاضی

لایقبله لان النغمة تشبه النغمة فلم یحصل العلم ۔ (ہدایہ مطبوعہ رشیدیہ ج ۳ ص ۱۴۲)

اگر پردہ سے کوئی آواز سنی تو اس کی شہادت دینا جائز نہیں اگر چہ قاضی سے ظاہر کردے تو وہ اس لئے قبول نہ کرے کہ نغمہ نغمہ کی مشابہ ہو جاتا ہے تو اس سے یقین نہیں حاصل ہوتا۔

تو جب نغمہ نغمہ کے مشابہ ہو جاتا ہے تو اس میں تزویر کی گنجائش خود اس کی بے اعتباری کے لئے نہایت کافی دلیل ہے ملاحظہ ہو کہ فقہائے کرام تو یہ تصریح فرماتے ہیں۔ جس کو۔

فتاوی عالمگیری میں نقل کیا:

یجب ان یعلم ان کتاب القاضی الی القاضی صار حجة شرعا فی المعاملات علی خلاف القیاس لان الکتاب قد یفتعل و یزور والخط یشبه الخط والخاتم یشبه الخاتم ولکن جعلناه حجة بالاجماع ولکن انما یقبله القاضی المکتوب الیه عند وجود شرائط ومن جملة الشرائط البینة حتی ان القاضی المکتوب الیه لایقبل کتاب القاضی مالم یثبت بالبینة انه کتاب القاضی۔ (عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۱۷۲)

یہ جاننا واجب ہے کہ قاضی کا خط دوسرے قاضی کی طرف معاملات میں خلاف قیاس حجت شرعی ہے کہ خط بنایا اور گڑھا جاسکتا ہے اور خط خط کے مشابہ ہو جاتا ہے اور مہر مہر کے مشابہ ہو جاتی ہے لیکن ہم نے اس کو اجماع سے حجت قرار دیا۔ مگر اس کو مکتوب الیہ قاضی اس کے تمام شرائط کے پائے جانے پر قبول کرے اور منجملہ شرائط کے بینہ ہے یہاں تک کہ قاضی مکتوب الیہ خط قاضی کو اس وقت تک قبول نہ کرے جب تک بینہ سے یہ نہ ثابت ہو جائے کہ وہ خط قاضی ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ قاضی کا وہ خط جس کو اس نے خود لکھا اور اسپر اپنے دستخط کر کے حکومت کی مہر لگادی ہو وہ تزویر کے احتمال کی بنا پر مقبول نہ ہوا لیکن اس پر اعتبار کرنے کے لئے باوجود اجماع کے بھی شہادت کو لازم قرار دیا۔ اور ثبوت بینہ کی بنا پر حجت مانا تو تو یہ ٹیلی فون جس کا بولنے والا مجہول پھر نہ اس کا قول نامہ قاضی کی برابر حیثیت رکھے نہ اس کے ساتھ کوئی شہادت موجود نہ بولنے والے کے صدق ہی پر کوئی دلیل لہذا اس کی بات شرعا کس بنا پر مقبول و معتبر ہو۔ پھر اگر ان سب امور سے بھی قطع نظر کرلی جائے تو ٹیلی فون پر جو بات کہی گئی وہ کس طرح شہادت و استفاضہ تو ہو نہیں سکتی۔ بلکہ خبر ہے اور خبر کا غیر مقبول و نامعتبر ہونا پہلے بدلائل ثابت کر دیا گیا۔ بالجملہ اس ٹیلی فون سے کسی طرح رویت ہلال ثابت نہیں ہو سکتی۔

ریڈیو

ریڈیو بھی ٹیلی فون کی طرح ہے اس میں ریڈیو اسٹیشن سے بولنے والا شخص مجہول ہی ہے اگر وہ اس میں اپنا نام و پتہ بھی بیان کردے تو اس کا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ واقعی یہ تمہارا وہی جانا پہچانا ہوا شخص ہے بلکہ یہ ٹیلی فون سے بھی کمتر ہے کہ ٹیلی فون میں تو مزید معلومات کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا اور ریڈیو میں یہ اختیار بھی نہیں اب باقی رہا نغمہ کا امتیاز تو شریعت نے اس کا اعتبار نہیں کیا۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

ولو سمع من وراء الحجاب لایسعه ان یشهد لاحتمال ان یکون خبره اذ النغمة تشبه النغمة۔ (عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۲۰۳)

اگر پردہ میں سے آواز سنی تو اسے شہادت دینے کا حق حاصل نہیں کہ احتمال ہے کہ وہ کسی دوسرے کی آواز ہو کیونکہ نغمہ نغمہ سے مشابہ ہوتا ہے۔

تو جب نغمہ نغمہ کے مشابہ ہو سکتا ہے تو نغمہ کا اپنی ذات میں قابل تزویر ہونا ہی اس کی بے اعتمادی کو نہایت کافی ہے تو اب شرعی طور پر کوئی ثبوت نہیں کہ یہ آواز فلاں معروف شخص کی ہے۔ فقہاء کا کلام ابھی گذرا کہ قاضی کا مہری دستخطی خط اسی احتمال تزویر کی بنا پر بلا شہادت کے غیر معتبر تو نغمہ کے احتمال تزویر کی بنا پر ریڈیو کی خبر کس طرح معتبر و مقبول ہو سکتی ہے۔ پھر بالفرض اگر ریڈیو پر بولنے والا شخص متعین بھی ہو جائے تو اس کی عدالت پر کونسی دلیل قائم ہے اور اس کو بھی جانے دیجئے تو ایک شخص کی خبر ہے اور خبر کا غیر معتبر ہونا ثابت کر دیا گیا لہذا ریڈیو سے رویت ہلال کا شرعی حکم جس کے لئے طریق موجب کا ہونا ضروری کس طرح ثابت ہو سکتا ہے۔

اب رہا بعض مفتیوں کا ریڈیو کا اثبات رویت ہلال میں توپ اور روشنی اور ڈھنڈورہ پر قیاس کرنا اور اس میں کچھ شرائط و قیود کا لگا دینا اور اس کی صرف آواز کو ثبوت رویت ہلال کے لئے کافی قرار دینا اور اس کے اعلان پر مسلمانوں کو عمل کرنے کی رغبت دینا یہ میری نظر میں صحیح نہیں ہے۔

اولا ۔ ریڈیو حقیقۃ خبر رسانی کا آلہ ہے۔ جس طرح ٹیلیفون خبر رسانی کا ایک آلہ تھا۔ کسی مفتی اہلسنت اور کسی مفتی دیوبند و سہارنپور وغیرہ نے اس کی شہادت کو معتبر قرار دیا نہ اس کی خبر کو معتمد ٹھہرایا۔ نہ اس کو توپ اور روشنی اور ڈھنڈورہ پر قیاس کیا۔ نہ اس کی خبر کو ثبوت رویت ہلال میں کافی مانا۔ نہ اسکی آواز پر مسلمانوں کو عمل کرنے کا حکم دیا۔ باوجودیکہ جو شرائط و قیود آج ریڈیو کے لئے تحریر کئے جارہے ہیں یا

آئندہ کئے جائیں گے وہ ٹیلیفون کے لئے بھی کئے جاسکتے ہیں۔ تو اگر یہی شرائط وقیود ریڈیو کی خبر کو معتبر بنادیتے ہیں۔ تو ٹیلیفون کی خبر کو بھی معتبر بنادیں گے تو جب ریڈیو کی خبر کو ثبوت رویت ہلال میں قابل اعتبار قرار دیا تو ٹیلیفون کی خبر کو بھی رویت ہلال میں معتبر ماننا پڑیگا۔ اور اپنے پہلے سارے فتاوے کو غلط کہنا پڑے گا۔

ثانیا۔ ٹیلیفون کی خبر ریڈیو کی خبر سے زیادہ معتبر ومعتمد ہونی چاہئے کہ ٹیلیفون کی خبر کو دوبارہ سہ بارہ دریافت کیا جاسکتا ہے۔ اس کے ہر اشتباہ کو دور کیا جاسکتا ہے۔ خبر دینے والے کا نام و پتہ معلوم ہوسکتا ہے۔ اس کی پوری طور پر معرفت کیجا سکتی ہے۔ اور ریڈیو کی خبر کا دوبارہ دریافت کرنا نہایت مشکل اس کے اشتباہ کا دور ہونا بہت دشوار اور اس نشر کرنے والے کا نہ نام و پتہ معلوم ہوسکتا ہے نہ اس کی کما حقہ معرفت کیجا سکے۔ علاوہ بریں ریڈیو کے اسٹیشن چند ہیں اس کی خبر صرف انہیں چند مقاموں سے نشر کیا جاسکتا ہے اور ٹیلیفون کے لئے نہ کسی اسٹیشن کی قید نہ کسی شہر کی پابندی۔ تو ٹیلیفون سے رویت ہلال کی خبر قصبات بلکہ بعض بڑے دیہات سے بھی دیجا سکتی ہے۔ لہذا یہ خصوصیت اعتماد واعتبار ٹیلیفون ہی کو دیا جاتا نہ کہ ریڈیو کو جو بہ نسبت اس کے چند نا قابل اعتبار امور پر مشتمل ہے۔ مگر حیرت یہ ہے کہ فتوی برعکس ہے۔

ثالثا۔ ریڈیو پر رویت ہلال کی خبر نشر کرنے والا ہندوستان بھر کے لئے اگر صرف ایک ہی عالم مقرر کیا جائے تو وہ سب اہل ہند کا معتمد نہیں ہوسکتا کہ ہندوستان میں مذہبی اختلاف ہے اور یہ عالم آخر کسی ایک فرقہ کا ہوگا تو دوسرے اس کو کس طرح معتمد مان سکتے ہیں لہذا سارے ہندوستان کے لئے ایسا عالم جو معتمد مقتدا ہو متبع احکام و مرجع انام ہو مقرر نہیں کیا جاسکتا۔

رابعا۔ اگر ہر عالم کو شہادت گذرنے کے بعد ریڈیو پر خبر شہادت نشر کرنے کا حق دیا جاتا ہے تو یہ بہت کثیر غلطیوں کا سبب ہوگا بطور نمونہ ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے کہ سنبھل میں ایک سال رمضان شریف میں تیسویں شب میں بعد عشا صبح کو عید کا اعلان سنایا جب وہ معلن میرے مکان کے سامنے اعلان کرتے ہوئے آئے میں نے دریافت کیا کہ آپ کا اعلان کس بنا پر ہو رہا ہے یہاں تو رویت ہلال نہیں ہوئی تو کیا کوئی شہادت گذری ہے انہوں نے کہا کہ فلاں مشہور مولوی صاحب کے پاس باقاعدہ شہادتیں گذری ہیں اور انہوں نے ہمیں اعلان کرنے کے لئے مقرر کیا ہے میں نے فورا ایک عالم صاحب کو ان مولوی صاحب کے پاس بھیجا اور دریافت کیا کہ کن کن شاہدوں نے شہادت دی ہے انہوں نے ان

کے نام اور پتے بتائے میں نے ان شاہدوں کو بلایا تو وہ ہر دو معلن فساق تھے۔ میں نے یہ صریح غلطی دیکھکر ان مولوی صاحب کے پاس یہ اطلاع بھیجی کہ آپ نے معلن فاسقوں کی شہادت کا اعتبار کر کے کس لئے اعلان عید کا حکم دیا انہوں نے بے تکلف جواب دیا کہ شاہدان عدول کا لحاظ پہلے زمانہ میں تھا۔ اب فسق وفجور کا زمانہ ہے جب عادل نہیں ملتا تو فاسق کی شہادت ہی کو معتبر مانا جائے گا۔ تو جب ریڈیو پر خبر شہادت نشر کرنے کے لئے ہر نام نہاد عالم کو حق دیدیا گیا تو اسی طرح کی بہت سی غلطیاں ہوں گی۔ اور دین کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور ان غلطیوں کا کون ذمہ دار ہوگا۔ نیز وہ عالم پھر کسی فرقہ خاص کا ہوگا۔ اس کی خبر پر دوسرے فرقے کس طرح عمل کریں گے۔ تو جب ہر عالم کے متعلق نا قابل اعتبار اور غیر معتمد ہونے کے احتمالات موجود ہیں تو اس ریڈیو پر کسی عالم کے نشر کرنے کا کیا فائدہ ہے۔

خامسا۔ اس کی کونسی ذمہ داری ہے کہ ریڈیو پر نشر کرنے والا عالم محقق ومعتمد متبع احکام ہی ہوگا جب رات دن یہ دیکھا جا رہا ہے کہ ریڈیو کے محکمہ میں ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں اور اکثر وہ ہیں جو مذہب سے ناواقف ہیں تو یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ نشر کرنے والا وہی محقق عالم ہے اور اگر انہیں نہ تسلیم کیا جائے تو ہمارے پاس اس وقت اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ یہی عالم دین ہیں۔

سادسا۔ جب ایک شہر کے قاضی پر دوسرے شہر کے قاضی کی قضا کا ماننا ضروری نہیں تو ایک عالم کی خبر شہادت پر تمام شہروں کے مسلمانوں کو عمل کرنا کس دلیل سے ضروری ہے۔

سابعا۔ ریڈیو پر انتہائی احتیاط یہ کیجا سکتی ہے کہ اس پر خود وہ عالم معتمد خبر شہادت کو نشر کرے تو اس شہر اور اس کے مضافات کے سوا اور شہروں کے لئے اسی عالم کا ریڈیو پر نشر کرنا کیونکر قابل قبول ہوگا کہ فتح القدیر میں ہے کہ ایک شہر کا قاضی کسی دوسرے شہر میں خود ہی جا کر یہ زبانی بیان دے کہ میرے سامنے دو گواہیاں گذریں تو اس کا خود زبانی بیان مقبول معتبر نہیں جس کی عبارت ٹیلیویزن کے ذکر میں منقول ہے۔

ثامنا۔ ریڈیو کی شہادت کے لئے جو شرائط مقرر کئے گئے ہیں ان کی پابندی کی کیا ذمہ داری ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ ابتدا میں تو ان شرائط کا کچھ لحاظ کر لیا جائے گا پھر بے احتیاطیاں ہوتے ہوتے یہ شرائط ختم ہو جائیں گے جیسا کہ پہلے مفتیان دیوبند نے تار کو توپ پر قیاس کر کے اس میں کچھ شرائط کی تقیید کی تھی اور تار کو ثبوت ہلال کے لئے معتبر مان لیا تھا لیکن ان شرائط کا لحاظ نہ کیا گیا تو پھر انہیں اپنے فتوے سے رجوع کرنا پڑا اور تار کو غیر معتبر قرار دینا پڑا یہی نتیجہ اس ریڈیو کا ہوگا کہ ان مفتیوں کو اپنے فتوے سے رجوع کرنا پڑیگا اور ریڈیو کی شہادت کو غیر معتبر کہنا پڑے گا۔

تاسعاً۔ کچہریوں میں جب تار ٹیلیفون ریڈیو وغیرہ کل خبر شہادت دوسرے شہروں سے معتبر نہیں مانی جاتی اور اس پر اعتماد کر کے کسی مقدمہ کی ڈگری نہیں کیجاتی تو دینیات میں اس کی ایسی کیا حاجت پیش آئی ہے کہ اس کو معتبر ہی مانا جائے۔

عاشراً۔ جب حدیث شریف میں ہمارے لئے صاف طور پر فرمادیا گیا ہے۔

فان غم علیکم فاکملوا العدة ثلثین۔

تو جب انتیس کو رویت ہلال بطریق موجب ثابت نہ ہوگی تو ہم مہینہ کے تیس دن کامل کرلیں گے اب ان آلات جدید سے متاثر ہو کر ہم اپنے لئے محض اپنی رائے سے کیوں فرائض کی ذمہ داری کو خطرہ میں ڈالیں۔ تو یہ مفتیان خوش فہم ان امور پر کافی غور کرلیں پھر اپنے لئے کوئی راہ تجویز کریں۔

وائرلیس

وائرلیس میں اگر ہوا کی لہروں پر حروف بنا کر عبارت بنا دیجاتی ہے تو یہ تار سے مشابہت رکھتا ہے اور اگر اس میں بے تکلف کلام کیا جاتا ہے تو یہ ٹیلی فون سے مشابہت رکھتا ہے بہرصورت اس کا خبر دینے والا بھی مجہول شخص ہوا اگرچہ وہ اپنا نام و پتہ پورا بتادے کہ اسکے تعین پر کوئی ثبوت شرعی نہیں اور اس کی عدالت پر کوئی دلیل شرعی قائم نہیں اسی طرح آواز کا پہچاننا یہ بھی کوئی حجت نہیں کہ نغمہ نغمہ کے مشابہ ہوجاتا ہے۔ پھر اس وائرلیس سے جو اطلاع دیجائے گی وہ خبر ہوگی اور خبر نا قابل اعتبار ہونا ثابت ہو چکا فقہاء کرام تو یہ تصریح فرماتے ہیں کہ دوسرے شہر سے خبر شہادت دینا صرف اس قاضی شرع کیساتھ خاص ہے جس کو سلطان اسلام نے مقدمات کے فیصلہ کے لئے مقرر کیا ہو یہاں تک کہ حَکَم کا خط معتبر و مقبول نہیں۔

درمختار میں ہے: القاضی یکتب الی القاضی وھو نقل الشھادة حقیقة ولا یقبل من حکم بل من قاضی مولی من قبل الامام مختصراً۔ ملخصا۔

(ردالمحتار مصری ج۴ ص ۳۶۵ و ۳۷۰)

قاضی قاضی کی طرف خط لکھے کہ یہ حقیقۃً شہادت کا نقل کرنا ہے اور حَکَم کا خط قبول نہ کیا جائے گا بلکہ اس قاضی کا جو امام کی طرف سے مقرر کیا ہوا ہو۔

فتح القدیر میں ہے: ھذا النقل بمنزلة القضاء ولھذا لا یصلح الا من القاضی۔

(فتح القدیر مصری ج۵ ص ۴۸۴)

خط کا بھیجنا گویا قضا کا نقل کرنا ہے اسی لئے قاضی ہی اس کے لائق ہے۔

تو اب رویت ہلال کی خبر شہادت دینے کا اگر حق حاصل ہے تو صرف قاضی کو ہے۔ پھر ہر کس و ناکس کا تار ٹیلیفون۔ ریڈیو، وائرلیس سے رویت ہلال کی خبر شہادت دینے کا کیا حق حاصل ہے۔

بالجملہ اس وائرلیس سے بھی رویت ہلال ثابت نہیں ہوسکتی کہ یہ طریق موجب نہیں۔

لاؤڈاسپیکر

لاؤڈاسپیکر پر بولنے والا بھی اگر سامنے نہ ہو تو مجہول شخص ہے اس کے تعین کے لئے ثبوت شرعی درکار ہے۔ اب رہی آواز کی معرفت تو اس کا حکم اوپر گذرا کہ نغمہ نغمہ کے مشابہ ہوتا ہے لہذا اس کا قابل تزویر ہونا خود اسکے غیر معتبر ہونے کے لئے کافی ہے۔ بالجملہ اس سے بھی دوسرے شہر میں رویت ہلال ثابت نہیں ہوسکتی۔

ہاں اگر لاؤڈاسپیکر سے قاضی شرع یا مفتی شہر انتیس کی شام کو رویت ہلال کے شرعی ثبوت کے بعد اپنے اہل شہر کے لئے یا حوالی شہر کے دیہات کیواسطے اعلان کرتا ہے تو لاؤڈاسپیکر کے اعلان سے رویت ہلال کی اشاعت کی جاسکتی ہے جیسے سرکاری طور پر توپ یا ڈھنڈورے یا منادی سے اعلان کیا جاتا ہے جو اہل شہر اور دیہات کے لئے قابل اعتبار اور لائق عمل ہوتا ہے۔

ردالمحتار میں فرمایا:

قلت والظاھر انه یلزم اھل القری الصوم بسماع المدافع او رؤیة القنادیل من المصر لانه علامة ظاھرة تفید غلبة الظن وغلبة الظن حجة موجبة للعمل کما صرحوا به واحتمال کون ذلك لغیر رمضان بعید اذلا یفعل مثل ذلك عادة فی لیلة الشك الالثبوت رمضان۔

(ردالمحتار ج۲ ص ۹۴)

میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہ ہے کہ شہر کی روشنی دیکھ کر یا توپوں کی آواز سنکر گاؤں پر روزہ لازم ہو اس لئے کہ یہ وہ ظاہر علامت ہے جو غلبہ ظن کا فائدہ کرتی ہے۔ اور غلبہ ظن عمل کے لئے حجت موجبہ ہے جیسا کہ فقہاء نے اس کی تصریح کی۔ اور اس کا غیر رمضان کے لئے ہونا بعید احتمال ہے کہ ایسی عادت شک کی شب ہی میں ثبوت رمضان کے لئے جاری ہے۔

تو اس صورت میں لاؤڈاسپیکر سے رویت ہلال ثابت نہیں کیجارہی ہے۔ بلکہ صرف اپنے اہل

شہر و دیہات کو رویت ہلال کے ثبوت گذر جانے پر حکم حاکم کا اعلان کیا جارہا ہے۔

ٹیلیویزن

ٹیلیویزن یہ وہ جدید آلہ ہے جو غالبا ابھی تک ہندوستان کی سرزمین میں نہیں آیا ہے۔ اخبار وغیرہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بولنے والے کی تصویر بھی سامنے موجود ہو جاتی ہے۔ مگر مغربی تعلیم کے فدائیوں نے صرف اتنا سنکر شور مچانا شروع کردیا ہے کہ وائرلیس۔ ریڈیو ٹیلیفون وغیرہ میں بولنے والا مجہول قرار دیا گیا تھا اس میں تو اب تصویر سامنے آجاتی ہے تو کیا اشتباہ باقی رہتا ہے۔ اب اس کی خبر کس بنا پر غیر معتبر و نامقبول ہوگی۔ اس سے رویت ہلال کیوں نہ ثابت ہوگی لہذا ان نادانوں سے کہو کہ ہماری شریعت بحمدہ تعالیٰ نہایت مکمل ہے ہمیں نہ فقط ان جدید آلات بلکہ جو ابھی آئندہ تا قیامت ایجاد ہونے والے ہیں ان کے اگر صراحۃ نہیں تو تلویحاً یا تفریعاً یا تاصیلاً احکام موجود ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ عقل وفہم عطا فرمائے اقول یہ کہنا کہ وہ خبر دینے والا اس کے ذریعہ سے مجہول نہیں ہوتا یہ غلط اور باطل دعوئی ہے۔ یہ ہم نے تسلیم کرلیا کہ بولنے والے کی تصویر سامنے موجود ہوگئی تو محض تصویر کا سامنے آجانا کیا اس کی عدالت ثابت ہونے کے لئے کافی دلیل ہے۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اس میں تو صرف تصویر ہی سامنے آئی ہے اور قاضی کے سامنے تو بوقت شہادت بذاتہ صاحب تصویر ایک نہیں بلکہ دو مرد موجود ہوتے ہیں جو مستور یعنی مجہول الحال ہوں تو ان کی شہادت غیر مقبول و نامعتبر ہے۔ جیسا کہ مستور کے بیان میں مذکور ہوا۔ بلکہ قاضی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اگر گواہوں کی عدالت کو وہ نہیں جانتا ہے تو ان گواہوں کی شہادت گذر جانے پر ان کے حال عدالت کی تحقیق ہو جانے کے بعد حکم دے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: لابد ان يسأل القاضی عن الشهود فی السر والعلانية۔

(عالمگیری مجیدی ج۳ص۲۳۶)

قاضی کا گواہوں کے متعلق پوشیدگی اور علانیہ طور پر سوال کرنا ضروری ہے۔

اسی عالمگیری میں ہے: ثم القاضی ان شاء يجمع بين تزكية العلانية وبين تزكية السر وان شاء اكتفى بتزكية السر وفی زماننا تركوا تزكية العلانية واكتفوا بتزكية السر۔

(عالمگیری مجیدی ج۳ص۲۳۷)

پھر قاضی اگر چاہے تو تزکیہ علانیہ اور تزکیہ پوشیدہ دونوں کو جمع کرے اور اگر چاہے تو پوشیدہ تزکیہ

ہی پر اکتفا کرے اور ہمارے زمانہ میں تو تزکیہ علانیہ کو ترک کریں اور پوشیدہ تزکیہ پر اکتفا کریں۔

تو جب شاہدوں کا قاضی کے سامنے صرف موجود ہو جانا بلا تحقیق عدالت کے شہادت کے معتبر ہونے کے لئے کافی نہیں۔ تو ٹیلیویزن میں اس کی صرف تصویر کا سامنے آجانا ہی کیا ذی صورت کا عادل ہونا ثابت کردیگا۔ ہرگز نہیں۔ فقہاء کرام تو یہ تصریح فرماتے ہیں۔

جس کو فتاوی عالمگیری نے فتاوی قاضی خان اور محیط سے نقل کیا:

رجل غريب شهد عند القاضی فان القاضی يقول له من معارفك فان سماهم وهم يصلحون للمسألة منهم سأل منهم فی السر فان عدلوا سأل عنهم فی العلانية فان عدلوه قبل تعديلهم اذا كان القاضی يريد ان يجمع بين تزكية السر والعلانية وان يصلحوا توقف فيه ويسأل عن المعدل الذی فی بلدته ان كان فی ولاية هذا القاضی وان لم يكن كتب الی قاضی ولايته يتعرف عن حاله۔ (عالمگیری مجیدی ج۳ص۲۳۷)

ایک مسافر شخص ہے جس نے قاضی کے پاس شہادت دی تو قاضی اس سے کہے تیرے پہچاننے والے کون ہیں اگر وہ ان کے نام بتائے اور وہ سوال کے قابل ہوں تو ان سے پوشیدگی میں سوال کرے تو اگر وہ ان کی تعدیل کریں تو قاضی ان سے علانیہ طور پر سوال کرے اگر وہ اس کی تعدیل کریں تو ان کی تعدیل قبول کرلیجائے جب قاضی پوشیدہ تزکیہ اور علانیہ تزکیہ کے جمع کرنے کا ارادہ رکھے۔ اور اگر وہ اس قابل نہ ہوں تو قاضی اس میں توقف کرے اور اس کے شہر کے تعدیل کرنے والے سے سوال کرے اگر وہ اس قاضی کی ولایت میں ہو اور اگر اس کی ولایت میں نہ ہو تو اس ولایت کے قاضی کی طرف لکھے اور اس کے حال کی معرفت حاصل کرے۔

لہذا جب مسافر کو خود قاضی کے سامنے موجود ہو کر شہادت دینا اس کی عدالت کے لئے کفایت نہیں کرتا بلکہ اس کے جاننے والے اگر اس قاضی کی حدود میں ہیں تو ان سے اس کی عدالت کی تحقیق کرے ورنہ اس کی ولایت کے قاضی سے یہ قاضی اس کی عدالت کی تحقیق کرے بعد ثبوت عدالت کے اس کی شہادت پر حکم صادر کرے تو ٹیلیویزن میں محض تصویر کا آجانا اس کی نہ عدالت ثابت کرتا ہے نہ اسکے مجہول ہونے کو باطل کرتا ہے۔ پھر اگر کوئی یہ کہے کہ ٹیلیویزن پر جو شخص بول رہا ہے وہ عادل ہے اس کی عدالت کو ہم خوب جانتے ہیں قاضی شہر کو بھی اس کی عدالت کا علم ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تم اس کو خوب جانتے پہچانتے تھے اور قاضی بھی جانتا تھا۔ لیکن آج وہ ٹیلیویزن پر بول رہا

ہے اس وقت اس کا کیا حال ہے آیا وہ اپنے پہلے ہی حال پر باقی ہے یا نہیں۔ اگر وہ اپنی پہلی ہی حالت عدالت پر باقی ہے تو اس کی شہادت معتبر اور اس کے مزکی بن سکتے ہیں۔ اور اگر وہ اپنی پہلی حالت عدالت، پر باقی نہیں رہا یا چھ ماہ یا اس سے زائد کی مدت گذر چکی ہے تو پھر اس کی عدالت کی تحقیق جدید کی جائے گی۔

عالمگیری میں ہے: لو ثبت عدالة الشهود عند القاضي وقضى بشهادتهم ثم شهدوا عند القاضي في حادثة اخرى اذا كان العهد قريب لايشتغل بتعديلهم وان كان بعيدا يشتغل به واختلفوا في الحدالفاصل بينهما والصحيح فيه قولان احدهما انه مقدر بستة اشهر والثاني انه مفوض الى رأى القاضي كذا في محيط السرخسي۔

(عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۲۳۸)

اگر قاضی کے نزدیک گواہوں کی عدالت ثابت ہے تو ان کی شہادت پر حکم دے۔ پھر اسی قاضی کے سامنے انہوں نے کسی دوسرے واقعہ میں شہادت دی اور زمانہ قریب کا ہو تو ان کی تعدیل میں مشغول نہ ہو اور اگر زمانہ بعید کا گذرا تو مشغول ہو اور فقہاء نے حد فاصل میں اختلاف کیا ہے اس میں صحیح دو قول ہیں ایک تو یہ ہے کہ وہ چھ ماہ کی مقدار ہے دوسرا قول یہ ہے کہ وہ قاضی کی رائے پر موقوف ہے اسی طرح محیط سرخسی میں ہے۔

تو اگر اسکی عدالت کی معرفت بھی ہو اب عرصہ بعید وہ اپنی اسی عدالت پر باقی ہے اس پر کونسی دلیل شرعی قائم ہے پھر یہ گفتگو تو اس بنا پر ہو سکتی ہے جب ٹیلیویزن کے قول کو شہادت فرض کیا جائے اور حقیقت یہ کہ اسکا قول شہادت نہیں ہے بلکہ خبر ہے اور جب خبر ہے تو وہ حجت شرعی نہیں کہ فقہا کرام تو یہ تصریح فرماتے ہیں۔

فتح القدیر میں ہے: الفرق بين رسول القاضي وبين كتابه حيث يقبل كتابه ولا يقبل رسوله فلان غاية رسوله ان يكون كنفسه وقدمنا انه لو ذكر مافي كتابه لذلك القاضي بنفسه لايقبل وكان القياس في كتابه كذلك الا انه اجيز باجماع التابعين على خلاف القياس فاقتصر عليه ۔ فتح القدیر مصری ج ۵ ص ۴۸۱

قاضی کے قاصد اور اس کے خط میں یہ فرق ہے کہ اس کا خط تو قبول کیا جائے گا۔ اور اس کا قاصد اس لئے قبول نہیں کیا جاتا کہ اس کی غایت یہ ہے کہ وہ مثل قاضی کے ہوگا اور ہم نے پہلے ذکر کیا کہ یہی

قاضی خود اس مضمون کو جو اس کے خط میں ہے زبانی بیان کرے تو قبول نہ کیا جائے اور قیاس اس کے خط میں بھی ایسا ہی تھا لیکن خلاف قیاس اجماع تابعین کی وجہ سے اس میں اجازت دیدی گئی تو یہ اجازت خط ہی کے ساتھ خاص رہے گی۔

جب قاضی اگر اپنا قاصد بھیجے بلکہ بذات خود ہی آ کر بیان دے کہ میرے سامنے گواہیاں گذریں تو وہ مقبول نہیں تو تار۔ ٹیلیفون، ریڈیو۔ وائرلیس۔ لاؤڈ اسپیکر ٹیلیویزن کی خبریں کیا قابل ذکر اور ان سے رویت ہلال کس طرح ثابت ہو سکتی ہے۔

جنتریاں

جنتریوں کا یہ لکھنا کہ فلاں مہینہ انتیس کا ہوگا اور اس کی پہلی تاریخ فلاں دن ہے۔ ہمارے ائمہ کرام فرماتے ہیں کہ اہل توقیت اور منجمین کا یہ لکھدینا شرعاً قابل اعتبار نہیں نہ اس پر عمل جائز۔

درمختار میں ہے: لاعبرة بقول الموقتين ولو عدولا على المذهب۔

(ردالمحتار مصری ج ۲ ص ۹۴)

مذہب صحیح کی بنا پر اہل توقیت کے قول کا اعتبار نہیں اگرچہ وہ عادل ہوں۔

ردالمحتار میں معراج سے ناقل ہیں: لايعتبر قولهم بالاجماع ولايجوز للمنجمين ان يعمل بحساب نفسه۔

(ردالمحتار مصری ج ۲ ص ۹۴)

اہل توقیت کا قول بالاتفاق معتبر نہیں نہ اسکے لئے حساب پر عمل جائز ہے۔

اسی ردالمحتار میں ہے: لايلتفت الى قول المنجمين ۔ (ردالمحتار مصری ج ۲ ص ۹۸)

منجموں کے قول کی طرف التفات نہ کیا جائے۔

مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں ہے: ماقال اهل التنجيم غير معتبر ۔

(مجمع الانہر مصری ج ۱ ص ۲۳۷)

اہل تنجیم نے جو کہا وہ غیر معتبر ہے۔

درالمنتقی شرح الملتقی میں ہے: قول اهل التنجيم غير معتبر فمن قال به فقد خالف الشرع۔

(درالمنتقی مصری ج ۱ ص ۲۳۸)

اہل تنجیم کا قول غیر معتبر ہے اور جو اس کو معتبر جانے وہ شریعت کی مخالفت کرتا ہے۔

مراقی الفلاح میں نظم ابن وہباں سے ناقل ہیں: وقول اهل التوقيت ليس ...

(طحطاوی مصری ۳۸۱)

اہل توقیت کا قول واجب کرنے والا نہیں ہے۔

اسی مراقی الفلاح میں ہے: اتفق اصحاب ابی حنیفۃ الا النادر والشافعی انہ لا اعتماد علی قول المنجمین فی ہذا۔ (طحطاوی مصری ۳۸۱)

بعض کے سوا اصحاب امام ابوحنیفہ اور امام شافعی نے اس پر اتفاق کیا کہ اہل تنجیم کے قول پر اعتماد نہیں۔ طحطاوی میں ہے: (قولہ لیس بموجب) شرعا فطرا ولا صوما۔

(طحطاوی مصری ص ۳۸۱)

قول اہل توقیت کا روزے اور فطر کسی کو شرعا واجب کرنے والا نہیں۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: وھل یرجع الی قول اہل الخبرۃ العدول ممن یعرف علم النجوم الصحیح انہ لا یقبل کذا فی السراج۔ (عالمگیری میں ہے مجیدی ج ۱ ص ۱۰۱)

عادل اہل خبر جو علم نجوم کے ماہر ہیں کیا ان کے قول کی طرف رجوع کیا جائے صحیح ہے کہ ان کا قول قبول نہ کیا جائے جیسا کہ سراج میں ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ اہل توقیت اور اصحاب نجوم اگر مسلمان عاقل ثقہ بھی ہوں تو باتفاق فقہا ان کا قول رویت ہلال میں معتبر نہیں ان کی بات قابل التفات نہیں۔ ان کا بیان خلاف شرع ہے۔ ان کا لکھ دینا طریق موجب نہیں ان کے قول پر عمل کرنا جائز نہیں۔ لہذا جب ان کا قول غیر معتبر اور نا قابل عمل ہے تو ہندوانی جنتریاں جو اکثر کفار کی ہیں اور مصرانی بینات کی بنا پر تیار کی جاتی ہیں ان کا غیر معتبر ہونا کتنے درجے بدتر ہوگی۔ تو ان سے رویت ہلال کس طرح ثابت ہوسکتی ہے۔ بلکہ مسلمان کا اس بارے میں انکا پیش کرنا ہی سراسر غلط وباطل ہے۔

قیاسات

عوام میں یہ باتیں بہت عام ہیں کہ جب چاند اٹھائیسویں کو نظر نہ آیا تو چاند انتیس کا ہوگا۔ اور جب چاند اٹھائیس کو نظر آ گیا تو چاند تیسویں کو دکھے گا۔ یا آج چاند بیٹھکر نکلا تو آج پندرہویں تاریخ ہے۔ یا چاند بڑا دیکھا یا دیر تک رہا تو نہایت جزم سے کہد یا یہ چاند کل کا ہے تو ان قیاسات کا کچھ اعتبار نہیں ان پر نہ شرعا حکم کرنا صحیح نہ عمل کرنا جائز۔

حدیث شریف میں وارد ہے جس کو طبرانی میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی کہ

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: من اقتراب الساعۃ انتفاخ الاہلۃ۔ (جامع صغیر مصری ج ۲ ص ۱۳۸)

علامات قرب قیامت سے چاندوں کا بڑا ہونا ہے۔

اسی طبرانی نے حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔

من اقتراب الساعۃ ان یری الہلال قبلا فیقال لیلتین۔

(جامع صغیر مصری للسیوطی ج ۲ ص ۱۳۸)

علامات قیامت سے ہے کہ چاند بے تکلف نظر آئے گا تو کہا جائے گا کہ یہ دو رات کا ہے۔

مسلم شریف میں حضرت ابوالبختری تابعی رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی:

قال خرجنا للعمرۃ فلما نزلنا ببطن نخلۃ رأینا الہلال فقال بعض القوم ہو ابن ثلث وقال بعض القوم ہو ابن لیلتین فلقینا ابن عباس فقلنا انا رأینا الہلال فقال بعض القوم ہو ابن ثلث وقال بعض القوم ہو ابن لیلتین فقال ای لیلۃ رایتموہ قلنا لیلۃ کذا وکذا فقال ابن عباس قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ تعالی قد امدہ لرؤیتہ فان اغمی علیکم فاکملوا العدۃ۔

(مشکوۃ شریف ص ۱۷۵)

انہوں نے کہا ہم عمرہ کو چلے جب بطن نخلہ میں اترے ہم نے چاند کو دیکھا کوئی بولا تین رات کا ہے۔ قوم میں سے بعض نے کہا کہ یہ دو رات کا ہے ہم حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہما سے ملے تو ہم نے عرض کیا کہ ہم نے چاند دیکھا۔ کوئی کہتا ہے کہ تین شب کا ہے کسی نے کہا دو شب کا ہے فرمایا تم نے اس کو کس رات دیکھا ہم نے کہا فلاں رات کو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہما نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالی نے چاند دیکھنے کو مدت ماہ کی حد ٹھہرایا تو اگر تم پر مہینہ پوشیدہ ہو جائے تو عدت یعنی تیس دن پورے کرو۔

ان احادیث سے ثابت ہوگیا کہ چاند کا بڑا ہونا اور بے تکلف نظر آ جانا علامات قیامت سے ہے اور لوگوں کا اس کو بڑا دیکھ کر یہ کہنا کہ یہ دو رات کا ہے یا تین رات کا ہے کوئی قابل اعتبار چیز نہیں ہے۔ ثبوت ہلال کا مدار رویت ہلال پر ہے اگر وہ انتیسویں کو نظر آیا تو انتیس کا ہے۔ اور تیسویں کو دیکھا تو تیس کا ہے۔ لہذا یہ عوام کی قیاسات شرعا قابل التفات نہیں۔ مذہب ایسے قرائن کی کچھ وقعت نہیں رکھتا ہے۔ ان پر عمل کرنا ناواقفی اور جہالت ہے۔

اختراعات

عوام میں ایک یہ قاعدہ مشہور ہے کہ رجب کی چوتھی تاریخ جو دن ہے اسی دن رمضان کی پہلی تاریخ ہوتی ہے یا جس دن عیدالفطر ہوتی ہے اسی دن محرم کی دسویں تاریخ ہوگی۔ یا تین مہینے پے درپے انتیس کے ہوئے ہیں یہ مہینہ ضرور تیس کا ہوگا یا چار مہینے برابر تیس کے ہوئے ہیں یہ مہینہ ضرور انتیس کا ہوگا۔ تو ان باتوں کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔ یہ وہ منگھڑت قاعدے ہیں جن پر کوئی دلیل شرعی نہیں میرے آقائے نعمت۔ امام اہلسنت مجدد دین وملت اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے وجیز امام کردری سے یہ عبارت نقل فرمائی۔

وما نقل عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان یوم اول الصوم یوم النحر لیس بتشریع کلی بل اخبار عن اتفاقی فی ھذہ السنة وکذا ماھو الرابع من رجب لایلزم ان یکون غرة رمضان بل قد یتفق۔

اور جو حضرت مولا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ پہلے روزہ کا دن یوم نحر ہوگا تو یہ قاعدہ شرعی کلی نہیں بلکہ ایک خبر ہے جو اتفاقا اس سال میں واقع ہوئی اسی طرح رجب کی چوتھی کا دن پہلی رمضان ہونا ضروری نہیں بلکہ کبھی اتفاقا ایسا ہوجاتا ہے۔

لہذا یہ اگر قواعد شرع سے ہوتے تو شریعت میں اس کی تصریح ہوتی اور اگر قواعد توقیت وتنجیم سے ہوتے تو اہل توقیت اس کو لکھتے۔ لہذا جب کسی نے ان کو نہیں لکھا تو معلوم ہوا کہ یہ قواعد مخترعہ ہیں جن کو عوام نے محض اس بنا پر گڑھ لیا ہے کہ کسی سال ایسا اتفاق ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ امام کردری نے تصریح فرمائی کہ یہ اتفاقی خبریں ہیں لہذا ثبوت ہلال پر انکا کچھ اثر نہیں۔

سوالات کے جوابات ان مباحث ہی سے حل ہوگئے۔ ضرورت تو نہیں کہ نمبروار جواب دیا جائے لیکن مزید وضاحت کے لئے ہر سوال کا جواب مختصر الفاظ میں دیا جاتا ہے۔ عبارت وثبوت اوپر منقول ہوئے۔

جواب سوال اول: اگر ان سے حاکم صرف اپنے شہر یا حوالی شہر کے دیہات کے لئے شہادت شرعی گذر جانے کے بعد فقط اپنے حکم کا اعلان کرتا ہے تو اس میں کچھ حرج نہیں۔ جیسے منادی توپ وغیرہ سے حکام اعلان کرایا کرتے ہیں تو اس اعلان پر عمل کرتے ہوئے عید کرسکتے ہیں اب رہے دوسرے شہر ان کے لئے نہ اعلان کافی نہ اس پر عمل کرتے ہوئے عید کی جاسکتی ہے اس کے لئے رویت ہلال کا ثبوت بطریق موجب نہیں پایا گیا۔

جواب سوال دوم: نائب اگر دوسرے کسی شہر میں ہے تو ان آلات سے خبر سن کر اپنے حاکم اعلیٰ کے حکم پر نہ عمل کرسکتا ہے نہ عید منا سکتا ہے۔ اب رہا آواز کا پہچاننا اس کو شریعت نے معتبر نہیں مانا کہ نغمہ نغمہ کے مشابہ ہوسکتا ہے جو قابل تزویر ہو وہ کب لائق اعتماد ہوسکتا ہے

جواب سوال سوم: کسی شہر کی شہادت جب اور کسی دوسرے شہر میں بطریق موجب پہونچ جائے تو وہاں کے لوگ ضرور عید کریں اور شرعی قوانین وہی ہیں جو بطریق موجب ہو۔ رویت ہلال میں یہی مدار حکم ہے۔

جواب سوال چہارم: نماز وخطبہ میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال مکروہ ہے اس میں میرا مفصل فتوی ۱۹۴۰ء کا موجود ہے اور نماز خطبہ کو مجالس وعظ پر قیاس نہیں کرسکتے۔ اس میں بحث بھی ہے۔

جواب سوال پنجم: ٹیلیویزن سے دوسرے شہروں میں رویت ہلال ثابت نہیں ہوسکتی تو اس کی خبر پر عید بھی نہیں کرسکتے بولنے والے کی تصویر سامنے آجانا اس کے ثبوت عدالت کے لئے کافی نہیں۔ ٹیلیویزن سے شہادت ثابت نہیں ہوسکتی جو مقدمہ ثانیہ سے ظاہر ہے۔

جواب سوال ششم: احکام شرع کا ان آلات سے اثبات کرنا غیر معتبر ونامقبول ہے۔ شرعا تو ان سے شہادت ثابت ہی نہیں ہوسکتی۔ قانونا بھی ان سے شہادت حاصل نہیں ہوتی ورنہ کچہریوں میں ان آلات کے ذریعہ سے دوسرے شہروں کی شہادت حاصل کرلی جاتی اور اسی پر اعتماد کرکے کسی مقدمہ کی ڈگری کردی جاتی تو ان سائنس کے مقلدوں اور مغربی تعلیم کے دلدادوں نے پہلے مسائل شرع میں ان کا استعمال کیوں شروع کردیا ہے مولیٰ تعالیٰ ان کو قبول حق کی توفیق عطا فرمائے اور اپنا سچا متبع دین بنادے۔

واخر دعوینا ان الحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد و الہ واصحابہ اجمعین۔

کتبہ

المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل

الفقیر الی اللہ عزوجل العبد **محمد اجمل غفرلہ** الاول

المفتی فی بلدۃ سنبھل ۲۵ محرم الحرام ۱۳۷۰ھ



باب مسائل الصوم

مسئلہ (٥٨٤)

کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک امام صاحب ایک موضع میں خطیب تھے اور موضع کے کچھ بچے تعلیم بھی حاصل کرتے تھے لڑکے بھی تھے اور لڑکیاں بھی تھیں جن کو تعلیم اردو و قرآن شریف حافظہ دیا کرتے تھے ایک عرصہ دراز تک سلسلہ تعلیم و امامت جاری رہا انہیں بچوں میں ایک چھوٹی لڑکی جس کی عمر تقریباً نو سال کی تھی چند کتابیں اردو کی اور کلام پاک کی تعلیم حاصل کی اس کے بعد اسی لڑکی نے اپنے شوق میں حافظہ شروع کر دیا جو کہ تین پارے حافظہ کر چکی ہے۔ اور اس کے علاوہ اور سورتیں بھی سورہ یٰس وطٰہٰ وغیرہ بھی یاد کیں، اس کے بعد اس کی موت نے جلدی کی اور قضاء الٰہی سے دار فانی کو سدھار گئی اور اس کے مرنے کے بعد جو کیفیتیں ظاہر ہوئیں امام صاحب مذکور نے اس قصہ کو بنام حاجرہ میں شائع کیا جو کہ پیش نظر ہے برائے کرم قصہ حاجرہ کو بنظر عمیق ملاحظہ فرما کر جواب سے سرفراز فرمائے گا کہ ایسا قصہ حاجرہ عند الشرع جائز ہے اور عقل میں آتا ہے یا نہیں؟ تاکہ قسم قسم کے فتنہ نہ بڑھیں جو کہ بڑھ رہے ہیں اور بڑھ گئے ہیں، کوئی کہتا ہے جھوٹ ہے یہ ہونا امر محال ہے، کوئی کہتا ہے سچ ہے ایسا ہو سکتا ہے، اولیاء کے لئے کوئی مشکل نہیں، کوئی کہتا ہے کہ ولی نہیں تھی کیونکہ اگر وہ ولی ہوتی تو روزہ کے متعلق یہ نہ کہتی کہ روزہ ٹوٹ گیا جو کہ امام صاحب نے اس شعر میں بتائے ہیں کہ روزہ ٹوٹ گیا جب کہ منہ بھر کے قے ہوئی تھی، بہر حال کچھ بھی ہے بنظر تعمق ملاحظہ فرما کر جواب سے جلد از جلد سرفراز فرمائیں عین نوازش ہوگی۔ بینوا توجروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اس قصہ میں منہ بھر قے سے روزہ ٹوٹ جانے کا حکم تو غلط ہے باقی اس میں اور کوئی بات ایسی نہیں ہے جو شرعاً قابل اعتراض ہو۔ اور اس صالحہ لڑکی کا ولی ہونا بھی کوئی حیرت انگیز بات نہیں کہ بعض بچے مادر زاد ولی ہوتے ہیں اور بعد موت کے قبر سے طٰہٰ اور یٰسین شریف کی آواز کا آنا اور خوشبو کا محسوس

ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے کہ قبر سے بعض صحابہ کرام نے سورۂ ملک کی آواز سنی ہے کہ مشکوۃ شریف میں اس مضمون کی حدیث وارد ہے۔ لیکن ان امام صاحب کو اس واقعہ سے اس قدر متاثر نہ ہونا چاہئے نہ وہاں کے لوگوں کو اس پر کسی طرح کا اختلاف کرنا چاہئے اہل اسلام کا عقیدہ ہی یہ ہے کہ کرامات اولیاء حق یعنی اولیاء کرام کی کرامتیں حق ہیں اور معجزہ و کرامت وہی ہے جو عقل میں نہ آوے۔ بالجملہ یہ کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا جس میں مسلمان فتنہ میں پڑیں یا کسی طرح کا اختلاف کریں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

٢٩ جمادی الاخریٰ ٧٦ھ/١٣

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (٥٨٥)

قبلہ حضرت مولانا محمد اجمل صاحب دامت برکاتہم العالیہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد بصد آداب غلامانہ بجالا کر عرض ہے کہ جب ذیل مسائل کا جواب ارسال فرمایا جائے روزے کی حالت میں انجکشن لگوانا جائز ہے یا نہیں؟۔ دیوبندیوں نے اپنے نقشہ افطار میں جائز لکھا ہے استدعا ہے کہ مدلل جواب تحریر فرمایا جاوے۔

آپ کا کفش بردار محمد عبد اللہ رضوی کھیری محلہ ڈیہ پور ١٦/رمضان المبارک ٧٨ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

حقیقت تو یہ ہے کہ دیوبندی قوم عقیدۃً تو غیر مقلد ہیں۔ پھر جب وہ باطنی طور پر غیر مقلد ہیں تو ان میں نہ فقاہت حاصل ہونی چاہئے۔ نہ وہ کتب فقہ کے ماہر ہونے چاہیں۔ لیکن وہ جب مدعی حنفیت ہیں تو انہیں بظاہر مقلد بننا پڑتا ہے۔ اور بمجبوری کتب فقہ سے تعلق رکھنا پڑتا ہے۔ تو اب انہیں جن مسائل میں فقہ کی تصریحات اور جزئیات مل جاتے ہیں تو ان میں تو ان سے زیادہ صریح غلطیاں نہیں ہوتیں۔ اور جب ان کو رفہموں کو نئے واقعات اور نادر حوادث سے واسطہ پڑتا ہے تو ان میں یہ ضرور غلطیاں کرتے ہیں۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ جیسے رویت ہلال میں ریڈیو کی خبر کا اعتبار۔ نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال وغیرہ انہیں میں روزہ میں انجکشن کا مسئلہ بھی ہے۔ چنانچہ انہوں نے انجکشن سے روزے کے فاسد ہونے کا حکم نہیں دیا۔ اس میں ان سے دو اصولی غلطیاں ہو گئیں۔

پہلی غلطی تو یہ ہے کہ دوا انجکشن سے دماغ یا جوف تک نہیں پہونچتی۔

چنانچہ فتاوی دیو بند میں ہے:

انجکشن کے ذریعہ دوا جوف عروق میں پہونچائی جاتی ہے اور خون کے ساتھ شرائین میں اس کا سریان ہوتا ہے۔ جوف دماغ یا جوف بطن میں دوا نہیں پہونچتی۔

اولاً: جب رگوں کا سلسلہ وتعلق دماغ اور جوف سے ہے تو عقل باور نہیں کرتی کہ بذریعہ انجکشن جب دوا رگوں کے اندر پہنچادی گئی تو کیا خون کی حرکت اور اس کا سیلان اسکو دماغ یا جوف تک پہنچانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ پھر انجکشن کی حرکت قسریہ اس کو معین ثابت نہ ہوگی۔

ثانیاً: بیہوش کرنے کے لئے انجکشن کیا جاتا ہے تو اگر وہ دوا دماغ تک نہیں پہنچتی تو دماغ کو کس چیز نے ماؤف کیا۔

ثالثاً: درد معدہ یا درد قولنج وغیرہ کے لئے انجکشن کیا گیا تو اگر دوا جوف تک نہیں پہونچی تو اس درد کو کس چیز نے دفع کیا۔

رابعاً: غذا کا انجکشن بھی ہوتا ہے تو دوا جوف تک اگر نہیں پہونچی تو غذائیت کس چیز سے حاصل ہوئی۔

خامساً: پیاس کے دفع کرنے کے لئے بھی انجکشن ہوتا ہے تو وہ دوا جوف تک نہیں پہونچی تو پیاس کیسے دفع ہوئی اور سیراب کس چیز نے کر دیا۔

بالجملہ یہ وہ امور ہیں جن کا انکار مشاہدات وتجربیات کا انکار ہے۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر اور اطباء تو اس کا اقرار کرتے ہیں کہ انجکشن کی دوا جوف ودماغ تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اکابر مفتیان دیو بند کا اس سے انکار کرنا کیسی بیزار عقل چیز ہے۔

دوسری غلطی یہ ہے کسی چیز کا دماغ یا جوف تک پہنچنا مطلقا روزے کو فاسد نہیں کرتا بلکہ اس کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ چیز منافذ اصلیہ کے ذریعہ سے پہنچے۔

چنانچہ فتاوی دیو بند میں ہے:

افساد صوم کے لئے مفطر کا جوف دماغ یا جوف بطن میں بذریعہ منفذ اصلی پہنچنا ضروری ہے۔

(فتاوی دیو بند ج ۲ ص ۴۷)

اولاً: کتب فقہ میں روزے کے فاسد کرنے کے لئے کسی چیز کا دماغ یا جوف تک پہنچ جانا کافی

سمجھا گیا ہے۔

مفاد ماذکر متنا وشرحا وهو ان مادخل فی الجوف ان غاب فیه فسد وهو المرا… بالاستقرار وان لم یغب بل بقی طرف منه فی الخارج او کان متصلا بشئ خارج لایفس… لعدم استقراره ۔ (شامی مصری ج ۲ ص ۱۰۴)

درمختار میں بدائع سے ناقل: ان الاستقرار الداخل فی الجوف شرط للفساد۔

(شامی ج ۲ ص ۱۰۲)

ردالمحتار میں خزانۃ الاکمل سے منقول ہے: ان العلة من الجانبین الوصول الی الجو… وعدمه۔ (ردالمحتار ج ۲ ص ۱۰۳)

اسی ردالمحتار ص ۱۰۵ ر میں ہے: قلت ولم یقیدوا الاحتقان والاستعاط والاقطا… بالوصول الی الجوف لظهوره فیها والا فلا بدمنه حتی لو بقی السعوط فی الانف ول… یصل الی الراس لایفطر ویمکن ان یکون الدواء راجعا الی الکل۔

علامہ شامی نہر سے ناقل ہیں: والذی ذکر المحققون ان معنی الفطر وصول ماف… صلاح البدن الی الجوف اعم من کونه غذاء او دواء ۔ (ج ۲ ص ۱۱۱)

ہدایہ میں ہے: من احتقن او اسعط او اقطر فی اذنه افطر لقوله ﷺ الفطر ممادخل… ولوجود معنی الفطر وهو وصول مافیه صلاح البدن الی الجوف ۔ (ہدایہ ج ۱ ص ۲۰۰)

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ روزے کے فاسد ہوجانے کے لئے کسی مفطر چیز کا دما… یا جوف تک پہنچ جانا ضروری ہے۔

ثانیاً: اگر مفطر چیز کے دماغ یا جوف تک پہنچنے کے لئے منافذ اصلیہ کے ذریعہ سے پہنچنا ضرور… اور شرط ہوتا تو متون وشروح اپنی عبارات میں اس شرط کا ذکر کرتے تو جب متون وشروح بلکہ فتاوی… اس کو شرط قرار نہیں دیا تو چودھویں صدی میں ان اکابر دیو بند کا اس کو شرط اور ضروری قرار دینا کیا قابل… التفات۔

ثالثاً: یہ امر تو ضروری ہے کہ منافذ اصلیہ کے ذریعہ سے جو چیز دماغ یا جوف تک پہنچے وہ بالاتفا… روزہ کو فاسد کردیگی۔

چنانچہ ردالمحتار میں ہے اور خود فتاوی دیو بند میں خلاصۃ الفتاوی سے منقول ہے:

ماوصل الی الجوف والراس والبطن من الاذن والانف والدبر فھو مفطر بالاجماع۔

لیکن مفتی دیوبند کا اس عبارت کا یہ مفہوم مخالف نکالنا (کہ جو چیز دماغ یا جوف تک بذریعہ منافذ اصلیہ کے نہ پہنچے وہ روزہ کو فاسد نہیں کرتی) کوئی حجت اور دلیل نہیں کہ عندالحنفیہ مفہوم مخالف معتبر نہیں ہے۔

رابعا: ہدایہ میں ہے: لوداوی جائفۃ او آمۃ بدواء فوصل الی جوفہ اودماغہ افطر عند ابی حنیفۃ والذی یصل ھو الرطب۔ (ہدایہ ص۲۰۰)

پیٹ کا ایسا زخم جو جوف تک ہو اس کو جائفہ کہتے ہیں اور سر کا ایسا زخم جو دماغ تک ہو اس کو آمہ کہتے ہیں۔

اگر ان میں تر دوا استعمال کی جو جوف ودماغ تک پہنچے گی تو روزہ فاسد ہوگیا اور مفتی دیوبند کے نزدیک اس صورت میں روزہ فاسد نہیں ہونا چاہئے کہ ان کی شرط نہیں پائی گئی یعنی یہ دوا جوف ودماغ تک منافذ اصلیہ کے ذریعہ سے نہیں پہنچی۔ تو کہیے مفتی صاحب آپ کا حکم صحیح ہے۔ یا ہدایہ جیسی معتبر ومستند کتاب کا۔ اور پھر ان کا قول مانا جائے یا حضرت امام اعظم علیہ الرحمہ کا۔

الحاصل ان دیوبندیوں مفتیوں کی یہ دو بنیادی غلطیاں ہیں جن پر کافی سوالات وارد کردیے گئے ہیں۔ تو جب ان کے فتوے کا غلط ہونا اور ماہرین انجکشن کے تجربوں کے خلاف ہونا ثابت ہو چکا تو اب مسئلہ خود ہی منقح ہوگیا لہذا اب مختصر طور پر حکم شرع ظاہر کردیا جاتا ہے۔ وباللہ التوفیق۔

انجکشن رقیق اور تر دوا کا کیا جاتا ہے اور ظن غالب یہ ہے کہ تر اور رقیق دوا بذریعہ رگوں کے خود خون کی حرکت اور اس کے سیلان سے اور مزید انجکشن کی حرکت قسریہ کی مدد سے دماغ یا جوف تک پہونچ جاتی ہے۔ مسلمان ڈاکٹروں سے تحقیق کی تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ انجکشن سے دوا دماغ یا جوف تک پہونچ جاتی ہے۔

ردالمحتار میں ظاہر الروایہ سے منقول ہے:

وقع فی ظاھر الروایۃ من تقیید الافساد وبالدواء الرطب مبنی علی العادۃ من انہ یصلی والا فالمعتبر حقیقۃ الوصول حتی لوعلم وصول الیابس افسد (وفیہ ایضا) فان کان

مما یصل عادۃ حکم بالفساد لانہ متیقن۔

اور یہ امور نا قابل انکار ہیں۔ (۱) انجکشن فعل قصدی وارادی ہے (۲) اور دوا میں اصلاح بدن کا فائدہ موجود ہے۔ (۳) وہ جوف میں پہنچ کر رہ جاتی ہے اس کو خارج سے پھر کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اور روزے کے فساد کا مدار انہیں امور پر موقوف تھا۔

چنانچہ ردالمحتار میں ہے: وحاصلہ ان الا فساد منوط بما اذا کان بفعلہ او فیہ صلاح بدنہ ویشترط ایضا استقرارہ داخل الجوف۔

لہذا جب یہ امور اس انجکشن میں متحقق ہوگئے تو اس انجکشن سے روزہ فاسد ہوجائے گا۔ اور اس کی قضا لازم ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۲۷/ رمضان المبارک ۱۳۷۸ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

اللہ اکبر

کتاب الحج



باب ارکان الحج

مسئلہ (۵۸۶)

(۱) کیا قانونی مجبوری سے حج فرض کے لئے فوٹو کھنچوا کر دینا جائز ہے؟۔

(۲) جب فرض وحرام کا تعارض ہو تو شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟۔

(۳) جب عوام وخواص یعنی محدث اعظم صاحب ودیگر علماء کرام بھی فوٹو لے کر حج کو جارہے ہیں اور " لا تجتمع امتی علی الضلالۃ " صحیح ہے تو اس کو اجماع امت سمجھ کر جواز فوٹو کا حکم دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟۔

(۴) یہ خیال کر کے کہ حجر اسود چوم کر یا وقوف عرفات سے یا طواف بیت اللہ شریف کر کے سب گناہ معاف ہو جائیں گے فوٹو کھنچوانے میں کیا مضائقہ ہے؟۔

(۵) فعل حرام کا ارتکاب فسق ہے اور یہ فسق مستور بھی نہیں ہے ایسی حالت میں جو حج سے فارغ ہو کر آئے وہ اس فسق کی وجہ سے احترام وتعظیم کے لائق نہیں مگر لوگ ان کو مکرم ومعظم ہی سمجھتے ہیں۔ یہ سمجھنا کیسا ہے؟۔

(۶) رہن دخلی حرام ہے یعنی شی مرہونہ سے انتفاع ناجائز ہے۔ اگر کسی نے مکان اس شرط پر خرید لیا کہ اگر تم سال ڈیڑھ سال میں خریدنا چاہو گے تو میں اسی قیمت میں تمہارے ہاتھ پر بیع کردونگا اسی طرح وہ اتنی مدت خود رہا یا کرایہ پر اٹھایا تو یہ رقم اس کے لئے حلال ہوئی یا نہیں؟۔

(۷) نماز مغرب کے وقت تین شخص ٹخنوں سے نیچے پائچے پہنے ہوئے مسجد میں آئے ان سے کہا گیا کہ یہ شکل شرعاً ممنوع ہے، تو ایک نے نیفہ ٹوم لیا، دوسرے نے پائچے الٹ لئے، تیسرے نے اسی حالت میں نماز پڑھی۔ ان تینوں کی نماز کا کیا حکم ہے؟۔

(۸) عندالناس تو صاحب کرامات اولیاء کا مرتبہ علماء حق سے افضل ہے مگر عنداللہ والرسول علماء واولیاء میں سے کون افضل ہے میرا گمان عوام کے خلاف ہے؟۔

المستفتی ،مولوی محمد یوسف بمعرفت محمد فاروق صاحب سوداگر الموینیم پیلی بھیت

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) اب سفر حج کیلئے فوٹو کا کھینچوانا ضروری ہوگیا ہے۔ جب یہ قانون زیر غور ہی تھا اس وقت بھی ہم نے اور دیگر مقامات سے علماء کرام نے اس کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور حکومت سے مطالبہ کیا تھا۔ حکومت نے اسکا جواب ہم کو یہ دیا کہ حکومت کو مجبوراً پاسپورٹ کے ساتھ فوٹو کو لازم کرنا پڑا ہے۔ تو فوٹو کا پاسپورٹ کے ساتھ ہونا بہر حال ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اب ہمیں ادھر تو یہ ملحوظ رکھنا ہے کہ فوٹو تصویر ہے اور اس کا کھینچوانا تصویر کا کھینچوانا ہے جو گناہ ہے۔ اور ادھر یہ مدنظر رکھنا ہے کہ حج فرض ہے جو بلا ادا کئے ادا نہیں ہوسکتا اور سال دو سال میں غیر مسلم حکومت سے یہ امید بھی نہیں ہے کہ حجاج سے یہ فوٹو کی قید اٹھائی جائے گی۔ اب وہ شخص جس کو حج فرض ادا کرنا ہے اور تمام شرائط حج مجتمع ہیں اور شرعی موانع سے کوئی مانع موجود نہیں ہے تو کیا اس کے لئے صرف فوٹو کا کھینچوانا شرعاً عذر و مانع قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اور بصورت عذر و مانع ہونے کے تاخیر حج کے گناہ بلکہ ترک فریضۂ حج کے عذاب کا سزا وار ہوگا یا نہیں۔ لھذا اہم جواب سے اپنے چند مقدمات پیش کرتے ہیں۔

مقدمہ اول:۔ ماں باپ کی اطاعت سے حج فرض ادا کرنا اولے ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:فی المنقطع حج الفرض اولی من طاعۃ الوالدین وطاعتھما اولی من حج النفل" (عالمگیری قیومی ص۱۱۳ ج۱)

ارشاد الساری حاشیہ المسلک المتقسط میں ہے:۔"وفی المضمرات الاتیان بحج الفرض اولی من طاعۃ الوالدین" (ارشاد مصری ص۳)

اسی طرح جب عورت کے ساتھ محرم ہو تو اسے حج فرض کے لئے بغیر اجازت شوہر کے جانا جائز ہے۔ فتاوی قاضی خاں میں ہے ۔"وعند وجود المحرم کان علیھا ان تخرج حجۃ الاسلام وان لم یاذن زوجھا وفی النافلۃ لاتخرج بغیر اذن الزوج" (فتاوی قاضی خاں مصطفائی ص۱۳۵ ج۱)

درمختار میں ہے:۔"ولیس لزوجھا منعھا عن حجۃ الاسلام"

ردالمختار میں ہے:۔" ای اذا کان معھا محرم والا فلہ منعھا کمایمنعھا عن غیر

حجۃ الاسلام" (ردالمختار مصری ص۱۵۰ ج۲)

ان عبارات سے یہ ثابت ہوگیا کہ حج فرض کی اس قدر اہمیت ہے کہ اس کے مقابلہ میں اطاعت والدین اور اذن شوہر کا بھی لحاظ نہ رکھا گیا۔

مقدمۃ ثانیہ: پانی کی قلت۔ گرم ہوا کا چلنا۔ موت۔ قتل۔ چوری۔ بیماری کے محض خطرات حج کے لئے عذر مانع نہیں۔۔ ردالمختار میں ہے:۔" ان مایحصل من الموت بقلۃ الماء وھیجان السموم اکثر ممایحصل بالقتل با ضعاف کثیرۃ فلو کان عذرا لزم ان لایجب الحج الاعلی القریب من مکۃ فی او قات خاصۃ مع ان اللہ تعالی اوجبہ علی اھل الآفاق من کل فج عمیق مع العلم با ن سفرہ لا یخلو عما یکون فی غیرہ من الاسفار من موت وقتل وسرقۃ (ردالمختار مصری ص۱۴۹ ج۲)

اس عبارت سے ظاہر ہوگیا کہ سفر قلت آب، بادسموم، موت، قتل، چوری کے خطرات سے خالی نہیں ہوتا ہے تو یہ چیزیں حج کے لئے عذر و مانع نہیں جب تک کہ یہ حد یقین یا ظن غالب کی حد تک نہ پہنچ جائیں۔

مقدمۃ ثالثہ: اگر مال حرام سے حج فرض ادا کر رہا ہے تو اگر چہ اس کا حج درجہ قبولیت تک نہ پہنچے اور ثواب کا مستحق نہ بنے لیکن وہ تارک حج کا عذاب نہ دیا جائے گا۔

ردالمختار میں ہے:۔"ویجتھد فی تحصیل نفقۃ حلال فانہ لایقبل با لنفقۃ الحرام کما ورد فی الحدیث مع انہ یسقط الفریضۃ معھا ولاتنافی بین سقوطہ وعدم قبولہ فلا یثاب لعدم القبول ولایعاقب عقاب تارک الحج ای لان عدم الترک یبتنی علی الصحۃ وھی الاتیان بالشرائط والارکان والقبول المترتب علیہ الثواب یبتنی علی اشیاء کحل المال والاخلاص کمالوصلی مرائیا او صام و اغتاب فان الفعل صحیح لکنہ بلا ثواب" (ردالمختار مصری ص۱۴۴ ج۲)

اس عبارت سے ثابت ہوگیا کہ مال حرام سے حج کرنے میں فرض ادا ہو جاتا ہے اور فریضہ سر سے ساقط ہو جاتا ہے کہ جب اس نے حج کے شرائط وارکان ادا کیئے تو حج تو صحیح ہوگیا اور وہ ترک حج کے ثواب سے بچ جائے گا۔ اب باقی رہا حج کا ثواب تو وہ حج کے مقبول ہونے پر مرتب ہے اور قبولیت حج مال حلال اور اخلاص پر موقوف ہے۔ جیسے کہ کسی نے ریا کے لئے نماز پڑھی یا روزہ رکھا اور اس میں غیبت

کی تو وہ نماز وروزہ تو ادا ہو گیا مگر وہ ثواب کا حقدار نہ بنا۔ بالجملہ فریضہ کی صحت تو اسکے شرائط وارکان کے ادا کرنے پر ہو جاتی ہے۔ اور خارجی امور کا اثر خود فعل پر نہیں پڑتا بلکہ ثواب پر ہے۔

مقدمۃ اربعۃ:۔ سفر حج میں اگر ظلم ظالم یا دفع شر یا حصول امن کے لئے رشوت دینی پڑے۔ یا چنگی ٹیکس بجبر لیا جاتا ہو اور یہ محض اسقاط فرض یا دفع مضرت مال کے لئے بضرورت دینے کے لئے مضطر ہو تو اس عازم حج پر کوئی محظور شرعی لازم نہیں آتا بلکہ گناہ لینے والے پر ہے اور یہ امور مذکورہ حج کے لئے عذر نہیں اور نہ منافی امن ہیں۔

درمختار میں ہے:۔" وھل مایوخذ فی الطریق من المکس والحقارة عذر قولان والمعتمد لا کمافی القنیة والمجتبی"

علامہ علی قاری المسلک المتقسط میں تحریر فرماتے ہیں:" قال غیرالو بری یجب الحج وان اعلم یوخذمنه المکس قال صاحب القنیة والمجتبی وعلیه الاعتمادوفی المنهاج وعلیه الفتوی وقال ابن الهمام حاصله ان الاثم فی مثله علی الآخر لاعلی المو طی فلایترك الفرض لمعصیة عاص" (ارشاد الساری مصری ص ۳۶)

ردالمحتار میں ہے:۔ واعترضه ابن کمال با شافی شرحه علی الهدایة بان ما ذکرفی القضاء لیس علی اطلاقه بل فیما اذا کان المعطی مضطر ابان لزمه الاعطاء ضرورة عن نفسه وماله، اما اذا کان بالا لتزام منه فبالا عطاء ایضا یا ثم وما نحن فیه من هذ القبیل۔ اه۔ واقره فی النهر واجاب السید ابو السعود بانه هنا مضطر لا سقاط الفرض عن نفسه قلت ویؤیده مایاتی عن القنیة والمجتبی فان المکس والخفارة رشوة ونقل ح عن البحران الرشوة فی مثل هذا جائزةولم اره فیه۔ (ردالمحتار مصری ج ۲۔ ص ۱۲۹)

ابن کمال پاشا نے اپنی شرح ہدایہ میں اس پر اعتراض کیا کہ قضا میں مذکور ہوا اس کا حکم مطلق نہیں بلکہ اس صورت میں ہے کہ جب دینے والا مجبور ہو کہ اپنے نفس و مال کی ضرورت کی بنا پر اس کو دینا لازم ہو لیکن جب اس نے خود ہی اپنے اوپر لازم قرار دے دیا تو دینے پر گنہگار ہوگا۔ اور ہم جس پر گفتگو کر رہے ہیں وہ اسی قبیل سے ہے اسی کو نہر میں برقرار رکھا۔ اور سید ابو سعود نے جواب دیا کہ بلاشک حاجی یہاں پر اپنے نفس پر سے فریضہ حج کے ساقط کرنے کے لئے مجبور ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسی کی تائید کرتا ہے۔ جو قنیہ اور مجتبی میں لکھا ہے۔ کہ بیشک محصول اور ٹیکس رشوت ہے اور بحر الرائق سے منقول ہے کہ

بیشک اس جیسی جگہ میں رشوت جائز ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ ظلم ظالم، دفع شر، حصول امن، چنگی ٹیکس، کوئی عازم حج فرض محض اپنے اوپر سے فریضہ حج کے ادا کرنے یا اپنے مال سے دفع مضرت کرنے کے لئے بلحاظ ضرورت مجبورا رشوت دے تو ایسی رشوت جائز ہے۔ اس کا گناہ صرف لینے والے پر ہوگا۔ اس دینے والے پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ اور یہ چیزیں نہ حج فرض کے لئے عذر و مانع ہیں نہ اس کے لئے منافی امن ہیں۔ لہذا ان چیزوں کی بنا پر حج فرض کو نہ چھوڑا جائے گا بلکہ جب اس کے لئے اور تمام شرائط حج پائے جائیں تو اسے حج فرض کے لئے جانا واجب ہے۔

مقدمۂ خامسہ: جس شخص کے لئے موانع حج مرتفع ہوں اور شرائط حج مجتمع ہوں تو اس کو اسی سال حج کرنا فرض ہے۔ وہ اگر دوسرے سال تک تاخیر کرے گا تو گنہگار ہوگا۔ اور اگر چند سال تک حج کے لئے تاخیر کرتا رہا تو فاسق ہے اور اس کی گواہی مردود ہے۔

درمختار میں ہے:

(فرض فی العمر مرة علی الفور) فی العام الاول عند الثانی واصح الروایتین عن الامام ومالك واحمد فیفسق وترد شهادته بتاخیره ای سنیناً لان تاخیره صغیرة وبارتکابه مرة لا یفسق الا بالاصرار۔ (ردالمحتار۔ ص ۱۴۴۔ ج ۲)

اور حج ایک بار فوراً پہلے سال ہی میں فرض ہے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک اور امام مالک وامام احمد وامام اعظم کی اصح روایت میں تو چند سال تاخیر سے وہ فاسق ہو جائے گا اور اس کی گواہی مردود کر دی جائے گی۔ کیونکہ تاخیر حج صغیرہ گناہ ہے اور صغیرہ کے ایک بار کرنے سے فسق نہیں ہوتا۔ ہاں وہ اس تاخیر کے اصرار سے ضرور فاسق ہو جائے گا۔

درالمنتقی شرح الملتقی میں ہے:

(فرض فی العمر مرة علی الفور)عند الثانی لان الموت فی السنة غیر نادر وهو اصح الروایتین عن الامام ومالك واحمد کما فی عامة الکتب المعتبرات کالخانیة والاسرار وفی القنیة انه المختار فیفسق وتردشهادة بالتاخیر عن العام الاول بلا عذر۔ (درالمنتقی مصری۔ ج ۱۔ ص ۲۵۹)

(حج) ایک مرتبہ عمر میں فوراً فرض کیا گیا امام ابو یوسف کے نزدیک کہ سال میں موت کا وجود

غیر نادر ہے اور یہ امام اعظم اور مالک اور احمد کی اصح روایت میں ہے جیسا کہ عام معتبر کتب مثل فتاوی قاضی خان اور اسرار میں ہے اور قنیہ میں ہے کہ یہی مختار قول ہے تو بلا عذر پہلے سال کی تاخیر سے فاسق ہو جائے گا۔ اور وہ مردود الشہادت ہو جائے گا۔

لباب المناسک' اور اس کی شرح المسلک المتقسط فی المسلک المتوسط' میں ہے:

(و اذا وجدت الشروط) ای شروط وجوب الحج و ادائه وجب (فالوجوب على الفور) ای محمول علیه فی القول الاصح عند نا وهو اختیار ابی یوسف و اصح الروایتین عن ابی حنیفة کما نص علیه قاضی خان وصاحب الکافی و به قال مالك فی المشهور و احمد فی الاظهر والمازنی من الشافعیة (فیقدمه خائف العزوبة) ای من العنت (علی التزوج) لحق تعلق وجوب الحج وسبقه (ویاثم الموخر عن سنة الامکان) ای اول سنی الامکان وهذا طریق امام الهدی ابی منصور الماتریدی فی کل امر مطلق عن الوقت فانه یحمل علی الفور۔ (المسلک المتقسط۔ص ۴۴)

اور جب حج کے وجوب اور ادا کی شرطیں پائی گئیں اور وہ واجب ہو گیا تو اس کا وجوب ہمارے نزدیک صحیح ترین قول کی بنا پر علی الفور ہے۔ یہی امام ابو یوسف کا مختار قول ہے۔ اور امام اعظم کی اصح روایت ہے جیسا کہ اس پر قاضی خان اور صاحب کافی نے نص بیان کی اور یہی مشہور روایت میں امام مالک نے اور اظہر روایت میں امام احمد نے اور شافعیہ میں سے مازنی نے فرمایا۔ تو حج کو غیر شادی شدہ شخص جو زنا سے خائف ہے نکاح پر مقدم کرے کہ حج کا وجوب اور سبقت کا حق اس سے متعلق ہو چکا۔ اور قادر ہو جانے کے سالوں میں سے پہلے سال ہی سے تاخیر کرنے والا گنہگار ہو جائے گا۔ یہ امام ہدی امام ابو منصور ماتریدی کا طریقہ ہر اس امر میں ہے جو وقت سے مطلق ہو کہ وہ علی الفور ہی پر محمول ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ فرضیت حج کی اس قدر اہمیت ہے کہ اس کے مانع نہ ہوں اور تمام شرائط جمع ہوں تو اس کے مقابل طاعت والدین اور اذن شوہر کی بھی پروانہ کی جائے گی اور قلت آب، باد سموم، موت، قتل، چوری، بیماری کے خطرات بھی حج کے موانع نہیں ٹھریں گے یہاں تک کہ مال حرام سے حج فرض ادا ہو جاتا ہے اور فریضہ ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اور وہ ترک حج کے عذاب سے بچ جاتا ہے اگر چہ ایسا حج مقبول نہیں ہوتا، اور وہ ثواب کا مستحق نہیں بنتا لیکن باوجود اس کے مال حرام حج کے لئے عذر نہیں قرار پاتا۔ بلکہ حج فرض کی ضرورت کا اتنا لحاظ ہے کہ اس کے سفر میں ظلم ظالم ودفع شر وحصول امن کے

لئے رشوت دینے کی اجازت ہے۔ اور چنگی اور ٹیکس ادا کرنے پر کوئی مواخذہ شرعی نہیں ہے تو رشوت بھی حج کیلئے نہ عذر نہ مانع نہ منافی امن ہے۔ بالجملہ ان سب امور کو نہ تو حج فرض کے لئے عذر و مانع قرار دیا۔ نہ ان کی وجہ سے حج کو جانا گناہ و ناجائز ٹھہرایا۔ نہ ان کی بنا پر فریضۂ حج کا التوا کیا۔ تو فوٹو کا کھنچوانا بھی اگر چہ گناہ ہے مگر اس کو بلا کسی دلیل کے حج فرض کا عذر و مانع کس طرح قرار دیا جائے۔ اور محض اس فوٹو کی بنا پر حج فرض کے لئے جانا کس ثبوت سے گناہ و ناجائز ٹھہرایا جائے۔ اور صرف اس کی وجہ سے کس نص سے تاخیر حج کے گناہ وفسق بلکہ ترک حج کے عذاب کو اٹھا دیا جائے اور اس شخص کو فاسق و مردود شہادت ہونے سے بچا لیا جائے۔

خلاصہ جواب یہ ہے کہ فوٹو کا کھنچوانا عازم حج فرض کے لئے محض اسقاط حج فرض کی ضرورت کے لئے مجبوراً ہے۔ جیسا کہ مقدمہ ثالثہ میں ثابت ہو چکا ہے کہ مال حرام سے حج فرض ادا ہو جاتا ہے۔ اور فریضہ ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اور ترک حج کے عذاب سے بچ جاتا ہے۔ اور محض اسقاط فرض کی ضرورت کی بنا پر مجبوراً اسے حج ادا کرنے کی اجازت دی اور یہ بات بیان کی کہ یہ ایک خارجی چیز ہے اس کا اثر خود فعل حج پر نہیں پڑتا بلکہ ثواب پر اثر پڑیگا۔ تو مال حرام حج کیلئے عذر و مانع نہ بنایا باوجود کہ یہ ارکان حج کے اسباب میں اثر انداز ہے کہ اسی سے منی، مزدلفہ، عرفات، طواف زیارت کے لئے جا رہے ہیں۔ خود ارکان حج ادا کرنے والے کا خورد و نوش، طہارت، لباس، قربانی وغیرہ کثیر امور اسی مال حرام سے ہو رہے ہیں۔ تو اسی طرح فوٹو کے ہونے کے باوجود حج فرض ادا ہو جانا چاہیے۔ اور فریضہ ذمہ سے ساقط ہو جانا چاہئے۔ تو یہ فوٹو رکھنے والا شخص بھی ترک حج کے عذاب سے بچ جانا چاہئے۔ اور محض اسقاط فرض کی ضرورت کی بنا پر مجبوراً فوٹو کے ساتھ حج فرض کی اجازت دی جائے تو فوٹو بھی تو ایک خارجی ہی چیز ہے۔ اس کا اثر کسی رکن حج پر نہیں پڑتا۔ بلکہ اس کو تو چھپا کر صندوق میں رکھ دیا جائے گا۔ نہ اس کو منی، مزدلفہ، عرفات، صفا و مروہ، مسجد حرام میں لے جانے کی حاجت نہ کسی فعل کے ادا کرنے کے وقت اس کے دکھانے کی ضرورت تو فوٹو کو فرض حج کے لئے کس طرح عذر و مانع قرار دیا جا سکتا ہے۔

مقدمۂ رابعہ میں ثابت کیا گیا کہ رشوت جس کی حرمت منصوص ہے اس کی محض اسقاط فرض کی ضرورت کو مدنظر رکھ کر اجازت دی گئی اور اس کی حرمت کو حج فرض کیلئے عذر و مانع قرار نہیں دیا گیا اسی طرح فوٹو کو بھی محض اسقاط فرض کی ضرورت کی بنا پر جائز قرار دیا جائے اور اس کی حرمت کو حج فرض کے لئے عذر و مانع نہ ٹھہرایا جائے۔ پھر رشوت کی مجبوری تو کبھی اتفاقاً پیش آجاتی ہے۔ اسی طرح مال حرام کے

صرف کرنے میں تو کوئی شخص خاص ہی مبتلا ہو جاتا ہے۔ لیکن فوٹو کی ایسی قانونی مجبوری ہے جس کے اٹھ جانے کی اب کوئی امید باقی نہیں رہی ہے۔ پھر اس میں ایسا ابتلاء عام وعموم بلوی ہے جس سے کسی شخص کا اس سے مستثنیٰ ہو جانا نہایت مشکل امر ہے۔ تو ان مجبوریوں، ضرورتوں کو کتب فقہ کی نظروں کی بنا پر حج فرض کے ادا کرنے کے لئے فوٹو کی اجازت دی جاتی ہے۔ اور قول فقہائے کرام "الضرورات تبیح المحظورات" (ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں) پر عمل ہو جاتا ہے۔ اور اس قانون کے اٹھ جانے یا اس سے مستثنیٰ ہو جانے کی موہومی امیدوں پر التوائے حج یا تاخیر حج بلکہ ترک حج کے گناہ وفسق سے اہل اسلام کو بچالیا جائے گا۔ یہ حکم فرض حج کیلئے ہے۔ باقی رہا حج نفل اس کے لئے فوٹو کی اجازت نہیں دی جاتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۲) جہاں فرض وحرام میں ایسا تعارض وتقابل ہو کہ اس حرام کے ارتکاب سے ترک فرض لازم آئے جیسے حج فرض ہے اور ترک حج حرام ہے تو اس تعارض وتقابل میں فرض ہی کو ادا کیا جائیگا۔ تو اس سے حرام خود ہی ترک ہو جائیگا اور جہاں فرض وحرام میں ایسا تعارض وتقابل نہ ہو جیسے کسی شخص پر حج فرض ہے لیکن اس فریضہ کی ادائیگی میں رشوت دینی پڑتی ہے اور رشوت حرام ہے۔ تو اس صورت میں حج فرض کو ادا کیا جائیگا اور رشوت محض اسقاط فرض کی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے دی جائیگی بلکہ اس کو بخوف ترک فرض اختیار کیا جائیگا تو حقیقۃً اس میں تقابل حرام کا حرام سے ہو سکتا ہے صورت مسئولہ میں حج کیلئے فوٹو کھچوانا بھی حرام۔ اور اس کی بنا پر ترک حج کا ہو جانا بھی حرام ہے تو بمقتضائے حدیث کہ "جب تو دو بلاؤں میں مبتلا ہو فاختر اھونھما تو آسان بلا کو اختیار کر" تو اس میں ترک فرض کی بلا تو اہم تر ہے۔ اور فوٹو محض اسقاط فرض بلکہ ترک فرض کے عذاب سے بچنے کے لئے اختیار کیا گیا۔ تو اس کی حرمت اسکے مقابلہ میں ضرور کمتر وایسر ہوئی تو اس کو اختیار کر کے ترک فریضہ حج کی حرمت سے اجتناب ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) ہمارے خواص علمائے کرام نے مجھ سے گفتگو کے بعد اور بعض نے میرے اس فتوے کے دیکھ لینے کے بعد حج کا عزم کیا ہے۔ حج فرض میں جواز فوٹو کیلئے یہ میرا فتویٰ ہی بہت کافی ہے اس کے لئے زبردستی اجماع کو دلیل بنانے کی حاجت نہیں۔ پھر جب حضرت مفتی اعظم صاحب قبلہ کو ابھی تک اس میں کلام ہے تو اجماع ہوا بھی نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۴) جب فوٹو کا جواز محض اسقاط فرض کی ضرورت۔ اور خوف ترک فرض کی بنا پر ہے تو حدیث

شریف میں ہے "الاعمال بالنیات" لہٰذا اس نیت خاص کی بنا پر جب عازم حج مقامات پر دعا کریگا تو اس گناہ کے معاف ہو جانے کی بھی امید ہے۔ "ان اللہ لا یغفر ان یشرك به و یغفر مادون ذالك لمن یشاء"۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۵) جب بوقت ضرورت شرعی کے کسی فعل حرام کو مجبوراً کیا جا رہا ہے تو اسکا مرتکب فاسق ہی قرار نہیں پایا تو اس بنا پر لوگوں کا اسکو مکرم ومعظم سمجھنا غلط قرار نہیں پاتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۶) بلاشبہ شئی مرہونہ سے مرتہن کو انتفاع ناجائز ہے۔ ردالمحتار میں ہے:

لا یحله ان ینتفع بشئی منه بوجه من الوجوه وان اذن له الراهن لانه اذن له فی الربا لانه یستوفی دینه کاملا فتبقی له المنفعة فضلا فیکون ربا۔ (ردالمحتار جلد ۵ صفحہ ۳۲۰)

باقی رہا مکان کا اس شرط پر خریدنا کہ وہ اسکو ان ڈیڑھ سال تک اسی قیمت پر بائع کو بیع کر دیگا۔ اس کو بیع الوفاء کہتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بیع نہیں ہے بلکہ رہن ہی ہے اور اس کا حکم رہن کا حکم ہے۔

ردالمحتار میں جواہر الفتاویٰ سے ناقل ہیں:

اذ یقول بعت منك علی ان تبیعه منی متی جئت بالثمن فهذا البیع باطل وهو رهن وحکمه حکم الرهن وهوا الصحیح"

فتاوے سے ناقل ہیں" والذی علیه الاکثر انه رهن لا یفترق عن الرهن فی حکم من الاحکام"۔

اسی میں جامع الفصولین سے ناقل ہیں'

'البیع الذی تعارفه اهل زماننا احتیا لا للربا وسموه بیع الوفاء هو رهن فی الحقیقة"

(ردالمحتار جلد ۴ صفحہ ۲۷)

اب جب اس کا رہن ہونا ثابت ہو گیا تو مشتری کو اس سے نہ انتفاع جائز ہے نہ اس کے کرایہ کی رقم حلال ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

****

مسئلہ (۵۸۷)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

حجاج کے لئے فوٹو کی پابندی امن طریق کے منافی ہے یا نہیں؟۔ برتقدیر ثانی سوال یہ ہے کہ امن طریق صرف جان و مال کی حفاظت کا نام ہے یا دین کا امان بھی اس میں داخل ہے؟۔

ظاہر ہے کہ جس راہ میں کسی معصیت پر مجبور کیا جاتا ہو اس راہ کو پر امن نہیں کہا جا سکتا اگر امن طریق میں امن دین بھی داخل ہے یعنی عدم ارتکاب حرام شرط ہے تو فوٹو حرام ہے اس کی پابندی امن طریق کے منافی ہونی چاہئے۔ اور اگر امنِ طریق کے لئے عدم ارتکاب حرام شرط نہیں بلکہ ارتکاب حرام کے باوجود بھی حج کرنا ضروری ہے تو سوال یہ ہے کہ عورت کو عدت میں اور بغیر محرم کے حج کرنے سے کیوں روکا گیا ہے۔ نیز فوٹو کی طرح دوسرے محرمات شرعیہ (مثلاً زنا، لواطت شرب خمر وغیرہ) بھی اگر حجاج کے لئے لازم قرار دیئے جائیں تو کیا ان محرمات شرعیہ کی پابندی کے باوجود بھی حج کرنا ضروری ہوگا یا نہیں اگر نہیں تو وجہ فرق کیا ہے۔ بینوا توجروا

المستفتی، خریدار سنی

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

ردالمحتار میں بحر سے ناقل ہیں:

ویجتهد فی تحصیل نفقة حلال فانه لا یقبل بالنفقة الحرام کما ورد فی الحدیث مع انه یسقط الفرض عنه معها ولا تنافی بین سقوطه وعدم قبوله فلا یثاب لعدم القبول ولا یعاقب عقاب تارك الحج۔ (ردالمحتار مصری جلد ۲ صفحہ ۱۴۴)

علامہ علی قاری المسلک المتقسط میں تحریر فرماتے ہیں:

یجب الحج وان علم انه یوخذ منه المکس قال صاحب القنیه والمجتبی وعلیه الاعتماد وفی المنهاج وعلیه الفتویٰ وقال ابن الهمام ما حاصله ان الا ثم فی مثله علی الأخذ لا علی المعطی فلا یترك الفرض لمعصیة عاصٍ۔ (ارشاد الساری مصری صفحہ ۳۷)

ردالمحتار میں ہے:

فان المکس والخفارة رشوة ونقل عن البحر ان الرشوة فی مثل هذا جائزة۔

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ جس طرح مال حرام اور رشوت سے حج فرض ذمہ پر سے ساقط ہو

جاتا ہے اور ترک حج کے عذاب اور گناہ سے بچ جاتا ہے اسی طرح فوٹو کی بھی محض اسقاط فرض حج کی بنیاد پر اجازت دی جائے اور اس کی حرمت کو حج فرض کے لئے عذر اور مانع قرار نہ دیا جائے۔ باوجودیکہ مال حرام ارکان حج کے اسباب میں اثر انداز ہے کہ اسی سے منیٰ، مزدلفہ، عرفات، طواف زیارت کا سفر کیا جائیگا۔ بلکہ اس مبارک سفر میں خود عازم حج کے خوردنوش۔ طہارت۔ لباس۔ قربانی وغیرہ امور میں بھی مال حرام صرف ہوگا۔ پھر مال میں کوئی خاص شخص مبتلا ہوگا۔ اسی طرح رشوت کی مجبوری بھی ایک اتفاقی چیز ہے۔ لیکن فوٹو تو ایک ایسی خارجی چیز ہے جس کا اثر ارکان حج بلکہ اسباب ارکان پر نہیں پڑتا۔ کہ اس کو صندوق میں چھپا کر رکھا جا سکتا ہے نہ اسے منیٰ، مزدلفہ، عرفات، صفا، مروۃ، مسجد حرام میں لے جانے کی کوئی حاجت نہ کسی رکن حج کرنے کے وقت اس کے دکھانے یا پاس ہونے کی کوئی ضرورت۔ علاوہ بریں اس فوٹو کی ایسی قانونی مجبوری ہے جس کے ہندوستان میں اُٹھ جانے کی اب کوئی امید باقی نہیں رہی۔ پھر اس میں ایسا ابتلائے عام وعموم بلوی ہے جس سے کسی شخص کا مستثنیٰ ہونا دشوار ہے۔ تو ان مجبوریوں ضرورتوں، کتب فقہ کی نظیروں، کی بنا پر صرف حج فرض ادا کرنے کے لئے فوٹو کی اجازت دی جاتی ہے اور قول فقہاء ”الضرورات تبیح المحظورات“ پر عمل کیا جاتا ہے، اور اس قانون کے اٹھ جانے یا اس سے مستثنیٰ ہو جانے کی موہومی امیدوں پر التوائے حج یا تاخیر حج بلکہ ترک حج کے گناہ عظیم اور فسق سے اہل اسلام کو بچایا جاتا ہے۔

اس مسئلہ میں ایک مبسوط اور مدلل فتویٰ ہے جو فتاویٰ اجملیہ میں درج ہے لہٰذا فوٹو کی پابندی میرے نزدیک امن طریق کے منافی نہیں جیسے بہ تصریح فقہاء کرام مال حرام اور رشوت امن طریق کے منافی نہیں۔ پھر اگر فوٹو کی معصیت سے بچایا جاتا ہے تو تاخیر حج بلکہ ترک حج کی معصیت لازم آئی جاتی ہے۔ تو معصیت میں مبتلا ہونا بہر صورت لازم آتا ہے۔ دیکھئے رشوت او مال حرام سے حج کرنے میں کیا ارتکاب حرام لازم نہیں آتا ہے لیکن ان امور محرمہ کی ضرورۃً اسقاط فریضۂ حج کی وجہ سے فقہاء کرام نے اجازت دی اسی طرح فوٹو کا حکم سمجھئے۔ اب باقی رہا زنا لواطت شرب خمر وغیرہ ان امور محرمہ کا یہاں پیش کر دینا تو ان کے لئے نہ تو کوئی شرعی مجبوری ہے نہ کوئی قانونی پابندی۔ نہ عموم بلوی کا وجود ہے تو ان میں سے کسی بات کی اجازت کتب فقہ سے کیسے مستفاد ہو سکتی ہے تو ان محرمات کا فوٹو پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے تو فوٹو اور ان محرمات میں یہ کھلی ہوئی وجہ فرق موجود ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۲۵ رجب المرجب ۷۶/۱۳۷۶ھ **کتبہ**: المفتقر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۸۸)

جناب مفتی صاحب دامت برکاتہم جناب کی خدمت میں ایک لفافہ دیا جاتا ہے اس میں دوتین فتوی طلب کرتے ہیں آپ برائے مہربانی انکا بہت جلدی جواب عنایت فرمائیں۔

(۱) کیا لکھتے ہیں علماء دین شرع متین ایک شخص صاحب استطاعت ہے اس کی بیوی اور اس کا لڑکا حج پڑھنے بھیجنے کے لئے تیار ہے لیکن وہ تیار نہیں ہوتا، اس لئے اس کو چھوڑ کر اس کی بیوی اور لڑکا حج پڑھنے جاسکتا ہے یا نہیں؟۔

(۲) ایک شخص والدہ کو لیکر ایک دفعہ حج پڑھ آیا ہے اور اب پھر ارادہ ہے تو اس کی والدہ کو چھوڑ کر جاسکتا ہے یا نہیں؟۔

(۳) ایک شخص کی والدہ ثانی ہے اور اپنے شوہر کے ساتھ الگ رہتی ہے اور رقم بھی الگ ہے تو کیا وہ اپنے والد کے ساتھ اپنی ثانی والدہ کو چھوڑ کر حج پڑھنے جاسکتا ہے یا نہیں؟۔

اس کا جواب جلدی عنایت فرمائیں کیونکہ فارم آنے والے ہیں یہاں سے پندرہ بیس آدمی حج کو جانے کے لئے تیار ہورہے ہیں آپ بھی ان کے حق میں دعا فرمائیں والسلام

پیش امام صاحب واسکی پالٹی کا بہت بہت سلام معلوم ہو

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) جب ان ماں اور بیٹے کے ذموں پر حج فرض ہے تو ان دونوں پر بغیر اس کی اجازت کے بھی حج کے لئے جانا فرض ہے، پھر اگر امسال اس کے نہ جانے کی وجہ سے حج کے لئے نہیں جائینگے تو تاخیر حج کے مرتکب ہونگے۔

(۲) والدہ کی اجازت سے دوسری مرتبہ بغیر ان کو ساتھ لئے ہوئے حج کو یقیناً جاسکتا ہے۔

(۳) اس صورت میں بلا شبہ یہ اپنے والد کے ساتھ حج کے لئے جاسکتا ہے واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

****

متعلقہ ادائے فریضہ حج وزیارت پر حکومت حجاز کا جابرانہ ٹیکس

الجواب

الحمد للہ الذی جعل الکعبۃ مثا بۃ للناس وامنا ۔ومنح لھم من مقام ابراھیم مصلیٰ ۔ وجعل الحرام امنا ۔وبعث فیھم رسو لا کریما ۔ یتلو علیھم ایا تہ ویزکیھم ویطھرھم تطھیر ا ۔ فصلوات اللہ تعالیٰ وسلا مہ علیہ و علی الہ واصحابہ دائما ابدا ۔

(۱) ھذ ہ الضریبۃ بدعۃ شنیعۃ قبیحۃ حرم للآخذو حکم بغیر ما انزل اللہ تعالی ۔قال النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لا یدخل الجنۃ صاحب مکس یعنی الذی یعشر النا س (رواہ احمد وابو داؤ د والدارمی) والمراد اخذ المزید من العشر قھرا فھو ظلم ۔

وعن عائذ بن عمر وقال: سمعت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یقول: ان شرالرعا ء الحطمۃ (رواہ مسلم) والحطمۃ المظلمۃ ۔وروی البیھقی عن حرۃ الرقاشی عن عمہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم الا لا تظلموا الا لا یحل ما ل امری الا بطیب نفس منہ واخذ ما ل المسلم قھر ایسمی نھبۃ (کذا فی مجمع بجا ر الانوا ر) وھی ممنو عۃ محرمۃ وردت فی ذمھا احادیث کثیرۃ ۔ھذا اذا کا ن الاخذمر ۃ ۔

قال رسو ل اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم :یا تی علی النا س زما ن لا یبالی المرء ما اخذ منہ أمن الحلا ل ام من الحرام ۔ومنع الحاج من الدخول فی البلد الحرام وصدھم عن الحج لھذا الطمع الفاسد قھر وظلم ومخالفۃ لکتاب اللہ تعالی حیث قال ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکر فیہ اسمہ وسعی فی خرابھا الآ یۃ وصدالمو من ومنعہ من الحج والدخول فی المسجد الحرام سنۃ مشرکی مکۃ کا نوا منعوا رسول للہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم واصحابہ عن ان یصلوا فیہ فی ابتداء الاسلام ومنعوھم من حجۃ والصلوۃ فیہ عام الحدیبیۃ واذا منعوا من یعمر ہ بذکر اللہ تعالی وصلو تہ فیہ فقد سعوا فی خرابہ (ما فی تفسیر لبا ب التاویل)فمن یقتفی آثارھم یکو ن معھم ولا فرق بینہ وبین من یبعث الجند علی ابواب المساجد یو م الجمعۃلمنع المصلین من الصلوۃ [illegible]یر اداء ضریبۃ

بحیلۃ حراسۃ المسجد واصلاحہ بل ھذا اشرمنہ ۔وحاشا ان یوجد مثل ذلک فی زمن اسلاف الصلحین غیر انہ کان عمل المشرکین ۔قال اللہ تعالیٰ ان الذین کفروا ویصدون عن سبیل اللہ والمسجدالحرام الذی جعلناہ للناس سواء العاکف فیہ والباد ومن یرد فیہ بالحاد بظلم نذقہ من عذاب الیم ۔

عن جبیر بن مطعم ان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قال: یا بنی عبد مناف! لا تمنعوا احدا طاف بھذا البیت وصلی ایۃ ساعۃ شاء من لیل ونھار اخرجہ الترمذی وابو داؤد والنسائی)

(۲) لا یجوز فانہ داخل تحت حکم ومن اظلم الآیۃ فی مدارک التنزیل ھوحکم عام لجنس مساجد اللہ وان مانعھا من ذکر اللہ مفرط فی الظلم ۔فاین الجواز ؟وھذا المکوس الغالیۃ اقبح واشد علی الناس واضرلھم من غارات قطاع الطرایق۔

(۳) لا یجوز لان الرشوۃ حرام ۔

(٤) لا یجوز اصلا لان الناس کلھم عباد اللہ تعالی ومنع الطائفین عن الطواف واخراجھم عن المطاف ظلم وسعی فی تخریب المسجد والاخلال فی عبادات الخلق لتعظیم الامیر امر شدید شنیع ۔

(٥) لا یجوز لانہ سبب تعطیل السعی وموجب زوال خشوع اھل السعی وخضوعھم ویجدون منہ ضیقا وفی قلوبھم تشویشا واللہ سبحانہ وتعالی اعلم ۔

کتبہ العبد المعتصم بحبلہ المتین محمد نعیم الدین شرفہ اللہ بمزید العلم والیقین آمین ۔الاجوبۃ کلھا صحیحۃ محمد عمر ۔

احمدہ محمودا واحمد محمدا۔ واسلم علی اکرم العالم سرمدا۔ اما بعد فان الحکومۃ النجدیۃ تدعی انھا تحکم بما انزل اللہ فی آیاتہ الکریمۃ وبما وردت فیھا الاحادیث الشریفۃ ۔ولا تامر بالامور البدعیۃ ۔وتجری الاحکام الشرعیۃ ۔وتحفظ اموال المسلمین ۔وتحرس علی الحجاج الزائرین لکن ھذا ادعاء باطل مع کذب زائل ۔بل حکامھا حتی السلطان ۔یحکمون بغیر ما انزل فی القران یخالفون الاحادیث الصحیحۃ ۔ویفعلون الامور المحدثۃ ۔ویبدعون البدع الشنیعۃ ویحرفون السنن السنیۃ ۔ویاخذون

اموال المسلمین قھرا ۔وینتھبون علی الحجاج جبرا ۔ویقررون الضریبۃ علی العبادات ۔ویحلون الرشوۃ علی امور الخیرات ۔ویصدون المسلمین عن اداء الفریضۃ ویمنعون الزائرین عن المقامات المتبرکۃ ۔فما افتی العلامۃ صدرالافاضل ۔فخر الاماثل ۔سلطان المحدثین ۔امام المفسرین واستاذ العلماء وسندالفضلاء الحافظ الحاج المولوی محمد نعیم الدین المرادابادی ناظم الجمھوریۃ الاسلامیۃ ۔ومؤسس الجامعۃ النعیمیۃ متع اللہ المسلمین بطول بقائہ فھو حق وصحیح وصواب ۔ومدلل بالاحادیث والکتاب ۔فلا ریب ان ضرب الضریبۃ بدعۃ سیئۃ ومخالف للسنۃ السنیۃ ۔وظلم وحرام ۔وصد اھل الاسلام عن الحج والدخول فی البلد الحرام ۔وھذا الفعل لم یثبت من القرون الثلثۃ وائمۃ المجتھدین۔ ولا من الفقھاء والصالحین ۔ولم یاخذ احد من السلاطین ۔فھی ظلم واتباع عمل المشرکین واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۸۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) ایک آدمی مالدار غریب کو اپنے ساتھ حج کو لے جارہا ہے تو حج کا ثواب لیجانے والے کو ملے گا یا کہ جانے والے کو؟۔

(۲) ایک شخص مرحوم کے بدلے ایک آدمی کو حج کو لیجارہا ہے ایسا بوڑھا جو حج کو جانے کی طاقت نہیں رکھتا تو وہ دوسرے آدمی کو حج کو بھیج رہا ہے تو ان دونوں شخص جانے والوں کو حج کا ثواب ملے گا یا نہیں؟۔ براہ کرم جواب سے مطلع فرمائیں یعنی ماہنامہ سنی میں شائع کرانے کی زحمت فرمائیں خریدار نمبر ۳۳۷۲۶ جونہ بازار بھوساول، مشرقی فاؤنڈیشن سید سردار علی خلیفہ پیر جیلانی میاں قادری

الجواب

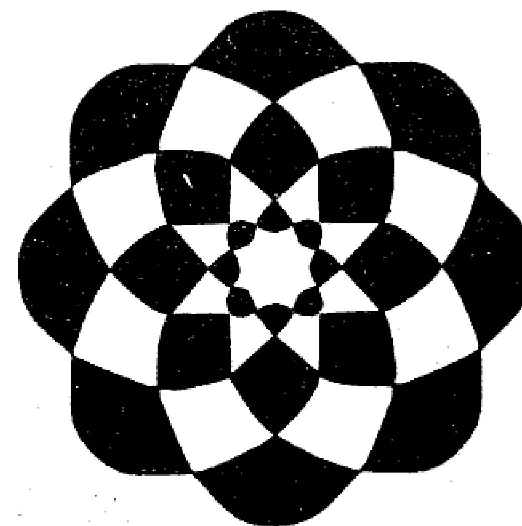
نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

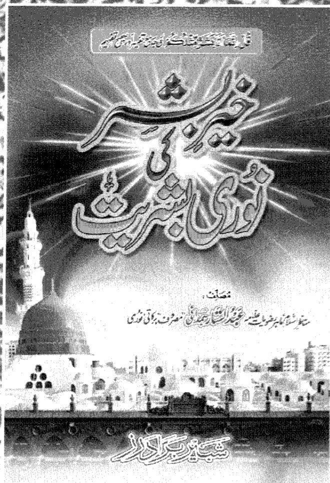
(۱) جو مالدار کسی غریب کو حج کو اپنے ساتھ لے جائے تو اس حج کا ثواب اس غریب کو تو اپنے ارکان حج ادا کرنے کی بناپر ہوگا اس مالدار کو اسکے لیجانے اور اس کے تمام اخراجات اٹھانے کی بناپر ہوگا۔

لہذا ان میں ثواب سے کوئی بھی محروم نہیں ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

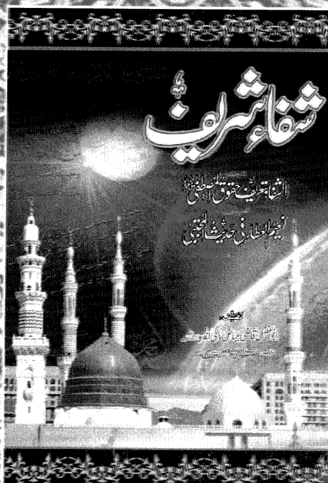
(۲) حج بدل میں فریضہ حج تو اس کا ادا ہوگا جس کی طرف سے روپیہ دیا گیا اور جس کی نیت سے ارکان حج ادا کئے گئے ہیں اور ثواب اس جانے والے کو بھی ملے گا۔ درمختار ردالمحتار میں ہے: ویقع الحج المفروض عن الآمر علی الظاہر ولا یخلو المامور من الثواب۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

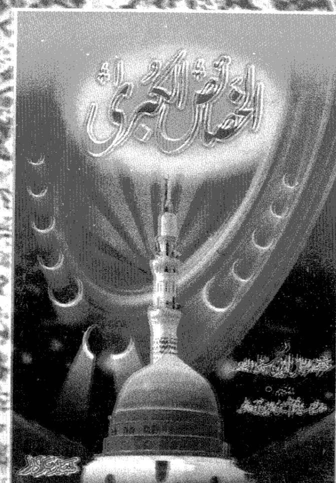




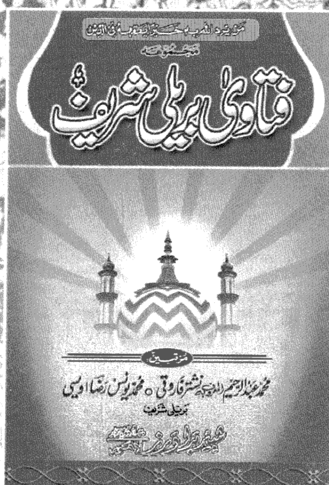
خیر بشر کی نوری بشریت
شبیر برادرز



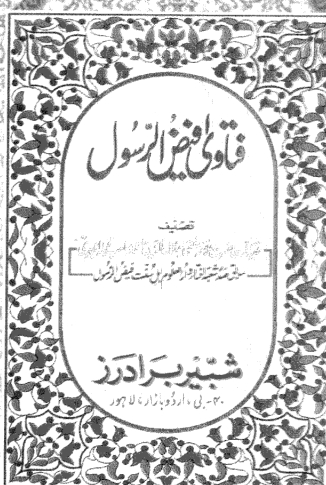
شفاء شریف



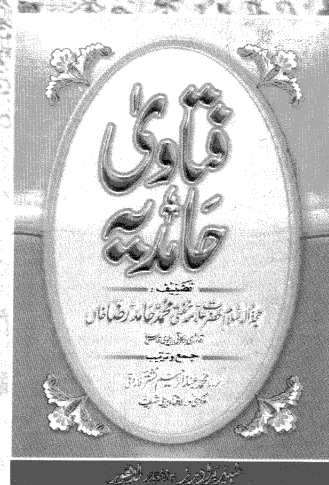
الخصائص الکبریٰ



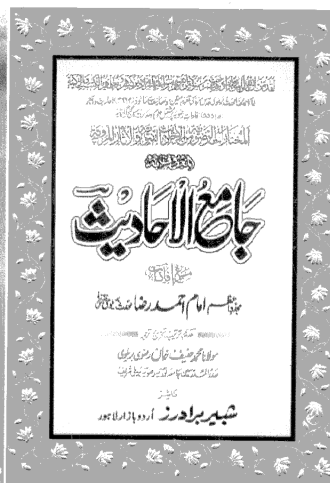
فتاویٰ بریلی شریف



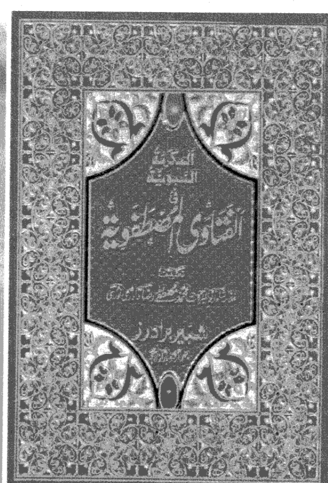
فتاویٰ فیض الرسول
تصنیف
شبیر برادرز



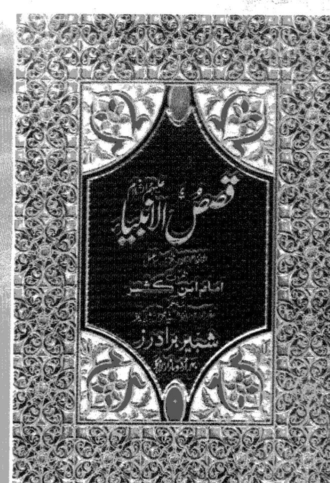
فتاویٰ حامدیہ
تصنیف
جمع وترتیب



جامع الاحادیث
شبیر برادرز اردو بازار لاہور



الفتاویٰ المصطفویۃ
شبیر برادرز



قصص الانبیاء
شبیر برادرز



شبیر برادرز